بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہفتم

سورۃ البقرۃ آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران آیات ۱ تا ۹۲

از رشحات قلم رئیس المفسرین

حافظ قاضی عبدالرزاق

ناشر جامعہ عثمانیہ مظہر العلوم

ٹیم ماڈل ٹاؤن راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہفتم

سورۃ البقرۃ آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران آیات 1 تا ۶۹

از رشحات قلم

مشفق اہلسنت

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا عبدالرزاق بھترالوی، حطاروی

مہتمم جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر: جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

❁ نام کتاب............ نجوم الفرقان فی تفسیرآیات القرآن
سورۃ البقرۃ ۲۸۴ تا ۲۸۶، آل عمران 1 تا ۶۹

❁ مصنف.......... شیخ الحدیث والتفسیر مولانا عبدالرزاق بھترالوی

❁ کمپیوٹر گرافکس ...... محمد اسحاق ہزاروی

❁ خصوصی معاون...... تنویر احمد ہزاروی

❁ کمپوزر............ محمد اکرم رضوی

❁ کمپوزنگ سنٹر...... مہرالعلوم کمپوزنگ سنٹر شکریال راولپنڈی

❁ بار طباعت............ اول

❁ ناشر .... جامعہ جماعتیہ مہرالعلوم راولپنڈی

ضروری نوٹ

جلد ششم میں بناء برعدم توجہ استاذ العلماء حافظ عطا محمد بندیالوی رحمہ اللہ کا مضمون ''درس نظامی کے مقاصد'' صفحہ 529 کے بجائے 440 پر لگ گیا تھا آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح کردی جائے گی۔
کمپیوٹر گرافر

کچھ مصنف کے بارے میں

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر؟

اگر کائنات ارض وسماں کے اندر نظر دوڑائی جائے تو بعض لوگ آپ کو ساری کائنات سے الگ تھلگ نظر آئیں گے لیکن اس کے باوجود اگر ان کو پرچم اسلام کا نور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا انہی اعلیٰ ہستیوں میں ایک نمایاں ہستی استاذ المدرسین رئیس المحققین والمدققین مشفقی ومحبی ومربی شیخ الحدیث والتفسیر استاذی المکرّم حضرت علامہ مولانا قاضی عبدالرزاق بھترالوی متعنا اللہ بطول حیاتہ کی ہے

رب ذوالجلال نے جہاں قبلہ استاذی المکرّم کو اور بے بہا خوبیاں عطا فرمائی ہیں وہاں آپ کو طاقت قلم بھی عطا فرمائی اور آپ کا انداز تحریر بڑا ہی نکھرا ہوا سادہ اور دلکش ہے جس کو عوام الناس بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتی ہے بایں وجہ آپ کی تصنیفات علماء میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں بھی بے حد مقبول ہیں اور آپ ہی وہ عظیم شخصیت ہیں جو صحیح معنوں میں محسن اہلسنت کہلوانے کے قابل ہیں اور خصوصا درس نظامی کے حوالے سے اہلسنت پر جو احسان عظیم فرمایا وہ شمس وقمر کی طرح سب پر عیاں ہے ان ہی درسی کتب میں سے آپ کی تصنیفات اردو حواشی میں میزان الصرف مراح الارواح اور السراجی فی المیراث جبکہ عربی میں نورالایضاح مختصر القدوری کنزالدقائق اور تلخیص المفتاح قابل ذکر ہیں اور اس کے علاوہ اس کے آپ کے ہاتھ میں موجود روایات مصدقہ وصحیحہ پر مشتمل تفسیر نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن کی جلد ہشتم بھی آپ کا ایک عظیم علمی شاہکار ہے

میری دعا ہے خالق آپ کو ہمیشہ صحت وعافیت کے ساتھ عمر دراز عطاء فرمائے اور آپ کی تدریسی وتحریری علمی شاہکاروں میں شب رروز ترقی عطاء فرمائے اور آپ کا سایہ اہلسنت وجماعت پر تادیر قائم رہے تاکہ مجھ جیسے تشنگان علم ومعرفت آپ سے آب رحمت لے کر اپنی پیاس بجھاتے رہیں اور آپکے سایہ محبت میں علمی وعملی پرورش پاتے رہیں

آتی رہیگی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہیگا

کلے از سگان کوچہ تو
فدا حسین

عنوان	صفحة	عنوان	صفحه
معتزلہ کا استدلال	132	تکلیف مالا یطاق کی دو قسمیں	149
اہل سنت و جماعت کا قول	132	کیا خوب استدلال	150
ایک عمل دوسرے عمل کو ضائع نہیں کرتا	133	''اصرا'' کے اور معنی	150
وسوسہ کے متعلق شاندار قول	134	نبی کریم ﷺ کی رحمت کی وجہ سے دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہوگیا	151
مسئلہ	134	اہل سنت و جماعت کی طرف سے جواب	152
عزم پر مؤاخذہ	135	رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَابِهٖ	153
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا	135	اہل سنت و جماعت کا مذہب	153
بھولنے اور خطاء کے لحاظ پر احکام کی قسمیں	140	معتزلہ کا مذہب	153
سہو و نسیان میں فرق	141	معتزلہ کے دلائل اور ان جوابات	153
خطاء سے مراد کیا ہے؟	141	معتزلہ کی دوسری دلیل	154
چند مسائل ضروریہ	141	معتزلہ کی تیسری دلیل	155
مسئلہ	143	وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا	156
مسئلہ	144	تین دعاؤں میں '' ربنا '' ذکر کیا ایک میں نہیں	158
اس دعا کی مقبولیت	144	عفو، مغفرت اور رحمت کی ترتیب میں اہم نکتہ	158
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا	145	وضاحت	159
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	145	ثواب جسمانی	159
''اصرا'' کے معانی	145	تنبیہ	160
''اصرا'' بمعنی نا قابل توبہ گناہ	146	''انت مولنا'' کہنے میں ایک اور فائدہ	161
''اصرا'' بمعنی سخت امر	146	فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ	162
''اصرا'' بمعنی مسخ	147	دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے	162
''اصرا'' بمعنی اعمال شاقہ	147	''مولیٰ'' کے معانی	163
''اصرا'' بمعنی بھاری بوجھ	147	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	163
تمام معنی کا جامع معنی	148	فضائل سورۃ بقرۃ پر احادیث مبارکہ	163
پہلے لوگوں پر کیسے امور شاقہ ڈالے گئے	148	آخر میں قرطبی سے اقتباس	166
مؤمنین کی دعا قبول کی گئی	149		

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحة

﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌO﴾ (آیۃنمبر ۲۸۴)

(1) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا تو جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(2) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم چھپاؤ اسے حساب لے گا تم سے اس کا اللہ، تو بخشش فرمائے گا جس کی چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماقبل سے تعلق میں چند وجوہ:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں چند چیزوں کا ذکر کیا ہے جو اصول ہیں، یعنی توحید و نبوت پر دلائل کو ذکر کیا اور شرائع کے احکام اصولیہ کا تذکرہ کیا، یعنی نماز، زکوۃ، قصاص، روزہ، حج، جہاد، حیض، طلاق، عدت، مہر، خلع، ایلاء، رضاع، بیع، ربوا، دین کے معاملہ کی کیفیت کو بیان کیا تو سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ہے، جس میں لوگوں کو ڈرایا گیا ہے، کہ سب چیزیں خواہ آسمانوں میں ہیں یا زمینوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں اور اسی کی غلامیت میں ہیں۔

(۲) دوسری وجہ جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے اپنا موقف بیان کیا، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ذکر کیا جو کمالات حقیقیہ یا صفات حقیقیہ ہیں، کیونکہ ﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ سے جب یہ ثابت کیا کہ سب چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں اور سب پر اسی کو بادشاہت حاصل ہے تو اس سے رب تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا پتہ چل گیا۔ اور یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے کیونکہ ارشاد فرمایا۔ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم اسے چھپا رکھو

اس کا اللہ تم سے حساب لے گا۔ جب اللہ تعالی کی قدرت اور علم کا پتہ چل گیا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ تمام چیزیں رب تعالی کی مملوک مخلوق ہیں اور اسی کے ربوبیت میں ہیں۔

"کذلک غایة الوعد للمطیعین و نهایة الوعید للمذنبین فلهذا السبب ختم الله هذه الصورة بهذه الایة"

تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسی آیۃ کریمہ میں مطیع لوگوں کیلئے کامل وعدہ پایا گیا ہے اور گنہگار لوگوں کیلئے کامل وعید پائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ان آیات سے سورۃ کو ختم کیا گیا ہے۔

(۳) جب اس آیۃ کریمہ سے پہلی آیۃ کے آخر میں ذکر فرمایا۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے تو اس آیۃ کریمہ میں اس پر دلیل قائم کی گئی۔ ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ کہ تمام چیزیں اللہ تعالی کی مخلوق ہیں جب رب تعالی تمام چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔

"لابد وان یکون عالمابها اذمن المحال صدور الفعل المحکم المتقن عن الجاهل به فکان الله تعالی احتج بخلقه السماوات والارض مع ما فیهما من وجوه الا حکام والاتقان علی کو نه تعالی عالمابهامحیطا باجزا ئها وجزئیا تها"

تو ضروری ہے کہ وہ ان تمام کا عالم (جاننے والا) بھی ہو، یہ محال ہے کہ کسی جاہل سے اتنا محکم اور یقینی کام ہو سکے گویا کہ اللہ تعالی نے تمام چیزوں کو محکم طور پر اور یقینی طور پر پیدا کرنے پر دلیل قائم کی ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو جاننے والا ہے۔ اور اس کا علم تمام اجزاء مخلوق اور تمام جزئیات وکلیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۴) جب اللہ تعالی نے دین کے معاملات پر وثیقہ کا ذکر فرمایا کہ اسے لکھ لو، گواہ بنا لو، یا اس کے بدلے رہن رکھو، گویا کہ اس بیان سے مقصد مال کی حفاظت اور مال کی حفاظت میں احتیاط ہے، رب تعالی نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن میں مخلوق کے منافع پائے جاتے ہیں رب تعالی کا ان میں کوئی نفع نہیں، وہ کسی چیز سے نفع حاصل کرنے سے بے نیاز ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (بے شک اللہ بے پرواہ اور تعریف کیا ہوا ہے) ان احکام کے بعد ذکر فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ای فانه له ملک السما وات والارض " یعنی تمام آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی رب تعالی کو حاصل ہے، وہ کسی قسم کا تمہارے اعمال سے نفع حاصل کرے یہ ممکن نہیں اسلئے کہ وہ محتاج نہیں اور منافع وہی حاصل کرتا ہے جس کو منافع حاصل کرنے کی محتاجی ہوتی ہے۔

(۵) ان میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے گواہی کو چھپانے سے منع فرمایا اور اس پر وعید فرمائی اس کے بعد ذکر فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ای انه له ملک السماوات والا رض فیجازی علی الکتما ن والاظهار " کہ بیشک اسی ذات کو زمین و آسمان کی بادشاہت حاصل ہے اور بادشاہ کو حق حاصل

ہوتا ہے کہ وہ کسی کو حکم عدولی کی سزا دے لھذا رب تعالیٰ حاکم اعلیٰ تمہیں گواہی کے چھپانے پر سزا دے گا اور گواہی کے اظہار پر جزاء خیر عطاء فرمائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں:

جب رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ (جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے) یعنی زمین و آسمان کی تمام چیزیں رب تعالیٰ کی مخلوق ہیں تو اسی سے پتہ چل گیا کہ بندوں کے اعمال بھی ﴿مَافِی الْاَرْضِ﴾ "جو کچھ زمینوں میں ہے" میں ہی پائے جاتے ہیں تو وہ رب تعالیٰ کی ہی مخلوق ہیں، اسی سے معتزلہ فرقہ کا بھی رد ہو گیا کہ وہ بندوں کو اپنے تمام اعمال کا خالق مانتے ہیں خواہ وہ اعمال خیر ہوں یا شر ہوں۔ اور اسی سے مجوسیوں کا بھی رد ہو گیا جو نیکیوں کا اور خالق مانتے ہیں اور برائیوں کا اور خالق مانتے ہیں۔

"لِلّٰهِ" میں لام کس معنیٰ کیلئے ہے:

"لیس لام الغرض فانه لیس غرض الفا سق من فسقه طاعة الله فلا بد وان یکو ن المراد منه لام الملک وا لتخلیق"

"لام" غرض کے معنیٰ میں استعمال نہیں، یعنی یہ معنیٰ درست نہیں کہ زمین آسمان کی تمام چیزیں رب تعالیٰ کیلئے ہیں۔ اگر یہ معنیٰ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ فاسق کا فاسقانہ عمل بھی اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی کیلئے ہو گا۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ فاسق کا عمل فسق اللہ تعالیٰ کی طاعت نہیں بن سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ لام ملک اور تخلیق کا معنیٰ دے۔ اس لحاظ پر معنیٰ ہو گا اللہ کی ملک میں ہیں تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں یا معنیٰ یہ ہو گا، اللہ کی مخلوق ہیں تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان دونوں صورتوں کو حاوی ہے خواہ لام ملکیت کا ہو یا لام تخلیق کا ہو۔ آپ کا ترجمہ یہ ہے، اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔

دینی طلباء کرام کے ذوق کیلئے:

"احتج الاصحاب بهذه الا یة علی ان معدوم لیس بشیء لان من جملتما فی السماوات والا رض حقائق الا شیا ء وما هیا تها"

اسی آیۃ کریمہ سے ہمارے اصحاب نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ ''شیء''موجود کو کہتے ہیں۔معدوم کو ''شیء'' نہیں کہا جاسکتا۔اسلئے کہ تمام چیزیں زمین وآسمان کی موجود ہیں اور حقائق وماہیات ہیں۔اللہ تعالی کی قدرت میں حقائق وماہیات داخل ہیں، وہی مکون ہیں جو تکوین باری تعالی میں داخل ہیں۔

''فاذا کان کذلک کانت قدرۃ اللہ تعالی مکونۃ للذوات و محققۃ للحقائق فکان القول بان المعدوم شیء باطلا''

جب یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالی کی قدرت ذاتوں کی مکون ہے اور حقائق کیلئے محقق ہے، تو معدوم کو شئی کہنے کا قول باطل ہے۔ (کبیر)

﴿وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ﴾

''اور اگر ظاہر کرو تم جو تمہارے نفسوں میں یا تم چھپاؤ اسے حساب لے گا تم سے اس کا اللہ۔''

بعض حضرات نے بیان کیا کہ یہ آیۃ منسوخ ہے:

''واخرج احمد و مسلم و ابو داؤد فی ناسخہ وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی ہریرۃ قال لما نزلت علی رسول ﷺ ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾ اشتد ذلک علی اصحاب رسول اللہ ﷺ فاتوا رسول اللہ ﷺ ثم جثوا علی الرکب فقالوا یا رسول اللہ ﷺ کلفنا من الاعمال ما نطیق الصلوۃ والصیام والجہاد والصدقۃ وقد انزل علیک ہذہ الایۃ ولا نطیقہا فقال رسول اللہ ﷺ اتریدون ان تقولوا کما قال اہل الکتابین من قبلکم سمعنا و عصینا بل قولوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر فلما اقترا ہا قوم وذلت بہا السنتہم انزل اللہ فی اثرہا امن الرسول الآیۃ فلما فعلوا ذالک نسخہا اللہ فانزل اللہ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا﴾ الی آخرہا''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ پر آیہ کریمہ ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ﴾ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ﴿وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ﴾ بہت سخت حکم محسوس ہوا تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (تو سخت شدت کی وجہ سے) گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کرنے لگے، یا رسول اللہ ﷺ ہمیں (پہلے) ان احکام کی تکلیف دی گئی جن کی ہم طاقت رکھتے تھے یعنی نماز اور روزے اور جہاد اور صدقہ کی، اور اب رب تعالی نے آپ پر یہ آیہ نازل کی ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم وہ کہو جو تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا ﴿سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا﴾ (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) بلکہ تم

کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ ''ہم نے سنا اور اطاعت کی تیری مغفرت ہوا ے رب ہمارے اور تیری طرف ہی پھرنا ہے''

جب صحابہ کرام نے یہ آیہ (الفاظ مبارکہ) پڑھی تو (شدت خوف کی وجہ سے) ان کی زبانوں میں رکاوٹ سی پیدا ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ﴿امن الرسول﴾ آیہ کریمہ نازل فرمائی یہ، جب انہوں نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے آیہ کریمہ: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نازل فرما کر اسے منسوخ فرما دیا۔ (درمنثور)

''عن ابی هریره ان رسول الله ﷺ قال ان الله تعالی تجاوز لامتی ما حدثت به انفسها مالم یعملو ابه او یتکلموا به وفی روایتما وسوست به صدرها''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ میری امت سے درگذر فرماتا ہے جو ان کے نفسوں میں واقع ہوں جب تک ان پر عمل نہ کریں یا ان کے ساتھ کلام نہ کریں ایک روایت میں ہے جو چیزیں ان کے سینوں میں بطور وسوسہ واقع ہوتی ہے رب تعالیٰ ان سے درگذر کرتا ہے۔

ابھی تک جو روایت ذکر کی گئی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ کا حکم ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ سے منسوخ ہو گیا۔ (خازن)

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ منسوخ نہیں:

''لان النسخ لا یرد الا علی الا مرو النهی ولا یرد علی الاخبار'' اسلئے کہ نسخ امر یا نہی پر وارد ہوتی ہے اور خبروں پر نہیں وارد ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ خبر ہے اس پر نسخ وارد نہیں، ان حضرات نے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ آیۃ منسوخ نہیں، انہوں نے اس کی تاویل یہ پیش کی ہے کہ دل کے خیال کو کسب کہا جاتا ہے عمل نہیں کہا جاتا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ﴾ ''جو تمہارے دلوں نے کسب کیا''، عمل وہ ہوگا جو اعضاء ظاہرہ سے کیا جائے یا دل اس پر پختہ ارادہ کرے جب دل پختہ ارادہ کر لے تو وہ محاسبہ کے درجہ میں آئے گا اور ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ﴾ رب تعالیٰ جس کی چاہے مغفرت فرمائے اور جس کو چاہے عذاب دے) کا مصداق بن جائے گا۔

کچھ اور حضرات نے اسکی تاویل یہ کی ہے:

کہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا حساب لیتا ہے جو بھی وہ عمل کریں خواہ ظاہر کریں یا مخفی

رکھیں ،یعنی دل میں واقع ہونے والے خطرات کا بھی محاسبہ ہوتا ہے۔

"غیر ان معاقبتھم علی ما اخفوہ ما اخف ممالم یعملوا بہ وھو ما یحدث لھم فی الدنیا من النوائب والمصائب والا مور التی یحزنون علیھا"

سوائے اس کے کہ بات یہ ہے کہ جو ان کے چھپے اعمال ہوتے ہیں، رب تعالیٰ بھی ان کو ایسا عذاب دیتا ہے جو پوشیدہ ہوتا ہے، (بظاہر وہ گرفت نظر نہیں آتی ،لیکن حقیقت میں وہ گرفت ہی ہوتی ہے)یعنی دنیا میں ان کو مصائب وآلام (دکھ، درد) میں مبتلا کردیا جاتا ہے،اوران کو غموں میں مبتلا کردیا جاتا ہے(یہ ایسی گرفت ہوتی ہے جسے وہ خود بھی گرفت نہیں سمجھ سکتے ،وہ ظاہری اسباب کی طرف منسوب کریں گے،ایسا ہوا تو یہ مصیبت آگئی، یہ امر واقع ہوگیا جس نے غمزدہ کردیا) یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔

❁ **"عن امیہ انھا سالت عائشۃ عن قول اللہ عزوجل ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ﴾وعن قولہ﴿ مَنْ یَعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَبِہٖ﴾فقالت ما سالنی عنھا احد منذ سالت رسول اللہ ﷺ فقال ھذہ معاتبۃ اللہ العبد بما یصیبہ من الحمی والنکبۃ حتی البضاعۃیضعھا فی ید قمیصہ فیفقدھا فیفزع لھاحتی ان العبد لیخرج من ذنوبہ کما یخرج التبر الاحمر من الکیر"اخرجہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب"**

امیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی﴿ وَاِنْ تُبْدُوْامَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ﴾ کے متعلق اورارشاد باری تعالیٰ ﴿مَنْ یَعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَبِہٖ﴾ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے کسی ایک نے بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا سوال کیا، آپ نے فرمایا یہ گرفت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو عتاب ہوتا ہے وہ یہ کہ بخار ہوگیا کوئی اور مصیبت آگئی، یہاں تک کہ قمیص کی جیب میں ڈالے ہوئے پیسے گم ہوجانے پر جو غم لاحق ہوتا ہے وہ بھی عتاب ہی ہوتا ہے (اس طرح گرفت ہوتی رہتی ہے)یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے ایسے نکل آتا ہے جیسے کہ سونے کا ٹکڑا بھٹی سے صاف نکل آتا ہے۔

سبحان اللہ !اللہ تعالیٰ کی اپنے مؤمن بندوں پر کتنی رحمت ہوتی ہے کہ بظاہر ان کی گرفت ہوتی ہے کہ بخار اور تکالیف میں مبتلاء کرنا بظاہر عتاب، سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ ہے لیکن حقیقت میں رحمت ہی رحمت ہے کہ یہ تکالیف بندے کو گناہوں سے پاک کرنے کیلئے آتی ہیں، اس لئے کہ صغیرہ گناہ تو خود ہی مصائب سے معاف ہوجاتے ہیں اور کبیرہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب اسے کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، رب تعالیٰ کی طرف کامل طور پر رجوع کرتا ہے۔

۞ "وعن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ قال اذا اراد الله بعبده الخیر عجل له العقوبة فی الدنیا واذا اراد الله بعبده الشر امسک علیه بذنبه حتی یوافیه به یوم القیامة" (رواہ الترمذی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے جلدی ہی دنیا میں گرفت میں لے لیا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ بندے پر شر، (عذاب) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے گناہ محفوظ کر لئے جاتے ہیں یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے پورا پورا بدلہ (عذاب) دیا جائے گا۔

بعض حضرات نے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بیان کیا:

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ﴾ یعنی مما عزمتم علیه ﴿ او تخفوه ﴾ ای ولا تبدوه وانتم عازمون علیه ﴿ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ فاما حدیث النفس مما لم تعزموا علیه فان ذلک مما لا یکلف الله نفسا الا وسعها ولا یواخذ به"

یعنی بندوں کے دلی ارادوں اور خیالات کی تین قسمیں ہیں، ایک یہ ہے کہ کسی کام کا دل میں پختہ ارادہ پیدا ہو گیا اور اس کے کرنے کو ظاہر بھی کر دیا گیا اس کا بھی مواخذہ ہوگا، یہ حکم ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ﴾ میں آ گیا اور دوسری قسم وہ ہے کہ دل میں خیال واقع ہوا کہ فلاں برا کام کرنا ہے۔ اس پر پختہ ارادہ کر لیا کہ یہ کام اب ضرور ہی کرنا ہے البتہ اسے کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا بلکہ اس پختہ ارادہ کو دل میں چھپا کر رکھا، اس کا محاسبہ بھی ہوگا یہ حکم ﴿ اَوْ تُخْفُوْهُ ﴾ میں آ گیا۔ ان دونوں قسموں کا محاسبہ ہونا واضح ہے کہ، ارشاد باری تعالیٰ ﴿ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ ان دونوں قسموں کو شامل ہے۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ دل میں خیال صرف وسوسہ کی حد تک رہا وہ کام کرنے کا پختہ ارادہ نہیں کیا اس کام پر کوئی گرفت نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کی تکلیف اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیتا ہے۔

بعض اور حضرات نے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بیان کیا:

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ محاسبہ کا معنی ہے خبر دینا اور پہچان کرانا یعنی مشہور و معروف کرنا۔ آیۃ کریمہ میں محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی مخفی باتوں کو جانتا ہے خواہ تم ان کو ظاہر کر دو یا مخفی ہی رہنے دو، اب آیۃ کریمہ کا معنی یوں ہوگا:

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ﴾ لتعملوا به (او تخفوه) مما اضمرتم ونویتم ﴿ یُحَاسِبْكُمْ به اللّٰهُ ﴾ ای یخبرکم به ویعرفکم ایاه ثم یغفر للمؤمنین اظهارا لفضله ویعذب الکافرین اظهار العدله"

اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے کہ تم اس پر عمل کرو یا تم اسے چھپا کر رکھو، دل میں مخفی ہو اور اس پر ارادہ ہو تو اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا، یعنی اس کی تمہیں خبر دے گا اور اسکی تمہیں پہچان کرائے گا یعنی تم پردہ مشہور و معروف کردے گا، پھر اپنے فضل کا اظہار کرتے ہوئے مؤمنوں کی اس سے مغفرت فرمائے گا۔ اور اپنے عدل کے اظہار کیلئے کافروں کو عذاب دے گا۔

❁ "ویروی عن ابن عباس ویدل علیه انه قال یحاسبکم به الله ولم یقل یؤاخذکم به لان المحاسبة غیر المواخذة"

اور ابن عباس ﷛ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ یہ نہیں فرمایا ﴿یُؤَاخِذُکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اس لئے کہ محاسبہ اور چیز ہے اور مؤاخذہ اور چیز ہے، دونوں میں فرق ہے۔

اس پر دلیل وہ روایت ہے جو صفوان بن محرز مازنی سے مروی ہے۔

"قال بينما ابن عمر يطوف اذعرض له رجل فقال يا ابا عبد الرحمن اخبرني ما سمعت من رسول الله ﷺ في النجوى قال سمعت رسول الله ﷺ يقول يدني المو من من ربه حتى يضع عليه كنفه فيقرره بذنوبه تعرف ذنب كذا و كذا فيقول اعرف رب اعرف مرتين فيقول الله سترتها عليك في الدنيا وانا اغفرها لک اليوم ثم تطوى صحيفة حسابه واما الاخرون وهم الكفار والمنا فقون فينادى بهم على رؤوس الخلائق هولا ء الذين كذبوا على ربهم الالعنة الله على الظالمين" (اخرجه البخاری ومسلم)

وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر ﷛ ایک مرتبہ طواف کررہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پاس آکر پوچھا کہ (فلاں وقت جب تم اکیلے نبی کریم ﷺ کے پاس تھے تو آپ تم سے کوئی گفتگو فرمارہے تھے) وہ اکیلے میں تم نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا، مجھے بھی اس کی خبر دو، آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، مؤمن اپنے رب تعالیٰ کے قریب ہوگا، یہاں تک کہ وہ اس پر اپنا دست قدرت رکھے گا کہ بندہ اپنا گناہوں کا اعتراف کرے۔ (رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا) کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ کو پہچانتا ہے وہ دو مرتبہ عرض کرے گا ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں میں پہچانتا ہوں، تو رب تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تمہاری پردہ پوشی کی تھی تو آج بھی تمہاری مغفرت کررہا ہوں۔ اس کے بعد اس کے حساب کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا (یہ ہے محاسبہ) لیکن دوسرے کفار اور منافقین کو تمام مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا، کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی تکذیب کی، خبردار اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر (یہ ہے مؤاخذہ)۔ (ماخوذ از خازن)

راقم کے نزدیک تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں:

طلباء کرام ذرا اپنے روشن ذہن وضمیر کو بیدار کرتے ہوئے راقم کے ساتھ ساتھ چلیں تو آپ کو تمام اقوال مجتمع ہوتے ہوئے نظر آئیں گے، ہاں یوں بیان کیجئے۔

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ میں اور ﴿ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ پہلی آیۃ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دل کے خیالات اور وسوسہ پر بھی مؤاخذہ ہو گا، لیکن دوسری آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ اللہ تعالی کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ جب وسوسہ انسان کی طاقت سے باہر ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

بظاہر دوسری آیۃ سے پہلی آیۃ منسوخ ہے، لیکن حقیقت میں پہلی آیۃ کریمہ منسوخ نہیں کیونکہ وہ گرفت جو دل کے ارادوں پر ہوتی ہے وہ عتاب دنیا میں ہی بخار، مصائب وآلام اور غموں کی شکل میں ان کو آئے گا اور ان کو گناہوں سے ایسے پاک وصاف کر دیا جائے گا جیسا کہ لوہا یا سونا آگ کی بھٹی میں صاف وشفاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ عتاب صرف ان خیالات پر ہو گا جن کو ظاہر کر دیا جائے کہ اس پر ضرور عمل کرنا ہے یا دل میں رکھا جائے کہ ان پر ضرور عمل کرنا ہے، صرف دل کے خیالات اور وسوسہ پر کوئی عتاب نہیں ہوتا۔

رب تعالی چونکہ ہر ظاہر وباطن کو جانتا ہے، اس لئے ان کے دل کے ارادوں پر ان کو بھی مطلع کر دے گا بلکہ ان سے اقرار کرا کے اپنے فضل وکرم سے معاف فرما دے گا، یہ محاسبہ ہو گا، اور کفار ومنافقین کی گردن میں ہمیشہ کیلئے لعنت کا طوق ڈال کر ذلیل وخوار کر دیا جائے گا، یہ ان کا مواخذہ ہو گا، البتہ مؤمنین کو کسی برے کام کے مصمم ارادہ (پختہ ارادہ) پر بطور عدل گرفت فرمانا چاہے تو گرفت بھی فرمائے گا۔ (راقم)

خیال رہے کہ تفسیر خازن سے جو بحث نقل کی گئی ہے، تقریباً تفسیر قرطبی اور کبیر میں بھی وہی بحث ہے، تفسیر کبیر میں ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ کی وضاحت کیلئے ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ کو بھی دلیل بنایا گیا ہے، کہ جن لوگوں کے دل میں خطرات ووسوسات واقع ہوتے ہیں، لیکن وہ مجبور ہوتے ہیں ان وسوسوں کو دل سے نکالنے پر قادر نہیں ہوتے وہ تو ﴿فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ کا مصداق ہوں گے۔ کہ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے گا۔ اور جو لوگ دل کے ارادوں پر عمل کرنے پر اصرار کریں گے۔ ان کے عمل پر مصمم ارادہ ہو جائے گا وہ ﴿وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ کا مصداق ہوں گے، یعنی وہ اللہ تعالی کی گرفت میں آئیں گے۔

﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ ﴾ کا وسیع تر مفہوم:

یہ آیۃ کریمہ شامل ہے تمام قسم کے رذیل (گھٹیا قسم کے کام) کاموں کو شامل ہے، جیسا کہ نفاق، ریاء (دکھلاوا) عصبیت (خاندانی حمیت) دنیا کی محبت، غضب، تکبر، اپنے آپ پر تعجب کرنا، بے جا امیدیں باندھنا، حرص، توکل کو چھوڑنا، صبر کو چھوڑنا، حسد کرنا، کھوٹ وکینہ رکھنا، وغیرہ جو بھی دل اور نفس کے افعال ہیں ان تمام کو یہ آیۃ کریمہ شامل ہے۔

❁ "عن جبیر بن مطعم قال قال رسول اللہ ﷺ لیس منامن دعا علی عصبیۃ ولیس منا من قاتل علی عصبیۃ ولیس منا من مات علی عصبیۃ" "رواہ ابو داؤد" (مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ، مظہری)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی دعوت دی اور وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی وجہ سے کسی سے قتال کیا، اور وہ (بھی) ہم سے نہیں جو عصبیت پر مر گیا۔

وضاحت حدیث :

"(**لیس منا**) ای لیس من اهل ملتنا او من اصحاب طریقتنا" رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی، کہ وہ ہم سے نہیں کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دین پر چلنے والے لوگوں سے نہیں ، وہ ہمارے طریقہ پر چلنے والے اصحاب سے نہیں۔

"(**من دعا**) ای الناس (الی عصبیة) ای الی اجتماع عصبیة فی معاونة ظالم" جس نے عصبیت کی دعوت دی، کا مطلب یہ ہے کہ جس نے لوگوں کو ظالم کی امداد اور پشت پناہی کیلئے بلایا۔

(**ولیس منا من قاتل عصبیة**) ای با لباطل "اور وہ شخص ہم سے نہیں جس نے عصبیت کی وجہ سے قتال کیا (لڑائی کی) یعنی باطل طریقہ پر صرف عصبیت کی وجہ سے لڑائی کرنے والا ہمارے دین پر چلنے والوں سے نہیں۔

"(**ولیس منا من مات علی عصبیة**) ای علی طریقتهم من حمیة الجاهلیة" اور وہ شخص ہم سے نہیں جس کی موت عصبیت پر آئی، یعنی جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے طریقہ پر حمیت وجاہلیت پر مر گیا وہ ہمارے دین پر چلنے والوں میں سے نہیں۔ (مرقاۃ ج۹ ص۱۸۸)

عصبیت کیا ھے ؟

"العصبی هو الذی یغضب لعصبته ویحامی عنهم والعصبة الا قارب من جهة الا ب لا نهم یعصبو نه و یعتصب بهم ای یحیطون به ویشتد بهم"

باپ کی طرف سے جو قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں ان کو عصبہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اسے طاقت پہنچاتے ہیں اس کے پٹھے مضبوط کرتے ہیں، یہ ایک دوسرے کی وجہ سے مضبوطی حاصل کر کے دوسروں پر سختی کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسروں سے قتال کرتے ہیں۔

عصبیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے تھے ہم نے ہر حال میں اپنے پدری رشتہ داروں کی امداد کرنی ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں، یعنی حق و باطل کی تمیز کرنے کے بغیر ہر حال میں اپنے ہی پدری رشتہ داروں کی امداد کی وجہ سے دوسروں سے جھگڑا، دوسروں سے لڑائی، اور دوسرے لوگوں کو قتل کرنا اور ان پر ظلم کرنا یہ عصبیت ہے جو شرعاً مذموم چیز ہے۔

" والقواعد الشرعية انهم يكونون قوامين بالقسط شهداء الله ولو على انفسكم او الوالدين والاقربين"

حالانکہ شرعی قوانین یہ ہیں کہ مؤمن انصاف پر قائم رہتے ہیں، انصاف سے گواہی دیتے ہیں۔ گواہی دینے میں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء دیکھتے ہیں خواہ ان کو اپنی ذات کے خلاف گواہی دینی پڑے یا والدین کے خلاف گواہی دینی ہو یا اپنے رشتہ داروں کے خلاف گواہی دینی ہو انہیں اسکا کوئی خوف نہیں ہوتا کیونکہ ان کے سامنے مقصد عظیم اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہوتا ہے، وہ ناجائز طور پر اپنا یا اپنے والدین کا یا اپنے رشتہ داروں کا لحاظ کر کے گنہگار نہیں ہوتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے جہنم کا ایندھن بن جائیں۔ (مرقاۃ ج۹ص ۱۷۸)

تنبیہ: مشکوۃ شریف میں عصبیت کی مذمت اور مفاخرت کی مذمت میں احادیث کو ایک ہی باب میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" ولعل وجه الجمع بين المفاخرة والعصبية ان بينهما تلازما غالبا"

مفاخرت اور عصبیت کو ایک ہی باب میں اسلئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان میں غالباً تلازم پایا گیا ہے زیادہ طور پر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد کی تعریف کرتا ہے ان کے کارناموں پر فخر کرتا ہے، خاندانی بلندی بیان کرتا ہے، مال کی زیادتی پر فخر کرتا ہے، یہی فخر اسے خاندان کی پشت پناہی پر مجبور کرتا ہے، وہ یہ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس کے رشتہ دار جب ظالم ہیں تو میں ظالموں کی امداد کیوں کر رہا ہوں۔

مفاخرت و عصبیت پر احادیث:

اب جن احادیث کو ذکر کیا جا رہا ہے ان کا مختصر مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے حسب و نسب پر اس وقت فخر کرے

جب وہ نیک اور بہتر ہوں۔اسی طرح عصبیت کا ساتھ اس وقت دے جب وہ حق پر ہوں۔ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے۔

❁ عن ابی هريرة قال سئل رسول الله ﷺ ای الناس اکرم قال اکرمهم عند الله اتقاهم قالوا ليس عن هذا نسألک قال فاکرم الناس يوسف نبی الله ابن نبی الله ابن نبی الله ابن خليل الله قالوا ليس عن هذا نسألک قال فعن معادن العرب تسألونی قالوا نعم قال فخيارکم فی الجاهلية خيارکم فی الاسلام اذافقهوا" (بخاری و مسلم، مشکوة باب المفاخرة والعصبية)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں سے کون شخص مکرم ہے؟ آپ نے فرمایا ان میں سے مکرم (معظم واشرف) اللہ کے ہاں وہ شخص ہے جو ان میں سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے۔انہوں نے کہا ہم آپ ﷺ سے یہ سوال نہیں کرر ہے، آپ نے فرمایا کہ لوگوں میں سے مکرم اللہ کے نبی یوسف ہیں جو اللہ کے نبی کے بیٹے ہیں، وہ (ان کے باپ) اللہ کے نبی کے بیٹے ہیں وہ (ان کے دادا) اللہ کے خلیل کے بیٹے ہیں، انہوں عرض کیا ہم آپ سے یہ سوال نہیں کرر ہے، آپ نے فرمایا تم مجھ سے عرب قبائل کے متعلق سوال کرر ہے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں (یا رسول اللہ ﷺ) آپ نے فرمایا تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب انہوں نے علم شریعت کو حاصل کیا۔

وضاحت حدیث: سبحان اللہ ! رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ کا کیا خوب انداز تھا کہ صحابہ کرام نے جب یہ پوچھا کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے، تو آپ نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ سوال کیا کرر ہے ہیں، بغیر کسی تبصرہ کے جواب دیا کہ اللہ کے ہاں مکرم تو وہ ہے جو ان لوگوں میں سے تقوی زیادہ رکھے یعنی اصل عظمت یہ ہے کہ انسان کے اپنے اعمال درست اور اعلی ہوں۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا ہم تو یہ سوال نہیں کرر ہے، یعنی ہم تو کچھ اور پوچھ رہے ہیں۔تو رسول اللہ ﷺ نے پھر بغیر کسی تبصرہ کے دوسرا جواب دے کر بڑے پیارے انداز میں یہ سمجھا دیا کہ دوسرا درجہ عظمت و شرافت کا یہ ہے کہ انسان میں کمال ہو اور اسے حسب ونسب میں بھی کمال ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں لوگوں سے مکرم یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ کے نبی ہیں اور اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اللہ کے نبی اسحاق علیہ السلام کے پوتے اور اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پرپوتے ہیں۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم یہ سوال نہیں کرر ہے تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا اچھا تم ہی بتاؤ کیا سوال کرر ہے ہو؟ یہ بھی نہیں فرمایا تم صاف بات کیوں نہیں کرتے بلکہ آپ نے فرمایا کہ ہاں اب تیسرا درجہ تمہا

رے سوال کے جواب کا یہ ہے کہ تم سوال عرب قبائل کے متعلق کر رہے ہو کہ جو عرب قبائل میں سے مکرم کون ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب قبائل میں جو بہتر تھے زمانہ جاہلیت میں وہ بہتر ہیں زمانہ اسلام میں بھی بشرطیکہ انہوں نے دین اسلام کا علم حاصل کیا ہو، گویا کہ نبی کریم ﷺ نے بتادیا کہ سوال اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا جو پہلا جواب دیا، پھر دوسرا درجہ یہ ہے کہ سوال اس کے مطابق ہو جو دوسرا جواب دیا گیا، تمہارا سوال تو تیسرے درجہ کا ہے یہی وجہ ہے کہ تیسرا جواب سب سے آخر میں دیا جارہا ہے۔ (راقم)

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی شرح حدیث دیکھئے:

" ای الناس اکرم ای من بین انواعھم او اوصافھم اشرف واعظم" صحابہ کرام کا یہ پوچھنا کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے؟ اس کا مطلب لوگوں کی انواع میں سے کون سی قسم کے لوگ اشرف ہیں یعنی کن کو عظمت حاصل ہے یا ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی صفات میں سے کون سی صفات اشرف و اعظم ہیں۔

قال طیبی رحمہ اللہ یحتمل ان یرادبہ اکرم عند اللہ تعالی مطلقا من غیر نظر الی النسب ولو کان عبدا حبشیا وان یراد بہ الحسب مع النسب وان یراد بہ الحسب فحسب "

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحابہ اکرام کا سوال ہی اس انداز کا تھا کہ اس میں تینوں احتمال پائے گئے تھے ایک احتمال یہ تھا کہ وہ حسب ونسب سے قطع نظر مطلقا سوال کر رہے تھے کہ لوگوں میں سے مکرم کون ہے؟ خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو، رنگ ونسل، ذات پات کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ ان کے سوال میں دوسرا احتمال یہ تھا کہ حسب ونسب میں دوسرے لوگوں سے افضل کون ہے؟ اور صحابہ کرام کے سوال میں تیسرا احتمال یہ تھا کہ صرف حسب یعنی خاندانی شرافت کے لحاظ سے کون مکرم و معظم ہے؟

" لما اطلقوا السؤال وکان المناسب صرفہ علیہ الصلوۃ والسلام الی الفرد الاکمل والوصف لا فضل"

جب انہوں نے مطلق سوال کیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے مناسب یہی سمجھا کہ وہ جواب دیا جائے جس سے کسی فرد کے کامل ترین ہونے کا پتہ چل جائے اور اس کے اوصاف کے افضل ہونے کا علم حاصل ہو جائے۔

" قال اکرمھم عند اللہ اتقاھم" آپ نے فرمایا ان میں سے مکرم اللہ کے ہاں وہ ہے جو ان سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے، آپ نے اللہ تعالی کے ارشاد گرامی سے اقتباس حاصل کیا ہے، وہ ارشاد گرامی یہ ہے: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ بیشک تم میں سے اللہ کے ہاں مکرم وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقوی رکھنے والا ہے، یہ ارشاد ہی اس ارشاد

کے بعد ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (الحجرات آیہ نمبر ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو۔

آیۃ کریمہ میں (لِتَعَارَفُوْا) سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ " ان معرفة الا نساب انما هو للتعارف بالوصلة " بیشک انساب کی معرفت ذریعہ ہے تعلقات کے جوڑنے کا۔ آگے آنے والے الفاظ مبارکہ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ سے واضح ہوگیا کہ " وان الكرم لا يكون الا با لتقوى لا ن العاقبة للمتقين والعبرة بما فى العقبى " بیشک کرم بغیر تقوی کے حاصل نہیں ہوتا، اس لئے کہ اچھی عاقبت پرہیزگاروں کیلئے ہی ہے۔ اور عظمت و کرم کی دارو مدار اخروی فضل و کرم پر ہی موقوف ہے۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم یہ سوال نہیں کر رہے تو نبی کریم ﷺ نے حسب و نسب کے اجتماعی کمال کو بیان کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو مکرم بیان فرمایا کیونکہ

"فقد اجتمع شرف النبوه والعلم و كرم الاباء والعدل والرياسة فى الدنيا والدين فى يوسف علیہ السلام"

یوسف علیہ السلام کو نبوت کی شرافت، علم کا کمال، آباؤ اجداد کا کرم، عدل اور دین و دنیا کی ریاست حاصل تھی۔

جب صحابہ کرام نے عرض کیا ہم یہ سوال نہیں کر رہے تو آپ نے فرمایا، اچھا تم قبائل عرب کے متعلق سوال کے رہے ہو، انہوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ ﷺ ہم یہی سوال کر رہے ہیں، یعنی وہ جن آباء و اجداد کی طرف منسوب تھے ان کے متعلق سوال کر رہے تھے کہ ان میں سے مکرم کون ہے؟

"وكان جوابهم فسلك على الطف وجه حيث جمع بين الحسب والنسب وقال اذافقهوا"

صحابہ کرام کا سوال صرف نسب کے متعلق تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے بہت پیارے انداز پر حسب و نسب کو جمع فرما کر جواب دیا، جس پر آپ کے ارشاد گرامی میں "اذافقهوا" کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

"(اذافقهوا) (بضم القاف ويكسر) اى اذا علموا آداب الشريعة واحكام الاسلام بعد دخولهم فيه"

حدیث پاک میں جو لفظ " اذافقهوا " استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے جو انہوں نے آداب شریعت سیکھ لئے اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد احکام اسلام کا علم حاصل کر لیا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں حسب و نسب میں بہتر شمار ہوتے تھے جب وہ اسلام میں داخل ہو کر بھی بہتر رہے یعنی علم دین حاصل کیا اور اس کے مطابق عمل کیا تو یقیناً ان کو شرافت اور عظمت

حاصل ہوئی وہی لوگوں میں بہتر ہیں۔

"واما من زادفی الفقه فهو اعلی ومن لم یفقه فهو فی مرتبة الا دنی والمراد بالفقه هو العلم المقرون بالعمل وهو حاصل التقوی"

جس شخص کو دین میں زیادہ علم حاصل ہوگا وہ اعلیٰ مرتبہ رکھے گا، جسے علم دین نہیں حاصل ہوگا وہ گھٹیا مرتبہ رکھے گا، وہ علم دین تقوی کا ذریعہ بنے گا جس میں اس کے مطابق عمل بھی پایا جائے گا۔

تنبیہ: یہ بات بھی واضح ہے کہ جسے تقوی حاصل ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہوگا، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کررہا ہے، ﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ﴾ لیکن اپنی بزرگی اور اپنے تقوی کے قصیدے پڑھنا بھی منع ہے، اظہار عجز ہی بہتر ہے رب تعالیٰ کا خوف دامن گیر ہونا ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴾ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرو وہ زیادہ جانتا ہے اسے جو زیادہ تقوی رکھنے والا ہے۔

مکرم ہونے کا کیا مطلب ہے ؟

تقریباً واضح کر دیا گیا ہے کہ مکرم ہونے کا مطلب اشرف ہونا اور دوسروں سے زیادہ عظمت حاصل ہونا۔ تاہم علامہ نووی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت فرمائی ہے:

"ان اصل الکرم کثرة الخیر ومن کان متقیا کان کثیر الخیر و کثیر الفائدة فی الدنیا وصاحب الدرجا ت العلی فی الاخری"

بیشک اصل کرم کثرت خیر ہے، اور جو شخص متقی ہوگا اسے کثیر خیر حاصل ہوگا، اور دنیا میں اسکے بہت فائدے لوگوں کو حاصل ہوں گے، اسکی وجہ سے دین کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوگا، اور آخرت میں اس کے مدارج بلند ہوں گے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۷۸، ۱۷۹)

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراهیم" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم ہیں۔

اس حدیث شریف میں بھی یوسف علیہ السلام کی فضیلت بیان فرمائی کہ وہ خود بھی نبوت وعلم جیسے کمال سے مشرف تھے، اور ان کے آباء واجداد بھی کرم اور عدل جیسے رفیع الشان فضائل سے مشرف تھے اور یوسف علیہ السلام کو دین ودنیا

کی ریاست حاصل تھی، ساتھ ساتھ حدیث پاک سے یہ مسئلہ بھی واضح ہورہا ہے کہ آباءواجداد پر اسی وقت فخر کیا جائے جب ان میں دینی شرافت پائی جائے دینی شرافت سے خالی نسب کی تعریف کا کوئی فائدہ نہیں۔

❁ ''وعن البراء بن عازب قال فی یوم حنین کان ابوسفیان بن الحارث آخذا بعنان بغلة رسول اللهﷺ فلما غشیه المشرکون نزل فجعل یقول انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب قال فما رؤی من الناس اشد منه'' (رواه البخاری ومسلم، مشکوۃ باب المفاخرة والعصبیة)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حنین کے دن ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خچر کی رسی کو پکڑا ہوا تھا، جب آپ کو کفار نے گھیرے میں لے لیا تو آپ اتر آئے اور فرمارہے تھے بیشک میں نبی ہوں کوئی جھوٹ کی بات نہیں، میں ابن عبدالمطلب ہوں، براء کہتے ہیں کہ اس دن نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر کوئی بہادر معلوم نہ ہوسکا۔

وضاحت حدیث: راوی براء اور ان کے باپ عازب دونوں ہی جلیل القدر صحابی ہیں۔ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے چچا حارث ابن عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور یہ رسول اللہ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی ہیں کیونکہ ان کو بھی حضرت حلیمہ بنت ابی ذویب السعد یہ نے دودھ پلایا ہے ابوسفیان شاعر بھی تھے، اسلام لانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی شعروں میں ہجو کرتے تھے (اشعار میں کسی کی مذمت بیان کرنا ہجو کہلاتا ہے) اور اس کا جواب حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اپنے اشعار میں دیا بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا، پھر اسلام پر اچھی طرح قائم رہے۔

'' ویقال انه ما رفع راسه الی رسول اللهﷺ حیاء منه ''

بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سر اٹھا کر کبھی نہیں دیکھا کیونکہ ان کو رسول اللہ ﷺ سے حیاء آتی تھی وجہ اس کی واضح ہے کہ یہ آپ کی اشعار میں ھجو کیا کرتے تھے، انہوں نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ تم نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوکر وہی عرض کرو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے سامنے عرض کرتے ہوئے یوں کہا۔﴿لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخَاطِئِيْنَ﴾ ''بولے خدا کی قسم بیشک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بیشک ہم خطاوار تھے۔''

جب ابوسفیان نے یہ عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی وہ جواب دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیا تھا۔

﴿قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (سورۃ یوسف، آیۃ نمبر ۹۲)

''کہا آج تم پر کچھ ملامت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے اور سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔''

ان کی وفات کا سبب یہ بنا کہ یہ حج کرنے کیلئے گئے وہاں سر منڈانے پر حجام کے استرہ سے آپ کی رگ کٹ

گئی جس کی وجہ سے آپ بیمار رہے اور ستائیس ہجری میں آپ کا وصال ہو گیا اور عقیل بن ابی طالب کے دار میں دفن ہوئے۔ حضرت عمر ﷺ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث ﷺ نبی کریم ﷺ کی خچر کی باگ پکڑے ہوئے تھے۔ "فلما غشیه المشرکون" ای اتوه من جمیع جوانبه" تو جب کافروں نے آپ کو ڈھانپ لیا یعنی تمام جانبوں سے آگئے، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا تو آپ خچر سے نیچے اتر آئے، اور آپ ارشاد فرمارہے تھے۔

"انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب" میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔

نبی کریم ﷺ نے بظاہر یہ اپنی تعریف کی حالانکہ آپ نے لوگوں کو اپنی تعریف کرنے سے منع بھی کیا، تو آپ نے خود اپنی تعریف کیسے کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے؟

"وقد نفی نبی الله ﷺ عن نفسه ان یذکر الفضائل التی خصه بها فخرا بل شکرا لا نعمه فقال انا سید ولد آدم ولا فخر"

کہ نبی کریم ﷺ نے جو منع فرمایا ہے اس کا تعلق اپنے کمالات فخریہ طور پر بیان کرنے سے ہے۔ بطور شکر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرنا جائز ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا، میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے کوئی فخر نہیں۔

اسی طرح حنین میں بھی آپ نے اپنے کمالات کو بیان کیا۔ پھر خاص کر کے (وقد رخص النبی ﷺ الخیلاء فی الحرب مع نهیه عنها فی غیرها) نبی کریم ﷺ نے کفار کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے فخریہ انداز پر اپنے کمالات بیان کرنے کی بھی اجازت عطاء فرمائی ہے، مگر اس کے بغیر عام حالات میں اپنے کمالات صرف اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے جائز ہیں یا کوئی شخص کسی کے منصب کو نہ جانتا ہو تو یہ اپنی پہچان کرانے کیلئے اپنے کمالات بیان کرے تو یہ بھی جائز ہے یہی وجہ ہے کہ خیبر کے میدان میں مرحب کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بہادری کا تذکرہ یوں کیا۔

"انا الذی سمتنی امی حیدره" بیشک میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام، حیدر، (شیر) رکھا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی حنین میں اپنی بہادری کا تذکرہ کیا تا کہ مسلمانوں کو بھی بہادری اور کفار پر دبدبہ حاصل ہو، اور کفار کو

جوش دلانا بھی مقصود تھا کہ تم اپنی بہادری کے کارنامے اور بھی دکھاؤ لیکن تمہارے مقابلہ میں اللہ کا نبی ہے، اللہ کے نبی میدان جنگ میں جم کر رہتے ہیں بھاگا نہیں کرتے۔ حاصل کلام یہ ہے:

"ان المفاخرة نوعان مذمومة ومحمودة فالمذموم منها ما كان عليها الجاهلية من الفخر بالآء والانساب للسمعة والرياء والمحمود منها ما ضم من النسب الحسب في الدين لا رياء بل اظهار لأنعمه تعالى"

اپنے کمالات بیان کرنے کی دو قسمیں ہیں، مذموم اور محمود۔ مذموم (برا طریقہ) یہ ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کے کمالات اور اپنے نسب کی تعریف لوگوں میں اپنا چرچا کرنے کیلئے اور دکھلاوے کیلئے ہو اور صرف فخر کرنا مقصود ہو۔ محمود (اچھا طریقہ) یہ ہے کہ نسب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دینی حسب بھی بیان کرے اور اس میں ریاء مقصود نہ ہو بلکہ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہو یا اپنی پہچان کرانا مقصود ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے "لا فخر" کہہ کر واضح کر دیا کہ فخر اور تکبر منع ہے کیونکہ آپ نے اپنی پہچان کرانے اور رب تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کیلئے فرمایا۔ "انا سيد ولد آدم يوم القيامة لا فخر" قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں یعنی میں فخر اور تکبر کے طور پر یہ نہیں کہہ رہا، فخر کرنا اور تکبر کرنا منع ہے۔ پھر برا طریقہ صرف نسب بیان کرنا اور اچھا طریقہ حسب ونسب دونوں چیزوں کو بیان کرنا یعنی جہاں خاندانی منصب کو بیان کرے وہاں دینی منصب کو بھی بیان کیا جائے۔

اسی کو نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد سے واضح کر دیا کہ "خياركم في الجاهلية خياركم في الاسلام اذا فقهوا" زمانہ جاہلیت میں جو تم میں بہتر لوگ تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب وہ دین اسلام حاصل کر لیں، نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کی طرف منسوب کیا ہے، اپنے باپ حضرت عبداللہ کی طرف کیوں منسوب نہیں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں اپنی پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ اپنی بہادری بیان کرنا بھی مقصود تھا وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی تھی جب آپ اپنے دادا کا ذکر کرتے کیونکہ ان کی بہادری کے کارنامے مشہور و معروف تھے لیکن آپ کے والد حضرت عبداللہ عین جوانی میں فوت ہو گئے تھے جنگوں میں شریک ہونے کا ان کو موقع نہیں مل سکا تھا اس لئے ان کی بہادری کے کارنامے مشہور نہیں تھے۔

" (فما رؤی) بصيغة المجهول اي ما عرف (من الناس) اي احدمنهم (يومئذ اشد منه) اي اقوى واشجع من النبي ﷺ "

حدیث شریف کے آخری الفاظ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ، اس دن لوگوں میں سے کوئی ایک کو بھی نبی کریم ﷺ سے

زیادہ طاقت ور اور زیادہ مضبوط اور زیادہ بہادر نہیں معلوم ہو سکا، آپ کی بہادری آپ کے خچر پر سوار ہونے سے بھی واضح ہو رہی تھی کہ میدان جنگ میں آپ تیز رفتار گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ خچر پر سوار تھے جو سست رفتار سواری ہے۔ پھر جب کفار نے آپ کو گھیرے میں لیا تو آپ سواری سے نیچے تشریف لے آئے جو آپ کی بہادری کی عظیم ترین مثال ہے، کہاں سواری پر رہنا اور کہاں سواری سے نیچے اتر کر مقابلہ کیلئے بلانا۔ پھر اتنے خوف کے مقام میں آپ اپنا منصب بیان کر رہے ہیں، آپ کو کفار کے گھیرا ڈالنے کی کوئی فکر نہیں، یہ کام بہادر شخص کا ہی ہو سکتا ہے ورنہ عام انسان تو ڈر کے مارے بات بھی نہیں کر سکتا۔

"وما ذاک الالقوۃ قلبه و توکله علی ربه و اعتماده علی عصمته بمقتضی وعده حیث قال تعالی واللہ یعصمک من الناس وبموجب حکمه حیث قال ھو الذی ارسل رسوله بالھدی ودین الحق لیظھره علی الدین کله"

نبی کریم ﷺ کی اتنی بڑی بہادری اسی وجہ سے تھی کہ آپ مضبوط دل والے تھے، اور آپ کو رب تعالی پر توکل حاصل تھی اور آپ کو اللہ کے وعدہ پر کامل اعتماد تھا کہ اللہ تعالی مجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا، وہ اللہ تعالی کا وعدہ یہ تھا ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ اور اللہ بچائے گا آپ کو لوگوں سے، اور اسی طرح آپ اپنی بہادری کی وجہ سے عین جنگ کے دوران بلکہ گھیرے میں آنے کے باوجود اللہ تعالی کے حکم کے مطابق بڑے اعتماد میں تھے، کیونکہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ص۱۷۹ تا ۱۸۱)

❁ **"عن انس قال جاء رجل الی النبی ﷺ فقال یا خیر البریة فقال رسول اللہ ﷺ ذاک ابراھیم"**

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہا اے تمام مخلوق سے بہتر تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (رواہ مسلم، مشکوۃ باب العصبیۃ والمفاخرۃ)

وضاحت حدیث:

"برأ یبرأ" کا معنی ہے پیدا کرنا "بریة" یاء کی شد سے بھی استعمال ہے، اور "بریئة" یاء ساکن اور ہمزہ سے بھی استعمال ہے۔ فعیل بمعنی مفعول کے اس لئے "بریة" کا معنی ہے مخلوق۔

اعتراض: جب نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے بہتر ہیں، جس میں انبیاء کرام بھی داخل ہیں کہ آپ سید الانبیاء اور خیر

الانبیا بھی ہیں، تو آپ نے "یا خیر البریة" کہنے کے جواب میں "ذاك ابراهيم" (وہ تو ابراہیم ہیں) کیوں کہا۔

جواب اول: "احدها انه قال هذا توا ضعا واحتراما لا براهيم لخلته وابوته والا فنبينا ﷺ كماقال ﷺ انا سيد ولد آدم ولا فخر"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس کے چند جواب ذکر فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد رب تعالی کے حضور عاجزی کا اظہار کرنے کیلئے اور ابراہیم علیہ السلام جو اللہ تعالی کے خلیل ہیں اور آپ کے آباؤ اجداد سے ہیں ان کے احترام کے پیش نظر تھا، ورنہ ہمارے نبی کریم ﷺ سب سے افضل ہیں جس پر آپ کا اپنا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے کہ میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں جس پر مجھے کوئی فخر نہیں، جب آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے جن میں انبیاء کرام بھی ہیں تو آپ کو فرشتوں پر اور باقی تمام مخلوق پر بھی فضیلت حاصل ہے، لھذا آپ افضل الخلق ہیں۔

جواب دوم: " انه قال هذا قبل ان يعلم انه سيد ولد آدم فان الفضائل يمنحها الله تعالى لمن يشاء فاخبر بفضيلة ابراهيم عليه السلام الى ان علم تفضيل نفسه فاخبر به "

دوسرا جواب ان میں سے یہ ہے کہ یہ کلام نبی کریم ﷺ کا "انا سيد ولد آدم ولا فخر" سے پہلے کا ہو کہ آپ کو بعد میں اپنی فضیلت کا علم حاصل ہوا ہو (کیونکہ محققین علما کرام کا یہی مذہب ہے کہ آپ کو تدریجا آہستہ آہستہ تمام لوح محفوظ کا علم عطا کر دیا گیا تھا آپ کے وصال کے وقت تک لوح محفوظ کا تمام علم آپ کو عطاء کر دیا گیا تھا) (صاوی)

کیونکہ اللہ تعالی جب چاہے اور جسے چاہے فضائل سے نواز دے اللہ تعالی نے پہلے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل کی خبر دی، پھر آپ کو اپنے فضائل کی خبر دی یہی وجہ ہے پہلے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل بیان فرمائے پھر اپنے فضائل بیان فرمائے تاہم یہ جواب حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا:

"قلت وفيه انه يحتاج الى معرفة تاريخ ليدفع التعارض به"

میں کہتا ہوں یہ جواب اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب دونوں حدیثوں کی تاریخوں کا علم ہو کہ دونوں کے درمیان تعارض کو اٹھایا جائے جب تاریخوں کا علم نہ ہو تو یہ جواب قوی نہیں ہوگا۔

جواب سوم: " ولثالثها ان المراد به انه افضل برية عصره فاطلق العبارة الموهومة للعموم لانه ابلغ فى التواضع " ان جوابات میں سے تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اپنے زمانہ میں " خیر البریة تمام مخلوق سے بہتر تھے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے

آئے تو سب سے زیادہ افضلیت آپ کو حاصل ہوگئی۔ آپ کو فضیلت سب اگلے اور پچھلے لوگوں پر عطاء کر دی گئی لیکن آپ نے کامل عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے مطلقاً "خیر البریة" کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی یہ نہیں فرمایا "ذاك ابراهيم فی زمانه" کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ میں تمام مخلوق سے بہتر تھے۔ نبی کریم ﷺ کی افضلیت قطعی طور پر ثابت ہے اور اس پر اجماع امت ہے۔ تفصیلی بیان اسی تیسرے پارہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے، تاہم دو تین حدیثیں مرقات میں زیر بحث حدیث کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں جن کا اعادہ ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

❁ "انا سيد ولد آدم يوم القيامة واول من ينشق عنه القبر واول شافع واول مشفع" (رواہ ابوداود ومسلم)

میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن، سب سے پہلے قبر سے باہر آپ ہی تشریف لائیں گے سب سے پہلے آپ ہی شفاعت فرمائیں گے اور سب سے پہلے آپ کی شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا۔

❁ "عن ابی سعيد قال رسول ﷺ انا سيد ولد آدم يوم القيامة ولا فخر وبيدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی يومئذ آدم فمن سواه الا تحت لوائی وانا اول من تنشق عنه الارض ولا فخر وانا اول شافع واول مشفع ولا فخر" (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجة)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمام اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ اور میرے ہی ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا یہ کوئی فخر کی بات نہیں، کوئی نبی بھی اس دن نہیں ہوں گا آدم ہو یا ان کے علاوہ سب ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، سب سے پہلے میرے لئے ہی زمین پھٹے گی (یعنی قبر سے سب سے پہلے باہر میں ہی آؤں گا) یہ کوئی فخر کی بات نہیں سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت کو قبول کیا جائے گا یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔

❁ "عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ انا اول من تنشق عنه الارض فاكسی حلة من حلل الجنة ثم اقوم عن يمين العرش ليس احد من الخلائق يقوم ذلك المقام غيری" (رواہ الترمذی)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے پہلے زمین میرے لئے ہی پھٹے گی تو مجھے جنتی جوڑوں میں سے ایک جوڑا پہنایا جائے گا، پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا، تمام مخلوق میں سے کوئی ایک بھی میرے علاوہ اس مقام پر کھڑا نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۱)

❁ "عن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تطرونی كما أطرت النصارى ابن مريم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب المفاخرة والعصبية)

حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میری مدح میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاری نے ابن مریم (عیسی علیہ السلام) کی مدح میں مبالغہ کیا ہے، بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں تم (بھی مجھے) کہو اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول۔

وضاحت حدیث:

بعض نصاری نے عیسی علیہ السلام کو مستقل طور پر خدا کہا، اور بعض نے عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور بعض نے تین خداؤں میں سے ایک کہا، یہ تھا ان کی تعریف میں مبالغہ۔

"(لاتطرونی) (بضم اولہ) واصلہ لا تطرونی من الا طراء وھو المبالغہ والغلوفی الثناء"

یعنی رسول اللہ کے ارشاد میں (لاتطرونی) کا جولفظ استعمال ہوا ہے وہ باب افعال یعنی "اطراء" سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہوتا ہے تعریف میں مبالغہ کرنا اور غلو کرنا اب معنی یہ ہوگا کہ تم میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو۔

" (کما اطرت النصاری ابن مریم) ای مثل اطرائھم ایا ہ،مفھومہ ان اطرائہ من غیر جنس اطرائھم جائز"

جیسا کہ نصاری نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا، نبی کریم ﷺ نے اپنی تعریف میں اس طرح مبالغہ کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ عیسائیوں نے عیسی علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا تھا، لھذا رسول اللہ ﷺ کو معاذ اللہ مستقل خدا ماننا، خدا کا بیٹا ماننا، خدا کا شریک ماننا جائز نہیں ہوگا، لیکن اس کے بغیر آپ کی جتنی تعریف کریں وہ جائز ہے۔

قصیدہ بردہ شریف میں کیا خوب بیان کیا گیا۔

" دع ما ادعتہ النصاری فی نبیھم　　　واحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم"

وہ تعریف چھوڑ دے جو نصاری نے اپنی نبی کی اور جتنی تعریف کرنا چاہتا ہے اتنی ہی تعریف کر۔

"وفی شرح السنۃ وذلک ان النصاری افرطوافی مدح عیسی علیہ السلام واطرائہ بالباطل وجعلوہ ولدا للہ تعالی فمنعھم النبی ﷺ ان یطروہ بالباطل"

شرح السنۃ میں بھی یہی وضاحت کی گئی ہے کہ نصرانیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا تھا اور وہ مبالغہ باطل اور غلط تھا کہ انہوں نے عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا تھا، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعریف میں غلط اور باطل طور پر مبالغہ سے منع فرمایا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عیسی علیہ السلام کی مدح جو نصرانیوں نے کی ایسی مدح سے منع فرمایا کہ اس طرح کی مدح کوئی شخص میری نہ کرے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نصاری نے تعریف میں اتنا زیادہ مبالغہ کیا اور جھوٹی تعریف یہاں تک کر ڈالی کہ عیسی علیہ السلام کو خدا کہا اور کچھ نے خدا کا بیٹا کہا، ان کو یہ بھی سمجھ نہ آسکی کہ عیسی

علیہ السلام تو حضرت مریم کے بیٹے ہیں جو ایک عورت ہے، جسے حیض بھی آتا ہے، مطلقا کسی کی اولاد کا معبود بننا جائز نہیں، کیونکہ اولاد اپنے ماں، باپ کی محتاج ہوتی ہے، جو محتاج ہو وہ خدا نہیں بن سکتا۔

" ولکون الیهود بالغوا فی قدح المسیح والنصاری فی مدحه قال الله تعالی ﴿ یٰاَهْلَ الْکِتٰبِ لَاتَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ ﴾

چونکہ یہودیوں نے عیسی علیہ السلام پر عیب لگانے (آپ کی شان میں گستاخی کرنے) میں مبالغہ کیا اور نصاری نے آپ کی باطل تعریف میں مبالغہ کیا تو رب تعالی نے فرمایا اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو (زیادتی) نہ کرو۔

"فالحق هو الوسط العدل" حق درمیانی راہ کا نام ہے جو عدل وانصاف پر قائم ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالی نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ "سوائے اس کے نہیں کہ مسیح عیسی ابن مریم اللہ کے رسول ہیں" عیسی علیہ السلام کو مریم کا بیٹا بتا کر ہی واضح کر دیا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اللہ نہیں، مخلوق ہے خالق نہیں، پھر اللہ کا رسول کہہ کر واضح کر دیا کہ اللہ کے رسول اللہ کے عبادت گزار ہوتے ہیں خود معبود نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾ "وہ دونوں طعام کھاتے تھے" یعنی حضرت مریم اور عیسی علیہ السلام معبود نہیں کیونکہ وہ طعام کھاتے تھے، جو طعام کھائے وہ پیشاب، یا پاخانہ کا بھی محتاج ہوتا ہے۔

"فلایصلحان للالوهیة ولا مناسبة لهما لربوبیة وانما شانهما العبودیة"

لھذا وہ دونوں ماں، بیٹا الہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان دونوں کی شان کے لائق ہے کہ وہ رب بن سکیں، بس ان کی شان یہی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور اسی کے عبادت گزار ہیں۔

(فانما انا عبده) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو اللہ کا عبد ہی ہوں، " ای الخاص فی مقام الاختصاص" یعنی مقام اختصاص میں، میں اللہ کا خاص بندہ ہوں۔ "وهو فی الحقیقة افضل مدح عند الفاضل الکامل" اللہ کا خاص بندہ ہونا، کامل فضیلت رکھنے والوں کے ہاں یہ کامل مدح ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ کے معراج کو بیان کرتے ہوئے آپ کی صفت عبودیت کا ہی ذکر فرمایا ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ﴾ اور آپ پر قرآن نازل کرنے کے ذکر پر بھی آپ کی یہی کامل صفت "عبودیت" کا ہی ذکر فرمایا، ﴿ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ ﴾ اور ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ ﴾ فقولوا عبدالله ورسوله"

تم کہو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول، یعنی تم مجھے اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول کہہ کر پکارو۔

سب سے امتیازی شان میری ان الفاظ میں ہی ہے "وفی ذکرهما ایضا ایماء الی مبداء حالته

ومنتھی غایتہ" نبی کریم ﷺ نے اپنے دو وصف "عبودیت" اور "رسالت" ذکر فرما کر اپنی ابتداء اور انتہاء کو بھی بیان فرمادیا۔ کیونکہ " ان العنایۃ الربوبیۃ باعتبار غایۃ العبودیۃ" جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا زیادہ عبادت گزار ہوتا۔ رب تعالیٰ کی اس پر اتنی ہی زیادہ مہربانیاں ہوتی ہیں، یعنی مقام ابتداء عبودیت ہے اور مقام انتہاء رسالت ہے، اس سے اوپر الوہیت ہے جو کسی انسان کو حاصل نہیں، عبودیت افضل ہے، اسی وجہ سے جب کسی کو کہا جائے "یا عبد اللہ" (اے اللہ کے بندے) تو نیک انسان کو جتنا سروران الفاظ سے آتا ہے اتنا کسی اور وصف سے نہیں آتا، کیونکہ یہ قلبی راحت کا ذریعہ ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا:

لا تدعنی الا بیا عبدہ فانہ افضل اسمائیا

مجھے "اسکا بندہ" کے بغیر کسی اور نام سے نہ پکارو بیشک سب ناموں سے یہی میرا نام افضل ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۲)

فائدہ جلیلہ : "ان العبودیۃ اجل صفاتہ ﷺ واشرفھا وذلک لان اشرف ما سوی العبودیۃ من صفاتہ ﷺ وھی الرسالۃ وعبودیۃ الرسول لکونھا انصرافا من الخلق الی الحق اجل واشرف من رسالتہ لکونھا بالعکس فانھا انصراف من الحق الی الخق لتبلیغ احکام المرسل"

رسول اللہ ﷺ کی صفات میں سے عبودیت آپ کی اعلیٰ اور اجل صفت ہے، کیونکہ عبودیت کے بغیر اور کوئی اعلیٰ صفت ہو سکتی ہے تو وہ رسالت ہے، لیکن نبی کی عبودیت اس کی رسالت سے افضل واشرف ہے کیونکہ عبودیت میں مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالق کی طرف کامل توجہ کی جاتی ہے۔ یہ مرتبہ اس لئے اعلیٰ ہے کہ رسالت میں اسکا معاملہ بالعکس (الٹ) ہے، یعنی رسالت میں مخلوق کی طرف زیادہ توجہ کرنی پڑتی ہے اسلئے کہ رب تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا رسول کی اہم ذمہ داری ہے۔

" ولیس المعنی ان عبودیۃ غیر الرسول افضل من الرسالۃ فانہ لم یقل بہ احد "
کوئی یہ مطلب نہ سمجھ بیٹھے کہ عام انسان جو رسول نہیں اس کی عبودیت بھی رسالت سے افضل ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (شیخ زادہ ص۳ ج اول)

میرے عزیز **طلباء کرام**! یہ نازک مقام ہے اللہ کے نبی کو " **عبدہ** " سے اپنے جیسا بندہ سمجھنے سے بھی ایمان کا جنازہ نکل جائے گا اور غیر رسول کی عبودیت کو رسولت سے افضل ماننا بھی ایمان کو تباہ و برباد کر دے گا۔ (راقم)

❁ عن ابی ھریرہ عن النبیاقال لینتھین اقوام یفتخرون بابائھم الذین ماتوا انما ھم فحم من جھنم او لیکونن اھون علی اللہ من الجعل الذی ید ھدہ الخراء بانفہ ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وفخر ھا بالآ باء انما ھو مو من تقی او فاجر شقی

الناس کلھم بنو آدم و آم من تراب'' (رواہ الترمذی وابوداؤد مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور رک جائیں قومیں اپنے آباواجداد پر فخر کرنے سے جو مر چکے ہیں، بیشک وہ جہنم کا کوئلہ ہیں یا اللہ کے ہاں وہ اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر ہوں گے جو اپنے ناک سے گندگی لڑھکاتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جاہلیت کے فخر اور اپنے آباء کے فخر کو تم سے لے گیا (یعنی فخر کو دور کرنے کا اس نے حکم دے دیا ہے) بیشک وہ یا تو مؤمن و پرہیز گار ہوگا یا فاجر و بدبخت ہوگا، لوگ تمام کے تمام آدم ؈ کی اولاد ہیں اور آدم ؈ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

وضاحت حدیث: ''**لینتھین**'' میں لام مفتوحہ ہے، قسم مقدر کا جواب ہے۔ اصل میں عبارت کا مفہوم یہ ہوگا، ''واللہ لیمتنعن عن الافتخار'' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی قومیں ضرور بر ضرور فخر کرنے سے رک جائیں، جو لوگ مر چکے تھے ان میں سے اکثریت کی موت کفر پر تھی، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے زمانہ فطرت میں فوت ہوئے ان کے آباواجداد سے بھی کئی کفر کی حالت میں مرے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ ان کے آباء جن پر یہ فخر کر رہے ہیں اور ان کے تعریفی قصیدے پڑھ رہے ہیں، وہ تو کفر کی وجہ سے جہنم کا کوئلہ ہیں۔ یا اللہ کے ہاں ناک سے گندگی کو لڑھکانے والے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے۔

''**اھون علی اللہ**'' کا معنی ہے ''اذل عند اللہ'' اللہ کے ہاں ذلیل ہوں گے ''الجعل'' کے جیم پر ضمہ (پیش) ہے، اور عین پر فتحہ (زبر) ہے۔ اسے عربی میں ''خنفساء'' بھی کہتے ہیں۔ یہ سیاہ رنگ کا کیڑا ہے جو گندگی کی گولیاں بنا کر اپنے ناک سے دھکیل کے لے جاتا ہے۔

''**یدھدہ**'' کا وزن بھی ''یدحرج'' کا ہے اور معنی بھی یدحرج والا ہی ہے، یعنی لڑھکانا۔ ''الخرا'' خاء پر فتحہ (زبر) ہے اور راء مقصورہ ہے، اس کا معنی ہے گندگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فخر کرنے والوں کو سیاہ کیڑے سے تشبیہ دی اور ان کے کفار آباء کو گندگی سے اور فخر کو گندگی لڑھکانے سے۔ یعنی اس جملہ کے معنی میں دو احتمال ہو گئے ایک یہ کہ تم اپنے آباء پر فخر کرنا چھوڑ دو وہ تو اپنے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں گندگی کو اپنے ناک سے دھکیلنے، لڑھکانے والے سیاہ کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے اور دوسرے معنی کا احتمال اس طرح ہے کہ قوموں کو چاہیے کہ وہ اپنے کفار آباء پر فخر کرنا چھوڑ دیں وہ تو اللہ کے ہاں نجس (گندگی، ناپاکی) ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ ''بیشک مشرک نجس ہیں''۔ نجس پر فخر کرنے والے اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے جو گندگی کو لڑھکاتا ہے یعنی اپنے کفار آباء پر فخر کر کے گندگی

لڑھکانے والے کیڑے سے زیادہ ذلیل نہ ہو۔ تاہم پہلا معنی لینا زیادہ قوی اور صحیح قول وہی ہے کیونکہ عبادت کا مابعد اور ماقبل اسی پہلے معنی کو زیادہ ترجیح دے رہے ہیں۔

" ان الله قد اذهب عنكم عبية الجا هلية " بیشک اللہ تعالیٰ تم سے جاہلیت کا فخر لے گیا۔

" **عبية** " بضم العين المهملةو كسرها و كسر موحدة "عین پر پیش اور زیر دونوں کا پڑھنا جائز ہے اور باء کے نیچے زیر ہے اور یاء مشدد ہے۔ اس کا معنی فخر کرنا، تکبر کرنا ایک اور احتمال اس میں یہ ہے کہ یہ ماخوذ ہو "عب ء" سے جس کا معنی ہوتا ہے "نور اور ضیاء" کہ اللہ تعالیٰ تم سے زمانہ جاہلیت کی وجہ سے تمہارے چہرے کا نور اور ضیاء دور کر دے گا۔

"انما هو مومن تقي او فاجر شقي" ہو ضمیر کا مرجع " المفتخو " ہے یعنی فخر کرنے والا دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مؤمن پرہیز ہوگا اور مؤمن کی شان کے لائق ہی نہیں کہ وہ فخر و تکبر کرے کیونکہ "لان مدار الا يمان على الخاتمة و الله سبحا نه وتعالى اعلم بمن اتقى " ایمان کی دارومدار خاتمہ پر ہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کا خاتمہ ایمان و تقوی پر ہوگا یا فخر کرنے والا فاجر یعنی منافق و کافر اور بد بخت ہوگا۔ جب وہ نیک بخت نہیں بلکہ بد بخت ہے تو وہ اللہ کے ہاں ذلیل ہے۔

"والذليل لا ينا سبه التكبر ولا يلا ئمه التجبر" ذلیل شخص کے مناسب تکبر نہیں اور نہ ہی وہ اس قابل ہے کہ وہ اپنے آپ کو جابر بن کر دکھائے۔

"فا لتكبر لا يليق با لمخلوق فانه صفة خاصة للخا لق ولذا قال الكبريا ء ردائي و العظمة ازاري فمن ناز عني فيهما قصمته"

مخلوق کو تکبر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اپنی بڑائی بیان کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو سب کا خالق ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کبریائی (بڑائی) میری رداء ہے، اور عظمت میری ازار ہے، جس نے میرے ساتھ کبریائی اور عظمت میں جھگڑا کیا میں اس (کی گردن) کو توڑ دوں گا۔

" **ردا ء** " اوپر لپٹنے والی چادر کو کہتے ہیں اور ازار کمر سے باندھنے والی چادر کو کہتے ہیں دو چادروں سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی کبریائی اور عظمت میرے ساتھ اس طرح خاص ہیں جیسے لباس انسان کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

" **الناس كلهم بنو آدم و آدم من تراب** " اس جملہ سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فخر سے منع اس طرح فرمایا ہے کہ تم فخر کس چیز پر کر رہے ہو، تم سب ہی تو آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا

ہے تو تم اپنی اصلیت کو دیکھو کہ تمہیں مٹی سے تو اس لئے بنایا گیا کہ تم عاجزی اختیار کرو گے، مٹی کا حق تکبر کرنا نہیں۔

الناس من جهة التمثال اكفاء ابــــوهــــم آدم والام حــــواء
فان يكن لهم فى اصلهم شرف يـفـاخـرون بـــه فـا لطـين والـمـاء
ما الفخر الا لاهل العلم انهم عـلـى الهـدى لـمـن استهـدى ادلاء

لوگ سب اپنے جسموں کے لحاظ پر ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام ہیں اور سب کی ماں حضرت حواء ہیں۔ اگر ان کی اصل میں کوئی شرافت ہے، جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں تو وہ کیچڑ اور پانی ہی ہے۔ کوئی فخر نہیں کر سکتا سوائے اہل علم کے بیشک وہی ہدایت پر ہیں، جو ہدایت پر ہو وہی مقام ناز پر ہے۔

نبی کریم ﷺ کا انداز گفتگو کیا خوب ہے:

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ذرا سختی سے کلام فرما کر جھنجھوڑا ہے گویا کہ آپ کے ارشاد کا مقصد واضح ہے گویا کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ

" ما ذاک العزيز الكريم عند الله الا رجل تقى وما ذاک الذليل الدنئى عند ہ الا فاجر شقى "

اللہ کے ہاں سوائے مومن و پرہیزگار کے کوئی عزیز و کریم نہیں۔ اور اللہ کے ہاں سوائے کافر منافق بدبخت کے کوئی گھٹیا اور ذلیل نہیں۔

"ثم رجع ﷺ من ذلک العنف الى اللطف ومن التو بيخ الى اسماع الحق قائلا والناس كلهم بنو آدم"

نبی کریم ﷺ نے جھنجھوڑنے اور ذرا سخت کلام کے بعد نرمی کی طرف رجوع فرمایا اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد نرم کلام کا مقصد یہ تھا کہ جو وعید اور سختی سے باز آ گئے تو بہتر اور کچھ دوسرے نرم کلام کو سن کر سوچیں گے اور سمجھیں گے، اس طرح وہ حق کی طرف میلان کریں گے، وہ نرم کلام کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا، جس کا نتیجہ واضح ہے کہ تمہاری اصلیت مٹی ہے تم فخر کس پر کرتے ہو تمہیں تو عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۸۴)

❁ "عن مطرف بن عبد الله بن الشخير قال انطلقت فى وفد بنى عامر الى رسول الله ﷺ فقلنا انت سيد نا فقال السيد الله فقلنا وافضلنا فضلا واعظمنا طولا فقال قولوا او بعض قولكم ولا يستجرينكم الشيطان" (رواه احمد وابو داود، مشكوة باب المفاخرة والعصبية)

مطرف بن عبداللہ بن شخیر فرماتے ہیں کہ میں بنی عامر کے وفد کیساتھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلا، (جب ہم آپ کی

خدمت میں حاضر ہوئے) تو ہم نے کہا آپ ہمارے سید (سردار) ہیں تو آپ نے فرمایا سردار تو اللہ تعالیٰ ہے، تو ہم نے کہا آپ ہم تمام سے افضل ہیں اور آپ ہم تمام سے عظیم طاقت کے مالک ہیں تو آپ نے فرمایا تم یہ کہتے رہو، یا اس کا بعض حصہ کہتے رہو، اور شیطان تمہیں اپنی راہ پر نہ چلائے۔

وضاحت حدیث: "**مطرف**" کی راء مکسورہ مشددہ ہے (یعنی راء کے نیچے زیر ہے شد والی) اور "**الشخیر**" میں شین کے نیچے زیر ہے اور خاء کے نیچے بھی زیر ہے اور شد ہے۔ نبی کریم ﷺ کو جب بنی عامر کے وفد نے کہا "انت سید نا" (تم ہمارے سردار ہو) تو آپ نے فرمایا "السید اللہ" (سردار تو اللہ ہے) اور بعض روایات میں ہے "السید ھو اللہ" (سردار تو صرف اللہ ہے)۔

نبی کریم ﷺ کا اپنے آپ سے سیادت کی نفی کا کیا مطلب؟

اصل اس کی وجہ یہ ہے کہ سید اسے کہا جاتا ہے جس کی طرف مصائب و آلام میں رجوع کیا جائے اور وہ ان مصائب کو دور کرے، یعنی حقیقت میں سید وہ ہے جس کے لوگ محتاج ہوں۔ اس معنی کے لحاظ سے حقیقی طور پر سید رب تعالیٰ کی ذات ہے مجازی طور پر رسول اللہ ﷺ یا اور انبیاء اکرام اور صلحاء ہیں۔

" وفی نسخة السید ھو اللہ بزیا دہ ضمیر الفصل لمزیدتا کید افادۃ الحصر مبالغة فی تعظیم ربه وتواضع نفسه فحول الامر فیه الی الحقیقة مراعاۃ لا داب الشریعة و الطریقة ای الذی یملک نواصی الخلق ویتولاھم ویسو سھم ھو اللہ سبحانه وھذا لاینا فی سیادته المجازیة الاضافیة المخصوصة بالافراد الانسانیة حیث قال انا سید ولد آدم ولا فخر ای لا اقول افتخارا بل تحدثا بنعمةاللہ واخبارا بما امرنی اللہ"

جو بعض روایات میں "السید ھو اللہ" ہے، اس میں حصر پائی گئی ہے کہ سید صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس ارشاد گرامی میں آپ نے رب تعالیٰ کی کامل تعظیم کا ذکر فرمایا اور اپنی عاجزی کامل طور پر بیان فرمائی۔ آپ نے تمام امور بطور حقیقت رب تعالیٰ کی طرف پھیرے ہیں جس میں آداب شریعت و طریقت کا لحاظ کیا گیا ہے، کیونکہ حقیقت میں تمام مخلوق کا مالک اور والی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہی ان کو دین و دنیا کی صحیح راہ بتاتا ہے، حقیقی طور پر جو صفت رب تعالیٰ کو حاصل ہو، اور وہی، مجازی طور پر اس کے انبیاء اکرام اور صلحاء کو حاصل ہو تو اس میں کوئی منافات نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ادھر نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا " السید ھو اللہ" سردار صرف اللہ تعالیٰ لیکن دوسرا رخ یوں بیان فرمایا "انا سید ولد آدم ولا فخر" میں اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، یعنی میں اپنا یہ کمال فخر

کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالی کی نعمت کا تذکرہ کر رہا ہوں اور اس چیز کی خبر دے رہا ہوں جو مجھے رب تعالی نے حکم دیا ہے یعنی رب نے تعالی مجھے حکم دیا ہے ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ کہ تم اپنے رب تعالی کی نعمت کو بیان کرو۔ واضح ہوا کہ رب تعالی حقیقی طور پر سید ہے اور اس کی مخلوق کے نیک لوگ مجازی طور پر سید ہیں کہ لوگ مجازی طور پر اپنے مصائب و آلام صلحاء کی طرف پیش کرتے ہیں اور ان کے وسیلہ جلیلہ سے رب تعالی کی طرف حقیقۃ پیش کرتے ہیں، اسی پر ایک اور دلیل دیکھیے۔

"عن جابر ان عمر کان یقول ابو بکر سیدنا واعتق سیدنا بلالا" (رواہ البخاری)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں بیشک حضرت عمر ﷺ فرماتے تھے کہ ابو بکر ﷺ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار حضرت بلال ﷺ کو آزاد کیا۔

یعنی اس حدیث میں جلیل القدر صحابی حضرت عمر ﷺ اعتراف حقیقت کے طور پر حضرت ابو بکر ﷺ کو سردار کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ ان سے حقیقت میں افضل ہیں اور عاجزی کے طور پر حضرت بلال ﷺ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سردار کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ حضرت بلال ﷺ سے افضل ہیں۔

لیکن اتنا واضح ہوا کہ صحابہ کرام کو بھی سید (سردار) کہا گیا ہے۔لھذا تمام احادیث میں تطبیق واضح ہو گئی مطرف ﷺ کہتے ہیں، ہم نے کہا "وافضلنا فضلا واعظمنا طولا" آپ ہم سے مراتب کے لحاظ پر بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور ہم پر آپ کو افضلیت اور فوقیت حاصل ہے۔اور آپ ہم پر عظیم طاقت رکھتے ہیں یعنی آپ اپنے احباب پر مہربانیاں فرماتے ہیں ان کو عطیات سے نوازتے ہیں، اور اپنے دشمنوں پر آپ کو بلندی حاصل ہے کہ آپ ان کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔تو نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت فرما دی، ارشاد فرمایا:

"قولوا قولکم ای مجموع ما قلتم او ھذاالقول ونحوہ" ہاں یہ تم کہہ لو یا اس قسم کے القاب تم دے دو۔

عاجزی کو اختیار فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔" اوبعض قولکم" بلکہ اپنے بعض قول پر اکتفاء کر لیا کرو، یعنی اصل مطلب یہ ہے۔"قولوا قولکم الذی جئتم لاجلہ وقصدتموہ ودعوا غیر کم مما لا یعنیکم" کہ آپ نے عاجزی اور تواضع کے طور پر یہ فرمایا کہ تم جس مقصد کیلئے آئے ہو وہ بات کرو، میری تعریف کرنے کی کوئی اتنی ضرورت نہیں۔آپ کا یہ ارشاد اسی طرح ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بچیاں دف بجا رہی تھیں اور بدر میں شہید ہونے والے اپنے آباء واجداد پر فدیہ (شعروں میں تذکرہ) کر رہی تھیں۔ان میں سے ایک بچی نے کہا" وفینا نبی یعلم ما فی غد" اور ہم میں نبی کریم ﷺ موجود ہیں جو کل کی باتیں جانتے ہیں۔اس کی بات کو سن کر رسول اللہ ﷺ نے یہ

نہیں فرمایا کہ یہ تو شرک ہے۔ گناہ ہے، میں تو بالکل کل کی باتیں نہیں جانتا، اگر اس بچی کی بات غلط ہوتی تو آپ کو ضرور یہی کہنا چاہیے تھا، لیکن آپ نے اپنی عاجزی کے طور پر یہ ارشاد فرمایا" **دعی هذه وقولی ما کنت تقولین** "یہ بات چھوڑ دو، (یعنی میرا تذکرہ نہ کرو) وہی کہو جو تم کہہ رہی تھی (یعنی بدر کے شہداء کا ہی تذکرہ کرو) اور اسکا یہ مطلب ہے:

"**اقتصروا علی احدی الکمیتین من غیر حاجة الی المبالغة بهما**"

کہ چونکہ بنی عامر کے وفد نے آپ کی تعریف میں دو جملے ذکر کئے تھے، ایک "**افضلنا فضلا**" کہ آپ ہم تمام سے افضل ہیں، اور دوسرا جملہ یہ ذکر کیا، "**اعظمنا طولا**" کہ آپ ہم تمام سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے "**او بعض قولکم**" فرما کہ یہ واضح کیا کہ تم ایک کلمہ پر ہی اکتفا کرلیا کرو، زیادہ تعریفی کلمات آپ کے سامنے کہنے کو آپ نے پسند نہیں فرمایا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آپ کو معبود نہ کہا جائے، رب تعالی کا شریک نہ مانا جائے اور آپ کی جتنی تعریف کی جاسکے کرے، آپ کی نعمتوں کے مقابل آپ کی تعریف کا کوئی حق ادا نہیں کرسکتا۔

"**ولا یستجرینکم الشیطان**" اس جملہ میں ایک احتمال یہ ہے کہ ماخوذ ہو "**جری یجری جریا**" سے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تمہیں شیطان اپنی راہ پر نہ چلائے، یعنی نصاری کی طرح تم سے میری ایسی تعریف نہ کرائے کہ معاذ اللہ تم مجھے خدا کا شریک یا خدا کا بیٹا ماننا شروع کردو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ "**جرأ یجرأ جرأة**" سے ماخوذ ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ شیطان تمہیں جرأت نہ دلائے کہ تم نصاری کی طرح میری مدح میں مبالغہ کرکے کفر تک پہنچ جاؤ۔ علامہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا لب لباب (اصل نچوڑ) یہ ہے:

"**لا تبالغوا فی مدحی بحیث تمدحوننی بشئی یلیق بالخالق ولا یلیق بالمخلوق**"

کہ آپ نے گویا کہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم میری تعریف ایسی نہ کرو جو صرف خالق کائنات کی ہوسکتی ہو، اور مخلوق کی وہ تعریف نہ ہوسکتی ہو۔ اسی سے نتیجہ یہ بھی نکل آیا کہ مخلوق سمجھتے ہوئے جتنی تعریف کرسکتے ہو کرو، بس خالق نہ سمجھو۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ کی خوبصورت وضاحت:

"**وقال الخطابی اراد ﷺ بقوله قولوا بقول اهل دینکم وملتکم وادعونی نبیا ورسولا کما سمانی الله فی کتابه ولا تسمونی سیدا کما تسمون رؤسائکم وعظمائکم لانی لست کاحد منهم اذ کانوا یسودونکم فی اسباب الدنیا وانا اسودکم بالرسالة والنبوة فسمونی رسولا ونبیا**"

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ تم مجھے اس طرح پکارو جس طرح اور مسلمان پکار رہے ہیں وہ مجھے رسول اور نبی کہہ کر پکار رہے ہیں تم بھی مجھے نبی اور رسول کہو، اللہ تعالی نے بھی مجھے اپنی کتاب میں رسول و نبی کہا ہے، تم مجھے اس طرح کا سردار سمجھ کر سید نہ کہو جیسا کہ تم اپنے وڈیروں اور چوہدریوں کو سردار کہہ کر پکارتے ہو، وہ تو صرف دنیاوی معاملات میں تمہارے سردار ہیں میں تو تمہارا دین و دنیا میں سردار ہوں، یہ سرداری اللہ کے نبی اور اس کے رسول کو حاصل ہوتی ہے، اسی لئے تم مجھے اللہ کا رسول اور نبی کہو۔

نتیجہ یوں نکلا کہ اگر تم دنیادار سرداروں کی طرح مجھے بھی دنیادار سمجھ کر سید (سردار) کہو تو یہ ناجائز ہے ایسا مت کہو، ہاں اگر تمہیں معلوم ہو کہ سید تو محتاج الیہ ہے اور مصائب و آلام میں اسکی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو اس معنی کے لحاظ سے تم مجھے برملا طور پر سید (سردار) کہو، یہ تو میں خود ہی اعلان کر رہا ہوں، "انا سید ولد آدم ولا فخر" میں اولاد آدم کا سردار ہوں مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کا قول بھی اسی کی تائید کر رہا ہے:

"وقال التور بشتی مسلک القوم فی الخطاب معه مسلکهم مع رؤ ساء القبائل فانهم یخاطبو نهم بنحو هذا الخطاب فکره ذلک لا نه کا ن من حقه ان یخطابوه بالنبی والرسول فانها المنزلة التی لا منزلة وراء ها لا حد من البشر"

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب قوم نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے وہ طریقہ اختیار فرمایا جو وہ اپنے قبیلے کے سرداروں سے اختیار کرتے تھے اور جب انہوں نے آپ کو اپنے قبیلے کے سرداروں والے لقب سے پکارا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھے نبی اور رسول کہہ کر پکارو، کیونکہ یہ مرتبہ کسی عام انسان کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف اللہ تعالی کے انبیاء ورسل کو حاصل ہوتا ہے، اس منصب کے مستحقین کو صرف رب تعالی نے ہی جانا۔

رب تعالی کا ارشاد گرامی اس مسئلہ کو واضح کر رہا ہے ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ ہی جانتا ہے جہاں اس نے رسالت کو رکھنا ہے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص ۱۸۶،۱۸۵)

☆ "وعن الحسن عن سمرة قال قال رسول الله ﷺ الحسب الما ل و الکرم التقوی"

(رواہ الترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حضرت سمرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسب مال ہے اور کرم تقوی ہے۔

وضاحت حدیث: آپ نے فرمایا حسب دنیا کا مال ہے، یعنی اس سے غالبا انسان دنیا کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ نسب صرف خاندانی کمال بیان کرنا کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں، اس سے منع کیا گیا، بلکہ ساتھ ساتھ حسب بیان کرنے کا حکم دیا گیا کہ اس میں انسان اپنے آباء کے اچھے اخلاق کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں حسب کو کرم کے مقابل ذکر کیا گیا ہے۔ اسلئے حسب کا یہاں معنی دنیاوی مال اور جاہ وجلال لیا گیا ہے۔ جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا "الحسب المال" حسب مال ہے۔

"وقال الطیبی الحسب ما یعده من مآثره ومآثر آباءه " علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حسب یہ ہے کہ انسان اپنے مال و دولت کی ثروت بیان کرے اور اپنے آباء واجداد کی ثروت بیان کرے، اس وقت عرب میں رواج یہ تھا کہ

"لیس ذکر الحسب عند الناس للفقیر حیث لا یوقر ولا یحتفل به بل کل الحسب عندهم من رزق الثروة ووقرفی العیون"

وہ فقیر کو لوگوں کے ہاں صاحب حسب نہیں سمجھتے تھے اور اسی کا لوگوں کی نظروں میں وقار ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ان نظریات کو رد کرتے ہوئے فرمایا "والکرم التقویٰ" کرم تقویٰ ہے۔ اس کرم سے مراد، "الکرم المعتبر فی العقبی المترتب علیه الا کرام بالدرجات العلی هو التقویٰ" وہ کرم ہے جو آخرت میں معتبر ہوگا۔ جس پر درجات کی بلندی مرتب ہوگی یہ کرم صرف تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ بیشک تم میں سے زیادہ مکرم اللہ کے ہاں وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔

"وفیه تنبیه نبیه علی ان الدنیا فانیة والأخریٰ باقیه فآثروا ما یبقی علی ما یفنی"

اس حدیث پاک سے اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے اس پر متنبہ کر دیا کہ دنیا فانی ہے، اور آخرت باقی رہنے والی ہے، لہٰذا باقی رہنے والی چیز اختیار کرو، فانی چیز کو اختیار نہ کرو۔

"وقیل معناه ان الغنی یعظم کما یعظم الحسب وان الکریم هو المتقی لا من یجود بما له ویخطر بنفسه لیعد جوادا شجاعا"

لوگ غنی کی اس طرح تعظیم کرتے تھے جس طرح صاحب حسب یعنی صاحب اخلاق کی تعریف کرتے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمایا کہ اللہ کے ہاں عزت والا وہی ہے جسے تقویٰ زیادہ حاصل ہوگا۔

ایک شخص دنیا میں فقراء وغرباء پر مال بھی خرچ کرتا ہے، جنگوں میں بھی شریک ہوتا ہے، مجاہدین کی بھی امداد کرتا ہے اور اس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے "شجاع وجواد" (بہادر وسخی) کہیں وہ دنیا میں تو نام پیدا کر لیتا ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی قدر ومنزلت نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص۱۸۶)

❁ "وعن ابی بن کعب ﷺ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من تعزی بعزاء الجاھلیة فاعضوہ بھن ابیہ ولا تکنوا" (رواہ فی شرح السنة، مشکوٰة باب المفاخرة والعصبیة)

ابی بن کعب ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے زمانہ جاہلیت کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا تو اس کے باپ کی برائیوں کو ظاہر کر کے بیان کرو، ان کے بیان کرنے میں کنایہ سے کام نہ لو۔

وضاحتِ حدیث:

"تعزی ای انتسب" یعنی "تعزی" کا معنی ہے منسوب کرنا۔" بعزاء الجاھلیة ای نسب اھلھا وافتخر بابائہ واجدادہ" یعنی جس نے اپنے آپ کو زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب کیا کہ اپنے کافر آباء واجداد پر فخر کیا۔"فاعضوہ بھن ابیہ "اس کے باپ کے عیوب اور قبائح بیان کئے جائیں "اعض" میں ضاد مشدد ہے اصل معنی" اعض یعض " کا کاٹنا ہے۔خواہ دانتوں سے کاٹا جائے یا زبان سے اس کی برائیوں کو بیان کر کے اس کی شہرت کو کاٹا جائے۔"بھن "میں باء علیحدہ ہے۔"ھن "علیحدہ ہے۔

دینی مدارس کے ابتدائی طلباء کرام بھی بخوبی جانتے ہیں کہ "ھن" اسماء ستہ مکبرہ سے ہے۔جس کا معنی ہوتا ہے شرمگاہ اور ایسی برائیاں جن کا ذکر قبیح (برا) سمجھا جائے۔"ولا تکنوا" کنایہ سے کام نہ لو، یعنی اس کے باپ کی برائیوں کو اشارہ سے نہ بیان کرو کہ اس کی برائیوں کا پتہ ہی نہ چلے بلکہ واضح طور پر بیان کرو، حدیث شریف کا مفہوم مندرجہ ذیل الفاظ میں دیکھئے۔

"وقیل معناہ من انتسب وانتمی الی الجاھلیة باحیاء سنة اھلھا وابتداع سنتھم فی الشتم واللعن والتعییر ومواجھتکم بالفحشاء والتکبر فاذکروا لہ قبائح ابیہ من عبادة الاصنام والزنا وشرب الخمر ونحو ذلک مما کان یعیر بہ من لؤم ورذالة صریحا لا کنایة کی یرتدع عن التعرض لأعراض الناس"

حدیث کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو جاہلیت کی طرف اس لئے منسوب کرتا ہے کہ جاہلیت کے طور طریقے زندہ کئے جائیں، جس طرح کافر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے تھے مسلمان بھی اسی طرح ایک دوسرے کو گالیاں دیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے کو عار دلائیں اور ان کی طرح یہ بھی ایک دوسرے کے سامنے بے حیائی کے کام کریں، اور ان کی طرح یہ بھی تکبر کریں اپنی بڑائی بیان کریں، تو ان کے آباء واجداد کی برائیوں کو کھول کھول کر بیان کرو، واضح طور پر ان کی بت پرستی، بدکاری اور شراب پینے اور اس قسم کی برائیوں کو بیان کرو جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔اسی طرح جن کاموں سے وہ دوسروں کو عار دلاتے تھے

وہ بیان کرو، ان کے رذیل، گھٹیا کاموں کو بہت ظاہر کر کے بیان کرو، ان کی برائیوں کو بیان کرنے میں اشارہ اور کنایہ سے کام نہ لو تا کہ وہ لوگوں کو زمانہ جاہلیت کی برائیوں کی طرف دھکیلنے سے باز آجائیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۸۶)

مقام افسوس ہے کہ آج کل لوگ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں سے اپنے رشتے جوڑ رہے ہیں۔ ذلت آمیز نعرے لگا رہے ہیں کہ ہم ایک تھے ایک ہو کر رہیں گے ایسے لوگوں کیلئے مشورہ یہ ہے کہ وہ بھارت چلے جائیں ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کرلیں اور وہاں سے جو مسلمان پاکستان آنا چاہیں تو ان کی جگہ ان مسلمانوں کو پاکستان میں آنے دیا جائے۔ بصورت دیگر ان کی زبانوں کو لگام دیا جائے، بلکہ ان کی زبانوں کو گدی سے کھینچ لیا جائے، اور جو لوگ ان کے آباء و اجداد کے کرتوتوں سے باخبر ہوں، وہ ان کے کرتوتوں کو بیان کریں کہ یہ ہندوؤں سے روابط رکھنے میں بے تاب کیوں ہیں۔

☆ **"وعن عبد الرحمٰن بن عقبة عن ابی عقبة وكان مولى من اهل فارس قال شهدت مع رسول الله ﷺ احد فضربت رجلا من المشركين فقلت خذها منى وانا الغلام الفارسى فالتفت الى (فقال رسول الله ﷺ هلا قلت خذها منى وانا الغلام الانصارى)** (رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

عبدالرحمٰن بن عقبہ روایت کرتے ہیں ابو عقبہ سے جو اہل فارس کے (اس سے پہلے) غلام تھے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احد (کے غزوہ) میں حاضر ہوا تو میں نے مشرکوں کے ایک شخص کو ضرب لگائی، تو میں نے کہا یہ لو مجھ سے میں فارسی غلام ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے میری طرف توجہ فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا یہ لو مجھ سے میں انصاری غلام ہوں۔

وضاحت حدیث:

راوی عبدالرحمٰن بن ابی عقبہ، جبیر بن عتیق کے غلام تھے، یہ تابعی ہیں۔ اپنے باپ ابو عقبہ سے روایت فرماتے ہیں جو صحابی ہیں، یہ انصار کے غلام تھے، عام طور پر یہ "مولی بن ہاشم" کے لقب سے مشہور تھے۔

"**شهدت**" کا معنی ہے میں حاضر ہوا۔ "**ضربت**" میں نے ضرب لگائی، یہ عام ہے تیر مارنے، تلوار مارنے، نیزہ مارنے کو ضرب ہی کہا جاتا ہے۔ "**خذها منى**" یہ ضرب مجھ سے لے لو، اس وقت مجاہدین کی یہ عادت تھی کہ وہ جنگ میں جسے ضرب لگاتے اسے اپنے نام اور نسب کی خبر دیتے تھے یہ درحقیقت اپنے بہادری کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

ابو عقبہ نے جب اپنے آپ کو فارس کی طرف منسوب کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا اور انصار کی طرف منسوب کرنے کی رغبت دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ کا مقصد یہ تھا "**فانسب الى الانصار الذين هاجرت اليهم ونصرونى**" کہ تم انصار کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرو، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف میں

نے ہجرت کی اور انہوں نے میری امداد کی اور خاص کر کے ابوعقبہ اہل فارس سے آزاد ہو کر انصار میں آ چکے تھے، اس لحاظ پر بھی انہیں اپنے آپ کو انصار کی طرف منسوب کرنا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی:

"وکان فارسی فی ذلک الزمان کفارا فکرہ ﷺ الا نتساب الیھم وامرہ بالانتساب الی الا نصار لیکون منتسبا الی اھل الاسلام"

کہ فارسی اس زمانہ میں کافر تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف منسوب کرنے سے ابوعقبہ کو منع فرمایا کہ تم اپنے آپ کو انصار کی طرف منسوب کرو تا کہ تمہاری نسبت اہل اسلام کی طرف ہو۔

خیال رہے کہ ضمناً ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اگر چہ زیادہ مشہور یہی ہے کہ مدینہ طیبہ کے صحابہ کرام جنہوں نے مہاجرین مکہ صحابہ کرام کی امداد کی وہ انصار تھے، لیکن اس حدیث پاک سے ایک یہ مسئلہ بھی سمجھ آیا:

"وفیہ اشعار بان الصحابۃ مماعدا المھجرین قد یطلق علیھم الا نصار ولیسوا بمخصوصین باھل المدینۃ کمایتوھم"

کہ مدینہ طیبہ کے صحابہ کرام ﷺ کو ہی انصار کہا جائے اور کسی کو انصار نہ کہا جائے یہ وہم پیش کرنا درست نہیں کیونکہ کبھی کبھی دوسرے صحابہ کرام کو بھی انصار کہا گیا ہے، جیسا کہ ابوعقبہ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہیں یہ کہنا چاہئے تھا "خذھا منی وانا الغلام الانصاری" یہ ضرب مجھ سے لے لو میں ایک انصاری نوجوان ہوں۔ ابوعقبہ حقیقت میں فارسی ہی تھے، مدنی نہیں تھے، لیکن ان کو انصار کی طرف منسوب کرنے کا حکم دیا گیا کہ غیر مدنی کو بھی انصار کہا گیا ہے۔ البتہ غیر مدنی کو انصار کہنے میں قرائن کی ضرورت ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۹ ص ۱۸۷)

❁ "وعن ابن مسعود عن النبی ﷺ قال من نصر قومہ علی غیر الحق فھو کالبعیر الذی ردی فھو ینزع بذنبہ" (رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب المفاخرۃ و العصبیۃ)

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص قوم کی ناحق امداد کرے وہ ہلاک ہو جانے والے اونٹ کی طرح ہے جسے دم سے پکڑ کر کھینچا جا رہا ہو۔

وضاحت حدیث:

"(علی غیر الحق) ای علی باطل او مشکوک" ناحق امداد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ وہ جھوٹا ہے باطل راہ پر چل رہا ہے یہ پھر بھی اسے اپنی قوم کا فرد سمجھتے ہوئے اس کی امداد کرے یا اسے اس شخص کے سچا ہونے کا کوئی یقین نہ ہو صرف شک کی بنیاد پر اس کی امداد کرے تو اس کا امداد کرنا باطل ہو گا۔ "فھو کالبعیر الذی ردی"

لفظ "ردی" کو تین طرح پڑھا گیا ہے دال پر فتحہ (زبر) اور مخفف، دال کے نیچے کسرہ (زیر) اور یاء پر فتحہ (زبر) اور زیادہ مشہور اور صحیح یہ ہے کہ راء پر ضمہ (پیش) اور دال مشدد ومکسور اور یاء پر فتحہ معنی اس کا کنوئیں میں گر جاتا یا مطلق ہلاک ہو جانا یعنی وہ شخص اپنی قوم کی باطل امداد کی وجہ سے ہلاکت میں واقع ہو جاتا ہے۔

تشبیہ میں وجوہ:

نبی کریم ﷺ نے ہلاک ہونے والے اونٹ سے تشبیہ دی جس کو دم سے پکڑ کر کھینچا جائے، اس تشبیہ کی چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ "اذا اراد الرفعة بنصرة قومه فوقع فی حضیض بئر الاثم وهلک کا لبعیر فلا ینفعه کما لا ینفع البعیر نزعه عن البئر بذنبه"

اس شخص نے اپنی قوم کی باطل طور پر امداد کر کے اپنے آپ کو بلند کرنا چاہا تو وہ گناہوں کے کنوئیں کی گہرائی میں گر کر ہلاک ہو گیا، جیسے کہ اونٹ کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو جائے، لہٰذا جس طرح کنوئیں میں گرے ہوئے اونٹ کو دم سے پکڑ کر کھینچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اپنی قوم کی باطل طور پر امداد کرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں۔

یہ بھی طلباء کرام کے ذہن میں رہے کہ "ذنب" کے ذال اور نون دونوں پر فتحہ ہے، جس کا معنی ہے "دم"

(۲) "وقیل شبه القوم ببعیر هالک لان من کان علی غیر حق فهو هالک وشبه ناصرهم بذنب هذا البعیر فکما ان نزعه بذنبه لا یخلصه من الهلکة کذالک هذا الناصر لا یخلصهم عن بئر الهلاک التی وقعوا فیها"

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قوم جو باطل راہ پر ہے اسے ہلاک ہونے والے اونٹ سے تشبیہ دی گئی کہ وہ باطل راہ پر ہونے کی وجہ سے گویا کہ ہلاکت میں واقع ہو گئے اور یہ ان کا ہم قوم جو ان کی باطل طور پر امداد کر رہا ہے گویا کہ یہ ان کو ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے ایسے ہی جیسے کنوئیں میں گرے ہوئے اونٹ کو دم سے پکڑ کر کھینچنے والا اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے، ایسے ہی یہ شخص جو ان کی باطل راہ پر امداد کرنے والا ہے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔

اعتراض:

بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت بیان فرمائی ہے۔

"عن انس مرفوعا من نصر اخاه بظهر الغیب نصره الله فی الدنیا والاخرة"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں امداد فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں امداد فرماتا ہے۔

یہ حدیث تو مطلق ہے، اس میں صرف امداد کرنے کا ذکر ہے، حق یا باطل کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گویا کہ ہر طرح

کی امداد جائز سمجھ آتی ہے۔

جواب : "هذا الحديث محمول على نصرة الحق وان كان اللفظ مطلقا" یہ حدیث جو حضرت انس ﷺ سے بیہقی نے روایت کی ہے حق راہ پر جو ہو اس کی امداد پر محمول ہے۔ لفظ اگرچہ عام ہیں۔ لیکن دوسری احادیث سے واضح ہو جانے پر کہ باطل طور پر امداد نا جائز ہے تو اس حدیث کو بھی حق امداد پر محمول کرنا لازم ہو گیا۔
(ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص ۱۰۸)

آنے والی حدیث سے بھی یہ مسئلہ واضح ہو رہا ہے، اور زیر بحث حدیث سے تو زیادہ ہی واضح ہے۔

❁ "وعن واثلة بن الاسقع قال قلت يارسول الله ﷺ ما العصبية قال ان تعين قومك على الظلم"
(رواہ ابو داؤد۔ مشکوۃ باب المفاخرہ والعصبیہ)

واثلہ بن اسقع کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عصبیہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی قوم کی ظلم پر امداد کرو۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ ظالم کی امداد کرنا جب عصبیت و جاہلیت ہے تو "ان الواجب عليك متابعة الحق من غير نظر الى ملاحظة الخلق" واجب ہے تم پر کہ حق کی تابعداری کرو، حق پر چلنے والے کی امداد کرو، مخلوق کی طرف نہ دیکھو کہ یہ تمہارا رشتہ دار ہے یا غیر ہے۔ رشتہ دار ظالم ہو تو اس کی امداد کرنا ظلم عظیم ہے۔ اس پر دارمی اور ابن عساکر کی حضرت جابر ﷺ سے مرفوع روایت زیادہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے۔

"عن جابر مرفوعا انصر اخاك ظالما او مظلوما ان يك ظالما فاردده عن ظلمه وان يك مظلوما فانصره"

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے بھائی کی امداد کرو، خواہ ظالم ہو یا مظلوم اگر وہ ظالم ہے تو (اس کی امداد یہ ہے کہ) اسے ظلم سے روکو، مظلوم کی امداد یہ ہے کہ اس کی امداد کرو، یعنی اسے ظالم کے ظلم سے بچاؤ۔
(ماخوذ از مرقاۃ ج۹ ص ۱۰۷)

❁ "عن سراقة بن مالك بن جعشم قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال خيركم المدافع عن عشيرته مالم يأثم"
(رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب المفاخرہ والعصبیہ)

سراقہ بن مالک بن جعشم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے قبیلہ سے مدافعت کرے جب تک وہ گناہ نہ ہو۔

وضاحت حدیث: "**سراقه**" سین پر ضمہ ہے۔ "**جعشم**" جیم اور شین پر ضمہ ہے اور عین ساکن ہے۔ "**عشیرۃ**" سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ انسان مل جل کر رہتا ہے۔

"**مالم یأثم**" (جب تک گناہ نہ ہو) کا مطلب راقم کو وسیع نظر آتا ہے ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم اپنے قبیلہ کی طرف سے مدافعت تو کرو جب تک گناہ نہ ہو یعنی تمہارا رشتہ دار ظالم نہ ہو، باطل راہ پر نہ ہو، اگر باطل راہ پر چلنے والے، ظالم کی تم امداد کرو گے تو تم گنہگار ہو گے یہ امداد ناجائز ہوگی۔ (راقم)

دوسرا معنی حضرت علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

"(مالم یائثم) ای مالم یظلم علی المرفوع فانه حیث یکون جامعا بین نصرة المظلوم ووصلة الا قارب"

"جب تک گناہ نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اپنے رشتہ دار کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے تم جس سے مدافعت کر رہے ہو اس پر ظلم کر بیٹھو، مقصد بیان یہ ہے کہ تم سے بہتر وہ شخص ہے کہ جو اپنے رشتہ دار سے مدافعت کرے بشرطیکہ دوسرے پر ظلم نہ کرے، جب یہ صورت اختیار کرے گا اپنے مظلوم رشتہ دار کی امداد کا ثواب بھی حاصل ہوگا اور صلہ رحمی کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔

تنبیہ: **"اعلم انه لو قدر علی دفع الظلم عن قومه بکلام لم یجز له الضرب ولو قدر بالضرب لم یجزله القتل لانه من باب الا مر بالمعروف والنهی عن المنکر فیجب مراعاة الترتیب قال تعالی﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجٰدِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾**

اگر ظالم کے ظلم کو صرف زبان سے یعنی کلام کے ذریعے دور کیا جا سکے تو صرف زبانی نصیحت سے کام لے، مارنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر زبانی نصیحت سے کام نہ چلے معمولی مارنے کی ضرورت درپیش آئے تو معمولی مار سے کام لے، جب معمولی مار سے کام چل جائے تو لڑائی کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "تم ان کو حکمت سے سیدھی راہ کی طرف بلاؤ اور اچھی نصیحت سے اور اچھی طرح (دلائل سے) جھگڑا کرو" ہاں اگر ظالم کے ظلم کے برابر اس سے بدلہ لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ اور اگر تم سزا دو تو اسی کی مثل سزا دو جو تمہیں سزا دی گئی۔

❁ **"وعن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال حبک الشیء یعمی و یصم"**
(رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی چیز سے تمہاری محبت، اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

وضاحت حدیث: "حبک الشیء" میں دواحتمال ہیں، ایک یہ کہ نسبت ہوتا فاعل کی طرف اور معنی تمہارا کسی سے محبت کرنا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ نسبت ہو مفعول کی جانب ہو، اس وقت معنی ہوگا، کسی کا تمہارے ساتھ محبت کرنا اندھا اور بہرہ کرنے کا مطلب کیا ہے، وہ مطلب یوں بیان کیا گیا۔

"یجعلک اعمی عن رؤیة معایب الشیٔ المحبوب بحیث لا تبصر فیه عیبا ویجعلک اصم عن سماع قبائحه بحیث لا تسمع فیه کلامه قبیحا لا ستیلاء سلطان المحبة علی فؤادک"

کہ کسی سے محبت تمہیں اندھا کردے گی کہ تمہیں محبوب کے عیب نہیں دکھائی دیں گے اور تمہیں بہرہ کردے گی کہ تمہیں محبوب کی کوئی بری بات بری نہیں سنائی دے گی کیونکہ تمہارے دل پراس کی محبت کا غلبہ چھایا ہوا ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیة ولکن عین السخط تبدی المساویا

رضامندی کی آنکھ ہر عیب سے رات کی طرح (پردہ پوشی کرتی) ہے اور ناراضگی کی آنکھ ہر گناہ (عیب) کو ظاہر کر دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم کا خصوصی وصف حاصل ہے کہ الفاظ مختصر اور مطالب زیادہ، اگر بظاہر دیکھا جائے تو اس حدیث کا تعلق مفاخرت وعصبیت سے نظر نہیں آتا، لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی کی محبت میں اتنے گرفتار نہ ہو جاؤ کہ اس کے عیب بھی تمہیں نظر نہ آئیں، اس کی فحش کلامی بھی تمہیں نہ سنائی دے۔ تم اس سے اندھا دھند تعاون کرتے چلے جاؤ۔ اگر وہ حق پر ہو تو تمہارا امداد کرنا درست ہوگا لیکن وہ جب باطل راہ پر چل رہا ہو تو تمہارا اس کی امداد کرنا زمانہ جاہلیت کی عصبیت ہی ہوگی اور گویا کہ محبوب کے عیوب پر فخر ہوگا جو سراسر ناجائز ہے۔ یہ روایت مسند احمد، تاریخ بخاری، خرائطی اور ابن عساکر میں بھی مذکور ہے۔

❁ "عن عبادة بن کثیر الشامی من اهل فلسطین عن امرأة منهم یقال لها فسیلة انها قالت سمعت ابی یقول سالت رسول الله ﷺ فقلت یا رسول الله امن العصبیة ان یحب الرجل قومه قال لا ولکن من العصبیة ان ینصر الرجل قومه علی الظلم" (رواه احمد وابن ماجه، مشکوٰة باب المفاخرة والعصبیة)

عبادہ بن کثیر شامی جو اہل فلسطین سے ہیں وہ ایک فلسطینی عورت سے روایت کرتے ہیں، جسے "فسیلہ" (مکبر اور مصغر دونوں طرح پڑھا گیا ہے) وہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا کوئی شخص اپنی قوم سے محبت کرے تو یہ بھی عصبیت ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں لیکن عصبیت تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم سے اس کے ظلم پر امداد کرے۔

حدیث پاک کا مفہوم بہت واضح ہے کہ قوم سے مطلقا محبت کرنا منع نہیں بلکہ اپنے رشتہ داروں سے محبت

رکھنا اور اچھا سلوک رکھنا اچھا کام ہے، البتہ منع عصبیت ہے۔ عصبیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قوم باطل راہ پر ہو لوگوں پر مظالم ڈھا رہے ہوں تو یہ ان کی ظلم پر امداد کرے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

❁ " و عن عقبة بن عامر قال قال رسول الله ﷺ انسابكم هذه ليست بمسبةعلى احد كلكم بنو آدم طف الصاع بالصاع لم تملؤه ليس لاحد على احد فضل الا بدين وتقوى كفى بالرجل ان يكون بذيا فا حشا بخيلا " (رواه احمد والبيهقي في شعب الايمان مشكوة باب المفاخرة والعصبية)

عقبہ بن عامر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب کسی ایک کیلئے بھی گالیوں کا سبب نہ بنیں، تم تمام آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، اور تم ایک دوسرے سے اسطرح ہو جیسا کہ صاع جو بھرا ہوا نہ ہو وہ دوسرے صاع کے مقابل ہو جو بھرا ہوا نہ ہو، کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں سوائے دین اور تقوی کے، انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ وہ بد کلام اور اس کے کام فحش پر مبنی ہوں اور وہ بخیل ہو۔

وضاحت حدیث:

" **انسابكم هذه** " تمہارے یہ نسب جو لوگوں کے سامنے مشہور و معروف ہیں، جو بمنزل محسوس کے ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے (اسی وجہ سے هذه اشارہ لایا گیا)۔

(**ليست بمسبة**) "مسبة" میں میم اور سین مفتوح ہیں اور باء مشدد ہے۔ "**اى محل سب وسبب عار**" گالیوں کا سبب بنا اور عار کا سبب بنا۔ اب مکمل معنی یہ ہو گیا کہ یہ تمہارے نسب دوسروں کو گھٹیا سمجھنے، ان کو گالی دینے اور عار دلانے کا سبب نہ بنیں جب تم " **طف الصاع بالصاع لم تملوه** " کا معنی بیان کیا گیا ہے۔

" **كلكم متساوون في النسبة اى أب واحد متقاربون كتقارب ما في الصاع أو تساوية للصاع اذا لم يملأملأ تاماحتى يزداد عليه** "

جب تم سب ہی آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہو تو تم نسبت میں برابر ہو، ایک دوسرے کے قریب ہو، جیسا کہ دو صاع بھرے ہوئے نہ ہوں تو وہ ایک دوسرے جیسے ہیں کسی ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں اسی طرح تمہیں بھی نسب پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم تمام کا نسب اولاد آدم ہونے کے لحاظ پر ایک ہی ہے۔

اور صاع سے تشبیہ دے کر اور وضاحت یہ فرما دی کہ جس طرح ایک ادھورا صاع دوسرے ادھورے صاع پر فخر نہیں کر سکتا اسی طرح تم بھی نقصان اور خسارے میں ہو تم ایک دوسرے پر کس وجہ سے برتری کا اظہار کر رہے ہو، ہاں بلندی مرتبہ صرف دین اور تقوی سے حاصل ہوگی، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ "بیشک تم

میں سے اللہ کے ہاں عزت والا وہی ہے جسے تم میں سے تقویٰ زیادہ حاصل ہوگا'' اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍo لا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَعَمِلُو الصّٰلِحَاتِ﴾

''قسم ہے زمانہ کی بیشک تمام انسان ہی خسارے میں ہیں سوائے ایمان والوں اور اچھے عمل والوں کے''

" کفی بالرجل ان یکو ن بذیا فا حشا بخیلا" یہ جملہ تقریباً اس طرح ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" کفی بالمرء اثما ان یحدث بکل ما سمع" انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ ہر بات جو سنے وہ بیان کردے یہاں بھی اگر ''اثما'' کا لفظ محذوف ہو تو معنی یہ ہوگا۔ کہ انسان کے گنہگار ہونے کیلئے کافی ہے کہ وہ بدکلامی سے کام لے اور اس کے کام فحش پر مبنی ہوں اور بخیل ہو۔ یعنی "جامعا بین اطالة اللسان وتقصیر الاحسان" یعنی زبان کو لمبا کرنے اور احسان کو کوتاہ کرنے کو جمع کردے۔ اسی طرح یہاں لفظ ''نقصانا'' کو بھی محذوف مانا جاسکتا ہے۔ جس کا معنی ہوگا انسان کیلئے یہی نقصان کافی ہے۔ اور لفظ ''عار'' کو بھی محذوف مانا جاسکتا ہے۔ جس کا معنی ہوگا انسان کو شرمندہ کرنے کیلئے یہی کافی ہے۔ الخ اور لفظ "مسبة" بھی محذوف نکالا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا انسان کا گالی گلوچ میں مشہور ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ بدکلام اور افعال اس کے فحش ہوں اور کنجوس ہو۔

آمدم بر سر مطلب: ذکر ہورہا تھا کہ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ کا وسیع تر مفہوم ہے۔ اسی کے ضمن میں تفسیر مظہری سے عصبیت کے متعلق ایک ابوداؤد کی حدیث ذکر کی تو طلباء کرام کے فائدہ کیلئے کچھ اور احادیث بمع تشریحات کے ذکر کردیں، مظہری اور یہ ذکر کرتے ہیں۔

❁ "عن حارثة بن وهب قال قال رسول الله ﷺ الا اخبر کم باهل الجنة کل ضعیف متضعف لو اقسم علی الله لابره الا اخبر کم باهل النار کل عتل جواظ مستکبر" (بخاری و مسلم)

حارثہ بن وھب ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں خبر نہ دوں اہل جنت کی؟ اہل جنت وہ لوگ ہوں گے جو ضعیف ہوں گے اور اپنے آپ کو ضعیف سمجھیں گے۔ اگر وہ اللہ پر قسم اٹھادیں گے تو اللہ ان کی قسم کو پورا کردے۔ کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں۔ جہنمی سخت مزاج، متکبر، نیکیوں سے روکنے والے ہوں گے۔

وفی روایة المسلم" کل جواز زنیم متکبر" جہنمی وہ لوگ ہوں گے جو دوسروں کو روکیں گے اور اپنے آپ کو کسی قوم سے ملائیں گے حالانکہ اس قوم سے نہیں ہوں گے اور وہ متکبر ہوں گے۔

وضاحت حدیث: "ضعیف و متضعف" سے مراد یہ ہے کہ جو غریب و فقیر ہوں اور حقیقت میں عاجز ہوں گویا کہ عجز ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو وہ حقیقی طور پر ضعیف الحال ہوتا ہے۔ جس کا عجز بغیر کسی تکلف

کے نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا مقبول ہوتا ہے کہ اگر وہ قسم اٹھا دے کہ ایسا ہوگا یا ایسا نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کی قسم کو پورا کر دیتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو سرکش، متکبر، دوسروں کو نیکیوں سے روکنے والے اور کسی قوم کا فرد نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس قوم میں ملانے والے جہنمی ہوں گے۔

"(**عتل**) شدید الجافی الفظ الغلیظ من الناس " جو شخص لوگوں میں سے سخت مزاج ہو، کسی نیک اور برے میں تمیز نہ کرے، ہر ایک سے یوں درپیش آئے جیسے کتا ہر ایک کو بھونکتا ہے، اسے "عتل" کہتے ہیں۔ "(الجواظ) الجموح المنوع " جو شخص دوسروں کو نیکیوں سے منع کرے خود بھی نیکیوں سے دور رہے اسے "جواظ" کہتے ہیں۔ "المستکبر" متکبر کو کہا جاتا ہے، "الزنیم" الملحق بالقوم لیس منھم" جو شخص اپنے آپ کو قوم سے ملائے وہ اس قوم کا فرد نہ ہو اسے زنیم کہا جاتا ہے۔ (از مظہری)

مقام افسوس یہ ہے کہ آج ہزاروں کی تعداد میں غیر سید اپنے آپ کو سید بنیں نظر آئیں گیں۔ کئی گھٹیا قوموں کے افراد شہروں میں آ کر راجہ، ملک، چوہدری بن کر اپنی نسل کو برباد کرنے کے ساتھ جھوٹ، فراڈ کے مرتکب ہو کر اپنے ایمان کو قینچیوں سے کاٹ رہے ہیں۔

❁ "وعن الحسن مرسلا قال قال رسول اللہ ﷺ حب الدینار رأس کل خطیئة"
(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جو تابعی ہیں درمیان میں راوی کا واسطہ چھوڑتے ہوئے مرسل حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دینار کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے۔ (مظہری)

یعنی انسان کو جب مال ودولت سے محبت ہوگی تو مال جمع کرنے کی وہ کوشش بھی کرے گا اور مال جمع کرنے میں بھی ضروری نہیں کہ وہ مال حلال طریقے سے ہی جمع کرے گا ہوسکتا ہے کہ وہ مال بھی حرام طریقے سے حاصل کرے پھر جب مال ہوگا تو وہ ہر قسم کے جرائم میں دلیر ہوگا کہ مال دے کر جان چھڑالوں گا۔ یعنی مال کی حوس بھی ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ﴾ کے ضمن میں آتی ہے۔

❁ "عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ حب ابی بکر وعمر ایمان وبغضھما نفاق" (رواہ ابن عدی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنھما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض منافقت ہے۔ (مظہری)

❁ "وعن جابر مرفوعا حب ابی بکر وعمر من الایمان وبغضھما کفر وحب الانصار من الایمان وبغضھم کفر ومن سب اصحابی فعلیہ لعنة اللہ ومن حفظنی فیھم فانا احفظہ یوم القیامة"

حضرت جابر ﷺ مرفوع حدیث بیان کرتے ہیں ابوبکر اور عمر ﷺ کی محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور انصار سے محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور عرب سے محبت ایمان کا حصہ ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس شخص نے میرے صحابہ کو گالی دیں اس پر اللہ کی لعنت ہو اور جس نے میری حفاظت کی ان میں تو میں اس کی قیامت کے دن حفاظت کروں گا۔ (مظہری)

کیا خوب ارشاد فرمایا کہ صحابہ کرام ﷺ کو **گالی دینا** اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہونا ہے اور آنے والے الفاظ مبارکہ اور دوسری احادیث کی تائید سے یہ بھی سمجھ آ گیا کہ جس نے میرے صحابہ کو گالی دیں اس نے مجھے گالی دی اور جس نے میرے صحابہ کو گالیوں سے بچایا اس نے مجھے گالیوں سے بچایا، جس نے مجھے گالیوں سے بچایا قیامت کے دن میں اسے شفاعت کر کے اللہ کے عذاب سے بچاؤں گا۔

❁ "عن النبی ﷺ قال حب علی عبادۃ" نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت علی ﷺ کی محبت عبادت ہے۔ (مظہری)

❁ "وعن علی قال والذی خلق الحبة وبرئی النسمة لعهد النبی الأمی ﷺ الی ان لا یحبنی الا مؤمن ولا یبغضنی الا منافق" (رواہ مسلم)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو پھاڑا اور ذی روح مخلوق کو پیدا فرمایا نبی امی ﷺ کا میرے ساتھ عہد ہے کہ میرے ساتھ کوئی محبت نہیں رکھے گا سوائے مومن کے اور میرے ساتھ کوئی بغض نہیں رکھے گا سوائے منافق کے۔ (مظہری)

"**فلق الحبة**" دانے کو پھاڑا یعنی جس ذات نے دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑ کر ان سے نباتات کو پیدا کیا۔

"**برأ النسمة**" برأ کا معنی پیدا کیا "بارئی" پیدا کرنے والا "النسمة" ہر ذی روح چیز، حدیث پاک میں جس محبت کا ذکر ہے وہ کون سی محبت ہے؟ وہ محبت یہ ہے۔ "والمعنی لا یحبنی حبا مشروعا مطابقا للواقع من غیر زیادۃ ونقصان" کہ حضرت علی ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ میرے ساتھ صرف مومن ہی محبت رکھیں گے لیکن اس محبت سے مراد یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ جائز محبت رکھیں گے جو واقع کے مطابق ہوگی۔ نہ ہی میری محبت میں حد سے تجاوز کریں گے اور نہ ہی میرے ساتھ بغض میں حد سے بڑھیں گے۔

❁ "عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ فیک مثل من عیسیٰ ابغضته الیهود حتیٰ بهتوا امه واحبته النصاریٰ حتی انزلوه بالمنزلة التی لیست له ثم قال یهلک فی رجلان محب مفرط یقرظنی بما لیس فی و مبغض یحمله شنانی علی ان یبهتنی" (رواہ احمد)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری مثال عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے کہ ان سے یہود نے بغض رکھا

یہاں تک کہ ان کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی یہاں تک کہ ان کو ان کے مرتبہ سے اتار کر اس مرتبہ پر پہنچا دیا جو ان کا نہیں تھا۔ پھر حضرت علی ﷛ نے فرمایا میری وجہ سے دو قسم کے لوگ ہلاکت میں پہنچ گئے۔ ایک بہت زیادہ میری تعریف کرنے والا جو مجھ میں نہیں اور میرے ساتھ بغض رکھنے والا جسے میری عداوت مجھ پر بہتان باندھنے پر (یعنی عیب لگانے پر) ابھارتی ہے۔

حدیث پاک میں الفاظ کی وضاحت:

"یقرظنی ای یمد حنی والتقریظه بالظاء المعجمة مدح الحی و وصفه" تقریظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زندہ شخص کی تعریف کرنا اور وصف بیان کرنا۔ (لمعات)

"شنان" بفتح النون والسکون والمدالعداوة وقیل شدة البغض "(لمعات) عداوت رکھنا اور سخت بغض رکھنا۔

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ سے جسطرح یہودیوں نے بغض رکھا اور اس بغض اور عداوت کی وجہ سے آپ کی والدہ مکرمہ پر معاذ اللہ زنا کی تہمت لگائی اسی طرح حضرت علی ﷛ سے بغض رکھنے والے خارجی آپ کے عیوب بیان کر کے گویا کہ آپ پر بہتان باندھتے ہیں اور جس طرح عیسیٰ ؑ سے نصاریٰ نے بظاہر محبت کی لیکن حقیقت میں ان کو مرتبہ رسالت وعبودیت سے ہٹا کر مرتبہ الوہیت تک پہنچا دیا یہ حقیقت میں آپ کے مرتبہ کو کم کرنے کو مستلزم ہے۔ اسی طرح رافضیوں نے بظاہر حضرت علی ﷛ سے محبت کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے لیکن درحقیقت وہ آپ کو اپنے مرتبہ سے ہٹا کر اس مرتبہ پر پہنچانے کی ناکام کوشش میں رہتے ہیں جو آپ کو حاصل نہیں۔

"فمن احبه وابغض الشیخین مثلا فما احبه حبا مشروعا" (مرقاة)

جس نے حضرت علی ﷛ سے محبت رکھی اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بغض رکھا اس نے حقیقت میں حضرت علی ﷛ سے جائز محبت نہیں رکھی۔

ایسے لوگ بظاہر محبت کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت وہ حضرت علی ﷛ کی شان کو گھٹا رہے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ ؑ سے مثال دی اور ان سے بے جا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے متعلق فرمایا "انزلوه بالمنزلة التی لیست له" کہ انہوں نے آپ کو اپنے مرتبہ سے اتار دیا۔ یعنی مطلب واضح ہوا کہ رب تعالیٰ تم سے حساب لے گا اگر تم نے صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی یا حضرت علی ﷛ کی شان میں گستاخی کی۔

❁ "وعن عطیة الساعدی مرفوعا ان الغضب من الشیطان" (رواه ابو داؤد)

عطیہ ساعدی سے مرفوع حدیث مروی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غضب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔

یعنی غضب ثوران نفس (نفس کے بھڑکنے اور جوش مارنے) کی وجہ سے ہوتا ہے کہ میں فلاں سے انتقام لوں یہ ابھارنے والا جوش دلانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔ (ازمظہری)

❁ "عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده مرفوعا ان الغضب يفسد الايمان كما يفسد الصبر العسل" (رواه البيهقي في الشعب)

بھز بن حکیم اپنے باپ، دادا سے مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک غضب ایمان کو فاسد کر دیتا ہے جیسا کہ ایلوا شہد کو برباد کر دیتا ہے۔

''صبر'' ایک کڑوی دوا ہے جسے ''ایلوا'' کہا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں اسے ''مصبر'' کہتے ہیں۔ یہ شہد میں ملائیں تو شہد بھی کڑوا ہو جاتا ہے۔ دونوں حدیثوں کو اس آیۃ کی تفسیر میں قاضی مظہری رحمہ اللہ نے نقل فرما کر مسئلہ واضح کر دیا کہ صبر سے کام لو، غیظ و غضب اور جوش سے انتقام لینا شیطانی عمل ہے، رب تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا۔

❁ "وعن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده مرفوعا اول صلاح هذه الامة اليقين و الزهد و اول فسادها البخل و الامل" (رواه البيهقي)

عمرو بن شعیب اپنے باپ دادا سے مرفوع حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس امت کی پہلی درستگی یقین اور زہد ہے۔

(یعنی ایمان کے ساتھ ایقان ضروری ہے اور دنیاوی حرص و امید سے انقطاع ضروری ہے اور کامل رب تعالیٰ کی طرف توجہ ہو اسی کا نام زہد ہے) اور پہلا فساد کنجوسی اور امیدیں رکھنا (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقات فرضیہ اور واجبہ کو نہ ادا کرنے والا اور دنیاوی مال و متاع کا حریص اور لمبی لمبی امیدیں باندھنا یہ اس امت کیلئے فساد (نادرستگی، بگاڑ) ہے۔ (ازمظہری)

❁ "عن سعد قال قال رسول الله ﷺ من سعادة ابن آدم رضاؤه بما قضى الله و من شقاوة ابن آدم سخطه بما قضى الله" (رواه احمد و الترمذی)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کی سعادت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور اس کے حکم پر راضی رہے اور انسان کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور اس کے احکام کو پسند نہ کرے اور ان پر ناراض ہو۔ (مظہری)

❁ "عن معاذ جبل مر فو عاقال يطلع الله الى جميع خلقه ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه الا لمشرك او مشاحن" (رواه الدار قطني و صححه ابن حيان)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق پر شعبان کی پندرھویں رات کو اپنی جلوہ نمائی فرماتا ہے، (اس رات عبادت کرنے والے توبہ کرنے والے) تمام لوگوں کی

مغفرت فرماتا ہے سوائے مشرک اور سخت کینہ اور دشمنی رکھنے والوں کے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ نفس کے تمام برے کام اور اچھے کام خواہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا حساب لے گا چند احادیث آیۃ کریمہ کا وسیع تر مفہوم ثابت کرنے کیلئے پیش کر دیں ورنہ "فی رذائل النفس ومحامدها احادیث لا تکاد تحصی" نفس کے رذیل کاموں اور اچھے کاموں کے متعلق بے شمار احادیث ہیں، جن کا ذکر یہاں کئی جلدوں کا تقاضا کرتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ﴾

"تو بخشش فرمائے گا جس کی چاہے گا، اور عذاب دے گا جسے چاہے گا۔"

یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی کو معاف فرمانے کا ارادہ فرمائے گا تو معاف فرما دے گا اور اگر اس نے عدل کرتے ہوئے کسی کو اس کے گناہوں کا عذاب دینا چاہا تو اسے عذاب دے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ عذاب دینا چاہے یا مغفرت کرنا چاہے وہ اس پر قادر ہے "ان شاء عذب علی الصغیرة وان شاء غفر الکبیرة من غیر توبة" اگر چاہے تو چھوٹے گناہوں پر عذاب دے دے اور اگر چاہے تو بغیر توبہ کے کبیرہ گناہوں کو معاف کر دے" لا یمکن لا حد الا عتراض علیه" کسی ایک کو اس ذات پر اعتراض کرنا ممکن نہیں۔

معاصی کے حساب پر اجماع امت ہے:

اہل سنت و جماعت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ معاصی پر حساب حق ہے خواہ ان گناہوں کا تعلق جسم سے ہو یا نفس سے ہو یا دل سے ہو۔ اور صغائر گناہوں یا کبائر ان پر عذاب دینا حق ہے لیکن واجب نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو مغفرت فرمائے، چاہے تو عذاب دے۔

❁ "روی طاؤس عن ابن عباس قال فیغفر لمن یشاء الذنب العظیم یعنی سواء تاب عنه المذنب اولم یتب ویعذب من یشاء علی الذنب الصغیر لا یسئل عما یفعل"

طاؤس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ﴾ (بخشش فرمائے گا جسے چاہے گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہے تو گناہ کبیرہ کی مغفرت فرما دے خواہ وہ گنہگار توبہ

کرے یا نہ کرے اور چاہے تو صغائر گناہوں پر عذاب دے دے، رب تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

معتزلہ و روافض اس کے منکر ہیں:

یعنی معتزلہ اور روافض حساب کا انکار کرتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے "یجب العذاب علی العصاۃ" نافرمانوں، گنہگاروں کو عذاب دینا واجب ہے۔ اہل سنت و جماعت کے مذہب پر یہ آیۃ کریمہ روز روشن کی طرح واضح دلیل ہے کہ مغفرت و عذاب اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے۔

❁ "عن عائشة رضی الله عنها ان النبی ﷺ قال لیس احد یحاسب یو م القیا مة الا هلک قلت اولیس یقول الله تعالی ﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيرًا ﴾ فقال انما ذلک العرض ولکن من نوقش فی الحساب یهلک" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کوئی ایک بھی نہیں ہوگا کہ اس کا حساب لیا جائے مگر یہ کہ وہ ہلاک ہوگا۔ تو میں نے عرض کیا کہ کیا رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ جلدی سہل حساب لے گا، آپ نے فرمایا یہ اس کے سامنے پیش کیا جانا ہے، اگر حساب میں گرفت ہوئی تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

یعنی حساب ہونا تو حق ہے کہ رب تعالیٰ کے سامنے نیکیوں اور گناہوں کو پیش کیا جائے گا، لیکن اگر حساب میں کسی کی گرفت ہوگئی تو وہ ہلاک ہو جائے گا، اس سے بھی واضح ہوا کہ گرفت میں واقع ہونے پر اللہ تعالیٰ کی مشیت کا دخل ہوگا، گرفت واقع ہونا لازم نہیں۔

"قال صاحب الفائق یقال ناقشه الحساب اذاعاسره فیه و استقیصی فلم یترک قلیلا ولا کثیرا"
مناقشہ یہ ہے کہ مشکل حساب لیا جائے۔ قلیل اور کثیر عمل کو نہ چھوڑا جائے، انتہائی چھانٹ بینٹ کی جائے۔

"والعرض هو ابراز الاعمال واظهارها فیقر صاحبها بذنوبه لم یتجاوز عنها لاظهار الفضل کما ان المنا قشة لبیان ظهور العدل عرض الاعمال"
عرض کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کو ظاہر کرنا کہ انسان اپنے گناہوں کا اقرار کر لے، پھر اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے، اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا، اور مناقشہ میں سخت حساب ہوگا، کسی چھوٹے بڑے عمل سے درگزر نہیں کیا جائے گا یہ اظہار عدل ہوگا۔ (از مرقاۃ ج۱۰ ص۲۶۱)

❁ "عن عدی بن حاتم قال قال رسول الله ﷺ ما منکم من احد الا سیکلمه ربه لیس بینه و بینه ترجمان ولا حجاب یحجبه فینظر أیمن منه فلا یری الاماقدم من عمله وینظر أشام منه فلا یری الاما قدم

وینظر بین یدیه فلایری الا النار تلقاء وجهه فاتقوا النار ولو بشق تمرة" (بخاری ومسلم، مشکوۃ باب الحساب)

عدی بن حاتم کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک شخص نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس سے اس کا رب کلام کرے گا، اس بندے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، اور نہ ہی کوئی حجاب ہوگا، تو وہ دائیں جانب دیکھے گا تو اسے اور کچھ نظر نہیں آئے گا سوائے اس کے کہ اس نے جو عمل آگے بھیجے ہوں گے، اور اپنی بائیں جانب دیکھے گا تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا سوائے اس کی جو اعمال اس نے آگے بھیجے ہونگے اور آگے دیکھے گا تو اسے سوائے آگ کے کچھ نظر نہیں آئے گا تو آگ سے بچ جاؤ اگر چہ کھجور کے کچھ حصہ (صدقہ کرنے) سے۔

وضاحت حدیث: رب تعالیٰ کا بغیر ترجمان کے مؤمن بندوں سے کلام کرنا اور بے حجاب ان کو زیارت کرانا، اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، جو اس کی شان کے لائق ہوگا اسی کے مطابق کلام فرمائے گا اور اسی کے مطابق ان کو اپنی زیارت کرائے گا، اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤمنین اس کے کلام کو خود بخود سمجھیں گے کسی کو درمیان میں ترجمان بنانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

"مامنکم من احد" من مزیدة لاستغراق النفی والخطاب للمؤمنین"

"من" زائد ہے، استغراق نفی کیلئے ہے یعنی نکرہ تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم کا فائدہ دے رہا ہے اور خطاب مؤمنوں کو ہے یعنی مطلب یہ ہوا "کہ اے مومنو! کوئی ایک بھی تم میں سے نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس کا رب تعالیٰ اس سے کلام کرے گا" الخ۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

"**ترجمان**" کو زعفران کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے اور جیم پر پیش اور تاء پر زبر سے بھی اور تاء اور جیم دونوں کے پیش سے بھی پڑھا گیا ہے تاء کلمہ کیا ہے۔ "ترجم یترجم ترجمة" باب فعللة ہے۔ مترجم کو مدحرج کے وزن پر پڑھا جائے، متصرف کے وزن پر باب تفعلل پر پڑھنا درست نہیں۔

"ولا حجاب" ای حاجز وساتر ومانع بینه وبینه (یحجبه) ای یحجب ذلک العبد من ربه"

اس بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ، کوئی پردہ، کوئی ممانعت نہیں ہوگی جو اس بندے کو اپنے رب سے دور رکھے اور حجاب بن جائے۔

"أیمن" دائیں جانب "أشأم" بائیں جانب یعنی دائیں جانب دیکھے گا تو اسے اپنے اچھے اعمال نظر آئیں گے اور بائیں جانب دیکھے گا تو اسے اپنے برے اعمال نظر آئیں گے، اس کے بغیر اور اسے کچھ نہیں دکھائی دے گا۔

دائیں بائیں دیکھنے کی وجہ:

"اذا دهمه امران يلتفت يمينا وشمالا لطلب الغوث" جب کوئی معاملہ پریشان کن انسان کو درپیش آتا ہے تو وہ دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ کوئی میری فریاد کو پہنچنے والا مل جائے۔

"ويحتمل ان يكون سبب الالتفات انه يترجي ان يجد طريقا يذهب فيها لتحصل له النجاة من النار فلايرى الامايفضي به الى النار"

اور دائیں بائیں دیکھنے کی یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ انسان ایسی گھڑی میں نجات کی راہ تلاش کرتا ہے خصوصا قیامت کی گھڑی میں وہ آگ سے بچنے کی راہ دیکھے گا، لیکن سوائے نار کے راستہ کے اسے اور کوئی راستہ نہیں نظر آئے گا۔

"فاتقوا النار "اذا عرفتم ذلك فاحذروا منها ولا تظلموا احدا"

آپ کا ارشاد گرامی "تو آگ سے بچو" اس کا مطلب بائیں جانب اعمال ہوں، آگے آگ ہو گی تو اس سے ڈرو اور کسی پر ظلم نہ کرو۔

"ولو بشق تمرة" اى فتصدقوا ولو بشق تمرة اى ولو بمقدار نصفها او ببعضها و المعنى ولو بشيء يسير منها أو من غيرها فانه حجاب وحاجز بينكم وبين النار فان الصدقة جنة ووسيلة الى جنة"

"تو آگ سے بچو اگر چہ کھجور کے کچھ حصہ سے" اگر چہ کھجور کا نصف حصہ دے یا کچھ حصہ دے مطلب صرف کھجور ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ خواہ تھوڑا سا حصہ کھجور کا صدقہ کرے یا کوئی چیز اور تھوڑی مقدار میں صدقہ کر دے تو وہ اس بندے اور آگ کے درمیان حجاب اور آڑ بن جائے گی، بیشک صدقہ ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہے۔

❁ "عن عدى بن حاتم مرفوعا اتقوا النار ولو بشق تمرة فان لم تجدوا فبكلمة طيبة"

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ سے بچو اگر چہ کھجور کے ایک حصہ کو صدقہ کرنے سے اگر تم نہ پاؤ تو کلمہ طیبہ سے۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

یعنی تھوڑے سے صدقہ سے جو خلوص نیت سے ہو جہنم کی آگ سے بچا جا سکتا ہے اگر معمولی چیز بھی صدقہ کرنے کی طاقت نہیں تو کلمہ طیبہ سے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے کلمہ طیبہ کا ذکر کر کے اپنے آپ کو بچائے ایک احتمال یہ ہے اور دوسرا قوی احتمال جو عام شارحین نے لیا ہے وہ یہ ہے کہ اچھا کلام کر کے با اخلاق طریقہ سے لوگوں سے گفتگو کر کے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ سائل سے نرم گفتگو کر کے اسے جواب سے کہ میرے پاس اس وقت کوئی مال نہیں کہ میں تمہیں دوں یہ بھی جہنم کی آگ سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ بزیادۃ ج ۱۰ ص ۲۶۲)

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ ان اللہ یدنی المؤمن فیضع علیه کنفه ویستره فیقول اتعرف ذنب کذا اتعرف ذنب کذا فیقول نعم ای رب حتی قرره بذنوبه ورأی فی نفسه انه قد هلک قال سترتها علیک فی الدنیا وانا اغفرها لک الیوم فیعطی کتاب حسناته واماالکفار والمنافقون فینادی بهم علی رؤس الخلائق هؤلاء الذین کذبوا علی ربهم ألا لعنة الله علی الظالمین"

(بخاری ومسلم مشکوۃ باب الحساب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ مؤمن کو اپنے قریب کرے گا اور اس پر اپنا دست قدرت رکھے گا اور اسے ڈھانپ لے گا پھر کہے گا کیا تم اپنے اس طرح کے گناہوں کو جانتے ہو کیا تم اپنے اس طرح کے گناہوں کو جانتے ہو؟ تو وہ کہے ہاں اے میرے رب یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلے گا (کہ ہاں میں اپنے یہ گناہ پہچانتا ہوں کہ میں نے یہ گناہ کئے ہیں) وہ اپنی ذات میں دیکھے گا کہ بیشک وہ ہلاکت میں پڑ گیا تو رب تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہاری دنیا میں پوشی کی اور میں آج تمہاری ان گناہوں سے مغفرت کررہا ہوں تو اسے نیکیوں والا اعمال نامہ دے دیا جائے گا لیکن کفار اور منافقین کو تمام مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب تعالیٰ کی تکذیب کی خبردار اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ظالموں پر۔

وضاحت حدیث:

"**یدنی**" کی یاء پر ضمہ (پیش) ہے "ای یقربه کرامة لا قرب مسافة فأنه سبحانه یتعالی عن ذلك" اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے قریب کرے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے رحمت کے قریب کرے گا وہ مقرب ہوگا یعنی رب تعالیٰ کے ہاں مکرم ہوگا قرب مکانی مراد نہیں یہ معنی کرنا باطل ہوگا کہ وہ مسافت کے لحاظ پر بندے کو اپنے مکان کے قریب کرے گا کیونکہ رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے مکان کا محتاج جسم ہوتا ہے جب رب تعالیٰ جسم سے پاک ہے تو مکان سے بھی پاک ہے۔

"فیضع علیه کنفه بفتحتین ای یحفظه مستعار من کنف الطائر وهو جناحه لانه یحوط به نفسه ویصون به بیضته"

یعنی "کنف الطائر" لفظ بولا جاتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے پرندے نے اپنے پر بچھائے جس کی وجہ سے پرندہ اپنے آپ کو بھی بچاتا ہے اور اپنے انڈوں کو بھی یہاں مجازی معنی لیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی حفاظت میں لے گا یعنی اس پر اپنا دست قدرت اور اپنا دست شفقت ورحمت رکھے گا۔ "ویستره" اور اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

"یعنی یستر عن اهل المؤقف کیلا یفتضح وقیل ای یطهر عنایة علیه ویصونه عن الخزی بین اهل

المؤقف"

اللہ تعالی اپنے بندے کو اپنے رحمت کے پردے میں لے گا تا کہ وہ میدان قیامت میں کھڑے دوسروں لوگوں سے رسوانہ ہو یعنی اللہ تعالی اس پر اپنی عنایت ظاہر فرمائے گا اور اس کو رسوائی سے بچائے گا۔

"فیقول اتعرف ذنب کذا اتعرف ذنب کذا" رب تعالی فرمائے گا کیا تو اپنے فلاں گناہ کو جانتا ہے کیا تو اپنے فلاں گناہ کو جانتا ہے یہ سوال دومرتبہ کر کے اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالی تمھارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے۔"فیقول نعم ای رب حتی قررہ بذنوبہ" وہ کہے گا اے میرے رب ہاں میں اپنے گناہوں کو جانتا پہچانتا ہوں یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے گا یعنی اسے اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا کیونکہ جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ رب تعالی تو میرے دلوں کے رازوں پر بھی مطلع ہے تو سوائے اقرار کرنے کے اس کیلئے کوئی راہ نہیں رہے گی۔

"ورای فی نفسہ" ای ظن المؤمن فی باطنہ (انہ قد ھلک) ای مع الھالکین ولیس لہ طریق مع الناجین "

یعنی مومن کے دل میں یہ گمان پیدا ہوگا کہ اب میں نے ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہی ہونا ہے نجات حاصل کرنے والوں کا ساتھ اور قرب مجھ جیسے گنہگار کو کیسے نصیب ہوگا؟ یہ تو بہت مشکل ہے۔

"ورای فی نفسہ" کے معنی میں ایک اور احتمال یہ ہے کہ ضمیریں "اللہ" کی طرف لوٹیں تو اب معنی یہ ہوگا "علم اللہ فی ذاتہ انہ ھلک ای المؤمن" اللہ تعالی کو ذاتی علم حاصل ہے کہ مومن اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے از روئے عدل مستحق ہلاکت ہو چکا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالی فرمائے گا میں نے تمھاری دنیا میں پردہ پوشی کی میں آج بھی تمھاری مغفرت کر رہا ہوں تو اسے نیکیوں کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ لیکن کفار اور منافقین کے متعلق تمام مخلوق کے سامنے اعلان کر کے کہا جائے گا کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالی کی تکذیب کی اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائے خبردار اللہ تعالی کی لعنت ہے ظالموں پر یعنی مشرکین اور منافقین پر اللہ تعالی کی لعنت ہو اس طرح تمام مخلوق کے سامنے اس کی رسوائی ہوگی۔ (از مرقات ج ۱۰ ص ۲۶۲)

❁ "وعن ابی موسی قال قال رسول اللہ ﷺ اذا کان یوم القیامۃ دفع اللہ الی کل مسلم یھودیا او نصرانیا فیقول ھذا فکاکک من النار" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الحساب)

حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالی ہر مسلمان کو یہودی یا نصرانی دے گا اور فرمائے گا یہ تمہیں آگ سے بچائے گا۔

وضاحت حدیث: اصل میں ہر شخص کے دو دو ٹھکانے ہیں ایک جنت میں اور ایک جہنم میں

جس شخص نے صدق دل سے ایمان قبول کرلیا تو اللہ تعالی اسکے جہنم کے ٹھکانے کو جنت کے ٹھکانے سے بدل دے گا اور جس نے کفر کیا اللہ تعالی اس کے جنت کے ٹھکانے کو جہنم کے ٹھکانے سے بدل دے گا یعنی کافر مؤمنین کے آگ کے ٹھکانوں میں پہنچ جائیں گے گویا کہ ان کے نائب اور خلیفہ ہوں گے یہی معنی ہے (هذا فكاكك) ای خلاصک (من النار) کا۔اس مندرجہ بالا ترجمہ پر مرقاۃ کی عبارت کو طلباء کرام دیکھیں وہ یہ ہے۔

"لما كان لكل مكلف مقعد من الجنة ومقعدمن النار فمن امن حق الايمان بدل مقعده من النار بمقعد من الجنة ومن لم يؤمن فبالعكس كانت الكفر كالخلف للمؤمنين في مقاعد هم من النار والنائب منا بهم فيها"

یهود ونصاری کی تخصیص کی کیا وجه ؟

"ولعل تخصيص اليهود والنصارى بالذكر لاشتهار هما بمضادة المسلمين ومقابلة هما اياهم في تصديق الرسول المقتضى لنجالهم"

یہود نصاری کو ذکر فرمایا حالانکہ تمام کفار کی جنتوں میں سے نشستوں کو بدل کر جہنم میں انہیں نشستیں دے دی جائیں گے گویا کہ وہ مسلمانوں کی جہنم کی نشستوں میں پہنچ جائیں گے،اس طرح ہر کافر مسلمان کا جہنم میں بدل ہوگا،لیکن یہود ونصاری مسلمانوں کے کھلے دشمن تھے،اور مسلمانوں نے جو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کر کے اپنی نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا یہ ان کو ناپسند تھا،اسی وجہ سے ان کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔

تنبیه: مجازی معنی ہی مراد ہے کیونکہ جب ہر شخص کے دو دو ٹھکانے ہوتے ہیں جہنم میں بھی اور جنت میں بھی،تو مسلمان کو جنت میں اپنا مکان بھی ملنا ہے اور کافر کا چھوڑا ہوا بھی اور کافر کو جہنم میں اپنا مکان بھی ملنا ہے اور مسلمان کو جہنم سے نجات حاصل ہونے کی وجہ سے اس کا مکان بھی کافر کو ملنا ہے تو گویا کہ کافر مؤمن کا بدل ہوگا جہنم کے مکان میں۔یہ بھی خیال رہے بعض روایات میں مطلقا کفار کا بھی ذکر ہے،اور "فکاک" کی جگہ "فداء" کا ذکر ہے۔

❁ "عن ابى موسى قال قال رسول الله ﷺ اذكان يوم القيامة بعث الله تعالى الى كل مؤمن ملكامعه كافر فيقول الملك للمؤمن يامؤمن هاك هذاالكافرفهذا فداؤك من النار"

(رواه الطبرانی والحاکم)

ابو موسی ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالی ہر مؤمن کی طرف ایک فرشتہ بھیجے گا اس کے ساتھ ایک کافر بھی ہوگا،وہ فرشتہ مؤمن کو کہے گا اے مؤمن یہ کافر ہے،یہ تمہارا آگ سے آزاد کرنے کا فدیہ ہے۔ (از مرقاۃ ج ۱۰ص ۲۶۳)

❁ "وعن انس قال كنا عند رسول الله ﷺ فضحک فقال هل تدرون مما أضحک قال قلنا الله ورسوله أعلم قال من مخاطبة العبد ربه يقول يارب الم تجرني من الظلم قال يقول بلى قال فيقول فاني لااجيز على نفسي الاشاهدا مني قال فيقول كفى بنفسک اليوم عليک شهيدا وبالكرام الكاتبين شهودا قال فيختم على فيه فيقال لأركانه انطقي قال فتنطق باعماله ثم يخلى بينه وبين الكلام قال فيقول بعدا لكن وسحقا فعنكن كنت اناضل" (رواه مسلم،مشکوۃ باب الحساب)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے رسول اللہ ﷺ مسکرائے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم میرے مسکرانے کی وجہ کو جانتے ہو؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا (میرے مسکرانے کی وجہ) بندے کا اپنے رب سے خطاب ہے، بندہ کہے گا اے میرے رب! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ رب تعالی فرمائے گا کیوں نہیں (یعنی ظلم سے تو میں نے تمہیں پناہ دے دی ہے) تو رب تعالی فرمائے گا کہ میں اپنے لئے کوئی فیصلہ کرنا بغیر گواہوں کے جائز نہیں سمجھتا، آج تمہارا اپنا نفس ہی تمہارے خلاف گواہی دینے کیلئے کافی ہے اور" کراما کاتبین" گواہی کیلئے کافی ہیں، پھر اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی، اس کے اعضاء کو کہا جائے گا تم کلام کرو، تو وہ اس کے اعضاء بول کر بتائیں گے کہ اس کے یہ عمل تھے، پھر اس کے اور اس کے کلام کے درمیان رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے گا یعنی مہر کو ختم کردیا جائے گا، تو وہ کہے گا ہائے ہلاکت، (اے میرے اعضاء) کیا میں اسی لئے تمہاری طرف سے مدافعت کرتا رہا۔

وضاحت حدیث: یہی مفہوم قرآن پاک کے تیسویں پارہ میں موجود ہے، تفصیلی تذکرہ تو وہاں ہی انشاءاللہ آئے گا، البتہ صرف چند الفاظ مبارکہ اور ان کے ترجمہ کو دیکھ لیا جائے۔

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾

" آج ہم ان کے منہوں پر مہر لگا رہے ہیں ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے، اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے"۔

اور دوسری آیۃ میں ذکر فرمایا، ﴿تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ﴾ ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان پر گواہی دیں گے۔

"بعدا" دوری "وسحقا" بضم وسكون وبضم اى هلاكا"

"سحقا" کے سین پر پیش ہے اور حاء ساکن بھی اور پیش سے بھی پڑھی گئی ہے، معنی اس کا ہے" ہلاک ہونا"

"والمناضلة المراماة بالسهام والمراد هنا المحاجة بالكلام"

"مناضلة" کا معنی آمنے سامنے سے ایک دوسرے کو تیر مارنا، لیکن یہاں مراد ہے کلام سے حجت پیش کرنا۔

"بعدا لكن وسحقا" اى فيقول العبد للاركان اى البعدن واسحقن"

یعنی بندہ اپنے اعضاء کو کہے تم دور ہو جاؤ، برباد ہو جاؤ یا کہے گا ہائے ہلاکت، ہائے بربادی۔

"فعنکن کنت اجادل، ای عن قبلکن ومن جھتکن ولأجل خلاصکن اجادل واخاصم وادافع"

میں تمہاری طرف سے "تمہاری وجہ سے" تمہیں بچانے کے لئے جھگڑا کرتا رہا اور مدافعت کرتا رہا۔ یعنی

وہ بطور تعجب یا بطور اضطرار اپنے اعضاء کو کہے گا

"اخاصم لخلاصکن وانتن تلقین انفسکن فیھا"

میں تمہیں بچانے کی غرض سے تمہاری طرف سے مخاصمت کرتا رہا، لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ تم خود ہی

اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی میں ڈال رہے ہو۔

اسی مضمون کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

وہ لوگ اپنے چمڑوں کو کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، وہ کہیں گے ہمیں اس ذات نے

بولنے کی طاقت دی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت دی، اور اسی نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی

طرف تمہیں لوٹایا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج۱۰ص۲۶۵)

بغیر حساب کے جنت میں جانے کا مطلب:

❁ "عن ابی امامة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول وعدنی ربی ان یدخل الجنة من امتی سبعین الفا لاحساب علیھم ولاعذاب مع کل الف سبعون الفا وثلاث حثیات من حثیات ربی"

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ باب الحساب)

ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ

فرمایا کہ وہ میری امت سے ستر ہزار لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا ان پر کوئی حساب نہیں ہوگا اور نہ ان

پر عذاب ہوگا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر، ستر ہزار اور ہوں گے، میرے رب کے تین قبضوں میں ہوں گے۔

وضاحت حدیث: ستر ہزار کا لفظ کبھی بیان عدد کیلئے آتا ہے کہ یہ معین تعداد ہے لیکن کبھی بیان

کثرت کیلئے آتا ہے جسکا مطلب ہوتا کثیر تعداد اس صورت میں تعداد معین نہیں ہوتی بلکہ ستر ہزار سے زائد بھی مراد

ہوتے ہیں یہاں بیان کثرت ہی مراد ہے۔ "لاحساب علیھم ای لامناقشة لھم فی المحاسبة" (ان پر کوئی

حساب نہیں ہوگا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر بالکل حساب نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر حساب میں

مناقشہ نہیں ہوگا،صرف ان کے اعمال ان پر پیش ہوں گا،جن کا ان کو علم حاصل ہوگا،ان پر فضل ہی فضل ہوگا،راقم کہتا ہے "لاحساب علیھم" میں لفظ "علی" سے ہی یہ پتہ چل رہا ہے کہ حساب ان کے خلاف نہیں ہوگا یعنی نفی ضرررساں حساب کی ہے، مطلق حساب کی نہیں۔"ثلاث حثیات من حثیات ربی" سے بھی پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہا کی امت کے لوگ کثیر تعداد میں رب تعالی کے فضل سے جنت میں جائیں گے،ان پر حساب میں تنگی نہیں ہوگی۔

"الحثیة والحثوة یستعمل فیمایعطیه الانسان بکفیه دفعة واحدة من غیر وزن وتقدیر ثم تستعار لما یعطی من غیر تقدیر"

جب دونوں ہاتھوں سے بغیروزن اور بغیر اندازے کسی کو دیا جائے تو اس کیلئے عربی میں "حثیة" اور "حثوة" الفاظ استعمال ہوتے ہیں، پھر مجازی طور پر مطلقاً معنی لیا جاتا "بغیر اندازے کے دینا، بے حساب دینا" یعنی وہ لوگ اتنی تعداد میں ہوں جو رب تعالی کے دو ہاتھوں میں تین مرتبہ سمائیں گے، رب تعالی چونکہ ہاتوں سے پاک ہے، اور اس کے قبضہ قدرت میں آنے کی کوئی حد بیان نہیں ہوسکتی، لہذا آسان معنی یہی ہوگا کہ وہ لوگ جو جنت میں بغیر تنگی حساب کے جائیں گے وہ کثیر تعداد میں ہوگے، ان کی تعداد کو رب تعالی ہی جانتا ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ویمکن حمله علی النجلی الصوری" کہ رب تعالی کے قبضہ میں ہونے کا یہ مطلب لینا بھی ممکن ہے کہ رب تعالی ان کو اپنی ظاہر تجلیات سے مشرف فرمائے گا۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج۱۰ ص ۲۶۸)

❁ "وعن الحسن عن ابی هریرۃ قال قال رسول اللهﷺ یعرض الناس یوم القیامة ثلاث عرضات فاما عرضتان فجدال ومعاذیر واما العرضة الثالثة فعندذلک تطیر الصحف فی الایدی فآخذ بیمینه واخذ بشماله" رواہ احمد والترمذی" وقال لایصیح هذالحدیث من قبل ان الحسن لم یسمع من ابی هریرۃ وقد رواہ بعضهم عن الحسن عن ابی موسی"

(مشکوۃ باب الحساب)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حضرت ابوہریرہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہا نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن تین مرتبہ پیش کیا جائے گا، دو مرتبہ تو جھگڑا اور عذر ہوگا لیکن تیسری مرتبہ اعمال نامے ان کے ہاتھوں میں دے دئے جائیں گے، کسی کے دائیں ہاتھ میں اور کسی کے بائیں ہاتھ میں۔

وضاحت حدیث: قیامت کے دن لوگوں کو اللہ تعالی پر پیش کیا جائے گا تین مرتبہ، لیکن پہلی مرتبہ وہ اپنے نفسوں سے دفاع کریں گے۔"ویقولون لم یبلغنا الانبیاء ویحاجون الله تعالی" اور کہیں گے ہم تک انبیاء نے تیرے احکام نہیں پہنچائے تھے، اس طرح وہ اللہ تعالی کے حضور حجت بازی سے کام لیں گے اور جھگڑا

کریں گے۔اور دوسری مرتبہ، "یعترفون ویعتذرون بأن یقول کل فعلته سهوا او خطأ او جهلا اور جاء ونحو ذلک" وہ اعتراف کرلیں گے اور عذر پیش کریں گے کہ اے اللہ ہم سے تیری احکام کی عدولی بھول کر ہوئی، یا کہیں گے حکم عدولی حطاء سے ہوئی، یا جہالت سے حکم عدولی کا قول کریں گے، یا کہیں گے تیری رحمت کی امید ہے، اس طرح وہ عذر پیش کریں گے، حیلے بہانے تراشیں گے، تیسر مرتبہ جب بندوں کو رب تعالی کے حضور پیش کیا جائے گا تو سب کے اعمال نامے متفرق کر کے اہل سعادت (نیکوں) کے دائیں ہاتھ میں دے دیے جائیں گے، اور اہل شقاوت (بدبختوں) کے بائیں ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے۔

"تطاير الصحف ای تفرقها الی کل جانب" "تطاير الصحف" کا معنی یہ ہے کہ ہر جانب نامہ اعمال کو پھیلا دیا جائے گا، یعنی تیسری مرتبہ جلدی ہی مکمل فیصلہ کر دیا جائے گا، چونکہ بعض روایات میں الفاظ ہی "یسرع وقوعها" کے ہیں کہ جلدی واقع ہو جائے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ترمذی نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے براہ راست نہیں سنا، اس لئے اس کی سند میں انقطاع ہے، سند متصل نہیں۔

" لكن قال الشيخ الجزری فی تصحيح المصابيح بيع ان البخاری اخرج فی صحيحه الحسن عن ابی هريرة ثلاث احاديث"

شیخ جزری رحمہ اللہ نے تصحیح المصابیح میں یہ بیان کیا ہے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے تین حدیثیں روایت کی ہیں۔

" اما مسلم فلم يخرج للحسن عن ابی هريرة شيا "

لیکن مسلم نے ایسی کوئی حدیث بیان نہیں کی جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے ہو۔

لیکن اس پر خوبصورت تحقیقی تبصرہ حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا دیکھئے، کیا خوب ذکر فرمایا۔

" اقول ولايلزم من عدم اخراج مسلم حديث عنه انه لايصح اسناده اذشرط البخاری وهو تحقق اللقاء ولومرة اقوی من شرط مسلم وهو مجرد وجود المعاصرة "

میں کہتا ہوں کے مسلم نے اگر کوئی حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے نہیں ذکر کی تو اس سے حدیث کا غیر صحیح ہونا تو لازم نہیں آتا۔ جب بخاری نے تین روایات ذکر کردی ہیں تو ان کی ملاقات تو ثابت ہو

گئی۔ کیونکہ بخاری کے نزدیک تو روایت کیلئے صرف ہم زمان ہونا کافی نہیں بلکہ کہیں ایک مرتبہ ملاقات کا پایا جانا ضروری ہے۔جبکہ مسلم کے نزدیک تو روایت کیلئے صرف ان دونوں یعنی راوی اور مروی عنہ (جس سے روایت کی گئی) کا ہم زمان ہونا ہی کافی ہے ملاقات نہ بھی ثابت ہو تو پھر بھی روایت صحیح ہے جب بخاری کی شرط مسلم کی شرط سے سخت اور قوی ہے تو یقیناً حضرت بصری رحمہ اللہ کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے قبول ہوگی، اور ان کی ملاقات بھی ثابت ہو جائے گی۔

اصل میں بعض الفاظ مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو غلط مسئلہ بیان کر کے بتا دیا جاتا ہے۔ترمذی کا یہ کہنا "لایصح هذا الحدیث من قبل ان الحسن لم یسمع من ابی هریرة" کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس وجہ سے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے براہ راست حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ بلکہ ترمذی کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث سند کے اتصال کے لحاظ پر صحیح نہیں، بلکہ منقطع ہے "صحیح الاتصال" کی نفی سے "ضعف" ثابت نہیں ہوتا بلکہ انقطاع ثابت ہوتا ہے۔وہ بھی ترمذی نے اپنے خیال سے مطابق بیان کیا ہے۔ورنہ بخاری کا تین حدیثوں کو روایت کرنا انقطاع کی نفی کر رہا ہے۔

تاہم ترمذی نے بھی آخر میں یہ بیان کر دیا "وقد رواه بعضهم عن الحسن عن ابی موسی" کہ تحقیق یہی روایت بعض حضرت نے حضرت حسن بصری کی حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔ گویا کہ وہ روایت جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے اسے تائید مل گئی اس روایت سے جو حضرت حسن بصری کی حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ سے ہے۔ بلکہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مؤلف نے اسماء الرجال میں بیان کیا ہے کہ،

"ان الحسن روی عن الصحابة کابی موسی وانس بن مالک وابن عباس وغیرهم"

بیشک حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کئی صحابہ سے روایات بیان کی ہیں، یعنی حضرت ابو موسی اور حضرت انس بن مالک اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی روایات ملتی ہیں بلکہ ان کے بغیر اور بھی کئی صحابہ سے آپ کی روایات ملتی ہیں۔ (مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۹)

طلباء کرام اس قسم کی بحثوں کو ضرور یاد کیا کریں تا کہ ان کو کوئی دھوکا نہ دے سکے کہ یہ حدیث تو صحیح نہیں ضعیف ہے ایسے جاہل کو بتایا جائے یہاں صحیح کی نفی سے انقطاع ثابت کیا گیا ہے ضعف نہیں، وہ بھی ترمذی کا اپنا موقف ہے جو بخاری کی روایات کے مقابل درست نہیں۔

کیسا وہ خوش قسمت ہوگا جس پر رب تعالیٰ کا فضل ہوگا:

"عن عبدا لله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ان الله سيخلص رجلامن امتى على رؤس الخلائق يوم القيامة فينشر عليه تسعة وتسعون سجلا كل سجل مثل مدالبصرثم يقول اتنكر من هذ ا شيا أظلمك كتبتي الحافظون فيقول لا يارب فيقول أفلك عذر قال لا يارب فيقول بلى ان لك عند نا حسنة وانه لا ظلم عليك اليوم فتخرج بطاقة فيها اشهدان لااله الاالله وان محمد اعبده ورسوله فيقول احضروزنك فيقول يارب ماهذه البطاقة مع هذا السجلات فيقول انك لا تظلم قال فتوضع السجلات في كفة والبطاقة في كفة فطاشت السجلات وثقلت البطاقة فلايثقل مع اسم الله شيء"
(رواہ الترمذی وابن ماجۃ مشکوۃ باب الحساب)

حضرت عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ ایک شخص کو میری امت میں سے پسند کرے گا، اسے قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اس پر (اس کے گناہوں کے) ننانوے دفتر کھول دیئے جائیں گے ہر دفتر انتہا نظر تک جائے گا، پھر رب تعالیٰ فرمائے گا کیا تو ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا میرے لکھنے والے محافظین (کراما کاتبین) نے تم پر ظلم تو نہیں کیا؟ وہ عرض کرے گا نہیں۔ (یعنی اے اللہ نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ کراما کاتبین نے مجھ پر ظلم کیا ہے) رب تعالیٰ فرمائے گا، کیا تیرا کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا نہیں، اے میرے رب (یعنی اے میرے رب میں کوئی عذر نہیں پیش کر سکتا) رب تعالیٰ فرمائے گا ہاں کیوں نہیں تمہاری ایک (بہت بڑی) نیکی ہمارے پاس موجود ہے۔ بیشک آج تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جائے گا جس میں "اشهدان لااله الاالله وان محمد اعبده ورسوله" لکھا ہوگا تو رب تعالیٰ اسے فرمائے گا تو اپنے وزن کرنے میں حاضر ہو جا تو وہ بندہ کہے گا اے میرے رب! یہ کاغذ کا ٹکڑا اتنے بڑے دفاتر کے سامنے کیا حیثیت رکھے گا، تو رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، اس کے (گناہوں کے) تمام دفاتر میزان کے ایک پلڑے (طرف) میں رکھ دیئے جائیں گے اور وہ کاغذ کا ٹکڑا دوسرے پلڑا (دوسرے حصہ) میں رکھ دیا جائے گا۔ وہ تمام دفاتر ہلکے ہوں گے، وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہوگا، اللہ تعالیٰ کے نام پر کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔

وضاحت حدیث : "**سيخلص** بتشديد اللام اى يختار" "سیخلص" کے لام پر شد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پسند کیا جائے گا، منتخب کیا جائے گا۔

"**فينشر** بضم الشين المعجمة اى فيفتح" "فینشر" کے شین پر پیش ہے، جس کا معنی ہے کھولا جانا"

"**سجلا**" بکسرتین فتشدید ای کتابا کبیرا " سجل " ک سے سین اور جیم کے نیچے زیر ہے اور لام پر شد ہے جس کا معنی ہے بڑی کتاب جسے عام محاورہ میں دفتر کہا جاتا ہے۔ "**کل سجل مثل مدالبصر**" ہر بڑی کتاب انتہاء نظر تک ہوگی۔ یعنی اس کے اعمال کی بڑی کتاب، اس کے اعمال کے دفتر کی لمبائی اور چوڑائی وہاں تک ہوگی جہاں تک انسان کی نظر کام کرتی ہے۔

"**کتبتی**" میں "کتبة" کے پہلے تینوں حرفوں پر زبر ہے۔ جمع ہے کاتب کی، رب تعالیٰ کا ارشاد' میرے لکھنے والے'' اس سے مراد "کراما کا تبین' فرشتے ہیں جو لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں۔ لوگوں کے اعمال کی حفاظت کرنے کی وجہ سے ان کو " حافظین "بھی کہا جاتا ہے۔

"**فیقول افلک عذر**" ہمزہ استفہام کا ہے، فاء علیحدہ، لام علیحدہ، کاف علیحدہ ہے۔ یعنی رب تعالیٰ فرمائے گا کیا تیرا کوئی عذر ہے کہ یہ کام تو نے بھول کر کئے تھے، خطاء سے کئے تھے، یا جہالت سے کئے تھے۔ وہ اعتراف حقیقت کرتے ہوئے گا کہے نہیں کوئی عذر نہیں پیش کر سکتا سب کچھ جان بوجھ کر گناہ کئے تھے۔

"**بطاقة**" بکسر الباء ای رقعة صغیرة " کاغذ کے چھوٹے ٹکڑے کو " بطاقة "کہا جاتا ہے۔
"فیقول احضروزنک" ای الوزن الذی لک اووزن عملک او وقت وزنک او آلة وزنک وھوالمیزان لیظھرلک انتفاء الظلم وظھور العدل وتحقق الفضل "

رب تعالیٰ جب اس کے سامنے کاغذ کا ٹکڑا پیش فرمائے گا تو کہے گا'' تو اپنے وزن میں حاضر ہو جا'' اس کے کئی مطالب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بامحاورہ کلام ہو کہ تو اپنا وزن دیکھ یعنی اپنا مقام دیکھ یا مطلب یہ ہو کہ تو اپنے اعمال کے وزن کے پاس حاضر ہو جا یا مطلب یہ ہو جب تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے اس وقت تم حاضر ہو یا مطلب یہ ہو کہ تم آلہ وزن یعنی میزان کے پاس حاضر ہو جاؤ، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور جب وہ عدل فرماتا ہے تو انسان کے گناہوں کے عظیم دفاتر کھل جاتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں کھل جاتی ہیں۔ جب وہ فضل فرماتا ہے تو ایک نیکی یعنی اس نے جو اپنی زندگی میں کلمہ شہادت پڑھا ہوگا اسی کو رب تعالیٰ اتنا وزن عطا فرما دے گا جو اس کے تمام گناہوں کے دفاتر پر بھاری ہو جائے گا۔

"**طاشت**" ہلکا ہو جانا، خفیف ہو جانا۔ "**ثقلت**" کا معنی بھاری ہو جانا۔ "فلا یثقل مع اسم اللہ شیء" اللہ تعالیٰ کے نام پر کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسان پر اپنا فضل فرمائے گا تو اس کا کلمہ شہادت پڑھنا اور رب تعالیٰ کے اسم گرامی کا ذکر کرنا۔ " لا یقاومہ شئ من المعاصی بل یترجح ذکر اللہ تعالی علی

جمیع المعاصی" سب پر بھاری ہوگا، کوئی گناہ اس کے مقابل نہیں آسکیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر تمام گناہوں پر راجح ہوگا۔
حدیث پاک کا مطلب تقریباً ترجمہ سے واضح ہے مشکل الفاظ کے معانی ذکر کر دیئے گئے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱۰ ص ۲۶۹،۲۷۰)

اعتراض : زیر بحث آیہ کریمہ میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ میں نفس میں چھپانے اور ظاہر کرنے پر حساب کا ذکر ہے۔ حالانکہ گناہ یا اچھے اعمال تو ظاہری اعضاء سے بھی سرزد ہوتے ہیں تو ظاہری اعضاء کا ذکر نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب : کہ اصل دارومدار دل کے پاک وصاف ہونے پر ہے "وبعد تزكية النفس وتصفية القلب لايصدر المعاصى الانادرا" کیونکہ نفس جب پاکیزہ ہوجائے اور دل صاف ہوجائے تو گناہ بہت کم ہی اس سے صادر ہوتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی شاہد ہے، "اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله" جسم میں ایک ٹکڑا (دل) ہے جب وہ درست رہے تو تمام جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے، فاسد ہوجائے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے، فاسد ہوجاتا ہے۔ نفس مطمئنہ سے گناہ کم ہی صادر ہوتے ہیں، نیکی کے کام ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

"والقلب المصفى عن الزيغ والكدورات يندم فوراويتوب الى الله متابابحيث يجعل الله سيأتهم حسنا ت وكان الله غفورا رحيما"

اور دل جب ٹیڑھا پن ہونے سے پاک ہوگا اور کدورت سے پاک ہوگا تو اگر غلطی سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو وہ انسان فوراً ہی اس پر پریشان ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اسے توبہ کی وجہ سے نیکیاں عطاء کرتا ہے کیونکہ توبہ خود ہی سب نیکیوں سے بڑھ کر عظیم نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کے بعد اسکے گناہ معاف کر دے گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

"عن ابى مسعود مرفوعا التائب من الذنب كمن لا ذنب له" (رواه ابن ماجه والبيهقى وعنه فى شرح السنة موقوفا)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے گناہوں سے توبہ کرلی اس کے گناہ ایسے معاف کر دیئے جائیں گے گویا کہ اس کے گناہ تھے ہی نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

اب واضح ہوگیا کہ نفس کے اعمال پر حساب کو مرتب کیوں فرمایا گیا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُo﴾ (البقرة،آیة نمبر ۲۸۵)

(1) رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اترا اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے اور عرض کی کہ ہم نے سنا اور مانا تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیرے طرف پھرنا ہے۔

(2) ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان اس کے رسولوں میں سے (ایمان لانے میں) اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی، تو مغفرت فرما ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

(ا) اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں جب اپنی کامل بادشاہی، کامل ملکیت، کامل علم اور کامل قدرت کا ذکر کیا جو کہ کمال صفات ربوبیت کو ثابت کر رہی ہیں۔ اس کے بعد بندے کی صفات بیان کیں کہ مؤمنین کامل طور پر رب تعالیٰ کے احکام پر سر جھکانے والے ہیں اور کامل مطیع ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور کامل عاجزی کا اظہار کرنے والے ہیں، یہ انسان کی کامل عبودیت کا تذکرہ ہے جیسا کہ پہلی آیۂ کریمہ میں کامل صفات ربوبیت کا تذکرہ ہے۔

" واذا ظهر لنا كمال الربوبية وقد ظهر منا كمال العبودية فالمرجو من عميم فضله واحسانه ان يظهر يوم القيامة فى حقنا كمال العناية والرحمة والاحسان،اللهم حقق هذا الأمل"

اللہ تعالیٰ نے جب ہمارے لئے اپنی کامل ربوبیت کو ظاہر فرما دیا، اور اس نے اپنے فضل و کرم سے ہماری کمال عبودیت کو بھی ظاہر فرما دیا تو ہمیں قوی امید ہے کہ اپنے فضل و احسان کی وجہ سے قیامت کے دن ہمارے حق میں کامل عنایت

اور کامل رحمت اور کامل احسان فرمائے گا۔ **اے اللہ!** ہم نے جو تیری مہربانیوں اور تیرے احسان ورحمت پر امید رکھی ہوئی ہے تو اس کو ہمارے حق میں ثابت فرما، ہماری اس دعاء کو رد نہ فرمانا بلکہ شرف قبولیت عطاء فرمانا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیۃ میں ذکر فرمایا ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ﴾ اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا تم چھپا کر رکھو اسے تو اس کا اللہ تم سے حساب لے گا'' تو اس سے واضح ہوگیا۔ ''لا یخفی علیه من سرنا وجهرنا وباطننا وظاهرنا شئی البتة'' کہ اللہ تعالیٰ پر ہمارے مخفی عمل اور ہمارے اعلانیہ عمل اور ہمارے ظاہری اور باطنی اعمال میں سے کوئی عمل بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہماری مدح اور ثناء کا تذکرہ فرمایا'' کہ ایمان والے اللہ کو اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔

''کانه بفضله یقول عبدی انا وان کنت اعلم جمیع احوالک فلااظهر من احوالک ولا اذکر منها الامایکون مدحالک وثناء علیک حتی تعلم انی کما انا الکامل فی الملک والعلم والقدرة فاناالکامل فی الجود والرحمة وفی اظهار الحسنات وفی الستر علی السیآت''

گویا کہ رب تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے یوں فرمارہا ہے، اے میرے بندے بیشک میں تیرے سارے احوال کو جانتا ہوں لیکن تیرے سارے احوال کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ صرف وہی ذکر کروں گا جن میں تیری مدح اور ثناء پائی جائے، یہاں تک کہ تجھے پتہ چل جائے کہ بیشک میں جس طرح بادشاہت وملکیت میں کامل ہوں اور علم وقدرت میں مجھے ہی کمال حاصل ہے تو اسی طرح جودورحمت میں بھی مجھے ہی کمال حاصل ہے، اے میرے بندے تیری نیکیوں کو ظاہر کرنے اور تیری برائیوں کی پردہ پوشی کرنے میں بھی مجھے ہی کمال حاصل ہے۔

(۳) رب تعالیٰ نے اس سورۃ (بقرۃ) کی ابتدا میں متقین کی مدح کی اور ان کی صفات بیان کیں۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ '' وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہمارے راہ میں خرچ کریں'' اب سورۃ کے آخر میں پھر امت مصطفیٰ ﷺ کی تعریف فرمائی جو اول سورۃ کے مطابق ہے، سورۃ کی ابتداء میں بیان فرمایا، ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ ''متقین وہ لوگ ہیں جو بے دیکھے ایمان لاتے ہیں'' اب سورۃ کے آخر میں بیان فرمایا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِہٖ﴾

''ایمان والے سب ہی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، اور

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے تمام رسولوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں کرتے''

سورۃ پاک کی ابتداء میں متقین کا اور وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ o﴾ ''اور وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو روزی دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' اور اب سورۃ کے آخر میں بیان فرمایا، ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''اور وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی، یعنی اے اللہ ہم نے تیرے ارشاد کو سنا'' ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو'' ہم اسے دل و جان سے تسلیم کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رب تعالی کے حکم کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا اور رب تعالی نے بھی ان کی مدح کی کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور سورۃ کی ابتداء میں ارشاد فرمایا ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ ''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں'' اور یہاں سورۃ کے آخر میں ذکر فرمایا ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ ''تو مغفرت فرما اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے''۔

یہ دلیل ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اسی لئے تو وہ دعاء کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہی مغفرت فرما اور ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور سورۃ کی ابتداء میں ذکر کیا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ''وہی ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور وہی کامیاب ہیں'' اور اب سورۃ کے آخر میں بیان کیا جا رہا ہے، ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب! ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم خطاء کر لیں'' گویا کہ سورۃ کی ابتداء میں ان کا رب تعالی کی طرف لوٹنے اور عاجزی کرنے کا ذکر ہے اور سورۃ کے آخر میں بھی ان کا رب تعالی کی طرف رجوع اور خضوع کا تذکرہ کیا۔ "فانظر كيف حصلت الموافقة بين اول السورة وآخرها" تو تو دیکھ سورۃ کی ابتداء میں اور سورۃ کی انتہاء میں کیسے موافقت حاصل ہے''

راقم کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ رب تعالی کا کلام قرآن پاک بے مثال ہے، رب تعالی نے اپنے فضل و کرم سے مفسرین کرام کو باکمال بنایا جنہوں نے قرآن پاک کے جواہر کو تحقیق کے سمندروں میں غوطہ زن ہو کر نکالا۔ (از کبیر)

شان نزول:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ '' تمہارے ظاہر و باطن کا اللہ تعالی حساب لے گا'' تو اس آیۃ کریمہ سے جب صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ ہمارے دلوں میں واقع ہونے والے وسوسوں اور ارادوں پر بھی گرفت ہوگی تو وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے، تو نبی

کریم ﷺ نے انہیں تسلیم ورضاء کا طریقہ سکھایا، اور نفس مطمئنہ کی صفات کریمہ پر توکل کرنے کا طریقہ سکھایا، تو اللہ تعالی نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرما کر صحابہ کرام کے تسلیم کرنے کی شہادت دی کہ ان کے دلوں سے حساب کے وہ خطرات زائل ہو گئے جو پیدا ہوئے تھے، ان کی نیتیں درست تھیں، انہوں نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کیا اور اپنے دلوں کو صاف کیا۔

"فان زوائل رذائل النفس مقتضی الایمان والایمان الحقیقی الکامل لایکون الابعد فناء النفس وزوال رزائلها"

ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ نفس کے رذیل کاموں کو دلوں سے زائل کیا جائے، اور کامل وحقیقی ایمان سوائے نفس کے فناء کرنے اور رذیل کاموں کے زائل کرنے کے حاصل نہیں ہوتا۔

آیۂ کریمہ میں اگرچہ مطلق مؤمنین کا تذکرہ ہے لیکن "والمطلق ینصرف الی الکامل" مطلق کامل کی طرف پھرتا ہے۔

"والمراد بالمؤمنین المؤمنون الموجدون فی ذلک الزمان وهم الصحابة ﷺ کما فی قوله تعالی ﴿یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

آیۂ کریمہ جن مؤمنین کے بارے میں نازل ہوئی اس سے مراد وہی مؤمنین ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے وہ صحابہ کرام تھے، جس طرح دوسری آیۂ کریمہ میں رب تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا اے نبی تمہیں اللہ کافی ہے اور وہ مؤمنین جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اس آیۂ کریمہ میں ﴿وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ سے مراد بھی صحابہ کرام ہی ہیں۔ ہاں البتہ صحابہ کرام کے وسیلہ جلیلہ سے۔

"التحق بهم من کان ایمانهم کایمانهم من اهل السنة والجماعة قال رسول الله ﷺ ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملتو تفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالوا من هی یا رسول الله ﷺ قال مانا علیه واصحابی" (رواه الترمذی عن عبد الله بن عمرو)

اہل سنت وجماعت کے لوگوں کو بھی ان کے ساتھ اس آیۂ کریمہ میں ملا لیا گیا جن کا ایمان صحابہ کرام کے ایمان کی طرح ہے، جن کے کامل ایمان کی گواہی خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی سے دی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سب آگ (جہنم) میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا وہ فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ جو میرے اور میرے صحابہ کی راہ پر ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

یہ خیال رہے کہ حدیث شریف میں امت سے مراد امت دعوت ہے، کہ حضور ﷺ کی طرف سے دعوت ایمان قیامت تک آنے والے لوگوں کو دی گئی، پھر جب لوگوں نے عقائد کفریہ رکھے وہ حقیقت میں امت اجابت میں داخل ہی نہیں خواہ وہ یہ دعوی بھی کرتے رہیں کہ ہم مؤمن ہیں، لھذا جن لوگوں کے عقائد کفریہ ہیں وہ سب جہنم کے مستحق ہوں گے، وہ کافر فرقے تہتر ہوں گے۔صرف وہ فرقہ جن کے عقائد وہی ہوں گے جو عقائد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے تھے وہ نجات حاصل کرنے والے لوگ ہوں گے،اس ایک ہی فرقہ میں سب حنفی ،شافعی، مالکی، حنبلی داخل ہیں، سب ہی اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اہل سنت و جماعت میں داخل ہیں۔

اصولی اور فروعی اختلاف کا فرق ضروری ذہن میں رکھا جائے گا، معمولی فروعی اختلاف کی وجہ سے کسی کو جہنمی نہ کہا جائے، ہاں کفریہ عقائد رکھنے والے لوگوں کو شخصی طور پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر یہ کہنا جائز ہوگا کہ جن لوگوں کے عقائد کفریہ ہیں وہ جہنمی ہیں، ان کے جہنمی ہونے پر حدیث مذکورہ شاہد ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

یہ آیۃ کریمہ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ رسول اللہ ﷺ پر معراج کی رات براہ راست نازل ہوئی، یہ قول حضرت حسن اور مجاہد اور ضحاک کا ہے، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔

"**وقال بعضهم جميع القرآن نزل به جبريل عليه السلام على محمد ﷺ الاهذه الأية فان النبی ﷺ هو الذی سمع ليلة المعراج**"

بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ تمام قرآن پاک جبریل کے واسطہ سے محمد ﷺ پر نازل ہوا سوائے اس آیۃ کے کہ یہ نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات کو خود براہ راست سنی۔

لیکن بعض حضرات نے کہا کہ یہ سورۃ مدنیہ ہے اور معراج کا واقعہ مکہ شریف میں پیش آیا، اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ یہ آیۃ کریمہ معراج کی رات براہ راست رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔

راقم کا موقف یہ ہے : کہ اس میں کوئی مشکل در پیش نہیں آرہی کہ یہ کہا جائے کہ یہ آیۃ کریمہ معراج کی رات رسول اللہ ﷺ پر براہ راست نازل ہوئی ہو، لیکن دنیا میں بواسطہ جبریل نازل ہونے تک امت پر آیۃ کریمہ کو پیش کرنے کی اجازت نہ دی ہو، پھر بعد از ہجرت بوقت ضرورت رسول اللہ ﷺ پر جبریل کے واسطہ سے نازل فرمادی تاکہ تمام قرآن پاک کا حکم ایک ہی رہے کہ یہ بواسطہ جبریل علیہ السلام نازل ہوا۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾

''ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کی طرف اس کے رب کی طرف'' سے۔

''الـــرَّسُوْل'' پر الف لام عہد خارجی ہے، اس سے مراد ہمارے رسول اللہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں، قرآن پاک میں آپ کا اسی لفظ سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ (البحر المحیط) پھر اکثر کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''رسول الله، رسوله'' یہ الفاظ جب مطلق ذکر کیے جائیں تو اس سے مراد ہمارے رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ہیں، کیونکہ مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے، آپ کو اس منصب رسالت میں کامل درجہ حاصل ہے۔

''وما انزل اليه من ربه شامل لجميع ما انزل اليه من الله تعالى من العقائد، وانواع الشرائع واقسام الاحكام في القرآن وفي غيره''

رسول اللہ ﷺ نے ایمان لایا اس پر جو نازل کیا گیا آپ پر آپ کی رب کی طرف سے، اس سے مراد عام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عقائد اور انواع شرائع کو نازل کیا اور قرآن پاک میں جتنے احکام آپ پر نازل کئے گئے اور اس کے علاوہ آپ کے دل پر جو القاء کیے گئے ان تمام پر آپ نے ایمان لایا۔ (البحر المحیط)

رسول اللہ ﷺ کے ایمان لانے کا کیا مطلب؟

''امن بان ذلک وحی من الله وصل اليه'' ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یقین آ گیا کہ جو کچھ آپ کے پاس پہنچا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے۔ (البحر المحیط)

علامہ رازی رحمہ اللہ ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ آیا، تو اس نے آپ کو کہا ''ان الله بعثک رسولا الى الخلق'' بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس فرشتے کے کلام کو سن کر رسول اللہ ﷺ کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ فرشتہ کے کلام کو سن کر بغیر کسی معجزہ کے اسے سچا مان لیں، اس لئے ضروری تھا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ معجزہ کو ظاہر فرمائے جس سے آپ کو فرشتہ کی صداقت کا پتہ چل جائے۔

''ولولا ذلک المعجز لجوز الرسول ان يكون ذلک المخبر شيطانا ضالا مضلا''

کیونکہ بغیر معجزہ کے عین ممکن تھا کہ فرشتہ کو نہ پہچانا جاتا اور وہم ہوتا کہ کہیں یہ آواز شیطان کی جانب سے تو نہیں، جو ہے ہی گمراہ، اور دوسروں کو بھٹکانے کی پوری کوشش صرف کرتا ہے، اگرچہ انبیاء کرام سے ناکام اور ذلیل ہو کر ہی لوٹتا ہے۔

''وذلک الملک ايضا اذا سمع كلام الله تعالى افتقر الى معجز يدل على ان المسموع هو كلام الله تعالى لا غير''

بلکہ فرشتے نے جب اللہ کا کلام سنا کہ یہ میرے نبی تک پہنچانا ہے تو فرشتہ بھی کسی نہ کسی معجزہ کا محتاج تھا کہ اسے یقین ہو جائے کہ یہ اللہ تعالی کا کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔

یہ مراتب معتبر ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ معجزہ قائم ہو کہ یہ سنا ہوا اللہ تعالی کا کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔ "فیعرف ذلک الملک بواسطۃ ذلک المعجز انہ سمع کلام اللہ تعالی" تاکہ فرشتے کو اس معجزہ کے ذریعے یقین ہو جائے کہ ہاں بیشک یہ اللہ تعالی کا ہی کلام ہے۔

اور ان میں سے دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی کو معجزہ عطاء کیا جائے، جس سے فرشتے کو اپنے دعوی میں سچا مانا جائے کہ "وانہ ملک بعثہ اللہ تعالی ولیس بشیطان" واقعی یہ فرشتہ ہے جس کو رب تعالی نے میرے پاس بھیجا، کوئی شیطان اپنی ناکام کوشش کرنے کیلئے نہیں آیا۔ اور ان میں سے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو وہ معجزہ دیا جائے جسے دیکھ کر امت تسلیم کرلے کہ ہاں یقینی بات ہے کہ یہ شخص اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے، معجزہ صرف اللہ کے رسول کو ہی عطاء کیا جاتا ہے۔

"فاذن لمالم یعرف الرسول کونہ رسولا من عنداللہ لاتتمکن الأمۃ من ان یعرفواذلک"

اس لئے کہ جب تک امت کو یہ پہچان حاصل نہیں ہوگی کہ یہ اللہ کا رسول ہے اس وقت تک وہ ایمان بھی نہیں لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا مطلب واضح ہوا:

کہ جب اس سورۃ بقرہ میں اللہ تعالی نے شریعت اور اس کے احکام کی مختلف انواع واقسام بیان فرمائی ہیں، تو اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ "رسول اللہ نے ایمان لایا" جس کا مطلب یہ واضح ہوا ہے کہ "ان الرسول عرف ان ذلک وحی من اللہ تعالی وصف الیہ" بے شک رسول اللہ ﷺ کے دل میں جب القاء کر دیا کہ یہ اللہ کا فرشتہ ہے، یہ تحریف کرنے سے پاک ہے، یہ بھٹکانے والا شیطان نہیں، جب یہ اوصاف اللہ تعالی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو عطاء کر دیئے تو آپ نے پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے وحی ہے، اسی کا نام ایمان الرسول ہے۔

قرآن پاک کی ترتیب بھی معجزہ ہے:

اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا پہلے ذکر کیا اور مؤمنین کے ایمان کا ذکر بعد میں اسکی وجہ یہ ہے کہ:

"ثم ذکر ایمان الرسول ﷺ بذلک وھو المرتبۃ المتاخرۃ وھو المرتبہ المتقدمۃ وذکر عقبہ ایمان المؤمنین بذلک المرتبۃ المتاخرۃ"

رسول اللہ ﷺ کے ایمان یعنی یہ پہچاننا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے اس کا مرتبہ مقدم ہے اور امت کے ایمان لانے کا مرتبہ مؤخر ہے اسلئے رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا ذکر بھی پہلے کیا اور مؤمنین کے ایمان کا ذکر بعد میں کیا گیا۔

"ومن تامل فی لطائف نظم هذه الصورة وفی بدائع ترتیبها علم ان القرآن کما انه معجز بحسب فصاحة الفاظه وشرف معانیه فهو ایضا معجز بحسب ترتیبه ونظم آیاته ولعل الذین قالوا انه معجز بحسب اسلوبه ارادوا ذلک"

جو شخص اس سورۃ پاک کے الفاظ مبارکہ کے لطائف اور اسکی عمدہ ترتیب میں غور وفکر کرے گا اسے یہ معلوم ہوجائے گا کہ جس طرح قرآن پاک الفاظ کی فصاحت اور معانی کی شرافت کے لحاظ سے معجز ہے اسی طرح ترتیب مضامین اور ترتیب آیات سے بھی معجز ہے۔

بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ قرآن پاک کا اسلوب معجز ہے ان کی مراد بھی یہی نظر آتی ہے جو میں نے بیان کی ہے کہ قرآن پاک الفاظ ومعانی اور ترتیب مضامین اور ترتیب آیات میں ہر طرح معجز ہے۔ اگر بعض حضرات کو اس قسم کے نکات کا پتہ نہ چل سکے تو قرآن پاک کی عظمت اور قرآن پاک کے جواہر ویواقیت پر مشتمل ہونے میں کوئی کمی نہیں البتہ آنکھ کا قصور ہوسکتا ہے۔

والنجم تستصغر الابصار رؤیته والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر

ستارہ نظروں میں چھوٹا دکھائی دیتا ہے ہاں یہ گناہ آنکھ کا ہوسکتا ہے، ستارہ تو واقع میں چھوٹا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے ایمان لانے کے پہلے ذکر کرنے پر ایک روایت ذکر کی ہے کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یحق له ان یؤمن" مجھے زیادہ حق پہنچتا ہے کہ میں اسے سب سے پہلے تسلیم کروں۔ البحر المحیط کے محشی نے بیان کیا کہ یہ حدیث طبری نے تخریج کی لیکن ضعیف ہے البتہ یہی روایت ابوقتادہ سے موقوف طور پر بھی مروی ہے۔ (البحر المحیط مع حاشیہ)

لیکن البحر المحیط کے محشی کا قول درست نہیں کیونکہ یہی روایت ابن کثیر نے مستدرک حاکم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ "ثم قال الحاکم صحیح الاسناد ولم یخرجاه" حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے اگرچہ بخاری ومسلم نے اسے ذکر نہیں کیا۔ (ماخوذ از صابونی)

"**ایمان الرسول**" کا ذکر خازن نے مختصر مگر خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔

"ومعنی آمن الرسول صدق الرسول یعنی محمد ﷺ والمعنی صدق الرسول ان هذا القرآن وجملة

مافیه من الشرائع ولاحکام منزل من عندالله عز وجل "

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تصدیق فرمائی یہ کہ قرآن پاک اور اس میں تمام شرائع اور احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں۔

اجمال میں اجلال:

رب تعالیٰ نے مجمل طور پر ذکر فرمایا ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ "ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے" اس میں تفصیل بیان نہیں کی کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں جن کو آپ نے پہچان کر یقین کر لیا اور تسلیم کر لیا۔

"وفی هذاالاجمال اجلال لمحله ﷺ واشعار بان تعلق ایمانه بتفاصیل ماانزل الیه واحاطته بجمیع ماانطوی علیه من الظهور بحیث لاحاجة الی ذکره اصلا"

اس اجمال میں رسول اللہ ﷺ کے مقام کے اجلال (بزرگی، بلندی مرتبہ) کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آپ کی طرف جو احکام نازل کیے گئے آپ نے ان کی تمام تفاصیل کو پہچان لیا تھا۔ وہ احکام وشرائع جن جن چیزوں پر مشتمل تھے ان تمام کی تفاصیل آپ کے احاطہ علم میں آگئیں، اسلئے ان کو علیحدہ علیحدہ ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ "مَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ" کے عموم سے ذکر کر دیا گیا، سب کچھ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا آپ نے اسے پہچان لیا، ان کی تفاصیل کو پہچان لیا۔ (تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ! عظمت مصطفیٰ کریم ﷺ عظیم الشان اہل علم نے کیا خوب سمجھی۔ (فجزاهم الله خیر الجزاء)

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ "اور ایمان والے"

اعلیٰ حضرت اور مفسرین کرام رحمہم اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اس مقام پر ترجمہ کیا ہے "اور ایمان والے" اس کا ماقبل اور مابعد سے تعلق بظاہر معلوم نہیں ہو رہا کہ ترجمہ یوں کیا جائے "ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اسکے رب کی طرف سے اسکی طرف اور مؤمنوں نے ایمان لایا اور سب نے مانا......الخ۔ **یا یوں ترجمہ** کیا جائے "ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کے رب کی طرف سے" اور سب ایمان والوں نے مانا......الخ۔ اسکی وجہ مفسرین کرام نے خصوصاً کبیر، روح المعانی اور بیضاوی نے یہاں دو احتمال ذکر کیے ہیں، بیضاوی کی عبارت ملاحظہ ہو:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ الخ "لایخلو من ان یعطف المؤمنون علی الرسول فیکون الضمیر الذی ینوب عنه التنوین راجعا الی الرسول والمؤمنین او یجعل مبتدأ فیکون الضمیر للمؤمنین وباعتباره یصح وقوع کل بخبره خبر المبتدأ ویکون افراد الرسول بالحکم اما لتعظیمه او لان ایمانه عن مشاهدة وعیان وایمانهم عن نظر واستدلال"

احتمال اول: یعنی ترکیبی لحاظ پر جو دو احتمال پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ" کا عطف ہو ﴿الرَّسُوْلُ﴾ پر، اس صورت میں معطوف اور معطوف علیہ مل کر ﴿اٰمَنَ﴾ کا فاعل بن گئے اور لفظ "کُلٌّ" پر جو تنوین عوض مضاف الیہ وہ ضمیر ہے، یعنی "ہم" عبارت معنوی لحاظ پر یوں ہوگی ﴿کلهم آمن باللہ﴾ یہ ضمیر لوٹے گی ﴿الرَّسُوْلُ﴾ کی طرف اور ﴿الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کی طرف، اب اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اس کے رب کی طرف سے اسکی طرف اور ایمان لایا ایمان والوں نے اور سب نے (یعنی رسول اور ایمان والوں نے) مانا اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اسکے رسولوں کو۔ بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ "ایمان والوں کے ایمان لانے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ:

"لما ذکر اللہ عزوجل فی هذه الصورة فرض الصلوة والزکوة والطلاق والایلاء والجهاد ختم السورة بذکر تصدیق النبی ﷺ والمؤمنین بجمیع ذلک"

کہ جب اللہ تعالی نے اس سورۃ میں بہت سے احکام ذکر فرمائے، نماز کی فرضیت، زکوۃ کی فرضیت، طلاق کے مسائل واحکام، ایلاء کے مسائل واحکام اور جہاد کی فرضیت تو یہاں سورۃ کے آخر میں ذکر فرما دیا کہ ان تمام احکام کی تصدیق فرمائی رسول اللہ ﷺ نے اور تمام مؤمنین نے یعنی احکام کی تصدیق کرنے کو ایمان سے تعبیر کیا گیا کہ تمام احکام کو قبول کیا۔ (شیخ زادہ)

احتمال دوم: ترکیبی لحاظ پر دوسرا احتمال یہ ہے کہ کہ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ علیحدہ جملہ ہو اور ﴿اَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ میں واو استینافیہ ہو اور ﴿اَلْمُؤْمِنُوْنَ﴾ مبتدأ ہو اور "کُلٌّ" پھر مبتدأ ہو اور ﴿اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ مکمل جملہ خبر ہے "کُلٌّ" کی، مبتدأ اور خبر مل کر پھر خبر ہیں، پہلے مبتدأ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ کی۔ اس احتمال میں ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ پر وقف صحیح نہیں ہوگا پہلے احتمال میں وقف جائز ہے۔ اب اس دوسرے احتمال میں ترجمہ یہ ہوگا "ایمان لایا رسول نے اس پر جو نازل کیا گیا اسکی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان والوں نے، تمام نے مانا اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو۔

اب **اعلیٰ حضرت** مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو کیا خوب نظر آئے گا کہ دونوں احتمالوں میں جس پر چاہیں منطبق کرلیں۔ اگر آپ پہلے احتمال کے مطابق ترجمہ کرنا چاہیں تو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور ایمان والے کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں ترجمہ کریں ''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والے ایمان لائے اور دوسرے احتمال کے مطابق یوں ترجمہ کرلیں ''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والے تمام ہی مان گئے۔ کیا کوئی صاحب علم اور منصف مزاج اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ علیہ کی علمی بصیرت کا انکار کر سکے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

دوسرے احتمال میں علیحدہ علیحدہ ذکر کرنے کا کیا مطلب:

یعنی دوسرے احتمال میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور ایمان والوں کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وجہ علیحدہ ذکر کرنے کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان کی عظمت کا ذکر مقصود تھا، جس کی وجہ سے آپ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا اور امت کے ایمان کا ذکر بعد میں کیا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان اور آپ کی امت کے ایمان میں فرق پایا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سب چیزیں تھیں، آپ کا ایمان مشاہدہ سے تھا یعنی آپ دیکھ کر تصدیق فرمار ہے تھے اور آپ کی امت کا ایمان نظر و استدلال سے تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو سن کر آپ کی امت نے ایمان لایا۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

یہ فرق کرنا پہلے احتمال میں بھی ضروری ہے:

پہلے احتمال میں جس کا ترجمہ کیا گیا کہ ''ایمان لایا رسول نے اور ایمان والوں نے۔ اس صورت میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ایمان اور آپکی امت کے ایمان میں فرق کرنا ضروری ہے جیسا کہ صاوی نے بیان کیا ہے۔

''(والمؤمنون) فاشترک الرسول والمؤمنون فی اصل الایمان لکن افترقا من جهة اخری وهو ان ایمان الرسول من قبیل حق الیقین وایمان المؤمنین من قبیل علم الیقین اوعین الیقین فالافتراق من حیث المراتب لامن حیث اصله''

ایمان لایا رسول نے اور ایمان والوں نے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل ایمان میں تو رسول اللہ ﷺ اور ایمان والے مشترک ہیں، لیکن اور وجہ سے فرق پایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایمان حق الیقین کے درجہ میں ہے اور مؤمنین کا ایمان علم الیقین یا عین الیقین کے درجہ میں ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ اصل ایمان میں تو اشتراک پایا گیا، لیکن مراتب کے لحاظ پر بہت بڑا فرق پایا گیا۔ (صاوی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ "کُــلّ" تاکید کیلئے نہیں کیونکہ معرفہ کی تاکید کیلئے ظاہراً ضمیر کی طرف مضاف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ﴿کُــــــلٌّ﴾ کو نکرہ ہونے کے باوجود مبتداء بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس پر تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ اصل میں "کُلُّھُمْ" ہے اسلئے تقدیر مضاف الیہ یعنی ضمیر کی وجہ سے حکم معرفہ میں ہے مبتداء بنانا صحیح ہے۔ (از روح المعانی)

دوسرے احتمال میں رسول اللہ ﷺ کے ایمان کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور مؤمنون کے ایمان کو علیحدہ، اگرچہ اس معنی میں بھی رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا ہی ذکر ہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، تاہم علامہ آلوسی رحمہ اللہ پہلے احتمال کو ترجیح دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"ورجح الوجه الاول بانه اقصى لحق البلاغة واولى فى التلقى لان الرسول ا حينئذ يكون اصلافى حكم الايمان بماانزل الله والمؤمنون تابعون له ويافخرهم بذلك"

پہلا احتمال زیادہ راجح ہے کیونکہ اس میں بلاغت کا اعلیٰ معیار پایا گیا ہے اور ذہن بھی جلدی اسے ہی قبول کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایمان اصل ہوگا اور مؤمنین کا ایمان آپ کے تابع ہوگا، اس تابعداری کی وجہ سے آپ کی امت کے مؤمنین کو کتنا ہی عظیم مقام فخر حاصل ہوگا۔

یعنی امت کی عظمت شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ سے کم مرتبہ سمجھیں اور اپنے آپ کو حضور ﷺ کا تابع سمجھیں، بلکہ اپنے آپ کو حضور ﷺ کے اقوال وافعال میں کامل طور پر تابع بنانے کی پوری کوشش کریں۔ (از روح المعانی)

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾

"سب نے مانا اللہ اور اسکے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے رسولوں کو"

ایمان لانے میں ترتیب ذکری کا قدرے تفصیلی بیان:

اللہ تعالیٰ نے چار مراتب کا ضرورۃً ایمان میں ذکر کیا کہ ان چار مراتب کے ایمان کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہوگا۔

المرتبة الاولى: ان میں سب سے پہلے مرتبہ پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا، اسلئے کہ جب تک انسان کو یہ علم حاصل نہ ہو کہ کوئی ذات وہ بھی ہے جو عالم ہے یعنی تمام معلومات اس کے احاطہ علم میں داخل ہیں کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور جب تک یہ علم حاصل نہ ہو کوئی ذات صانع بھی ہے یعنی تمام مخلوقات کا کوئی

خالق بھی ہے اور جب تک یہ علم نہ ہو کہ کوئی قادر بھی ہے جسے تمام مقدورات پر قدرت حاصل ہے۔

"لایمکن معرفة صدق الانبیاء علیهم السلام فکانت معرفة الله تعالی هی الاصل فلذلک قدم الله هذه المرتبة فی الذکر"

تو اس وقت تک انبیاء کرام کی صداقت کی معرفت حاصل نہیں ہوگی، تو اللہ تعالی کی معرفت جب اصل ہے تو اسے ذکر بھی پہلے مرتبہ پر کر دیا گیا ہے۔

المرتبة الثانية: ان میں سے دوسرے مرتبہ پر فرشتوں کا ذکر کیا گیا، اسلئے کہ انبیاء کرام پر وحی بواسطہ ملائکہ ہی نازل ہوتی ہے رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ فرشتوں کو اتارتا ہے وحی دے کر اپنے امر کی جن پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور ارشاد فرمایا ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ کسی بشر سے اللہ تعالی کلام نہیں کرتا سوائے وحی کے یا حجاب کے پیچھے سے یا اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجتا ہے وہ اسکے حکم سے وحی لاتا ہے جو چاہے۔ اسی طرح کئی اور آیات میں مبارکہ میں جبریل علیہ السلام کے وحی لانے کا ذکر ملتا ہے:

"فاذاثبت ان وحی الله تعالی انمایصل الی البشر بواسطة الملائکة فالملائکة یکونون کالواسطة بین الله تعالی وبین البشر فلهذاالسبب جعل ذکر الملائکة فی المرتبة الثانية"

یہ بات ثابت ہوگئی کہ بے شک اللہ تعالی کی طرف سے انبیا کرام پر وحی فرشتوں کے ذریعے آتی ہے تو فرشتے اللہ تعالی اور بشر کے درمیان واسطہ بن گئے، اسی سبب سے فرشتوں کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا۔

اور یہی راز اس آیہ کریمہ میں بھی ملتا ہے کہ ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔

المرتبة الثالثة: ان میں سے ذکر کے لحاظ سے تیسرا مرتبہ کتب کا ہے کیونکہ وہ فرشتوں کے ذریعے بشر یعنی انبیاء کرام پر نازل ہوتی ہیں تو یقیناً جن کے ذریعے سے کتابوں نے نازل ہونا ہے ان کا ذکر پہلے ہونا ہے "فذات الملک کالقمر وذات الوحی کاستنارة القمر"، فرشتے کی ذات چاند کی طرح ہے اور وحی کی ذات چاند کی روشنی کی طرح ہے گویا کہ چاند کا ذکر پہلے کیا گیا اور روشنی کا بعد میں"

المرتبة الرابعة: چوتھے مرتبہ پر رسولوں کا ذکر کیا گیا "لان الرسل وهم الذین یقتبسون انوار الوحی من الملائکة فیکونون متاخرین فی الدرجة عن الکتب" کیونکہ فرشتے جب انبیاء کرام پر اللہ تعالی کی طرف

سے وحی لاتے ہیں تو انبیاء کرام ان وحی کے انوار سے اقتباس حاصل کرتے ہیں ،اسلئے رسولوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔اس تفصیل سے ترتیب ذکری کی کافی حد تک وضاحت بھی حاصل ہوگئی اور فوائد و حکمتیں بھی حاصل ہوگئیں۔
(ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: ترتیب حقیقی اور ہے اور یہاں ذکر کے لحاظ پر ترتیب اور ہے۔واقع میں اللہ تعالی اور اسکی صفات مقدم ہیں،کلام نفسی رب تعالی کی صفت ہے اسکے بعد رسولوں کا درجہ ہے اور اسکے بعد فرشتوں کا۔ (راقم)

اللہ تعالی پر ایمان لانے کا مطلب:

"المراد بالایمان بالله عبارة عن الایمان بوجوده وبصفاته بافعاله وباحکامه وباسمائه"

اللہ تعالی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وجود اور صفات اور سکے افعال اور اسکے احکام اور اسکے اسماء پر ایمان ہو"

الایمان بوجود الله : اللہ تعالی کے موجود ہونے پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان رب تعالی کے موجود بالذات اور قائم بالذات ہونے پر ایمان رکھے کہ وہ خود بخود قائم ہے اسکو کسی نے قائم نہیں کیا،اور انسان اسی پر ایمان رکھے "**ان وراء المتحیزات موجودا خالقالها**" کہ بیشک تمام کائنات مکان اور حیز کی محتاج ہے سب مکین اور متحیز اللہ تعالی کی مخلوق ہیں اور اللہ تعالی ان کا خالق ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔

"فالمجسم لایکون مقرا بوجود الاله تعالی لانه لایثبت ماوراء المتحیزات شیئاآخر فیکون اختلافه معنافی اثبات ذات الله تعالی"

مجسمہ فرقہ اللہ تعالی کو بھی جسم مانتا ہے اور وہ اللہ تعالی کو مکان اور حیز کا محتاج مانتے ہیں کہ وہ بھی مکین اور متحیز ہے۔ان کے نزدیک مکین چیزوں کے بغیر کوئی اور چیز نہیں،اسلئے ان کے نزدیک اللہ تعالی واجب الوجود نہیں بلکہ وہ وجود عارضی جو متحیز کو حاصل ہے،اسکے بغیر اللہ تعالی کو موجود ہی نہیں مانتے،ان کا مسلمانوں سے ذات باری تعالی میں ہی اختلاف ہے۔

آجکل کئی نام نہاد مسلمان بھی اللہ تعالی کا مکان آسمان ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں "العیاذ باللہ" فلاسفہ اور معتزلہ بھی رب تعالی کی صفات میں اہلسنت و جماعت کے خلاف نظریات رکھتے ہیں،جن کا تذکرہ پہلے پارہ میں ہو چکا ہے۔

ایمان بصفات الله : اللہ تعالی کی صفات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے،جب تک اللہ تعالی کی صفات پر کسی کو ایمان حاصل نہیں ہوگا تو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔اللہ تعالی کی صفات دو قسم کی ہیں،صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ۔

صفات سلبیہ : یعنی انسان اس پر ایمان رکھے کہ "انه فرد منزه عن جميع جهات التركيب" کہ بے شک وہ ذات فرد ہے ترکیب کی جہات سے پاک ہے، یعنی صفت ترکیب کی اس سے سلب (نفی) پائی گئی ہے، وہ مفرد (یکتا) ہے۔"فان كل مركب مفتقر الى كل واحد من اجزائه وكل واحدمن اجزائه غيره فهو مركب" بیشک ہر مرکب اپنی اجزا کا محتاج ہوتا ہے اور جب تک اسمیں اجزاء نہ پائی جائیں تو وہ مرکب نہیں یعنی مرکب کیلئے اجزاء سے مرکب ہونا ضروری ہے اور جو اجزاء سے مرکب ہو وہ محتاج ہوتا ہے۔"وكل مفتقر الى غيره ممكن لذاته فاذن كل مركب فهو ممكن لذاته" ہر وہ چیز جو غیر کی محتاج ہو وہ ممکن لذاتہ ہوتی ہے۔اور ہر مرکب ممکن لذاتہ ہوتا ہے۔

پتہ چلا کہ جب مرکب اپنی اجزاء کا محتاج ہے تو وہ ممکن لذاتہ ہوگا جبکہ ممکن ہے ہی وہ جسے کوئی موجود کرے، اسکا کوئی خالق ہو تو یقینی طور پر پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ فرد مطلق ہے، مرکب نہیں۔ جو ذات واجب الوجود ہے وہ کسی طرح بھی مرکب نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ فرد مطلق ہے۔

"واذاكان فردافي ذاته لزم ان لايكون متحيز اولاجسماولاجوهر اولافي مكان ولاحالاولافي محل ولامتغير اولامحتاجابوجه من الوجوه البتة"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے اور وہ اپنی ذات میں فرد مطلق ہے تو اس سے خود بخود واضح ہو گیا کہ وہ متحیز نہیں یعنی مکان وحیز سے پاک ہے اور وہ جسم نہیں اور وہ جوہر نہیں اور وہ کسی مکان میں نہیں اور کسی چیز میں حلول کرنے والا نہیں اور وہ محل نہیں اور اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں یعنی وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف، ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف، ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی طرف تبدیل نہیں ہوتا اور وہ کسی ذرہ کا بھی محتاج نہیں، احتیاجی کی تمام وجوہ سے وہ پاک ہے۔

صفات ثبوتیہ: یعنی یہ ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے۔ اسلئے کہ جب ہم مخلوقات کو دیکھتے ہیں کہ ان میں مختلف احوال و کیفیات پائی جاتی ہیں "فعلمناان المؤثر فيهاقادر لاموجب بالذات" تو اس سے ہمیں علم حاصل ہو جاتا ہے کہ مخلوق کا خالق اور ان میں مؤثر قادر و مختار ہے، اس پر کوئی کام واجب نہیں، وہ اپنے ارادہ واختیار سے جو چاہے وہی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے افعال محکم ہوتے ہیں ان میں یقین پایا جاتا ہے اور ان میں پختگی پائی جاتی ہے، یہ چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے۔

"فحينئذ يعرفه قادراعالما حياسميعابصيرا موصوفامنعوتابالجلال وصفات الكمال"

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور عالم ہے اور ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے اور صفات جلالیہ اور صفات کمالیہ سے متصف ہے رب تعالیٰ کی صفات کی بحث نجوم الفرقان کے "**حصہ اول سورۃ فاتحہ**" میں دیکھیں اور "**حصہ ششم آیۃ الکرسی**" کی بحث میں دیکھیں۔

ایمان بافعالہ : اللہ تعالیٰ کے افعال پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ جس کے بغیر ایمان حاصل ہونا ممکن نہیں اللہ تعالیٰ کے افعال پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ رب تعالیٰ کے ماسواء ہر چیز ممکن ہے اور حادث ہے جب اس پر ایمان حاصل ہو جائے گا تو انسان کے عقل میں کامل طور پر یہ بات آجائے گی کی ممکن اور حادث خود بخود موجود نہیں ہو سکتے، بدیہی طور پر یہ سمجھ آجائے گا کہ "**لابدلہ من موجد یوجدہ وھو القدیم**" مخلوق کو موجود کرنے والی ذات کا موجود ہونا ضروری ہے، وہ ذات قدیم ہے۔

"**وھذا الدلیل یحملک علی ان تجزم بان کل ماسواہ فانما حصل بتخلیقہ وایجادہ وتکوینہ**"
یہ دلیل یقین دلاتی ہے کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق (پیدا کرنے) اور اس کے موجود کرنے سے معرض وجود میں آئی ہے۔

اعتراض : جب کوئی انسان یہ کہے کہ میں اپنے نفس میں یہ پاتا ہوں کہ اگر میں چاہوں کہ میں حرکت کروں تو حرکت کرتا ہوں اور اگر میں چاہوں تو حرکت نہ کروں تو نہیں کرتا، "**فکانت حرکاتی وسکناتی بی لابغیری**" تو میری حرکات وسکنات میری وجہ سے پائی جاتی ہیں میرے بغیر کسی اور کی وجہ سے وہ حرکات وسکنات نہیں پائی جاتیں تو کس طرح کہا جائے گا کہ کائنات کی ہر چیز رب تعالیٰ کی قدرت اور اسکے اختیار میں ہے۔

جواب : انسان کی حرکت ارادہ حرکت کے بعد پائی جاتی ہے جب تک وہ حرکت کا ارادہ نہ کرے حرکت نہیں کر سکے گا یہی حال ہے انسان کے سکون کا وہ سکون کا ارادہ کرے گا تو سکون اسے حاصل ہو جائے گا، اگر ارادہ نہیں کرے گا تو سکون حاصل نہیں ہوگا۔

اب بندے کا ارادہ مشیت کو دیکھنا پڑے گا۔ "**وھذہ المشیۃ کیف حدث**" یہ مشیت کیسے پیدا ہوئی ؟ کیا وہ بغیر پیدا کرنے والے کے پیدا ہوئی یا کسی پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی چیز بغیر پیدا کرنے کے خود ہی پیدا ہو جائے یہ ضروری طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ بندے کی مشیت کا خالق اور موجود کرنے والا کوئی ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون ہے۔ "**ثم ذلک المحدث اما ان یکون ھو العبد او اللہ تعالیٰ**" یعنی بندے کی مشیت کا خالق اور موجود کرنے والا بندہ خود ہے یا کہ اللہ تعالیٰ۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ بندے کو خالق مانا جائے

کیونکہ بندہ مشیت کو اگر بالفرض موجود کرنا چاہے گا تو ایک اور مشیت کی ضرورت لازم آئے گی تو اس طرح اس میں تسلسل لازم آئے گا کہ ایک مشیت کیلئے دوسری مشیت لائی جائے اور دوسری کیلئے تیسری، اس طرح نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ جاری کر دیا جائے یہ عقل ونقل کے خلاف ہے۔ لہذا اسکے تسلیم کرنے کے بغیر اور کوئی راہ نہیں کہ بندے کی مشیت کو موجود کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور بندے حرکت وسکون کی مشیت وارادہ کے بعد ہی حرکت وسکون کر سکے گا، لہذا بندے کی حرکت وسکون بھی رب تعالیٰ کی قدرت واختیار میں ہے۔

پہلے **پارہ** میں تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام افعال کا خالق ہے، بندہ کاسب ہے اور بندے کو کسب کرنے یعنی عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

الایمان باحکام اللہ : اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ورنہ ایمان حاصل نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان لانے میں چار امور پائے گئے ہیں، یعنی چار طرح ایمان لانا ضروری ہے۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم کسی غرض پر موقوف نہیں۔

"لان کل ما کان معللابعلۃ کان صاحبہ ناقصا بذاتہ کاملابغیرہ و ذلک علی الحق سبحانہ محال" اسلئے کہ جس کام اور افعال غرضوں پر موقوف ہوں ان کی کوئی وجوہ اور علتیں پائی جائیں وہ خود ناقص ہوتا ہے، غیر کا محتاج ہوتا ہے غیر سے کمال حاصل کرتا، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر محال ہے کہ وہ "معاذ اللہ" ناقص ہو اور غیر سے کمال حاصل کرے۔

دینی طلباء کرام اصطلاحی الفاظ یاد کر لیں کہ " **اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے** " اگر اس کے افعال معلل بالاغراض ہوں تو وہ محتاج ہوگا۔ حالانکہ رب تعالیٰ محتاج الیہ ہے یعنی مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں وہ ﴿غَنِیٌّ حَمِیْدٌ﴾ ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے احکام وشرائع پر یہ ایمان ہو کہ "ان منفعتھاعائدۃ الی العبدلاالی الحق فانہ منزہ عن جلب المنافع و دفع المضار" ان احکام پر عمل کرنے میں بندے کا ہی نفع ہے اور نہ عمل کرنے میں بندے کا ہی نقصان ہے، رب تعالیٰ کا ان میں کوئی نفع نقصان نہیں کیونکہ رب تعالیٰ منافع حاصل کرنے سے یا اپنے آپ سے نقصان کو دور کرنے سے پاک ہے۔

(۳) "ان یعلم لہ الالزام والحکم فی الدنیا کیف شاء واراد"

اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان لانے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان کا اس پر ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ حکم

فرماتا ہے۔﴿لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ﴾''اس سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے'' کا مصداق ہےاوراس کے احکام پرعمل کرنا انسانوں پر دنیا میں لازم ہے،اعمال کی دارومدار دنیا میں ہی ہے،اسی لئے دنیا کاذکرکیا۔

(۴) احکام پرایمان لانے میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان ہوکہ بندے کے اعمال افعال کی وجہ سے رب تعالیٰ پرکچھ بھی لازم نہیں ہوتا بلکہ۔''انه سبحانه فی الاخرة یغفر لمن یشاء بفضله ویعذب من یشاء بعدله ''اللہ تعالیٰ آخرت میں جسے چاہےاپنے فضل سے اسکی مغفرت کردےاور جسے چاہےاپنے عدل سے عذاب دےدے،اللہ تعالیٰ اس میں فاعل مختار ہےاسلئے کہ

''وانه لایقبح منه شیٔ ولایجب علیه شیٔ لان الکل ملکه وملکه والمملوک المجازی لاحق علی المالک المجازی فکیف المملوک الحقیقی مع المالک الحقیقی''

رب تعالیٰ کے کسی فعل اور کسی حکم کوقبیح (برا) نہیں کہا جاسکتااوررب تعالیٰ پرکوئی چیز واجب نہیں اسلئے کہ ساری مخلوق دنیامیں ہم دیکھتے ہیں ملکیت میں ہےاوراسی کی بادشاہی میں تمام مخلوق کورعایا کی حیثیت حاصل ہے،جب ہم دنیامیں دیکھتے ہیں کہ مجازی غلاموں کوکوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مالک پر دعوی کریں کہ یہ کام ہم نے کیا ہےلہذا تجھ پراس کے بدلے ہمارا حق واجب ہے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ غلام کاہرکام مالک کاہی ہوتا ہےوہ مالک سے کسی قسم کی اجرت طلب نہیں کرسکتاجب مجازی مالک پرکوئی چیز لازم نہیں ہوتی تو حقیقی پرکس طرح لازم ہوسکتی ہے۔ہاں البتہ بغیرکسی لزوم اوربغیرکسی وجوب کےاپنےفضل وکرم سےاس نےاجروثواب کے جووعدےکررکھے ہیں ان کووہ پوراکرےگا۔

ایمان باسماء الله : اللہ تعالیٰ کے اسماء پرایمان لانا بھی ضروری ہے،یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء گرامی جوقرآن وحدیث میں وارد ہیں،ان کی معرفت حاصل ہو،ان پریقین اور یہ ایمان ہوکہ رب تعالیٰ کےتمام نام ہی اچھےاورحسین ہیں اس مسئلہ کوقرآن پاک میں کئی جگہ بیان کیا گیا۔سورة اعراف میں ذکرکیا گیا﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾''اوراللہ تعالیٰ کےتمام نام ہی اچھے ہیں۔''اورسورة بنی اسرائیل میں ذکرکیا گیا﴿اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾''جس نام(اللہ یارحمٰن) سےبھی تم اسے پکارواس کےتمام نام ہی اچھے ہیں''۔''سورة طٰهٰ'' میں مذکور ہے:﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾''اللہ،اسکےبغیراورکوئی معبودنہیں اسکےتمام نام اچھے ہیں''۔سورة حشر کےآخرمیں ہے﴿لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾''اسی کےاچھے نام ہیں زمین وآسمان کی ہرچیزاسی کی تسبیح بیان کرتی ہے''۔

ایمان بالملائکہ : فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، فرشتوں پر ایمان لانے کی چار وجوہ ہیں۔

(۱) ان چار وجوہ میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ علماء راسخین پر لازم تھا کہ حکمت قرآنیہ اور برہانیہ میں غور وفکر کرنا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سب چیزوں کو مدنظر رکھ کر وہ فقط روحانی مخلوق ہے یا فقط جسمانی یا جسمانی اور روحانی دونوں کا مجموعہ ہے، کیا وہ اجسام کثیفہ ہیں یا اجسام لطیفہ، پھر وہ اجسام نورانیہ ہیں یا ہوائیہ ہیں۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور قرآن وحدیث میں فرشتوں کی بیان کی ہوئی شان دیکھ کر علماء راسخین نے اتفاقی طور پر فیصلہ کیا ہے کہ،

"الملک جسم نورانی یتشکل باشکال مختلفة الابشکل حقیر ولایذکر ولایؤنث"

فرشتے نورانی جسم ہیں مختلف شکلیں بدل لیتے ہیں، البتہ کسی حقیر چیز (کتے وغیرہ) کی شکل میں نہیں ہوتے وہ مذکر ومؤنث نہیں ہوتے۔ کھانے پینے سے وہ بے نیاز ہیں، خواہشات نفسانیہ سے وہ پاک ہیں اسی وجہ سے گناہوں سے بھی پاک ہیں، ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ ﴿لَايَعْصُونَ اللّٰهَ مَاأَمَرَهُمْ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ نورانی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اور اسکے انبیائے کرام کے درمیان واسطہ بھی ہیں، تمام انبیائے کرام فرشتوں سے بلند شان رکھتے ہیں اور فرشتے باقی لوگوں سے افضل ہیں۔

مندرجہ بالا طریقہ پر ہی ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم فرشتوں پر ایمان رکھیں، مشرکین کی طرح فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہ تسلیم کرلیا جائے۔

(۲) ان چار وجوہ میں سے دوسری وجہ جس کا اجمالی طور پر ابھی ذکر کیا گیا کہ وہ یہ ہے کہ انسان اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ معصوم اور پاک ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کی شان بیان فرمائی، ﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَايُؤْمَرُونَ﴾ اپنے اوپر اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿لَايَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَايَسْتَحْسِرُونَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور وہ تھکتے نہیں۔

کیا خوب زندگی :

"کماان حیاة کل واحد منابنفسه الذی هوعبارة عن استنشاق الهواء فکذلک حیاتهم بذکر الله ومعرفته وطاعته"

جس طرح ہماری زندگی کا تعلق سانس سے ہے، سانس آیا تو زندہ، سانس رک گیا تو موت، ایسے ہی فرشتوں کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اسکی معرفت اور اسکی طاعت سے ہے لیکن فرشتوں کا ذکر الٰہی ختم نہیں

ہونا اسلئے ان پر موت نے بھی نہیں آنا، ہاں جب پہلا صور پھونکا جائے گا اس وقت سب کی موت واقع ہوگی "فان لذتھم بذکر اللہ وانسھم بعبادۃ اللہ" بے شک ان کو لذت ہی اللہ تعالی کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالی کی عبادت سے ہی ان کو انس حاصل ہوتا ہے۔

(۳) ملائکہ پر ایمان لانے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ ملائکہ اللہ تعالی اور بشر، یعنی اس کے انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں اور جہان مختلف کاموں پر ان کو مقرر کیا گیا، جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّاo فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًاo﴾ قسم ہے ان کی کہ با قاعدہ صف باندھیں پھر ان کی جھڑک کر چلائیں۔(اس سے مراد ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًاo فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًاo﴾ "قسم ہے ان کی جو بکھیر کر اڑانے والے ہیں، پھر بوجھ اٹھانے والے ہیں" (یہاں بھی ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًاo فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًاo﴾ "قسم ہے ان جماعتوں کی جو بھیجی جاتی ہیں لگا تار، پھر زور سے جھونکا دینے والی جماعتیں (یہاں بھی ایک تفسیر کے مطابق فرشتے ہی ہیں) اور رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًاo وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًاo﴾ "قسم ہے ان کی کہ سختی سے جان کھینچیں اور نرمی سے بند کھولیں۔(یہاں بھی فرشتوں کا ہی ذکر ہے) یعنی ان آیات میں فرشتوں کے مختلف کاموں کا تذکرہ ہے، تفصیل انشاء اللہ اپنے اپنے مقامات پر آئے گی۔ بہر حال اتنا ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے مختلف کاموں پر مقرر ہیں۔

(۴) ان وجوہ میں چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس پر ایمان ہو کہ اللہ تعالی کی کتابیں انبیاء کرام پر فرشتوں کے ذریعے ہی پہنچی ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍo ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍo مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾

"بے شک یہ عزت والے رسول (جبریل) کا پڑھنا ہے، جو قوت والا ہے، مالک عرش کے حضور عزت والا، وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے امانت دار ہے"۔

یعنی ان آیات میں قرآن پاک کا حضور ﷺ کے پاس جبریل کے پڑھنے کا ذکر ہے، "فھذہ المراتب لابد منھا فی حصول الایمان بالملائکۃ" ملائکہ پر ایمان لانے کی جو چار وجوہ ذکر کی گئیں ہیں ان تمام کے مطابق ایمان لانا ضروری ہے۔ عقل جتنا ان میں زیادہ غور و فکر کرے گی، انکی سوچ میں غوطہ زن ہوگی اتنا ہی ملائکہ پر ایمان اس کا مضبوط ہوگا۔

ایمان بالکتب:

اللہ تعالی کی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی چار وجوہ ہیں۔

(۱) ان وجوہ میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان اس پر ایمان رکھے کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسولوں پر وحی کے ذریعے نازل ہوئیں، یہ کسی کاہن کا کلام نہیں یا کسی جادوگر کا کلام نہیں یا کسی شیطان نے القاء نہیں کیں اور نہ ہی ارواح خبیثہ نے ان کو انبیاء کرام پر القاء کیا ہے۔

(۲) ان وجوہ میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر یہ ایمان ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام وحی کے ذریعے اسکے رسولوں پر نازل کیا گیا اور وحی کے نازل کرنے پر اللہ تعالیٰ نے صرف فرشتوں کو مقرر کیا ہے اور ان کو ہی طاقت دی ہے کہ جو پاک مخلوق ہے شیطان جو خبیث مخلوق ہے ان کو یہ طاقت ہی نہیں دی گئی کہ وہ وحی کو نازل کریں اور نہ ان کو یہ طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی اپنی طرف سے کلام ملا سکیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں شیطان کا کلام مل گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ کو پتہ نہیں چل سکا تھا یہ قرآن پاک پر تہمت ہے اور دین میں طعن ہے اور بہت بڑا عظیم جرم ہے بلکہ اس سے کفر لازم آئے گا۔

(۳) ان وجوہ میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے متعلق یہ عقیدہ ہو اور یہ ایمان ہو کہ "ان ھذا القرآن لم یغیر ولم یحرف" بے شک قرآن پاک میں ذرا بھر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی کسی قسم کی "معاذاللہ" اس میں کوئی تحریف نہیں کی گئی، تو ان لوگوں کا قول فاسد پر مبنی ہے اور وہ بے دین ہیں جنہوں نے دین میں فساد قائم کرنے کیلئے اور کافروں کو قرآن پاک پر طعن کرنے کا موقع فراہم کرنے کے لئے یہ کہا "ان ترتیب القرآن علی ھذا الوجہ شئ فعلہ عثمان ﷺ" کہ قرآن پاک کی ترتیب تو حضرت عثمان ﷺ نے رکھی تھی اس میں سے تو بعض سورتوں اور بعض آیات کو شامل ہی نہیں کیا گیا، یہ سب اقوال کفریہ ہیں ان سے یہ لازم آئے گا۔ "فان من قال ذلک اخرج القرآن عن کونہ حجۃ" کہ قرآن پاک حجت ہی نہ رہے، قرآن پاک سے کسی مسئلہ پر کوئی دلیل ہی نہ پکڑی جائے۔

حقیقت یہی ہے کہ نام نہاد مسلمانوں نے، بکاؤ مال مسلمانوں نے، منافقین نے، یہود و نصاریٰ نے اور یہود و نصاریٰ کے چمچوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگالیا ہے لیکن قرآن پاک کو مسلمانوں کے دلوں سے نہیں نکال سکے، قرآن پاک کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔ تا قیامت قرآن پاک میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

(۴) ان چار وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے متعلق یہ ایمان ہو کہ اس میں محکم آیات بھی ہیں جن کی مراد واضح ہے اور متشابہ آیات بھی ہیں جن کی مراد صرف اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطاء سے رسول اللہ ﷺ بھی جانتے ہیں مزید وضاحت انشاءاللہ سورۃ آل عمران میں قریب ہی آرہی ہے اور سورۃ بقرۃ کی ابتدا میں کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔

ایمان بالرسل : اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جب تک اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان نہیں ہوگا اس وقت تک انسان مؤمن کہلانے کا حقدار نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانے میں بھی چار مراتب ہیں، ہرایک کے مطابق ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

پہلا مرتبہ : ان چار مراتب میں سے پہلا مرتبہ یہ ہے کہ "ان یعلم کونهم معصومين من الذنوب" کہ اس پر کامل اور پختہ ایمان ہو کہ انبیاء کرام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں، تحقیق پر مبنی کلام یہی ہے کہ انبیاء کرام صغائر گناہوں سے بھی پاک ہیں اور کبائر سے بھی پاک ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل پہلے پارہ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں "نجوم الفرقان جلد دوم" میں دیکھئے۔

دوسرا مرتبہ : "من مراتب الايمان بهم ان يعلم ان النبى افضل ممن ليس بنبى" یعنی انبیاء کرام پر ایمان لانے کی چار مراتب میں سے دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر پختہ ایمان ہو کہ کوئی غیر نبی، اللہ کے نبی سے افضل نہیں۔

تیسرا مرتبہ : انبیاء کرام پر ایمان لانے کے چار مراتب میں سے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر ایمان اور عقیدہ ہو کہ انبیاء کرام تمام فرشتوں سے افضل ہیں کوئی مقرب فرشتہ کسی نبی سے افضل نہیں اس عقیدہ کے خلاف کسی باطل قول کو تسلیم کر کے فرشتوں کو افضل کہنا جائز نہیں۔

چوتھا مرتبہ : انبیاء کرام کے متعلق یہ ایمان رکھے کہ تمام انبیاء کرام نفس نبوت میں برابر ہیں، تمام کی نبوت اصلی اور حقیقی ہے یہ قول باطل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اصلی ہے اور باقی انبیاء کرام کی نبوت عارضی ہے البتہ یہ کہنا صحیح ہے، بلکہ اس پر ایمان رکھنے کے بغیر ایمان حاصل ہی نہیں ہوگا کہ انبیاء کرام میں سے بعض حضرات دوسرے بعض سے افضل ہیں، مراتب و درجات کے لحاظ سے انبیاء کرام میں فرق پایا جاتا ہے، اس مسئلہ کی تفصیل نجوم الفرقان کی "جلد ششم" میں ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔ (ماخوذ از کبیر)

یوم آخرت کے ذکر نہ کرنیکی وجہ:

اس آیہ کریمہ میں ﴿وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ نہیں ذکر فرمایا حالانکہ ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جب آخرت کے دن پر ایمان ہوگا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ "لاندراجه فى الايمان بكتبه" کتب پر جب ایمان کا ذکر ہوگیا تو اسی ضمن میں آخرت کا ذکر بھی آگیا کیونکہ آخرت پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان مکمل نہیں ہوتا اور کتابوں کے ایمان کے ضمن میں ذکر کرنے سے اختصار بھی حاصل ہوگیا۔ (روح المعانی)

﴿ لَانُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍمِّنۡ رُّسُلِهٖ ﴾

''ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان اسکے رسولوں میں سے (ایمان لانے میں)''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ایمان افروز ترجمہ:

آپ کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے'' **راقم** نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا لیکن راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ لفظی ترجمہ کیا جائے تا کہ طلباء کرام اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں یعنی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ایمان لانے میں فرق کرنے کی نفی واضح طور پر ذکر کی گئی ہے، صرف فرق کرنے کی نفی کرنا ممکن نہیں کیونکہ مراتب میں فرق کرنا ضروری ہے بلکہ ایمان کا حصہ ہے کہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضیلت دے تقریباً اکثر تفاسیر نے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے ۔جلالین ،مدارک اور مظہری وغیرہ میں واضح طور پر یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے خازن کی عبارت ملاحظہ ہو:

﴿ لَانُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍمِّنۡ رُّسُلِهٖ ﴾فنؤمن بعض ونكفر ببعض كمافعلت اليهود والنصارى بل نؤمن بجميع رسله "

ایمان والوں نے جو یہ کہا کہ ''ہم فرق نہیں کرتے کسی ایک کے درمیان اسکے رسولوں میں سے'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے فرق کیا تھا کہ بعض انبیاء کرام پر انہوں نے ایمان لایا اور بعض کے ساتھ کفر کیا، ہم ان کی طرح بعض کے ساتھ ایمان لانے اور بعض کے ساتھ کفر کرنے میں فرق نہیں کرتے بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (خازن)

یہاں بھی یہ خیال کیا جائے کہ آیۃ کریمہ میں ﴿ رُسُلٌ ﴾ کا لغوی معنیٰ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھیجے ہوئے تمام انبیاء کرام پر ایمان رکھتے ہیں، اسلئے کہ اصطلاحی معنیٰ کے لحاظ سے ﴿ رُسُلٌ ﴾ خاص ہے جو تمام انبیاء کرام کو شامل نہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ لفظ ﴿ بَيۡنَ ﴾ کا استعمال یہاں کس طرح درست ہے؟

"وهولايدخل الاعلى اسم يدل على اكثر من واحد تقول" المال بين القوم" ولاتقول "المال بين زيد"

کیونکہ لفظ ﴿ بَيۡنَ ﴾ کے متعلق یہ قانون ہے کہ یہ اس اسم پر داخل ہوتا ہے کہ جس میں سے ایک سے زائد کا معنیٰ پایا جاتا ہے، جیسے کہا جائے "المال بين القوم" مال قوم کے درمیان (مشترک یا منقسم) ہے، لیکن جہاں ایک

کا معنی پایا جائے وہاں لفظ "بین" کا استعمال صحیح نہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا "المال بین زید" مال ایک فرد واحد زید میں مشترک ہے یا مطلب یہ لیا جائے کہ مال زید میں منقسم ہوا ہے۔ جب لفظ "احد" واحد ہے اسکے معنی میں کثرت نہیں پائی گئی تو اس پر لفظ "بین" کا داخل کرنا کسطرح صحیح ہے؟

تو اس کا **جواب** یہ دیا گیا ہے کہ لفظ "احد" نکرہ ہے جو تحت النفی ہے یعنی ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ﴾ جب کہا گیا تو نکرہ کے تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم آ گیا۔ "ولهذا احد فی معنی الجمع ولذا دخل علیه بین" "اسی وجہ سے کہ "احد" میں کثرت کا معنی آ گیا اور اس پر "بین" داخل ہونا صحیح ہو گیا۔ (ماخوذ از مدارک)

یہی ضابطہ ﴿فَمَا مِنكُم مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ﴾ میں بیان کیا گیا ہے کہ نکرہ تحت النفی آنے کی وجہ سے عموم پر دلالت کر رہا ہے لہذا "اَحَدٍ" میں کثرت والا معنی پایا گیا ہے تو اس کی صفت بھی جمع ﴿حَاجِزِيْنَ﴾ لائی گئی ہے۔ (قرطبی)

مدارک کی عبارت میں سے "الجمع" کا معنی راقم نے کثرت کیا ہے کیونکہ جمع کے اصطلاحی معنی مراد لینے پر علامہ رازی رحمہ اللہ اعتراض کرتے ہیں:

"وعندی انه لایجوز ان یکون احد ههنا فی معنی الجمع لانه یصیر التقدیر لانفرق بین جمیع رسله وهذا لاینافی فی کونهم مفرقین بین بعض الرسل والمقصود بالنفی هو هذا" (از کبیر)

"احـــــــد" کو جمع کے معنی میں لینا میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ پھر معنوی لحاظ پر عبارت یہ ہو جائے گی "لانفرق بین جمیع رسله" "ہم تمام رسولوں پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے، اس سے بعض کی تفریق کی نفی نہیں ہوتی، حالانکہ مطلقاً مقصود بعض میں تفریق کی نفی ہے اسلئے یہود و نصاری یا تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاکر وہ تفریق کا سبب بنے اور یا یہود عیسی علیہ السلام پر ایمان نہ لاکر اور نصاری موسی علیہ السلام پر ایمان نہ لاکر تفریق کا سبب بنے، جمیع انبیاء کرام پر وہ ایمان نہ لاکر تفریق کے سبب نہیں بنے۔

لیکن راقم نے جو ضابطہ بیان کیا ہے کہ نکرہ تحت النفی آ کر عموم کا معنی دیتا ہے اور جمع کا جو معنی کثرت کیا ہے اس سے اعتراض اٹھ گیا۔

اب معنی واضح ہو گیا کہ "ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانے میں"، یعنی بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں" ہم ایسا نہیں کرتے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ کا جمع کو بمعنی جمیع لینا بھی راقم کو کچھ عجیب سا لگا، جمع کا اصطلاحی معنی لیکر بھی راقم کے نزدیک ترجمہ وہی رہے گا جو اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔

﴿ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴾

''اورانہوں نے کہا کہ ہم نے سنااور فرمابرداری کی تو مغفرت فرما ہمارے رب اور تیری اطاعت کی ، یعنی تیرے امر کی اطاعت کی۔''

"وقالوا سمعنا واطعنا یعنی سمعنا قولک و اطعنا امرک" اورانہوں نے کہا کہ ہم نے سنا یعنی اے اللہ! تیرے کلام کو ہم نے سنااور تیری اطاعت کی یعنی تیرے امر کی اطاعت کی۔

مطلب یہ ہے کہ مؤمنوں نے کہا کہ ہم نے اپنے رب کے کلام کو سنا جو اس نے ہمیں حکم دیا اور ہم نے اس کی اطاعت کی جو اس نے ہم پر لازم کیا یعنی فرائض وغیرہ اور ہم اللہ تعالی کی اطاعت کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی کے حضور سر جھکاتے ہیں جو کام اللہ تعالی نے ہم پر فرض کئے ہیں ان پر ہم عمل کر کے انہیں تسلیم کرتے ہیں اور جو کام رب تعالی نے ہم پر حرام کئے ہیں ہم ان کو چھوڑ کر اللہ تعالی کے ارشاد کو بجالاتے ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

بہت شاندار ترجمہ مدارک نے لکھا ہے: ﴿وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا﴾ "اجبنا قولک" اورانہوں نے کہا کہ ہم نے تمہارے قول کو قبول کیا یعنی صرف سننے کا اقرار نہیں کیا کہ ایک کان سے سنااور دوسرے سے نکال دیا، بلکہ دل وجان سے سننے کا مؤمنین نے اقرار کیا کہ ہمارے رب ہم نے تیرے کلام کو دل وجان سے سن کر قبول کیا۔ ﴿ وَاَطَعۡنَا ﴾ کا معنی مدارک نے بھی وہی کیا ہے جو خازن نے کیا ہے۔ "واطعنا امرک" اور تیرے امر کی اطاعت کی۔ (از مدارک)

﴿ غُفۡرَانَکَ ﴾ ای اغفرلنا غفرانک فهو منصوب بفعل مضمر" ترکیبی لحاظ پر ﴿غُفۡرَانَکَ﴾ منصوب ہے اور پوشیدہ فعل کا مفعول مطلق ہے جسکا مختصر معنی راقم نے لکھا" تو مغفرت فرما۔ (مدارک)

ایک معنی خازن نے بھی لکھا ہے البتہ ایک معنی اور بھی لکھا ہے۔ ﴿ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا ﴾ ای نسئلك غفرانك ربنا یعنی کی فعل مقدر اگر "نسئلک" ہو اور "غفرانک" مفعول بہ ہو تو معنی یہ ہوگا" ہم سوال کرتے ہیں تجھ سے تیری مغفرت کا اے ہمارے رب! (خازن)

﴿ وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴾ "یعنی قالوا الیک یا ربنا مرجعنا و معادنا فاغفرلنا ذنوبنا"

یعنی مکمل ﴿ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ﴾ کا معنی یہ ہے کہ مؤمنوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہمارا پھرنا تیری طرف ہی ہے یعنی ہم نے تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تو ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما۔ علامہ بغوی نے ایک روایت ذکر کی ہے اگر چہ اسکی مکمل سند ذکر نہیں کی تاہم اتنی سند بھی مذکور ہے۔

"عن حکیم بن جابر ان جبریل علیہ السلام قال للنبی ﷺ ان اللہ عزوجل قد اثنی علیک وعلی امتک فسل تعط قال بتلقین اللہ تعالی غفرانک ربنا والیک المصیر"

حکیم بن جابر سے مروی ہے کہ بے شک جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا بے شک اللہ تعالی نے آپ کی اور آپ کی امت کی تعریف فرمائی ہے، آپ سوال کریں آپ کو عطاء کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالی سے ﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ کی تلقین کا سوال کرتا ہوں۔ (ماخوذ از خازن)

قرآن پاک کے اسرار عجیبہ:

اس آیہ کریمہ میں ذکر کئے گئے الفاظ مبارکہ خاص نکات ثابت کرر ہے ہیں ان کی ترتیب کے فوائد کو سمجھنے کیلئے پہلے تمہیدی مقدمہ سمجھا جائے۔ انسان میں یہ کمال ہے کہ حق کو لذاتہ پہچاننا اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ تعالی کیلئے عمل کرنے میں ہی بھلائی ہے اور اسے یہ معلوم ہو کہ قوت نظریہ کا کمال علم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ پتہ ہونا چاہیے کہ قوت عملیہ کو کمال اچھے اور نیک اعمال سے حاصل ہوتا ہے۔

"والقوة النظرة اشرف من القوة العمليه والقرآن مملوء من ذكرهمابشرطان تكون القوة النظرية مقدمة على العملية"

قوت نظریہ کو قوت عملیہ سے بلند مرتبہ حاصل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نظر وفکر پہلے کرے اور عمل بعد میں کرے یعنی جب قوت نظریہ پہلے پائی گئی قوت عملیہ سے تو اس وقت قوت نظریہ کو بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔ قرآن پاک میں دونوں کا ذکر جا بجا موجود ہے جہاں بھی نیک اعمال کا حکم دیا گیا اور برے کاموں سے روکا گیا ہے ان پر عمل کرنا قوت عملیہ ہے اور جہاں تدبر کرنے، تفکر کرنے، عبرت پکڑنے اور نصیحت کرنے وغیرہ کا ذکر ہے وہ قوت نظریہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا ذکر رب تعالی نے فرمایا کہ آپ نے رب تعالی کے حضور عرض کیا: ﴿رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ اے میرے رب! مجھے حکم عطا فرما اور اپنے قرب کے لائق لوگوں میں مجھے ملا۔ "فالحكم كمال القوة النظرية" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعاء میں حکم کو پہلے ذکر کیا جو کمال قوت نظریہ ہے اور ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ کا ذکر آپ نے بعد میں کیا ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ "كمال القوة العملية" اس کی وجہ یہ ہے کہ ﴿وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ کمال قوت عملیہ ہے، اور قوت نظریہ مقدم ہے اور اشرف ہے، قوت عملیہ سے۔

"اذاعرفت هذا منقول الامرفى هذه الاية ايضا كذلك فقوله ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ اشارة الى استكمال القوة النظرية بهذه المعارف الشريفة وقوله تعالى

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ اشارة الی استکمال القوة العملیة الانسانیة بهذه الاعمال الفاضلة الکاملة"

جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے جو ہم نے تفصیلی طور پر تمہیداً ذکر کیا ہے تو آیۃ کریمہ میں غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ میں کمال قوت نظریہ کی طرف اشارہ ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں پر ایمان اسی وقت لایا جائے گا جب ان کی معرفت حاصل ہوگی جس کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ قوت عملیہ انسانیہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال فاضلہ وکاملہ سے قوت عملیہ کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ (از کبیر)

آیۃ کریمہ میں مبداء، وسط اور معاد کا ذکر ہے:

انسان کا تعلق تین زمانوں سے ہے "ماضی، حال اور استقبال" ماضی سے بحث معرفت مبداء کہلاتی ہے اور حال سے بحث علم وسط کہلاتی ہے اور استقبال سے بحث کا نام علم معاد ہے۔ قرآن پاک میں ان تینوں مراتب کا ذکر پایا گیا ہے جو اس آیہ کریمہ میں (جس کی بحث کی جاری ہے) بھی ذکر پایا گیا ہے اس آیۃ کریمہ کے ذکر سے پہلے دوسرے مقامات میں سے سمجھئے پھر اس آیۃ کریمہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔ سورۃ ہود کی آخری آیۃ میں ان تینوں علوم یعنی علم مبداء، علم وسط، علم معاد کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْهِ وَمَارَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّاتَعْمَلُوْنَ﴾

اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب اور اسی کی طرف سب کاموں کی رجوع تو اس کی بندگی کرو اور اس پر بھروسہ رکھو اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں ﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ اشارہ ہے معرفت مبدأ کی طرف اس لئے کمالات حقیقیہ سوائے علم اور قدرت کے حاصل نہیں اور ان دونوں کا ذکر یوں فرمادیا:

﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اشارة الی کمال العلم وقوله ﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ اشارة الی کمال القدرة فهذاهو الاشارة الی علم المبدأ"

یعنی ﴿وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ذکر فرما کر کمال علم کی طرف اشارہ کیا، اور ﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ﴾ فرما کر کمال قدرت کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

مسئلہ واضح ہے کہ جب یہ فرمایا ''اور اللہ تعالی کیلئے ہی ہیں آسمانوں اور زمینوں کے غیب'' تو اس میں کمال علم کا ذکر ہے اور جب یہ فرمایا کہ ''اسی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں'' تو اس میں کمال قدرت کا ذکر ہے۔ یہ علم مبداء کا ذکر ہے۔

میرے عزیز طلباء کرام یہاں ٹھوکر نہ کھانا، یہ انسانوں کا علم مبدأ ہے، رب تعالی کے علم میں ماضی، حال، استقبال کا کوئی اعتبار نہیں۔ علم وسط وہ علم ہے جس کا تعلق زمانہ حال میں مشغولیت سے ہے۔ اسکے دو مرتبے ہیں ایک کا نام ''بدایة'' ہے اور دوسرے کا نام ''نھایة'' ہے۔ "اما البدایة فالاشتغال بالعبودیة" بدایت (ابتدأ) عبودیت میں مشغول ہونا ہے۔

''واما النھایة فقطع النظر عن الاسباب وتفویض الامور کلھا الی مسبب الاسباب وذلک ھو المسمی بالتوکل'' لیکن نہایت (انتہا) اسباب سے قطع نظر ہو کر تمام امور مسبب الاسباب یعنی رب تعالی کے سپرد کر دینا اس کا نام توکل ہے۔

یعنی اللہ تعالی پر کامل بھروسہ رکھنا۔ ان دونوں مقاموں کا ذکر کیا گیا۔ یعنی مقام ابتدأ کا تذکرہ ﴿فَاعْبُدْهُ﴾ ''تو اسی کی عبادت کرو'' سے کیا گیا اور مقام انتہاء کا تذکرہ ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ ''تو اسی پر توکل کرو'' سے کیا گیا اور علم معاد کا ذکر رب تعالی نے ﴿وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝﴾ ''اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں'' سے کیا ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنا ہے۔ جس میں تمہیں اپنے اعمال کے نتائج کا علم حاصل ہونا ہے۔ یعنی جس آیۃ کریمہ کو بطور مثال پہلی زیر بحث آیۃ کو سمجھانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے اس میں تینوں یعنی علم مبدأ، علم وسط اور علم معاد پائے گئے ہیں۔ اب اور آیات کریمہ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے تاکہ زیر بحث آیۃ کریمہ کو سمجھنا آسان ہو جائے، ارشاد ربانی ہے:

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

''پاکی ہے تمہارے رب کو، عزت والے کو ان باتوں سے اور سلام ہے پیغمبروں پر اور سب خوبیاں اللہ تعالی کو جو سارے جہان کا رب ہے''۔

ان آیات کریمہ میں بھی تینوں علوم کا ذکر موجود ہے ﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝﴾ یہ آیۃ علم مبدأ پر دلالت کر رہی ہے، کیونکہ جب مؤمن شخص ماضی کی طرف توجہ کرتا ہے، دیکھتا ہے کہ کفار جو اس کے شریک ٹھہراتے ہیں اور اسکی اولاد مانتے ہیں کیا وہ درست راہ پر ہیں تو مؤمن برملا طور پر کہتا ہے کہ رب تعالی تو ان کے بیان کردہ اوصاف سے پاک ہے، بس اسی کا نام علم مبدأ ہے۔ اور ﴿وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ سے علم وسط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تک رسولوں پر ایمان نہیں ہوگا تو قیامت پر ایمان بھی نہیں ہوگا اور قیامت میں کامیابی بھی نہیں

ہوگی اسی کا نام ہے "علم وسط" پھر رب تعالی نے ﴿وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o﴾ سے علم معاد کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ جنت والوں کا وصف بھی یوں بیان فرمایا کہ ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰاهُمْ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o﴾ بس اسی کا نام علم معاد ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں کو سمجھنے کے بعد اور یہ سمجھنے کے بعد کے علم مبدأ، علم وسط اور علم معاد کیا ہیں۔

اب زیر بحث آیۃ کریمہ کی طرف نظر کریں تو آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ اس میں یہ تینوں علوم پائے گئے۔ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لیکر ﴿لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍمِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ تک علم مبدأ کا ذکر ہے اور ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ میں علم وسط کا ذکر ہے کیونکہ ان الفاظ مبارکہ میں ان احوال کی معرفت پائی گئی جن کا علم رکھنا انسان کیلئے ضروری ہے تاکہ ان کی معرفت حاصل کر کے پھر اس دنیا میں ان پر عمل بھی کر سکے۔ اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ علم معاد پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں واضح طور پر رب تعالی کی طرف پھرنے اور بخشش طلب کرنے کا ذکر ہے جو امور اخروی ہیں۔

تنبیہ: یہ نکات بے فائدہ نہ سمجھے جائیں بلکہ ان کو نفع مند سمجھ کر وہی فائدہ عظیمہ حاصل کیا جائے جو علامہ رازی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

"والوقوف علی هذه الاسرار ینورا لقلب ویجذبه من ضیق عالم الاجسام الی فسحة عالم الافلاک وانوار بهجة السماوات"

ان اسرار ورموز پر جو شخص واقف ہوگا اس کا دل منور ہوگا، عالم اجسام کی تنگی سے نکل کر وہ عالم افلاک کی کشادگی اور آسمانوں کی خوبصورتی کے انوار تک پہنچ جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

حقائق موجودات اور احکام کا ذکر:

جس آیۃ کریمہ کی بحث کی جاری ہے اس میں حقائق موجودات کی بحث بھی پائی گئی ہے اور افعال کے احکام کی بحث بھی پائی گئی کہ وہ احکام واجب ہیں یا جائز یا ممنوع ہیں۔ پہلی قسم یعنی حقائق موجودات کا علم عقل پر موقوف ہے اور دوسری قسم یعنی احکام افعال کا علم سمع پر موقوف ہے کیونکہ وہ عقل سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ صرف شرع سے سن کر حاصل ہوتے ہیں۔

پہلی قسم یعنی حقائق موجودات کا ذکر ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ﴾ میں کر دیا گیا ہے کیونکہ کوئی شخص جنگل میں ہو، پہاڑوں میں ہو وہاں کوئی شخص اسکی راہنمائی کو نہ پہنچے تو پھر بھی رب تعالی کی طرف سے دی ہوئی عقل سے وہ زمین و آسمان، چاند و سورج، ستارے اور دن رات وغیرہ کو دیکھ کر اتنا ضرور تسلیم کرے کہ اس بہت بڑے

نظام کا چلانے والا موجود ہے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ وہ محتاجی اور موت سے پاک ذات ہے۔ ''یہی علم عقلی کہلاتا ہے ''اور دوسری قسم یعنی احکام افعال کا علم سمعی وشرعی کا ذکر ﴿وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''اورانہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی'' میں موجود ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

الاعادة بالتفصيل للافادة :

تفسیر مدارک سے ﴿سَمِعْنَا﴾ کا شاندار معنی جو بیان کیا گیا ہے، اگر چہ بظاہر تو اسی کا ذکر نظر آئے گا لیکن کبیر سے تفصیل ذکر کی جارہی ہے جو یقیناً نفع مند ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اللہ تعالی نے مؤمنین کے ایمان کا پہلے وصف ذکر فرمایا اور اس کے بعد ان کے قول ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''اور ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی'' کا ذکر کیا۔

''وليس المراد منه السماع الظاهر لان ذلك لايفيد المدح بل المراد اناسمعناه باذان عقولنااى عقلناه وعلمناصحته وتيقناان كل تكليف ورد على لسان الملائكة والانبياء عليهم السلام الينافهوحق صحيح واجب القبول''

اگر چہ بظاہر ﴿سَمِعْنَا﴾ کا معنی صرف ''ہم نے سنا'' نظر آتا ہے لیکن صرف ظاہری طور پر سننا مراد نہیں کیونکہ صرف سننا قابل تعریف نہیں بلکہ قابل تعریف وہ سننا ہے جو دل کے کانوں سے سنا جائے اور اسے سمجھا جائے اور اس کے صحیح ہونے کا علم حاصل کیا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ بے شک اللہ تعالی نے جن چیزوں کا فرشتوں اور انبیاء کرام کے ذریعے حکم دیا ہے وہ سب حق اور صحیح ہیں ان پر عمل کرنا واجب ہے۔

"سمع بمعنی قبول وفهم" قرآن پاک میں مذکور ہے رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ ''بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جو دل رکھتا ہو یا کان لگائے متوجہ ہو کر''

"والمعنى لمن سمع الذكر بفهم حاضر" معنی اس کا یہ ہے کہ بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس نے ذہن کو حاضر رکھ کر خوب متوجہ ہو کر نصیحت کو سنا، اور اس کے مقابل بھی ارشاد باری تعالی موجود ہے ﴿کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا کَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَیْهِ وَقْرًا﴾ گویا کہ اس نے نہیں سنا گویا کہ اس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ ﴿سَمِعْنَا﴾ کے بعد فرمایا ﴿وَاَطَعْنَا﴾ ''اور ہم نے اطاعت کی'' اس لفظ سے مؤمنین نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔ اے رب تعالی تو نے جو احکام ہمیں عطاء کئے ہیں ان کو ہم تسلیم کر رہے ہیں، ہمارا اعتقاد ان کے بارے میں صحیح ہے "فهم مااخلو ابشیء منها" صحابہ کرام نے ان احکام کے بجالانے میں بغیر کسی عذر وخطاء کے کوئی خلل

پیدا نہیں کیا جیسا کہ انہوں نے دل وجان سے سن کر قبول کیا ایسا ہی اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔

"فجمع الله تعالى بهذين اللفظين كل مايتعلق بابواب التكليف علماو عملا" قرآن پاک کی کیا خوب فصاحت و بلاغت ہے کہ اللہ تعالی نے ان دو لفظوں ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ میں مکلفین پر تمام امور و نواہی کا علمی اور عملی ذکر فرمادیا۔ ﴿سمعنا﴾ میں علمی ذکر ہے اور ﴿وَ اَطَعْنَا﴾ میں عملی ذکر ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ "تو اپنی مغفرت فرما اے ہمارے رب"

یا تو اس کا معنی ہے "اغفر غفرانک" تو اپنی مغفرت فرما۔ فراء نحوی نے کہا ہے کہ "غفران" مصدر ہے، مقام امر میں ہونے کی وجہ سے نصب ہے جیسا کہ "الصلوة، الصلوة" کا معنی ہوتا ہے۔ نماز ادا کرو، نماز ادا کرو، یا کہا جاتا ہے "الاسد، الاسد" شیر سے بچ جاؤ، شیر سے بچ جاؤ۔

طلب مغفرت میں دو چیزوں کے ذکر کے فوائد:

یہاں اس آیۃ کریمہ میں مغفرت کی طلب کو دو چیزوں سے متصل کیا ایک یہ کہ اللہ تعالی نے مغفرت کو اپنی طرف منسوب کر کے بندوں کو طریقہ بتایا، جس پر انہوں نے عرض کیا ﴿غُفْرَانَکَ﴾ "تیری مغفرت" یعنی تو اپنی مغفرت فرما اسکے بعد ﴿رَبَّنَا﴾ "اے ہمارے رب"۔ یہ دونوں قیدیں چند فوائد پر مشتمل ہیں۔

(۱) ان فوائد میں سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب مؤمن یہ کہتے ہیں ﴿غُفْرَانَکَ﴾ تو اس کے ضمن میں گویا کہ یہ کہتے ہیں کہ "انت الكامل فی هذه الصفة فانت غافر الذنب و انت غفور" اے اللہ تو اس صفت میں کامل ہے تو ہی گناہوں کا بخشنے والا ہے اور تو ہی غفور ہے۔ تو نے اپنے غفور ہونے کو قرآن پاک میں جا بجا ذکر کیا ہے ﴿وَرَبُّکَ الْغَفُوْرُ﴾ اور آپ کا رب بخشنے والا ہے ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ o﴾ اور وہی بخشنے والا اپنے نیک بندوں پر پیارا ﴿وَاَنْتَ الْغَفَّارُ﴾ ﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا o﴾ اور مؤمنین گویا کہ ضمناً یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تو غفار ہے تو اپنی مہربانی سے ہماری بخشش فرما تو نے اپنے غفار ہونے کا تذکرہ یوں فرمایا ہے: ﴿وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا o﴾ "اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے"

اے اللہ! ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تواب سے غفار نہیں بلکہ یہ تو تیری صفت قدیمہ ہے، تو اس سے ازلاً ابداً متصف ہے یہ تو تیری صفت خاصہ ہے۔ اب رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿غُفْرَانَکَ﴾ کا مطلب یہ بنا کہ اللہ تعالی

کے بندے ایمان والے رب کے حضور گویا یوں کہتے ہیں:

"اطلب الغفران منک (واغفر غفرانک) وانت الکامل فی هذه الصفة والمطموع من الکامل فی صفة ان یعطی عطیة کاملة" کہ میں تجھی سے بخشش طلب کرتا ہوں، اے رب تعالیٰ تو ہی بخشش فرما تو ہی اس صفت میں کامل درجہ رکھتا ہے جب یہ تیری ہی صفت کاملہ ہے تو ہم امید کرتے ہیں کہ تو کامل عطیہ عنائت فرمائے گا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ

(غُفرَانکَ) طلب الغفران کامل وماذالک الابان یغفر جمیع الذنوب بفضله ورحمته ویبدلهابالحسنات کماقال ﴿فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾

کہ جب مغفرت اس ذات سے طلب کی جارہی ہے کہ جو کامل مغفرت کا حق وہی رکھتا ہے تو کامل امید اس پر رکھی جائے اور اس سے سوال کیا جائے کہ اے اللہ اپنے فضل وکرم سے تو تمام گناہوں کو معاف فرما۔ اور ہم یہی امید کامل رکھتے ہیں۔ کہ تو ہمیں اسی درجہ میں رکھے گا کہ تو ہماری لغزشوں کو، تو ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کو معاف کرکے ان کے بدلے ہمیں نیکیاں عطاء فرمائے گا۔

(۲) ان فوائد میں سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حدیث صحیح میں یہ مذکور ہے۔"ان الله مائة جزء من الرحمة قسم جزأ واحدامنهاعلی الملائکة والجن والانس وجمیع الحیوانات فبهایتراحمون وادخر تسعة وتسعین جزأ لیوم القیامة" بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں، ان میں سے ایک حصہ فرشتوں، جنوں، انسانوں اور تمام حیوانوں کو عطاء کیا گیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کی رحمت کے ننانوے حصے قیامت کے دن کیلئے ذخیرہ بنا رکھے گئے ہیں۔

جو بندہ رب تعالیٰ کے حضور "غفرانک" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ، اے اللہ! میں تیری رحمت پر غالب گمان رکھتا ہوں کہ تو مجھے بہت بڑی مغفرت سے نوازے گا۔"کان العبد یقول هب ان جرمی کبیر غفرانک اعظم من جرمی" گویا بندہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھے اپنی بخشش عطا فرمادے، بیشک میرا جرم تو بہت بڑا ہے لیکن اے اللہ تیری بخشش میرے جرم سے بڑی ہے۔

(۳) ان فوائد میں سے تیسرا فائدہ یہ ہے کہ گویا کہ بندہ یہ کہہ رہا ہو کہ اے اللہ تیری ہر صفت تیری صفات جلالیہ اور صفات الٰہیہ سے ہے اور اس کے اثرات مقام معین میں پائے جاتے ہیں، اگر وہ صفات موجود نہ ہوں تو تیری قدرت

کے آثار ظاہر نہ ہوں، اگر نظام عالم میں یہ عجیب وغریب ترتیب نہ پائی جائے تو تیرے علم کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ "فکذا لولاجرم العبد وجنایته وعجزه وحاجته لماظهرت آثار غفرانک" اسی طرح اے مولائے کائنات !اگر بندے کے جرم اور غلطیاں نہ ہوتیں اور بندہ عاجز اور حاجت مند نہ ہوتا تو تیری بخشش کے آثار ظاہر نہ ہوتے ﴿غُـفْـرَانَک﴾ کہہ کر بندہ اپنی امید کا قوی اظہار کرتا ہے کہ مجھے امید واثق ہے کہ تیری مغفرت مجھے بھی حاصل ہوگی اور میرے جیسے اور مجرمین کو بھی حاصل ہوگی۔

﴿رَبَّنَا﴾ "اے ہمارے رب"

مؤمنین نے ﴿غُفْرَانَک﴾ کے بعد ﴿رَبَّنَا﴾ ذکر کیا ہے اس میں بھی چند فوائد ہیں۔ وہ فوائد سمجھنے سے پہلے لفظ رب کا یہاں مقصودی معنی سمجھئے۔

لفظ **رب** کے کئی معانی ہیں "خالق، سید، مالک منعم، مصلح، معبود، صاحب" اس مقام پر لغوی معنی ہی معتبر ہے۔ "الرب فی الاصل مصدر بمعنی التربیة وهی تبلیغ الشیء الی کماله شیأفشیأ بحسب استعداده الازلی" رب اصل وضع میں مصدر ہے جسکا معنی "تربیت" ہے یعنی ایک چیز کو آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانا اسکی ازلی استعداد کے مطابق یعنی جس طرح کی انسان میں استعداد ہوگی اسی طرح اس پر تربیت کا اثر بھی ہوگا۔ تدریجا کمال تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ قوت سے فعل کی طرف نکالنا، جس چیز کے ذریعے سے ایک چیز کو کمال حاصل ہوتا ہے اسکی طرف نکالنا" اب ان فوائد کی طرف توجہ کیجئے جو اس مقام پر "ربنا" کے ذکر سے حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) بندہ گویا کہ رب تعالی کے حضور یوں عرض کر رہا ہوتا ہے کہ اے میرے رب جب میں تیری توحید کا ذکر نہیں کر رہا تھا تو اس وقت بھی تو میری تربیت فرما تا رہا "فکیف یلیق بکرمک ان لاتربیتی عند ماافنیت عمری فی توحیدک" اب تیری شان کریمی کے یہ کس طرح لائق ہوگا کہ تو میری تربیت نہ فرمائے جبکہ میں نے اب تک اپنی عمر کو تیری توحید میں صرف کر دیا یعنی اے اللہ میرا ایمان ہے کہ تو ﴿وحده لاشریک له﴾ ہے لہذا تو ہی مجھ پر کرم فرما۔

(۲) بندہ رب تعالی کے حضور یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ جب میں معدوم تھا (کچھ نہ تھا) اس وقت تو نے میری تربیت کی ہے اور معرض وجود میں لایا۔ (تو نے مجھے موجود کیا)

"امالآن فلولم تربنی وقعت فی الضرر الشدید فاسئلک ان لاتهملنی"
لیکن اب اگر تو میری تربیت نہ فرمائے گا تو میں شدید ضرر میں مبتلا ہو جاؤں گا اسلئے اب میں تیرے

حضور یہی عرض کرتا ہوں کہ مجھے یوں ہی نہ چھوڑ دینا بلکہ میری تربیت جاری رکھنا۔

(۳) ان فوائد میں سے تیسرا فائدہ یہ ہے کہ: "ربیتنی فی الماضی فاجعل تربیتک لی فی الماضی شفیعی الیک فی ان تربیتنی فی المستقبل" کہ بندہ رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کر رہا ہوا ہے کہ اے میرے اللہ تو نے ماضی میں میری تربیت کی اسی ماضی کی تیری تربیت کو تیرے حضور شفیع بنا کر پیش کر رہا ہوں کہ تو اس کی شفاعت کو قبول فرما کر مستقبل میں میری تربیت فرما"

(۴) ان فوائد میں سے چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ بندہ اپنے رب کے حضور گویا کہ یوں ذکر کر رہا ہوتا ہے "ربیتنی فی الماضی فاتمام المعروف خیر من ابتدائه فتمم هذه التربية بفضلک و رحمتک" کہ اے میرے اللہ تو نے ماضی میں میری تربیت کی اب اس تربیت کو جاری رکھ اور اسے اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے اسے مکمل فرما اسلئے کہ نعمت اور بھلائی کو مکمل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے بنسبت ابتدا کرنے کے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاِلَيۡکَ الۡمَصِيۡرُ﴾ "اور تیری طرف ہی پھرنا ہے"

ان الفاظ مبارکہ کے ذکر کرنے سے دو فائدے حاصل ہوئے:

(۱) جب ایمان والوں نے "عالم مبدأ" کا اقرار کیا تو اسکے بعد ﴿وَاِلَيۡکَ الۡمَصِيۡرُ﴾ کہہ کر عالم معاد کا اقرار کیا اور ترتیب بھی یہی ضروری تھی کہ "لان الایمان بالمبدأ اصل الایمان بالمعاد" کیونکہ مبدأ پر ایمان لانا، معاد پر ایمان لانے کی اصل و بنیاد ہے۔

"فان من اقر ان الله عالم بالجزئيات وقادر على الممكنات لابد وان يقر بالمعاد" بیشک وہ شخص جس نے اقرار کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ جزئیات کو جاننے والا ہے اور ممکنات پر قادر ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ معاد کا بھی اقرار کرے۔

(۲) دوسرا فائدہ یہ حاصل ہو رہا ہے کہ جب بندے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے رب تعالیٰ کے حضور لوٹ کر جانا ہے اور اس ذات کی طرف جانا ہے کہ قیامت میں اسکے حکم کے بغیر کسی کا حکم نہیں پایا جاتا، دنیا میں مجازی طور پر جو حاکم ہوتے ہیں ان کی مجازی احکام پائے جاتے ہیں۔ قیامت میں وہ سب ختم ہو جاتے ہیں صرف رب تعالیٰ "احکم الحاکمین" کا حکم چلتا ہے اور جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ کے حضور "ولا یستطیع احد ان یشفع الا باذن الله" اسکی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

"فکان اخلاصہ فی الطاعات اتم ،احترازہ عن السیات اکمل " تو اسکا اخلاص طاعات میں مکمل ہوگا اور برائیوں سے بھی وہ کامل طور پر بچ سکے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"والمصیر اسم مصدرمن صار یصیر وھو مبنی علی مفعل بکسر العین "

مصیر اسم مصدر ہے" صار ،یصیر "کا اور اس کا وزن" مفعِل " ہے،یعنی اصل میں "مَصْیِرٌ" یاء کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی "مَصِیْرٌ" ہوگیا۔ (البحر المحیط)

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرة آیة نمبر ۲۸۶)

(1) اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر، اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا، اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے اور ہم پر مہر کر تو ہمارا مولی ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔

(2) نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے، اس (نفس کے نفع) کیلئے ہے جو کسب کیا اس نے (خیر) اور اس (نفس) پر (ضرر) ہے، جو کسب کیا اس نے (شر)۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہمیں اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے، اے ہمارے رب! اور نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسا ڈالا تو نے وہ (بھاری بوجھ) ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں طاقت ہمیں اس کی اور معاف کر ہمیں اور بخش دے ہمیں اور رحم کر ہم پر، تو ہمارا مولی ہے، تو امداد فرما ہماری اوپر قوم کافرین کے۔

ماقبل سے تعلق اور شان نزول:

"واخرج احمد ومسلم والترمذی والنسائی وابن جریر وابن المنذر والحاکم والبیهقی فی الاسماء والصفات عن ابن عباس قال نزلت هذه الآ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ دخل فی قلوبهم منه شئی لم یدخل من شئی فقالوا للنبی ﷺ فقال قولوا سمعنا واطعنا وسلمنا فالقی الله الایمان فی قلوبهم فانزل الله آمن الرسول الآیة﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا

مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْاَخْطَأْ نَا)قال قدفعلت﴿ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾قال قدفعلت﴿ رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلْنَا مَالَاطَاقَةَ لَنَا بِهٖ)قال قدفعلت(وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا﴾ الأية قال قد فعلت"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آیۃ کریمہ ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَافِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ " اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ" نازل ہوئی، تو صحابہ کرام کے دلوں میں وہ چیز آ گئی جو پہلے ان کے دلوں میں کبھی نہیں آئی تھی، تو انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں (اپنی اس پریشانی کے متعلق) عرض کیا، تو آپ نے فرمایا تم یہ کہو کہ ہم نے اپنے رب کا کلام دل و جان سے سنا اور اس کی اطاعت کی، اور ہم نے رب کے حکم کو تسلیم کر لیا ہے۔ (جب انہوں نے رب کے حضور عرض کیا) تو اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں ایمان کو راسخ کر دیا، (ان کا اضطراب جاتا رہا) تو اللہ تعالی نے اس وقت ان دونوں آیتوں " آمن الرسول " اور ﴿لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَاكَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَااكْتَسَبَتْ﴾ کو نازل فرمایا، بندہ جب رب کے حضور عرض کرتا ہے ﴿(رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْاَخْطَأْنَا﴾ تو رب تعالی کی طرف سے اسے جواب ملتا ہے، " قدفعلت" تحقیق میں نے تمہاری دعاء کو قبول کر لیا، اور بندے جب رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ تو رب تعالی سے جواب ملتا ہے " قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کر لیا ہے، جب بندے رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلْنَا مَالَاطَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ تو رب تعالی سے جواب ملتا ہے "قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کر لیا، پھر جب بندہ رب تعالی کے حضور عرض کرتا ہے ﴿ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَافَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ o﴾ تو اللہ تعالی کی طرف سے جواب ملتا ہے "قدفعلت" میں نے تمہاری دعاء کو قبول کر لیا۔ (در منثور)

صحابہ کرام ﷺ کو کیا پریشانی لاحق ہوئی جس کا ذکر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کیا؟ اس پریشانی کا ذکر تفصیلا ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَافِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ میں ذکر کیا جا چکا ہے تاہم مختصرا اس کا بیان یہ ہے کہ مسلم، مسند احمد اور ابو داود کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں جب آیۃ "ان تبدوا" نازل ہوئی۔

"اشتد ذلک علی اصحاب رسول الله ﷺ فاتوا رسول الله ﷺ لم جثوا علی الرکب فقالوا یا رسول الله کلفنا من الاعمال مانطیق الصلوة والصیام والجها د والصدقة وقد انـزل علیک هذه الأیة ولانطیقها فقال رسول الله ﷺ اترید ون تقولوا کما قال اهل

الکتابین من قبلکم ﴿سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر﴾
تو صحابہ کرام پر بہت شاق گذری، وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں اعمال کی تکلیف دی گئی ہم ان کی طاقت رکھتے تھے، یعنی نماز، روزے، جہاد، صدقہ کی ہمیں طاقت تھی، اب آپ پر آیۃ نازل ہوئی (جس میں دلوں کی ظاہر اور باطن باتوں پر مؤاخذہ کا ذکر ہے) اس کی ہمیں طاقت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے کہو جیسے تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَيْکَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ (درمنثور)

تنبیہ : ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مؤمنین نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا تو آپ نے انہیں کچھ ڈرایا، کچھ تسلی دی، ڈرایا اس طرح "اتریدون ان تقولوا کما قال اھل الکتابین من قبلکم سمعنا وعصینا" (کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے کہو جیسے تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا" ہم نے سنا (اور دل میں کہا ہم نے نافرمانی کی) تو گویا کہ آپ نے دھمکی دی خبردار! اہل کتاب کی طرح تم کوئی ایسا قول نہ کرنا اور دل میں کوئی خیال نہ لانا جیسا انہوں نے دل میں کہا تھا ہم نے نافرمانی کی" ورنہ ان میں اور تم میں کیا فرق رہے گا اور ساتھ ساتھ تسلی بھی دی اور ارشاد فرمایا تم یوں کہو ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَيْکَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی تو مغفرت فرما اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی پھرنا ہے، اس میں گویا کہ تسلی دی گئی کہ جب تم نے رب کی اطاعت کی اور اس کے احکام کو قبول کیا اور اسی سے بخشش طلب کی اور قیامت پر تم نے ایمان لایا تو یقیناً رب تعالیٰ تم پر فضل و کرم فرمائے گا۔

مؤمنین نے جب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے تسلی پاتے ہوئے رب تعالیٰ کے حضور ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ عرض کیا ہم نے سنا اور اطاعت کی تو مغفرت فرما اے ہمارے رب، تو مؤمنین کی جانب سے

" ھذا طلب للمغفرة فیما یصدر عنھم من وجوہ التقصیر لا جرم خفف اللہ عنھم ذلک وقال (لَا يُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا)

جب اپنی اس کوتاہی کا ذکر کیا جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ اور رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کی تو رب تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ خبر دی۔

﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا ﴾

''اللہ تعالیٰ نہیں تکلیف دیتا کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔''

''والمعنی انکم اذا سمعتم واطعتم وماتعمد تم التقصیر فعند ذلک لووقع منکم نوع تقصیر علی سبیل السھو والغفلة فلاتکونوا خائفین منه ، فان اللہ تعالی ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾

مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ یوں کہا گیا کہ جب تم نے سن لیا اور اطاعت کر لی ، اور اپنی غلطی اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا وہ کوتاہی بھی درحقیقت سہو اور غفلت کی وجہ سے تھی ، جب تم اس سے بخشش طلب کر رہے ہو تو کوئی خوف نہ کرو ، بیشک میں اللہ ہوں ، اپنے بندوں پر مہربان ہوں ، میری شان الوہیت کے خلاف ہے کہ میں کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف دوں۔

''وبالجملة فهذا اجابة لهم فی دعائهم فی قولهم ''غفرانک ربنا''

حاصل کلام یہ ہے کہ بندوں نے رب کے حضور جب یہ عرض کیا ''غفرانک'' تو بخشش فرما ، تو رب تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کرتے ہوئے فرمایا ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی وسعت کے۔

لیکن خیال رہے کہ اس کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی مفسرین کرام نے بیان کیا ہے ، اسی دوسرے احتمال کو بیان کرنے کیلئے راقم نے تنبیہ کے لفظ سے عنوان مقرر کیا ہے۔ وہ دوسرا احتمال یہ ہے ،

ویحتمل ان یکون حکایة عن الرسول والمؤمنین علی نسق الکلام فی قوله (وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ٥) وقالوا (لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ ویؤید ذلک ما اردفه من قوله (ربنا لاتؤاخذ نا) فکأنه تعالی حکی عنهم طریقتهم فی التمسک بالایمان والعمل الصالح وحکی عنهم فی جملة ذلک انهم وصفوا ربهم بانه (لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا)

ایک اور احتمال یہ ہے کہ جس طرح پہلا کلام رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کا ہے ، اور اس کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان کی کہ انہوں نے کہا ﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ٥ ﴾ ایسا انہوں نے ہی کہا ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ اس کی تائید بعد والے کلمات کر رہے ہیں ﴿ ربنا لاتؤاخذنا ﴾ کہ یہ دعاء بھی مؤمنین نے کی۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے ایمان اور نیک اعمال کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ ذکر بھی فرما دیا کہ ان کو ایمان اور نیک اعمال اور رب تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے کی وجہ سے یہ توفیق حاصل ہوگئی اور ان کے دلوں میں یہ

بات بھی آ گئی کہ رب تعالیٰ جب رحیم وکریم ہے تو وہ کسی نفس کو طاقت سے زائد کیسے تکلیف دے گا۔ یہ دل میں آتے ہی انہوں نے برملا طور پر کہا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ (ماخوذ از کبیر)

اگرچہ پہلا احتمال زیادہ مشہور ہے اور زیادہ مفسرین کرام نے وہی قول لیا ہے، لیکن دوسرے قول میں بھی رب تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہے کہ اسی کی توفیق سے مؤمنین کے دلوں میں یہ بات خود ہی آ گئی کہ رب تعالیٰ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا، حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کا یہ عظیم مقام ہے کہ ایک ایک لفظ یا ایک ایک جملہ میں کئی کئی مطلب پائے جاتے ہیں۔

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ "کلفة" کا معنی ہے تکلیف دینا جیسے کہا جاتا ہے، "کلفته الشئی فتکلف" میں نے اسے تکلیف دی کسی چیز کی اس نے وہ تکلیف برداشت کر لی۔ تکلیف دینے کا مطلب احکام نافذ کرنا، حکم دینا یہ کام کرو، اسی وجہ سے، عاقل و بالغ شخص کو مکلف کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

"والوسع مایسع الانسان ولا یضیق علیه ولا یحرج فیه"

جو چیز انسان کی وسعت میں ہو اور اس پر تنگی نہ ہو اور اسے حرج نہ ہو اسے "الوسع" کہا جاتا ہے۔

دینی مدارس کے طلباء کرام یہ بھی مدنظر رکھیں، "قال لفراء هو اسم کالوجد والجهد" فراء نحوی نے یہ کہا ہے کہ "الوسع" مصدری معنی کے بغیر بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ "وجد" اور "جهد" اگرچہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن بطور اسم بھی ان کا استعمال عام ہے۔ "وقال بعضهم الوسع دون المجهود فی المشقة" اور بعض نے کہا جب کوئی شخص بہت زیادہ مشقت میں مبتلاء ہو تو پھر اس مشقت کو کم کر دیا جاتا ہے تو اس وقت "الوسع" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی مشقت کو کم کر کے اسے وسعت دے دی گئی۔ آسان طور پر اس کا معنی یہ ہے، "وهو مایتسع له قدرة الانسان" کہ انسان کی ذات وطاقت میں جو چیز وسعت پیدا کرے اسے ہی "الوسع" کہا جائے گا۔ (از کبیر)

طاقت سے زائد نہ تکلیف دینے کا مطلب کیا؟

قدرت کی دو قسمیں ہیں جن پر احکام کے فرض وواجب ہونے کی دارومدار ہے۔ ایک قُدۡرَة مُمۡکِنَة اور

دوسری قُدرۃ مُیَسِّرَہ۔ اگر ایک شخص کو قدرت ممکنہ ہی حاصل نہ ہو تو اس پر احکام فرض نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے کی قدرت ممکنہ ناقصہ ہوتی ہے اور مجنون یعنی پاگل، دیوانہ کو قدرت ممکنہ حاصل ہی نہیں ہوتی، اس لئے نابالغ اور مجنون احکام کے مکلف نہیں۔ جن احکام کا تعلق قدرۃ میسرہ سے ہے وہ قدرۃ میسرہ کے حاصل ہونے کے بغیر فرض نہیں ہوتے، جیسے زکوۃ کے فرض ہونے کیلئے مال کا نامی ہونا اور اس پر سال کا گذرنا اور نصاب مکمل ہونا قدرۃ میسرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ چیزیں پائی جائیں تو زکوۃ فرض ہوگی ورنہ فرض نہیں ہوگی۔ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہوگیا۔

"وھذا یدل علی عدم وقوع التکلیف بالمحال و لا یدل علی امتناعہ"

کہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی کہ محال چیزوں کی تکلیف کا وقوع نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہورہا کہ محال چیزوں کی تکلیف ممتنع ہے۔

یہاں قدرۃ سے مراد قدرۃ موہومہ ہے (جس کے پائے جانے پر وہم پایا جائے کہ یہ قدرۃ پائی گئی ہے) وہ قدرۃ ہومہ یہ ہے کہ کام کرنے سے پہلے اسباب وآلات سلامتی میں ہوں اور اس چیز کی فرضیت پر کہ اس کا حکم دیا گیا ہے دلائل وبراہین پائے گئے ہوں۔ خواہ ان اوامر (حکموں) کا تعلق اعتقادات سے ہو، یا عوامل ظاہرہ سے ہو یا عوامل باطنہ سے ہو۔ **یہاں** قدرۃ سے مراد وہ قدرۃ نہیں جو فعل کے ساتھ پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کام کرلیا جاتا ہے اور نہ ہو تو وہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس قدرۃ کا لحاظ کیوں نہیں کیا گیا؟ اس لئے کہ رب تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ایمان لانے کا حکم دیا، اور فرعون اور ابوجہل وغیرہ کو بھی ایمان لانے کا حکم دیا حالانکہ ان کے متعلق رب تعالی نے یہ خبر بھی دی ہے کہ

﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ﴾ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ "واخبر عنھم بانھم لایؤمنون" اور رب تعالی نے ان کے متعلق یہ خبر بھی دے دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور ان کے ایمان نہ لانے پر ان کو مستحق عذاب بھی ٹھہرادیا گیا ہے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان کو قدرۃ موہومہ حاصل تھی جو فعل سے پہلے ہوتی ہے، اگرچہ فعل کے ساتھ قدرۃ حاصل نہ تھی اسی طرح رب تعالی نے فرمایا۔

﴿لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَO وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَO﴾

جو تم میں سے چاہے درست راہ پر قائم رہے، اور نہیں چاہتے تم مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہتا ہے۔

یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ رب تعالی نے تمہیں اختیار دیا ہے۔ تمہارے اعضاء کو سلامت رکھتا ہے، تمہیں

عقل دی ہے سمجھنے کیلئے اس لئے تم اپنے اختیار سے درست راہ پر قائم ہو جاؤ، اگر تم درست راہ پر قائم نہ رہے تم نے بھی پسند کیا تو رب تعالی نے بھی تمہارے لئے عذاب کو پسند کر رکھا ہے۔ اگر یہ فرق نہیں کریں گے تو

" ومشية الله تعالى غير مقدور للبشر فكذا مشيته التى علقت بمشيته الله تعالى"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی مشیت انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ اسی طرح انسان کی مشیت کا اللہ تعالی کی مشیت سے معلق ہونا بھی انسان کی قدرت میں نہیں۔

"وهذا سرمن اسرار الله تعالى يجب الايمان به واسكوت عنه وترك البحث فيه فانه مزلة الا قدام"

یہ اللہ تعالی کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس پر خاموش رہنا ضروری ہے، اور اس میں الٹی بحثوں سے پرہیز کیا جائے ورنہ انسان کے قدم لڑکھڑا جائیں گے، وہ لغزش کی وجہ سے پھسل کر سر کے بل گر کر اپنے ایمان کو تباہ کر کے بیٹھ جائے گا، عاقبت برباد کر دے گا۔ (ماخوذ از مظہری)

ہاں درست بحثیں کرنا صحیح مطالب پیش کرنا اہل علم کا حق ہے، دین کے باغیوں کے شکوک وشبہات کو زائل کرنا علماء حق کا کام ہے، جس کو بفضلہ تعالی علماء کرام مستحسن طور پر ادا کر رہے ہیں۔ آجکل اگرچہ یہود ونصاری وہنود اور قادیانیوں کا گٹھ جوڑ ہو چکا ہے، بظاہر یوں نظر آتا ہے۔

دین نبی دا وانگ یتیماں رووے تے کرلاوے
کتھے هووے عمر بهادر که روندیاں نوں گل لاوے

لیکن حقیقت میں کوئی مایوسی بھی نہیں اس لئے کہ، " لكل فرعون موسى، اى لكل مبطل محق " ہر فرعون کے مقابل کوئی موسی آتا ہی ہے، یعنی باطل راہ پر چلنے والوں کے مقابل حق راہ پر چلنے والے آتے رہے، اور انشاء اللہ ہمیں آتے رہیں گے۔

اس مقام پر اگرچہ علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے معتزلہ کا مذہب اور ان کے دلائل کا ذکر کیا ہے، لیکن راقم کا مشورہ طلباء کرام کو یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی معتزلی اس آیۃ کریمہ ﴿لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ سے غلط مطالب میں پھنسانے کی کوشش کرے تو تفسیر مظہری کی بحث میں سے "قدرة موهرمه موجوده قبل الفعل " اور "قدرة متصلہ بالفعل" کا فرق یاد رکھیں اور ساتھ ساتھ " عدم وقوع فعل محال" اور "غير ممتنع تكليف بالمحال" کا فرق یاد رکھیں تو انشاء اللہ آپ کو باطل راہ پر چلنے کو جواب دینا آسان ہوگا۔ (راقم)

طاقت سے زائد تکلیف نہ دینا: "وهذا من لطفه تعالى بخلقه ورأفته بهم واحسانه اليهم"

اللہ تعالیٰ کا کسی نفس کو طاقت نہ دینا یہ اس کی خاص مہربانی ہے مخلوق پر اور ان سے نرم اور بہتر سلوک ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔

❁ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ان الله وضع عن امتی الخطاء و النسیان و ما استکرهوا علیه" (رواه ابن ماجه و ابن حبان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء اور بھول اور جبری طور پر کرائے ہوئے کام کو اٹھالیا ہے۔ یعنی ان تینوں پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اگر اس پر مؤاخذہ ہو تو وسعت سے زائد تکلیف دینا لازم آئے گا۔

❁ وعن ام الدرداء عن النبی ﷺ قال ان الله تجاوز لامتی عن ثلاث عن الخطاء و النسیان والاستکراه" (رواه ابن ابی حاتم)

حضرت ام الدرداء فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت سے تین چیزوں سے درگزر فرمایا ہے، خطاء اور بھول اور جبریہ کام کرانے سے۔ (ماخوذ از صابونی، ابن کثیر)

احکام شرعیہ میں غور کیا جائے تو تمام انسانوں کی وسعت کے مطابق ہیں، وسعت سے زائد تکلیف نہیں دی گئی۔

❁ عن عمران بن حصین قال کانت بی بواسیر فسئلت النبی ﷺ عن الصلوة فقال صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلی جنب زاد نسائی فان لم تستطع فمستلقیا ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا﴾ (رواه الجماعة الا مسلم)

حضرت عمران بن حصین ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بواسیر کی مرض میں مبتلاء ہوں، نماز کیسے ادا کروں؟ تو آپ نے فرمایا "نماز کھڑے ہو کر پڑھو، اگر تمہیں طاقت ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز ادا کرلو، اگر تمہیں بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو نماز کروٹ کے بل ادا کرو، نسائی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ "اگر تمہیں اسکی طاقت نہ ہو تو سیدھا سہارے پر لیٹ کر نماز ادا کرلو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر دلیل قائم فرماتے ہوئے یہی آیت پڑھی ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

❁ اسی طرح روزے کو دیکھیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں۔ اس سے بھی یہ واضح ہوا کہ مریض جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ یا روزہ رکھے تو مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہو یا مرض کے دیر سے ٹھیک ہونے کا خطرہ ہو، تو اس کی طاقت کے مطابق یہ حکم دیا گیا کہ وہ روزہ رمضان شریف میں نہ رکھے بعد میں مرض کے ٹھیک ہونے پر اتنی مقدار جو

روزے چھوڑے تھے قضاء کرلے۔ اسی طرح مسافر کو اجازت دی گئی کہ وہ روزہ وقتی طور پر نہ رکھے بعد میں قضاء کرلے یہ سب احکام دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی کسی نفس کو وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ سفر اگر مشقت آمیز ہو تو روزہ رکھنے میں بہت زیادہ دشواری درپیش آئے تو روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوران سفر ایک شخص کو دیکھا کہ بے ہوش پڑا ہے، دوسرے حضرت اس پر کپڑوں سے ہوا چلا رہے رہیں، پوچھا اسے کیا ہوا تو صحابہ کرام نے فرمایا کہ اس نے روزہ رکھا ہوا تھا سفر میں گرمی کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے، تو اس وقت آپ نے فرمایا، "لیس من البر الصیام فی السفر" ایسی حالت میں سفر میں روزہ رکھنا نیکی کا کام نہیں۔ مطلب واضح ہے کہ جب رب تعالی طاقت سے زائد کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا تو اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالتے ہو۔

❁ زکوۃ کو دیکھئے تو مال پر سال گذر جائے، اور مال بھی بڑھنے والا ہو یعنی تجارتی مال ہو یا سونا، چاندی اور پیسے ہوں تو زکوۃ لازم آ ہے گی پھر نصاب بھی مکمل ہو۔ زکوۃ کی فرضیت کو اتنی چیزوں پر موقوف کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالی کسی نفس کو وسعت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

❁ حج کو دیکھئے تو رب تعالی کا ارشاد نظر آئے گا، ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ اللہ تعالی کیلئے لوگوں پر حج ہے جو شخص اس کی طرف جانے کی طاقت رکھتا ہو۔ یعنی آنے جانے کی طاقت ہو، کرایہ ہو۔ پھر واپسی تک اہل وعیال کا خرچ ہو۔ کوئی رکاوٹ نہ ہو پھر حج فرض ہوتا ہے۔ وجہ وہی ہے کہ اللہ تعالی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دتیا۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

"اس (نفس کے نفع) کیلئے ہے جو اس نے کسب کیا (خیر) اور اس (نفس) پر (ضرر ہے) جو کسب کیا اس نے (شر)۔"

راقم چونکہ لفظی ترجمہ کی کوشش کر رہا ہے، لیکن مطلب سمجھانے کیلئے کچھ الفاظ کو بریکٹ میں لانے کی مجبوری بن گئی لیکن اعلی حضرت رحمۃ اللہ کا ترجمہ بامحاورہ ہے اس لئے مختصر اور خوبصورت کہ راقم جیسا نقال بھی اس خوبصورتی اور جاذبیت کو اپنے لفظوں میں سمونے قاصر رہا، آپ کا ترجمہ یہ ہے "اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی" ان الفاظ مبارکہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی۔ یعنی نیک کاموں کی رغبت دلائی گئی اور برے کاموں سے ڈرایا گیا، کیونکہ جب یہ بیان کیا گیا جب یہ بیان کہ اللہ تعالی کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں

دیتا، تواسی سے واضح ہو گیا۔

"ان تکلیف کل نفس مع مقارنته لنعمة التخفیف و التیسیر تتضمن مراعاته منفعة زائدة وانهاتعود الیها لاالی غیر ها ویستتبع الا خلال به مضرة تحق بها لا بغیرها "

کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بندے کو اپنے احکام کی تکلیف دینے میں تخفیف اور آسانی کو بھی ساتھ رکھتا ہے تا کہ اسے طاقت سے زائد تکلیف نہ دی جائے، پھر اس کے اوپر زائد منفعت یہ رکھی کہ جب بندہ نیک عمل کرے گا تو اس کا ثواب اسی کو دیا جائے گا، اس کا ثواب مکمل طور پر کسی اور کو دے دیا جائے اسے محروم رکھا جائے یا اس کا ثواب کم کر کے کسی اور کو دے دیا جائے ایسا نہیں ہوگا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل ہوگا، ہاں اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی اور برے کام کیے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ بھی سخت ہے، ان برے کاموں کا عذاب اور وبال بھی اسے ہی حاصل ہونا ہے، ایسا نہیں کہ اس کے گناہوں کا عذاب کسی اور کو دے دیا جائے، کیا خوبصورت انداز میں نیک کاموں کی رغبت دلائی گئی اور برے کاموں سے ڈرایا، اسی کا نام "ترغیب وترھیب" ہے۔

مختصر الفاظ میں دعوت عظیمہ:

﴿لها ما کسبت﴾ (اس کا فائدہ ہے جو اچھا کیا) بظاہر یہ کتنے مختصر الفاظ ہیں لیکن ان میں نیکی کے کاموں کی کیسے خوب اندازی میں عظیم دعوت دی گئی، اور اسی طرح مختصر الفاظ "وعلیها ما اکتسبت" (اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی) سے، کس خوبصورت انداز میں برے کاموں سے روکا، آیئے تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیے۔

"فان اختصاص منفعه الفعل بفاعله من اقوی الد واعی الی تحصیله و اقتصار مضرته علیه من اشد الزواجر عن مباشرته ای لها ثواب ما کسبت من الخیر الذیکلف فعله لا لغیرها استقلا او اشتر کا ضرورة شمول کلمة ما لکل جزء من اجزاء مکسوبها"

کیونکہ جب یہ پتہ چل جائے کہ اس فعل کا نفع اس پر عمل کرنے والے کو ہی حاصل ہونا ہے، تو یقیناً ہر شخص بڑھ چڑھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا، اس انداز پر نیکی کے کاموں کی طرف دعوت دینا دعوت عظیمہ ہے۔

اسی طرح جب یہ بیان کر دیا جائے کہ اگر تم نے شر (برے) کام کیے تو اس کا عذاب تمہیں حاصل ہونا ہے، وہ عذاب کسی اور کو نہیں دیا جائے گا تو اس میں زجر وتوبیخ (ڈانٹ، ڈپٹ، دھمکی) بھی بہت سخت دی گئی ہے۔ مطلب واضح ہوا

کہ نیکی کے ہر کام کا ثواب اس پر عمل کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے، اور برائی پر عمل کرنے والے کو اس کے ہر کام پر عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ عدل کی بات ہے اگر وہ اپنے فضل وکرم سے بغیر عذاب دینے کے معاف فرمادے تو اس کی مرضی کی بات ہے اس کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں، لیکن اس کے قہر سے بے خوف بھی کوئی نہ رہے، لفظ "مـــا" سے پتہ چل گیا کہ ہر نیکی کے کام ثواب یا ہر برائی کے کام کا عذاب اس پر عمل کرنے والے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

واہ عظمت قرآن تجھ پر جان قربان:

قرآن پاک کا ایک ایک حرف کیسے عظیم معانی پر دلالت کر رہا ہے۔ ابھی تفسیر ابی السعود کے حوالہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ لفظ "ما" سے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ہر عمل خیر وشر کی جزاء اس عمل کے مطابق دی جاتی ہے، یعنی یہ عموم لفظ "ما" سے سمجھ آیا اب دیکھئے "لام" اور "علی" سے کیا مسئلہ ثابت کیا گیا ہے۔

"وجاء ت العبارة فی الحسنات ب(لها)من حیث هی مما یفرح المرء بکسبه ویسر بها فتضاف الی ملکه وجاء ت فی السیآت ب(علیها)من حیث هی الثقال واوزار ومتحملات صعبة وهذا کما تقول"لی مال وعلی دین"

جب نیکیوں کا ذکر فرمایا تو ان کی جزا کیلئے لفظ "لام" لایا، ارشاد فرمایا ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ اس لئے کہ "لام" انتفاع اور ملکیت کیلئے آتا ہے، جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ فلاں چیز کی مجھے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے، یقیناً اسے نیک کام کرنے میں فرحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔

اور برے کاموں کی جزاء (بدلہ) کیلئے لفظ "عـــلـــی" ذکر کیا جو ضرر کیلئے آتا ہے، اس کا استعمال بوجھ اٹھانے، کسی چیز کے لزوم کیلئے ہوتا ہے، جیسا کہا جائے "لی مال وعلی دین" میری ملکیت میں میرے نفع کیلئے مال ہے، مجھ پر قرض لازم ہے، یعنی جب تک میں قرض ادا نہیں کروں گا اس کا بوجھ مجھ پر رہے گا، اگر میں قرض ادا کرنے کے بغیر ہی مر گیا تو اس کا وبال مجھ پر رہے گا، اس کا نقصان مجھے ہی ہوگا۔ (از قرطبی)

آیئے قرطبی کی وضاحت کے بعد ایک مرتبہ پھر اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ دیکھیں (گزشتہ ورق میں) تو خوبصورت اور تحقیق وتدقیق پر مبنی اور تفاسیر کے مطابق نظر آئے گا۔ ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا﴾ کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "والخواطر ونحوها لیست من کسب الانسان" انسان کے ذہن وضمیر میں آنے والے خیالات اور وسوسات پر گرفت (پکڑ) نہیں ہوگی، اسلئے کہ جن برے اعمال پر گرفت ہونے ہے، ان کو رب تعالیٰ نے "اکتسبـــت" سے بیان فرمایا، چونکہ دل میں آنے والے خیالات وسوسات کسب نہیں لھذا ان کی

گرفت بھی نہیں ہوگی۔ (از قرطبی)

کسب واکتساب میں فرق:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ کے ضمن میں کسب ذکر ہے، اور "وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" کے ضمن میں "اکتساب" ذکر ہے۔ کبھی کبھی کسب اور اکتساب ایک معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں، جیسا کہ ذوالرمۃ کے شعر میں ایک ہی معنی میں استعمال ہیں۔ "الفی اباه بذاک الکسب یکتسب" اس کا باپ یہی کسب کرتے ہوئے پایا گیا۔

اور قرآن پاک میں بھی ایک معنی میں استعمال ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا، ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ اور ارشاد گرامی، ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا﴾ اور ارشاد گرامی، ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ﴾ اور ارشاد گرامی ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا﴾ رب تعالیٰ کے ان تمام ارشادات میں کسب اور اکتساب کا استعمال ایک ہی معنی میں کیا گیا ہے کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ اور کبھی ان میں فرق بھی کیا جاتا ہے، وہ فرق **دو وجہ** سے کیا جاتا ہے۔

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ "اکتساب" خاص ہے، اور کسب عام ہے۔ یعنی ہر اکتساب پر کسب ضرور سچا آئے گا اور ہر کسب پر اکتساب کا سچا آنا ضروری نہیں۔ کسب عام ہے کیونکہ "لان الکسب ینقسم الی کسبه لنفسه ولغیره" جو کام انسان اپنے لئے کرے وہ بھی کسب ہے اور جو کام غیر کیلئے کرے وہ بھی کسب ہے۔ اکتساب خاص ہے کیونکہ "والاکتساب لایکون الامایکتسب الانسان لنفسه خاصة" جو کام اپنے لئے کیا جائے صرف اسی کو اکتساب کہا جاتا ہے، غیر کیلئے جو کام کیا جائے وہ اکتساب نہیں، اسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے "فلان کا سب لاهله" فلاں شخص اپنی اہل کیلئے مکتسب ہے، کیونکہ صرف اپنی ذات کیلئے کام کرنے والا مکتسب ہے، دوسروں کیلئے کام کرنے والا مکتسب نہیں۔

(۲) دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ صاحب کشاف نے کہا ہے:

"انما خص الخیر بالکسب والشر بالاکتساب لان الاکتساب اعتمال فلما کان الشر مما تشتهیه النفس وهی منجذبة الیه وأمارة به کانت فی تحصیله اعمل واجد فجعلت لهذاالمعنی مکتسبة فیه ولمالم یکن کذلک فی باب الخیر وصفت بما لادلالة فیه علی الاعتمال" (والله اعلم)

خیر کیلئے کسب ذکر کیا گیا ہے اور شر کیلئے اکتساب، کیونکہ اکتساب کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے کوئی کام کوشش سے کیا

جائے، جب شر کام کرنے کی نفس میں خواہش پائی جاتی ہے، نفس اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے تو یہ علامت ہے کہ اس کام کو حاصل کرنے کیلئے نفس زیادہ سے زیادہ عمل کر رہا ہے اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے لیکن خیر میں یہ کیفیت نہیں، اسی لئے خیر کا کام عمل تو ہے، لیکن کوشش سے کیا ہوا اعتمال نہیں، لھذا اس کیلئے کسب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (ماخوذ از کبیر، کشاف)

وقوله تعالی "لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت" فقد قيل خص الكسب ههنا بالصالح والاكتساب بالسيئ وقيل عني بالكسب مايفعله الانسان من فعل خير وجلب نفع الى غيره من حيث يجوز وبالاكتساب مايحصله لنفسه من نفع يجوز تناوله" (مفردات راغب)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں کسب کا تعلق نیک کاموں سے ہے اور اکتساب کا تعلق برے کاموں سے ہے۔ کبھی کبھی یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ نیک کام کرنا کہ اپنے لئے بھی فائدہ اور دوسروں کو بھی جائز طریقے سے نفع پہنچا دیا جائے یہ کسب ہے، لیکن اپنے نفع کیلئے جو کام کیا جائے وہ اکتساب ہے۔ اپنے نفع کیلئے کیا جانے والا کام کبھی بندے کی نظر میں بھی مفید ہوتا ہے اور شریعت میں بھی جائز ہوتا ہے، اور کبھی بندہ سمجھتا ہے کہ یہ کام میرے لئے نفع مند ہے لیکن وہ شریعت میں ناجائز ہوتا ہے، یہاں آیۃ کریمہ میں اکتساب کا یہی معنی لیا گیا ہے، اسی لئے بیان کیا گیا ہے کہ اکتساب کا تعلق شر سے ہے۔

معتزلہ کا استدلال: معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اس لئے کہ نیک اور بد کام کی نسبت اس آیۃ کریمہ میں انسانوں کے نفس کی طرف ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو خالق مانا جائے تو اس نسبت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، دوسری خرابی کی وجہ یہ ہوگی کہ بندے کا بے اختیار ہونا لازم آئے گا کہ وہ اپنے اعمال میں بھی ایسے ہی بے اختیار ہو جائے جیسے اپنے رنگ اور شکل اور طوالت وغیرہ میں اسے کوئی اختیار نہیں۔

اھل سنت وجماعت کا قول:

اہل سنت و جماعت نے کہا کہ معتزلہ کا یہ قول ہی غلط ہے۔ ان کی غلطی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ خلق اور کسب میں فرق نہیں کر سکے، اس آیۃ کریمہ میں نیک یا برے اعمال کی نسبت میں "کسب و اکتساب" کا ذکر ہے، اور کسب میں یقیناً انسان خود مختار ہوتا ہے وہ پتھر کی طرح مجبور محض بھی نہیں اور وہ خالق بھی نہیں، تمام اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے بندے کو کسب کرنے کا اختیار دیا ہے اور اسے باطل راہ اور حق راہ پر بھی مطلع کر دیا گیا ہے، اس لئے بندہ خیر و شر کو جانتے ہوئے کسی ایک پر عمل کر رہا ہے اور عمل بھی اپنے اختیار سے کر رہا جو اسے رب تعالیٰ نے عطا کر رکھا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ایک عمل دوسرے عمل کو ضائع نہیں کرتا:

اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نیکی کا کام کرے تو اس کا ثواب پائے گا، نیکی کے کام کے بعد اگر برائی کا کام کرے تو وہ عذاب کا مستحق ٹھہرے گا، برا کام نیک کام کو ضائع نہیں کرتا۔ اہل سنت و جماعت کی دلیل یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دونوں امر جمع کئے ہیں، اور بیان فرمادیا ہے کہ اچھے کاموں میں اسے ثواب دیا جائے گا اور برے کاموں میں وہ مستحق عذاب ہوگا۔

"وھذا صریح فی ان ھذین الاستحقاق یجتمعان و انہ لایلزم من طریان احدھما زوال الآخر"

اسی سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ انسان جو عمل بھی کرے اس کے بدلے کا وہ مستحق ہوتا ہے، لہذا اچھے اور برے اعمال جب انسان میں جمع ہوسکتے ہیں تو اس کا مستحق ثواب ہونا اور مستحق عذاب ہونا بھی جمع ہوسکتا ہے، کسی ایک کام کو دوسرا کام باطل نہیں کرسکے گا۔

اس بحث سے جبائی معتزلی کا قول باطل ہوگیا کہ وہ اس کا قائل ہے کہ نیک اعمال کا ثواب تو حاصل ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے بعد برے اعمال نہ پائے جائیں، کیونکہ برے اعمال سے نیک اعمال باطل ہوجاتے ہیں جبائی کا یہ قول مردود ہے، اس کے رد پر واضح طور پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی موجود ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ لَایُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کسی کے اچھے عمل کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ اور جبائی کا قول رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی مردود ہوجاتا ہے ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ○ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ○﴾ کیونکہ جب ذرہ بھر نیکی کا اجر بھی حاصل ہوتا ہے اور ذرہ بھر برائی کا بدلے کا استحقاق بھی سامنے آتا ہے تو یہ کہنا خود بخود باطل ہے کہ برے اعمال سے نیک اعمال برباد ہوجاتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

"وقیل فی معنی الآیۃ ان اللہ تعالیٰ لایؤاخذ احدا بذنب غیرہ"

بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں جب نفس کی تخصیص ہے، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (خازن)

کثیر متکلمین نے اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے **"ان اللہ تعالیٰ لایعذب الاطفال بذنوب آبائھم"** بیشک اللہ تعالیٰ بچوں کو ان کے آباء کے گناہوں کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں فرمائے گا، کیونکہ کسی نفس کو دوسرے نفس کی وجہ سے گرفت کرنے کا ذکر نہیں فرمایا گیا بلکہ ہر نفس کے اعمال کے مطابق اس کے ثواب و عذاب کا ذکر کیا گیا

ہے کہ ہر نفس نیک اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر عذاب دیا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

❁ وقال ابن عباس فکانت الوسوسة مما لا طاقة للمسلمین بها وصار الامر الی ان قضی الله ان للنفس ما کسبت وعلیها ما اکتسبت من القول والعمل"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب مسلمانوں کو وسوسہ سے بچنے کی طاقت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وسوسہ پر مؤاخذہ نہ کرنے کا فیصلہ فرمادیا اور یہ آیۃ کریمہ نازل کر کے واضح کردیا کہ ہر نفس کو اس کے قول اور عمل پر ثواب یا عذاب دیا جائے گا، کسی کو وسوسہ پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (درمنثور)

وسوسہ کے متعلق شاندار قول:

حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، انسان کے دل میں دو طرح کے خیالات آتے ہیں ایک بطور وسوسہ کے ان سے دل کا خالی کرنا انسان کی مقدرت میں نہیں لیکن وہ ان کو برا جانتا ہے اور عمل میں لانے کا ارادہ نہیں کرتا ان کو حدیث نفس اور وسوسہ کہتے ہیں اس پر مؤاخذہ نہیں بخاری و مسلم کی حدیث:

"عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال ان الله تجاوز لی عن امتی ما حدثت به انفسها مالم تتکلم او تعمل به" اخرجه ابو سفیان وعبد بن حمید والبخاری ومسلم وابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة وابن المنذر" (در منثور)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دلوں میں جو وسوسے گذرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے تجاوز فرماتا ہے جب تک کہ وہ انہیں عمل میں نہ لائیں یا ان کے ساتھ کلام نہ کریں یہ وسوسہ اس آیۃ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ "اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو اس کا تم سے اللہ حساب لے گا" میں داخل نہیں۔

دوسرے وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور ان کو عمل میں لانے کا قصد و ارادہ کرتا ہے اور ان پر مؤاخذہ ہوگا اور انہیں کا بیان اس (مذکورہ بالا) آیۃ میں ہے۔ (خزائن العرفان)

مسئلہ: کفر کا عزم کرنا کفر ہے اور گناہ کا عزم کر کے اگر آدمی اس پر ثابت رہے اور اس کا قصد و ارادہ رکھے لیکن اس گناہ کو عمل میں لانے کے اسباب اس کو بہم نہ پہنچیں اور مجبوراً وہ اس کو کر نہ سکے تو جمہور کے نزدیک اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا شیخ ابو منصور ماتریدی اور شمس الائمہ حلوائی اسی طرف گئے ہیں، ان کی دلیل آیۃ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ اور حدیث عائشہ ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ بندہ جس گناہ کا قصد کرتا ہے اگر وہ عمل

میں نہ آئے جب بھی اس پر عقاب کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر بندے نے کسی گناہ کا ارادہ کیا، (یعنی مصمم ارادہ کیا) پھر اس پر نادم ہوا اور استغفار کیا تو اللہ اس کو معاف فرمادے گا۔ (خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ سے واضح ہو گیا کہ احکام کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے غیر سے نہیں، کسی ایک کا دوسرے پر تصرف جائز نہیں، اور کسی کے گناہوں میں مبتلاء ہونے سے دوسرے کا مؤاخذہ نہیں، اس پر ایک حدیث پاک شاہد ہے:

"**قال النبی ﷺ لابی رمشة حین رآہ مع ابنہ فقال ھذاابنک قال نعم قال انک لیجنبی علیه ویجنبی علیک**"

نبی کریم ﷺ نے ابی رمشہ کو دیکھا، ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا، تو آپ نے فرمایا کیا یہ تمہارا بیٹا ہے تو انہوں نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا بیشک تمہاری جنایۃ اس پر نہیں اور اس کی جنایۃ تم پر نہیں۔

"**وقال ﷺ لایؤاخذ احد بجریرۃ ابیه ولا بجریرۃ اخیه**"

کسی شخص کا مؤاخذہ اس کے باپ اور اس کے بھائی کے گناہوں میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگا۔

طلباء کرام توجہ فرمائیں کہ "جریرۃ" کا معنی کھینچا ہوا، یعنی گناہوں کی طرف کھینچا ہوا۔ جس کا آسان ترجمہ راقم نے کیا ہے "گناہوں میں مبتلاء" (از احکام القرآن للجصاص)

عزم پر مؤاخذہ: "**واخرج ابن جریر من طریق الضحاک عن ابن عباس فی الآیة قال ان اللہ یقول یوم القیامة ان کتابی لم یکتبوا من اعمالکم الاماظھر منھا فاما اسررتم فی انفسکم فانا احاسبکم به الیوم فاغفر لمن شئت واعذب من شئت**"

حضرت ابن عباس ﷺ نے اس آیۃ کریمہ کے متعلق ایک روایت بیان کی کہ بیشک اللہ تعالی قیامت کے دن فرمائے گا کہ میرے لکھنے والوں (کراما کاتبین) نے تو تمہارے ظاہر اعمال کو ہی لکھا ہے، لیکن جو تمہارے نفسوں میں پوشیدہ عزم پایا گیا تھا، اس کا آج میں خود تم سے حساب لیتا ہوں، جسے میں نے بخشنا چاہا اس کی میں مغفرت کردوں گا، جسے میں نے عذاب دینا چاہا اسے عذاب دوں گا۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾

"اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہمیں اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے۔"

اس سورۃ پاک میں بہت مسائل اور علوم عظیمہ کو ذکر فرمایا اور اسے مومنین کی دعاء کے ذکر سے ختم فرمایا

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الدعاء مخ العبادة" دعاء عبادت کا مغز ہے، تو گویا کہ احکام پر عمل کرنے کے بعد دعاء کا ذکر کیا گیا، جبکہ دعاء عبادت کا نچوڑ اور مغز ہے اور عبادات کا اختتام دعاء سے کرنا ہی افضل ہے۔

"وان الداعي يشاهد نفسه في مقام الفقر والحاجة والذلة والمسكنة ويشاهد جلال الله تعالى وكرمه وعزته وعظمته بنعت الاستغناء والتعالي وهو المقصود من جميع العبادات والطاعات"

بیشک دعاء کرنے والا اپنے آپ کو فقیر محتاج سمجھتا ہے، اور رب تعالیٰ کے حضور گویا کہ یوں عرض کر رہا ہوتا ہے اے اللہ تعالیٰ میں تیرے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و مسکین سمجھتا ہوں، اور اے اللہ میں تیرے کرم، تیری عزت و عظمت اور تیرے جاہ و جلال کا مشاہدہ کر رہا ہوں، اے رب کائنات تو مستغنی (بے پرواہ) ہے، اور تیری شان بلند و بالا ہے، بس محتاج میں ہی ہوں تیرے کرم کا منتظر ہوں۔

تمام عبادات و طاعات میں مقصود ہی یہ ہے کہ انسان اپنے عجز کا اظہار کرے، یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ پاک کے احکام کو دعاء سے ختم کیا گیا۔ یہاں چار دعاؤں کا ذکر کیا گیا، تین دعاؤں کو "رَبَّنَا" سے شروع کیا گیا، البتہ ایک دعاء ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا﴾ کو "رَبَّنَا" سے نہیں شروع کیا گیا، اس کی وجہ انشاء اللہ آگے آئے گی۔

"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اَیْ لَا تُعَاقِبْنَا" اے ہمارے رب ہماری بھول اور خطاؤں پر سزا دینے کیلئے تعاقب نہ فرما، یعنی گرفت نہ فرمانے کی دعاء کا مطلب تعاقب نہ فرمانا ہے۔ (از کبیر)

سوال: مؤاخذہ باب مفاعلہ ہے جو شرکت جانبین کو چاہتا ہے، لیکن یہاں دعاء میں بندے کی طرف سے پکڑ کیسے صحیح ہے؟

جواب: کبھی باب مفاعلہ میں شرکت جانبین کا معنیٰ نہیں لیا جاتا، اس مقام میں بھی صرف رب تعالیٰ کے نہ پکڑنے کی دعاء، بندے کے پکڑنے کا ذکر نہیں۔ دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں شرکت جانبین پائی گئی ہو۔

"وهو ان الله تعالى يا خذ المذنب لعقوبة فالمذنب كأنه يأخذ ربه بالمطالبة بالعفو والكرم"

اللہ تعالیٰ کی پکڑ یہ ہے کہ وہ بندے کو گناہوں پر سزا دیتا ہے، اور گنہگار کی پکڑ یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے معاف کرنے اور کرم کرنے کا مطالبہ کر کے اپنے رب کی رحمت کا دامن پکڑے رہتا ہے۔

یہ جواب اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے دیا ہے جو یقیناً مقتدر ہستی ہے، **لیکن** راقم کے ناقص ذہن نے اسے قبول نہیں کیا، اسلئے کہ دعاء میں نہی پائی گئی، دعاء میں ثبوت نہیں، اگر دونوں جانبوں سے پکڑ نہ کرنے کا ذکر ہوتو مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ تعالیٰ تو میری بھول اور خطاؤں پر پکڑ نہ فرما، اور میں تجھ سے عفو و کرم کا مطالبہ نہ کر کے تیری رحمت کا دامن نہیں پکڑوں

گا۔ناقص ذہن نے اس لئے اسے نہیں قبول کیا کہ بندے کا رب کے حضور یہ ذکر کرنا تو ٹھیک ہے کہ اے میرے رب تو میری پکڑ نہ فرما لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ میں تجھے نہیں پکڑوں گا بلکہ عفو و کرم کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ بندہ ہمیشہ رب تعالیٰ کے دامن رحمت کو پکڑے رہے، کبھی نہ چھوڑے، ہر وقت عفو و کرم کا سوال کرتا ہی رہے، علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اس پر یہ الفاظ تحریر فرمائے "ولا یخفی فساد هذا الابتکلف" بغیر تکلف کے اس قول کا فساد مخفی نہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

فائدہ جلیلہ: یہاں جن دعاؤں کا ذکر ہے، ان میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ مؤمنین کی دعاؤں کی حکایت اور خبر ہو کہ مؤمنین اس طرح دعاء کرتے ہیں۔ لیکن دوسرا احتمال جو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے وہ خوب ترین ہے۔

سبحان اللہ !اہل علم نے کیا خوب تحقیق کی ہے، کیا خوب علم کے گہرے سمندروں میں غوطہ لگا کر تحقیق کے موتی نکالے ہیں۔

"والمروی عن الحسن ان ذلک علی تقدیر الامر ای قولوا فی دعائکم ذلک فهو تعلیم منه تعالی لعباده کیفیة الدعاء والطلب منه وهذا من غایة الکرم ونهایة الاحسان یعلمهم الطلب لیعطیهم ویرشدهم للسئوال لیثیبهم"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعاء میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم اس طرح دعاء کرو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعاء کرنے کا طریقہ بتایا اور تعلیم دی کہ تم اس طرح دعاء کرو، رب تعالیٰ سے یوں مطالبہ کرو، یہ رب تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے اور بہت بڑا احسان ہے کہ ان کو طلب کا طریقہ سکھاتا ہے کہ تم مجھ سے اس طرح مانگنا پھر میں تمہیں اپنی عطاء سے نوازوں گا، وہ خود ہی سوال کرنے کے انداز کی راہنمائی فرماتا ہے کہ تم مجھ سے اس طرح سوال کرنا تو میں تمہیں ثواب عطاء کروں گا۔

کیا خوب کہا گیا "لولم ترد نیل ما ارجو واطلبه من فیض جودک ماعلمتنی الطلبا"

اگر تو دینے کا ارادہ نہ کرتا جس کی میں امید کرتا ہوں اور طلب کرتا ہوں، تیرے جود کے فیضان سے، تو تو مجھے طلب کا طریقہ ہی نہ سکھاتا۔ (روح المعانی)

اعتراض: جب رب تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی نفس کو سوائے اس کی طاقت کے۔اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه" میری امت سے خطاء اور بھول اور جبراً کرائے گئے کام کو اٹھالیا گیا۔ فاذا کان النسیان فی محل العفو قطعا فما معنی طلب العفو عنه" جب اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے

قطعی (یقینی) طور پر ثابت ہوگیا کہ نسیان (بھولنے) پر مؤاخذہ نہیں ہوگا تو یہاں بھولنے سے معافی طلب کرنا اور گرفت نہ کرنے کے مطالبہ کا کیا مقصد ہے؟

جواب اول: نسیان کی دو قسمیں ہیں ایک پر پکڑ نہیں اور دوسری قسم پر پکڑ ہے، یہاں دعاء میں دوسری قسم ہے جس میں پکڑ ہوتی ہے، اس میں پکڑ نہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ جس بھول پر پکڑ نہیں وہ یہ ہے کہ انسان کا اس سے بچنا ممکن نہ ہو، جس میں بندے کی کوتاہی کو دخل نہ ہو بلکہ قدرتی طور پر اس میں بھول واقع ہو، جیسا کہ کپڑے پر نجاست دیکھی ہی نہیں تو نماز ادا کرلی، تو اس میں وہ شخص گنہگار نہیں ہوا، البتہ نماز کو دوبارہ لوٹانا پڑے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ انسان کی کوتاہی کا اس میں دخل ہو، جس کی وجہ سے بھولنے کے اسباب پائے جائیں اس میں گرفت ہوتی ہے، جیسا کہ ایک شخص نے قرآن پاک یاد کرنا چھوڑ دیا اور یاد رکھنے کے اسباب سے اعراض کرلیا تو قرآن پاک بھول گیا "فانه لایکون معذورا و معفوا عنه" تو اس صورت میں اسے معذور نہیں سمجھا جائے گا۔ اور نہ ہی یہ قابل معافی بھول ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے کپڑے پر نجاست کو دیکھا لیکن اس کو دور کرنے میں تاخیر کردی، کپڑے کو دھویا نہیں اور بعد میں بھول گیا اسی طرح نماز ادا کرلی یعنی نجاست کپڑوں پر رہی تھی **"فانه یعد مقصرا بترک المبادرة الی ازالتها"** تو اس شخص کی اس کوتاہی پر گرفت ہوگی کہ اس نے جلدی نجاست کو زائل کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ بھول معاف نہیں ہوگی، البتہ اتنی بات واضح ہے کہ کپڑے پر اتنی مقدار میں نجاست لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے نماز ادا نہیں کرسکتا تھا اور نجاست کو دھونے کیلئے پانی موجود تھا یا دوسرا پاک کپڑا موجود تھا، پھر اس ناپاک کپڑے میں جان بوجھ کر نماز ادا کی تو حرام کام کا مرتکب ہوا ہے، لیکن نجاست کو دیکھ کر زائل نہیں کیا تھا پھر بھول کر نماز ادا کی تو یہ حرام نہیں، البتہ جان بوجھ کر نجاست کو جو زائل نہیں کیا تھا اور بعد میں بھول گیا، اس کوتاہی پر سرزنش کا مستحق ہوگیا۔

اسی طرح **"ومن ترک الدراسة والتکرار حتی نسی القرآن یکون مقصرا وملوما"** جس شخص نے قرآن پاک کا تکرار (دور کرنا) چھوڑ دیا اور قرآن پاک پڑھنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بھول گیا تو وہ کوتاہی کرنے والا بن گیا اور ملامت کا مستحق ہوگیا۔ دعاء میں اسی نسیان کو معاف کرنے کی رب تعالیٰ سے درخواست پیش کی جارہی ہے۔ (شیخ زادہ)

اسی جواب کو علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے پیش کیا (جن کی وضاحت شیخ زادہ سے پیش کی گئی)

﴿ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا﴾ای لاتؤاخذنا بما ادی بنا الی نسیان او خطاء من تفریط وقلة مبالاة"

اے ہمارے رب! ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے۔اس دعاء میں جس بھول اور خطاء کا ذکر ہے،اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں کوتاہی اور بے پرواہی پر مؤاخذہ نہ فرما جو ہماری بھول اور خطاء کا سبب بنتے ہیں۔ (بیضاوی)

جواب دوم: کہ انسان رب تعالیٰ سے بھول اور خطاء کے معاف کرنے اور مؤاخذہ نہ کرنے کی جو درخواست کر رہا ہے اس سے مراد مطلقاً نسیان اور خطاء ہیں کیونکہ عقلاً ان پر پکڑ منع نہیں جس طرح بادسموم (گرم زہریلی ہوا) انسان کو ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے ایسے ہی گناہ عذاب تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں اگر چہ وہ گناہ خطاء سے ہی کیوں نہ سرزد ہوں ان میں ارادہ نہ ہی پایا گیا ہو۔یعنی مطلقاً بھول اور خطاء پر اگر چہ مؤاخذہ منع نہیں۔

"لکنه تعالی وعدالتجاوز عنه رحمة وفضلا فیجوز ان یدعو الانسان به استدامة واعتدادا بالنعمة فیه،ویؤید ذلک مفهوم قوله ﷺ رفع عن امتی الخطاء والنسیان"

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے اس سے درگزر کرنے اور معاف کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے،لھذا انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہی رہے کہ اس پر یہ نعمت ہمیشہ قائم رہے اور خاص کر کے جب بار بار دعاء کرے گا تو بار بار اسے رب تعالیٰ کی نعمت یاد ہوگی،رب تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہنا اور ان کا شکر بجالاتے رہنا نعمتوں کی زیادتی کا سبب ہے،جس پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی شاہد ہے ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ اگر تم شکر کرو گے تو میں اور نعمتیں زیادہ عطاء کروں گا۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب میں نے جو ذکر کیا ہے،اسے نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی تائید حاصل ہے کیونکہ آپ نے فرمایا "رفع عن امتی الخطاء والنسیان" میری امت سے خطاء اور بھول کو اٹھالیا گیا ہے،یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کو معاف کرنے اور ان سے تجاوز کرنے کا اعلان فرمادیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میری امت کو خطاء ونسیان (بھول) پر عذب دینا عقلاً محال ہے۔بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ "میری امت سے بھول اور خطاء" کو اٹھالیا گیا ہے،جس کا مطلب واضح ہے کہ عذاب کو اٹھا لینے میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور میری امت پر رب ذوالجلال کی خاص مہربانی اور خاص رحمت ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ،کبیر)

جواب سوم: یہ دعاء تقدیر کے طور پر ہے،کیونکہ دعاء کرنے والے مؤمنین ومتقین ہیں "وکانو امتقین لله حق تقاته" اور متقین بھی وہ تھے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔اسی سے یہ سمجھ آرہا ہے:

"فما کان یصدعنهم مالا ینبغی الاعلی وجه النسیان والخطاء"

کہ وہ گویا کہ دعاء یوں کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہم تجھ سے ڈرتے ہیں جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر کامل عمل کیا جائے پھر بھی اگر ہم سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جو تجھے ناپسند ہو تو وہ بھول اور خطاء کی وجہ سے ہوگا، اسے معاف کر دینا، گویا کہ وہ یوں کہہ رہے ہوتے ہیں۔

"ان کان النسیان مما تجوز المؤاخذة به فلاتؤاخذنا به"

اگر چہ بھول پر بالتقدیر (بالفرض) مؤاخذہ ہونا ہو تو اے رب کائنات ہم تیرے حضور عرض کرتے ہیں کہ تو اسے بھی معاف فرمادے اور اس پر گرفت نہ فرما۔ (از کبیر)

جواب چھارم: "ان المقصود من الدعاء اظهار التضرع الی الله تعالی لاطلب الفعل"

بیشک مقصد دعاء سے اللہ تعالی کی طرف عجز کا اظہار ہے، یعنی مقصود خشوع اور خضوع ہے، مقصود طلب فعل نہیں وہ تو اللہ تعالی نے وعدہ فرما ہی دیا ہے کہ وہ دلوں کے وسوسوں پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ جب اصل مقصد دعاء میں بندے کا اظہار عجز ہے اور اللہ تعالی کے استغناء کو ذکر کرنا مقصود ہے اور ساتھ ساتھ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اے اللہ بیشک تو مستغنی ہے لیکن اپنے بندوں کی عاجزی کی وجہ سے دعاء کو تو شرف قبولیت عطاء فرماتا ہے، بیشک تو نے مہربانی فرماتے ہوئے ہماری بھول اور خطاء سے درگذر نے کا اعلان فرمادیا ہے، لیکن ہم اپنے اظہار عجز کیلئے تجھ سے دعاء کرتے رہیں گے۔

"ولذلک فان الداعی کثیرا مایدعو بمایقطع بان الله تعالی یفعله سواء دعااولم یدع"

یہی وجہ ہے کہ دعاء کرنے والے بہت سی وہ دعائیں کرتے ہیں جن کا عطاء کرنا یقینی ہوتا ہے کیونکہ رب تعالی کا ان چیزوں کے عطاء کرنے کا وعدہ ہے، وہ دعاء کریں یا نہ کریں ان چیزوں نے واقع ہونا ہی ہوتا ہے۔ (از کبیر)

"رَبَّنَا" منادی ہے "حرف ندا" محذوف ہے، معنوی لحاظ پر اصل میں "یَارَبَّنَا" ہے، جس کا معنی ہے "اے ہمارے رب" (ماخوذ از صاوی)

بھولنے اور خطاء کے لحاظ پر احکام کی تین قسمیں:

ایک قسم تو وہی ہے جس کا ذکر پہلے جواب میں کیا جا چکا ہے، پھر اس کی تفصیلی طور پر دو قسموں کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ **دوسری قسم** یہ ہے کہ بھول اور خطاء سے بھی احکام پر عمل کرنا لازم رہتا ہے، جیسا کہ کسی کی غرامۃ (چٹی) ادا کرنی ہو، یا دیت ادا کرنی ہو، یا کوئی قرض ادا کرنا ہو جیسا کہ نماز ادا کرنی ہو تو بھول کر یا خطاء سے نہ ادا کر سکے تو پھر بھی یہ چیزیں لازم رہیں گی معاف نہیں ہوں گی۔

تیسری قسم یہ ہے کہ بھول کر مثال کے طور پر کلمہ کفر زبان پر جاری ہو گیا لیکن ارادہ نہیں تھا تو وہ شخص کافر نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از قرطبی)

سہو ونسیان میں فرق:

معلوم چیز سے غفلت درپیش آنا جس کی وجہ سے اس کا علم جاتا رہے لیکن معمولی تنبیہ سے وہ چیز یاد آ جائے اسے "سہو" کہا جاتا ہے۔اور اگر ایک چیز مکمل طور پر ذہن سے زائل ہو جائے ،لیکن کافی وضاحت سے یاد دلایا جائے تو یاد آ جائے معمولی تنبیہ سے وہ یاد نہ آئے تو اسے "نسیان" کہا جاتا ہے۔اگر ذہن سے کوئی چیز اس طرح نکل جائے کہ یاد دلانے سے بھی یاد نہ آئے تو اسے "ذھول" کہا جاتا ہے۔حکماء نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی چیز کی صورت قوت مدرکہ سے نکل جائے ،لیکن حافظہ میں موجود رہے تو اسے ''سہو'' کہا جاتا ہے۔اگر کسی چیز کی صورت ذہن سے اس طرح نکل جائے کہ نہ وہ قوت مدرکہ میں باقی رہے،اور نہ ہی وہ حافظہ میں باقی رہے تو اسے ''نسیان'' کہا جاتا ہے۔

فقہاء کرام احکام کے لحاظ پر کبھی ''سہو،نسیان،شک'' کو ایک معنی میں استعمال کرتے ہیں۔راجح جانب کو ظن کہا جاتا ہے اور مرجوح جانب کو وہم کہا جاتا ہے۔ (جمع الجوامع ،طحطاوی،شامی)

خطاء سے مراد کیا ہے: خطاء اس مقام پر صواب کی ضد ہے،یعنی بے احتیاطی کی وجہ سے غلطی ہو جائے اسے خطاء کہتے ہیں،جیسا کہ روزہ دار نے وضوء کرتے ہوئے بے احتیاطی سے کام لیا کہ کلی کرتے ہوئے پانی حلق میں نیچے چلا گیا تو اسے خطاء کہا جاتا ہے،اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا،روزہ کی قضاء لازم آئے گی لیکن کفارہ لازم نہیں آئے گا۔دعاء میں اسی خطاء کا ذکر ہے کہ اے اللہ اگر خطاء سے کوئی کام درست نہ ہو تو، تو اس پر پکڑ نہ فرما،جان بوجھ کر غلطی کرنا بھی اگرچہ کبھی خطاء کہلاتا ہے لیکن آیۃ کریمہ میں وہ خطاء بمعنی گناہ مراد نہیں،بلکہ خطاء کا معنی ''نادرست'' ہے اسی کا مقابل ''صواب'' کا معنی درست ہے۔ (ماخوذ از کبیر بزیادۃ)

چند مسائل ضروریہ:

نماز میں بھول کر کلام کرنے سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ٹوٹ جاتی ہے لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز نہیں ٹوٹتی،وہ اپنے مؤقف پر ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔

"عن ابن سیرین عن ابی ھریرۃ قال صلی بنارسول اللہﷺاحدی صلاتی العشی قال ابن سیرین قد سماھا ابوھریرۃ ولکن نسیت انا قال فصلی بنار کعتین ثم سلم فقام الی خشبۃ معروضۃ فی المسجد فاتکأ علیھا

کانہ غضبان ووضع یدہ الیمنی علی الیسری وشبک بین اصابعه ووضع خدہ الایمن علی ظهر کفه الیسری وخرجت سرعان القوم من ابواب المسجد فقالوا قصرت الصلوة وفی القوم ابوبکر وعمر رضی الله عنهما فهاباہ ان یکلماہ وفی القوم رجل فی یدیه طول یقال له ذوالیدین قال یارسول الله انسیت ام قصرت الصلوة فقال لم انس ولم تقصر فقال أکما یقول ذوالیدین فقالوا نعم فتقدم فصلی ماترک ثم سلم ثم کبر وسجد مثل سجودہ اواطول ثم رفع راسه وکبر ثم کبر وسجد مثل سجودہ اواطول ثم رفع راسه وکبر فربما سالوہ ثم سلم فیقول نبئت ان عمران بن حصین قال ثم سلم"

(بخاری ومسلم، مشکوۃ باب السہو)

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دوپہر ڈھلنے کے بعد دو نمازوں میں سے ایک نماز پڑھائی، ابن سیرین کہتے ہیں ابو ہریرہ ﷺ نے بتایا تھا کہ وہ کون سی نماز تھی لیکن میں بھول گیا، حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا آپ نے ہمیں دو رکعت پڑھائیں، پھر سلام پھیر دیا، پھر آپ کھڑے ہوئے ایک لکڑی کی طرف جو مسجد میں چوڑائی کے بل رکھی ہوئی تھی، آپ نے اس سے تکیہ لگایا گویا کہ آپ غصے کی حالت میں نظر آرہے تھے، اور آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھا، اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا، اور آپ نے اپنے دائیں رخسار کو اپنی بائیں ہتھیلی کی پیٹھ پر رکھا، قوم جلدی سے مسجد کے دروازوں سے نکلنے لگے، اور یہ کہہ رہے تھے نماز چھوٹی ہوگئی، اور اس قوم میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، جو رسول اللہ ﷺ سے کلام کرنے سے ڈر رہے تھے، اور اس قوم میں ایک اور شخص تھے جن کے ہاتھ لمبے تھے، اسی وجہ سے ان کو ذوالیدین کہا جاتا تھا، انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز چھوٹی ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہ میں بھولا اور نہ ہی نماز چھوٹی ہوئی ہے، پھر آپ نے پوچھا کیا ایسا ہی ہے جیسا کہ ذوالیدین کہتے ہیں؟ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا ہاں، نبی کریم ﷺ آگے ہوئے جو نماز رہ گئی تھی وہ پڑھا کر آپ نے سلام پھیرا (یہ سلام سہو کا تھا) پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا جیسا کہ پہلے سجدہ کیا تھا یا اس سے لمبا، پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی، پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا پہلے سجدہ کی طرح یا اس سے بھی لمبا سجدہ کیا، پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی۔ کئی مرتبہ صحابہ کرام نے ابن سیرین سے پوچھا، پھر سلام پھیرا (کے متعلق) ابن سیرین جواب دینے مجھے یہی خبر دی گئی، بیشک عمران بن حصین نے کہا "ثم سلم" پھر سلام پھیرا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ دلیل پکڑی کہ نماز میں بھول کر کلام کرنا جائز ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ذوالیدین اور دوسرے صحابہ کرام سے کلام کرنے کے بعد نماز کو مکمل کیا اور سجدہ سہو کیا، نماز کو نئے سرے سے نہیں ادا کیا، جس سے واضح ہوا کہ نماز میں بھول کر کلام کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ھذاالحدیث منسوخ بقولہ تعالی ﴿قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ﴾ وحدیث زیدبن ارقم"

کہ یہ حدیث اللہ تعالی کے ارشاد" کھڑے ہوئے اللہ کیلئے خشوع سے (خاموش ہوکر) سے منسوخ ہوچکی ہے اور ذوالیدین والی حدیث اس وقت واقع ہوئی جس وقت نماز میں کلام کرنا جائز تھا، جیسا کہ جماعت میں ملنے والا اگر دیر سے پہنچتا تو وہ نمازیوں سے پوچھ لیتا کہ کتنی رکعتیں ہوچکی ہیں، نماز پڑھتے ہوئے اسے بتادیا جاتا، وہ اپنی رکعتیں جورہ گئی تھیں ان کو پہلے مکمل کرتا پھر باقی نماز ادا کرتا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، ناسخ قرآن پاک کی آیۃ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ﴾ بھی ہے اور حضرت زید بن ارقم کی بیان کردہ حدیث بھی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازم میں کلام کرنے سے منع فرمادیا۔

زیادہ تفصیل **نجوم الفرقان** کے پانچویں حصہ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ﴾ کے تحت دیکھیں۔

مسئلہ: **"الحج یفسد بالجماع ناسیا عند الجمھور خلافاللشافعی"**

اگر حج کے احرام کے دوران بلکہ طواف زیارۃ سے پہلے بھول کر جماع کرلیا تو بالاتفاق اس کا حج فاسد ہوجائے گا، صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا اس میں اتفاق ہے۔

مسئلہ: **"طلاق المکرہ والمخطئی یقع عندنا خلافاللشافعی"** کسی شخص سے جبری طور پر طلاق لے لی جائے تو اس کی طلاق واقع ہوجائے گی اور کسی سے خطاء کے طور پر طلاق کے الفاظ صراحۃً سرزد ہوں تو طلاق واقع ہوجائے گی اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے۔

صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا اختلاف ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے اختلاف کی وجہ یہ حدیث ہے **"رفع عن امتی الخطاء والنسیان"** (میری امت سے بھول اور خطاء کو اٹھالیا گیا ہے) امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ خطاء اور نسیان کے ہوتے ہوئے وہ فعل صحیح ہوجائے گا، کیونکہ خطاء اور نسیان کو اٹھالینے کا یہ مقصد ہے کہ ان کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ میری امت سے بھول اور خطاء کے گناہ کو اٹھالیا گیا ہے، خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ (پکڑ) نہیں۔ حدیث پاک کا یہ مطلب نہیں کہ بھول اور خطاء کا حکم ہی اٹھالیا گیا ہے۔

مسئلہ: خطاء سے روزہ کے حال میں کچھ کھالیا اور پی لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اگرچہ وہ شخص گنہگار نہیں ہوگا، لیکن

روزہ کی قضاء لازم ہوگی، البتہ کفارہ لازم نہیں ہوگا، جیسا کہ ایک مثال بیان ہوچکی ہے کہ روزہ کی حالت میں کلی کرتے ہوئے لاپرواہی سے پانی حلق میں چلا گیا تو روزہ ٹوٹ گیا، قضاء لازم ہے کفارہ نہیں، اس مسئلہ میں قیاس بھی یہی ہے کہ روزہ ٹوٹ جائے اور اس کے خلاف روزہ نہ ٹوٹنے پر کوئی حدیث بھی موجود نہیں لھذا یہ مسئلہ قیاس پر ہی موقوف رہے گا۔

مسئلہ: بھول کر روزہ کی حالت میں کھالیا یا پی لیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، اگر چہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ روزہ ٹوٹ جاتا لیکن اس کے متعارض (مقابل) حدیث شریف موجود ہے لہذا عمل حدیث پاک پر ہوگا، قیاس کو چھوڑ دیا جائے گا

"عن ابی ھریرہ عن النبی ﷺ قال اذا نسی احدکم فاکل وشرب فلیتم صومہ فانما اطعمہ اللہ وسقاہ" (بخاری، مسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی ایک بھول جائے تو کھا، پی لے تو وہ اپنا روزہ مکمل کرے (یعنی اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) بیشک اسے اللہ تعالی نے کھلایا ہے اور پلایا ہے۔

مسئلہ: بھول کر ذبح کرتے ہوئے "بسم اللہ" پڑھنا بھول گیا تو وہ جانور حلال ہوگیا، اگر جان بوجھ کر "بسم اللہ" پڑھنا چھوڑ کر جانور کر ذبح کر دیا تو وہ حرام ہوگیا، اس مسئلہ کا مکمل ذکر انشاء اللہ آٹھویں پارہ میں آئے گا۔

فائدہ: "قال الکلبی کانت بنو اسرائیل اذا نسوا شیئا مما امروا بہ او اخطئوا عجلت لھم العقوبۃ فحرم علیھم شیء من مطعوم او مشروب علی حسب ذلک الذنب"

کلبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بنو اسرائیل کو جب کسی چیز کا حکم دیا جاتا وہ بھول کر یا خطاء سے اس پر عمل نہ کرتے تو اس کو جلدی ہی (دنیا میں) اس کی سزا دے دی جاتی، یعنی خطاء اور نسیان سے کی گئی غلطی پر اسے سزا دینے کیلئے اس پر کھانے اور پینے کی چیز کو حرام کر دیا جاتا۔ (ماخوذ از مظہری)

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی امت کے لوگو تم اپنی قسمت کو دیکھو رب تعالی کا تم پر کتنا کرم ہے کہ اس نے تم سے بھول اور خطاء کی پکڑ کو ہی اٹھالیا ہے، یہ سب کرم ہے میرے پیارے مصطفی کریم ﷺ کا جن کے مقام محبوبیت اور درجہ رفیعہ سے امت کو عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

تنبیہ: نسیان کبھی ترک کے معنی بھی آتا ہے، اگر کوئی شخص تاویل فاسد سے عمل کو چھوڑے، یا خطاء پر فاسد تاویل پیش کرے تو اسے مؤاخذہ ہوگا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ﴾ "انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔" (ماخوذ از کبیر بتصرف)

اس دعاء کی مقبولیت: واخرج ابن جریر عن السدی قال ان ھذہ الآیۃ حین نزلت ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ قال لہ جبریل ان اللہ قد فعل ذلک یا محمد" (در منثور)

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیشک جب یہ آیۃ ﴿رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطاء ہو جائے'' نازل ہوئی، تو جبریل نے رسول اللہ ﷺ کو رب کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعاء کو شرف قبولیت پہلے سے ہی عطاء کر رکھا ہے، یعنی بندے اپنے اظہار عجز کیلئے دعاء کرتے رہیں، رب تعالیٰ سے بے نیاز نہ ہو جائیں تاہم رب تعالیٰ نے پہلے ہی بھول اور خطاؤں پر مؤاخذہ نہ کرنے کا وعدہ فرما دیا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

''اے ہمارے رب اور نہ ڈال ہم پر بوجھ جیسا تو نے ڈالا وہ (بوجھ) ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ عطف علی ماقبله وتوسيط النداء بينهما لابراز مزيد الضراعة''

(تفسیر ابی السعود)

''وَلَا تَحْمِلْ'' کا عطف ''لَا تُؤَاخِذْنَا'' پر ہے۔ اگرچہ ''لَا تُؤَاخِذْنَا'' سے پہلے والا ''ربنا'' ساتھ مل رہا تھا، دوبارہ ''ربنا'' کے ذکر کی ضرورت تو نہ تھی، لیکن پھر معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ''ربنا'' کو ذکر کیا جو منادی ہے، حرف ندا محذوف ہے، اصل میں ''یاربنا'' ہے یعنی ''ربنا'' دوبارہ ذکر کر کے بندے کی مزید عاجزی کا اظہار کیا، کہ بندہ بار بار اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کر رہا ہے ''اے میرے رب، اے میرے رب'' وہ گویا کہ یوں کہہ رہا ہے، مالک تو ہی ہے میں تو تیرا عاجز بندہ ہوں، اس لئے تجھ سے فضل وکرم کی طلب کی دعاء کر رہا ہوں۔

''اِصْرًا'' کے معانی:

''الاصر العهد والميثاق الغليظ'' اخرجه الطبری عن قتادة'' سخت کا وعدہ لینا جس میں بہت مشکلات ہوں اسے ''اصـــــر'' کہا جاتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور مجاہد، قتادہ، سدی، ابن جریج، ربیع، ابن زید رضی اللہ عنہم کا ہے۔ (البحر المحیط)

''واخرج ابن جرير عن ابن جريج ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ قال عهدا لانطيقه و لانستطيع القيام به كما حملته على الذين من قبلنا اليهود والنصارى فلم يقوموا به فاهلكتهم''

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم سے سخت وعدہ نہ لینا کہ ہم اس کی طاقت نہ رکھیں اور اس وعدہ کو پورا نہ کر سکیں تو جیسا کہ تو نے ہم سے

پہلے لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ سے سخت وعدے لئے لیکن وہ ان وعدوں کو پورا نہ کر سکے تو ان کی بدعہدی اور وعدہ توڑنے کی وجہ سے تو نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ (درمنثور)

"اصرا" بمعنی نا قابل توبہ گناہ:

"الاصر الذنب الذی لا کفارۃ فیہ و لا توبۃ منہ" "اصرا" کا معنی وہ گناہ جن کا نہ کفارہ ہو اور نہ ہی توبہ ان کی قبول ہو، یہ قول ابن زید کا ہے۔ (البحر المحیط)

واخرج ابن ابی حاتم عن الفضیل فی قولہ ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ قال کان الرجل من بنی اسرائیل اذا اذنب قیل لہ ان توبتک ان تقتل نفسک فیقتل نفسہ فوضعت الآصار عن ھذہ الامۃ" (درمنثور)

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم پر گناہوں کا وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا کہ ان کی توبہ بغیر قتل کے قبول نہیں ہوتی تھی، کیونکہ بنی اسرائیل میں سے جب کوئی شخص گناہ کر لیتا تھا تو اسے کہا جاتا تھا کہ تیری توبہ یہ ہے کہ تجھے تیرا قریبی رشتہ دار قتل کر دے، رب تعالیٰ سے یہ دعاء کی گئی کہ اے اللہ ہم پر گناہوں کا بوجھ اس طرح نہ ڈال کہ ان کی توبہ زبان سے اور گناہ پر نادم ہونے سے قبول نہ ہو بلکہ توبہ کیلئے ایک دوسرے کو قتل کرنا پڑے، تو رب تعالیٰ نے ان سے اس بوجھ کو اٹھا لیا ان کی توبہ کو قبول کر لیا۔

"اصرا" بمعنی سخت امر:

"الاصر الامر الغلیظ الصعب" اصر کا معنی ہے سخت اور مشکل امر یہ قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے۔ (البحر المحیط)

"واخرج عبد بن حمید عن قتادۃ فی قولہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ قال کم من تشدید کان علی من قبلنا ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ قال کم من تخفیف و یسر و عافیۃ فی ھذہ الامۃ"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے جب اس آیہ کریمہ کے متعلق سوال کیا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ کتنی ہی شدت تھی یہود پر تو اسی کے متعلق یہ دعاء کی گئی کہ "اے ہمارے رب ہم پر شدید امروں کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا" اور جب ان سے سوال کیا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ "ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا وہ جن کی ہمیں طاقت نہیں" کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ اس امت پر کتنی ہی تخفیف اور آسانی اور عافیت رکھی گئی ہے وہ اسی دعاء کا اثر ہے۔

"اصرا" بمعنی مسخ:

"وقال عطاء الاصر المسخ قردة و خنازير" اصر کا معنی شکلوں کا تبدیل کر دینا یعنی کبھی بندر بنا دینا اور کبھی خنزیر بنا دینا، یہ قول عطاء رحمہ اللہ کا ہے۔ (البحر المحیط)

"واخرج الطستی عن ابن عباس ان نافع بن الازرق قال له اخبرني عن قوله ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ قال عهدا كما حملته على اليهود فمسختهم قردة و خنازير"

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا "وہ عہد جو یہود سے لیا گیا اور ان کی بدعہدی پر ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا گیا" گویا کہ یہ دعاء کی گئی کہ اللہ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم نہ اٹھائیں تو، تو ہمیں بندر اور خنزیر بنا دے جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں کو بدعہدی کی وجہ سے بندر اور خنزیر بنا دیا تھا۔

"اصرا" بمعنی اعمال شاقہ:

"وقيل فرض يصعب اداؤه" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "اصرا" کا معنی وہ فرائض ہیں جن کا ادا کرنا بہت مشکل ہو۔ (البحر المحیط)

"اصرا" بمعنی بھاری بوجھ:

"وقال الزمخشری العبء الذی یا صر صاحبه ای یحبسه مکانه لا یستقل به" زمخشری نے بیان کیا ہے کہ "اصرا" کا معنی بھاری بوجھ ہے جو اٹھانے والے کو عاجز کر دے کہ وہ بوجھ کم نہ ہونے کی وجہ سے اسے چلنے سے روک دے۔ (البحر المحیط، الکشاف)

"واخرج ابن جرير عن الضحاك ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ قال لا تحملنا من الاعمال مالانطيق" (درمنثور)

درمنثور کی یہ روایت تائید کر رہی ہے البحر المحیط کے دونوں قولوں کی کہ "اصرا" مشکل اعمال، اور بھاری بوجھ کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ضحاک سے پوچھا گیا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہم پر مشکل اعمال کا بوجھ نہ ڈال کہ ہم اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں۔ (درمنثور)

تمام معنی کا جامع معنی:

"استعیر للتکلیف الشاق" مجازی طور پر معنی مشقت آمیز تکلیف، یعنی مشکل کام مطلب یہ ہوا کہ "اے ہمارے رب ہمیں مشکل تکالیف یعنی مشکل امور میں مبتلاء نہ فرما جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں کو مشکل امور میں مبتلاء کیا تھا۔ یہ معنی پہلے تمام بیان کئے ہوئے معانی کو شامل ہے کیونکہ سب معنی مشکل اور مشقت آمیز ہونے والے معنی کو شامل ہیں۔

پہلے لوگوں پر کیسے امور شاقہ ڈالے گئے:

"وذلک ان الله تعالی فرض علیهم خمسین صلوة وامرهم باداء ربع اموالهم زکوة ومن اصاب منهم ثوبه نجاسة قطعها ومن اصاب ذنبا اصبح وذنبه مکتوب علی بابه"

اللہ تعالی نے یہود پر پچاس نمازیں فرض کیں اور چوتھا حصہ مال کی زکوۃ دینے کا حکم فرمایا، اگر کہیں نجاست لگ جائے تو وہ کپڑا دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے کاٹنا پڑتا تھا۔ اگر کسی نے گناہ کرلیا تو صبح ان کے دروازہ پر قدرتی طور پر لکھا ہوا ہوتا۔ (خازن)

تفسیر خازن سے جو امور شاقہ ذکر کئے ہیں ان پر مزید روح البیان میں یہ بھی مذکور ہیں۔

"وعدم التطهر بغیر الماء وعدم جواز صلوتهم فی غیر المسجد وحرمة اکل الصائم بعد النوم ومنع بعض الطیبات عنهم بالذنوب"

بغیر پانی کے ان کو پاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی تھی، یعنی تیمم سے پاکیزگی کا حاصل ہونا نبی کریم ﷺ کی امت پر رب تعالی کا خصوصی انعام واکرام ہے، اوران لوگوں کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے خصوصی فضیلت سے نوازا کہ تمام زمین کو مسجد بنادیا گیا۔

اے مؤمن! تو نماز ادا کر، جہاں بھی نماز کا وقت ہوجائے وہیں رب تعالی کے حضور سربسجود ہوجا اور پہلے لوگوں پر روزے کی حالت میں رات کو ایک مرتبہ سوجانے کے بعد بھی کھانا وغیرہ حرام کردیا گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت پر صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ کی پابندیاں رکھی گئیں، رات کو طعام کھانا اور کسی مشروب کا پینا اور جماع کرنا جائز قرار دیا۔ اور پہلے لوگوں پر بعض گناہوں کی سزا کی وجہ سے کئی حلال چیزوں کو حرام کردیا گیا، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ

شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ﴾
اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی مگر جو ان کی پیٹھ میں لگی ہو یا آنت اور ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا۔ (ماخوذ از روح البیان بوضاحت راقم)

مؤمنین کی دعاء قبول کی گئی:

اللہ تعالیٰ نے جب مؤمنین کو دعاء کرنے کا طریقہ سکھایا تو مؤمنین نے رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی،

"وقد اجاب اللہ تعالی دعاء هم برحمته وخفف عنهم بفضله و كرمه فقال تعالی(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ)"

تو رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی دعاء کو قبول کیا، اور ان سے عذاب کی تخفیف فرمائی، رسول اللہ ﷺ کی امت پر یہ خصوصی فضل وکرم ہے، اور رب تعالیٰ نے ان کی دعاء کی قبولیت کو ان الفاظ مبارکہ سے واضح فرمادیا ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ اور اس نے نہیں کی تم پر دین میں کوئی حرج۔

اور اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ ''اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا۔'' اس آیۂ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت سے ان بوجھوں اور گلے کے پھندوں (یعنی امور شاقہ) کو اتار دینے کا اعلان فرمایا جو یہود پر بوجھ ڈالے گئے اور امور شاقہ ان کے گلے کا بوجھ تھے۔ (ماخوذ از خازن)

تکلیف مالا یطاق کی دو قسمیں:

"احدهما مالیس فی قدرة العبد احتماله كتكليف الاعمى بالنظر و الزمن العدو فهذا النوع من التكليف الذى لايكلف الله به عبده بحال"

ایک قسم یہ ہے کہ جو بندے کی قدرت سے باہر ہو، بندہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھے، جس طرح نابینا کو کہا جائے تو دیکھ، اور جو شخص چلنے پھرنے سے عاجز ہو اسے کہا جائے تو دوڑ، اس قسم کی تکلیف جو انسان کی طاقت سے باہر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اسے اٹھالیا ہے۔

دوسری قسم تکلیف مالا یطاق کی یہ ہے کہ

"هو مافى قدرة العبد احتماله مع المشقة الشديدة والكلفة العظيمة كتكليف الاعمال الشاقة

والفرائض الثقیلة کما کان فی ابتداء الاسلام صلوة اللیل واجبة ونحوہ فھذا الذی سال المؤمنون ربھم لایحملھم مالاطاقة لھم بہ"

جس کو بندہ اٹھا تو سکے لیکن بہت مشقت اور بہت عظیم تکلیف اٹھانے کے بعد، جیسا کہ مشکل اعمال اور بھاری فرائض کے اٹھانے کا حکم دیا جائے، جیسا کہ ابتداء اسلام میں (اسلام کے شروع شروع میں) تہجد کی نماز تمام مسلمانوں پر واجب تھی، پھر مؤمنوں سے اس کے وجوب کو اٹھالیا گیا البتہ نبی کریم ﷺ پر جوں کی توں واجب رہی۔ اس قسم کے مشکل امور کو اٹھا لینے کی مؤمنین نے دعاء کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اور تمام مشکل امور کو ان سے اٹھالیا گیا۔

سبحان اللہ! رحمة للعلمین کی رحمت عامہ سے آپ کی امت کو کتنا عظیم فائدہ حاصل ہوا۔

کیا خوب استدلال:

"واستدل بھذہ الآیة من یقول ان تکلیف مالا یطاق جائز اذلولم یکن جائزا لماحسن طلب تخفیفہ بالدعاء من اللہ تعالیٰ"

اس آیہ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی گئی ہے کہ ابھی تکلیف مالا یطاق کی جو دوسری قسم بیان کی گئی ہے اس کی تکلیف دینا جائز ہے، اگر جائز نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی دعاء کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟ (ماخوذ از خازن)

"اصرا" کے اور معنیٰ:

"الاصر وقیل القطیعة" اب دعاء کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے ہمارے رب ہم پر قطع رحمی کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے پہلے لوگوں پر قطع رحمی کا بوجھ ڈالا، یعنی اے اللہ تعالیٰ ہمیں تو اپنے فضل وکرم سے اپنے اقرباء سے قطع تعلق سے بچا۔

"وقیل شماتة الاعداء، روی وھب ان ایوب علی نبینا وعلیہ السلام قیل لہ ماکان اشق علیک فی بلائک قال شماتة الاعداء"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے "اصر" کا معنیٰ ہے "شماتت اعداء" جب کسی کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے دشمن خوش ہوں تو اسے "شماتت اعداء" کہا جاتا ہے۔ **اب دعاء** کا مطلب یہ ہوگا اے میرے رب مجھے مصائب وآلام میں مبتلاء کر کے میرے دشمنوں کو خوش نہ کرنا یعنی مجھے ان چیزوں سے بچا کر رکھنا جن کی وجہ سے میرے دشمن خوش ہوں۔ وہب کی روایت میں ہے کہ حضرت ایوب علی نبینا وعلیہ السلام سے پوچھا گیا، آپ پر آزمائشوں کے دنوں میں زیادہ شاق کیا گزری؟ تو آپ نے فرمایا "شماتت اعداء" یعنی میرے دشمنوں کا میری آزمائش اور

میرے مصائب وآلام پر خوش ہونا میرے لئے مشقت آمیز امر تھا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

"اشمت بی الاعداء حین هجرتنی   والموت دون شماتة الاعداء"

میرے دشمنوں کو بڑی خوشی حاصل ہوئی جب تم نے مجھے چھوڑ دیا، موت کی تلخیاں دشمن کی شماتت سے کم درجہ رکھتی ہے۔ تاہم تمام معانی کو شامل معنی پہلے بیان کر دیا گیا، اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پہلے لوگوں پر کیا بوجھ ڈالا گیا تھا۔ (البحر المحیط)

نبی کریم ﷺ کی رحمت کی وجہ سے دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا:

یعنی مؤمنین کی یہ دعاء اللہ تعالیٰ کے حضور ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں اعمال شاقہ (ایسے اعمال جو مشقت آمیز ہوں، بہت مشکل ہوں) کی تکلیف نہ دے اگر چہ ہم ان کی طاقت بھی رکھیں جیسا کہ تو نے پہلے لوگوں پر اعمال شاقہ مقرر کئے جو ان کیلئے بوجھ تھے اور ان کے گلے میں پھنس جانے والے طوق تھے۔ اس لئے کہ

"بعثت نبیک محمد ﷺ بنی الرحمة بوضعه فی شرعه الذی ارسلته به من الدین الحنیفی السهل السمح"

تو نے اپنے نبی محمد ﷺ کو نبی رحمت بنا کر بھیجا تا کہ وہ تیرے حکم سے ان بوجھوں کو اٹھا دیں، اسلئے کہ تو نے ان کو دین حنیف عطاء کر کے بھیجا جس میں آسانی ہی آسانی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "بعثت بالحنیفیة السمحة" مجھے دین حنیف عطاء کر کے بھیجا گیا، جو دین آسان ہے "یعنی اس میں کوئی افراط وتفریط نہیں" (صابونی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو، اور اللہ انہیں عذاب کرنے والا نہیں جب تک کہ وہ بخشش مانگ رہے ہیں۔

"والمؤمنون انما طلبوا هذاالتخفیف لأن التشدید مظنة التقصیر والتقصیر موجب للعقوبة ولاطاقة لهم بعذاب الله فلاجرم طلبواالسهولة فی التکالیف"

مؤمنین نے اس تخفیف کی دعاء کی اس لئے کہ تکالیف شدیدہ سے کوتاہی ہو جانے کا گمان پیدا ہوتا ہے اور کوتاہی کی وجہ سے اعمال کو چھوڑ دینا باعث عذاب ہے، اور ان کو یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ

کے عذاب کو برداشت کریں تو انہوں نے تکالیف میں آسانی کا مطالبہ کیا۔ (کبیر)

اعتراض: "لقائل ان یقول دلت الدلائل العقلیة والسمعیة علی انه اکرم الاکرمین وارحم الراحمین فما السبب فی ان شدد التکلیف علی الیهود حتی ادی ذلک الی وقوعهم فی المخالفات والتمرد"

جب دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ "اکرم الاکرمین" اور "ارحم الراحمین" ہے تو کیا وجہ ہے اس نے یہود پر سخت احکام نافذ فرمائے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ان مشکل احکام کی وجہ سے ہی سرکش بنے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمائی کی وجہ بھی ان پر سختی ہو۔

جواب ازمعتزله: معتزلہ نے جواب یہ دیا ہے:

"من الجائز ان یکون اشئی مصلحة فی حق انسان مفسدة فی حق غیره فالیهود کانت الفظاظة والغلظة غالبة علی طباعهم فما کانوا ینصلحون الابالتکالیف الشاقة والشدة وهذه الامة کانت الرقة وکرم الخلق غالبا علی طباعهم فکانت مصلحتهم فی التخفیف وترک التغلیظ"

کہ جائز ہے ایک چیز کسی کیلئے بھلائی، درستی اور اصلاح کا ذریعہ ہو اور وہی دوسرے کیلئے فساد کا سبب ہو، نرم طبیعت والے کیلئے آسان احکام اصلاح کا سبب ہیں، لیکن سخت طبیعت والے کیلئے مشکل کا سبب ہیں۔ یہود چونکہ تند مزاج تھے اور ان کی طبیعت پر سختی غالب تھی، ان کی اصلاح بغیر تکالیف شاقہ کے نہیں ہوسکتی تھی اس وجہ سے ان پر سخت احکام نافذ فرمائے۔ نبی کریم ﷺ کی امت نرم مزاج ہے، اور ان کی طبیعت پر اچھے اخلاق اور نرم مزاجی غالب ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ان پر نرم احکام نافذ فرمائے۔

اہل سنت و جماعت کی طرف سے جواب:

جب اہل سنت و جماعت کے حضرات نے دیکھا کہ یہود پر اگرچہ احکام سخت تھے لیکن ان پر مہربانیاں بھی بہت زیادہ تھیں، من وسلوی ان پر اتارا گیا۔ پتھر سے چشمے ان کیلئے جاری کیے گئے، میدان تیہ میں ان پر بادل سے سایہ کیا گیا۔ ان کو گرمی وسردی سے میدان تیہ میں محفوظ رکھا گیا، ان کے کپڑوں کو میلا ہونے سے محفوظ رکھا گیا، بچہ جس طرح بڑا ہوتا کپڑا خود بخود بڑا ہوتا، ان ان مہربانیوں کو بھی دیکھتے ہوئے اور سخت احکام کو بھی دیکھتے ہوئے یوں کہا جائے

﴿وهو سبحانه تعالی (یَفْعَلُ مَایَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَایُرِیْدُ "لَایُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾

کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے، اور جو ارادہ فرمائے وہ حکم فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب (لوگوں) سے سوال ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے خیال میں عقلی باتیں بتانے والے، دین کے باغیوں، یہود ونصاری کیلئے جواب معتزلہ والا ہی صحیح ہے "ایسے کو تیسا" محاورہ بہت پیارا محاورہ ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾

''اے ہمارے رب اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں طاقت ہمیں اس کی۔''

یہ تیسری دعاء ابھی دوسری دعاء کے ضمن میں تفسیر خازن کے حوالہ سے کچھ بحث تکلیف مالا یطاق کے متعلق بیان کی جا چکی ہے۔ ''طاقة'' نام بن گیا ہے ''اطاقة'' کا، جیسے ''طاعة'' نام ہے ''اطاعة'' کا ''جابة'' نام ہے ''اجابة'' ''وهی توضع موضع المصدر'' اسے مصدر کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اہل سنت وجماعت کا مذہب:

''ان تکلیف مالایطاق جائز اذ لو لم یکن جائز الماحسن طلبه بالدعاء من الله تعالی'' اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے، اگر جائز نہ ہوتی تو دعاء میں اللہ تعالی سے یہ مطالبہ ہی نہ کیا جاتا کہ اے ہمارے رب ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کہتے ہیں کہ جس کی چیز طاقت نہیں، اس کا حکم نہیں دیا جا سکتا، یعنی ان کا قول یہ ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز نہیں۔

معتزلہ کے دلائل اور ان کے جوابات:

پھلی دلیل: معتزلہ نے کہا ہے یہاں ﴿مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ''مایشق مشقة عظيمة'' جس کام میں مشقت عظیمہ پائی جائے وہ ہم سے نہ اٹھوا۔ ''طاقة'' اس معنی میں استعمال ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ''لااستطیع ان انظر الی فلان'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے فلاں کو دیکھنا بھاری نظر آتا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غلام کے متعلق فرمایا ''له طعامه و کسوته و لایکلف من العمل مالایطیق'' کہ غلام کو طعام اور لباس دو (جیسا کہ خود استعمال کرتے ہو) اور اسے طاقت سے زائد کام کی تکلیف نہ دو، اس مقام پر بھی طاقة کا معنی مشقت ہے، کہ ان سے مشقت والا کام نہ لیا جائے۔

اور حدیث شریف میں مریض کی نماز کے بیان میں ہے 'فـان لـم یستطع فعلی جنب" اگر وہ (بیٹھنے کی) طاقت نہ رکھے تو کروٹ کے بل، یعنی لیٹ کر نماز ادا کرے۔ اس حدیث کے متعلق بھی فقہاء کرام کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ "المراد منه اذا كان يلحقه في الجلوس مشقة عظيمة شديدة" مراد اس سے یہ ہے کہ اسے بیٹھنے میں مشقت عظیمہ حاصل ہو تو لیٹ کر نماز ادا کرے۔

جواب: تمہاری یہ دلیل دو وجہ سے ناقص ہے، ایک تو یہ ہے کہ اگر ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ میں یہ معنی لیا جائے کہ ہم سے ''اعمال شدید'' نہ اٹھوا، تو اس میں تکرار لازم آئے گا کیونکہ یہی معنی ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ قانون یہی ہے کہ بلاوجہ تکرار درست نہیں "الافادة خير من الاعادة" نیا فائدہ زیادہ بہتر ہے لوٹانے سے۔ دوسری وجہ تمہاری دلیل کے ناقص ہونے کی یہ ہے، کہ قانون یہ ہے کہ جب لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جا سکے تو مجازی معنی مراد لینا درست نہیں، جب حقیقی معنی "طاقة" کا قدرت اور طاقت رکھنا ہے، تو کیا ضرورت ہے کہ ''امور شاقہ اور اعمال شاقہ'' معنی کیا جائے جو مجازی معنی ہے۔ جو احادیث تم نے پیش کی ہیں ان کے مجازی معانی لینے پر قرائن موجود ہیں، جو تمہاری دلیل سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ "فان لم يستطع فعلی جنب" کا معنی یہ ہے کہ جب بیٹھنا مشکل ہو جائے تو لیٹ کر نماز ادا کرے، فقہاء کرام کا اجماع دلیل ہے اس پر کہ یہاں مجازی معنی ہے۔

معتزلہ کی دوسری دلیل:

یہاں مراد تکلیف سے عذاب ہے، آیہ کریمہ کا معنی یہ ہوا "لا تحملنا عذابک الذی لا نطیق احتماله" ہم پر عذاب کا بوجھ نہ رکھ جس کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔

﴿لَا تُحَمِّلْنَا﴾ ماخوذ ہے "**تحمیل**" سے، جس کا معنی ہے، اٹھوانا کسی پر بوجھ رکھ دینا، یہاں یہ ذکر نہیں "لا تکلفنا ما لا طاقة لنا به" کہ ہمیں ان چیزوں کی تکلیف نہ دے جن کی ہمیں طاقت نہیں، بلکہ یہاں تو یہ ذکر ہے ﴿لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ہم سے وہ نہ اٹھوا، وہ چیز ہم پر نہ رکھ جس کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ اگر "**تحمیل**" کا معنی عذاب اٹھوانا، عذاب کا بوجھ ڈالنا لیا جائے تو یہ معنی حقیقی ہے، اور اگر "تحمیل" کو تکلیف کے معنی میں لیا جائے تو یہ معنی مجازی ہوگا، حقیقی معنی لینا بہتر ہے بنسبت مجازی کے۔

جواب: "ان التحمل مخصوص في عرف القرآن بالتكليف" "تحمل" اور "تحمیل" قرآن

پاک میں تکلیف کے معنی میں لیا گیا ہے، یہ مشہور و معروف ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ﴾ آیۃ میں ﴿وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ ذکر فرمایا، جس کا معنی ہی یہ ہے، امانت کی تکلیف کو انسان نے قبول کر لیا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ "تحمیل" کا معنی بوجھ اٹھانا عرف میں پایا گیا ہے، اور اس کا معنی "تکلیف" عرف میں نہیں پایا گیا تو یہ باطل ہے کیونکہ "تحمیل" کا معنی عرف قرآن میں تکلیف ہی ہے۔

"فوجب اجراؤه علی ظاهره اما التخصیص بغیر حجة فانه لایجوز"

اس کو ظاہر پر جاری رکھنا ضروری ہے کیونکہ جو معنی عرف قرآن میں پایا جاتا ہے وہی ظاہر ہے، لہٰذا بلاوجہ اس اصطلاح سے ہٹ کر عام عرف اور محاورہ کو دیکھتے رہنا جائز نہیں۔

معتزلہ کی تیسری دلیل:

اگر بالفرض یہ معنی لے بھی لیا جائے کہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ اے ہمارے رب ہمیں اس چیز کی تکلیف نہ دے جس کی ہمیں طاقت اور قدرت حاصل نہیں۔ تو اس کی مخالف جانب ثابت نہیں کہ "تکلیف مالایطاق" جائز ہے اسی لئے دعاء کی گئی ہے دعاء میں کئی جگہ مخالف جانب ثابت نہیں، جیسا کہ یہ دعاء ہے "رب الحکم بالحق" "اے میرے رب حق فیصلہ فرما" اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے یہ ثابت ہو جائے کہ معاذ اللہ رب تعالیٰ باطل فیصلے فرماتا ہے، اسی وجہ سے حق فیصلہ کرنے کی دعاء کی گئی اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴾ اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن سب اٹھائے جائیں گے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو رسوا بھی کرتا ہے "معاذ اللہ"

جواب: جب دلائل اور قرائن موجود ہوں کہ یہاں مخالف جانب ثابت نہیں تو یقیناً مخالف جانب نہیں ثابت ہوگی جیسا کہ کوئی کہے "ربنا لاتجمع بین الضدین" اے ہمارے رب دو ضدوں کو جمع نہ کر۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دو ضدوں کو جمع کرنا جائز ہے، اسی طرح کوئی دعاء کرے "ربنا و لاتقلب القدیم حادثا" اے ہمارے رب قدیم کو حادث نہ بنا، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدیم کو حادث بنانا جائز ہے، یہاں مخالف جانب ممتنع لذاتہ ہے، جو چیز ذاتی طور پر ممتنع اور محال ہو اس کا پایا جانا ممکن نہیں۔ جن چیزوں کی مخالف جانب کا پایا جانا ممتنع لذاتہ نہیں، ان کی مخالف جانب ثابت ہوگی۔ جن دعاؤں کا تم نے ذکر کیا ہے ان کی مخالف جانب کا ثابت ہونا محال ہے جو قطعی دلائل سے واضح ہے۔ لیکن جس مسئلہ میں ہم بات کر رہے اس میں کوئی قطعی دلیل ثابت نہیں جس سے یہ واضح ہو اکہ اس کی مخالف جانب ثابت ہے،

هذا هو الاصل فاذا صار ذلک متروکا فی بعض الصور لدلیل مفصل لم یجب ترکه

فی سائر الصور بغیر دلیل "وباللہ التوفیق"

یہ ضابطہ اور قانون ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے، اس لئے بعض صورتوں تفصیل دلائل سے اگر مخالف جانب کو ثابت کرنا محال ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جگہ محال ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطاء فرمائے تو مسائل کی تفصیل سمجھ آتی ہے۔ جس سے مسائل واضح ہو جاتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: اس سے پہلی دعاء میں ذکر فرمایا ﴿لاتحمل علینا اصرا﴾ ہم پر بوجھ نہ ڈال اور اس دعاء میں ذکر فرمایا ﴿ولاتحملنا مالاطاقۃ لنابہ﴾ اور ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ ان دونوں دعاؤں میں مختلف الفاظ ذکر کئے، پہلی دعاء میں "لاتحمل" ہے جو ثلاثی مجرد ہے۔ یعنی اس میں "حمل" ذکر ہے۔ دوسری دعاء میں "ولاتحملنا" ہے، جو ثلاثی مزید فیہ ہے، یعنی اس میں "تحمیل" کا ذکر ہے۔ ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: مشکل کاموں کو اٹھانا ممکن ہے، اور جن کاموں کی طاقت ہی نہ ہو ان کو اٹھانا ممکن نہیں، اس وجہ سے تکلیف مالایطاق میں دعاء کی "ہم سے وہ نہ اٹھوا جن کی ہمیں طاقت نہیں، اور مشکل کاموں کیلئے دعاء کی "ہم پر مشکل کاموں کا بوجھ نہ ڈال"

"فالحاصل فیما لایطاق ھوالتحمیل فقط اماالحمل فغیر ممکن واماالشاق فالحمل والتحمیل یمکنان فیہ فلھذاالسبب خص الآیۃ الاخیرۃ بالتحمیل"

حاصل جواب یہ ہے کہ "مالایطاق" میں صرف تحمیل پائی گئی ہے "حمل" ممکن نہیں، یعنی اٹھوانا ممکن ہے کہ اٹھانے کا حکم دے دیا جائے لیکن اٹھانا ممکن نہیں اور مشکل کام ہوں لیکن اس درجہ کے نہ ہوں کہ ان کو اٹھانے کی طاقت ہی نہ ہو تو ان میں تحمیل اور حمل (اٹھوانا اور اٹھانا) دونوں ہی ممکن ہیں۔ یہاں چونکہ تکلیف مالایطاق نہ دینے کی دعاء ہے اس لئے اس مقام میں "تحمیل" کا ذکر کیا گیا ہے، اور پہلی دعاء میں بوجھ نہ ڈالنے کی دعاء ہے اس لئے اس میں اگرچہ بظاہر صرف "حمل" کو ذکر کیا گیا ہے لیکن ضمناً اس میں تحمیل کا ذکر بھی پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿واعف عنّا واغفر لنا وارحمنا انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکافرین﴾

"اور معاف کر ہمیں اور بخش دے ہمیں اور رحم کر ہم پر، تو ہمارا مولیٰ ہے، تو امداد فرما ہماری اوپر قوم کافرین کے"

سوال: عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ﴿ولاتحملنا مالاطاقۃ لنابہ﴾ دعاء پہلے ہونی چاہئے تھی اور ﴿ولاتحمل علینا اصرا﴾ دعاء بعد میں ہونی چاہئے تھی کیونکہ جب یہ دعاء کی کہ مشقت آمیز مشکل کاموں کا بوجھ ہم پر

نہ ڈال تو یہ مستلزم ہے اسے کہ وہ تکلیف مالا یطاق کو نہ اٹھوانے کی پہلے دعاء کرے۔یعنی یوں دعاء کرتا کہ اے ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا جن کی ہمیں طاقت نہیں اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو مشکل اور مشقت آمیز ہے، جو ترتیب ذکر کی گئی ہے کیا اس میں بھی کوئی حکمت نظر آتی ہے؟

جواب: حقیقی علم تو اللہ تعالی کو ہے، انسان کی رسائی (پہنچ) حقیقی طور پر اللہ تعالی کی حکمتوں تک ممکن نہیں تاہم اپنے خیال سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے دو مقام ہیں، ایک یہ کہ وہ ظاہری شریعت پر عمل کرے، اور دوسرا یہ کہ مکاشفات کی ابتداء میں شروع ہونا۔

"وذلک هوان يشتغل بمعرفة الله وخدمته وطاعته وشكر نعمته"

اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت اور اس کی خدمت اور اس کی طاعت اور اس کا شکر بجالانے میں مشغول ہونا۔

ظاہری شریعت پر عمل کرنے کیلئے مشکل امور کا بوجھ نہ ڈالنے کی دعاء کی گئی کہ ہم ان پر عمل کر سکیں، عمل تب کر سکیں گے جب وہ مشکل نہ ہو بلکہ آسان ہو لیکن دوسرے مقام یعنی مکاشفات کے حصول کیلئے بندہ رب تعالی کے حضور یوں عرض کر رہا ہے

"ولا معرفة تليق بقدس عظمتک فان ذلک لایلیق بذکری وشکری وفکری ولا طاقة لی بذلک"

کہ اے میرے رب تیری پاکیزہ عظمت کے مطابق مجھے معرفت حاصل نہیں، اسی وجہ میرا ذکر میرا شکر میرا فکر تیری شان کے لائق نہیں، کیونکہ مجھے اس کی طاقت ہی حاصل نہیں۔

"ولما كانت الشريعة متقدمة على الحقيقة لاجرم كان قوله ﴿وَلَاتَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا﴾ مقدما فی الذکر علی قوله ﴿وَلَاتُحَمِّلۡنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾

جبکہ شریعت پر عمل کرنا پہلے ضروری ہے، شریعت پر عمل کے ذریعے ہی ہے حقیقت تک پہنچنا ہے، شریعت پر عمل کرنے کے بغیر حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں، اسی وجہ سے پہلے دعاء کی ﴿رَبَّنَا وَلَاتَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا﴾ اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال، پھر دعاء کی ﴿رَبَّنَا وَلَاتُحَمِّلۡنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ اے ہمارے رب اور ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: اس مقام میں تمام دعاؤں میں جمع کے صیغے ذکر کئے گئے ہیں، حالانکہ کبھی دعاء کرنے والا ایک ہی شخص ہوتا ہے، تو جمع کے صیغے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: "المقصود منه بيان ان قبول الدعاء عند الاجتماع الكمل، وذلک لان المهم

تاثیرات فاذا اجتمعت الارواح والدواعی علی شیء واحد کان حصوله اکمل"

دعاء کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دعاء قبول ہوجائے، اجتماعی دعاء کرنا زیادہ بہتر اور کامل ہوتا ہے، جب سب لوگ مل کر دعاء کرتے ہیں اور ان کی روحیں جمع ہوتی ہیں تو اس کی بہت بڑی تاثیر ہوتی ہے، اور دعاء کی قبولیت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تین دعاؤں میں "ربنا" ذکر کیا، ایک میں نہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تین دعاؤں میں بندہ رب تعالی سے ترک کی دعاء کرتا ہے، اے ہمارے رب "مؤاخذہ نہ فرما" اے ہمارے رب ہم پر بوجھ نہ ڈال، اے ہمارے رب ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہمیں طاقت نہیں۔ چونکہ ابتداء میں بندہ اپنے آپ کو رب تعالی سے دور سمجھ رہا تھا، جب بندے نے عاجزی اور خشوع وخضوع سے رب تعالی کے حضور چند دعائیں کردیں تو اب بندہ اپنے آپ کو رب تعالی کے قریب پاتا ہے۔

"ان العبد اذا واظب علی التفرع نال القرب من اللہ تعالی وھذا سر عظیم یطلع منه علی اسرار اخر والنداء انما یحتاج عندالبعد اما عندالقرب فلا"

بندہ جب اللہ تعالی کو عاجزی سے یاد کرتا رہتا ہے تو اسے قرب الہی حاصل ہوجاتا ہے، اور بندہ یہ خیال کرتا ہے کہ اگرچہ رب تعالی تو پہلے بھی میرے قریب تھا لیکن میں اس سے دور تھا، اس لئے رب کو "یاربنا" اے ہمارے رب، کہہ کر پکار رہا تھا، اب بندہ اپنے آپ کو رب تعالی کے قریب سمجھتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ اب نداء (پکارنے) کی کیا ضرورت ہے، اب پکارنے کے بغیر ہی عرض کردیتا ہوں، ہمیں معاف فرما اور ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

عفو، مغفرت اور رحمت کی ترتیب میں اہم نکتہ:

بندہ تین چیزوں کی دعاء کا محتاج ہوتا ہے۔

(۱) اللہ تعالی اسے معاف فرمائے۔ (۲) اپنی رحمت فرمائے کہ اسے گناہوں پر سزا نہ دے۔

(۳) اللہ تعالی اس کی پردہ پوشی فرمائے کہ اس کے گناہ بندوں سے چھپے رہیں تاکہ اسے دوسروں کے سامنے رسوا نہ کرے۔

"واعف عنا" ای فیما بیننا وبینک مما تعلمه من تقصیرنا وزللنا"

یعنی جو ہمارے اور تیرے درمیان ہیں ان کو معاف فرمادے کیونکہ تو تو جانتا ہے ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو، اس لئے معافی کی درخواست تجھی سے ہے۔

"واغفرلنا" ای فیما بیننا وبین عبادک فلا تظهر هم علی مساوینا و اعمالنا القبیحة"

اور ہماری مغفرت فرما، یعنی جن کا تعلق ہمارے اور تیرے دوسرں بندوں کے درمیان ہے ان کو ڈھانپ دے، ان کی ستر پوشی فرما، ہمارے گناہ اور ہمارے برے اعمال ہم پر ظاہر نہ فرما۔

"وارحمنا" ای فیما یستقبل فلاتوقعنا بتوفیقک فی ذنب آخر"

ہم پر رحم فرما، یعنی آئندہ بھی اپنی توفیق سے تو ہمیں گناہوں سے بچا کر رکھ، اگر ہم سے گناہ ہو جائے تو معاف فرما۔

(ماخوذ از ابن کثیر)

وضاحت: "عفو" کا مطلب ہے کہ اس کے گناہ معاف کردئے جائیں، مغفرت کا مطلب ہے کہ اس کی پردہ پوشی کی جائے کہ وہ خجالت وفضیحت (شرمندگی اور رسوائی) سے محفوظ رہے، گویا کہ بندہ کہتا ہے میں تجھ سے معافی طلب کرتا ہوں، جب تو مجھے معاف کردے تو میری پردہ پوشی فرما۔

"فان الخلاص من عذاب القبر انما یطیب اذا حصل عقیبه الخلاص من عذاب الفضیحة"

کیونکہ عذاب قبر سے خلاصی بھی اس وقت نفع مند ہوگی اور اچھی نظر آئے گی جب کہ محشر میں دوسروں کے سامنے رسوائی نہ ہوئی۔ قبر کا عذاب، جسمانی عذاب ہے اور لوگوں کے سامنے محشر میں رسوائی روحانی عذاب ہے۔

"فلما تخلص منهما اقبل علی طلب الثواب" جب ان دونوں عذابوں یعنی عذاب جسمانی اور عذاب روحانی سے راحت کی دعاء کرلی تو پھر ثواب کی طلب کی بندہ دعاء کرتا ہے، ثواب کی بھی دو قسمیں ہیں ثواب جسمانی اور ثواب روحانی۔

ثواب جسمانی: وہ جنت کی نعمتیں، پاک اور لذیز نعمتیں رب تعالی سے طلب کی جارہی ہیں۔ ثواب روحانی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کے جلال کے نور کی تجلیات حاصل ہو جائیں، اور انسان کو اپنی وسعت کے مطابق اس پر اللہ تعالی کی کبریائی حاصل ہو جائے۔ اور اللہ تعالی کے حضور اس کے نور میں کامل طور پر مستغرق ہو جائے، بندہ جسمانی ثواب کو طلب کرنے کیلئے رب تعالی کے حضور عرض کرتا ہے "وارحمنا" (اور ہم پر رحم فرما) اور ثواب روحانی کی طلب کیلئے عرض کرتا ہے "وانت مولنا" اور تو ہمارا مولی ہے۔

"ان یصیر العبد مقبلا بکلیته علی الله تعالی لان قوله تعالی ﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ خطاب الحاضرین"

یعنی بندہ رب تعالیٰ کے حضور ﴿اَنتَ مَولٰنَا﴾ کہہ کر کامل طور پر متوجہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو بندوں کی دعاء کی حکایت ہے، بلکہ بندوں کو دعاء کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس میں جو یہ فرمایا گیا ہے ﴿اَنتَ مَولٰنَا﴾ "تو ہمارا مولیٰ ہے" یہ اسی وقت بندہ رب تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو قریب سمجھتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میں خود رب تعالیٰ کے قریب ہو چکا ہوں، اگر چہ وہ تو پہلے ہی میرے قریب تھا۔ بندہ اپنے آپ کو اس درجہ میں دیکھ کر ثواب روحانی کا مطالبہ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلیات میں مستغرق ہو جاؤں۔

تنبیہ: متکلمین روحانیت، مکاشفہ، اور تقرب الٰہی جو صوفیاء کرام کے مسالک میں چیزیں آتی ہیں ان کے قائل نہیں، وہ صرف طاعت وغیرہ کے قائل ہیں۔ یوں کہیں کہ متکلمین اصحاب ظواہر ہیں۔ اصحاب ظواہر حقائق کو نہیں جانتے بلکہ قرآن وحدیث کے ظاہر الفاظ کا ظاہری ترجمہ جانتے ہیں، جب حقائق کو نہیں جانتے تو بھٹکتے ہی رہتے ہیں، کہیں رب تعالیٰ کی شان میں گستاخی کر دی ﴿نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُم﴾ کا ترجمہ یوں کر دیا وہ اللہ کو بھول گئے، اللہ ان کو بھول گیا۔ ان کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ اللہ تعالیٰ تو بھولنے سے پاک ہے،

سبحان اللہ ! اصحاب معرفت میں سے اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "حقیقت کو پہچانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ بھولنے سے تو پاک ہے" کیا خوب ترجمہ فرمایا انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔ پھر اصحاب ظواہر نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کر دی ﴿وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی﴾ کا ترجمہ کر دیا اور پایا تمہیں بھٹکا ہوا تو ہدایت دی۔ لیکن اس کے برخلاف اصحاب معرفت محبان رسول اللہ ﷺ نے کیا خوب ترجمہ فرمایا اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ (اعلیٰ حضرت)

علامہ رازی رحمہ اللہ متکلمین کے متعلق کیا خوب فرماتے ہیں۔

" ولعل کثیرا من المتکلمین یستبعدون ھذہ الکمات ویقولون انھا من باب الطاعات ولقد صدقوا فیما یقولون فذلک مبلغھم من العلم ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بمن اھتدیٰ"

چونکہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ثواب روحانی کا تذکرہ کیا، پھر اس کی وضاحت کی کہ ثواب روحانی کیا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ شاید بہت سے متکلمین یہ کہیں کہ یہ عقلاً بعید ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے قریب ہو جائے اور اسے رب تعالیٰ کے نور کی تجلیات میں مستغرق کر دے، علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بات انہوں نے بھی سچ کی کیونکہ انہوں نے بات اپنے علم کے مطابق کی، ان کے علم کی رسائی ہی یہاں تک ہے۔ جو رب تعالیٰ سے دور ہیں وہ رب تعالیٰ کے قرب کو کیا جانیں، لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ ان الفاظ کے معانی سے صرف ظاہر طور پر اطاعت سمجھ آتی ہے، معرفت کی باتیں درست

نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو معرفت سے دور ہے اسے معرفت کیا حاصل ہو سکتی ہے؟ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی﴾

بیشک آپ کا رب جانتا ہے جو سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے اور جانتا ہے اسے جس نے ہدایت حاصل کر لی۔

جب رب تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ کچھ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں، اور کچھ ہدایت پر قائم ہیں تو ہمیں ان پر شکوہ ہی کیا ہے کہ وہ معرفت کیوں انکار کرتے ہیں۔ جسے رب تعالیٰ معرفت سے دور رکھے ہماری کیا مجال کہ ہم اسے معرفت عطاء کر دیں، معاملہ قسمت کا ہے، کسی کو رب تعالیٰ اپنے قریب کر لیتا ہے اور کسی کو دور ہی رکھتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ کہنے میں ایک اور فائدہ:

بندہ جب رب تعالیٰ کے حضور ﴿اَنْــتَ مَـوْلٰـنَــا﴾ کہتا ہے تو اپنی عاجزی، بیکسی اور بے بسی کا تذکرہ کرتا ہے۔ "والاعتراف بانه سبحانه هو المتولی لکل نعمة یصلون الیها" اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر نعمت کا مالک ہے، اسی کی توفیق اور اسی کی عطاء سے وہ ان نعمتوں کو حاصل کر لیتے ہیں، ورنہ وہ ان نعمتوں سے ہی محروم رہیں۔ اور بندہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ رب تعالیٰ ہی تکریم عطاء فرماتا ہے، اسی کی عطاء سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ اپنی دعاء میں اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا تذکرہ کرتا ہے۔

"فهو بمنزلة الطفل الذی لاتتم مصلحته الابتدبیر قیمه"

جس طرح بچے کی کوئی پرورش کرنے والا نہ ہو، اس کا کوئی مدبر نہ ہو اور اس کا کوئی مصلح نہ ہو تو وہ نہ ہی پرورش پا سکتا ہے، نہ ہی اس کی اصلاح ہوتی ہے، اسی طرح بلاتشبیہ وتمثیل:

"والعبدالذی لاینتظم شمل مهماته الاباصلاح مولاه فهو سبحانه قیوم السماوات والارض والقائم باصلاح مهمات الکل وهو المتولی فی الحقیقة للکل"

بندہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتا اور اپنے امور کا خود منتظم نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح نہ کرے، وہ ہی مولیٰ ہے، وہی زمین وآسمان کو قائم رکھنے والا ہے وہی تمام اہم کاموں کی اصلاح کرنے والا ہے، وہی مشکلات کو دور کرنے والا ہے، حقیقت میں ہر کام کا وہی متولی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامی اس پر واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں: ﴿نِـعْـمَ الْـمَـوْلٰـی وَنِـعْـمَ الـنَّـصِیْـرُ﴾ وہی بہتر مولیٰ اور بہتر مددگار ہے۔ ﴿اَلـلّٰـــهُ وَلِـــیُّ الَّــذِیْـنَ اٰمَـنُـوْا﴾ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی (مددگار) ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ﴾ بیشک اللہ ہی مولیٰ (مددگار) ہے۔ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَی الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ ایمان والوں کا مولی، اور بیشک کافروں کا کوئی مولی نہیں۔
(ماخوذ از کبیر)

﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ ''تو ہماری امداد فرما کافروں کی قوم پر''

یعنی ان کے ساتھ جنگوں میں ہماری امداد فرما، اور ان کے ساتھ مناظرہ کرنے میں دلائل میں ان پر غالب آنے کی ہماری امداد فرما۔ اور اسلام کی سربلندی کیلئے ان کے ادیان باطلہ (باطل دینوں) کے خلاف ہماری امداد فرما ﴿لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ تا کہ اسلام کا تمام دینوں پر غلبہ ہو جائے۔

"ومن المحققین من قال ﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ المراد منه اعانة الله بالقوة الروحانية الملكية على قهر القوى الجسمانية الداعية الى ماسوى الله"

اصحاب معرفت محققین نے بیان کیا ہے یہاں جس امداد کی دعاء کی جارہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اے ہمارے مولی ہمیں قوت روحانیہ عطاء کر کے جسمانی قوتوں کے خلاف ہماری امداد فرما جو جسمانی قوتیں ہمیں تجھ سے پھیر کر اوروں کی طرف لگادیں، یعنی جسمانی قوتیں روحانی قوتوں کی منکر اور کافر ہیں، ان کے خلاف ہماری امداد فرما، تو ہی ہمارا مولی ہے، تو ہی ہمارا مددگار ہے، تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ باقامة الحجة و الغلبة فی قتالهم فان من شان مولى ان ينصر مواليه على الاعداء" (جلالین)

فان من شان المولى ان ينصر مواليه اى عبيده" اشار بهذا الى تقرير السببية المستفادة من الفاء اى طلب النصرة بتسبب عن اتصافه بكونه مولاه" (حاشیہ جلالین)

جلالین میں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ کی تفسیر کی کہ ہماری کافروں پر دلائل قائم کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے میں امداد فرما اس لئے کہ تو ہمارا مولی ہے، مولی کی شان کریمی کے لائق ہی یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے خلاف اپنے غلاموں کی امداد فرماتا ہے، اس پر حاشیہ جلالین میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ "فانصرنا" کی فاء سے حاصل ہوا، جو سببیت پر دلالت کر رہی ہے کہ ہم تجھ سے اس لئے امداد کر رہے ہیں کہ تو "مولی" کی صفت سے متصف ہے، تیرا مولی ہونا سبب ہے ہمارے مطالبہ کا کہ ہم تیرے حضور دعاء کر رہے ہیں کہ تو ہماری امداد فرما۔ (جلالین مع حاشیہ)

''مولیٰ'' کے معانی:

مولی "مفعل" کے وزن پر ہے "ولی ،یلی" سے لیا ہوا ہے، مصدر بھی آتا رہتا ہے اور ظرف بھی۔ مولی کا معنیٰ'' مالک التدبیر'' اور ضرر کو دور کرنے والا اور فائدہ پہنچانے والا، سردار۔ مددگار چچا کا بیٹا۔ "مولی" اصل میں مصدر ہے پھر بطور اسم بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ (البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

طلباء کرام مختصر المعانی کی بحثوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سمجھیں، ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ میں طباق لفظی پایا گیا ہے، اور ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں طباق معنوی پایا گیا ہے۔ کیونکہ ''لها'' میں لام نفع کیلئے ہے۔ اور "علیها" میں "علی" ضرر کیلئے ہے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ میں "ما" کا تکرار تنبیہ اور تاکید کیلئے ہے۔ "امن" اور ''مؤمنون'' میں ''تجنیس'' پائی گئی ہے، جسے علم بدیع میں زیادہ طور پر جناس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ ''امن'' فعل ہے اور ''مؤمنون'' اسم ہے ہے اسلئے تجنیس مغایرۃ مکمل نام ہے۔ (از البحر المحیط)

فضائل سورة بقرة پر احادیث مبارکه:

اکثر مفسرین کرام نے سورۃ بقرہ کے آخر میں فضائل والی احادیث کو ذکر کیا ہے اگر چہ بعض کا ذکر سورۃ فاتحہ میں اور بعض کا ذکر سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی آچکا ہے لیکن حصول برکت کیلئے اختتام بھی احادیث مبارکہ سے۔

❁ "عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من قرأ بالآیتین من آخر سورة البقرة فی لیلة کفتاه" (بخاری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سورۃ بقرۃ کی آخری دو آیتوں کو (ہر) رات میں پڑھا تو وہ دونوں اس کی کفایت کریں گی۔ (از صابونی وابن کثیر)

❁ "عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ اعطیت خواتیم سورة البقرة من کنز تحت العرش لم یعطهن نبی قبلی" (مسند احمد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں عرش کے نیچے خزانہ سے عطاء کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں۔ (از صابونی وابن کثیر)

❁ عن عبداللہ قال لما اسری برسول الله ﷺ انتهی به الی سدرة المنتهی وهی فی السماء

السابعة. اليها ينتهي مايعرج من الارض فيقبض منها واليها ينتهي مايهبط من فوقها فيقبض منها قال "اذيغشى السدرة مايغشى" قال فراش من ذهب قال واعطى رسول الله ﷺ ثلاثا اعطى الصلوات الخمس واعطى خواتيم سورة البقرة وغفرلمن لم يشرك بالله من امته شيئامن المقمحات" (مسلم)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کو معراج کرایا گیا تو آپ کو سدرۃ المنتہیٰ پر لے جایا گیا جو ساتویں آسمان میں ہے، زمین سے چڑھنے والے یہاں تک ہی پہنچ سکتے ہیں اور یہاں ہی ان کو روک لیا جاتا ہے اور سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر والوں کو نیچے آنے میں بھی یہیں روک لیا جاتا ہے اور نیچے نہیں آنے دیا جاتا، رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی﴾ سدرہ کو ڈھانپ دیا جو ڈھانپ دیا۔ یعنی سونے کے فراش سے ڈھانپ دیا گیا، نبی کریم ﷺ کو تین چیزیں عطاء کی گئیں، پانچ نمازیں عطاء کی گئیں، اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات عطاء کی گئیں اور آپ کی امت میں سے جس نے شرک نہیں کیا ہوگا اس کے گناہوں کو وہ معاف کردے گا۔ (از صابونی وابن کثیر)

خواہ ان کے گناہوں کو ان کی توبہ سے معاف کردے یا اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادے، زیادہ مناسب یہ دوسرا معنی ہے، کیونکہ توبہ سے تو شرک بھی معاف ہو جاتا اس لئے کہ شرک سے توبہ ہی یہ ہے کہ شرک چھوڑ دے اور ایمان لے آئے۔

❁ "عن عقبة بن عامر الجهني قال قال رسول الله ﷺ اقرأالآيتين من آخر سورة البقرة فاني اعطيتهما من كنز تحت العرش" (مسند احمد)

عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھو (یعنی پڑھا کرو) بیشک یہ دونوں آیتیں مجھے عرش کے نیچے خزانہ سے عطاء کی گئیں۔

❁ عن حذيفةقال قال رسول الله ﷺ فضلنا على الناس بثلاث او تيت هذه الأيات من آخر سورة البقرة من بيت كنز تحت العر ش لم يعطها احد قبلي و لا يعطا ها احد بعدي" (ابن مردويه)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں تین چیزوں سے فضیلت دی گئی مجھے سورۃ بقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے خزانے سے عطاء کی گئیں نہ مجھ سے پہلے کسی کو دی گئیں اور نہ ہی میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔

❁ عن الحارث عن علي قال لاأرى احداعقل الاسلام ينام حتى يقرأآية الكرسي وخواتيم سورة البقرة فانهامن كنزاعطيه نبيكم من تحت العرش" (ابن مردويه)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں دیکھتا کسی شخص کو کہ وہ اسلام کی سمجھ رکھتا ہو وہ سو جائے یہاں تک کہ وہ آیۃ الکرسی پڑھ لے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات پڑھ لے بیشک یہ تمہارے نبی کو عرش کے نیچے خزانہ

سے عطاء کی گئیں۔

❁ "عن النعمان بن بشیر عن النبی ﷺ قال ان اللہ کتب کتابا قبل ان یخلق السماوات والارض بالفی عام انزل منہ آیتین ختم بھما سورۃ البقرہ ولا یقرأ بھن فی دار ثلاث لیال فیقر بھا شیطان" (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی نے ایک کتاب لکھی زمین وآسمانوں کی تخلیق سے پہلے دو ہزار سال اس سے دو آیتیں نازل کی گئیں جن کے ساتھ سورۃ بقرہ کو ختم کیا گیا وہ نہ پڑھی جائیں گی کسی گھر میں تین راتیں (مسلسل) کہ شیطان اس گھر کے قریب ہو۔ مطلب واضح ہے کہ زمین وآسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب (لوح محفوظ) لکھی گئی اسی سے سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتوں کو نازل کیا گیا جب وہ دو آیتیں کسی گھر میں تین راتیں مسلسل پڑھی جائیں تو اس گھر میں شیطان نہیں آتا۔

❁ "عن ابن عباس قال کان رسول اللہ ﷺ اذا قرأ آخر سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی ضحک وقال انھما من کنز الرحمن تحت العرش واذا قرا ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیO وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰیO ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیO﴾ استرجع واستکان" (ابن مردویہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے سورۃ بقرہ کی آخری آیات اور آیۃ الکرسی پڑھی تو آپ مسکرائے آپ نے فرمایا بیشک یہ دونوں عرش کے نیچے رحمان کے خزانے سے نازل کی گئیں اور آپ نے جب ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ اور ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی ☆ وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ☆ ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی﴾ پڑھا تو آپ نے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ اور اظہار عجز کیا۔ چونکہ ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ﴾ کا معنی یہ ہے اور جس شخص نے برا عمل کیا تو اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیO وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰیO ثُمَّ یُجْزٰہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰیO﴾ کا معنی یہ ہے اور بیشک انسان کیلئے نہیں مگر وہی جو اس نے کوشش کی اور بیشک اس کی کوشش کا بدلہ) کو اسے دکھا دیا جائے گا (یعنی اس کی کوشش اس کے سامنے آجائے گی) پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

یہی وجہ تھی آپ کے ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾ ان آیات کے بعد پڑھنے کی اور عجز کے اظہار کی کیونکہ آپ نے اپنی امت کو تعلیم دی کہ وہ اپنے حساب وکتاب سے ڈرتے رہیں۔

❁ عن معقل بن یسار قال قال رسول اللہ ﷺ اعطیت فاتحۃ الکتاب وخواتیم سورۃ البقرۃ من تحت العرش" (ابن مردویہ)

معقل بن یسار ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے کتاب اللہ کی سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے دی گئی ہیں۔

❁ عن ابن عباس قال بینا رسول الله ﷺ وعنده جبریل اذ سمع قیضا فوقه فرفع جبریل بصره الی السماء فقال هذا باب قد فتح من السماء ما فتح قط قال فنزل منه ملک فآتی النبی ﷺ فقال له البشر بنورین قد اوتیهما لم یؤتهما نبی قبلک فاتحه الکتاب وخواتیم سورة البقرة لن تقرأ حرفا منهما الا اوتیته" (رواه مسلم والنسائی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس جبریل تھے اسی دوران انہوں نے اپنے اوپر (آسمانوں میں) ایک چرچراہٹ سنی تو جبریل نے اپنی نظر کو آسمانوں کی طرف اٹھایا تو کہا آسمانوں میں ایک دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا فرمایا اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا تو اس نے کہا آپ خوش ہو جائیں دونوروں سے تحقیق وہ دونوں میں لے کر آیا ہوں جو آپ سے پہلے وہ دونوں نور کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے وہ فاتحہ الکتاب ہے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں ہرگز ان سے تم کوئی حرف نہیں پڑھو گے مگر میں اسے (اس کا بدلہ) دوں گا۔ (تمام احادیث ابن کثیر اور صابونی سے حاصل کی گئی ہیں)

آخر میں قرطبی سے اقتباس:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کے تحت لکھا ہے۔

" وفی معنی هذه الایة ما حکاه ابوهریرة رضی الله عنه قال ما وددت ان احدا ولدتنی امه الا جعفر بن ابی طالب فانی تبعة یو ما و اناجائع فلما بلغ منزله لم یجد فیه سوی نحی سمن قد بقی فیه الارة فشقه بین ایدینا فجعلنا نلعق مافیه من السمن والرب وهو یقول:

ما کلف الله نفسا فوق طاقتها　　　ولا تجود ید الا بما تجد

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے کسی ایک کے متعلق اس کی خواہش نہیں کی کہ کاش اس شخص کی ماں مجھے بھی جنتی سوائے جعفر بن ابی طالب کے (آگے واقعہ بیان کرتے ہیں) بیشک ایک دن میں ان کے ساتھ چلا میں بھوکا تھا جب وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے سوائے گھی کے ایک چمڑے کے برتن کے کچھ نہ پایا اس میں بھی گھی کے کچھ آثار تھے آپ نے اسے ہمارے سامنے نچوڑا ہم گھی اور کھجور کا شیرازہ اس میں سے چاٹنے لگے آپ فرمارہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا کوئی ہاتھ سخاوت نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو وہ پاتا ہے راقم نے بھی حضرت جعفر بن ابی طالب ﷛ کے اس شعر کے مطابق اپنی وسعت کے مطابق سورۃ بقرہ کی توضیحات وتشریحات معتبر تفاسیر سے نقل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور رسول اللہ ﷺ کی رحمت اور میرے والدین مرحومین اور میرے شیخ حضرت غلام محی الدین المعروف **بابو جی** گولڑوی رحمہ اللہ کی غیبی امداد اور استاذی المکرّم حضرت علامہ ابوالحسنات **محمد اشرف** سیالوی مدظلہ العالی کی شفقت ودعاء سے یہ کام ہوا اور ''**نہ من آنم کہ من دانم**'' کہاں رب تعالیٰ کا کلام کہاں میرے جیسا ہیچمدان''

عبد الرزاق بھترالوی حطاروی ابن قاضی عبد العزیز ابن قاضی فیض احمد ابن قاضی غلام نبی رحمہم اللہ''

اختتام بروز اتوار بعد از نماز فجر ۱۲ ذوالحجۃ ۱۴۲۵ھ ۲۳ جنوری ۲۰۰۵ء

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

بسم الله الرحمن الرحیم

سورۃ آل عمران: آج پیر بوقت سحر ۱۳ ذوالحج ۱۴۲۵ھ ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء کوترجمہ وتشریحات کا آغاز کررہا ہوں۔اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمائے کہ تفاسیر کے اقوال نقل کرنے میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو،اوررسول اللہ ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے اختتام کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین یا رب العلمین بحرمة سید المرسلین و ببرکة عباده الصالحین المقربین۔

سورۃ آل عمران کی وجہ تسمیہ:

جیسا کہ سورۃ بقرہ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ کسی ایک مضمون کی وجہ سے سورۃ کا نام رکھ لیا گیا۔اس سورۃ پاک میں آل عمران کو چن لینے اور برگزیدہ کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے،اس لئے اس کا نام ہی آل عمران رکھ دیا گیا۔عمران حضرت مریم کے والد کا نام ہے۔اس سورۃ پاک میں عمران کی زوجہ یعنی حضرت مریم کی والدہ،اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ کرنے کا ذکر ہے،اوراتنی تفصیل سے جتنا کسی اورسورۃ پاک میں نہیں

"وقد جعل هذا الاصطفاء دليلا على اصطفاء نبينا محمد ﷺ وجعله متبوعا لكل محب لله ومحبوب له"

آل عمران کے برگزیدہ بنانے کورسول اللہ ﷺ کے برگزیدہ بنانے پر دلیل بنایا گیا ہے۔یعنی جب آل عمران رب تعالیٰ کے چنے ہوئے پسندیدہ لوگ ہیں تو یقیناً سیدالانبیاء وسیدالکائنات بھی رب تعالیٰ کے چنے ہوئے پسندیدہ رسول ہیں۔اوراللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اوراللہ تعالیٰ کے محبوب لوگوں میں سے ہر شخص رسول اللہ ﷺ کا تابع بنایا اورآپ کو تمام کا متبوع بنایا گیا۔

سورۃ آل عمران کے اور نام:

﴿الزهراء﴾ "زہرا" کا معنی ہے آب وتاب والی کلی۔جس طرح پودے کی کلی پودے سے نمایاں نظر آتی ہے اور واضح ہوتی ہے اسی طرح اس سورۃ پاک میں عیسیٰ علیہ السلام کی شان واضح طور پر بیان کردی گئی جس سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق شکوک وشبہات کو دور کردیا گیا۔

﴿الامان﴾ **"لان من تمسک بما فیها أمن من الغلط فی شأنه"** اس سورۃ کا نام امان رکھا گیا،اس لئے کہ جس شخص نے اس سورۃ پاک کے مضامین سے دلائل حاصل کئے اوران پر ایمان رکھا تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق

شکوک وشبہات سے بچ جائے، اور غلطی سے محفوظ ہوکر امن میں رہے گا۔

(مجادلۃ) اس سورۃ پاک میں اہل نجران کا رسول اللہ ﷺ سے محبت ومباحثہ کی وجہ سے جدال کرنا بھی مذکور ہے، اسی وجہ سے اس سورۃ پاک کا نام مجادلہ بھی رکھا گیا ہے۔ (ماخوذ از تنویر الابصار)

سورۃ پاک میں کلمات وحروف کی تعداد:

یہ سورۃ مدنی ہے، علماء کرام کا اتفاق ہے کہ یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اس کے بیس رکوع دوسو آیتیں ۳۵۴۲ الفاظ اور ۱۵۳۳۶ حروف ہیں۔

اس سورۃ پاک کے مضامین:

محکمات اور متشابہات کا ذکر کیا گیا، کہ محکمات کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں لیکن متشابہات پر ایمان رکھیں اور ان کی تاویلوں کو تلاش نہ کریں۔ ان کی تاویلوں کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

- اور بیان کیا گیا کہ دنیا کا مال ودولت اور آسائش ناپائیدار چیزیں ہیں، حقیقی نفع مند تقوی ہے جس سے انسان کو ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔
- اور دین اسلام کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اسی پر چل کر انسان کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ضابطہ حیات ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جو حق ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں تو حق ہونے یا باطل ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا دین تو حق ہی ہے، اس میں معاذ اللہ باطل ہونے کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دین اسلام میں کوئی تغیر وتبدل نہیں، زمانہ کے حالات بدلنے سے دین اسلام کے فرائض وواجبات وسنن ومستحاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور اس طرح محرمات ومکروہات ہمیشہ حرام اور مکروہ ہی رہیں گے، ہاں صرف مباحات میں اپنی مرضی کے مطابق کام کیا جا سکتا ہے۔

- اسی سے لسانی، علاقائی، وطنی گروہ بندیوں کو ختم کرنے کا ثبوت ملتا ہے کہ جب تم سب مسلمان ہو تو تمہیں چاہئے کہ تم سب اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر متحد ومتفق ہو کر رہو، چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر، آپس میں اختلاف پیدا کر کے، ایک دوسرے سے لڑ کر اپنے آپ کو تباہ وبرباد نہ کرو، پہلے اپنے آپ کو مسلمان سمجھو، پھر پاکستانی، ایرانی، افغانی، کا فرق کرو، ایک وطن والو پہلے اپنے آپ کو پاکستانی سمجھو پھر سندھی، بلوچی، سرحدی اور پنجابی

سمجھو، اسی میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔

❁ اور بیان کیا گیا کہ بادشاہت عطاء کرنا یا بادشاہت واپس لے لینا رب تعالی کے دست قدرت میں ہے۔ اسی طرح کسی کو عزت دینا اور کسی کو ذلیل کرنا رب تعالی کے ملک واختیار میں ہے۔

❁ اس سورۃ پاک میں آل عمران کا ذکر تفصیلی طور پر بیان ہوا، حضرت مریم کی کفالت کرنے والے ان کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر بھی کیا گیا اور ان کی دعاء سے جو اللہ تعالی نے ان کو بیٹا عطاء کیا جس کا نام بھی خود اللہ تعالی نے "یحییٰ" رکھا۔ ان کا ذکر بھی اس سورۃ پاک میں موجود ہے۔ "البتہ ان کا نام اللہ تعالی نے رکھا" اس کا ذکر سورۃ مریم میں ہے۔

❁ اہل نجران کا نبی کریم ﷺ سے عیسی علیہ السلام کے متعلق مجادلہ، مباحثہ اور نبی کریم ﷺ کے دلائل اور مباہلہ کا ذکر بھی اسی سورۃ میں ہے۔

❁ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کے دعوی کہ وہ یہودی تھے اور عیسائیوں کے دعوی کہ وہ عیسائی تھے کا رد کیا گیا ہے کہ یہ تمہارے نظریات باطل ہیں وہ نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے، بلکہ وہ دین حنیف پر قائم تھے۔

❁ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنے آپ کو رب تعالی کے عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا، خوہ وہ زمین کی پرائی کے برابر بھی فدیہ کیوں نہ دے، اس کا فدیہ قبول نہیں کیا جاسکے گا۔

❁ اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے جو اپنے آپ کو پسند ہو، ردی اور نکما مال نہ خرچ کیا جائے۔

❁ مکہ میں سب سے پہلے بننے والے گھر کعبہ شریف، جو برکت والا اور ہدایت ہے، یہ بھی اسی سورۃ میں مذکور ہے۔

❁ اللہ تعالی کے دین کی رسی کو متفق اور متحد ہو کر تھامنے اور تفرقہ پیدا نہ کرنے کا ذکر بھی اسی سورۃ پاک میں موجود ہے۔

❁ اور اس سورۃ پاک میں اچھے کاموں کا حکم دیا گیا اور برے کاموں سے روکنے کا حکم دیا گیا۔

❁ اور جنگ بدر اور جنگ بدر میں فرشتوں کی امداد کا ذکر کیا گیا ہے۔

❁ جنگ احد اور اس میں نبی کریم ﷺ کے زخمی ہونے اور صحابہ کرام کیز خمی ہونے اور شہید ہونے اور شہید ہونے والوں کی جاودانی زندگی کا ذکر کیا گیا۔ یہ مختصر خاکہ تھا جو پیش کیا گیا۔ تفصیل انشاء اللہ آیات کے تحت ہی آئے گی۔

تنبیہ: بعض حضرات نے اس سورۃ کی دوسو آیتیں بیان کی ہیں، انہوں نے "بسم اللہ" کو بھی سورۃ

کی آیۃ کہا ہے بعض حضرات نے اس سورۃ کی آیتیں ایک سوننانوے بیان کی ہیں، ان کے نزدیک ''بسم اللہ'' صرف دوسورتوں میں فرق کے لئے آئی ہوئی ہے، سورۃ کی جزء نہیں۔ (صاوی)

فائدہ جلیلہ: وردفی فضل هذه السورة انها امان من الحيات و كنز للفقير و انه يكتب لمن قرأمنها ان فی خلق السماوات والارض الی آخرها آخر الليل ثواب من قام الليل كله''

اس سورۃ پاک کی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو یہ سورۃ پڑھتا ہے وہ سانپوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور فقیر کیلئے یہ خزانہ ہے۔ یعنی فقیر پڑھے تو فقر سے اسے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور رات کے آخری حصہ میں یعنی سحر کے وقت اس سورۃ کی آخری آیات (اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ) سے لے کر سورۃ کے آخر تک پڑھتا ہے اسے ایک سال کی رات کی نفلی عبادت کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ (صاوی)

زهراء نام پر حدیث پاک:

عن ابی امامة الباهلی قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اقرء واالقرآن فانه ياتی يوم القيامة شفيعا لأصحابه اقرء والزهراوين البقرة وسورة آل عمران فانهما يأتيان يوم القيامة كانهما غمامتان او كانهما غيايتان او كانهما فرقان من طير صواف تحاجان عن اصحابهما اقرء وا سورة البقرة فان اخلها بركة وتركها حسرة ولا يستطيعها البطلة''

(رواہ مسلم)

ابوامامہ باہلی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ قرآن پڑھو، بیشک قیامت کے دن یہ پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا، پھر فرمایا دوسورتیں جن کے نام زہرا ہیں وہ پڑھو، وہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہیں۔ بیشک یہ دونوں قیامت کے دن (پڑھنے والے کے سر پر) بادل کی طرح سایہ کئے ہوں گی، یا صف بنا کر اڑنے والے پرندوں کی دو جماعتوں کی طرح پڑھنے والے پر سایہ کئے ہوں گی، اور پڑھنے والوں کیلئے رب تعالی سے بخشش کیلئے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ بقرۃ پڑھو، بیشک اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور اس پر جادوگر جادو کی طاقت نہیں رکھتے۔

''الغمام'' اسحاب الملتف'' گھنے بادلوں کو غمام کہا جاتا ہے۔ ''الغياية'' اذا كانت قريبا من الراس'' جب گھنے بادل سر کے قریب سائبان کی طرح سایہ کئے ہوئے ہوں تو ان کو ''غیایۃ'' کہا جاتا ہے۔

''والمعنی ان قارئهما فی ظل ثوابهما'' معنی یہ ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کو پڑھنے والا شخص

ان کے ثواب کے سایہ میں ہوگا۔ "وقال معاویة وبلغنی ان البطلة السحرة" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حدیث شریف میں جو لفظ "البطلة" استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے جادوگر۔ یعنی سورۃ بقرۃ کی تلاوت کرنے والے پر جادوگر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

زہراء نام رکھنے کی تین وجوہ:

(۱) "زہراء" کا لفظ زھر اور زھرۃ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی آب وتاب والا ہونا، روشن ہونا۔

"انھما النیرتان ولھدایتھما قارئھما بما یزھرله من انوارھما ای من معانیھما"

یہ دونوں سورتیں بھی منور ہیں اسی لئے ان کو زہراء کہا گیا ہے کیونکہ یہ اپنے معانی "جو انوار کی حیثیت رکھتے ہیں" سے ہدایت دیتی ہیں۔

(۲) ان وجوہ میں سے دوسری وجہ یہ ہے "ویترتب علی قراء تھما من النور التام یوم القیامة"

ان دونوں سورتوں کو پڑھنے والے شخص کو قیامت کے دن کامل نور حاصل ہوگا۔

(۳) ان دونوں سورتوں کو زہراء کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ ان دونوں میں اسم اعظم کا ذکر ہے (جو نور اعظم ہے) جیسا کہ ابوداود وغیرہ نے ذکر کیا ہے، اور ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے۔

عن اسماء بنت یزید ان رسول اللہ ﷺ قال ان اسم اللہ الاعظم فی ھاتین الآیتین والھکم الہ واحد لاالہ الاھو الرحمن الرحیم" والتی فی آل عمران "اللہ لاالہ الاھو الحی القیوم"

اسماء بنت یزید کہتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک اللہ تعالی کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے۔ ایک آیۃ ﴿وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾ میں، (یعنی یہ آیۃ سورۃ بقرہ کی ہے) اور وہ آیۃ جو سورۃ آل عمران کی ہے ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (اس میں بھی اسم اعظم پایا گیا ہے، اس وجہ سے دونوں کا نام زہراء رکھا گیا ہے) (قرطبی)

فضائل سورۃ آل عمران:

"عن ابن عباس قال نزلت سورة آل عمران بالمدینة" (اخرج البیھقی فی الدلائل)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ آل عمران مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔

❁ واخرج الطبرانی فی الاوسط بسند ضعیف عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من قرأ السورة التی یذکر فیها آل عمران یوم الجمعة ﷺ وملائکته حتی تغیب الشمس"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے وہ سورۃ جمعہ کے دن پڑھی جس میں آل عمران کا ذکر ہے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سورج کے غروب ہونے تک اس پر رحمتیں بھیجتے ہیں۔

❁ واخرج سعید بن منصور والبیهقی فی شعب الایمان عن عمر بن الخطاب من قرأ البقرة وآل عمران والنساء کتب عند الله من الحکماء"

حضرت عمر بن الخطاب ﷜ فرماتے ہیں جس شخص نے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کو پڑھا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حکماء میں لکھ دیا جاتا ہے۔

❁ واخرج الدارمی ومحمد بن نصر والبیهقی فی شعب الایمان عن ابن مسعود قال من قرأ آل عمران فهو غنی والنساء محبرة یعنی مزینة"

حضرت ابن مسعود ﷜ فرماتے ہیں جس شخص نے سورۃ آل عمران پڑھی وہ غنی ہے، اور سورۃ نساء مزین ہے، (زینت دینے والی)

اس روایت میں "محبرة ای مزینة" کو اسم فاعل اور اسم مفعول کے صیغے بنائے جا سکتے ہیں، اسی وجہ سے راقم نے دونوں معانی تحریر کر دیئے ہیں۔

❁ واخرج الدارمی وابو عبید فی فضائله والبیهقی فی شعب الایمان عن ابن مسعود قال نعم کنز الصعلوک سورة آل عمران یقوم بها الرجل من آخر اللیل"

حضرت ابن مسعود ﷜ فرماتے ہیں فقیر کا بہتر خزانہ سورۃ آل عمران ہے کہ اس نے رات کے آخری حصہ میں (بوقت سحر) اس کی تلاوت کو جاری رکھا۔

❁ واخرج سعید بن منصور عن ابی عطاف قال اسم آل عمران فی التوراة الطیبة"

ابو عطاف کہتے ہیں توراۃ میں سورۃ آل عمران کا نام طیبہ ہے۔

❁ واخرج ابن ابی شیبة فی المصنف عن ابن عباس ان الشمس انکسفت وهو امیر علی البصرة فصلی رکعتین قرأ فیهما بالبقرة وآل عمران"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ بصرہ کے جب امیر (حاکم) تھے تو سورج کو ایک مرتبہ گرہن لگ گیا تو آپ ایک رکعت میں سورۃ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۃ آل عمران پڑھ کر نماز کسوف پڑھائی۔

❁ واخرج ابن ابی شیبة عن عبدالملک بن عمیر قال قرأ رجل البقرة وآل عمران

فقال کعب قد قرأ سورتین ان فیهما للاسم الذی اذا دعی به استجاب"

عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں ایک شخص نے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران پڑھی، تو حضرت کعب نے کہا اس شخص نے وہ دو سورتیں پڑھی ہیں جن میں وہ اسم (اسم اعظم) جب وہ پڑھ کر دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس دعاء کو شرف قبولیت عطاء فرماتا ہے۔ (روایات فضائل ماخوذ از درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

(1) اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا۔

(2) اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر تبصیر الرحمٰن نے ہر سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ کا معنی اسی سورۃ کے مناسبت سے لکھا ہے۔

"(بسم الله) لجامع للکمالات اللطفیة و القهریة اذلطف بعیسی قوما آمنوا برسالته وقهربه قوما کذبوه او جعلوه الها اوولده (الرحمن) بافاضة الحیاة و افادة القوام وارسال الرسل و انزال الکتب (الرحیم) بافاضة العلم و التوفیق للایمان بالکل والعمل بالمتاخر" (تبصیر الرحمن)

شروع اللہ کے نام سے جو صفات لطفیہ اور قہریہ کا جامع ہے۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لایا ان کو اپنی مہربانی اور لطافت کا مستحق ٹھہرایا۔ اور جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی یا ان کو معبود مانا، یا ان کو خدا کا بیٹا مانا ان کو اپنے قہر کا مستحق ٹھہرایا، (وہ رحمٰن ہے) یعنی نہایت مہربان ہے کہ اس نے زندگی عطاء کی اور انسان کی جسمانی ساخت کو درست منایا اور رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر انسانوں کو ہدایت دی (اور وہ رحیم ہے) یعنی رحم کرنے والا ہے کیونکہ علم اسی نے عطاء کیا ہے اور ایمان کی توفیق اسی نے عطاء کی ہے کہ بندے نے تمام ایمانیات پر ایمان لایا پھر عمل کی بھی اسی نے توفیق عطاء کی۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿الٓمٓ ٥﴾ (آل عمران آیۃ نمبر ۱)

یہ حروف مقطعات جن کی مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے۔ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ زیادہ تفصیل دیکھنا چاہیں تو نجوم الفرقان جلد دوم سورۃ بقرہ کی ابتداء میں دیکھیں۔

﴿الٓمٓ ٥ اللّٰہُ﴾ کو ایک قراءت میں علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا گیا ہے۔ یعنی میم کو ساکن کر کے اور لفظ اللہ کے ہمزہ کو نصب دے کر پڑھا گیا ہے۔ اور دوسری قرائت میں ملا کر بھی پڑھا گیا ہے، کہ میم کو فتحہ دے کر اور لفظ اللہ کے ہمزہ وصل کو ساقط کر کے پڑھا گیا ہے۔ (از صاوی)

ماقبل سے تعلق:

سورۃ بقرہ میں بعض چیزوں کو مجمل طور پر ذکر فرمایا تھا، اور اس سورۃ آل عمران میں ان کی تفصیل بیان کر دی گئی۔ سورۃ بقرہ حجت قائم کرنے کے درجہ میں ہے اور سورۃ آل عمران شبہات کو زائل کرنے کے درجہ میں ہے۔ اسی وجہ سے کئی مضامین کا تکرار پایا گیا۔ کتاب اللہ کا ذکر سورۃ بقرہ میں بھی ہے اور سورۃ آل عمران میں بھی ہے اور دونوں سورتوں میں پہلی کتابوں اور ان کی تصدیق اور سیدھی راہ کی ہدایت کا ذکر موجود ہے۔ اور آیۃ کریمہ ﴿قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ﴾ سورۃ بقرہ میں بھی ہے اور سورۃ آل عمران میں بھی۔ بہت معمولی الفاظ کا فرق جو ان شاء اللہ آگے آ جائے گا۔ سورۃ بقرہ میں انسانوں کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ آل عمران میں ان کو ماؤں کی رحموں (بچہ دانیوں) میں صورتیں عطاء کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء کا ذکر کیا گیا، یہاں آپ کی اولاد خصوصاً حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء کو ذکر کیا گیا۔ سورۃ بقرہ میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کیا گیا جو بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا ہوئے اور سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا بیان ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے، ان دونوں میں کامل مناسبت پائی جانے کی وجہ سے ہی رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا آدم علیہ السلام کی پیدائش کی مثل قرار دیا۔ ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ مَثَلَہٗ کَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ بیشک ان (عیسیٰ) کی مثال، آدم علیہ السلام کی ہی مثال ہے۔

آدم علیہ السلام ظاہری جسم کے لحاظ پر سب سے پہلے ہیں اور آپ کی اولاد آپ کی فرع ہے اور بعد میں، اسی وجہ سے سورۃ بقرہ میں آدم علیہ السلام کا ذکر ہے اور سورۃ آل عمران میں آپکی اولاد کا ذکر ہے، آدم علیہ السلام کا ذکر پہلے کر کے لوگوں

کو سوچنے کا موقع فراہم کر دیا گیا کہ وہ ذات باری تعالیٰ جس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ بغیر باپ اور ماں کے کسی کو پیدا کر سکتا ہے تو یہ کیسے نہ ہو سکے کہ وہ بغیر باپ کے کسی کو پیدا کر دے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

حق تو یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نصیحت حاصل کی جاتی اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر ایمان لایا جاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے، لیکن افسوس کی بد بخت یہود نے پھر بھی طعنہ زنی کی یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ ''ولد الزنا'' کہہ دیا۔ **تعجب ھے** یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ پر کہ وہ یہودی جو آج تک عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو نہیں تسلیم کر پائے، عیسائی ان کے یار بنے بیٹھے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے ''الکفر ملۃ واحدۃ'' مسلمانوں کے خلاف سب کا فر ایک ہی ہیں۔ (راقم)

بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں سورتوں کے مضامین میں تلازم پایا گیا ہے کہ سورۃ بقرہ میں آگ کا ذکر کیا گیا ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ o﴾ کہ وہ کافروں کیلئے تیار کی گئی، اور اس میں متقین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور سورۃ آل عمران میں ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ o﴾ ذکر فرمایا، جس میں متقین کیلئے جنت کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی ابتداء اور سورۃ آل عمران کی انتہاء میں بھی مناسبت پائی گئی ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ میں متقین کا ذکر کیا پھر فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o﴾ وہی ہیں کامیاب ہونے والے۔

اور سورۃ آل عمران کو ختم کیا گیا ہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o﴾ اور ڈرو اللہ سے تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ اور سورۃ آل عمران کی آخری آیات میں ذکر کیا گیا ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾، اور سورۃ بقرہ میں جب آیہ کریمہ نازل ہوئی ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے گا) تو یہودیوں نے کہا۔ "**یا محمد** (ﷺ) **افتقر ربک یسأل عبادہ القرض**" (اے محمد! تمہارا رب مقروض ہو گیا جو اپنے بندوں سے قرض طلب کر رہا ہے)

تو ان کا رد آل عمران میں کیا ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ (تحقیق سنا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی باتوں کو جنہوں نے کہا بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں) اور سورۃ بقرہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ کا ذکر کیا گیا، اور سورۃ آل عمران میں اس کی قبولیت کا ذکر کیا گیا ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ دونوں سورتوں میں رابطہ و تعلق کافی حد تک واضح ہو گیا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (آل عمران آیۃ نمبر ۲)

(1) اللہ ہے جس کے سواء کسی کی پوجا نہیں آپ زندہ ہے اوروں کو قائم رکھنے والا۔

(2) اللہ ہے کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اس کے، وہ خود (ہمیشہ کیلئے) زندہ ہے۔ اوروں کو قائم رکھنے والا ہے۔

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کو نصاری کا رد کرنے کیلئے نازل کیا گیا کیونکہ انہوں نے عیسی علیہ السلام کو رب مانا تھا، تو رب تعالی نے فرمایا "اللہ وہ ہے جو خود ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اور دوسروں کو قائم کرنے والا ہے" عیسی علیہ السلام میں یہ صفات نہیں پائی گئیں، وہ تو اللہ تعالی کی مخلوق ہیں۔ اس سورۃ پاک میں کئی آیات کا شان نزول نجران کے وفد کا آنا اور بحث ومباحثہ کرنا اور نبی کریم ﷺ کا ان کے جوابات دینا ہے۔ نجران قبیلہ کا وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، جو ساٹھ سواروں پر مشتمل تھا، چودہ ان کے سردار تھے، اور تین ان میں سے سرکردہ حکام تھے،

"احدهم امیر وصاحب مشورتهم العاقب واسمه عبدالمسیح" ان میں سے ایک شخص ان کا حاکم اور صاحب مشورہ تھا، جس کا نام عبدالمسیح تھا اور لقب عاقب تھا۔ "ولانیهم وزیرهم ومشیرهم السید واسمه الایهم" اور دوسرا ان میں سے ان کا وزیر اور مشیر اور سردار تھا جس کا نام ایہم تھا۔ "ولالثهم حبرهم واسقفهم وصاحب مدارسهم ابو حارثة بن علقمة احد نبی بکربن وائل" اور تیسرا ان میں سے ان کا صاحب علم، سردار، ان کے مدارس کا نظام چلانے والا ابوحارثہ بن علقمہ تھا جو بکر بن وائل قبیلہ سے تھا۔

آجکل کی اصطلاح میں ان تینوں کے درجے یہ تھے، (۱) وزیر اعظم (۲) وزیر مالیات (۳) وزیر تعلیم۔

جب وہ لوگ نجران سے اپنی سواریوں پر سوار ہو کر چلے، تو ابوحارثہ کی خچر چلتے چلتے پھسل گئی، اس کے ساتھ ہی ایک طرف اس کا بھائی کرز بھی اپنی سواری پر چل رہا تھا "فقال کرز تعسا للابعد" کرز نے کہا دور رہنے والے کی ہلاکت ہو، اس نے معاذ اللہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ لئے "فقال له ابو حارثة بل تعست امک" ابوحارثہ نے کہا بلکہ تمہاری ماں ہلاک ہو جائے، تباہ و برباد ہو جائے، کرز نے بڑی حیرانگی سے پوچھا اے میرے بھائی! یہ کیا؟ قال انه واللہ النبی (ﷺ) الذی کنا ننتظرہ" تو ابوحارثہ نے کہا قسم ہے اللہ تعالی کی وہ آخری نبی ہیں جن کی

ہم انتظار کر رہے تھے۔ فقال له کرز فما یمنعک عنه وانت تعلم هذا'' کرز نے ابوحارثہ کو کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ''جب تو مانتا بھی ہے کہ وہ سچے نبی ہیں اور وہی نبی ہیں جن کا ہم انتظار کر رہے تھے'' تم ایمان نہیں لاتے؟ ابوحارثہ نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری قوم کے مالدار لوگ ہمیں ٹیکس دیتے ہیں، اور ہماری عزت کرتے ہیں، اگر ہم ایمان لے آئے تو وہ لوگ ہمیں چھوڑ جائیں گے اس سے ہمارا بڑا نقصان ہوگا۔ ''فوقع ذلک فی قلب کرز واضمره الی ان اسلم'' کرز کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اس نے دل ہی دل میں یہ سوچ لیا کہ میں اسلام قبول کرلوں گا۔ یہ لوگ عصر کی نماز کے بعد مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی میں داخل ہوئے، ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا ٹھیک ہے ان کو نماز پڑھنے دو، یہ لوگ بہت فاخرانہ لباس پہنے ہوئے تھے، یعنی یمنی کپڑا جو بہت قیمتی تھا اس کی قمیصیں اور چادریں ان کی تھیں۔

''یقول بعض من رآهم من اصحاب النبی ﷺ ما رأینا وفدا مثلتهم''

اسی وجہ سے ان کی شان وشوکت اور فاخرانہ لباس کو دیکھ کر صحابہ کرام میں سے کسی صحابی نے کہا کہ آج تک آنے والے وفود میں سے کوئی وفد ان جیسا ہم نے نہیں دیکھا، وہ لوگ جب نماز ادا کر چکے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کے تین سرکردہ لوگوں نے کلام شروع کیا۔ ''فقالوا تارة عیسی هو الله'' کبھی وہ کہتے عیسیٰ ہی اللہ ہے۔ کیونکہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، مادرزاد اندھے کو نظر دیتا ہے، بیماروں کو شفا دیتا ہے۔ اور غیبی خبریں دیتا ہے، کیچڑ سے پرندہ بنا کر اس میں روح پھونک کر اسے اڑا دیتا ہے یہ سب صفات دلالت کرتی ہیں کہ وہی اللہ ہے۔ ''وتارة اخری هو ابن الله'' کبھی وہ کہتے عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، کیونکہ اس کا جب کوئی باپ نہیں تو ''معاذ الله'' اس کا باپ اللہ ہے اس لئے وہ ''ابن الله'' (اللہ کا بیٹا) ہے۔ ''وتارة اخری انه ثالث ثلاثة'' اور کبھی وہ کہتے کہ تین خداؤں میں سے ایک خدا عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لئے جمع کے صیغے ذکر کرتا ہے۔ ''قلنا'' ''نعلم'' ''فعلنا'' وغیرہ، اگر صرف ایک خدا ہوتا تو رب تعالیٰ اپنے لئے واحد کے صیغے استعمال فرماتا، یوں ذکر ہونا چاہئے تھا، قلت، فعلت، اعلم، وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے ان کے کلام کو سن کر ارشاد فرمایا ''اسلموا'' ''تم اسلام لے آؤ۔ ''قالوا اسلمنا قبلک'' انہوں نے کہا ہم تم سے پہلے ہی اسلام لا چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، اگر تم سچے ہوتے، تمہارا ایمان ہوتا تو رب تعالیٰ کی اولاد تم نہ مانتے۔ ''قالوا ان لم یکن ولد الله فمن ابوه'' وہ کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد نہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا، تم یہ بتاؤ کہ اولاد کو والدین سے مشابہت حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ کہنے لگے ہاں اولاد کو والدین سے مشابہت تو حاصل ہوتی ہے۔

"قال الستم تعلمون ان ربنا حی لایموت و ان عیسی یأتی علیه الفناء قالوا بلی"

آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ بیشک ہمارا رب زندہ ہے وہ مرے گا نہیں ۔اور عیسی علیہ السلام پر وفات آنی ہے، انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔

"قال علیہ السلام الستم تعلمون ان ربنا قیوم علی کل شیٔ یحفظه ویرزقه قالوا بلی، قال علیہ السلام فهل یملک عیسی من ذلک شیأ قالوا لا"

آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ہمارا رب تو ہر چیز کو قائم کرنے والا ہے، اور ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے اور ہر ایک کو رزق دیتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، آپ نے فرمایا کیا عیسی علیہ السلام میں یہ صفات پائی جاتی ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں ۔ان میں تو یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔

فقال علیہ السلام الستم تعلمون ان الله تعالی لایخفی علیه شیٔ فی الارض ولا فی السماء قالوا بلی قال علیہ السلام فهل یعلم عیسی من ذلک الاما علم قالوا بلی"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں کہ بیشک اللہ تعالی پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کی عیسی علیہ السلام بغیر اللہ تعالی کے عطاء کئے ہوئے علم کے خود ذاتی طور کچھ نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا ایسا ہی ہے۔

"فقال علیہ السلام الستم تعلمون ان ربنا صور عیسی فی الرحم کیف شاء و ان ربنا لایأکل ولا یشرب"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ بیشک ہمارے رب نے عیسی علیہ السلام کو رحم (بچہ دانی) میں صورت عطاء فرمائی جیسے چاہا؟ انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ ہمارا رب نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے؟ تو انہوں نے کہا ہاں ایسے ہی ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ عیسی علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں اسی طرح رہے جس طرح دوسرے بچے اپنی ماؤں کے پیٹوں میں رہتے ہیں اور آپ کو آپ کی ماں نے اسی طرح جنا جس طرح اور عورتیں اپنے بچوں کو جنتی ہیں، کیا عیسی علیہ السلام کو باقی بچوں کی طرح غذا نہیں دی گئی، کیا آپ نے کھایا، پیا نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں ایسے ہی ہے۔"قال علیه السلام فکیف یکون هذا کما زعمتم فسکتوا" نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیسے ہے یہ جو تم نے گمان کیا (عیسی علیہ السلام خدا ہیں یا خدا کے بیٹے) تو وہ خاموش ہو گئے ۔نبی کریم ﷺ نے ان کے دلائل کے جوابات دیے اور ان کا رد کیا، اس سورۃ پاک میں اسی سے زائد آیات کریمہ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے، جو تفصیلا ان شاء اللہ مذکو ہوں گی۔ (تفسیر ابی السعود، معالم التنزیل للبغوی، بیر)

فائدہ: واعلم ان هذه الرواية دالة على ان المناظرة في تقرير الدين وازالة الشبهات حرفة الانبياء عليهم السلام"

ابھی جو روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ نے نجران کے اہل کتاب کے وفد کو دلائل دے کر ثابت کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ اور مخلوق ہیں، نہ خدا ہیں اور نہ خدا کا بیٹا۔

تو اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ باطل راہ پر چلنے والوں کے شبہات کو زائل کرنا اور دین اسلام کی حقانیت پر دلائل قائم کرنا سنت انبیاء کرام ہے، اسی کا نام مناظرہ ہے۔ صرف اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے اپنی غلط راہ پر بھی جھوٹے دلائل قائم کرنا اہل کتاب کا طریقہ ہے، یہی مجادلہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

خوبصورت انداز پر دلیل:

"الحی القیوم" سے دلیل اس پر قائم کی گئی کہ اے نصاریٰ کیا تم اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تنازع کرتے ہو یا کہ معرفت نبوت میں تمہارا جھگڑا ہے۔

"فان كان النزاع في معرفة الاله وهو انكم تثبتون له ولدا وان محمد الايثبت له ولدا"

اگر تمہارا جھگڑا اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ہے کہ تم اس کی اولاد ثابت کرتے ہو، تو بیشک محمد ﷺ اس کی اولاد نہیں ثابت کرتے قطعی طور پر عقلی دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔

"فانه قد ثبت بالبرهان انه حي قيوم والحي القيوم يستحيل عقلا ان يكون له ولد"

بیشک یقینی دلیل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے، اور وہ ذات جو ہمیشہ کیلئے زندہ ہے، اور تمام مخلوق کو قائم رکھنے والا ہے، اس کی اولاد کا ہونا عقلاً محال ہے۔ اور اگر تمہارا جھگڑا ہے نبوت میں تو وہ بھی باطل ہے (آنے والی آیۃ میں توراۃ و انجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے)

اسلئے کہ تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل کو نازل فرمایا

"فهو بعينه قائم في محمد ﷺ وماذاك الابالمعجزة وهو حاصل ههنا فكيف يمكن منازعته في صحة النبوة"

تو اسی ذات نے محمد ﷺ پر قرآن پاک کو نازل فرمایا ہے، آسمانی کتب کا نازل ہونا انبیاء کرام کا معجزہ ہے، وہ حضور ﷺ کو بھی حاصل ہے۔ تو صحت نبوت میں تمہارا جھگڑا کرنا کیسے ممکن ہے؟

"فهذا هو وجه النظم وهو مضبوط حسن جدا" یعنی کتنی خوبصورت اور کتنی مضبوط دلیل رب تعالیٰ نے اپنی الوہیت

اور وحدانیت پر قائم فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو کتنے خوبصورت انداز پر اور پختہ دلیل سے ثابت کیا گیا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

حی قیوم کی اولاد کیوں نہیں ہو سکتی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ حی قیوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ واجب الوجود ہو۔ "وکل ماسواه ممکن لذاته محدث حصل تکوینه وتخلیقه وایجاده" اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے ماسواء ہیں وہ سب ممکن لذاتہ ہیں۔ حادث ہیں اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے اور اس کی تخلیق اور موجود کرنے سے ہی مخلوق موجود ہوئی ہے۔ واجب لذاتہ وہ ہے جو خود بخود موجود ہو، اور غیروں کو موجود کرے، اور ممکن لذاتہ وہ جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہو خود بخود موجود نہ ہو۔ جب ہر چیز حادث ہے اور مخلوق ہے اور اس کے موجود کرنے سے موجود ہوئی ہے تو "امتنع کون شئی منها ولداله والها" مخلوق میں کوئی چیز نہ تو اللہ تعالیٰ کی اولاد ہو سکتی ہے اور نہ ہی خود الٰہ ہو سکتی ہے، حادث کا واجب لذاتہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (مریم آیۃ نمبر ۹۳)
آسمانوں اور زمینوں میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

"حـی قیوم" کی اولاد نہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ "الٰہ (معبود) کیلئے جب ضروری ہو گیا کہ وہ حی قیوم ہو، تو "وثبت ان عیسی ما کان حیا قیوما لانه ولد و کان یأکل ویشرب ویحدث" اسی سے ثابت ہو گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام "حی قیوم" نہیں تھے، اسلئے کہ جو ان کو خدا کا بیٹا کہتے تھے وہ یہ مانتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کھاتے اور پیتے تھے، اور حادث تھے کیونکہ وہ پیدا ہوئے تھے "وزعموا انه قتل" اور ان کے گمان کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو شہید بھی کر دیا گیا تھا، وہ اپنے آپ کو قتل سے نہیں بچا سکے تھے "فثبت انه ما کان حیا قیوما" ثابت ہوا کہ وہ "حی قیوم" نہیں تھے، کیونکہ "حی قیوم" کیلئے ضروری ہے کہ وہ واجب الوجود ہو، کھانے، پینے سے پاک ہو، نہ اس کی ابتداء ہو اور نہ انتہاء ہو لھذا کھانے، پینے والا اور پیدا ہونے والا اور فنا ہونے والا نہ "حی قیوم" ہے اور نہ ہی خدا کا بیٹا ہے اور نہ ہی مستقل خدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی خدا کا شریک ہو سکتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی نبوت اور قرآن پاک کی حقانیت پر دلیل:

"وهو مایتعلق بالنبوة فقد ذکره الله ههنا فی غایة الحسن ونهایة الجودة"

نبوت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے نہایت خوبصورت اور عمدہ دلیل پیش فرمائی، پہلے یہ ارشاد فرمایا ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ آپ پر کتاب حق سے نازل فرمائی۔ یہ ایک دعوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اپنے دعوی کے صحیح ہونے اور یہود و نصاری کو سوچنے کا موقع فراہم کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ اس نے اس سے پہلے توراۃ اور انجیل اتاری لوگوں کو راہ دکھائی" جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ توراۃ اور انجیل دونوں آسمانی کتابیں ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا، اور اللہ تعالیٰ نے توراۃ و انجیل کو معجزہ بنایا ہے کہ وہ حق اور باطل میں فرق کرنے والی ہیں۔

"والمعجز لما حصل به الفرق بين الدعوى الصادقة والدعوى الكاذبة كان فرقالامحالة"
معجزہ کے ذریعے سچے اور جھوٹے دعوی میں فرق کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے معجزہ کو "حق و باطل میں فرق کرنے والا" کہا جاتا ہے،

"ثم ان الفرقان الذى هو المعجز كما حصل فى كون التوراة والانجيل نازلين من عندالله فكذلك حصل فى كون القرآن نازلامن عند الله"

پھر فرقان (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا) جب معجزہ ہے جو توراۃ و انجیل میں پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، اسی قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، جو معجزہ ہے اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔

جب توراۃ و انجیل اور قرآن پاک کے نازل ہونے کی وجہ ایک ہے تو اے یہود و نصاری یا تو براہمہ فرقہ کی طرح تم سب کتابوں کا انکار کرو، یا مسلمانوں کی طرح سب کی تصدیق کرو کہ سب ہی آسمانی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں۔ "واما قبول البعض ورد البعض فذلك جهل وتقليد" لیکن بعض کو قبول کرنا اور بعض کو رد کرنا جہالت و تقلید ہے، (یہ خیال کریں کہ اس مقام پر باطل کی تقلید سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے منع فرمایا ہے، نہ کہ حق کی اور وہ بھی فروعی مسائل میں۔ علامہ رازی رحمہ اللہ کہیں اصول میں تقلید کی ممانعت پر اشارہ کرتے ہیں، اور کہیں باطل کی تقلید کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اس قسم کے الفاظ سے غیر مقلدین لوگ دوسرے جاہل لوگوں کو بھٹکاتے رہتے ہیں اسلئے تقلید باطل اور تقلید حق، اور تقلید اصول اور تقلید فروع کو مدنظر ضرور رکھا جائے، باطل کی تقلید ناجائز ہے اور اصولی عقائد کی تصدیق ناجائز ہے۔ اور حق کی تقلید اور وہ بھی فروعی مسائل میں جائز ہے، بلکہ ضروری ہے) (راقم)

پھر رب تعالیٰ نے جب عمدہ اور مستحسن طریقہ سے اپنی معرفت اور اپنے نبی کریم ﷺ کی معرفت اور قرآن پاک کے سچے ہونے کی معرفت کرادی۔

"ولم یبق بعد ذلک عذر لمن ینازعه فی دینه فلاجرم اردفه بالتهدید والوعید فقال(ان الذین کفروا بآیات الله لهم عذاب شدید والله عزیز ذوانتقام")

تو اس کے بعد ان لوگوں کا کوئی عذر باقی نہ رہا جو اس کے دین میں جھگڑا کرتے تھے، تو اسی وجہ سے رب تعالی نے اس کے بعد کفار کو سخت عذاب کی دھمکی دی اور بتایا کہ اسے عذاب دینے سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ وہ غالب انتقام لینے والا ہے۔

"فقد ظهر انه لا یمکن ان یکون کلام اقرب الی الضبط والی حسن الترتیب وجودة التالیف من هذاالکلام"

ابھی تک جو بیان کیا ہے اسی سے واضح ہوگیا کہ اللہ تعالی کے کلام میں ہی یہ کمال پایا گیا ہے کہ اس میں عمدہ ترتیب رکھی گئی اور خوبصورت انداز پر کلام کو پیش کیا گیا جو آسانی سے یاد بھی ہوتا ہے اور ذہن میں محفوظ ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا کلام نہیں جو رب تعالی کے کلام جیسا حسین وعمدہ ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ یہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں "والحمد لله علی ماهدی هذا المسکین الیه وله الشکر علی نعمة التی لاحد لها ولاحصر" سب تعریفیں اللہ تعالی کی ہیں جس نے اس بندہ مسکین کو قرآن پاک کی عمدہ ترتیب سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائی اور اس کی ان گنت نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں۔ (ماخوذاز کبیر)

راقم بھی علامہ رازی رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یوں کہہ رہا ہے، سب تعریفیں اس ذات کی جس نے سلف صالحین کی تفاسیر اور شروح احادیث کی سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائی جو میں قلمبند کررہا ہوں، اللہ تعالی کی ان گنت نعمتوں پر شکر گذار ہوں دعاء ہے کہ آخری سانس تک رب تعالی مجھ سے دین کا کام لے۔ (آمین ثم آمین)

اب مختصر طور پر آیۃ کریمہ کے علیحدہ علیحدہ الفاظ کو بیان کیا جاتا ہے، تفصیل آیۃ الکرسی میں دیکھیں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ ہے نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔

ان الفاظ مبارکہ سے نصاری کا رد کیا گیا ہے، کیونکہ وہ عیسی علیہ السلام کو معبود مانتے تھے، تو اللہ تعالی کے اس بیان کے بعد واضح ہوا "ان احدا لایستحق العبادة سواه" بیشک اللہ ایک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ وہ زندہ ہے (ہمیشہ کیلئے) (اور) اوروں کو قائم کرنے والا ہے۔

جب وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے تو ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ o﴾ (کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے) بھی وہی ہے۔ اور ہر چیز

کا علم رکھنے والا بھی وہی ہے۔

"واما القیوم فھو القائم بذاتہ والقائم بتدبیر الخلق والمصالح لما یحتاجون الیہ فی معاشھم"

اللہ تعالیٰ قیوم ہے، کہ وہ خود قائم ہے، اسے کوئی موجود کرنے والا نہیں، وہ مخلوق کی تدبیر کو قائم کرنے والا ہے، اور لوگ جن مصلحتوں کے محتاج ہیں اپنی زندگی کی گذران میں، ان تمام کا خالق بھی وہی ہے۔

رات ہو یا دن، گرمی ہو سردی، ہوائیں ہو یا بارشیں سب اسی کے دست قدرت میں ہیں وہی ان کا خالق ہے، اسی کے تصرف میں یہ چیزیں ہیں۔ اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں عطاء کر رکھی ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اور اگر تم شمار کرو اللہ کی نعمتوں کو تو تم شمار نہیں کر سکو گے۔

"وقال قتادۃ "الحی الذی لا یموت والقیوم القائم علی خلقہ بأعما لھم وآجالھم وارزاقھم"

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ "حی" ہے کہ اس پر موت نہیں آنی، اور وہ "قیوم" ہے کہ مخلوق کے اعمال اور ان کی عمروں اور ان کے رزق کو قائم کرنے والا ہے۔

"وعن سعید بن جبیر الحی قبل کل حی والقیوم الذی لاندلہ"

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ "حی" ہے اس لئے کہ وہ ہر زندہ مخلوق سے پہلے زندہ ہے اور وہ "قیوم" ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ط إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ط وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝﴾(آل عمران آیۃ نمبر ۳،۴)

(1) اس نے تم پر یہ سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی اور اس نے اس سے پہلے توریت اور انجیل اتاری لوگوں کو راہ دکھائی اور فیصلہ اتارا بیشک وہ جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے ان کیلئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب بدلہ لینے والا ہے۔

(2) اس نے اتاری تم پر کتاب (کامل وجامع) حق کے ساتھ، جو تصدیق کرنے والی ہے ان کی جو اس سے پہلے ہیں اور اس نے اتارا توراۃ وانجیل کو۔اس سے پہلے، ہدایت ہیں وہ لوگوں کیلئے، اور اس نے اتارا فرقان (حق وباطل میں فرق کرنے والا) بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیات سے، ان کیلئے عذاب ہے سخت، اور اللہ غالب ہے بدلہ لینے والا۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾

''اس نے اتاری تم پر کتاب (کامل وجامع) حق کے ساتھ''

''الکتاب''ای القرآن الجامع للاصول والفروع'' کتاب سے مراد قرآن پاک ہے جو اصول وفروع کی جامع کتاب ہے۔ (روح المعانی)

اسی وجہ سے راقم نے بریکٹ میں (کامل وجامع) کے الفاظ بڑھائے ہیں، اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں''ولما کان ومایکون الی یوم القیامۃ'' یہ کتاب یعنی قرآن پاک ماکان (جو ہو چکا ہے) اور قیامت تک ''مایکون'' جو کچھ ہونا ہے کو شامل ہے۔''کتاب''ذکر کیا ہے، یعنی اسم جنس ذکر کیا اسم علم ''قرآن''نہیں ذکر کیا۔

''ایذانا بتفوقه علی بقیة الافراد فی الانطواء علی کمالات الجنس کانه هو الحقیق بان یطلق علیه اسم الکتاب دون ماعداه''

اس کی وجہ یہ ہے کہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہی حقیقت میں وہ کتاب ہے کہ جب مطلق کتاب ذکر کیا جائے تو اس سے

مراد قرآن پاک ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ کتاب ان کمالات پر مشتمل ہے جن پر دوسری آسمانی کتب مشتمل نہیں، اسی لئے توراۃ اور انجیل کے نام ذکر کئے ہیں صرف ''کتاب'' ان کو نہیں کہا گیا۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

''علیک'' ظرف ذکر کی گئی، پھر ''الکتاب'' مفعول بہ ہے اس سے پہلے ظرف کو ذکر کیا گیا، پھر مخاطب کی ضمیر ذکر کی گئی، نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا گیا، پھر لفظ ''علی'' ذکر کیا گیا ''الی'' نہیں ذکر کیا گیا، یعنی ''علیک'' ذکر ہے، ''الیک'' نہیں، ان تمام کی وجہ یہ ہے۔

''لا یخفی من تعظیمه ﷺ والتنویه برفعة شانه علیه الصلوة والسلام''

کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی تعظیم اور رفعت شان بیان کرنا مقصود ہے جو مخفی نہیں۔ (روح المعانی)

یعنی رب تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ عظیم کتاب جس کا یہاں تذکرہ کیا جارہا ہے وہ صرف آپ پر نازل کی گئی اور اس کو آپ کے دل پر ڈال دیا گیا۔ (راقم)

قرآن پاک کے اتارنے کا ذکر ''نَزَّلَ'' سے، اور ''توراۃ وانجیل'' کا ذکر ''اَنْزَلَ'' سے کیا۔

''لان التنزیل لتکثیر واللہ تعالی نزل القرآن نجما نجما فکان معنی التکثیر حاصلافیه واما التوراة والانجیل فانه تعالی انزلهما دفعة واحدة فلهذا خصهما بالانزال''

اس لئے کہ تنزیل کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو آہستہ آہستہ نازل کیا، اس میں کثرت کا معنی پایا گیا ہے، لیکن توراۃ اور انجیل چونکہ ایک ہی مرتبہ نازل ہوئیں، اس لئے ان کے ساتھ لفظ انزال کو خاص کیا۔ (از کبیر)

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ قرآن پاک لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک مرتبہ ہی نازل ہوا اس لئے قرآن پاک کے نزول کیلئے تنزیل بھی ذکر کیا گیا اور انزال بھی۔

''بالحق'' یا تو حال ہے فاعل سے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا **''نزله محقافی تنزیله علی ماهو علیه''** اس نے اتاری کتاب اس حال میں کہ وہ حق رکھتا ہے اس کتاب کو نازل کرنے کا، اور اگر یہ حال ہو مفعول سے تو معنی یہ ہوگا **''نزله ملتبسا بالعدل فی احکامه''** اس نے کتاب نازل کی اس حال میں کہ وہ اپنے احکام میں عدل پر مبنی کتاب ہے۔ یا یہ معنی ہوگا

''نزله بالصدق فی اخباره التی من جملتها خبرالتوحید وما یلیه وفی وعده ووعیده''

کہ اس نے اتاری کتاب اس حال میں کے وہ سچ سے ملی ہوئی ہے۔ یعنی اس کی تمام خبریں خواہ توحید کی خبریں ہوں یا اس کی صفات کی خبریں ہو، اس کے وعدہ کی خبریں ہوں یا وعید کی خبریں ہوں تمام ہی سچی ہیں۔

یا معنی یہ ہے "نزله بالحق ای بما یحقق انه من عند الله تعالی من الحجج البینة"
کہ اس نے کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ، یعنی وہ کتاب خود ہی ثابت کر رہی ہے کہ اس کے دلائل واضح ہیں اور وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہیں (تفسیر ابی السعود)

حق سے مراد کیا ہے:

احکام میں عدل (میانہ روی، افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال) پایا جائے، اور خبروں میں سچ پایا جائے۔ (روح البیان)

"بالحق ای بالصدق وقیل بالحجة الغالبة" حق کا معنی ''سچ'' ہے۔ یا غالب دلیلیں ہیں۔ (قرطبی)

"حق" کاصل الحق المطابقة والموافقة کمطابقة رجل الباب فی حقه لدورانه علی استقامة''
حق کا اصلی معنی ''مطابقت اور موافقت'' ہے۔ جس طرح دروازہ سیدھا اپنے پاؤں پر چلتا ہے۔
پھر حق کا لفظ کئی معانی میں استعمال ہے:

(۱) "الاول یقال لموجد (بکسر الجیم) بسبب ماتقتضیه الحکمة" ان معانی میں سے پہلا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جو حکمت کے تقاضا کے مطابق کسی چیز کو ایجاد کرے۔ اس ایجاد کرنے والی ذات کو حق کہا جاتا ہے۔ یعنی اس معنی کے لحاظ سے ''اللہ تعالی حق'' ہے۔ رب تعالی نے اسی معنی کے مطابق ارشاد فرمایا "هو الحق" وہی (اللہ تعالی) حق ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ﴾ پھر وہ لوٹائے جائیں اللہ کی طرف جو ان کا مولی حق ہے۔

(۲) "والثانی یقال للموجد (بفتح الجیم) بحسب مقتضی الحکمة" ان معانی میں سے دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ چیز جس کو حکمت کے مطابق ایجاد کیا جائے وہ چیز حق ہے۔ یہ معنی بھی قرآن پاک میں کئی جگہ واقع ہے ﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ نہیں پیدا کیا اللہ نے یہ مگر حق کے ساتھ۔ ﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ﴾ اور بیشک یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔

(۳) "والثالث فی الاعتقاد للشئ المطابق لما علیه ذلك الشئ فی نفسه" ان معانی میں سے تیسرا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کا واقع کے مطابق ہونے کا اعتقاد رکھا جائے، یعنی قیامت، ثواب، عذاب، جنت، اور جہنم کے حق

ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔ یہی معنی قرآن پاک کے ان الفاظ مبارکہ میں استعمال ہے۔

"فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ"

تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو وہ حق بات سوجھادی جس میں جھگڑ رہے تھے، اپنے حکم سے۔

(۴) "والرابع للفعل والقول الواقع بحسب مایجب وبقدر ما یجب وفی الوقت الذی یجب"

ان معنی میں سے چوتھا معانی یہ ہے کہ حق اس فعل یا قول کو کہتے ہیں جو جس طرح واجب ہوا اسی طرح وہ پایا جائے۔ اور اس اندازے کے مطابق پایا جائے جس اندازے کے مطابق وہ واجب ہوا۔ اور اس وقت میں پایا جائے جس وقت میں واجب ہوا۔ اسی کے مطابق کہا جاتا ہے "قولک حق وفعلک حق "تمہارا قول حق ہے اور تمہارا فعل حق ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ اسی طرح ثابت ہے تمہارے رب کا کلمہ۔ اسی طرح اور ارشاد فرمایا "حق القول منی لأملئن جهنم" میرا قول حق ہے کہ میں ضرور بر ضرور جہنم بھر دوں گا۔

احقاق حق کی دو قسمیں:

(۱) "احدهما باظهار الادلة والآيات" ان دو معنوں میں سے ایک یہ ہے کہ دلائل اور آیات کو واضح طور پر بیان کر کے حق کو ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿أُولٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا﴾ اور یہ ہیں جن پر ہم نے تمہیں واضح غلبہ عطاء کیا۔ اس مقام میں "سُلْطَانًا مُّبِيْنًا" سے "حجة قوية" قوی دلائل ہیں۔ جن کی وجہ سے ثابت کیا کہ مسلمان حق پر ہیں "والثانی باکمال الشريعة وبثها فی الكافة" ان معانی میں سے دوسرا معنی "احقاق حق" کا یہ ہے کہ شریعت کو مکمل کر کے اور اس کو تمام لوگوں میں پھیلا کر حق ثابت کیا جائے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔

"وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ" (سورة الصف آية نمبر ۸،۹)

اور اللہ تعالیٰ مکمل کرنے والا ہے اپنے نور کو اگرچہ کافر ناپسند سمجھیں، وہی جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے سب دینوں پر۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

زیر بحث آیۃ کریمہ میں حق سے مراد کیا ہے؟:

اس میں بھی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں جو راقم کے نزدیک سب ہی معتبر ہیں۔

"احدها انه صدق فيما تضمنه من الاخبار عن الامم السالفة" ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کتاب کو حق

کے ساتھ نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں گذری ہوئی امتوں کی جو خبریں ہیں وہ سچی ہیں۔

"وثانیها ان مافیه من الوعد والوعید یحمل المکلف علی ملازمة الطریق الحق فی العقائد والأعمال ویمنعه عن سلوک الطریق الباطل"

ان وجوہ میں دوسری وجہ یہ ہے کہ کتاب کو حق کے ساتھ نازل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں جو وعدو وعید کا ذکر ہے وہ جن احکام پر مرتب ہیں، ان احکام پر اسی وقت عمل کیا جا سکے گا جبکہ مکلف اپنے عقائد اور اعمال میں حق راہ پر قائم ہو، باطل راہ سے دور ہو۔

یعنی اس کتاب (قرآن پاک) میں حق راہ دکھائی گئی ہے کہ اس پر چل کر اپنے عقائد واعمال کو درست رکھا جائے۔

"وثالثها انه حق بمعنی انه قول فصل ولیس بالهزل" اور تیسری وجہ ان میں سے یہ ہے کہ یہ حق ہے یعنی یہ وہ کلام ہے جو حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے، اور حق بات ہے کوئی مزاح کی بات نہیں۔

"ورابعها قال الاصم المعنی انه تعالی انزله بالحق الذی یجب له علی خلقه من العبودیة وشکر النعمة واظهار الخضوع وما یجب لبعضهم علی بعض من العدل والانصاف فی المعاملات"

اور ان وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے جو اصم رحمہ اللہ نے بیان فرمائی کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب قرآن پاک کو حق سے نازل فرمایا یعنی مخلوق پر اس کی عبودیت اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں، اور خشوع وخضوع کا اظہار کریں، اور آپس میں ایک دوسرے سے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لیں۔

"وخامسها انزله بالحق لابالمعانی الفاسدة المتناقضة"

اور پانچویں یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو حق سے نازل فرمایا، اس میں معانی ایک دوسرے کے متناقض (مخالف) نہیں، اور نہ ہی اس کے معانی فاسد ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کجی نہیں رکھی (بالکل اسمیں ٹیڑھے پن نہیں رکھا) اور ارشاد فرمایا ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر وہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ "اور جو تصدیق کرنے والی ہے ان کی جو اس سے پہلے ہیں"

"والمعنی انه مصدق لکتب الانبیاء علیهم السلام" مطلب یہ ہے کہ پہلے انبیاء کرام پر جو

کتابیں نازل کی گئیں قرآن پاک ان کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو اس نے انبیاء کرام پر نازل کی ہیں۔ توراۃ موسیٰ علیہ السلام پر، انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر، اور زبور داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئیں۔ اور قرآن پاک نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا جو پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔

خیال رہے کہ "بین یدیه" کا معنی ہے "ہاتھوں کے درمیان" لیکن یہاں مجازی معنی استعمال ہے "اگلی کتابیں" کیونکہ وہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں، اگرچہ ان میں تحریف کردی گئی تھی، نام ان کے وہی تھے، قرآن پاک نے ان کی اصلی حالت کی تصدیق کی نہ کہ تحریف شدہ (تبدیل کی گئی) کی۔

قرآن پاک کے مصدق ہونے سے نبی کریم ﷺ کا صادق ہونا سمجھ آیا:

رب تعالیٰ نے جب یہ بیان فرمایا کہ قرآن پاک پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے، یہ دلیل قرآن پاک کی حقانیت پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے "لانه لو کان من عند غیر الله لم یکن موافقا لسائر الکتب" اس لئے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف سے ہوتا تو باقی آسمانی کتب کے موافق نہ ہوتا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا "انه کان امیالم یختلط باحد من العلماء ولا تتلمذ لأحد" کہ نبی کریم ﷺ جب امی تھے، اس وقت کے علماء سے کبھی ملتے جلتے نہیں تھے، اور نہ ہی آپ کسی کے شاگرد بنے، تو پھر آپ کا وہ کتاب پیش کرنا جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، اور ان کتابوں کے مضامین کو بھی اس کتاب میں سمو دیا گیا ہے "فانما عرف هذه القصص بوحی الله تعالیٰ" تو بیشک اسی سے واضح ہوگیا کہ قرآن پاک میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے نازل ہوئے ہیں۔ لھذا نبی کریم ﷺ کا صادق ہونا واضح ہوگیا۔ ہر نبی نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دعوت دی، اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا، اور اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق نہیں ان سے دور رہنے کی تبلیغ کی۔ عدل اور احسان کا حکم دیا، اور ہر شریعت میں اس زمانے کے فسادات کو ختم کرنے اور اصلاح کرنے کا حکم دیا گیا "فالقرآن مصدق لتلک الکتب فی کل ذلک" قرآن پاک ان تمام چیزوں میں پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: "بین یدیه" کا معنی ہے۔ دو ہاتھوں کے درمیان، یہ تو اس چیز پر بولا جاتا ہے جو سامنے ہو، قرآن پاک سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو "بین یدیه" سے تعبیر کرنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: "ان تلک الاخبار لغایة ظهورها سماها بهذا الاسم" یہ خبریں بہت واضح ہیں، اس لئے

ان کو "بین یدیه" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا کہ توراۃ وانجیل سامنے تھیں اور قرآن پاک کی تصدیق واضح تھی۔ (از کبیر)

پہلا سوال: قرآن پاک کو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا کیسے کہا؟ حالانکہ قرآن پاک نے تو پہلی کتابوں کے اکثر احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔؟

جواب: "اذا کانت الکتب مبشرة بالقرآن وبالرسول، ودالة علی ان احکامها تثبت الی حین بعثته، وانها تصیر منسوخة عند نزول القرآن کانت موافقة للقرآن فکان القرآن مصدقالها"

جبکہ پہلی کتابوں میں قرآن پاک کے نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور پہلی کتب میں ہی بیان کر دیا گیا کہ قرآن پاک کے نازل ہونے پر یہ کتابیں منسوخ ہو جائیں گی، تو قرآن پاک پہلی کتابوں کے موافق نازل ہا اور ان کی تصدیق کرنے والا ہوا کہ ان میں جب ذکر ہی یہ تھا کہ قرآن پاک ان کا ناسخ ہے تو قرآن پاک کا ناسخ ہونا ان کی تصدیق کرنے والا ہوا۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسرا جواب: مصدقا لما بین یدیه" ای فی حال کونه مصد قا للکتب قبله فی التوحید والنبوات والاخبار وبعض الشرائع قبله" (روح البیان)

قرآن پاک کا پہلی کتب کی تصدیق کرنے کا یہ مطلب ہے کہ پہلی کتب میں توحید اور نبوت کا جو ذکر ہے، اور ان میں جو خبریں پائی گئی ہیں اور ان کے بعض احکام جو قرآن پاک نے منسوخ نہیں کیے، قرآن پاک کو ان کی تصدیق کرنے والا بنایا۔ **راقم** کے نزدیک پہلا جواب قوی جواب، بلکہ عظیم جواب ہے جو کبیر سے ماخوذ کیا گیا ہے۔

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝﴾ ''اور اتارا اس نے توراۃ وانجیل کو''

"والتوراة والانجیل اسمان اعجمیان الاول عبری والثانی سریانی"

توراۃ اور انجیل دونوں عجمی نام ہیں۔ عربی لفظ نہیں۔ بلکہ توراۃ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اور انجیل سریانی زبان کا لفظ ہے (روح البیان) یہی قول درست ہے۔

تاہم بعض حضرات نے ان الفاظ کو عربی بھی کہا ہے اور انہوں نے لغوی معنی اور ان کتب کے نام رکھنے میں مناسبت بھی بیان کی ہے۔

عربیت کا قول اور دینی طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

''توراۃ'' بصری نحویوں کے نزدیک اصل

میں ''وورية'' بروزن ''فوعلة'' ہے، جیسے ''دوخلة'' اور ''حوقلة'' ہے۔ پہلی واؤ کو ''تاء'' بنالیا گیا، پھر یاء مفتوحہ کو ماقبل بھی فتحہ ہونے کی وجہ سے الف بنالیا گیا، ''فصارت توراة و کتبت بالیاء علی اصل الکمة'' پڑھنے میں الف سے ہی پڑھا گیا ''توراة'' اور لکھنے میں البتہ اصل کا اعتبار کرکے یاء سے ان حضرات نے لکھا ''توریت'' اور کوفی اہل علم نے بیان کیا ہے، توراۃ اصل میں ''توریة'' ہے۔ تفعلة کا وزن ہے جیسے ''توصیة اور توفیة'' ہے پھر یاء کو الف سے تبدل کردیا گیا، کیونکہ ان کی لغت میں ''جاریة'' کو جاراۃ پڑھتے ہیں اور ناصیۃ کو ناصاۃ، یعنی ان حضرات کے نزدیک لکھنے اور پڑھنے میں ''توارۃ'' ہی ہے۔

بصریوں اور کوفیوں کے نزدیک یہ لفظ لیا ہوا ہے ''وری الزند'' سے، یعنی چقماق سے آگ نکالنا، جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ﴾ بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو، اب اس معنی کے لحاظ پر توراۃ کو توراۃ کہنے کہ وجہ یہ ہے ''فسمی التوراة لانها نور وضیا'' قال اللہ تعالی ﴿وَضِيَآءً وَّذِكْرًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کہ توراۃ میں نور وضیاء کے پائے جانے کی وجہ سے اس کا نام ہی توراۃ رکھ دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالی نے خود توراۃ کو متقین کیلئے ضیاء اور نصیحت قرار دیا۔ بعض حضرات نے اور وجہ بیان کی ہے

''هی من التورية وهی کتمان السر والتعريض بغيره و کان فی التوراة معاريض من غير تصريح''

کہ ''توراۃ کا لفظ ''توریۃ'' سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی راز چھپانا اور اشارہ سے بات کرنا، ظاہر نہ کرنا، چونکہ توراۃ میں کچھ اشارات پائے گئے ہیں جو ظاہر نہیں تو اس مناسبت سے اس کا نام بھی ''توراۃ'' رکھ لیا گیا۔

''انجیل'' کو انجیل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ''لفظ ''افعیل'' کے وزن پر ہے اور ''انجیل'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے ''نکلنا'' بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے ''نجل'' کہا جاتا ہے۔ انجیل کو انجیل کہنے کی وجہ واضح ہوگئی کہ اللہ تعالی نے اسے حق بیان کرنے کیلئے نکالا ہے تو نام انجیل رکھ دیا گیا، بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ لفظ ماخوذ ہے ''هو من النجل وهو سعة العين'' نجل سے جس کا معنی ہے آنکھ کی وسعت اور آنکھ کی نورانیت، انجیل کو بھی لوگوں کی ہدایت کیلئے وسعت دی گئی اور نور بنایا گیا، تو اس مناسبت سے نام انجیل رکھنا واضح ہوگیا۔ عبرانی زبان میں ''توراۃ'' کا معنی شریعت ہے، اس لئے کہ اس میں شرعی مسائل کا ذکر ہے، لھذا نام ہی توراۃ رکھ لیا گیا۔ سریانی زبان میں ''انجیل'' کا معنی ہے موتیوں کا جڑاؤ چونکہ انجیل شرعی مسائل کو موتیوں سے تشبیہ دے کر نام ''انجیل'' رکھ دیا گیا کہ اس میں موتیوں کو جوڑ دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

تنبیہ: عربیت والے قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ ان الفاظ سے رد کرتے ہیں۔

"التوراة والانجيل اسمان اعجميان احدهما بالعبرية والآخر بالسريانية فكيف يليق بالعاقل ان يشتغل بتطبيقهما على اوزان لغة العرب فظهر ان الأولى بالعاقل ان لايلتفت الى هذه المباحث (کبیر)

توراۃ اور انجیل جب عجمی لفظ ہیں ایک عبرانی اور دوسرا سریانی تو عقلمند آدمی کیلئے کس طرح لائق ہے کہ وہ ان کو عربی الفاظ کے وزنوں سے تطبیق دے، ظاہر بات یہی ہے کہ ان الفاظ کو عجمی ہی سمجھا جائے اور عربی والے اقوال کی طرف توجہ نہ دی جائے۔

﴿مِنْ قَبْلُ﴾ اس سے پہلے ﴿مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا۔

﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ ہدایت ہیں وہ لوگوں کیلئے اب مکمل ﴿مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ﴾ کا مطلب یہ ہو گیا یعنی "ان انزال التوراة والانجيل قبل القرآن كان هدى للناس" توراۃ اور انجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا، اور لوگوں کیلئے ہدایت بنایا۔

اعتراض: قرآن پاک کو "هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" (پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے) کہا گیا ہے، اور توراۃ و انجیل کو "هُدًى لِلنَّاسِ" (لوگوں کیلئے ہدایت ہیں) کہا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: قرآن پاک کو "هُدًى لِلْمُتَّقِينَ" کہا گیا ہے کیونکہ "هم الذين انتفعوا به وتبعوه" پرہیزگاروں نے ہی قرآن پاک کی ہدایت سے نفع حاصل کیا ہے اور انہوں نے ہی قرآن پاک کی تابعداری کی ہے، البتہ مطلقا قرآن پاک کی ہدایت (راہنمائی) کو بھی ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾ سے ذکر کیا گیا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ﴾ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کی ہدایت کیلئے۔ یہاں چونکہ نجران کے نصاریٰ سے مناظرہ ہو رہا تھا، وہ قرآن پاک کے ہادی ہونے کے قائل نہیں تھے کیونکہ وہ تو قرآن پاک کو اللہ کی کتاب ہی نہیں مانتے تھے، لیکن توراۃ اور انجیل کی ہدایت کو مانتے تھے اس لئے توراۃ اور انجیل کا وصف بیان کیا گیا "هُدًى لِلنَّاسِ" قرآن پاک کا وصف "حق" بیان کیا گیا ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ (اس نے کتاب اتاری حق کے ساتھ) گویا کہ یوں بیان کر دیا گیا "انه حق فى نفسه سواء قبلوه او لم يقبلوا" کہ قرآن پاک حقیقت میں حق ہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے قرآن پاک کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ (ماخوذ از خازن و کبیر)

"وقيل ان قوله هدى للناس يعود الى الكتب الثلاثة يعني القرآن المتقدم ذكره والتوراة والانجيل"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول "هُدًى لِلنَّاسِ" کا تعلق تینوں کتابوں سے ہے۔ قرآن پاک جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور توراۃ اور انجیل (تاہم راقم کے نزدیک پہلا جواب ہی قوی ہے)

"وانما وصف هذه الكتب بانها هدی للناس لما فیهامن الشرائع والاحکام"
ان کتب کو"هُدًی لِلنَّاسِ" (لوگوں کیلئے ہدایت ہیں) کہا گیا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شرائع اوراحکام پائے گئے ہیں۔ (خازن)

توراۃ وانجیل تمام لوگوں کیلئے ہدایت کیسے ہیں؟

هدی للناس لقول موسی وعیسی اولجمیع الناس" اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ توراۃ ہدایت ہے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کیلئے اورانجیل ہدایت ہے عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کیلئے۔یعنی "الناس" پرالف لام عہد خارجی ہو۔معہودلوگ مراد ہوں وہ قوم موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) کے لوگ مراد ہیں۔اور **دوسرا مطلب** یہ ہے کہ توراۃ وانجیل تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہیں،کیونکہ توراۃ وانجیل میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پائے گئے ہیں اورآپ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے،اس طرح توراۃ وانجیل تحریف سے پہلے اپنی اصلی حالت میں لوگوں کیلئے ہدایت ہیں۔ (ماخوذازمدارک)

﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ "اورنازل کیافرقان (حق وباطل میں فرق کرنے والا)"

فرقان سے مراد کیا ہے؟

اس میں چنداقوال ہیں۔

(۱)الاول ان المرد هو الزبور" ان میں سے پہلاقول یہ ہے کہ فرقان سے مرادزبور ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا"وآتینا داود زبورا"اورہم نے عطاء کیا ہےداودکوزبور۔

(۲) "والثانی ان المراد هو القرآن وانما اعاده تعظیما لشانه ومدحایکونه فارقا بین الحق والباطل"

دوسراقول یہ ہے کہ فرقان سے مرادقرآن پاک ہے۔اب اس قول پر بظاہر وہم ہوتا تھا کہ قرآن پاک کا ذکرتو پہلے کیا جاچکا ہے پھردوبارہ ذکرکرنے کا کیا مطلب ہے؟ تواس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ دوبارہ ذکرکیا گیا ہے قرآن پاک کی عظمت شان بیان کرنے کیلئے اورقرآن پاک کی تعریف کرنے کیلئے اورواضح طور پر بیان کرنے کیلئے کہ قرآن پاک حق وباطل میں فرق کرنے والا ہے۔**فرقان** سے مرادقرآن پاک ہی ہو،لیکن اس کا مطلب یہ ہوکہ قرآن پاک کا اگرچہ ذکردوبارہ کیا گیا ہے لیکن اس میں تکرارنہیں بلکہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن پاک توراۃ وانجیل سے بعدنازل ہوا۔

"لیجعله فرقا بین مااختلف فیه الیهود والنصاری من الحق والباطل"

اور یہود ونصاری جن چیزوں میں اختلاف کرتے تھے ان کے اختلافات میں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا بنایا۔

اس صورت میں تکرار نہ ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن پاک اترا حق سے۔اب یہ بیان کیا کہ قرآن پاک نے یہود ونصاری کے درمیان واقع ہونے والے اختلافات کے حق و باطل میں بھی فرق کیا۔یہ نیا مطلب ہے۔تکرار نہیں کیونکہ تکرار کا مطلب ہوتا ہے پہلی چیز کو دوبارہ لوٹا دیا جائے۔

(۳) والقول الثالث وهوقول الأكثرين ان المراد انه تعالى كما جعل الكتب الثلاثة هدى للناس ودلالة فقد جعلها فارقة بين الحلال والحرام وسائر الشرائع"

تیسرا قول اکثر حضرات کا ہے کہ جس طرح ایک قول کے مطابق تینوں کتابیں" قرآن پاک،توراۃ اور انجیل" لوگوں کیلئے ہدایت ہیں اسی طرح یہ تینوں ہی حلال وحرام اور تمام شرائع میں فرق کرنے والی ہیں۔یعنی اس قول کے مطابق فرقان سے مراد قرآن پاک،توراۃ وانجیل تینوں ہی ہیں۔ (از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک تینوں قول مرجوح، مختار چوتھا قول:

آپ فرماتے ہیں:"اما حمله على الزبور فهو بعيد لان الزبور ليس فيه شئ من الشرائع والاحكام بل ليس فيه الا المواعظ" فرقان سے مراد زبور لینا عقل سے بعید ہے کیونکہ زبور میں شرائع اور احکام کا ذکر نہیں، بلکہ اس میں فقط وعظ ونصیحت پائے گئے ہیں۔

اور دوسرا قول" کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے" درست نہیں، کیونکہ "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" کو عطف سے ذکر کیا گیا ہے، جبکہ حقیقت میں معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت پائی جاتی ہے "فهذا يقتضي ان يكون هذا الفرقان مغاير اللقرآن" تو اس قانون وضابطہ کے تقاضا کے مطابق فرقان مغائر ہوگا قرآن پاک کے۔

تیسرا قول بھی مرجوح ہے کیونکہ، اگر یہ کہا جائے کہ تینوں کتابیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔تو یہ ان کی صفت ہوگی۔

"وعطف الصفة وان كان قدورد في بعض الاشعارا لنا درة الاانه ضعيف بعيد عن وجه الفصاحة اللائقة بكلام الله تعالى"

اور صفت کا عطف موصوف پر اگر چہ بعض نادر اشعار میں پایا گیا ہے۔لیکن فصاحت سے دور ہے، اللہ تعالی کے فصیح کلام کی شان کے لائق نہیں کہ صفت کا عطف موصوف پر ہو، کیونکہ صفت اور موصوف میں

موافقت پائی جاتی ہے اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار:

آپ فرماتے ہیں میرے نزدیک مختار چوتھا قول ہے۔یعنی یہ تینوں قول مرجوح ہیں وہ چوتھا قول یہ ہے

"وهو ان المراد من هذاالفرقان المعجزات التی قرنها الله تعالٰی بانزال هذه الکتب"

کہ فرقان سے مراد معجزات ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے جب کتابوں کو نازل فرمایا تو ان کے ساتھ ہی انبیاء کرام کو معجزات عطاء فرمائے۔انبیاء کرام نے جب اپنی قوموں کے سامنے کتابیں پیش کیں، اور دعویٰ کیا کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں تو ان کو اپنے دعوی پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت درپیش آئی تا کہ انبیاء کرام کے دعوی اور کذاب (جھوٹے) لوگوں کے دعوی میں فرق واضح ہو جائے۔

"فلما اظهر الله تعالٰی علی وفق دعواهم تلک المعجزات حصلت المفارقة بین دعوی الصادق وبین دعوی الکاذب فالمعجزة هی الفرقان"

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوی کے مطابق انہیں معجزات عطاء فرمائے تو سچے حضرات کے دعوی اور جھوٹے لوگوں کے دعوی میں فرق واضح ہو گیا، لھذا معجزہ فرقان ہے کہ حق اور باطل میں فرق کرنے والا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ذکر فرما کہ اس نے کتاب (قرآن پاک) کو حق سے نازل فرمایا پھر بیان کیا کہ توراۃ وانجیل کو قرآن پاک سے پہلے نازل کیا۔

"بین انه تعالٰی انزل معها ماهو الفرقان الحق وهو المعجز القاهر الذی یدل علی صحتها ویفید الفرق بینها وبین سائر الکتب المختلفة"

تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ذکر فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرقان نازل کیا'' فرقان سے مراد معجزہ ہے جو کتابوں کے صحیح ہونے اور اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔اور عطف جو مغایرت کا تقاضا کرتا ہے وہ بھی ثابت ہو گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی و اعلیٰ حضرت رحمہما اللہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ کے تحقیق کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے خوب ترین، حسین وجمیل، تحقیق پر مبنی نظر آئے گا، آپ کا ترجمہ یہ ہے ''وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ'' اور فیصلہ اتارا، یعنی وہ چیز اتاری جو حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی ہے، وہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق معجزہ ہے۔

راقم نے بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، لیکن کہاں اصل اور کہاں نقل، آپ نے "فرقان" کا معنیٰ "فیصلہ" کر کے دریا کوزے میں بند کر دیا، راقم نے لکھا "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" اور نازل کیا فرقان (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا) راقم کے ترجمہ میں حق ترجمانی بھی ادا نہیں ہوا، تطویل بھی ہے، خوبصورت بھی نہیں اور جامعیت بھی نہیں۔ لیکن مشابہت ضرور پائی گئی ہے۔ خیال رہے کہ روح المعانی میں پہلی تین توجیہات کو بھی صحیح کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن راقم کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی تحقیق عظیم نظر آئی، تاہم راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ سب اقوال کو جمع کیا جاسکے تو جمع کر لیا جائے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کے مطابق "اور فیصلہ اتارا" اور راقم کے ترجمہ کے مطابق "اور نازل کیا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا) سب اقوال کو جمع کیا جاسکتا ہے کہ وہ فیصلہ جو حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے وہ قرآن بھی ہے، اور قرآن و توراۃ و انجیل تینوں بھی ہیں، اور وہ زبور بھی ہے اگرچہ زبور میں احکام و شرائع نہیں مواعظ ہیں "ولکن فیھا من الزجر والترغیب فارقۃ ایضا" لیکن ان مواعظ میں گناہ کرنے پر ڈانٹ دی گئی اور نیکی کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اسلئے وہ مواعظ حق و باطل میں فرق کرنے والی ہیں۔ اور فرقان سے مراد معجزہ بھی ہے۔

راقم کے بیان میں چار اقوال جمع ہو گئے، امید ہے طلباء کرام اس کوشش کو پسند کریں گے اور راقم کے حق میں دعاء کریں گے۔ ان چار اقوال کے بغیر دوسرے چار اقوال بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور راقم کے ترجمہ میں سموئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

"قال محمد بن جعفر فرق بین الحق والباطل فی امر عیسی علیہ السلام الذی جادل فیہ الوفد"

حضرت محمد بن جعفر فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جو نجران کا وفد آپ سے جھگڑا کر رہا تھا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو رب تعالیٰ ان کے متعلق حق فیصلہ نازل کر دیا، جس نے حق و باطل میں فرق کر دیا، وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں ماں کا دودھ پینے کی عمر میں اپنی ماں سے بہتان دور کرنے کیلئے جو اپنا تعارف کرایا وہی آپ کے حق میں حق فیصلہ ہے۔ وہ تعارف آپ نے یوں کر دیا

"قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِیَ الْکِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا"

آپ نے فرمایا بیشک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطاء فرمائی اور اس نے مجھے نبی بنایا۔ اس معنیٰ کے لحاظ پر قرآن پاک کی بعض آیات کو فرقان کہا گیا ہے۔

"وقال قتادۃ والربیع وغیرھما فرق بین الحق والباطل فی احکام الشرائع وفی الحلال والحرام ونحوہ"

قتادہ اور ربیع وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ فرقان سے مراد یہ ہے کہ احکام شرائع میں حق و باطل اور حلال وحرام کے درمیان فرق کرنے والی چیز کو اتارا۔

"وقیل الفرقان کل امر فرق بین الحق والباطل فیما قدم وحدث فدخل فی ھذا التاویل طوفان نوح وفرق البحر لغرق فرعون ویوم بدر وسائر افعال اللہ المفرقة بین الحق والباطل"

فرقان سے مراد ہر وہ چیز ہے جس نے حق و باطل میں فرق کیا ہو، خواہ وہ قدیم ہو یا حادث ہو، لھذا کلام الٰہی نفسی جو قدیم ہے وہ بھی حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے، اور طوفان نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے قوم کیلئے دریا کا پھٹ کر جگہ دینا کہ یہ دریا سے گزر جائیں، اور فرعون کیلئے پانی کو ملا دینا اور اسے غرق کر دینا، اور بدر میں مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کو شکست فاحش حاصل ہونا، اور اس قسم کے رب تعالیٰ کے تمام افعال جو حق و باطل میں فرق کرتے ہیں وہ سب ہی فرقان میں آتے ہیں۔

"وقیل الفرقان، النصر" بعض حضرات نے بیان کیا کہ فرقان سے مراد "امداد کرنا" ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی رب تعالیٰ نے امداد فرمائی، جبکہ کافر کثیر تعداد میں تھے، آپ کے ساتھ ابتدائی طور پر مسلمانوں کی تعداد بہت ہی قلیل تھی، پھر کافر "معاذاللہ" آپ کو مٹانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، لیکن رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی امداد فرما کر کافروں کے ارادے خاک میں ملا دیئے، یہ امداد حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی۔ (آخری چار اقوال ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**الفرقان فی الاصل مصدر کالغفران اطلق علی الفاعل مبالغة**" فرقان اصل میں مصدر ہے، غفران کے وزن پر ہے، لیکن یہاں فاعل کے معنی میں استعمال ہے اور مبالغہ کا معنی ہے، یعنی "حق و باطل میں بہت زیادہ فرق کرنے والی چیز کو اتارا" (تفسیر ابی السعود)

اسی طرح طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور ترکیب پیش خدمت ہے۔

"ھدی للناس" فی حیز النصب علی انه علة للانزال ای انزلھما لھدایة الناس اوعلی انه حال منھما ای انزلھما حال کونھما ھدی لھم والافراد لما انه مصدر جعلا نفس الھدی مبالغة او حذف منه المضاف ای ذوی ھدی"

"ھدی للناس" پر نصب کی چند وجہ ہیں، ایک یہ ہے کہ مفعول لہ ہو لیکن لام انتفاع کا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا معلل بالاغراض ہونا لازم نہ آئے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا اس سے پہلے اس نے توراۃ وانجیل کو نازل کیا لوگوں کو ہدایت سے نفع

پہنچانے کیلئے۔ یا یہ حال ہو مفعول سے وہ، توراۃ وانجیل ہیں، یعنی اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اس سے پہلے اس نے توراۃ وانجیل کو اتارا دراں حالیکہ وہ ہدایت ہیں لوگوں کیلئے۔ بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ جب ''ھـدی'' حال ہے چیزوں سے تو اسے تثنیہ نہیں لایا گیا، مفرد لایا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جو تثنیہ نہیں ہوتا، مبالغہ کیلئے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ مرتب ہوگا۔ تیسری ترکیب اس میں یہ ہے کہ اس میں مضاف کو حذف کیا گیا ہے، اور مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھا گیا ہے، ''الحذف والایصال'' کے قاعدہ کے مطابق مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھ کر نصب دے دی گئی، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اس سے پہلے توراۃ وانجیل ہدایت والا بنا کر اتارا۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ﴾

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیات سے ان کیلئے عذاب ہے سخت۔''

کافروں سے مراد کون سے لوگ ہیں؟ بعض حضرات نے کہا اس سے مراد اہل کتاب یعنی نصاری ہیں، کیونکہ آیۃ نازل نجران کے وفد کے متعلق ہوئی، وہ نصاری تھے۔

"وقال المحققون من المفسرين خصوص السبب لايمنع عموم اللفظ فهو يتناول كل من اعرض عن دلائل الله تعالى"

محققین مفسرین کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ بیشک آیۃ کریمہ نصاری کے وفد کے متعلق نازل ہوئی، لیکن خصوص سبب عموم لفظ سے منع نہیں کرتا۔ یعنی شان نزول کے لحاظ پر آیۃ کریمہ خاص ہو، اس کے الفاظ عام ہوں تو اس میں عموم کا اعتبار کرنا بھی موقع ومحل کے نشانیوں سے انکار کرتے ہیں، ان تمام کیلئے شدید عذاب ہوگا۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

''بـآیـات اللـه'' میں یا تو اضافۃ عہدیہ ہے، اس صورت میں اللہ کی آیات سے مراد ''قرآن پاک، توراۃ وانجیل کی آیات ہوں گی'' کیونکہ پہلے ان کا ہی ذکر کیا گیا ہے لہذا معہود (معین ومقرر) آیات ان تینوں کتابوں کی آیات ہی ہوں گی۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اضافۃ جنسیہ ہو۔

"فتصدق الآيات على مايتحقق فی ضمن ما تقدم وعلى غيره كالمعجزات"

تو اس صورت میں آیات سے مراد جنس آیات ہوں گی، لھذا، قرآن پاک، توراۃ وانجیل کی آیات کو بھی شامل رہیں گی اور معجزات کو بھی، بلکہ ہر وہ نشانی جو اللہ تعالی کی قدرت اور اس کے معبود اور اس خالق وغیرہ ہونے پر دلالت کرتی

ہو، اس کا انکار کفر ہی ہے، وہ سب منکرین اس آیۃ میں داخل ہیں کہ ان کیلئے شدید عذاب ہوگا۔

آیات کی اضافت ''اللہ تعالیٰ'' کی طرف کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

واضافها الی الاسم الجلیل تعیینا لحیثیة کفرهم وتهویلا لأمرهم وتاکیدا لاستحقاقهم العذاب"

آیات کی اضافت رب قدوس کے اسم گرامی ''اللہ کی طرف کی تا کہ کافروں کے کفر کی حیثیت واضح ہو جائے، معین ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے والے ہیں کیونکہ کفر کی کئی صورتیں ہیں، جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے والے ہیں تو ان کا معاملہ ہولناک ہو گیا، یعنی یہ بھی خود بخود سمجھ آ گیا کہ وہ شدید عذاب کے مستحق ہیں۔

یعنی ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ﴾ سے ہی ان کا شدید عذاب کا مستحق ہونا سمجھ آ گیا، پھر ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴾ کو تاکید کیلئے ذکر کر دیا گیا، کہ ان کا شدید عذاب کا مستحق ہونا یقینی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث:

"لهم" خبر مقدم ہے اور "عذاب شدید" مبتداء مؤخر ہے۔ پھر تمام جملہ خبر ہے ''ان'' کی، اور یہ بھی جائز ہے کہ "لهم ظرف کا تعلق جس عامل سے اسی کا "عذاب شدید" فاعل ہو، ''رفع بوجہ فاعلیت بناء بر ظرفیت لازم آ رہا ہو'' "والتنکیر للتفخیم ففیه اشارة الی انه لایقدر قدره" "عذاب شدید" کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے، تنکیر فخامت (زیادتی) پر دلالت کر رہی ہے، جس سے یہ اشارہ مل رہا ہے کہ وہ عذاب اتنا شدید ہوگا کہ اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا، اس سخت عذاب کو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ کتنا زیادہ سخت ہوگا۔ "وهو مناط الحصر ولا معنی (کہ وہ عذاب صرف کافروں کو حاصل ہوتا ہے) "لهم" ظرف کے مقدم کرنے سے حاصل ہوا، جیسا کہ دینی مدارس کے چھوٹی کلاسوں والے طلباء کرام بھی یہ ضابطہ زبانی یاد کئے ہوتے ہیں۔

"والتعلیق بالموصول الذی هو فی حکم المشتق یشعر بالعلیة وهو معنی تضمنه الشرط"

موصول سے متعلق کیا ہے جو حکم مشتق میں ہے اس سے پتہ چل رہا ہے کہ ان کا کفر علت (سبب) ہے عذاب شدید کی، گویا کہ شرط کے معنی کو متضمن ہے۔

یعنی یہ پتہ چل گیا کہ اگر وہ کفر کریں گے تو شدید عذاب کے مستحق ہوں گے، اگر کفر نہیں کریں گے بلکہ اسلام لے آئے تو ان کو شدید عذاب نہیں ہوگا، اگر گناہوں کی وجہ سے گرفت ہو گئی اور جہنم میں داخل ہونا پڑا (العیاذ باللہ) تو وہ

گرفت سرزنش کی حد تک ہوگی، مؤمن کو گناہوں کے زنگ سے پاک وصاف کر کے جنت میں داخل کرنا مقصود ہوگا۔طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کہ جب مبتداء معنی شرط کو متضمن ہو تو خبر پر فاء کا لانا واجب ہوجاتا ہے تو یہاں "لھم" پر فاء نہیں آئی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں دیا ہے "وترک فیه الفاء لظھوره فھو ابلغ اذا اقتضاه المقام" فاء کو ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ مسئلہ واضح ہے کہ جب مقام تقاضا کرے کہ یہاں فاء کو اس لئے نہ ذکر کیا جائے کہ فاء کا مقام ہونا اس کا ظاہر ہے تو اس صورت میں فاء کا ذکر نہ کرنا بلاغت ہے۔ (از روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍo﴾ اور اللہ غالب ہے بدلہ لینے والا۔

"عزیز ای لایغلب" اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی غالب ہے، اس پر کوئی غالب نہیں ہوسکتا۔ (خازن)

"ای غالب امره یفعل مایشاء ویحکم مایرید" یعنی وہ اپنے حکم اور ارادہ پر غالب ہے، جو چاہے وہ کرتا ہے، اور جو ارادہ کرے اس کا وہ فیصلہ کرتا ہے۔ (روح المعانی)

"ذوانتقام" (بدلہ لینے والا) "نقمت الشئ وقمته اذانکرته اما باللسان واما بالعقوبة" نقم کا معنی ہے انکار کرنا، خواہ وہ زبان سے انکار کرے یا سزا دے کر انکار کرے۔زبان سے انکار کرنا ان آیات میں پایا گیا ہے۔﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ اَغْنَاهُمُ اللّٰهُ﴾ ﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ ﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّا﴾ اور نقمۃ بمعنی عقوبت ان آیات میں پایا گیا ہے ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنَاهُمْ فِی الْیَمِّ﴾ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا﴾ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فانظر كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ﴾ (مفردات راغب)

یہاں مراد عذاب دینا ہی ہے۔اللہ تعالیٰ انتقام لینے والا ہے، یعنی وہ تسلط رکھتا ہے عذاب دینے کا۔

"والعزیز اشارة الی القدرة التامة علی العقاب وذوالانتقام اشارة الی کونه فاعلا للعقاب والاول صفة الذات والثانی صفة الفعل" (والله اعلم)

"عزیز" سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے کی قدرت کاملہ حاصل ہے، اور "ذوانتقام" سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ عذاب کا فعل کا فاعل ہے۔اسطرح یہ واضح ہوگا کہ "عزیز" رب تعالیٰ کی صفت ذات ہے، اور "ذوانتقام" صفت فعل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ٥ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥﴾ (آل عمران آیت نمبر ۵،۶)

(1) اللہ پر کچھ چھپا نہیں زمین نہ آسمان میں ٥ وہی ہے کہ تمھاری تصویر بناتا ہے ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا۔

(2) بیشک اللہ نہیں چھپی اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمانوں میں ٥ وہی ہے جو تمہیں صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح وہ چاہتا ہے نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اس کے جو غالب ہے حکمت والا ہے۔

ماقبل سے تعلق : اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی "القیوم" وہ حی وقیوم ہے۔

"والقیوم هو القائم باصلاح مصالح الخلق ومهما تهم وكونه كذلك لا يتم الا بمجموع امرين احدهما ان يكون عالما بحاجاتهم على جميع وجوه الكمية والكيفية والثاني ان يكون بحيث متى علم جهات حاجاتهم قدر على دفعها"

قیوم کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی مصلحتوں کے مطابق اصلاح فرماتا ہے اوران کی مشکلات کو دور فرماتا ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک دو چیزیں نہ پائی جائیں ۔ایک یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں کی تمام حاجات کو جانتا ہو کمیت (مقدار) کے طور پر اور کیفیت کے طور پر بھی اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان کی حاجات کی وجوہ مکمل طور پر معلوم ہوں تاکہ ان کی مشکلات کو دور کیا جاسکے اوران کی حاجات کو پورا کیا جاسکے

پہلی چیز اس وقت تک مکمل نہیں جب تک تمام معلومات کا علم حاصل نہ ہو اور دوسری چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تمام ممکنات پر قدرت حاصل نہ ہو۔

فقوله "ان الله لا يخفى عليه شئ فی الارض ولا فی السماء" اشارة الى كمال علمه المتعلق بجميع المعلومات"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ دلالت کررہا ہے اس پر کہ اس ذات کبریاء کو تمام مخلوقات کی تمام ضروریات و حاجات کا مکمل علم حاصل ہے معلومات میں سے کوئی چیز

اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں خواہ وہ معلومات زمین سے متعلق ہوں یا آسمانوں سے اللہ تعالیٰ کو حاجات کی مقدار کا علم حاصل ہے اور ضروریات کے مراتب کا علم حاصل ہے کسی کے سوال سے وہ اعراض نہیں فرماتا بہت سوال کرنے والے لوگوں کے کثیر سوالات کی وجہ سے اسے کوئی اشتباہ نہیں ہوتا کہ فلاں نے کیا سوال کیا تھا اور فلاں نے کیا بلکہ اسے ہر ایک کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا فلاں سوال تھا اور دوسرے فلاں کا فلاں سوال تھا۔

"ثم قوله هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء" اشارة الی کونه تعالی قادرا علی جمیع الممکنات وحینئذیکون قادرا علی تحصیل مصالح جمیع الخلق ومنافعهم"

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ دلالت کر رہا ہے اس پر کہ وہ تمام ممکنات پر قادر ہے کہ تمام مخلوقات کی تمام مصلحتوں کو پورا کرے اور ان کے منافع انہیں پہنچائے۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسری آیت کریمہ پہلی پر دلیل ہے:

عقلی دلائل سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے کیونکہ

"ان افعال الله تعالی محکمة متقنة والفعل المحکم المتقن یدل علی کون فاعله عالما"

ہر شخص عقل شعور رکھنے والا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال محکم اور یقینی ہیں۔ فعل کا محکم اور یقینی ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس فعل کا فاعل (اس کام کو کرنے والا) کامل علم رکھتا ہے۔

جب عقلی دلیل سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا علم رکھنے والا ہے تو اب پتہ چلا کہ پہلی آیت ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ دعویٰ کے درجہ میں ہے کہ "بیشک اللہ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ آسمانوں میں۔ پھر اس پر عقلی دلیل قائم کی اور ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (رب تعالیٰ کی) وہ ذات ہے جو تمہیں صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جسطرح چاہتا ہے۔ یعنی وہ ماں کے پیٹ میں بچہ دانی کی تاریکی میں عجیب صورت اور عجیب جسم کی تخلیق فرماتا ہے، اور انوکھے انداز سے جسم کو مرکب کرتا ہے۔ مختلف شکلیں، مختلف طبیعتیں، مختلف صفات عطاء کرتا ہے، پھر جسم میں سخت ہڈیاں، نرم ہڈیاں، پھر موٹی رگیں یعنی شریان اور چھوٹی رگیں، اور پٹھے رکھے گئے۔

"ثم انه ضم بعضها الی بعض علی الترکیب الاحسن والتالیف الاکمل"

پھر ان تمام چیزوں کو اچھی خوبصورت ترکیب سے مرکب کیا اور جسم کی ساخت کو مکمل کیا۔

"وذلک یدل علی کمال قدرتہ" انسان کے جسم کی اس خوبصورت انداز میں تخلیق دلالت کر رہی ہے کہ اسے کامل قدرت حاصل ہے اس نے اپنی کامل قدرت کے ذریعے ہی تو نطفہ کے ایک قطرہ سے مختلف اعضاء بنائے، مختلف طبیعتیں بنائیں، اور مختلف شکلیں عطا فرمائیں، اور مختلف رنگ عطاء کئے۔

"ویدل علی کونہ عالما من حیث ان الفعل المحکم لایصدر الاعن العالم"

تو اسی سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ تمام معلومات کا عالم ہے، کیونکہ اس طرح کا محکم (پختہ) فعل صرف وہی کر سکتا ہے جس کا علم وسیع ہو۔

"فکان قولہ ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء" دلا علی کونہ قادرا علی کل المکنات روالا علی صحۃ ما تقدم عن قولہ" "ان اللہ لایخفی علیہ شیٔ فی الارض ولا فی السماء"

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ دلالت کر رہا ہے اس پر کہ وہ تمام ممکنات پر قادر ہے، اور اللہ تعالی کے پہلے ارشاد گرامی ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ جو دعوی پایا گیا ہے کہ رب تعالی کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے، اور وہ تمام مخلوقات کی حاجات کو جانتا ہے کیونکہ اس پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اس پر بھی یہ دوسری آیۃ دلیل بن گئی، کیونکہ عقل اسے تسلیم کرتی ہے کہ بغیر علم کے عجیب وغریب صورت ممکن نہیں۔

"واذاثبت انہ تعالی عالم بجمیع المعلومات وقادر علی کل الممکنات ثبت انہ قیوم المحدثات والممکنات"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالی کو تمام معلومات کا علم حاصل ہے، اور اسے تمام ممکنات پر قدرت حاصل ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ تمام حادث اور ممکن چیزوں (یعنی تمام مخلوق) کا قیوم ہے، کہ وہی ان کی مصلحتوں کو قائم کرنے والا ہے، وہی ان کی حاجات کو پورا کرنے والا ہے، وہی ان کی مشکلات کو دور کرنے والا ہے۔

زیر بحث یہ دونوں آیتیں رب تعالی کے "حی وقیوم" ہونے پر دلیل ہیں۔ اور اسی سے ان دونوں آیتوں کا ماقبل سے رابطہ اور تعلق بھی واضح ہو گیا۔ جس شخص نے بھی ان لطائف میں توجہ کر لی وہ سمجھ جائے گا کہ اللہ تعالی کا کلام کتنا ہی زیادہ فائدہ مند ہے، اور کتنی ہی اچھی ترتیب اس میں پائی گئی ہے، اور کتنا ہی زیادہ دلوں پر اثر کرنے والا ہے۔

شان نزول: نصاری کے وفد نے عیسی علیہ السلام کے الٰہ (معبود) ہونے میں دو دلیلیں قائم کیں، ایک کا تعلق عیسی علیہ السلام کے علم سے تھا اور دوسری کا تعلق قدرت سے تھا۔

نصاری کی پہلی دلیل : جو علم سے متعلق تھی وہ یہ تھی

"ان عیسی علیہ السلام کان یخبر عن الغیوب و کان یقول لهذا انت اکلت فی دارک کذا ویقول لذلک انک صنعت فی دارک کذا"

بیشک عیسی علیہ السلام غیبی خبریں دیتے تھے، کہ کسی کو کہتے تھے تم نے آج گھر میں یہ کھایا ہے، اور کسی کو کہتے تم نے اپنے گھر میں یہ کیا ہے یعنی فلاں چیز جمع کر کے رکھی ہے۔

قرآن پاک نے اسی کو بیان کیا ﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ (عیسی علیہ السلام نے کہا) اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے اور جو تم اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو۔ نصاری کی دلیل کا یہ مطلب تھا کہ علم غیب صرف معبود کو حاصل ہوتا ہے، لهذا عیسی علیہ السلام خدا تھے۔

نصاری کی دوسری دلیل: عیسی علیہ السلام کے معبود ہونے پر ان کی دوسری دلیل کا تعلق قدرت سے تھا۔

"وهو ان عیسی علیہ السلام کان یحیی الموتی ویبرء ی الاکمه والابرص ویخلق من الطین کهیئة الطیر فینفخ فیه فیکون طیرا"

کہ عیسی علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور مادرزاد اندھے کو نظر عطا کرتے تھے، اور مرض والے کو تندرست کر دیتے تھے، اور کیچڑ سے پرندے کی شکل بناتے اس میں روح پھونکتے وہ پرندہ بن جاتا۔ قرآن پاک میں بھی آپ کے ان معجزات کا ذکر ہے"

اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ" (آل عمران، آیۃ نمبر ۴۹)

بیشک میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرند ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے۔ اور میں شفاء دیتا ہوں مادر زاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے، اس سے پتہ چلا کہ جب عیسی علیہ السلام کو یہ قدرت حاصل ہے تو آپ (معاذ اللہ) معبود ہی تھے۔

یہ دونوں دلیلیں جب نصاری نے پیش کیں تو رب تعالی نے ان کا رد کرنے کیلئے ان دو آیتوں کو نازل کیا۔

ان کی پہلی دلیل کا رد:

پہلی آیۃ کریمہ سے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ بیشک اللہ تعالی

پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ آسمانوں میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جو تمام مخلوق کا خالق ہے، "والخالق لابد ان یکون عالما بمخلوقه" اور خالق کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوق کا علم رکھے۔

"ومن المعلوم بالضرورة ان عیسی علیه السلام ماکان عالما بجمیع المعلومات والمغیبات"

اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ عیسی علیہ السلام کو تمام مخلوق کا علم نہیں تھا اور تمام چیزوں کا علم غیب حاصل نہیں تھا تو واضح ہوا کہ آپ الہ (معبود) بھی نہیں تھے، آپ کو اگرچہ بعض علوم غیبیہ حاصل تھے۔

"انه لایلزم من کونه عالما ببعض المغیبات ان یکون الها"

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعض علوم غیبیہ جسے حاصل ہوں وہ معبود بھی ہو۔

اور عیسی علیہ السلام کو جو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء اور اس کی تعلیم اور وحی کے ذریعے حاصل تھے۔ "ولکن عدم احاطته ببعض المغیبات یدل دلالة قاطعة علی انه لیس باله" اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ بعض غیبی چیزوں کا علم حضرت عیسی علیہ السلام کو حاصل نہیں تھا جسے بعض علوم غیبیہ حاصل ہوں اور بعض حاصل نہ ہوں وہ الہ (معبود) نہیں ہوسکتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ نصاری کہتے تھے کہ عیسی علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تھا اور انہوں نے موت کے وقت جزع وفزع کی اگر آپ کو تمام علوم غیبیہ حاصل ہوتے تو آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ ایک قوم میرے قتل کا ارادہ رکھتی ہے اور مجھے پکڑنا چاہتی ہے جس سے مجھے ایذاء اور درد حاصل ہوگا۔ "فکان یفر قبل وصولهم الیه" آپ ان لوگوں سے بھاگ کر اپنی جان بچا لیتے جب آپ نصاری کے قول کے مطابق اپنی جان نہیں بچا سکے تو آپ جو تمام علوم غیبیہ بھی حاصل نہیں تھے۔

" فثبت ان الاستدلال بمعرفة بعض الغیب لایدل علی حصول الالٰهیة واما الجهل ببعض الغیب یدل قطعا علی عدم الالهیة"

تو ثابت ہوا کہ بیشک بعض علوم غیبیہ کے حاصل ہونے سے معبودیت پر دلیل نہیں پکڑی جاسکتی اور خاص کر کے یہ اقرار بھی کرنا کہ عیسی علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل نہیں تھے یہ تو بہت پختہ قطعی دلیل ہے کہ وہ الہ (معبود) نہیں تھے۔

خیال رہے کہ یہ الزامی جواب ہے کہ جب تم عیسی علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ ان کو قتل کر دیا گیا' اور انہوں نے موت کے وقت چیخ وپکار کی تو تمہارا یہ عقیدہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کو تمام علوم غیبیہ حاصل نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے بھاگ کر نہیں بچا سکے ورنہ حضرت عیسی علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو زندہ اٹھا لیا گیا جس کا تذکرہ انشاء اللہ آگے تفصیلی طور پر آئے گا۔ واضح ہو کہ نصاری کا عقیدہ بھی باطل ہے اور ان کے دلائل باطل ہیں

عیسیٰ علیہ السلام کو معبود ماننا سراسر کفر ہے۔

نصاریٰ کی دوسری دلیل کا رد:

نصاریٰ نے جب یہ دلیل پکڑی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قدرت حاصل تھی مردہ کو زندہ کرنے کی اور وہ مٹی کی مورتی میں روح پھونک کر پرندہ بنا لیتے تھے، تو رب تعالیٰ نے ان کے رد کیلئے زیر بحث دو آیتوں میں سے دوسری آیت کریمہ کو نازل کیا اور ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ (وہ صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں جیسے چاہتا ہے) اس سے پتہ چلا کہ "حصول الاحیاء والاماتة علی وفق بعض الصور لا یدل علی کونه الها" بعض صورتوں کو زندہ کرنے یا موت دینے کی قدرت حاصل ہونے سے الوہیت (معبودیت) حاصل نہیں ہوتی۔ اور خاص کر کے قدرت بھی وہ جو رب تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عزت افزائی کیلئے انہیں عطاء کی ہو اور آپ کو بطور معجزہ عطاء کی ہو اسے دلیل ماننا "کہ آپ معبود تھے" باطل ہے۔

"اما العجز عن الاحیاء فی بعض الصور یدل علی عدم الالهیة وذلک لان الاله هو الذی یکون قادرا علی ان یصور فی الارحام من قطرة صغیرة من النطفة هذا الترکیب العجیب والتالیف الغریب"

لیکن نصاریٰ کا بھی یہ تسلیم کرنا کہ بعض صورتوں (مورتیوں) کو زندہ کرنے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طاقت حاصل نہیں تھی اسی سے پتہ چلا کہ آپ کو الوہیت بھی حاصل نہیں تھی اس لئے کہ الٰہ تو وہ ہے جو ماؤوں کے پیٹوں میں بچہ دانیوں میں نطفہ کے ایک چھوٹے سے قطرہ سے عجیب وغریب صورت انسان کی شکل میں معرض وجود میں لاتا ہے۔

"ومعلوم ان عیسی علیه السلام ما کان قادرا علی الاحیاء والاماتة علی هذا الوجه"

یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کی طرح زندہ کرنے کی طاقت حاصل نہیں تھی بعض مردوں کو زندہ کرنے کی رب تعالیٰ کی طرف سے قدرت دیا جانا یا بعض مورتیوں کو زندگی عطاء کرنے سے ان کا معبود ہونا لازم نہیں آتا۔

اور خاص کر کے نصاریٰ کے باطل عقیدہ کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تو آپ کو اگر قدرت حاصل ہوتی تو اپنے قاتلین کی روحیں قبض کر لیتے، جب آپ یہ نہیں کر سکتے تو اس سے خود بخود لازم ہو گیا کہ آپ کو جمیع قدرتیں حاصل نہیں تھیں۔

"اما عدم حصول الاماتة والاحیاء علی وفق مراده فی سائر الصور یدل علی انه ما کان الها"

جب آپ کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق زندہ کرنے اور مارنے کی تمام قدرت حاصل نہیں تھی، بلکہ صرف رب تعالیٰ

کی طرف سے دی گئی کچھ قدرت وطاقت حاصل تھی تو واضح ہو گیا کہ آپ الٰہ (معبود) نہیں تھے۔

اللہ کا بیٹا کہنے والوں کی دلیل اور اس کا رد:

نصاری کے دوسرے فرقہ نے مسلمانوں سے یہ کہا۔"ایها المسلمون انتم انتم توافقونا علی انه ما کان له اب من البشر فوجب ان یکون ابناله" اے مسلمانو جب تم بھی اس میں ہمارے ساتھ اتفاق رکھتے ہو کہ عیسی علیہ السلام کا کوئی انسان باپ نہیں تھا تو اسے بھی تسلیم کرلو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا ہو۔ تو رب تعالی نے ان کے رد میں اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ اس آیۃ کریمہ سے جب یہ پتہ چل گیا کہ بچہ دانیوں میں صورتیں تو اللہ تعالی ہی عطاء کرتا ہے جس طرح چاہے، تو اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا "فان شاء صوره من نطفة الاب وان شاء صوره ابتداء من غیر الاب" کہ اگر چاہے تو باپ کے نطفہ سے کسی کو صورت عطاء کردے اور اس کے جسم کی تخلیق کردے، اور اگر چاہے تو بغیر باپ کے ابتدائی طور پر ہی کسی کو صورت عطاء کردے اور اسکے جسم کی تخلیق کردے۔ باپ کے بغیر پیدا ہونے کو اللہ کا بیٹا ہونے پر دلیل بنانا جہالت وحماقت ہے اور رب تعالی کی قدرت "کن فیکون" کا صراحۃ انکار ہے۔

نصاری کی ایک اور دلیل کا رد اگلی آیۃ کریمہ میں:

نصاری نے جب رسول اللہ ﷺ کو یہ کہا۔ "الست تقول ان عیسی روح الله و کلمته فهذا یدل علی انه ابن الله" کیا تم نہیں کہتے ہو کہ عیسی علیہ السلام اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں؟ جب یہ کہتے ہو تو اسی سے واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا بیٹا ہیں۔ تو ان کے رد میں آنے والی آیۃ کریمہ کو نازل کیا ﴿هُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے) اور اس آیۃ کریمہ سے واضح کہ "روح الله اور کلمة الله" سے خدا کا بیٹا ہونے پر تمہارا استدلال باطل کیونکہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے مطالب کو سمجھنے سے ہی قاصر ہو، مکمل تفصیل ہر ایک کی ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

ابتداء سے لے کر آنے والی آیۃ کریمہ تک نصاری کا رد:

رب تعالی نے اپنی صفت "الحی القیوم" سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ حضرت عیسی علیہ السلام نہ خدا تھے اور

نہ خدا کا بیٹا اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اے نصاری تمہارا یہ کہنا کہ عیسی علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے اس لئے وہ معبود ہیں'' غلط اور باطل ہے، الہ تو وہ ہے جس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔ اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ﴾ نصاری کے اس استدلال کا رد ہے۔ کہ عیسی علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے اور مٹی کی مورتی بنا کر روح پھونک کر پرندہ بنانے کی طاقت حاصل تھی جو ان کے معبود ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے اس قول کا رد یوں کیا گیا کہ بعض چیزوں کی قدرت رب تعالی کی طرف سے کسی کو عطاء ہونے سے اسے معبودیت حاصل نہیں ہوتی، اور اسی سے ان کی اس دلیل کا بھی رد کر دیا گیا کہ عیسی علیہ السلام کا کوئی انسان جب باپ نہیں تھا تو وہ خدا کا بیٹا ہیں، اور رب تعالی نے ﴿هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ﴾ سے ان کی اس دلیل کا رد کیا کہ عیسی علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں لھذا خدا کا بیٹا ہیں۔ ان کا رد کیا کہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے ان الفاظ کے مطالب سمجھنے سے قاصر ہو۔ اور ''لا الہ الا ھو العزیز الحکیم'' کلمہ توحید سے نصاری کے تمام فرقوں کا رد بھی کر دیا گیا اور ان پر زجر بھی کر دی گئی۔ کہ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں لھذا عیسی علیہ السلام معبود بھی نہیں اور معبود کا بیٹا بھی نہیں اور معبود کے ساتھ شریک بھی نہیں۔ اس سے نصاری کے تینوں فرقوں کا رد ہو گیا، عیسی علیہ السلام کو خدا کہنے والوں کا بھی، اور خدا کا بیٹا کہنے والوں کا بھی، اور خدا کے ساتھ تیسرا معبود کہنے والوں کو بھی۔ ''فالعزیز اشارۃ الی کمال القدرۃ'' رب تعالی نے اپنی صفت عزیز ذکر فرما کر اپنی کامل قدرت کا ذکر فرما دیا کہ وہ غالب ہے، اس پر کوئی غالب ہیں، لھذا رب تعالی کو وحدہ لا شریک لہ نہ ماننے والوں کو اور اس کو اولاد سے پاک نہ ماننے والوں کو وہ اپنی گرفت میں لے گا، اس کی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔ ''والحکیم اشارۃ الی کمال العلم'' اور رب تعالی نے اپنے صفت ''حکیم'' ذکر کر کے اپنے کامل علم کی طرف اشارہ فرما دیا۔

ساری بحث کا خلاصہ:

قرآن پاک میں یہ عظمت پائی گئی ہے کہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' میں پہلی تمام آیات کا مفہوم سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

''وھو تقریر لما تقدم من ان علم المسیح ببعض الغیوب وقدرتہ علی الاحیاء والاماتۃ فی بعض الصور لایکفی فی کونہ الھا فان الالہ لا بد وان یکون کامل القدرۃ وھو العزیز وکامل العلم وھو الحکیم''

رب تعالیٰ کا ارشادِ گرامی "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" پچھلے تمام مضمون کو حاوی ہے اور اس کی تاکید اور وضاحت اس میں موجود ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بعض علوم غیبیہ حاصل تھے اور زندہ کرنے اور مارنے کی کچھ قدرت حاصل تھی یہ معبود بننے کیلئے کافی نہیں۔ معبود تو وہ ہے جو کامل قدرت کا مالک ہے، کامل قدرت کا تو وہی مالک ہے جو عزیز ہے، اور معبود تو وہ ہے جو کامل علم رکھتا ہو، کامل علم اسے ہی حاصل ہے جو حکیم ہے۔

جب عزیز بھی رب تعالیٰ ہی ہے اور حکیم بھی رب تعالیٰ ہی ہے تو یقیناً معبود بھی صرف وہی ہے، اس کے بغیر کوئی معبود حقیقی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی خبر دی کہ اس پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں زمین میں اور نہ ہی آسمانوں میں۔ اس سے یہ پتہ چل گیا "فهو العالم بما كان ومايكون ومالايكون" کہ اللہ تعالیٰ کو "ما کان" اور "مایکون، ما لایکون" جو کچھ ہو چکا ہے، جو کچھ ہونا ہے، جو کچھ نہیں ہونا سب کا علم ہے۔ اسی سے ضمناً یہ بات سمجھ آ گئی "فكيف يكون عيسى الها او ابنا له وهو تخفى عليه الاشياء" کہ عیسیٰ علیہ السلام کس طرح "الٰہ" بن سکتے ہیں، یا اللہ کا بیٹا کیسے بن سکتے ہیں، ان پر تو بہت سی چیزیں پوشیدہ رہیں، "الٰہ" تو وہ ہے جس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہ رہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

صرف زمین و آسمان کے ذکر کا کیا مطلب؟

بظاہر وہم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اسی طرح زمین و آسمان کے درمیان فضاء میں بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اور آسمانوں سے اوپر بھی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، صرف آسمانوں اور زمین کے ذکر کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے "وانما عبر عن العالم بهما لان الحس لايتجاوزهما" کہ اصل مقصد بیان یہ ہے کہ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام معبود نہیں اس پر دلیل جو قائم کی گئی تھی کہ وہ علوم غیبیہ جانتے ہیں لھذا معبود ہیں اس کا رد کیا گیا کہ وہ تو بہت چیزوں کو نہیں جانتے تھے الٰہ تو وہ ہے جس پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں صرف زمین و آسمانوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو سمجھانا مقصود تھا ان کی حس اور سمجھ کا تعلق زمین اور آسمانوں سے ہی فقط تھا اس لئے ان دونوں چیزوں کا ذکر کر دیا گیا۔ (مظہری)

راقم کے نزدیک "فضاء یا آسمانوں سے ماوراء بھی زمین آسمان کے ذکر میں آجاتے ہیں اس لئے کہ فضاء تو زمین و آسمان کے تابع ہے لیکن "سماء" کا معنیٰ "علا" (بلند ہونا) جب لیا جائے تو خود لفظ "سماء" آسمانوں اور آسمانوں سے ماوراء کو شامل ہے۔ زمین کو مقدم ذکر کیا گیا اور آسمانوں کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے "ان المقصود

بالذکر انه تعالی یعلم اعمال العباد فیجاز یهم علیه " کیونکہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے یہ بھی واضح کردیا جائے کہ اللہ تعالی بندوں کے اعمال کو جانتا ہے۔ اوران کو اس کا بدلہ دے گا بندوں کے اعمال کا تعلق زمین سے ہی ہے اس لئے پہلے زمین کا ذکر دیا گیا۔ (مظہری)

"لا یخفی علیه شیئ "تحذیر من مخالفته سرا و جهرا و وعید علیه با لمجازاة"

اللہ تعالی نے اپنی صفت بیان کردی کہ اس پر کوئی چیز چھپی نہیں لھذا جس نے اس کی مخالفت کی خواہ پوشیدگی میں یا ظاہر طور پر اللہ تعالی ان کو اسی طرح بدلہ دے گا یعنی "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَافِی السَّمَآءِ " سے لوگوں کو بداعمالیوں پر گرفت کی دھمکی دی گئی۔ اسی سے عیسی علیہ السلام کو الہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ کا شریک ماننے والوں کو بھی دھمکی دے دی گئی کہ جب اللہ تعالی پر زمین اور آسمانوں کی کوئی چیز چھپی نہیں لھذا وہ تمھارے باطل عقیدہ کو جانتا ہے وہ تمہیں اپنی گرفت میں لے گا زمخشری نے کہا اس سے یہ پتہ چل گیا "هو مطلع علی کفر من کفر و ایمان من آمن وهو مجاز یهم علیه " کہ اللہ تعالی کافروں کے کفر پر مطلع ہے اور ایمان والوں کے ایمان پر لھذا ان کو جزاء دے گا۔ ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسی آیہ کریمہ سے یہ واضح ہو گیا "لا یخفی علیه شئی من الامور الخفية عن الخلق فكيف تخفی علیه اعمالكم التی هی ظاهرة عندكم " کہ جب اللہ تعالی پر وہ چیزیں بھی مخفی نہیں جو مخلوق پر مخفی ہیں تو اس پر اے انسانو تمھارے اعمال کیسے پوشیدہ رہ سکتے ہیں وہ تمہیں ضرور جزاء دے گا۔ ان تمام اقوال سے یہ واضح ہو گیا کہ آیہ کریمہ میں ضمناً وعید (دھمکی) پائی گئی۔

وقال الراغب لا یخفی علیه شئی ابلغ من یعلم فی الاصل وان کا ن استعمال اللفظین فیه یفید ان معنی واحدا "المفردات "

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ رب تعالی نے یہ بیان فرمایا ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَایَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ﴾ (بیشک اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں) اور یہ نہیں فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ کُلَّ شَیۡءٍ﴾ بیشک اللہ تعالی ہر چیز کو جانتا ہے اگرچہ دونوں کا بظاہر مطلب ایک ہی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَایَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ﴾ میں زیادہ مبالغہ پایا گیا ہے۔ (البحر المحیط)

راقم کے نزدیک دونوں جملوں کو جب رب تعالی کی طرف منسوب کی جائے تو فرق واضح نہیں البتہ بندوں کی طرف منسوب کرنے میں فرق ہے بعض لوگوں نے رب تعالی کو بندوں کی طرح ہی سمجھا تھا اس لئے ان کو سمجھانے کیلئے علامہ راغب کا قول صحیح ہے۔ کیونکہ بندوں کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ فلاں بندہ اس چیز کے متعلق

سب کچھ جانتا ہے تو اس میں یہ وہم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی ہو تو جاننے کے باوجود علم حاصل نہ ہو اور جب کسی چیز کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں پر یہ کسی طرح پر پوشیدہ نہیں تو اس میں یہ وہم نہیں ہوگا کہ ان نے اس طرف توجہ نہ کی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ یا عدم توجہ کی نسبت نہیں ہو سکتی (واللہ اعلم بالصواب) (راقم)

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ﴾

"وہی ہے جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں جس طرح چاہے"

"ھو" وہ "الذی" جو کہ" اصل میں ترجمہ یہ ہے" وہ ذات وہ ہی جو" لیکن مختصر ترجمہ یہ ہے" وہی ہے" اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے ناقل نے بھی وہی نقل کیا ہے

"یصورکم" التصویر جعل الشئ علی الصورۃ والصورۃ ھیئۃ یکون علیھا الشئ بالتالیف"

"تصویر" کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو صورت پر بنانا، صورت اس شکل کو کہتے ہیں جس پر کسی چیز کو بنایا گیا ہو۔

"صور یصور" کا معنی تصویر بنانا بھی ہے، اور شکل وصورت عطاء کرنا بھی ہے (خازن)

"فی الارحام" رحم (راء کے کسرہ سے) ماں کے پیٹ میں بچہ دانی کو کہتے ہیں، جس میں بچہ قرار پکڑتا ہے۔ جس عورت کے رحم میں درد ہو اس کیلئے لفظ استعال ہوتا" امرأۃ رحوم" قریبی رشتہ داروں کو بھی رحم کہا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ بھی ایک رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

"کیف یشــــاء" جس طرح چاہے، یعنی تمہیں ماؤں کے پیٹ میں بچہ دانیوں میں صورتیں عطاء کرتا ہے، یعنی تمہاری صورتیں بناتا ہے جس طرح چاہے۔ تخلیق میں رب تعالیٰ مختلف صورتیں بناتا ہے، کوئی مذکر، کوئی مونث، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی خوبصورت، کوئی بدصورت، کوئی کامل، کوئی ناقص۔

"والمعنی انه الذی یصورکم فی ظلمات الارحام صورا مختلفة فی الشکل والطبع واللون وذلک من نطفة"

مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نطفہ سے تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تاریک بچہ دانیوں میں تمہاری مختلف صورتیں بناتا ہے۔

❁ عن ابن مسعود قال حدثنا رسول اللہ ﷺ وھو الصادق المصدوق ان خلق احدکم یجمع فی بطن امه اربعین یوما نطفة ثم یکون علقة مثل ذلک ثم یکون مضغة مثل ذلک ثم یبعث اللہ ملکا باربع کلمات فیکتب عمله واجله ورزقه وشقی او سعید

ثم ینفخ فیه الروح فو الذی لااله غیر ہ احدکم لیعمل بجمل اهل الجنة حتی مایکون بینه وبینها الاذراع فیسبق علیه فیعمل بعمل اهل النار فید خلها وان احدکم لیعمل بعمل اهل النار حتی مایکون بینه وبینها الاذراع فیسبق علیه الکتاب فیعمل اهل الجنة فیدخلها" (بخاری ومسلم مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، وہ جو صادق ومصدوق ہیں بیشک تم میں سے ہر ایک ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ کی حیثیت میں جمع رہتا ہے، پھر اسی کی مثل (چالیس دن) گاڑھا خون بن کر رہتا ہے، پھر اسی کی مثل (چالیس دن) گوشت کا ٹکڑا (لوتھڑا) بن کر رہتا ہے، پھر اللہ تعالی اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے چار کلمات کے ساتھ، یعنی وہ فرشتہ اس کا عمل، اور اس کی موت کا وقت اور اس کا رزق اور بدبخت ہونا یا نیک بخت ہونا لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک تم میں سے کوئی ایک جنت والے عمل کرتا رہتا ہے۔

یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں (جہنم والوں) کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ آگ میں داخل ہو جاتا ہے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں (جہنم والوں) کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ آگ میں داخل ہو جاتا ہے، اور بیشک تم میں سے کوئی ایک آگ والوں کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور آگ کے درمیان صرف ایک ذراع کا فیصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب اس پر سبقت کر جاتی ہے تو وہ جنت والوں کا عمل شروع کر دیتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وضاحت حدیث:

"وهو الصادق المصدوق" نبی کریم ﷺ صادق ومصدوق ہیں۔ "وان یکون من عادته ذلک" یعنی آپ کی یہ عادت شریفہ تھی کیونکہ آپ کے یہ اوصاف حمیدہ آپ کو ہمیشہ کیلئے حاصل تھے اسی وجہ سے یہ جملہ حالیہ نہیں بلکہ معترضہ ہے تاکہ آپ کے تمام احوال کو شامل رہے

"الصادق فی جمیع افعاله حتی قبل النبوة لما کان مشهورا فیما بینهم بمحمدالامین الصادق"
نبی کریم ﷺ تمام افعال میں سچے تھے، نبوت سے پہلے بھی آپ کی صداقت مشہور ومعروف تھی، اسی وجہ سے آپ امین اور صادق کے لقب سے مشہور تھے۔

"المصدوق فی جمیع ماأتاه من الوحی الکریم" آپ کے پاس جو وحی کریم آئی اس نے آپ کو سچا

کہا، یعنی نبی کریم ﷺ کی صداقت کی وحی کے ذریعے تصدیق کردی گئی۔ "المصدوق" کا استعمال اسی طرح ہے جیسا کہ ان جملوں میں "صدق" استعمال ہوا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "صدقه زید" زید نے اس سے سچ کہا، اور رسول اللہ ﷺ نے ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا "فصدقنی" زید نے مجھ سے سچ کہا، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو جب ابلیس نے بتایا کہ تم رات کو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو، تو چوروں سے محفوظ رہو گے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقک وھو کذوب" اس نے تمہیں سچ کہا ہے، وہ خود جھوٹا ہے۔ چالیس دن تک نطفہ رحم میں رہتا ہے، اس کی تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت میں پائی گئی ہے۔

"عن ابن مسعود ان النطفة اذا وقعت فی الرحم فاراد الله ان یخلق منها بشرا طارت فی بشرة المراة تحت کل ظفر وشعر ثم تمکث اربعین لیلة ثم تنزل دما فی الرحم فذلک جمعها"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نطفہ ماں کے پیٹ میں جب پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ اس سے انسان پیدا کرے تو وہ نطفہ اس عورت کے تمام چمڑے میں سرایت کر جاتا ہے یہاں تک کہ ناخنوں اور بالوں کے نیچے بھی پہنچ جاتا ہے۔ پھر چالیس راتوں تک اسی کیفیت میں وہ نطفہ ہی رہتا ہے، پھر وہ خون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور ماں کے پیٹ میں بچہ دانی میں اسی طرح یعنی چالیس راتیں رہتا ہے۔

"قال ﷺ ان الله اذا اراد خلق عبد فجامع الرجل المراة طار ماؤه فی کل عرق وعضو منها فاذا کان یوم السابع جمعه الله ثم احضره فی ای صورة ماشاء رکبک"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جب ارادہ فرماتا ہے کسی بندے کی تخلیق کا تو مرد عورت سے جماع کرتا ہے، وہ نطفہ عورت کے ہر عضو اور ہر رگ میں جاتا ہے، جب ساتواں دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایک جگہ (رحم میں) کر دیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس صورت میں چاہے اسے مرکب کر کے ظاہر کر دیتا ہے، یعنی اچھی یا بری صورت میں سفید یا سیاہ رنگ میں انسان کو رب تعالیٰ پیدا فرما دیتا ہے۔

چالیس دنوں میں خصوصی حکمت:

"قال الصوفیة خصوصیة الاربعین لموافقته تخمیر طینة آدم ومیقات موسی ثم انه یعجن النطفة بتراب قبره کما ورد فی تفسیر "منها خلقنا کم" ان الملک یاخذ من تراب مدفنه فیبذ دها علی النطفة ولکونه سلالة من الطین"

صوفیاء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ کا چالیس دن رات ٹھہرنا، پھر خون بن کر چالیس دن ٹھہرنا پھر

گوشت بن کر چالیس دن ٹھہرنا اس میں حکمت یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر بھی چالیس دن تک رہا پھر اس میں روح پھونکی گئی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلا کر چالیس راتوں کے مکمل ہونے پر توراۃ عطاء کی گئی، اسی طرح انسان کی تخلیق میں بھی چالیس چالیس راتوں کے بعد تبدیلی کی جاتی ہے تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی جھلک بھی اس میں پائی جائے، اور موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ ملنے کی جھلک بھی پائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو یہ پتہ چلے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اس پر آپ کو بطور انعام اللہ کی کتاب توراۃ عطاء کی گئی، تو اسی سے پتہ چل جائے گا کہ چالیس دن تک قرآن پاک کی تلاوت کر کے اور کلمہ شریف پڑھ کر اور درود شریف پڑھ کر جب میت کیلئے دعاء کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھی جائے کہ اس دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہوگا، فوت شدہ انسان کی مغفرت ہوگی اور پڑھ کر دعاء کرنے والا اجر و ثواب پائے گا۔ (راقم)

پھر نطفہ کو قبر کی مٹی سے ملا کر، مٹی کو گوندھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ مفسرین کرام نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ﴾ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے، کہ فرشتہ اس کی قبر سے مٹی لیتا ہے اور اسے نطفہ پر بکھیر دیتا ہے، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے انسان کی تخلیق میں بیان کیا ہے ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ﴾ اور بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا۔ (المؤمنون، آیۃ نمبر ۱۲)

انسان کے مختلف رنگوں اور اخلاق کی وجہ:

"جاء مختلف الالوان والاخلاق حسب اختلاف اجزاء الطین بل بحسب اخلاق المرکبات من الطین فیه حرص النملة والفارة وشهوة العصفور وغضب الفهد وکبر النمر وبخل الکلب وشره الخنزیر وحقد الحیة وغیر ذلک من ذمائم الصفات وفیه شجاعة الاسد وسخاوة الدیک وقناعة البوم وحلم الجمل وتواضع الهرة ووفاء الکلب وبکور الغراب وهمة البازی ونحوها من محاسن الاخلاق"

چونکہ مٹی کے مختلف رنگ ہیں، جس طرح کی مٹی کا ذرہ اس کی قبر کی جگہ سے لے کر اس کے نطفہ سے ملایا جائے گا وہی رنگ اسے حاصل ہوگا، سیاہ ہو یا سفید ہو۔ جس طرح مٹی کے اوصاف ہوں گے اسی طرح کے اوصاف بھی انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ مٹی سے مرکبات باقی مخلوق کی صفات بھی انسان میں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ بری صفات ہوں یا اچھی صفات ہوں۔ چھینوٹی اور چوہیا کی حرص، اور چڑے کی شہوت، اور تیندوے کا غضب' اور چیتے کا تکبر، اور کتے کا بخل، اور خنزیر کی شرانگیزی، اور سانپ کا کینہ (کھوٹ، انسان کی دشمنی) وغیرہ حیوانوں کی بری صفات مجموعی طور پر

انسان میں پائی جاتی ہیں۔اور حیوانوں کی اچھی صفات کا مجموعہ بھی انسان کو حاصل ہے جیسا کہ شیر کی شجاعت وبہادری، مرغ کی سخاوت، اور الو کی قناعت، اور اونٹ کا حلم (حوصلہ وبردباری) اور بلی کی تواضع، اور کتے کی وفا، اور کوے کا احتیاط (چوکنا رہنا) اور باز کی ہمت انسان کو حاصل ہیں۔

(**الـفـهـد**، درندہ کی ایک نوع جو کہ کتے سے بڑا اور چیتے سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کے بدن پر چھوٹے چھوٹے سیاہ داغ ہوتے ہیں، اس کو تینداوا کہتے ہیں، (جمع) **فهود و افهد**، "**الفهدة**" **فهد** کا مؤنث تیندوے کی مادہ، (جمع) **فهدات**، "المنجد"

انسان کی آہستہ تخلیق میں فوائد:

(۱) اگر انسان کی ایک مرتبہ ہی (دفعۃ واحدۃ) تخلیق کردی جاتی تو ماں پر مشکل درپیش آتی اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر بیماری آتی، اس لئے چالیس دن تک نطفہ رکھا تاکہ اس کو برداشت کی عادت ہو جائے، پھر گاڑھا خون بنا کر بھی چالیس دن تک رکھا تاکہ اس کی عادت ہو جائے، پھر چالیس دن تک گوشت بنا کر رکھا، اسی طرح ولادت تک آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی کی گئی تاکہ عورت ان مختلف حالات کو برداشت کر سکے۔

(۲) آہستہ آہستہ مختلف حیثیات وکیفیات میں تبدیلی کی طرف اگر انسان غور کرے کہ نطفہ وخون سے اسے کیسے حسین صورت عطاء کی گئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ونعمت کو دیکھ کر رب تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اس کا شکریہ ادا کرے گا۔

(۳) "**وعنها ارشاد الناس وتنبيههم على كمال قدرته على الحشر**" آہستہ آہستہ مختلف حالات کے بعد کرنے میں جس ذات کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ نطفہ سے گاڑھا خون اور گاڑھے خون سے گوشت کا لوتھڑا بنا لیتا ہے اور اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے انسانی شکل میں معرض وجود میں لے آتا ہے وہ حشر میں سب کو جمع کرنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے۔

(۴) "**ومنها بل اظهرها تعليم العباد فى تدريج الامور وعدم تعجيلهم فيها فانه تعالى مع كمال قدرته وقوته على خلقه دفعة واحدة حيث خلقه مدرجافان الانسان اولى به الثانى فى فعله**"

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ بندوں کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ تم کام کرو تو آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو کامل قدرت اور قوی طاقت حاصل ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ سب کو "کن" کہے تو تمام مخلوق "فیکون" ہو جائے (معرض وجود میں آجائے) یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ "آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا"۔

(۵) ”ومنها تنبيههم اصلهم وفرعهم فلايغتروا بقوة ابدانهم واعضائهم وحواسهم ويعرفوا انها كلها عطايا وهدايا بل على وجه العارية موجودة عندهم لينظروا فی مبدئهم“

اور آہستہ آہستہ انسان کی تخلیق سے لوگوں کو اس پر خبردار کرنا اور سمجھانا مقصود ہے کہ تم اپنی اصلی، ابتدائی حالت کو دیکھو اور اب موجودہ حالت کو دیکھو، اسلئے تم اپنے بدن کی طاقت اور اعضاء کی طاقت اور اپنے حواس کو دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑو کہ تم اسی طرح تھے، نہیں نہیں، تم کمزور پانی (نطفہ) سے بنے ہو یہ طاقت، اور حواس تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عطاء سے حاصل ہوئے ہیں۔ بلکہ اے انسان اگر تو یہ خیال کرے کہ تیرے حواس اور اعضاء تو تجھے حاصل ہیں جیسے کسی کو (عـــاریۃ) (منگوی) کوئی چیز دی جائے، پھر اس سے واپس لے لی جائے، تجھ سے بھی سب کچھ واپس لے لیا جائے گا، اس لئے انسان اپنی ابتداء کو دیکھے گا تو اسے موت بھی یاد آئے گی، جسے موت یاد ہو اسی کے اعمال بھی اچھے ہوں گے وہی دین و دنیا میں کامیاب رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾ انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ اور حدیث شریف میں ہے ”من عرف نفسه عرف ربه“، جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

”ثم يبعث الله اليه ملكا باربع كلمات فيكتب عمله واجله ورزقه وشقی اوسعيد ثم ينفخ فيه الروح“

جس حدیث شریف کی وضاحت کی جارہی ہے یہ الفاظ مبارکہ اس کے ہیں، یعنی جب چالیس دن کے اس پر تین دور گزر جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتا، فرشتے کو بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ فرشتے کو حکم دیتا ہے ”باربع كلمات ای بكتابتها وكل قضية تسمی كلمة قولا كان اوعملا“ کہ اس کیلئے چار فیصلے لکھ دو، ہر فیصلہ کو کلمہ سے تعبیر کردیا گیا خواہ وہ فیصلہ زبانی ہو یا عملی ہو۔

”(فيكتب عمله) من الخير اوشر“ تو وہ فرشتہ اس کے عمل لکھ لیتا ہے خواہ اس کے عمل اچھے ہوں یا برے۔

”(واجله) مدة حياته اوانتهاء عمره“ اور اس کی ”اجل“ یعنی اس کی زندگی کی مدت اور عمر کی انتہاء لکھ لیتا ہے۔

”(ورزقه) يعنی انه قليل او كثير وغيرهما مما ينتفع به حلالا كان او حراما ماكولا اوغيره فيعين له وينقش فيه“

اور اس کا رزق لکھ لیا جاتا ہے، خواہ اسے تھوڑا ملنا ہو یا زیادہ، ہر وہ چیز جس نے اسے نفع پہچانا ہو وہ رزق ہی ہے، وہ لکھ دیتا ہے خواہ حلال ہو یا حرام، کھانے والی چیز ہو یا نہ کھانے والی، وہ تمام چیزیں جو اس نے تمام عمر میں حاصل کرنی ہیں ان کو معین کردیا جاتا ہے اور لکھ لیا جاتا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ تمام چیزیں لوح محفوظ میں پہلے ہی لکھی ہوئی ہیں، دوبارہ لکھنا اس لئے ہوگا کہ انسان

کو اس پر خبردار کیا جائے کہ تو خود مختار۔ ہے اپنے اچھے اعمال میں کوشش کرتا رہ، اور برے اعمال سے بچ کر رہ، اگرچہ تیرے اعمال سے رب تعالیٰ خبردار ہے۔

''وشقی وسیعد'' اور اس کا شقی ہونا یا سعید ہونا لکھ لیا جاتا ہے کہ یہ نیک بخت ہے یا بدبخت ہے، نیک ہے یا گنہگار، اللہ تعالیٰ کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، ان کی حکمتوں پر وہی خبر رکھتا ہے، انسان کو ان پر شاکر رہنا جائے۔

کم من ادیب فهم قلبه ——— مستکمل العقل مقل عدیم

و کم جهول مکثر ماله ——— ذلک تقدیر العزیز العلیم

کتنے ہی ادیب اور سمجھ رکھنے والے، کامل عقل رکھنے والے، مال کم رکھتے ہیں بلکہ ان کے پاس مال ہوتا ہی نہیں اور کتنے ہی جاہل بہت زیادہ مال رکھتے ہیں، یہ فیصلے ہیں اس ذات کے جو غالب، علم رکھنے والا ہے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں۔(۱) لطف و مہربانی (۲) قہر و غضب

یہ دونوں صفات جسے حاصل ہوں وہ بادشاہ ہے بلکہ بادشاہوں کا بادشاہ، یہ دونوں صفتیں صرف رب تعالیٰ کو ہی کامل درجے کی حاصل ہیں، جو اس ذات باری تعالیٰ کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ ہر ایک صفت کا اپنا اپنا مقام کوئی ایک بھی دوسری کی جگہ قائم نہیں ہوسکتی۔ ''ولا یتحقق کل منهما الابوجود الآخر کما لاتبین اللذة الابالألم'' اور نہ ہی یہ دونوں صفتیں ایک دوسری کے بغیر متحقق ہوتی ہیں۔ جس طرح لذت کا درد کے بغیر پتہ نہیں چلتا، اسی نیک بختی کا بدبختی کے بغیر پتہ نہیں چلتا، اس لئے ہر صفت کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

''فالسعداء واعمالهم مظاهر اللطف وفائدة بعثة الانبیاء والکتب ترجع الیهم انما انت منذر من یخشاها کما ان فائدة نور الشمس لاهل البصر''

نیک بخت لوگ اور ان کے اعمال رب تعالیٰ کی صفت لطافت کا مظہر ہیں۔ اور انبیاء کرام کے تشریف لانے اور رب تعالیٰ کی کتابوں کے اترنے سے انہوں نے ہی فائدہ حاصل کیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا﴾ بیشک آپ ڈرانے والے ہیں انہیں جو قیامت کا خوف رکھتے ہوں، یعنی وہی لوگ رب تعالیٰ کے قہر و غضب سے ڈریں گے جن کا ایمان قیامت پر ہوگا۔ جو لوگ قیامت کا خوف نہیں کریں گے وہ رب تعالیٰ سے بھی نہیں ڈریں گے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ سورج کی روشنی سے فائدہ وہی حاصل کرتا ہے جس کی نظر صحیح ہو، نابینا کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے سامنے رات دن ایک جیسے ہوتے ہیں۔

”والاشقياء وافعالهم مظاهر القهر وفائدة البعثة لهم الزام الحجة لئلا يكون للناس على الله حجة بعدالرسل وهی فی الحقيقة نعی عليهم بالشقاوة“

بد بخت اوران کےافعال اللہ تعالیٰ کی صفت قہر کے مظہر ہیں۔ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو بھیجنے کا یہی فائدہ ہے کہ ان پر حجت (دلیل) قائم کی جاسکے کہ ہم نے تو تمہاری طرف رسول بھیج دیئے تھے،تم نے اگر ایمان نہیں لایا تو آج تم عذاب کے مستحق ہو،اسی لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ تاکہ نہ رہے لوگوں کیلئے کوئی حجت اللہ پر رسولوں کے بھیجنے کے بعد۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حقیقت میں بدبختوں کی شقاوت وبدبختی کی خبر ہے،(خیال رہے کہ ”نعی“ اصل میں موت کی خبر کو کہا جاتا ہے،علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے نعی کا لفظ استعمال کر کے اشارہ فرمایا کہ بد بخت لوگ حقیقت میں مردہ ہیں،ان کی بدبختی موت ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے بدبختوں کی شقاوت یعنی موت کی خبر دی ہے)۔ (راقم)

”ثم ينفخ فيه الروح“ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔یعنی ماں کے پیٹ میں بچہ دانی میں جب ایک سو بیس دن گزر جاتے ہیں تو روح پھونکی جاتی ہے،(ایک سو بیس دن کے بعد روح پھونکی جاتی ہے لھذا اس کے بعد اسقاط حمل جرم قتل ہے۔اس سے پہلے کسی عذر شدید کی وجہ سے جائز،بغیر عذر شدید کے مکروہ ہوگا) (راقم)

”فوالذی لااله غيره“ قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں،قسم اٹھا کر آنے والے مسئلہ کی تصدیق وتحقیق فرمائی،یعنی جب سعادت وشقاوت عند اللہ مکتوب ہیں (لوح محفوظ پر لکھی گئیں ہیں) تو انسان اس تقدیر کو بدل تو نہیں سکتا لیکن اس نے اپنے اختیار سے نیکی یا برائی کا عمل کیا ہوگا لھذا نیکی پر ثواب اور برائی پر عذاب کا مستحق ہوگا۔

”ان احدكم ليعمل بعمل اهل الجنة حتی مايكون بينه وبينها الاذراع فيسبق عليه الكتاب فيعمل بعمل اهل النار فيدخلها“

(قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں) بیشک تم میں سے کوئی ایک جنت والوں کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ نہیں رہتا اس کے درمیان اور جنت کے درمیان سوائے ایک ذراع کے تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ آگ والوں کا عمل کرنے لگ جاتا ہے تو آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ذراع کا لفظ تمثیل کیلئے استعمال ہے،یعنی اس بندے اور جنت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا،بلکہ قرب حاصل ہوگا۔رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی ”فيعمل بعمل اهل النار“ سے یہ پتہ چل گیا۔

”ان دخول النار لايكون بمجرد تعلق العلم الالهی بل لابد من ظهور العمل

المخلوقی فلایکون جبرا محضا ولا قدرابحتا"

کہ آگ میں داخل ہونے کی وجہ صرف اللہ تعالی کا علم نہیں ہوگی، بلکہ مخلوق کی بداعمالیاں آگ میں داخل ہونے کی وجہ ہوگی۔یعنی انسان کو صرف جبری طور پر جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی تقدیر محض کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا بلکہ وہ خود بخود عمل ایسے کرے گا جو اسے جہنم میں داخل کر دیں گے۔

❁ وان بذر الشقاوة والسعادة قد اختفی فی الاطوار الانسانية لايبرز الااذاانتهى الى الغاية الايمانية او الطغيانية"والله اعلم"

انسان کی پیدائش میں جو مختلف دورر کھے گئے ہیں ان میں بدبختی اور نیک بختی کا بیج بھی چھپا کر رکھ دیا جاتا ہے جس کا خاتمہ ایمان پر ہو اس میں سعادت کا بیج ظاہر ہو گیا،اور جس کا خاتمہ "العیاذ باللہ" بدبختی پر ہو اس میں کفر و بدبختی کا بیج ظاہر ہو گیا۔

❁ وان احدكم ليعمل بعمل اهل النار حتى مايكون بينه وبينهما الاذراع فيسبق عليه الكتاب فيعمل بعمل اهل الجنة فيدخلها"

اور بیشک تم میں سے کوئی ایک جہنم والوں کے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے درمیان اور جہنم کے درمیان سوائے ایک ذراع کے فاصلہ نہیں رہتا تو کتاب سبقت کر جاتی ہے تو وہ جنت والوں کا عمل کرنے لگ جاتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

یعنی کوئی شخص کفر و معاصی میں مبتلاء رہتا ہے جو اسے جہنم میں پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن رب تعالی اسے ایسے اعمال کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے کہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے، واضح ہوا کہ اصل میں اعمال ہی جنت اور جہنم میں جانے کا ذریعہ ہیں اگر چہ رب تعالی کو معلوم ہے کہ کسی نے جنت میں جانا ہے یا کسی نے جہنم میں۔

فائدہ: "ان السالک ينبغي ان لايغتر باعماله الحسنة ويجتنب العجب والتكبر والا خلاق السيئة ويكون بين الخوف والرجاء ومسلما بالرضاء تحت القضاء وكذااذاصدرت منه الاعمال السيئة فلاييأس من روح الله الطيبة فانها اذابدت عين العناية الحقت الآخرة بالسابقة"

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والا شخص اپنے نیک اعمال پر ناز نہ کرے اور اپنے اچھے اعمال پر اترائے نہیں تکبر اور بداخلاقی سے دور رہے، خوف اور امید کے درمیان رہے، اور تقدیر پر راضی اور شاکر رہے، اسی طرح اگر کسی شخص سے برے اعمال سرزد ہوں تو وہ اللہ تعالی کی رحمت و مہربانی سے مایوس نہ ہو اسلئے کہ جب رب تعالی کسی پر مہربانی فرماتا ہے تو اسے نیک اعمال کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے، وہ گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو رب

تعالیٰ اسے گناہوں سے پہلے حال کی طرف پہنچا دیتا ہے کہ جس طرح وہ ابتداء میں گناہوں سے پاک تھا وہ انتہاء میں بھی گناہوں سے پاک ہو کر جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: "وان العبرة بخواتيم الحالات و لايطلع عليها غير عالم الغيب و الشهادة"

اعتبار خاتمہ کے حالات پر ہے، اس پر صرف اللہ تعالیٰ مطلع ہے جو عالم غیب و شہادت ہے (ظاہر اور چھپی ہوئی سب چیزوں کا جاننے والا ہے)

لھذا کسی شخص کو یقینی طور پر جنتی یا جہنمی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ جنتی ہونے یا جہنمی ہونے کی دار و مدار خاتمہ پر ہے ہم کسی کے خاتمہ کو نہیں جانتے، البتہ کسی کے نیک اعمال کو دیکھ کر یوں کہا جا سکتا ہے، اس کے یہ اعمال جنتیوں کے اعمال ہیں، اور کسی کے برے اعمال کو دیکھ کر یوں کہا جا سکتا ہے، اس کے اعمال جہنمیوں کے اعمال ہیں۔

(وضاحت حدیث ماخوذ از مرقات ج۱ص۱۴۹تا۱۵۲)

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o﴾

"نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اس کے جو غالب ہے حکمت والا"۔

شروع میں ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ذکر فرمایا، اب دوبارہ ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o﴾ ذکر ہے، تا کہ ماقبل جملہ کی تاکید ہو جائے اور واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے بغیر معبودان باطلہ کی نفی ہو جائے اور الوہیت کا رب تعالیٰ میں انحصار ہو جائے۔ اور عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو مناظرہ ہو رہا تھا اس میں عیسائیوں کا رد کرنا بھی مقصود تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تمہارا معبود ماننا باطل ہے معبود تو صرف رب تعالیٰ ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے دو وصف بیان فرمائے "علم اور قدرت" تو اسی سے یہ بھی واضح کر دیا "اذ من هذان الوصفان له هو المتصف بالالهية لاغيره" کہ جس میں یہ دونوں وصف کامل درجہ کے پائے جائیں گے وہی معبود ہوگا، اس کے بغیر کوئی اور معبود نہیں، کیونکہ کسی اور کو یہ دونوں وصف اعلیٰ درجہ کے حاصل ہی نہیں۔

ثم اتى بوصف العزة الدالة على عدم النظير، والحكمة الموجبة لتصوير الاشياء على الاتقان التام"

پھر رب تعالیٰ نے اپنا وصف عزیز ہونا ذکر فرمایا جس سے واضح کیا کہ اس کا کوئی مثل نہیں۔ اور پھر اپنا وصف حکیم ہونا ذکر فرمایا کہ وہ مخلوق کو صورتیں عطاء فرماتا ہے جو اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہیں اور اس پر اسے قدرت کاملہ حاصل ہے۔ (البحر المحیط)

اعلیٰ حضرت وعلامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ:

اس مقام پر زیادہ مفسرین کرام رحمہ اللہ نے "العزیز" کا ترجمہ کیا ہے" غالب" اور راقم نے بھی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہی نقل کر دیا کہ طلباء کرام کو مختلف معانی ذہن نشین ہوتے رہیں۔ لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے" عزت والا" یہی ترجمہ علامہ صابونی رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے" ولہ العزة التی لاترام" اور اسے عزت حاصل ہے وہ جس کا قصد نہیں کیا جا سکتا۔ (صابونی)

البحر المحیط میں ایسا ترجمہ ذکر کیا گیا ہے جس میں دونوں احتمال ہیں" ثم اتی بوصف العزة الدالة علی عدم النظیر" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف 'عزة' ذکر فرمایا جو دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نظیر نہیں۔ چاہے تو اردو میں" البحر المحیط" کا ترجمہ یوں کر لیا جائے" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف" عزت والا ہونا' ذکر کیا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔ یا یوں ترجمہ کر لیا جائے" پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف" غالب ہونا" ذکر کیا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔

تنبیہ: یہ تو واضح ہے کہ العزیز کا معنیٰ" غالب" بھی ہے، اور" عزت والا" بھی ہے، اس میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔ بات تو یہ ہے کہ زیر بحث آیۃ کریمہ میں' العزیز" کا معنیٰ کیا ہے، وہ بھی تفاسیر سے واضح ہو رہا ہے کہ دونوں معانی لئے گئے ہیں، بعض نے معنیٰ کیا ہے" غالب" ہونا، اور بعض نے معنیٰ کیا ہے" عزت والا"

" مطلقاً العزة" کے معانی علامہ راغب بیان کرتے ہیں" العزة حالة مانعة للانسان من ان یغلب من قولھم ارض عزازة ای صلبة" عزت کا معنیٰ ہے کہ انسان کو وہ حالت حاصل ہو جو اس کے مغلوب ہونے سے مانع ہو، یہ معنیٰ ماخوذ ہے" ارض عزازة" سے، جس کا معنیٰ ہے" سخت زمین" "والعزیز الذی یقھر ولا یقھر" اور عزیز وہ ہے جو قہر کرے، اس پر قہر نہ کیا جا سکے، یعنی غالب ہو اور مغلوب نہ ہو، "فقد یمدح بالعزة تارة کما تری ویلم بھا تارة کعزة الکفار" کبھی عزت کا لفظ ذکر کر کے کسی کی تعریف کی جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور اللہ کیلئے ہی عزت ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مؤمنوں کیلئے۔ عزت ذکر کر کے کافروں کی مذمت کی، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ بلکہ کافر عزت اور بدبختی میں ہیں، (یعنی وہ اپنے آپ کو عزت والا سمجھتے ہیں، واقع میں وہ بدبخت ہیں) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے" بلکہ کافر تکبر اور خلاف میں ہیں" اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کی عزت، ہی حقیقی عزت ہے۔" وھی الدائمة الباقیة التی ھی العزة الحقیقیة" اسلئے کہ وہ دائمی عزت ہے، جو ہمیشہ

اپنے والی عزت ہو وہی حقیقی عزت ہے۔

کفار کی عزت حقیقت میں "تعزز" جو دنیاوی مال و دولت کی وجہ سے وقتی طور پر ان کو یہ عزت حاصل ہوتی ہے جب مال و دولت جائے اور عہدے جائیں تو ظاہری عزت بھی ختم ہو جاتی ہے "و وفی الحقیقة ذل" یہ حقیقت میں ذلت ہے، عزت نہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کل عز لیس بالله فهو ذل" اللہ تعالی کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے جو عزت حاصل ہو وہ ذلت ہے، "یقال عز علی کذا صعب" عزت کا معنی کبھی "مشکل" آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "عز علی" فلاں چیز مجھ پر مشکل ہے، اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ میں بھی یعنی معنی لیا گیا ہے، "گراں ہے (مشکل ہے) ان (رسول اللہ ﷺ) پر تمہارا مشقت میں پڑنا۔ عزت کا معنی کبھی "قلت" بھی آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا "شاة عزوز قل درها" یعنی جس بکری کا دودھ قلیل (تھوڑا) ہو اسے شاۃ عزوز کہا جاتا ہے۔ تھوڑی چیز کو عزیز کیوں کہا جاتا ہے؟ "وعز الشئ قل اعتبارا بما قیل کل موجود مملول و کل مفقود مطلوب" تھوڑی چیز کو عزیز کہنے کی وجہ اس محاورہ کے مطابق ہے "جو چیز موجود ہے اس سے دل اکتا جاتا ہے اور جو موجود نہیں اس کو طلب کیا جاتا ہے۔ یعنی جس چیز میں دل نہ لگے وہ بھاری اور گراں ہوتی ہے، زیادہ ہونے کے باوجود تھوڑی نظر آتی ہے۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

سبق حاصل ہوا:

"فعلی العاقل ان لایتکا سل عن الاعمال فی جمیع الاحوال و لا یفوت ایام الفرصة و اللیال"
عقلمند آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر حال میں نیک عمل کرنے میں سستی نہ کرے اور زندگی کے دن رات جو اسے حاصل ہیں، ان کو غنیمت سمجھے، ان کو ہاتھ سے نہ جانے دے، اے انسان موت سے پہلے جا فرصت تجھے ملی ہے، اس میں نیکی کا عمل کر لے، موت کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔

خبر داری ای الستخوانی قفس — کہ جان تو مرغیست نامش نفس
چو مرغ از قفس رفت وبگسست قید — دگر رہ نگر ددبسعی تو صید
نگہ دار فرصت کہ عالم دمیست — دمی پیش دانا بہ از عالمیست

اے ہڈیوں کے پنجرے تو خبر رکھ، کہ جان تیری پرندے کی طرح ہے جس کا نام نفس ہے۔ جب پرندہ پنجرے سے اڑ جائے اور قید کے بند کھول دے۔ دوبارہ تیری کوشش کے باوجود تیرے شکار میں نہیں آئے گا۔

(از روح البیان)

فائدہ جلیلہ: جس ماں کی رحم (بچہ دانی) میں نطفہ ہر چالیس دن کے بعد حالت بدلتا ہے، اور رحم میں اللہ تعالیٰ اسے صورت عطاء کرتا ہے صورت عطاء کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے، اسی طرح مرید خاص کا قلب رحم کی طرح ہوتا ہے، جس میں شیخ کامل کے تصرفات ہوتے ہیں وہ چالیس دنوں کے چلے کٹواتا ہے۔ جس سے اس کے ظاہر و باطن پر شیخ کا تصرف پایا جاتا ہے، چلہ کاٹنا اور کچھ دیر کیلئے لوگوں سے علیحدہ ہونے کا مقصد یہ ہوتا ہے۔

"ویختار الخلوة والعزلة کیلا یصدر منه حرکة عنیفة او یجد رائحة غریبة یلزم منها سقوط النطفة وفسادها"

کہ اس سے کوئی حرکت خلاف شرع سرزد نہ ہو، اور اس کی بداعمالیوں کی بدبو کسی اور کو نہ پہنچے، کیونکہ خلاف شرع حرکات اور بداعمالیوں کی وجہ سے شیخ کے تصرفات فاسد ہو جاتے ہیں۔ جب انسان چالیس دن علیحدہ ہوکر عبادت کرتا ہے، اور ریاضت کرتا ہے۔

"فالله تعالی یصرف ولایة الشیخ المنوید بتائید الحق بمرور ذلک اربعین علیه بشرائطها یحولها من حال الی حال وینقلها من مقام الی مقام الی ان یرجع الی حظائر القدس"

تو اللہ تعالیٰ اس کے شیخ کے تصرفات کی وجہ سے اس کی صحیح چلہ کشی کی برکت سے اسے ایک حال سے دوسرے حال تک پہنچا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ مقام قدس تک پہنچ جاتا ہے، جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو پھر حقیقی طور پر آدمی بنتا ہے، ورنہ اس سے پہلے وہ بصورت آدم ہے بسیرت آدم نہیں۔

آدم علیہ السلام کے جسم کے مٹی کے خمیر پر جب چالیس دن گزرے تو ان میں روح پھونکی گئی تو ان کو مسجود ملائکہ بنایا گیا (فرشتوں سے آپ کے سامنے سجدہ کرایا گیا) یہی وہ درجہ ہے حقیقی طور پر آدمی بننے کا شکل انسانی کی وجہ سے تو ہم بھی آدمی ہیں، اگر چہ مقام رفیع حاصل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اے مولائے کریم! بحرمت نبی کریم ﷺ و بتصرف شیخی حضرت سید پیر غلام محی الدین المعروف **بابوجی** گولڑوی رحمہ اللہ مجھ گنہگار کے گناہ معاف فرما، تیری وسعت رحمت پر قوی امید رکھتا ہوں کہ تو اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کے محب صادق کو مقام روح قدس تک پہنچائے گا۔

جس طرح ماں کی رحم میں چالیس چالیس دن کے تین دور گزرتے ہیں تو اس میں روح کو پھونکا جاتا ہے، اسی طرح شیخ کے تصرف سے چلہ کشیوں کی وجہ سے، ریاضت و عبادات کی وجہ سے انسان کو خصوصی قدس حاصل ہو جاتی ہے یہی وہ روح ہے جو دل کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے، یہی وہ روح ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔

"علقی الروح من امره علی من یشاء من عباده" اور اسی روح کا تذکرہ یوں بیان فرمایا "کتب فی قلوبهم الایمان وایدهم بروح منه" (ماخوذ از روح البیان)

شیر خدا کا پیارا ارشاد:

کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ موجد شطرنج کا کمال تو دیکھو کہ اس نے گز بھر کپڑے پر چونسٹھ خانے بنائے مگر جب کھیلو تب اس کی نئی چال ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خالق کا کمال تو دیکھو اس نے بالشت بھر چہرہ میں پانچ سوراخ کئے دو آنکھوں کے، دو ناک کے ایک منہ کا، مگر اس پر کروڑں نقشے کھینچ دئے ان میں کوئی دوسرے سے نہیں ملتا حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا یہ پیارا ارشاد گویا کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ کی تفسیر ہے۔ (ماخوذ از نعیمی)

(هو الذی یصورکم فی الارحام) صورا جامعة للاسرار الارضیة والسماویة تارة وغیر جامعة اخری)

وہ جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں بچہ دانیوں میں" کبھی وہ صورتیں عطاء کرتا ہے جو زمین اور آسمانوں کے رازوں کی جامع ہوتی ہیں اور کبھی وہ ایسی صورتیں عطاء کرتا ہے جو ان رازوں کی جامع نہیں ہوتیں۔

(کیف یشاء) وقد جعل آیات کتابه صورا جامعة لمعانی صفة کلامه فی ارحام الالفاظ وصورا فی ارحام المعانی معانی اخر وهلم جرا"

وہ صورتیں عطاء کرتا ہے بچہ دانیوں میں جس طرح چاہتا ہے، تحقیق اس نے اپنی کتاب کی آیات کی صورتیں بنائیں جو کہ الفاظ کی رحموں میں (الفاظ کے ضمن میں) اس کے کلام کی صفات کے معانی کی جامع ہیں۔

اور ان معانیوں کے ضمن میں اور معانی رکھ دیئے گئے۔ اس طرح سلسلہ جاری رہتا ہے اگر چہ کمال عیسوی بھی اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں، لیکن ان کمالات کی وجہ سے آپ میں الوہیت نہیں ثابت ہوسکتی۔ جس طرح رحم میں جو صورتیں عطاء کی جاتی ہیں وہ اعضاء کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں، ان میں گویا کہ دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں، اسی طرح کمالات معنویہ میں بھی دوسرے شریک ہوتے ہیں، جن کے شرکاء پائے جائیں وہ معبود نہیں بن سکتے۔

واضح ہوا کہ معبود صرف اللہ تعالی ہے "هو الجامع لکمالات" وہی تمام کمالات کا جامع ہے، اس کا کوئی شریک جو "وحده لاشریک له" ہے وہی معبود حقیقی ہے۔ (ماخوذ از تبصیر الرحمٰن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿هُوَ الَّذِی اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْه آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِیْلِهٖ وَمَایَعْلَمُ تَاوِیْلَهُ اِلَّااللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ ٥﴾ (آیۃ نمبر ۷)

(1) وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کے کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہ چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو، اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے، اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کے پاس سے ہے، اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے۔

(2) وہی ہے جس نے اتاری تم پر کتاب، اس کی بعض آیات محکم ہیں (صاف معنی رکھتی ہیں) وہ اصل کتاب ہیں اور کچھ دوسری متشابہات ہیں (جن کے معنی میں اشتباہ ہے) وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں ان کا جو اشتباہ والی ہیں، اس سے وہ تلاش کرتے ہیں فتنہ اور تلاش کرتے ہیں اس کی تاویلیں اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ کے، اور وہ لوگ جو پختہ ہیں علم میں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کے ساتھ، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے۔

شان نزول:

(۱) نزول کی ایک وجہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کے وفد میں جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دوران مناظرہ کہا۔

"الست تقول ان عیسی روح الله و کلمتة فقال نعم فقالو احسبنا ای یکفینا ذلک فی کونه ابن الله"

کیا تم خود نہیں کہتے ہو کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام "اللہ کی روح اور اللہ کا کلمہ" ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہم یہی

کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ "و کلمۃ اللہ" ہیں۔

اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ قرآن پاک کی کچھ آیتیں محکم ہیں جن کے معانی واضح اور ظاہر وصاف ہیں، جن کو سمجھنا آسان ہے، اور کچھ آیتیں متشابہات ہیں جن کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

"وقوله تعالى "روح الله و كلمته" من المتشابه الذى لايعرفون معناه و لا يفهمون تاويله"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی کہ عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ یہ متشابہات سے ہے، جس کا ظاہری معنی مراد نہیں (البتہ مجازی معانی معتبر ہیں جن کا ذکر آگے انشاء اللہ آئے گا) اور ان کی تاویلوں کو یہ عیسائی نہیں سمجھ سکتے لھذا ان کا "روح اللہ وکلمۃ" سے عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے پر دلیل بنانا باطل ہے۔

(۲) نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ آیۃ یہود کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ ایک مرتبہ ابو یاسر بن اخطب یہود کے چند آدمیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گذرا تو آپ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی ابتدائی آیات تلاوت فرما رہے تھے، وہ اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آیا، اس کے پاس بھی یہود کی محفل لگی ہوئی تھی، ابو یاسر نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے محمد ﷺ سے تلاوت سنی ہے جو ان پر آیۃ نازل ہوئی ﴿الٓمٓ ٥ ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ حیی ابن اخطب نے کہا کیا واقعی تم نے یہ آیۃ محمد ﷺ سے سنی ہے؟ وہ کہنے لگا ہاں میں نے یقیناً سنی ہے حیی اپنے ساتھ چند یہود کے لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور پوچھنے لگا کیا تم پر یہ آیۃ نازل ہوئی ﴿الٓمٓ ٥ ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾؟ آپ نے فرمایا ہاں یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی۔ اس نے کہا ہم اس دین پر کیسے ایمان لائیں جس کی مدت اکہتر سال ہے، کیونکہ الف کا ایک عدد ہے اور لام کے تیس اور میم کے چالیس، اس کی بات کو سن کر نبی کریم ﷺ مسکرائے، اس نے پوچھا کیا اور بھی کوئی آیۃ ہے؟ آپ نے "الٓمٓصٓ" تلاوت کی۔ تو وہ کہنے لگا کہ اس کے تو ایک سو اکسٹھ عدد بنتے ہیں۔ الف کا ایک، لام کے تیس اور میم کے چالیس اور صاد کے نوے عدد ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے "الٓرٰ" اور "الٓمٓرٰ" تلاوت کیں تو وہ کہنے لگا ہم پر اشتباہ ہو گیا ہم معلوم نہیں ہو رہا کہ تمہیں تھوڑی مدت کیلئے دین دیا گیا یا زیادہ مدت کیلئے۔

"ثم قال ابو ياسر لاخيه ومن معه وما يدريكم لعله لقد جمع هذا كله لمحمد، فقالوا لقد تشابه الامر علينا"

پھر ابو یاسر نے اپنے بھائی اور اس کے ساتھ والے لوگوں کو کہا، کیا تم یہ نہیں سمجھ رہے کہ ہو سکتا ہے ان تمام آیات کے مجموعی عددوں کے مطابق محمد کے دین کی مدت ہو، وہ کہنے لگے معاملہ ہم پر متشابہ ہو گیا۔

اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اس کتاب کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض آیتیں متشابہ ہیں۔
(ماخوذ از روح المعانی وصاوی)

شان نزول کی وجوہ مجتمع ہیں:

دونوں واقعات درپیش آنے کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، اس لئے دوسری وجہ شان نزول پر یہ اعتراض درست نہیں کہ وہ سیاق وسباق سے ہٹ کر ہے، اور پہلی وجہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اسی (۸۰) سے زیادہ آیات نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں۔ اس کا تو کوئی انکار نہیں کہ اسی (۸۰) سے زیادہ آیات نجران کے وفد کے متعلق نازل ہوئیں اور ماقبل اور مابعد سے تعلق بھی پہلی وجہ شان نزول کا زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اکثر آیات کے شان نزول کے چند واقعات مجموعی طور پر ہیں، یہاں بھی مراد دونوں واقعات کا مجموعی طور پر درپیش آنا اور پھر آیۃ کریمہ کا نازل ہونا ہے۔

سؤال: یہاں ارشاد ہوا" مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ" کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں جن کے معانی واضح ہیں وہ اصل کتاب ہیں، اور بعض میں اشتباہ ہے۔ لیکن دوسرے مقام میں فرمایا﴿الٓرٰ O كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ﴾ اس کتاب کی آیات محکم ہیں اور تیسرے مقام میں فرمایا﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سے ہے۔

ان آیات میں تطبیق کیسے ہے کہ ایک میں کل آیات کو محکم قرار دیا۔ دوسری میں کل آیات کو متشابہ قرار دیا، اور تیسری آیات میں بعض کو محکم اور بعض کو متشابہ قرار دیا۔

جواب: محکم اور متشابہ مختلف معانی میں استعمال ہیں، جس کی وجہ سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔"قيل حيث جعل الكل محكما اراد ان الكل حق ليس فيه عبث ولا هزل" جس آیات کریمہ میں تمام آیات کو محکم کہا ہے وہاں محکم کا یہ معنی ہے کہ قرآن پاک کی تمام آیات حق ہیں۔ ان میں کوئی بے فائدہ اور حقیقت کے خلاف نہیں۔

"وحيث جعل الكل متشابها اراد ان بعضه يشبه بعضا في الحق والصدق وفي الحسن"

اور جس آیت کریمہ میں تمام آیات کو متشابہ قرار دیا اس سے مراد یہ لیا کہ بیشک بعض آیات بعض کے ساتھ حق وصداقت میں اور حسن میں مشابہ ہیں۔

وجعل ههنا بعضه محكما وبعضه متشابها(يعني ان القرآن منه محكم العبارة قد صينت من الاحتمال ومنه متشابه وهوما احتمل وجوها)

زیر بحث آیۃ کریمہ میں بعض کو محکم کہا اور بعض کو متشابہ، محکم سے مراد یہ ہے کہ ان کے مطابق واضح

ہیں۔ان میں مختلف احتمالات نہیں پائے جاتے ،اور بعض آیات کو متشابہ بنایا یعنی ان کے معانی میں اشتباہ پایا جاتا ہے،ان کے معنی واضح نہیں بلکہ ان میں کئی احتمالات پائے جاتے ہیں۔ (ماخوذ از معالم التنزیل)

علامہ بغوی رحمہ اللہ کی تفسیر کو سمجھنے کے بعد اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تینوں آیات کا دیکھیں، آپ کو بہت ہی حسین وجمیل ترجمہ نظر آئے گا، انصاف کی نگاہ سے دیکھنے والا کنز الایمان کی تعریف کئے بغیر رہ نہیں سکتا''

(۱) ﴿آلرٰ O کِتَابٌ اُحْکِمَتْ آیَاتُه﴾ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں حکمت بھری ہیں۔(کنز الایمان)

(۲) ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے۔ (کنز الایمان)

(۳) هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْه آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ'' وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔(کنز الایمان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت میں ذکر فرمایا''هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ'' وہی ہے جو صورتیں عطاء کرتا ہے تمہیں (ماؤں کے پیٹوں میں) بچہ دانیوں میں جسطرح چاہتا ہے۔''وھذا امر جسمانی'' یہ انسان کی تخلیق کی جسمانی صورت کا تذکرہ ہے،اور اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں،''استطرد الی العلم وھو امر روحانی'' امر جسمانی کے تذکرہ کے بعد علم کا تذکرہ کیا یہ روحانی معاملہ کا تذکرہ ہے، یہ نجران کے عیسائیوں کے اس اشتباہ کو زائل کرنے کیلئے نازل کی گئی جو انہیں عیسی علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک کے''وروح منہ'' سے پڑا تھا۔جس کی تفصیل شان نزول کی وجوہ میں بیان کر دی گئی۔

محکم کے معانی:

''اما المحکم فالعرب تقول حاکمت وحکمت واحکمت بمعنی رددت و منعت''

عرب حضرات حاکمت اور حکمت اور احکمت کا معنی کرتے ہیں، پھیرنا اور روکنا۔اور حاکم کو حاکم اس لئے کہا جاتا''ھو یمنع الظالم عن الظلم'' کہ وہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے۔(اسی سے یہ پتہ چلا جو حاکم ظالم کو ظلم سے نہ روکے بلکہ اپنے آپ کو ظلم سے نہ روکے، بدترین ظالم ہو تو وہ حاکم کہلانے کا حقدار نہیں البتہ وہ غاصب اور لٹیرا ہو سکتا

ہے)اور لگام کو(حکمۃ بفتحتین) کہا جاتا ہے کہ وہ گھوڑے کو ادھر ادھر مضطرب ہونے سے (ادھر ادھر پھرنے سے) روکتا ہے، حدیث نخعی رحمہ اللہ میں ہے "احکم الیتیم کم تحکم ولدک ای امنعہ عن الفساد" یتیم کو (فساد وغیرہ سے) اسی طرح روکو جس طرح اپنی اولاد کو روکتے ہو۔

"وقال جریر احکموا سفھاء کم ای امنعوھم" تم اپنے بے وقوفوں کو فساد وغیرہ سے روکو، اسی طرح کہا جاتا ہے "بناء محکم" ولیق یمنع من تعرض لہ' یعنی محکم تعمیر وہ ہے دوسرے کو اپنے آپ میں تصرف کرنے سے منع کرے۔"وسمیت الحکمۃ حکمۃ لانھا تمنع عما لاینبغی" حکمت کو بھی حکمت اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ غیر مناسب چیزوں سے روکتی ہے (از کبیر)

محکم کی دو قسمیں: جب یہ واضح ہو گیا کہ محکم وہ ہے جس کے معانی میں اشتباہ نہ ہو، عبارت اس طرح واضح ہو کہ عربی زبان جاننے والے کو الفاظ اور مفہوم اور آیۃ کریمہ کے تقاضا میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ اب محکم کو دو قسموں کو سمجھا جائے (۱) جو بلا تامل (بغیر غور وفکر کے) حاصل ہو جائے، (۲) دوسری قسم وہ ہے جو تامل (غور وفکر) کے بعد حاصل ہو۔

بلا تامل حاصل ہو: جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ﴾ فرما دو آؤ میں بیان کروں تم پر جو حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ اور حکم دیا ہے تمہارے رب نے یہ کہ تم نہ عبادت کرو سوائے اس کے۔ اور ارشاد باری تعالی ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ اور اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان تمام آیات کے مطالب بغیر تامل (سوچ وبچار، غور وفکر کے بغیر) حاصل ہیں، ان کے معانی میں کوئی اشتباہ نہیں۔

تامل کے بعد حاصل ہو: یعنی انسان خود ہی غور فکر کرے تو اسے مطلب سمجھ آجائے، یہ ضرورت در پیش نہ آئے کہ اس کا مطلب اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ ہی سمجھائیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ چور مرد ہو یا عورت ان کے (دائیں) ہاتھوں کو کاٹو۔ اس آیت کریمہ میں معمولی تامل کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ جیب کاٹنے والے کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، اور کفن چوری کرنے والے کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

سرقہ کیا ہے؟: "السرقۃ اخذ مال مملوک لغیرہ علی سبیل الخفیۃ" سرقہ یہ ہے کہ کسی کا

مال جو حفاظت میں ہو اسے پوشیدہ طور پر لے لینا، یعنی مال کے محافظ کی غفلت سے اس کا مال اس طرح لے لینا کہ اسے پتہ نہ چلنے دیا جائے۔ جب سرقہ کا معنی معلوم ہو تو معمولی تأمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم جیب کاٹنے والے کو شامل ہے، کیوں؟ "لوجود معنی السرقة فیه مع زیادة" اس لئے کہ سرقہ کا معنی بھی 'طرار" (جیب تراش) میں پایا گیا ہے اور زیادتی بھی۔ کیونکہ یہ غیر کا مال اس کی حفاظت میں ہوتے ہوئے، اس کے ذرا بھر توجہ ہٹنے سے یہ اس کی جیب کاٹ لیتا ہے، اس لئے جیب کاٹنے والوں کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفن کسی کی ملکیت میں نہیں رہتا، اسلئے کہ میت کو دنیاوی مال ومتاع سے کوئی غرض نہیں رہتی، اور میت کے ورثاء بھی کفن کے مالک نہیں ہوتے، اس لئے کہ وراثت ہی کفن پہنانے کے بعد حاصل ہوتی ہے میت کے مال میں سب سے پہلے میت کا حق کفن ہی ہے۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

اور ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ ان الفاظ مبارکہ میں اور اس سے پہلے الفاظ مبارکہ میں تأمل کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے "انه معطوف علی المغسولات لضرب الغایة فیه" کہ اس کا عطف ﴿وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ پر ہے، کیونکہ غایۃ کا ذکر دونوں میں ہے، ہاتھوں کے دھونے کا ذکر کیا کہ "ہاتھوں کو دھوئے کہنیوں تک" اور پاؤں کے دھونے کا ذکر کیا کہ "پاؤں کو دھوئے ٹخنوں تک" ان دونوں میں غایۃ (یعنی ایک حد) کا ذکر ہے، یہ معطوف اور معطوف علیہ میں وجہ مناسبت ہے۔ اس کا عطف ﴿وَامْسَحُوا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ پر نہیں کہ پاؤں پر مسح کرنا ثابت ہو، کیونکہ ﴿وَامْسَحُوا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ میں غایت کا ذکر نہیں اور ﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ میں غایت کا ذکر ہے، ان دونوں میں عطف کیلئے مناسبت نہیں پائی گئی۔

اور ارشاد باری تعالی ہے ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ اس میں معمولی سوچ، غور وفکر سے پتہ چل جاتا ہے کہ "قُرُوْٓءٍ" سے مراد طہر (پاکیزگی) ہے، حیض (ماہواری خون) نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عدت طلاق کے بعد شروع ہوتی ہے، اور طلاق طہر میں دینے کا حکم ہے، جب طہر میں طلاق دی جائے گی، اس کی بعد تین حیض عدت گذاری جائے گی، تین میں کمی اور زیادتی نہیں ہوگی، اگر "قُرُوْٓءٍ" کا معنی "طہر" کیا جائے، تو تین مکمل نہیں ہوتے کم ہوں گے یا زیادہ، کیونکہ جس طہر میں طلاق دی گئی اگر وہ عدت میں شمار کیا جائے تو تین میں کمی واقع ہوگی، اور اگر اسے نہ شمار کیا جائے تو تین سے زیادتی لازم آئے گی۔ حالانکہ "ثلاثة (تین) لفظ خاص ہے جو کمی اور زیادتی کا احتمال نہیں رکھتا۔

اسی طرح اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ﴾ اس میں جنتی پیالوں کا ذکر ہے کہ وہ شیشے کی طرح

ہوں گے وہ شیشے چاندی کے ہوں گے، اس میں بظاہر وہم ہے کہ چاندی کے شیشے تو نہیں ہوتے بلکہ وہ تو گچ کے ہوتے ہیں، لیکن معمولی تامل سے سمجھ آجاتا ہے کہ وہ برتن چاندی کے ہوں گے، ان میں چمک، دمک چاندی کی طرح ہوگی۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

محکم کی قسمیں اور مثالیں جو بیان کی گئی ہیں ان سے واضح ہوگیا کہ اصول فقہ میں جن کو ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی اور مشکل کہا گیا ہے وہ سب ہی اس آیۃ کریمہ میں مذکور محکم میں داخل ہیں۔

واضح ہوا: والمحکم مالا یحتمل من التأویل غیر وجه واحد" محکم وہ ہے جس کا ایک ہی مطلب ہوا اور اس میں کوئی تاویل نہ پائی جائے۔" وماقیل المحکم مایعرف معناه ویکون حجة واضحة ودلائله لاتحة" اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا معنی پہچانا جاتا ہو، اور حجت واضح ہو، اور دلائل ظاہر ہوں۔
(ماخوذ از مظہری)

راقم کے نزدیک دونوں معانی مجموعی طور پر معتبر ہیں "محکم وہ ہے جس کے معانی واضح ہوں، کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہ ہو" الحمد للہ راقم کی ذہنی اختراع کو روح المعانی سے تائید حاصل ہوگئی، علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

(محکمات) صفة آیات ای واضحة المعنی ظاهرة الدلالة محکمة العبارة محفوظة من الاحتمال والاشتباه"

اس مقام میں "محکمات" کا لفظ "آیات" کی صفت واقع ہو رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ محکم وہ ہے جس کا معنی ظاہر ہو الفاظ محکم ہوں، احتمال اور اشتباہ سے محفوظ ہو۔ (روح المعانی)

محکم کے کئی مطالب:

(۱) احناف کا قول یہ ہے "**المحکم الواضح الدلالة الظاهر الذی لایحتمل النسخ**" محکم وہ ہے جو واضح ہے اور الفاظ کی دلالت معنی پر ظاہر ہو اور نسخ کا احتمال نہ پایا جائے۔

"والمتشابه الخفی الذی لایدرک معناه عقلا ولانقلا وهو مااستأثر الله تعالی بعلمه کقیام الساعة والحروف المقطعة فی اوائل السور"

اور متشابہ وہ خفا ہے کہ جس کا معنی عقلا اور نقلا نہ پایا جاسکے، یعنی اس میں عقل کو دخل نہ ہو اور نہ ہی اس کے معنی قرآن وحدیث سے واضح ہوں، متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، کسی اور کو ذاتی طور پر علم حاصل نہیں، جیسا کہ

قیامت کا علم اور حروف مقطعات جو سورتوں کی ابتداء میں ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

ھاں اللہ تعالیٰ کی عطاء سے قیامت کا علم حضور ﷺ کو دیا گیا اور حروف مقطعات کا علم آپ کو اور آپ کی امت کے نیک لوگوں کو آپ کے وسیلہ سے عطاء کیا گیا۔(نجوم الفرقان کی جلد دوم سورۃ البقرہ کی ابتداء میں حروف مقطعات کے متعلق تفصیلا ذکر کر دیا گیا۔قیامت کا علم بھی ضمنا کر دیا گیا البتہ مکمل ذکر ﴿وَعِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ کے ضمن میں آئے گا "ان شاء اللہ"

(۲) دوسرا قول درحقیقت روایت ابن عباس ہے جو ابن ابی طلحہ سے ابن ابی حاتم نے ذکر کی ہے،وہ یہ ہے "المحکمات ناسخه وحلاله وحرامه وحدوده وفرائضه والمتشابهات مایؤمن به ولا یعمل به" محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ ہیں اور وہ جن میں حلال وحرام،حدود،اور فرائض کا ذکر ہے۔اور متشابہات سے مراد وہ جن پر ایمان رکھا جائے،لیکن ان کی مراد واضح نہ ہونے کی وجہ سے ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) "وقیل المحکم الفرائض والوعد والوعید،والمتشابه القصص والامثال" بعض حضرات نے بیان کیا محکم سے مراد فرائض اور وعد اور وعید ہے۔اور متشابہ سے مراد قصص وامثال ہیں۔

(۴) فریابی نے مجاہد سے روایت کی "المحکمات ما فیه الحلال والحرام وماسوی ذلک متشابه" محکمات وہ ہیں جن میں حلال وحرام کا ذکر پایا جائے،اور متشابہ وہ ہیں جن میں حلال وحرام کا ذکر نہ پایا جائے۔

(۵) "واخرج عبید بن عمیر عن الضحاک قال المحکمات مالم ینسخ والمتشابهات ماقد نسخ"

عبید بن عمیر نے ضحاک سے روایت کی کہ محکمات وہ ہیں جو منسوخ نہیں ہوئیں،اور متشابہات میں سے کچھ منسوخ بھی ہوئیں

(۶) "وقیل المحکم مالم یتکرر الفاظه والمتشابه مایقابله" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کے الفاظ میں تکرار نہ ہو،اور متشابہ وہ ہے جس کے الفاظ میں تکرار پایا جائے۔

(۷) "وقال الماوردی المحکم ماکان معقول المعنی والمتشابه بخلافه کاعداد الصلوات واختصاص الصیام برمضان دون شعبان"

ماوردی نے بیان کیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا مطلب واضح ہو،اور متشابہ وہ ہے جس کا مطلب واضح نہ ہو،جس طرح نمازوں کی تعداد،اور روزوں کا رمضان میں فرض ہونا اور شعبان میں فرض نہ ہونا۔ان کی حکمت اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم

ہے، بندے کو اس کا علم نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کا موقف: محکم اور متشابہ کے معانی تفسیر مظہری سے بیان کئے جا چکے ہیں، اور ایک سوال کا جواب معالم التنزیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ تین آیات میں تطبیق کیسے ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ محکم اور متشابہ کے مختلف معانی کی وجہ سے مختلف اقوال ہیں ورنہ محکم وہی ہے جس کے معانی واضح ہوں ان میں احتمال واشتباہ وہ ہے جس کے معنی میں احتمال واشتباہ پایا جائے، اور اس کے معانی ومطالب واضح نہ ہوں۔

﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتَابُ﴾ ''وہ اصل کتاب ہیں''۔

یعنی آیات محکمات اصل کتاب ہیں، "یعنی هن اصل الكتاب الذی یعول علیه فی الاحکام ویعمل به فی الحلال والحرام" یعنی وہ آیات اصل کتاب ہیں کیونکہ ان کی مراد واضح ہونے کی وجہ سے ان پر کامل اعتماد پایا جاتا ہے اور ان سے احکام واضح طور پر ثابت ہوتے ہیں، اور محکم کے ذریعے ہی حلال وحرام پر عمل کیا جائے گا۔

ام الکتاب کے مرادی اور لغوی معنی میں مناسبت:

"الام" الوالدة وام کل شیء اصله وعماده وللقوم رئیسهم وکل شیء انضمحت الیه اشیاء" (القاموس)

''الام'' کا معنی والدہ، ہر چیز کی اصل اور ستون کو "الام" کہا جاتا ہے، اسی طرح قوم کے رئیس اور سردار کو "ام القوم" کہا جاتا ہے۔ بلکہ ہر چیز جس کے تابع دوسری چیزیں ہوں وہ ان کی "ام" کہلاتی ہے۔

"الکتاب" کا یا تو معنی "مکتوب" ہے، جس کا مطلب مفروض ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ میں "کُتِبَ" کا معنی "فُرِضَ" کیا جائے" اسی صورت میں اضافت بمعنی "لام" کے ہوگی، اور "ام" کا معنی "ماں" یا "اصل" ہوگا، اب عبارت کا معنی یوں ہوگا "هن والدات واصول لما کتب علینا اتیانه او الکف عنه من الفرائض والمحرمات" آیات محکمات والدہ کی طرح ہیں، یعنی اصل ہیں ان کیلئے جو ہم پر فرض کر دی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق عمل کرنے سے ہو جیسا کہ فرائض یا ان کا تعلق ترک سے ہو جیسے محرمات، یعنی وہ آیات جن میں فرائض اور محرمات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان فرائض وحرمات کی اصل ہیں۔

اور اگر "الکتاب" سے مراد قرآن پاک ہو تو اس وقت اضافت بمعنی "من" کے ہوگی۔ "یعنی انها ام للاحکام من الکتاب یؤخذ منها الاحکام بلاحاجة بیان من الشارع" یعنی آیات محکمات قرآن پاک کے

احکام کی اصل ہیں، کہ ان آیات سے ہی واضح طور پر احکام سمجھ میں آجاتے ہیں شارع (اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ) کی طرف سے مزید وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں درپیش آتی۔

"واما بمعنى اللام" اور یا تو اضافت بمعنی لام کے ہو، تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا۔

"والمعنى انها عماد القرآن وبمنزلة رئيس القوم سائر الايات يحتاج اليها غيرها ويضم اليها حتى يستفاد من غيرها المراد منها يردها الى المحكمات"

کہ آیات محکمات قرآن پاک کی اصل یعنی ستون کی طرح ہیں، اور ان کو باقی آیات پر وہ حیثیت حاصل ہو جو قوم کے رئیس کو قوم پر حیثیت حاصل ہوتی ہے، یعنی دوسری آیات ان محکم آیات کی محتاج ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ محکمات کو ملایا جائے تو ان دوسری آیات سے مطالب حاصل کئے جاتے ہیں۔ تقریبا مطلب یوں ہو گیا کہ دوسری آیات کو ان محکم آیات کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ (مظہری)

سؤال: آیات محکمات، جمع ہے، پھر ضمیر "هُنَّ" جمع ہے۔ لیکن خبر مفرد ہے "اُمُّ الْكِتَابُ" حالانکہ "امهات الكتاب" ہونا چاہئے تھا، "ام" کو مفرد لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: **اورد لفظ المفرد ليدل على ان المحكمات كلها بمنزلة ام واحدة لان الاحكام المفروضة تؤخذ من جميعها لا من كل واحدة منها"**

واحد لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بیشک تمام محکم آیات ایک دلیل کی طرح ہیں، ان تمام سے احکام مفرضہ ثابت ہوتے ہیں، ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اصل نہیں بنایا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے "ان مجموع المحكمات في تقدير شئى واحد ومجموع المتشابهات في تقدير شئى آخر واحدهما ام للآخر" کہ بیشک محکم آیات تمام ہی ایک چیز کی حیثیت میں ہیں اور متشابہات تمام ایک چیز کی حیثیت میں ہیں۔ محکم متشابہات کیلئے ایک ہی اصل کی طرح ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً﴾ (اور بنایا ہم نے ابن مریم اور ان کی ماں کو نشانی) کیونکہ عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ مکرمہ ایک نشانی کی طرح تھے۔ اسی طرح تمام محکم آیات کو ایک ہی آیۃ (نشانی) کہا گیا ہے۔ (مظہری، کبیر)

﴿وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ **"اور کچھ دوسری متشابہات ہیں (جن کے معانی میں اشتباہ ہے)"**

متشابہات کا ذکر محکمات کے ساتھ ساتھ ہی کافی حد تک کر دیا گیا ہے، (متشابہات) محتملات" یعنی متشابہات کا معنی یہ ہے کہ ان میں احتمال پایا جائے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ فلا

ستواء بمعنی الجلوس وبمعنی القدرة والاستیلاء ولا یجوز الاول علی الله تعالی بدلیل المحکم وھو قولہ لیس کمثلہ شیء" استواء کا معنی بیٹھنا، اور قدرت رکھنا، اور غلبہ حاصل کرنا، ان معانی میں سے پہلا معنی اللہ تعالی کی شان کے لائق نہیں کیونکہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ جو بیٹھے وہ جسم ہے، حادث ہے وہ بے مثل نہیں۔ اسی وجہ سے یہ آیۃ متشابہات کی ان اقسام میں سے ہے جن کے معانی کا تو علم ہے مگر مطالب کا علم نہیں۔ (مدارک)

سوال: قرآن پاک تو نازل کیا گیا ہے بندوں کی رہنمائی کیلئے اور دین کے بیان کیلئے اور بندوں کی ہدایت کیلئے متشابہات کے جب مطالب ہی واضح نہیں تو ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ؟

پہلا جواب: قرآن پاک نازل کیا گیا عرب کے الفاظ اور لغات کے مطابق۔ کلام عرب کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے "ایجاز" ہے، جو اختصار کیلئے ذکر کیا جاتا ہے، "والموجز الذی لایخفی علی سامعہ ولا یحتمل غیر ظاہرہ" کلام موجز وہ ہے جس میں اختصار تو ہو لیکن سننے والے پر مخفی نہ رہے اور غیر کا احتمال نہ رکھے کیونکہ کلام کو لمبا ذکر کرنے کی وجہ تاکید اور مراد کی وضاحت مقصود ہوتی ہے۔ جب مراد مخفی نہ ہو، غیر کا احتمال نہ رکھے تو اختصار بہتر ہوتا ہے، طوالت کی ضرورت نہیں۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ مجاز، کنایات، اشارات، تلویحات (کسی کے کلام کو اپنے کلام میں سمو کر اپنے کلام کا حصہ بنانا) کا ذکر کرنا، اور بعض معانی کو پوشیدہ رکھنا، "وھذا الضرب ھو المستحسن عند العرب والبدیع فی کلامھم" یہ قسم عرب حضرات کے نزدیک مستحسن ہے اور ان کے کلام میں بدیع ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن پاک کو ان دونوں قسموں کے مطابق نازل کیا، صرف محکم آیات ہی تمام کی تمام ہوتیں "لقالوا ھلا انزل بالضرب المستحسن" تو وہ کہتے کہ قرآن پاک اسی طرح کیوں نازل نہیں جو ہمارے کلام میں مستحسن صورت سمجھی جاتی ہے۔ کلام عرب کے ہر پہلو کے مطابق قرآن پاک کو نازل فرما کر "فکانہ قال عارضوہ بای الضربین شئتم" گویا کہ یوں کہا گیا کہ قرآن پاک کا مقابلہ کرو دونوں قسموں میں جس طرح تم چاہتے ہو، لیکن وہ معارضہ سے عاجز آ گئے۔

دوسرا جواب: اللہ تعالی نے متشابہات کو فائدہ عظیمہ کیلئے نازل کیا وہ یہ کہ اہل علم متشابہات کو محکمات کی طرف لے جانے میں مشغول ہوں اور آیات میں زیادہ تفکر کریں، جب وہ معانی کے حاصل کرنے میں محنت

ومشقت کریں گے "فیثیبون علی تعبهم کما اثیبوا علی عباداتهم" تو ان کو اس مشقت پر اسی طرح ثواب دیا جائے گا جس طرح عبادت کرنے پر ثواب دیا جاتا ہے۔

"ولو انزل القرآن کله محکما لاستوی فی معرفته العالم و الجاهل و لم یفضل العالم علی غیره"

اگر تمام قرآن پاک محکم نازل ہوتا، اس میں متشابہات آیات نہ ہوتیں تو عالم اور جاہل برابر ہوتے، اور عالم کو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل نہ ہوتی کیونکہ معانی میں جب تفکر کی ضرورت ہی درپیش نہ آتی تو غور وفکر کا مقام ختم ہو جاتا تو جاہل اور عالم برابر ہو جاتے۔

قرآن پاک کی متشابہات میں تفکر کرنے والا فقیر اور محتاج کی طرح ہے اور نہ فکر کرنے والا غنی اور بے پرواہ کی طرح ہے "وقد قیل فی عیب الغنی انه یورث البلادة وفی فضیلة الفقر انه یورث الفطنة" غنی کا عیب ہی یہ ہے کہ اسے بے پرواہی کی وجہ سے بے وقوفی حاصل ہوتی ہے، اور فقیر کا کمال ہی یہ ہے اسے احتیاجی کی وجہ سے عقلمندی حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا جواب: علم والے حضرات علم میں کچھ پوشیدہ نکات رکھتے ہیں تاکہ طلباء کے ذہنوں کو پہچانیں کہ وہ ان کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں، پھر ان کا وہ کیا جواب دیتے ہیں، جب وہ پوشیدہ نکات کا جواب دینے پر قادر ہوں تو ان کو ذہین سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کو علمی دسترس (قدرت) حاصل ہے۔

"فلما کان ذلک حسنا عند العلماء جاز ان یکون ما انزل الله تعالی من المتشابه علی هذا النحو"

جب یہ اہل علم کے نزدیک جائز ہے تو اللہ تعالیٰ کا متشابہات کو نازل کرنا بھی جائز ہے۔

چوتھا جواب: ان الله تعالی انزل المتشابه فی کتابه مختبرا به عباده لیقف المؤمن عنده ویرد علمه الی عالمه فیعظم بذلک ثوابه ویرتاب به المنافق فیداخله الزیغ فیستحق بذلک العقوبة کما ابتلی بنو اسرئیل بالنهر والله اعلم بمراده"

تحقیق اللہ تعالیٰ نے متشابہات کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اپنے بندوں کو آزمانے کیلئے، مومن کی آزمائش یہ ہے کہ بیشک وہ ان آیات میں غور وفکر کرے، اپنے ذہن کی آزمائش کرے، معانی ومطالب کو حاصل کرنے میں غور فکر کر کے ثواب حاصل کرے لیکن آخر کار رک جائے، توقف کرے، اور یہی کہے کہ ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا

ہے تو اسے عظیم ثواب حاصل ہوگا۔

آیات متشابہات سے منافقوں کی بھی آزمائش پائی جاتی ہے کہ وہ ان میں شک کریں گے، ان کو دلوں میں ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ غلط تاویلیں کر کے گمراہ ہو جاتے ہیں، اور عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں، آیات متشابہات سے آزمائش ایسے ہی ہے جیسے بنی اسرئیل کو ایک نہر سے آزمایا گیا، جن لوگوں نے اس سے پانی پی لیا وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمان ہوئے، جنہوں نے پانی نہیں پیا ہاں البتہ ایک چلو بھر جس کی اجازت تھی اسی پر اکتفاء کیا وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع ہوئے۔ واللہ اعلم (ماخوذ از خازن)

تنبیہ: حقیقی مراد متشابہات کی اللہ تعالیٰ ہے جانتا ہے ظاہری مطالب بیان کرنا کہ ان الفاظ کے یہ مطالب لئے جا سکتے ہیں جو شریعت کے منافی نہیں۔ یہ صحابہ کرام اور تابعین سے ثابت ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ کے متعلق ابھی قریب ہی ذکر کیا گیا کہ استواء کا معنی ہے ''بیٹھنا'' غلبہ حاصل کرنا، قدرت حاصل کرنا'' ان معانی میں ''بیٹھنا'' اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں لیکن جب یہ معنی کیا جائے کہ ''رحمٰن کو عرش پر غلبہ حاصل ہے'' یا معنی یہ کیا جائے ''رحمٰن کو عرش پر قدرت حاصل ہے'' تو یہ معانی اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی نہیں، لیکن احتمال پائے جانے کی وجہ سے متشابہ کہا گیا ہے، کہ حقیقی مراد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (راقم)

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾

''لیکن وہ جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں ان کا جو اشتباہ والی ہیں، اس سے وہ تلاش کرتے ہیں فتنہ اور تلاش کرتے ہیں اس کی تاویلیں۔''

بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو دو قسموں پر منقسم فرمایا کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔ اب یہاں پر بیان فرمایا کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی (ٹیڑھا پن) ہے وہ متشابہات سے ہی دلائل پکڑتے ہیں، ''والزیغ المیل عن الحق یقال زاغ زیغا ای مال میلا'' زیغ کا معنی ہے حق سے پھر جانا، کہا جاتا ہے ''زاغ زیغا'' اس کا معنی کیا جاتا ہے میلان کرنا، پھر جانا۔ (کبیر)

جن کے دلوں میں کجی ہے وہ کون لوگ ہیں:

''فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ'' میل عن الحق وھم اھل البدع'' ''جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن

ہے''اس سے مراد اہل بدعت ہیں جو حق سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ (مدارک)

اسی معنی کو قاضی ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے پسند فرمایا ہے۔

''وقیل هم جمیع المبتدعة والصحیح ان اللفظ عام لجمیع من ذکر وجمیع اصناف البدعة''

بعض حضرات نے کجی والوں کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ بدعتی لوگ ہیں۔ صحیح یہی ہے کیونکہ لفظ عام ہے جو سب اقوال کو شامل ہے (جن کا ذکر عنقریب ہی انشاء اللہ آرہا ہے) یعنی تمام ہی بدعتی لوگوں کو یہ شامل ہے کہ ان کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے۔

مختلف اقوال: اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آرہا ہے کہ ''زیغ'' میں مختلف اقوال ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ تمام بدعتی لوگ ''اهل زیغ'' (کجی والے) ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ پر مختلف لوگوں کو مختلف اوقات میں اہل زیغ کہا گیا ہے، یہ اقوال کا اختلاف بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اہل زیغ ہیں۔

''قال الربیع هم وفد نجران خاصموا النبی ﷺ فی عیسی علیه السلام''

ربیع رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں جو مذکور ہے ''کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ٹیڑھا پن ہے وہ پیچھا کرتے ہیں متشابہات کا فتنہ تلاش کرنے کیلئے اور تاویلیں تلاش کرنے کیلئے''

اس سے مراد نجران کے عیسائیوں کا وفد ہے، جنہوں نے ''کلمة الله وروح منه'' کا مطلب نہ سمجھا اور ظاہر الفاظ سے غلط مطلب لے کر عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔ ''وقال الکلبی هم الیهود وطلبوا علم اجل هذه الامة واستخراجه بحساب الجمل'' کلبی رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے مرد یہودی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی امت کا حساب حروف مقطعات سے باعتبار ابجد کے حساب لگایا، لیکن وہ خود ہی اعتراض کرنے لگے ''ولقد خلطت علینا فلاندری أبکثیرة ناخذ ام بقلیلة ونحن مما لانؤمن بهذا'' کہ تم نے ہم پر خلط ملط کر دیا ہے، یعنی مختلف حروف مقطعات پیش کر کے معاملہ ہم پر مشتبہ کر دیا ہے ہمیں معلوم نہیں ہو رہا کہ ہم ان حروف پر عمل کریں جن کے عدد کم ہیں یا ان پر عمل کریں جن کے عدد زیادہ ہیں۔ انہوں نے اس سے بہانہ وحیلہ تراشا کہ ہم ایمان ہی نہیں لاتے۔

خیال رہے جو قول کلبی رحمہ اللہ کہ ہے وہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ ''وقال ابن جریج هم المنافقون'' ابن جریج رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں مذکور اہل زیغ سے مرد منافقین ہیں۔ جنہوں نے متشابہات کی غلط تاویلیں کیں۔ ''وقال الحسن هم الخوارج'' حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا وہ اہل زیغ خارجی لوگ ہیں۔ ''کذا اخرج احمد وغیره عن ابی امامة عن النبی ﷺ'' اسی طرح یعنی خارجی مراد

ہونے پر مسند احمد وغیرہ میں ابوامامہ کی روایت نبی کریم ﷺ سے بھی ملتی ہے۔

"وکان قتادة اذاقرأ هذه الآية "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" قال ان لم يكونوا الحرورية والسابية فلاادرى من هم"

قتادہ ﷫ جب یہ آیۃ کریمہ "فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" تلاوت فرماتے تو فرماتے اگر حرور یہ قبیلہ کے خارجی اور سابیہ قبیلہ کے لوگ نہ ہوتے تو مجھے معلوم نہ ہوتا کہ جن لوگوں کے دلوں میں زیغ (ٹیڑھا پن) ہے وہ کون ہیں۔

"وقيل هم جميع المبتدعة" بعض حضرات نے کہا اس سے مرد تمام بدعتی لوگ ہیں۔نتیجہ وہی جس کو شروع میں ذکر کر دیا گیا" والصحيح ان اللفظ عام لجميع من ذكر وجميع اصناف المبتدعة" صحیح یہی ہے کہ لفظ عام ہے، اس لئے جتنے اقوال اہل زیغ (کجی والوں) کے متعلق ذکر ہیں، وہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ وہ سب ہی دلوں میں ٹیڑھا پن رکھتے ہیں۔اور بدعتی لوگوں کی سب قسمیں ہی اس میں داخل ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

❁ عن عائشة قالت تلارسول الله ﷺ هذه الآية هو الذى انزل عليك الكتاب منه آيات محكمات هن ام الكتاب واخر متشابهات ،الى قوله اولوا الالباب،قالت قال رسول الله ﷺ قالت قال رسول الله ﷺ فاذا رأت الذين يتبعون ماتشابه منه فاولئك الذين سمى الله فا حذروهم" (رواه البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہ آیۃ تلاوت فرمائی۔"هُوَ الَّذِي اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ .... اُولُوا الْاَلْبَابِ" (یعنی مکمل آیۃ تلاوت فرمائی) تو ارشاد فرمایا جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں۔(تو ان سے بچ کر رہو) یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا "فاحذروهم" ان سے بچ کر رہو۔ (مظہری)

❁ وروى احمد عن ابى امامة عن النبى ﷺ فى قوله تعالى "فاما الذين فى قلوبهم زيغ فيتبعون ماتشابه منه" قال هم الخوارج،وفى قوله تعالى "يوم تبيض وجوه وتسود وجوه" قال هم الخوارج"

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ﴾ کے متعلق فرمایا کہ اس کا مصداق "خارجی لوگ ہیں" اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" کا مصداق بھی آپ نے خارجیوں کو قرار دیا۔

یہ حدیث صراحۃ (ظاہر طور پر) مرفوع ہے، اور عقل کا بھی تقاضا یہی ہے کہ یہ کسی صحابی پر موقوف نہیں، اور

اس کا معنی بھی صحیح ہے "فان اول بدعة وقعت فی الاسلام فتنة الخوارج" کیونکہ اسلام میں سب سے پہلا فتنہ اسلام میں خارجیوں نے پیدا کیا۔ان کا مقصد ہی اصل میں دنیاوی مال ہوتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حنین کے مال غنیمت میں ذوالخویصرۃ نے کہا "اعدل فانک لم تعدل" انصاف کرو تم نے انصاف نہیں کیا۔"فقال رسول الله ﷺ لقد خبیت و خسرت ان لم اکن اعدل ایأمننی علی اھل الارض ولا تأمنونی" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ذلیل و خوار ہو گیا (جب تو نے کہا) میں نے عدل نہیں کیا۔میرے انصاف پر تو تمام زمین والے یقین رکھتے ہیں۔اور تم اس پر یقین نہیں رکھتے۔"استاذن عمر بن الخطاب فی قتله" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کی اجازت طلب کی کہ یا رسول اللہ مجھے اجازت دو کہ میں اس منافق کا سر قلم کر دوں۔

"فقال دعه فانه یخرج من ضنضئی هذا (ای من جنسه) قول یحقر احدکم صلوته مع صلوتهم و قراء ته مع قراء تهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة فاینما لقیتموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجرالمن قتلهم"

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو، اس کی جنس (نسل) سے ایسی قوم نکلے گی جن کی نمازوں کے سامنے تم اپنی نمازوں کو گھٹیا سمجھو گے، اور ان کے قرآن پڑھنے کے سامنے تم اپنا قرآن پاک پڑھنا گھٹیا سمجھو گے (یعنی تم یہ خیال کرو گے کہاں ہماری نمازیں کہاں ان کی نمازیں، وہ بڑے لمبے رکوع و سجود کر کے بڑی اعلیٰ نماز پڑھ رہے ہیں۔کہاں ان کا قرآن پاک پڑھنا اور کہاں ہمارا قرآن پڑھنا وہ تو بڑی عمدگی سے تجوید اور خوش الحانی سے قرآن پڑھ رہے ہیں) وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔جہاں بھی ان کو پانا ان کو قتل کر دینا، ان کے قتل میں تمہیں اجر حاصل ہو گا۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خارجیوں کا سردار قتل کر دیا گیا۔پھر مختلف نظریات و خواہشات رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے، مختلف عقائد ان کے ہوئے، کوئی قدریہ فرقہ بن گیا، کوئی معتزلہ فرقہ بنا، کوئی جہمیہ فرقہ بنا، یہ سب بدعتی فرقے ہیں، یہ سب ہی "اہل زیغ" دل میں کجی، ٹیڑھا پن رکھنے والے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی جگمگا رہا ہے "وستفترق هذه الامة علی ثلاث وسبعین فرقة کلها فی النار الاواحدة" کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے، سوائے ایک فرقہ کے باقی سب جہنمی ہوں گے۔صحابہ کرام نے پوچھا "ومن یا رسول الله" وہ نجات پانے والا فرقہ یا رسول اللہ کونسا ہو گیا؟ "قال "ومن کان علی ما انا علیه واصحابی" آپ نے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں" (اس پر قائم رہنے والا فرقہ نجات پانے والا ہو گا)۔ (ماخوذ از ابن کثیر و صابونی)

❁ واخرج الطبرانی عن ابی مالک الا شعری انه سمع رسول اللهﷺ یقول لا اخاف علی امتی الآثلاث خلال ان یکثرلهم المال فیتحا سدوا فیقتتلوا وان یفتح لهم الکتاب فیاخذه المؤمن یبتغی تاویله (وما یعلم تاویله الاالله والراسخون فی العلم یقولون آمنابه کل من عندربنا وما یذکر الااولوا الالباب) وان یزداد علمهم فیضیعوه ولا یبالون به"

طبرانی نے ابو مالک اشعریؓ سے روایت کی کہ انہوں نے رسول اللہﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مجھے اپنی امت پر سوائے تین خصلتوں کے کوئی خوف نہیں۔(ایک یہ کہ) ان کے پاس مال زیادہ ہو جائے گا، وہ ایک دوسرے پر حسد کریں گے اور آپس میں لڑیں گے۔(دوسری یہ کہ) اور ان کے سامنے قرآن پاک کھولا جائے گا وہ اس میں تاویلیں تلاش کریں گے، حالانکہ (متشابہ کی) تاویلیں رب تعالی کے بغیر کوئی نہیں جانتا، اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہیں گے ہم ایمان لائے ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نہیں نصیحت کرتے سوائے عقل والوں کے۔(اور تیسری یہ کہ) ان کو علم زیادہ عطاء کیا جائے گا وہ اسے ضائع کر دیں گے اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔ (درمنثور)

❁ واخرج الحاکم وصححه عن ابی هریرة قال قال رسول الله ا مما الخوف علی امتی ان یکثر فیهم المال حتی یتنافسوا فیه فیقتتلوا علیه وان مما الخوف علی امتی ان یفتح لهم القرآن حتی یقرأه المؤمن والکافر والمنافق فیحل حلاله المؤمن"

مستدرک حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ذکر کی جسے صحیح قرار دیا، رسول اللہﷺ نے بیان فرمایا مجھے اپنی امت پر یہ خوف ہے کہ ان کے پاس مال کثیر ہو جائے گا، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے آپ کو برتر اور نفیس سمجھیں گے جس کی وجہ سے ان میں قتال واقع ہوگا، اور مجھے اپنی امت پر یہ خوف ہے کہ ان کے سامنے قرآن کھولا جائے گا یہاں تک کہ مؤمن اور کافر اور منافق قرآن پڑھیں گے، حلال کو حلال صرف مؤمن سمجھیں گے۔ (درمنثور)

یعنی قرآن پاک سے دلیل کافر بھی پکڑیں گے اور منافق بھی، لیکن معاذ اللہ ان کے دلائل دھوکے پرمبنی ہوں گے، وہ اپنے دلوں میں کجی رکھنے کی وجہ سے قرآن کی غلط تاویلیں کریں گے۔ صرف مؤمنین ہی قرآن پاک کو صحیح سمجھ کر حلال کو حلال سمجھیں گے، اور حرام کو حرام سمجھیں گے۔

❁ اخرج ابو یعلی عن حذیفة عن رسول اللهﷺ قال ان فی امتی قوما یقرؤن القرآن ینثرونه نثر الدقل یتاولونه علی غیر تاویله"

مسند ابی یعلی میں حضرت حذیفہؓ سے روایت ذکر کی گئی ہے، رسول اللہﷺ نے فرمایا بیشک میرے امت میں ایک

قوم ایسی آئے گی جو قرآن پاک اس طرح بکھیر دیں گے جیسا کہ ردی کھجوروں کو بکھیر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی تاویلیں پیش کریں گے جو قرآن پاک کے مطالب کے خلاف ہوں گی۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن سعد وابن الضريس في فضائله وابن مردويه عن عمر بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله ﷺ خرج على قوم يترا جعون في القرآن وهو مغضب فقال بهذا ضلت الامم قبلكم باختلافهم على ابنيائهم وضرب الكتاب بعضه ببعض قال وان القرآن لم ينزل ليكذب بعضه بعضا ولكن نزل ان يصدق بعضه بعضافما عرفتم منه فاعملو ابه وما تشابه عليكم فآمنوا به"

ابن سعد اور ابن ضریس اور ابن مردویہ نے عمرو بن شعیب کی روایت اپنے باپ، دادا سے بیان کی بیشک رسول اللہ ﷺ ایک قوم پر نکلے جو قرآن میں جھگڑا کر رہے تھے، آپ بہت زیادہ ناراض ہوئے آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام پر جھگڑا کیا اور آسمانی کتابوں کی بعض آیات کو بعض پر پیش کیا (یعنی یہ کہا کہ یہ آیت فلاں آیۃ کے مخالف ہے) آپ نے فرمایا بیشک قرآن اس لئے نہیں نازل ہوا کہ بعض آیات بعض دوسری آیات کی تکذیب کریں (جھٹلائیں) لیکن قرآن تو اس لئے نازل ہوا کہ بعض قرآن دوسرے بعض کی تصدیق کرے جو تمہاری سمجھ میں آجائے اس پر عمل کرو، اور جو تمہاری سمجھ میں نہ آئے اس پر ایمان رکھو۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شيبة في المصنف عن ابی قال كتاب الله ما استبان منه فاعمل به وما اشتبه عليک فآمن به وكله الى عالمه"

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ اللہ کی کتاب سے جو تم پر ظاہر ہو اس پر عمل کرو اور جو تم پر مشتبہ ہو اس پر ایمان رکھو اور صاحب علم کے سپرد اسے کر دو۔ (درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ ○﴾

(1) ''اور نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ کے، اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس پر، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے عقل والوں کے۔''

وقف کس پر ھے: اس میں ایک مذہب احناف کا ہے کہ وقف ''الا اللہ'' پر ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہے ''اور نہیں جانتا اس کے تاویل کو سوائے اللہ کے۔ اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے'' اور دوسرا مذہب اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے کہ وقف ''والراسخون فی العلم'' پر ہے اس لحاظ پر معنی یہ ہے کہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو سوائے اللہ اور پختہ علم والوں کے، حال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔

وجہ فرق: دونوں مذہبوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مذہب کے متعلق متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور دوسرے مذہب کے مطابق متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور پختہ علم والوں کو بھی حاصل ہے۔

سؤال: جب احناف کا مذہب یہ ہے کہ وقف ''الا اللہ'' پر ہے تو پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ متشابہات کا علم رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے، اور اولیاء کرام کو بھی متشابہات کا علم حاصل ہے یہ تو ''الا اللہ'' پر وقف کے منافی ہے۔

اجمالی جواب: اللہ تعالیٰ جب کسی کو علم عطاء نہ کرے تو اس کے بغیر متشابہات کا علم کسی کو حاصل نہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ یا اولیاء کرام کو علم عطاء کر دے تو وہ اس کے عطاء سے علم رکھتے ہیں۔

تفصیلی جواب: متشابہ کی چند قسمیں ہیں ان میں سے **ایک قسم** یہ ہے کہ اسے علماء جانتے ہیں یہ قسم کون سی ہے؟ ''وقسم للانسان سبیل الی معرفته کالالفاظ الغریبة والاحکام الغلقة'' یہ قسم وہ ہے کہ الفاظ غریبہ ہوں یعنی کم استعمال ہوتے ہوں اور احکام ان کے پیچیدہ اور پوشیدہ ہوں، ان کی تنگ ودو کی جائے یعنی ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

پھر اس قسم کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ کمیت (تعداد، مقدار) کے لحاظ پر اشتباہ حاصل ہو جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ''اقتلوا المشرکین'' اس میں دو احتمال ہیں کہ تمام مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا یا بعض کو، لیکن جب دوسرے

احکام کو دیکھا تو پتہ چل گیا کہ وہ کفار جن کو مسلمانوں کے حاکم نے اپنے ملک میں رہنے کی اجازت دے دی اور ان پر جزیہ مقرر کر دیا، وہ ذمی ہو گئے، ذمی لوگوں کے مال اور ان کی جانوں کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، لھذا ان کو قتل نہیں کیا جا سکے گا۔ جنگ میں کسی مسلمان نے کسی کافر کو پناہ دے دی تو اسے اس معاہدہ کی وجہ سے قتل نہیں کیا جا سکے گا۔ دار حرب سے کوئی کافر مسلمانوں کے ملک میں اجازت طلب کر کے آئے تو اسے قتل کرنا منع ہو گا اسے آنے کی اجازت دے کر اس کی جان اور مال کی حفاظت مسلمانوں نے اپنے ذمہ لے لی لھذا جتنے دنوں کی اسے اجازت دی ہے اتنے دنوں تک اسے قتل کرنا منع ہے۔

واضح ہوا کہ اس قسم میں بظاہر اشتباہ تھا، لیکن احکام شرع میں غور و فکر سے پتہ چل گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے، "والثانی من جهة الكيفية كالوجوب والندب فی نحو "(فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ) کہ کیفیت کے لحاظ پر اشتباہ ہو کہ یہ امر (حکم) وجوبی ہے یا استحبابی، جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ﴾ میں یہ بظاہر واضح نہیں کہ نکاح کرنا واجب ہے یا مستحب ہے۔ جب احکام شرع میں غور کیا تو پتہ چلا کہ نکاح کرنا سنت ہے، اگر غلبہ شہوت ہو تو واجب ہے۔

(۳) "والثالث من جهة الزمان كالناسخ والمنسوخ نحو "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ" (ڈرو اللہ تعالی سے جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے) یعنی تیسری قسم یہ ہے کہ زمان کے لحاظ پر اس میں اشتباہ ہو کہ یہ ناسخ ہے یا منسوخ ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ میں اشتباہ پایا گیا، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا رسول اللہ ﷺ کے بعد منسوخ ہونے کا احتمال ہی اٹھ گیا۔

(۴) "والرابع من جهة المكان والامور التی نزلت فيها الآية نحو "وليس البر بأن تأتوا البيوت من ظهورها" "وانما النسئ زيادة فی الكفر "فان من لا يعرف عادتهم فی الجاهلية يتعذر عليه تفسير هذه"

چوتھی قسم یہ ہے کہ مکان کے لحاظ پر اشتباہ ہو اور امور جن کا ذکر آیۃ کریمہ میں اشتباہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پیٹھوں کی طرف سے آؤ۔

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِی الْكُفْرِ﴾ ان کا مہینے پیچھے ہٹانا نہیں مگر اور کفر میں بڑھنا۔ جس شخص کو کافروں کی عادات کا پتہ نہ ہو اس پر ان آیات کا سمجھنا مشکل ہے، اور اسے اشتباہ حاصل ہوتا ہے کہ ان کا مطلب کیا ہے، جب ان کی عادت کا پتہ چل گیا کہ وہ جب احرام باندھ لیتے تو واپس گھر نہیں لوٹتے تھے، اگر گھر

آنے کی کوئی مجبوری درپیش آجاتی تو گھروں کے دروازوں سے نہیں آتے تھے بلکہ پچھلی دیوار میں سوراخ کر کے گھر داخل ہوتے، رب تعالی نے ان کے اس فعل کا رد فرمایا کہ یہ کوئی نیکی کا کام نہیں۔اسی طرح ان کا مہینوں کا پیچھے ہٹانے کا کیا مطلب ہے؟ واضح نہیں تھا، اس میں اشتباہ پایا گیا، لیکن جب ان کی عادت کا پتہ چلا تو مطلب بھی واضح ہوگیا کہ ان کی زمانہ جاہلیت میں یہ عادت تھی کہ حج صرف موسم بہار میں کرتے تھے اس لئے وہ ہر تین سال کے بعد ایک مہینہ بڑھادیتے تھے یعنی سال تیرہ مہینوں کا کر دیتے تھے، اب واضح ہوگیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۵) والخامس من جهة الشروط التی یصح بها الفعل ویفسد کشرط الصلوة و النکاح"

اور پانچویں قسم شرطوں کے لحاظ پر اشتباہ کا پایا جانا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو شرطیں ہیں کسی فعل کیلئے کہ ان کے پائے جانے سے وہ فعل صحیح ہو، اور نہ پائے جانے سے وہ فعل فاسد ہو، جیسا کہ نماز کی شرطوں یا نکاح کی شرطوں میں اشتباہ تھا، جب احکام شرع کی طرف غور کیا تو پتہ چل گیا کہ طہارت بدن اور کپڑوں اور مکان کی جس میں وہ نماز ادا کر رہا ہے ضروری ہے، بدن کی طہارت عام ہے، حدث سے بھی پاک ہو اور نجاست سے بھی پاک ہو۔اور نیت کا پایا جانا ضروری ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کرے، اور ستر عورت پایا جائے۔اسی طرح نکاح میں جب غور کیا تو پتہ چلا کہ اس میں ایجاب وقبول ضروری ہے، اور دو مردوں کا گواہ ہونا، یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ بنانا ضروری ہے۔

اسی طرح نکاح میں جب غور کیا تو پتہ چلا کہ اس میں ایجاب وقبول ضروری ہے، اور دو مردوں کا گواہ ہونا، یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہ بنانا ضروری ہے۔متشابہ کی یہ تمام اقسام غور وفکر کے بعد حاصل ہوجاتی ہیں۔

دوسری قسم: "وضرب متردد بین الأمرین یختص بمعرفته بعض الراسخین فی العلم ویخفی علی من دونهم"

یعنی متشابہ کی اقسام میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ دو امروں میں تردد ہو کہ اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے یا یہ مطلب ہوسکتا ہے، اس کا وہ علم ان علماء کو حاصل ہوتا ہے جو پختہ علم رکھنے والا ہوتے ہیں، اور جن کا علم پختہ نہیں ہوتا ان کو اس قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔

"وهوا لمشار الیه بقوله ﷺ لابن عباس رضی الله عنهما "اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل"

اسی کی طرف اشارہ ملتا ہے رسول اللہ ﷺ کی اس دعاء سے جو آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے فرمائی "اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل" اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطاء فرما اور تاویلوں کا علم عطاء فرما۔حدیث شریف میں تاویلوں کے علم کا یہی مطلب ہے کہ متشابہات کی صحیح تاویلوں کا علم عطا فرما۔

تیسری قسم: "ضرب لاسبیل للوقوف علیه کوقت الساعة وخروج الدابة وغیر ذلک"
متشابہات کی تیسری قسم یہ ہے کہ جن پر انسان واقف نہیں ہوسکتا جیسا کہ قیامت کا وقت اور قیامت کے قریب دابہ کا نکلنا، وہ دابہ (جانور) کیسا ہوگا اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

تنبیہ: ابھی جس تیسری قسم کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر بعض متشابہات کا علم کسی کو حاصل نہیں اس سے مراد ذاتی علم ہے، کہ ان کا ذاتی طور پر علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لیکن عطائی علم انبیاء کرام اور اولیاء عظام کو حاصل ہے، جو وحی اور الہام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

آیئے اس مسئلہ کی تفصیل دیکھئے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو آزماتا ہے، لیکن ہر ایک کی آزمائش اس کی شان کے مطابق ہوتی ہے۔ جاہل کی آزمائش اس میں ہے کہ اسے علم حاصل کرنے کے متعلق کہا گیا ہے۔ اور علماء کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ متشابہات کی طرف عقلی گھوڑے نہ دوڑائیں

"والسر فی هذا الابتلاء قص جناح العقل وکسر سورة الفکر، واذهاب عجب طاؤس النفس لیتوجه القلب بشراشره تجاه کعبة العبودیة ویخضع تحت سرادقات الربوبیة ویعترف بالقصور ویقر بالعجز عن الوصول الی ما فی هاتیک القصور وفی ذلک غایة التربیة ونهایة المصلحة هذا اذا ارید بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفته من طریق الفکر"

علماء کی اس آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کے پروں کو کاٹ دیں، اور اپنی فکر کی تیزی اور دبدبہ کو توڑ دیں، اور اپنے نفس پر مور کی طرح تعجب کرنا چھوڑ دیں، اور دل کو مکمل طور پر کعبہ عبودیت کی طرف متوجہ کرلیں، اور ربوبیت کے پردوں میں اپنے آپ کو نہایت عجز وانکساری سے چھپالیں، اور وہ اپنے قصور، یعنی کم علمی کا اعتراف کرلیں۔ اور اقرار کرلیں کہ متشابہات کے ان محلات میں پہنچنا ان کے لئے دشوار ہے، ہاں کان کی تربیت و مصلحت کی انتہاء اسی میں ہے کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے وہ اپنی فکر ورائے سے ان کا علم حاصل نہیں کرسکتے۔

اعتراض: یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کسی اور کو حاصل نہیں، اس سے تو وحی اور الہام کا دروازہ مکمل طور پر بند ہوجائے گا، حالانکہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ وحی اور الہام کے ذریعے علم عطاء کرتا ہے اور اولیاء کرام کو بھی الہام کے ذریعے علم عطاء کیا جاتا ہے۔

جواب: "وانما المنع من الاحاطة ومن معرفته علی سبیل النظر والفکر" متشابہات کا علم کسی انسان کو حاصل نہیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی شخص نظر وفکر سے ان کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا، جہاں تک وحی اور

الہام کا تعلق ہے اس کا مطلب یہ ہے

"وان المتشابه مما استاثره الله تعالى بعلمه لايمنع تعليمه للنبی ﷺ بواسطة الوحی مثلا ولا القائه فی روع الولی الكامل مفصلا لكن لا يصل الى درجة الاحاطة كعلم الله تعالى"

متشابہات کا علم ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کو وحی کے ذریعے یہ علم عطا نہیں کرتا، اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کاملین کو الہام کے ذریعے یہ علم عطا نہیں کرتا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو بذریعہ وحی اور اولیاء کرام کو بذریعہ الہام متشابہات کا علم تفصیلی طور عطاء فرماتا ہے تفصیلی علم عطاء کرنے کے باوجود بندوں کا علم اس طرح احاطہ نہیں کرتا جسطرح اللہ تعالیٰ کا علم احاطہ کرتا ہے۔

"ومنع هذا وذاک مما لايكاد يقول به من يعرف رتبة النبی ﷺ ورتبة اولياء امته الكاملين"

متشابہات کا علم ذاتی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور رب تعالیٰ کی عطاء سے انبیاء کرام اور نبی کریم ﷺ کی امت کے اولیاء کاملین کو بھی حاصل ہے۔ ان دونوں چیزوں کا وہ شخص انکار نہیں کرسکتا جو نبی کریم ﷺ کے مرتبہ کو جانتا ہے اور آپ کی امت کے اولیاء کاملین کے مراتب کو جانتا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی بالتفصیل)

ھاں جو شخص مقام نبی کریم ﷺ اور مقام اولیاء کرام کو نہیں جانتا تو اس کا یہ کہنا "کہ متشابہات کا علم نبی کریم ﷺ اور اولیاء کرام کو حاصل نہیں" صحیح ہے، کیونکہ وہ جاہل ہے جاہل کو جہالت کی وجہ سے معذور ہی سمجھا جائے۔ (راقم)

ان کا فتنہ کیا ہے؟

یعنی رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ﴾ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں فتنہ تلاش کرنے کیلئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فتنہ کسے کہا جاتا ہے اور متشابہات کا پیچھا کرنے والوں کا فتنہ کیا ہے۔

"الفتنة فی اللغة الاستهتار بالشیء والغلو فيه" فتنہ کا لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز پر فریفتہ ہوجانا اور اس میں غلو کرنا، حد سے بڑھ جانا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان مفتون بطلب الدنيا" فلاں شخص دنیا کی طلب میں حد سے بڑھ گیا، قدر سے تجاوز کرگیا۔

مفسرین کرام نے متشابہات کا پیچھا کرنے والوں کے فتنہ میں چند وجوہ بیان کی ہیں جو سب ہی مراد ہیں۔

(۱) پہلا قول ہے اصم رحمہ اللہ کا کہ جب وہ دین میں متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں تو بعض لوگ بعض کے مخالف ہوجاتے ہیں "وذلک يفضی الی القتال والهرج والمرج فذاک هو الفتنة" ان کا ایک دوسرے کے مخالف

ہونا ان کے درمیان لڑائیوں کا اب بنتا ہے، جس پر قتل وغارت مرتب ہوتے ہیں، یہی تو فتنہ ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے 'ان التمسک بذلک المتشابه یقرر البدعة و الباطل فی قلبه فیصیر مفتونا بذلک الباطل عاکفا علیه لاینقلع عنه بحیلة البتة" کہ متشابہات کا پیچھا کرنے سے انسان بدعات کا مرتکب ہوجاتا ہے، اوراس کے دل میں باطل نظریات گھر کر جاتے ہیں وہ اسے باطل پر سہارا لگانے کی وجہ سے فتنہ میں مبتلاء ہوجاتا ہے، وہ اس درجہ تک فتنہ میں مبتلاء ہوجاتا ہے کہ کسی حیلہ سے بھی اسے ان باطل نظریات سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔

(۳) ان الفتنة فی الدین هو الدین هو الضلال عنه ومعلوم انه لافتنة و لافساد اعظم من الفتنة فی الدین و الفساد فیه"

تیسرا قول یہ ہے کہ متشابہات کا پیچھا کرنے والا اور ان کے غلط مطالب نکالنے والا گمراہ ہوجاتا ہے، اور یہ یقینی بات ہے دین میں فتنہ وفساد سب فتنوں سے بڑا فتنہ ہے۔ (از کبیر)

﴿وَابۡتِغَاءَ تَأۡوِيلِهِ﴾ ''اور وہ تاویلیں تلاش کرتے ہیں۔''

"التاویل فی اللغة المرجع والمصیر" تاویل کا لغوی معنی ہے''لوٹنا، پھرنا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے"آل الامر کذا" یہ معاملہ اس طرف پھیر دیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے"اولته تاویلا "میں نے اس کو اس طرف پھیر دیا۔ پھر کسی چیز کی وضاحت کرنے کو بھی تاویل کہا جاتا ہے جس طرح اللہ تعالی کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿سَأُنَبِّئُكَ بِتَأۡوِيلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعۡ عَلَيۡهِ صَبۡرًا﴾ اب میں باتوں کی وضاحت کروں گا جن پر تم سے صبر نہ ہو سکا" اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے ﴿ذَٰلِكَ خَيۡرٞ وَأَحۡسَنُ تَأۡوِيلًا﴾ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

متشابہات کا دو طرح پیچھا کرنا منع ہے:

جن کے دلوں میں کجی (ٹیڑھا پن) ہوتی ہے وہ متشابہات کا دو طرح کا پیچھا کرتے ہیں، جس کی رب تعالی نے مذمت بیان فرمائی ہے۔

(۱) "احدهما علی غیر الحق وهو المراد من قوله تعالی (ابتغاء الفتنة) ایک ان کے پیچھا کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ان متشابہات کے غلط مطالب نکالتے ہیں، ان کے اپنی مرضی سے غلط مطالب نکالنے کو ہی رب تعالی نے ﴿ابۡتِغَاءَ الۡفِتۡنَةِ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ وہ فتنہ تلاش کرتے ہیں۔

(۲) والثانی ان یحکموا بحکم فی الموضع الذی لادلیل فیه وهو المراد من قوله

تعالی(وابتغاء تاویلہ)

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ متشابہات سے حکم لگاتے ہیں جس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، اسی کو رب تعالی نے ﴿وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ متشابہات کا پیچھا کرنے والے تاویلیں تلاش کرتے ہیں۔ (کبیر)

شوافع کے دلائل:

چونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وقف ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ پر ہے۔ لھذا ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ نہیں جانتا کوئی اس کی تاویل کو سوائے اللہ تعالی اور پختہ علم والوں کے۔ یعنی متشابہات کا علم اللہ تعالی کو حاصل ہے اور پختہ علم والوں کو بھی حاصل ہے، امام شافعی رحمہ اللہ اور آپ کے متبعین نے اپنے موقف پر یہ دلائل قائم کیے ہیں۔

(۱) اگر پختہ علم والوں کا ذکر دل میں ٹیڑھا پن کے ذکر کے بالکل مقابل ہو، کہ دل میں کجی رکھنے والا متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں اور دل میں کجی نہ رکھنے والے متشابہات کو حاصل کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے تو مناسب یہ تھا کہ یوں کہا جاتا "واما الراسخون فیقولون" علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی عبارت کو بھی طلباء کرام مدنظر رکھ لیں۔

"ورجح الاول(ای قول الشافعی) بوجوہ اما اولا فلانہ لو ارید بیان حظ الراسخین مقابلا لبیان حظ الزائغین لکان المناسب ان یقال واما الراسخون فیقولون"

(۲) "واما ثانیا فلأنہ لا فائدۃ حینئذ فی قید الرسوخ بل ھذا حکم العالمین کلھم"

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر صرف ایمان لانے کی بات ہو تو اس میں پختہ علم والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ متشابہات کے متعلق یہ ایمان کہ "یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں" سب اہل علم کو حاصل ہے خواہ وہ ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والے) ہیں یا نہیں۔

(۳) واما ثالثا فلأنہ لا ینحصر حینئذ الکتاب فی المحکم والمتشابہ علی ماھو مقتضی ظاھر العبارۃ حیث لم یقل "ومنہ متشابھات" لان مالایکون متضح المعنی ویھتدی العلماء الی تأویلہ وردہ الی المحکم لا یکون محکما ولا متشابھا بالمعنی المذکور وھو کثیر جدا"

تیسری دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات صرف محکم اور متشابہ میں منحصر (بند) نہیں۔ کیونکہ ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ﴾ تو کہا ہے، لیکن "ومنہ متشابھات" نہیں کہا تو اس سے پتہ چلا کہ جن آیات کا معنی واضح نہ ہو اور علماء کرام ان کو حاصل کرنے کیلئے محکم کی طرف لوٹائیں، یعنی محکم آیات سے ان کے معنی کو حاصل کریں تو وہ آیات نہ محکم

ہیں اور نہ ہی متشابہات ہیں، اس طرح کی آیات بھی قرآن پاک میں بہت ہیں۔ لھذا مسئلہ صرف کجی رکھنے والوں میں اور پختہ علم والوں میں بند نہیں، بلکہ اور قسم بھی ہے۔

(۴) واما رابعا فلأن المحكم حينئذ لا يكون ام الكتاب بمعنى رجوع المتشابه اليه اذلارجوع اليه فيما استأثر الله تعالى بعلمه كعدد الزبانية"

چوتھی دلیل یہ ہے کہ محکم آیات اس وقت تک "ام الکتاب" (اصل کتاب) نہیں ہوسکتیں جب تک ان کو محکم کی طرف نہ لوٹایا جائے، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان متشابہات کو محکم کی طرف نہیں لوٹا سکتے جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جیسا کہ "زبانیہ" فرشتوں کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔

لھذا واضح ہوا کہ بعض متشابہات کو محکم کی طرف لوٹایا جائے گا، ان کا علم پختہ علم والوں کو حاصل ہوگا، یہ چوتھی دلیل دراصل راقم کو محاکمہ نظر آتی ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ احناف کی طرف سے جوابات کے بعد آئے گا۔

(۵) "واما خامسا فلأن ابن عباس رضي الله عنه كان يقول "انا ممن يعلم تاويله"

پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو متشابہ کی تاویل جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس ﷺ کا یہ کہنا درحقیقت نبی کریم ﷺ کی دعاء کا اثر تھا، جس کا ذکر متصل ہی آرہا ہے۔

(۶) واماسادسا فلأنه قد ثبت في الصحيح انه ﷺ دعا لابن عباس فقال ''اللهم فقهه في الدين وعلمه التاويل "ولو كان التاويل مما لايعلمه الاالله تعالى لما كان للدعاء معنى "

لیکن چھٹی دلیل یہ ہے کہ صحیح میں ثابت ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے دعاء کی "اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطاء فرما" اگر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی اور تاویل کا علم نہیں رکھتا تو نبی کریم ﷺ کی دعاء کا کیا مقصد رہ جاتا ہے۔

(۷) واماسابعافلأنه سبحانه وتعالى مدح الراسخين بالتذكرفي هذا المقام وهويشعر بان لهم حظ الأوفرمن معرفة ذلك "

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام میں پختہ علم والوں کی تعریف کی ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَاب﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے) اللہ تعالیٰ نے جب اس مقام میں یعنی متشابہات کے ذکر میں ان کے تذکرہ (نصیحت حاصل کرنے) کا ذکر فرمایا تو اسی سے پتہ چل گیا کہ ان کو کافی حد تک متشابہات کا علم عطاء کردیا گیا۔

(۸) آیات میں جمع، تقسیم، تفریق پائی گئی ہے۔ ﴿اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ میں جمع پائی گئی ہے کہ مطلقاً تمام

کتاب (قرآن پاک) کے نازل کرنے کا ذکر فرمایا گیا'' ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ میں تقسیم پائی گئی ہے کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، اور ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ﴾ میں تفریق پائی گئی کیونکہ جب دو قسموں کو ایک دوسرے کے مقابل ذکر کیا جائے تو اسے تفریق کہا جاتا ہے، یہاں بھی جب ذکر کیا گیا ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ﴾ تو اس کے مقابل ذکر کیا گیا ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کو، یہ بھی ''اما'' اور ''فا'' پر مشتمل ہونا چاہئے تھا، یعنی ''واما الراسخون فی العلم فیقولون'' ہونا چاہئے تھا لیکن قرائن سے پتہ چل جانے پر ''اما'' اور ''فا'' کو حذف کر دیا گیا۔ اس ترتیب سے واضح ہو گیا کہ پختہ علم والوں کو متشابہات کا علم حاصل ہے۔

احناف کی طرف سے جوابات:

(۱) پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ پختہ علم والوں کا ذکر دل میں کجی رکھنے والوں کے مقابل ذکر کیا، لیکن ''والراسخون'' کہا ہے ''واما الراسخون'' نہیں کہا، کیونکہ اس میں پختہ علم والوں کی شان بیان کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہے

''ولم یسلک بهم سبیل المعادلة اللفظیة هنولاء الزائغین وصینوا عن ان یذکروا معهم کما یذکر المتقا بلان فی مثل هذاالمقامات''

کہ لفظی طور پر بھی دونوں کو ایک دوسرے کے برابر نہیں کیا کہ لفظی فرق برابر ہے ''زیغ'' (کجی) والوں کا ذکر اور انداز سے کیا اور ''راسخون'' (پختہ علم والوں) کا ذکر اور انداز سے کیا تا کہ پختہ علم کا ذکر، دل میں ٹیڑھ پن رکھنے والوں کے مقابل ایک ہی انداز سے نہ کیا جائے۔

یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ایمان والوں اور کافروں کے ذکر میں ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ﴾ میں فرق کیا گیا ہے۔

''لم یقل والطاغوت اولیاء الذین کفروا ولا الذین آمنوا ولیهم الله، تعظیما لشانئه تعالی ورعایة للاعتناء بشان المؤمنین''

کیونکہ ''وَالطَّاغُوتُ أَوْلِيَاءُ الَّذِينَ كَفَرُوا'' نہیں ذکر کیا جیسا کہ ایمان والوں کا ذکر ''اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا'' سے کیا گیا ہے۔ اور جس طرح کافروں کا ذکر '' وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ'' سے کیا اس طرح مؤمنین کا ذکر ''الَّذِينَ آمَنُوا وَلِيُّهُمُ اللَّهُ'' سے نہیں کیا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ رب تعالی نے

اپنی عظمت کا بھی لحاظ رکھا اور مؤمنین کی شان کی بلندی کی رعایت بھی رکھی ہے۔

(۲) دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کہا ہے۔یعنی علم والوں کے ساتھ رسوخ کا ذکر کیا ہے، جس سے مبالغہ کے طور پر ثابت کیا ہے کہ متشابہ کی تاویل صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے کیونکہ پختہ علم والے بھی اپنے علم میں کمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں "آمَنَّا بِہٖ" ہمارا اس پر ایمان ہے تو عام علم والے متشابہات کا علم کیسے رکھتے ہوں گے۔تو یقیناً واضح ہو گیا کہ متشابہات کا علم صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے۔

(۳) تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات کا انحصار متشابہات اور محکمات میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ اکہ آپ بیان فرمائیں لوگوں کیلئے جو نازل کیا گیا ان کی طرف (یعنی ان کیلئے) محکمات کے بیان کی ضرورت نہیں، ان کا معنی واضح ہوتا ہے، اور متشابہات کو بیان کرنا مقصود نہیں، تو پتہ چلا کہ بعض آیات محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں، اور بعض نہ ہی محکم ہیں اور نہ متشابہ ہیں، ان کے وضاحت کرنے اور بیان کرنے کا حکم نبی کریم ﷺ کو دیا گیا۔

(۴) چوتھی دلیل کا جواب یہ ہے کہ "ام الکتاب" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ اضافت "فی" سے ہو اب مطلب یہ ہوگا "والمحکم ام فی الکتاب" محکم آیات قرآن پاک میں اصل ہیں۔لیکن متشابہ آیات جن کا علم صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے ان کیلئے محکم نہیں، اور "ام الکتاب" نہیں البتہ یہ کہا جائے کہ "ھو ام ای اصل فی فھم العبادات الشرعیۃ کو جوب معرفتہ وتصدیق رسلہ وامتثال اوامرہ واجتناب نواھیہ" وہ عبادات شرعیہ کے سمجھنے میں اصل ہیں جیسا کہ اللہ تعالی کی معرفت کا واجب ہونا، اور اس کے رسولوں کی تصدیق اور اس کے امر کی فرمانبرداری اور اس کی نواہی سے اجتناب' اور اگر اضافت بمعنی لام کے مانی جائے تو معنی یہ ہوگا 'ھن ام للکتاب" وہ کتاب کیلئے اصل ہیں۔

ولکنہ باعتبار بعضہ وھو الواسطۃ بین القسمین لان متضح الدلالۃ کثیرا ما یرجع الیہ فی خفیھا ممالم یصل الی حد الاستار"

لیکن بعض آیات کیلئے جن آیات کیلئے اصل ہیں وہ آیات دونوں قسموں (محکم ومتشابہ) کے درمیان واسطہ ہیں اس لئے کہ جن کی دلالت واضح ہے یعنی محکم کی طرف وہ آیات لوٹتی ہیں جن میں کچھ معمولی خفاء ہو، اور جن میں زیادہ خفاء ہو یعنی متشابہات ہوں وہ محکم کی طرف نہیں لوٹائی جاتیں کیونکہ ان کا علم ہی حاصل نہیں ہوتا۔

(۵) پانچویں دلیل کا جواب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا "انا ممن یعلم تاویله" میں ان سے ہوں جو اس کی تاویلیں جانتے ہیں، یہ قول آپ کا صحیح روایات (جن میں متشابہات کی تاویلیں نہ جاننے کا ذکر ہے) کے مخالف ہے، اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ قول معتبر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے "وهو متشابه لكنه في الحقيقة واسطة بين المحكم والمتشابه بالمعنى المراد" کہ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو متشابہات کی تاویلوں کا علم ہے، لیکن درحقیقت آپ کے ارشاد سے مراد وہ آیات ہیں جو محکمات اور متشابہات کے درمیان واسطہ ہیں۔

(۶) چھٹی دلیل کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو دعاء فرمائی ہے "وعلمه التاويل" کہ اسے (ابن عباس کو) تاویل کا علم عطاء فرما۔

"لایتعین حمله علی تاویل ما اختص علمه به تعالی بل یجوز حمله علی تفسیر ما یخفی تفسیره من القسم المتردد بین الامرین"

اس تاویل سے مراد وہ تاویل نہیں جو متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کی تاویل جاننے کیلئے دعاء کی ہو بلکہ اس تاویل سے مراد تفسیر ہے۔ یعنی وہ آیات جو محکمات اور متشابہات کے درمیان ہیں جن کے معانی میں احتمال پایا جاتا ہو، اس کے تفسیر جاننے کیلئے آپ نے دعاء فرمائی۔

(۷) ساتویں دلیل کا جواب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ﴿اَلرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) کے متعلق جو یہ ارشاد فرمایا ﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے سوائے عقل والوں کے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو متشابہات کا بھی علم حاصل ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے

"الهم اتعظوا فخالفوا اهواهم ووقفوا عندما حدلهم مولاهم ولم يسلكوا مسلك الزائغين ولم يخوضوا مع الخائضين"

کہ پختہ علم والے نصیحت حاصل کرتے ہیں وہ اپنے خواہشات کے خلاف کام کرتے ہیں کیونکہ علم والوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ متشابہ کا بھی علم حاصل کریں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے جو حد مقرر کی ہے وہ وہاں رک جاتے ہیں اور دل میں کجی رکھنے والوں کی راہ پر وہ نہیں چلتے اور متشابہات میں غور خوض نہیں کرتے۔

(۸) "لابعد في ان يخاطب الله تعالى عباده بمالاسبيل لأحدمن الخلق الى معرفته ويكون ذلك من باب الابتلاء" متشابہات کو نازل فرما کر بندوں کا امتحان لیا گیا کہ جس کی معرفت وہ حاصل نہیں کرسکتے اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں، اس آزمائش کی یہی وجہ ہے کہ وہ عقلی گھوڑے دوڑانے بند کردیں۔ واضح ہوا

کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کو متشابہات کا علم حاصل نہیں، وقف ﴿اِلَّا اللّٰہُ﴾ پر ہے۔

محاکمہ: اگر غور کیا جائے تو احناف اور شوافع کا اختلاف نہیں۔ کیونکہ شوافع نے بھی ان آیات کے متعلق یہ نہیں کہا جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے (جیسے حروف مقطعات اور قیامت کا علم) کہ پختہ علم والے بھی ان کو جانتے ہیں بلکہ بعض آیات جن کے معانی میں احتمال پایا جاتا ہے ان کا علم انہیں حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شوافع نے ان کو متشابہات کہا اور احناف نے ان کو محکمات اور متشابہات کے درمیان فاصلہ مانا کہ یہ نہ محکمات ہیں اور نہ متشابہات ہیں۔

اب نتیجہ واضح ہو گیا کہ جن آیات کے معانی میں احتمال پایا گیا ہے جب ان کو متشابہ کہا جائے تو ان کا علم پختہ علم والوں کو حاصل ہے۔ ان کو حاصل کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ جن متشابہات کے ظاہر معنی معلوم ہیں جیسا کہ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ان کے معانی میں صحیح تاویل کرنا ٹھیک ہے، باطل تاویلیں کرنا جائز نہیں۔ جن کا علم اللہ تعالیٰ سے خاص ہے ان کے تاویلیں تلاش نہ کی جائیں اگر کچھ مطالب مراد لئے جائیں تو یہی کہا جائے کہ حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ اور اولیاء کاملین کو بھی بذریعہ الہام وکشف عطاء کر رکھا ہے جیسا کہ روح المعانی کی عبارت نقل کی جا چکی ہے لیکن اس مقام میں تفسیر مظہری کی عبارت بہت خوب ہے طلباء کرام اسے بھی مدنظر رکھ لیں۔

فهذه الآية لاتدل على ان النبي ﷺ وبعض الكمل من اتباعه لم يكونوا عالمين بمعاني المتشابهات كيف وقد قال الله تعالى (لم ان علينا بيانه) فانه يقتضي ان بيان القرآن محكمه ومتشابه من الله تعالى للنبي ﷺ واجب ضروري، لايجوز ان يكون شئي منهاغير مبين له عليه السلام والا يخلو الخطاب عن الفائدة ويلزم الخلف في الوعدوالحق ماحققنا في اوائل سور البقرة ان المتشابهات هن اسراربين الله تعالى وبين رسول الله ﷺ لم يقصد بها افهام العامة بل افهام الرسول ومن شاء افهامه من كمل اتباعه بل هي ممالايمكن بيانها للعامة وانما يدركها اخص الخواص بعلم لدني مستفادبنوع من المعية الذاتية اوالصفاتية الغير المتكيفة " (مظهری)

اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل نہیں پکڑی جاسکتی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے کامل متبعین کو بھی متشابہات کا علم حاصل نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ (پھر بیشک ہم نے اپنے ذمہ کرم پر لازم کر لیا ہے اس کا بیان کرنا) قرآن پاک کی خواہ محکم آیات ہوں یا متشابہات اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کیلئے ان کو بیان کرنے کا وعدہ فرما لیا، رب تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق یہ نہیں ہوسکتا کہ قرآن پاک کا کچھ حصہ آپ پر بیان نہ کیا گیا ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بعض آیات نبی

کریم ﷺ پر نہ بیان کی ہوں تو وعدہ کی خلاف ورزی لازم آئے گی، اور خطاب کا کوئی مقصد نہیں نکلے گا کیونکہ جسے خطاب کیا جا رہا ہے اسے تو پتہ ہی نہیں۔

اس لئے حق بات یہی ہے جو ہم نے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بیان کر دی ہے کہ متشابہات اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان راز ہیں، ان کے مطالب عام لوگوں کو نہیں سمجھائے گئے، لیکن رسول اللہ ﷺ کو ان کا علم عطاء کر دیا گیا، اور آپ کے کامل متبعین کو بھی اس کا علم عطاء کر دیا گیا۔ یہ علم عوام حاصل ہی نہیں کر سکتے، بلکہ صرف خواص کو ہی یہ علم لدنی حاصل ہوتا جو ان کو رب تعالی کی ذات کے تقرب اور صفات کا مظہر ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾

اور وہ لوگ جو پختہ ہیں علم میں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کے ساتھ۔

پختہ علم والے کون ہیں:

وھم اھل السنة والجماعة الذین عضوابالنواجذعلی محکمات الکتاب والسنة" پختہ علم والے اہلسنت و جماعت ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی محکم آیات اور احادیث مبارکہ پر مضبوطی سے عمل کیا اور ان کی وہی تفاسیر بیان کیں اور ان مطالب پر ایمان رکھا جو سلف صالحین یعنی صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین نے بیان کئے ' چونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو امت میں بہتر ہیں جب کہ بہتر ہونے کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادیا۔ صوفیاء کرام کے نزدیک پختہ علم والے وہ لوگ ہیں جو اپنی خواہشات کو مکمل طور پر ختم کر دیں تا کہ ان کے دل اور نفس میں تجلیات ذات ہی کو جگہ مل سکے۔

اخرج الطبرانی وغیرہ عن ابی الدرداء ان رسول اللہ ﷺ سئل عن الراسخین فی العلم قال من برت یمینه وصدق لسانه واستقام قلبه وعفف بطنه وفرجه فذلک من الراسخین فی العلم"

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ بیشک رسول اللہ ﷺ سے پختہ علم والوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا جس شخص نے اپنی قسم کو پورا کیا' اور بات سچی کی اور دل کو (ایمان وعقائد واعمال پر) سیدھا قائم رکھا اور اپنے پیٹ اور شرمگاہ کو پاک رکھا (یعنی کھانے میں اور خواہشات میں اپنے آپ کو حرام سے بچا کر رکھا) تو وہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) سے ہے۔

یہ بلند مقام صوفیاء کرام کو ہی حاصل ہے اسی وجہ سے قاضی مظہری رحمہ اللہ نے حدیث پاک کو بیان کرنے

کے بعد فرمایا"قلت هذا شان الصوفية" میں کہتا ہوں یہ مقام صرف صوفیاء کرام کو ہی حاصل ہے۔ (مظہری)

یہی حدیث علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ابن عساکر سے عبداللہ بن یزید ازدی سے روایت ذکر کرنے کے بعد فرمایا" ولعل ذلک بیان علاماتهم" شائد یہ ان لوگوں کی علامات بیان کی گئی ہوں کہ نبی کریم ﷺ کی امت میں کامل متبعین پختہ علم والے ہیں جن کی یہ علامات ہوں گی۔

"والمراد بالعلم العلم الشرعي المتقبس من مشكاة النبوة فان اهله هم الممدوحون"
علم سے مراد شرعی علم ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے حاصل ہوا اسی علم والوں کی رب تعالیٰ تعریف فرماتا ہے۔
(روح المعانی)

"الرسوخ في اللغة الثبوت في الشئ" رسوخ کا لغوی معنی یہ ہے کہ "کسی چیز کا ثابت رہنا' قائم رہنا" پختہ علم والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات رکھتے ہوں دلائل یقینیہ سے اور ان کو یقینی دلائل سے یہ معلوم ہو کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح جب ان کو پتہ چل جائے کہ یہ متشابہ ہے تو وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اس کی ظاہری مراد نہیں بلکہ حقیقی مراد وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ (از کبیر)

﴿كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا﴾ "سب ہمارے رب کی طرف سے ہے"

والمعنى ان كل واحد من المحكم والمتشابه من عند ربنا " یعنی پختہ علم والے یہ کہتے ہیں کہ محکم آیات ہوں یا متشابہ ہوں سب رب تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

سؤال : لفظ "عند" بڑھانے کا کیا فائدہ ہے؟ جبکہ "کل من ربنا" کہنا صحیح تھا۔

جواب : متشابہات پر ایمان زیادتی تاکید کا محتاج تھا اس لئے "فذكر كلمة "عند" لمزيد التاكيد" کلمہ عند زیادہ تاکید کیلئے بڑھایا گیا ہے۔ (از کبیر)

سؤال : جب "کل من عند ربنا" کا معنی یہ ہے "كل واحد من المحكم والمتشابه من عند ربنا" تو مضاف الیہ کو حذف کیوں کیا گیا؟

جواب: لان دلالة المضاف عليه قوية فبعد الحذف الأمن من اللبس حاصل" مضاف کی دلالت مضاف الیہ پر قوی پائی گئی۔ مضاف الیہ کے حذف ہونے کے باوجود التباس سے امن حاصل تھا تو اسی وجہ سے مضاف الیہ کو حذف کر دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ "اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے"۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو یہ کہتے ہیں ﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (ہمارا اس پر ایمان ہے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے)

"انهم يستعملون عقولهم فی فهم القرآن فيعلمون الذلی يطابق ظاهره دلائل العقول فيكون محكما واما الذی يخالف ظاهره دلائل العقول فيكون متشابها"

کیونکہ وہ لوگ اپنی عقلوں کو قرآن پاک کے سمجھنے میں صرف کرتے ہیں جن کے معانی ومطالب ظاہر ہوتے ہیں ان کو وہ جانتے ہیں کہ یہ محکم ہیں اور جن کے معانی ظاہر نہیں اور ان تک عقل کی پہنچ نہیں ان کو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ متشابہ ہیں یعنی یہی لوگ کامل ہیں کیونکہ "مایتعظ بما فی القرآن الاذووالعقول الکاملة" قرآن پاک سے وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے جو کامل رکھتے ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تناقض اور باطل ہونے سے پاک ہے یعنی ایسا نہیں کہ بعض آیات دوسری بعض کے مخالف ہوں اور ایسا بھی نہیں کہ قرآن پاک کی کچھ آیات بے مقصد، اور بے فائدہ ہوں۔ "فيعلمون ان ذلک المتشابه لا بد وان يكون له معنى صحيح عند الله تعالى" یہی وہ لوگ ہیں جن کو یہ علم حاصل ہے کہ متشابہات بھی بے مقصد نہیں، بلکہ ان کے معانی اللہ کے ہاں صحیح ہیں، جو مقاصد پر دلالت کر رہے ہیں۔ (از کبیر)

متشابہات کا علم جو اللہ تعالیٰ کو ذاتی طور پر حاصل ہے وہی علم رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو عطاء فرمایا ہے۔

فائدہ: اس آیہ کریمہ سے متکلمین کی شان سمجھ میں آئی کہ وہ عقلی دلائل سے بحثیں کرتے ہیں اور ان عقلی دلائل کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل کرتے ہیں "ولا يفسرون القرآن الابمايطابق دلائل العقول ويوافق اللغة والاعراب" اگرچہ متکلمین قرآن پاک کی تفسیر عقلی دلائل سے پیش کرتے ہیں لیکن ان کے عقل دلائل الفاظ کے لغوی معانی اور الفاظ کے اعراب (حرکات وسکنات) سے حاصل ہوتے ہیں وہ شریعت کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ (از کبیر)

یقینی بات ہے کہ محض عقلی ڈھکوسلے جو شریعت کے مخالف ہوں گے ان کو یکسر ٹھکرا دیا جائے گا۔

انتباہ شدید: واعلم ان الشئی کلماکان اشرف کان ضده اخس " ضابطہ وقانون یہ ہے کہ ایک چیز جتنی بلند مرتبہ ہوتی ہے اس کی ضد اتنی ہی زیادہ گھٹیا ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی تفسیر جب کوئی شخص دلائل

نقلیہ سے کرے یا دلائل عقلیہ سے لیکن ان کی دارومدار لغوی معانی یا حرکات وسکنات سے مطالب حاصل کرنے تک محدود ہو "فکانت درجته هذه الدرجة العظمی التی عظم الله الثناء علیه" تو اسے وہ عظیم درجہ حاصل ہوتا ہے جس کی رب تعالیٰ بھی تعریف فرماتا ہے ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (اور نہیں نصیحت حاصل کرتے سوائے عقل والوں کے)

"ومتی تکلم فی القرآن من غیر ان یکون متبحرا فی علم الاصول وفی علم اللغة والنحو کان فی غایة البعد عن الله تعالیٰ"

جس شخص کو شرعی اصول معلوم نہیں، وہ عربی لغت کو نہیں جانتا، گرائمر اسے نہیں آتی، وہ صرف اور نحو سے بے خبر ہے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت ہی دور ہے (ایسا شخص حقیقت میں اپنے باطل نظریات کو قرآن پاک کے مطالب غلط بیان کرکے ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کرتا ہے، جیسا کہ نیچری وغیرہ مذاہب باطلہ کی تفاسیر میں یہ ناکام کوشش کی گئی) ولهذا قال النبی ﷺ "من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار" اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کی اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ (ماخوذ از کبیر)

یعنی اپنی رائے سے باطل نظریات کو قرآن پاک کی تفسیر میں لانے والا جہنمی ہے ہاں البتہ وہ اپنے نظریات کو احادیث مبارکہ سے یا عقلی دلائل صحیحہ سے بیان کرے تو یہ جائز ہے۔ ہاں اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ مطالب صحیحہ بیان کرے لیکن پھر بھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

کوزے میں سمندر:

ابھی تک جو بحث کی گئی جو کئی اوراق پر مشتمل ہے وہ تمام اس ایک روایت میں سمٹ کر آ جاتی ہے اس ایک روایت کو یوں سمجھا گیا کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے وہ روایت یہ ہے۔

نقل عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال تفسیر القرآن علی اربعة اوجه تفسیر لایسع احدا جهله وتفسیر تعرفه العرب بألسنتها وتفسیر تعلمه العلماء وتفسیر لایعلمه الا الله تعالیٰ" (کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قرآن پاک کی تفسیر چار قسموں پر مشتمل ہے۔

(۱) ایک یہ کہ اس سے کوئی بھی جاہل نہیں ہوتا یعنی اس کی مراد واضح ہوتی ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ اسے عرب حضرات اپنی زبان سے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

(۳) تیسری قسم یہ ہے کہ ان مطالب و مقاصد کو صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم یہ ہے کہ اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا خوب ارشاد:

جب امام مالک رحمہ اللہ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "**الرحمن علی العرش استوی**" میں "استواء" کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "**الاستواء معلوم والکیفیة مجهول والایمان به واجب والسؤال عنه بدعته**" "استواء" کا معنی تو معلوم ہے (سیدھا ہو کر بیٹھنا، غالب ہونا، قدرت حاصل کرنا) لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ یعنی یہ پتہ نہیں کہ اس سے رب تعالیٰ کی مراد کیا ہے، اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سؤال کرنا بدعت ہے۔ (یعنی یہ سؤال نہ کرے کہ اس کی حقیقی مراد کیا ہے حقیقی مراد تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے) (کبیر)

تنبیہ: ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پختہ علم والے کون لوگ ہیں؟ ایک قول پہلے ذکر کر دیا گیا جو معتبر ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا تھا جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، (لیکن اس قول کو مظہری میں رد کیا گیا ہے کہ اس تخصیص کی ضرورت نہیں)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "**العالم العامل بما علم المتبع لما علم**" عالم باعمل یعنی جس نے اپنے علم کے مطابق عمل کیا۔ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "الراسخ فی العلم" وہ شخص ہے جس میں چار چیزیں پائی جائیں۔

(۱) "**التقوی بینه وبین الله تعالی**" ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ اس شخص کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تقوی پایا جائے۔

(۲) "**والزهد بینه وبین الدنیا**" اس کے درمیان اور دنیا کے درمیان زہد پایا جائے،

(۳) یہ تیسری چیز ہے، یعنی بندے کو دنیا سے محبت نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو۔

(۴) "**والمجاهدة بینه وبین نفسه**" چوتھی چیز یہ ہے کہ اس کے درمیان اور اس کے نفس کے درمیان مجاہدہ

پایا جائے یعنی اپنے نفس کو گناہوں سے بچانے کیلئے پوری کوشش سے اس پر قہر کرے۔ (از معالم التنزیل للبغوی)

اولیاء کرام کا علم:

حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی خواص رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "ان اللہ تعالی اطلعه الله علی معانی سورة الفاتحة فخرج منها مائتی الف علم و اربعین الف علم وتسعمائة وتسعين علما" کہ بیشک اللہ تعالی نے انہیں (مجھے) سورۃ فاتحہ کے اتنے معانی پر مطلع فرمایا کہ ان کی وجہ سے سورۃ فاتحہ سے انہوں نے دو لاکھ چالیس ہزار نو سو نناوے علوم (مسائل) نکالے۔

"وكان يقول لايسمى عالما اى عنداهل الله الامن عرف كل لفظ جاء ت به الشريعة"

حضرت علی خواص فرماتے تھے کہ اولیاء کاملین کے نزدیک عالم وہی شخص ہے جو قرآن پاک کے ہر لفظ کے متعلق یہ جانتا ہو کہ اس میں شرعی مسئلہ کیا ہے۔

"وقال فی الکشف فی نحو"،ق،ص،حم، طس،لعل ادراک ماتحته عند اهله کادراکنا للاولیات ولا يستبعور ففيض البارى عم نواله غير محصور،واستعدادالانسان الكامل عن القبول غير محسور"

اہل کشف حروف مقطعات کا علم اس طرح رکھتے ہیں جیسا ہمیں بدیہی چیزوں (ظاہر چیزوں) کا علم حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالی کی عطاء عام ہے، اس کے فیضان میں کوئی کمی نہیں اور کامل انسان کے اس قبول کرنے کی استعداد میں کوئی کمی نہیں (از روح المعانی)

عبد اللہ صبیغ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ:

عن سليمان بن يسار ان صبيغ بن عسل قدم المدينة فجعل يسئال عن متشابه القرآن وعن اشياء،فبلغ ذلک عمر رضی اللہ عنہ فبعث اليه عمر فاحضره وقد اعدله عراجين من عراجين النخل فلما حضر قال له عمر من انت؟قال انا عبد الله صبيغ فقال عمر رضی اللہ عنہ وانا عبد الله عمر ثم قام اليه فضرب رأسه يعرجون فشجه ثم تابع ضربه حتى سال دمه على وجهه فقال حسبک يا امير المؤمنين فقدوالله ذهب ماكنت اجد فی راسی"

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک عنوان قائم کیا "اذ اوجد للمنا فقين الملحدين فی ذلک الوقت سبيلا الى ان يقصدوا ضعفة المسلمين بالتشکيک والتضليل فی تحريف القرآن عن مناهج

التنزیل وحقائق التاویل" کہ منافق اور بے دین لوگوں کو جب بھی کوئی موقع ملتا تو نئے نئے اسلام قبول کرنے والے دین میں ناپختہ لوگوں کو شک میں ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کرتے، قرآن پاک کے نزول کے طریقہ میں یا متشابہات کی غلط تاویلوں کا سہارا لے کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کرتے۔ ان میں سے ہی ایک شخص صبیغ بن عسل تھا جو مدینہ طیبہ میں آیا اور لوگوں سے متشابہات وغیرہ کے متعلق سوال کرنے لگا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اسے بلوایا، ساتھ ہی کھجور کی چھڑیوں کو تیار رکھا، وہ جب آیا تو اس سے پوچھا تم کون ہو، اس نے کہا میں "عبد الله صبیغ" ہوں، تو حضرت عمر ﷺ نے فرمایا میں عبداللہ عمر (اللہ کا بندہ عمر) ہوں، آپ نے اس کے سر پر اتنی چھڑیاں ماریں کہ اس کا خون سر سے نکل کر اس کے چہرے پر آ گیا، تو اس شخص نے حضرت عمر ﷺ کو کہا اے امیر المؤمنین اب کافی سزا مل چکی ہے اور میرے سر سے فتنہ وفساد بھی دور ہو گیا۔ (از قرطبی)

خیال رہے کہ قرطبی میں "صبیع" صاد مہملہ سے ہے اور روح المعانی میں ضاد معجمہ سے ہے۔ (راقم)

تفہیم القرآن کی ناقص لفاظی:

مودودی صاحب متشابہات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "لیکن اسی زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، (تھوڑا آگے جا کر لکھتے ہیں) پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوق فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کیلئے کافی ہے۔ (تفہیم القرآن)

وہ قرآن جو نور ہے اور ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہے (ہر چیز کا بیان ہے) اس کی آیات کے متعلق "دھندلا تصور" کے الفاظ کا استعمال راقم کی سمجھ میں نہیں آیا، بلکہ گھٹیا اور ناقص لفاظی کا تصور ذہن میں آیا، جسے دیکھ کر ایک مرتبہ ذہن وضمیر چونک گئے کہ یہ کیا کہا گیا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ کا راقم نے ترجمہ کیا ہے "اور نصیحت نہیں قبول کرتے سوائے خالص عقل والوں کے" "خالص" کا لفظ روح البیان سے لیا گیا ہے،

(اولوا الالباب) ای العقول الخالصة عن الرکون الی الاھواء الزائغة"

"اولوا الالباب" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقلیں ٹیڑھی، (باطل، غلط) خواہشات کی طرف میلان کرنے سے خالص ہیں۔ اور تفسیر مظہری میں ہے'

'اولوا الالباب"ذوو العقول السليمة فان سلامة العقل يقتضي ان يفوضوا مالاعلم لهم به الى المتكلم العليم الحكيم ولا يقعوا في الجهل المركب وهم في كل واديهيمون،قالت الاكابر لاادری نصف العلم'

"اولوا الالباب" سے مراد وہ لوگ جن کی عقلیں سالم ہوں، کیونکہ جن لوگوں کی عقلیں سالم و درست ہوں وہ جن چیز کا علم نہیں رکھتے ان کو ذات باری تعالیٰ کی طرف سپرد کرتے ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہے، وہ ٹیڑھی عقل والے جاہل مرکب کی طرح جہل مرکب میں نہیں واقع ہوتے جو کہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکابر (بڑے اصحاب علم) حضرات نے کہا ہے جب کوئی شخص مسئلہ نہ جانتا ہو تو اس سے وہ مسئلہ پوچھا جائے تو وہ یہ کہے "لاادری" میں نہیں جانتا تو اس کا یہ جواب دینا "نصف علم" ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۸)

(1) اے رب ہمارے دل ٹیرھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطاء کر بیشک تو ہے بڑا دینے والا۔

(2) اے ہمارے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو (حق سے) اس کے بعد جب تو نے ہدایت عطاء کی ہمیں۔ اور عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت، بیشک تو ہے بڑا دینے والا۔

راقم نے ترجمہ حاصل کیا ہے مظہری، روح المعانی اور بحرالحیط سے، تقریباً سب کے الفاظ قریب قریب ہیں مظہری کی عبارت یہ ہے

"(ربنا لاتزغ قلوبنا) ولا تملها عن الحق كما ازغت قلوب الذين فی قلوبهم زيغ"

اے ہمارے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو حق سے جیسا کہ تو نے پھیر دیا ان لوگوں کے دلوں کو جن کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے۔

یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ پختہ علم والوں کی ہی یہ دعاء بھی ہو، کہ وہ یہ کہتے ہیں ''اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو نہ پھیر (حق سے) اس صورت میں ''یقولون'' اس سے پہلے ہوگا اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤمنین کو تعلیم دی گئی ہو کہ تم یہ دعاء کرو، اس صورت میں اس سے پہلے ''قولوا'' ہوگا۔ (از روح المعانی)

﴿بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ ''بعد اس کے کہ تو نہ ہدایت دی ہمیں''۔

یعنی اے ہمارے رب تو نے ہمیں کتب کے نازل کرنے اور رسولوں کو بھیج کہ جب ہدایت عطاء فرمادی اور تو نے ہمیں توفیق عطاء فرمادی کہ ہم نے محکم اور متشابہ پر ایمان لایا تو اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کر۔ (مظہری)

حق سے پھرنا گمراہی ہے:

"ويؤل المعنى الى لاتضلنا بعد الهداية لأن زيغ القلوب فی مقابلة الهداية ومقابلة الهداية الاضلال"

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ کا مفہوم یہ بن گیا ''اے ہمارے رب ہمیں ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر'' کیونکہ دلوں کو حق سے پھیرنے کو ہدایت کے مقابل ذکر کیا، ہدایت کا مقابل گمراہی ہے۔ (روح المعانی)

حق راہ سے ہٹ کر گمراہ ہونے کی مثال دیکھئے ''محمد علی لاہوری مرزائی'' نے اپنی تفسیر ''بیان القران'' میں اس جگہ (متشابہات کی بحث میں) لکھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعوی نبوت یا دعوی خدائی مثل متشابہات کے ہے۔ نہ انہیں نبی کہو اور نہ انہیں برا جانو۔

یہ قول اس کا گمراہی ہے کیونکہ وہ حق راہ سے ہٹ گیا، حالانکہ متشابہ ہونے کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ بولنے والا وہ شخص ہو جس کی ولایت پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہو ورنہ پھر تو ابلیس بھی کہہ سکتا تھا کہ میرا کلام متشابہ ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس عبارت کو عقیدہ نہ بنایا گیا ہو نہ بولنے والے نے اس کی تبلیغ کی ہو نہ اس کے ماننے والوں نے، منصور الحق نے ''انا الحق'' تو جوش میں کہہ دیا، لیکن نہ اس کی طرف کسی کو دعوت دی اور نہ کسی نے اس کی تبلیغ کی۔

(۳) تیسری یہ کہ اس کلام میں کسی نبی کی توہین نہ ہو، توہین نبی مثل متشابہ نہیں بن سکتی۔

❁ مرزا جی عمر بھر دعوی نبوت پر مناظرے کرتے رہے، اپنے پیروکار بناتے رہے، خود تو گمراہ تھے، لیکن لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا، آجکل ملک پاکستان میں تباہی کے جال وہی پھیلا رہے ہیں۔

❁ پھر یہ کہ بعض اولیاء کو علماء نے بے اختیاری عبارات کی وجہ سے قتل کر دیا، جیسے حضرت منصور کا واقعہ مشہور معروف ہے۔

انہوں نے بھی شریعت کے سامنے سر جھکا دیا کہ ان کی بے اختیاری عبارت کی وجہ سے دین میں فتنہ نہ پڑے،

❁ کسی ولی نے بارگاہ نبوی میں گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کی، جوش میں ''انا اللہ''

تو کہہ گئے مگر ''انا محمد'' (ﷺ) کسی نے نہ کہا، کیونکہ دربار الٰہی بارگاہ ناز ہے، اور آستانہ مصطفیٰ مقام نیاز، یہاں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہوتی ہیں۔ (از نعیمی)

معتزلہ اور اہلسنت کا اختلاف:

''زیغ'' کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنی درست نہیں، یہ مذہب ہے معتزلہ کا جو اس آیۃ کی تاویلیں کرتے ہیں، ان

کی تاویلیں بمع جوابات کے انشاء اللہ آگے آرہی ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ زیغ کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کرنی کہ دل اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ چاہے تو دلوں میں کجی پیدا کردے، یا دلوں کو سیدھا رکھے، اس لئے رب تعالیٰ سے دعاء کرنی کہ "اے ہمارے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر، دلوں کو ٹیڑھا نہ کر" درست ہے۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب ظاہر وحق ہے:

انسان کے دل میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ ایمان کے طرف میلان کرے، یا کفر کی طرف میلان کرے۔

خذلان، ازاغة، صد، ختم، طبع، رین، قسوة، وقر، کنان وغیرھا، (رسوائی، کجی، روکنا، مہر لگانا، پختہ بند کر دینا، زنگ آلود کردینا، دلوں کو سخت کر دینا، دل میں بوجھ پیدا کر دینا اور دلوں پر پردہ چھا جانا، وغیرہ) اور انسان کا دل ایمان کی طرف میلان کرے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ بھی پایا جائے تو اسے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کیلئے قرآن پاک میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ توفیق، رشاد، ھدایت، تسدید، تثبیت، عصمة وغیرھا، (اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے رشد و ہدایت عطاء کئے، اللہ تعالیٰ نے درست راہ پر چلایا، اللہ تعالیٰ نے ایمان پر ثابت رکھا، اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچایا، وغیرہ۔ (کبیر)

اہل سنت اپنے موقف پر احادیث پیش کرتے ہیں:

❁ اخرج ابن جریر و ابن حاتم عن ام سلمة ان النبی ﷺ کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک ثم قرأربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا"

ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ذکر کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ یہ دعاء کرتے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) پھر آپ یہ آیۃ کریمہ پڑھتے ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ (درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة و احمد و الترمذی و ابن جریر و الطبرانی و ابن مردویه عن ام سلمة ان رسول اللہ ﷺ کان یکثر فی دعائه ان یقول اللھم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک قلت یا رسول اللہ وان القلوب لتتقلب قال نعم ما من خلق اللہ من

بشر من بنی آدم الا وقلبه بین اصبعین من اصابع الله فان شاء الله اقامه وان شاء ازاغه فنسأل الله ربنا ان لا یزیغ قلوبنا بعداذ هدانا ونسأله ان یهب لنامن لدنه رحمة انه هو الوهاب قلت یا رسول الله لاتعلمنی دعوة ادعوبها لنفسی قال بلی قولی "اللهم رب النبی محمد اغفرلی ذنبی واذهب غیظ قلبی واجرنی من مضلات الفتن ما احییتنی"

ابن ابی شیبہ اور احمد اور ترمذی اور ابن جریر اور طبرانی اور مردویہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی بیشک رسول اللہ ﷺ اپنی دعاء میں اکثر طور پر کہتے تھے (اَللّٰهُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ) اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ میں نے عرض کیا، کیا دلوں کو بھی پھیرا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسانوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو (انگلیوں کی حقیقی مراد اللہ اور اس کے رسول ہی جانتے ہیں) اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کو قائم کرتا ہے اور اگر چاہے تو ان کو ٹیڑھا کرتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطاء کرے، بیشک وہی بڑا عطاء کرنے والا ہے میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ مجھے کوئی دعاء نہیں سکھا دیتے جو میں اپنے لئے کیا کروں، آپ نے فرمایا کیوں نہیں (ہاں میں تمہیں دعاء سکھاتا ہوں) تم یہ دعاء کیا کرو [اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ اِغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَاَذْهِبْ غَیْظَ قَلْبِیْ وَأَجِرْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ مَااَحْیَیْتَنِیْ] اے اللہ اپنے نبی محمد کے رب میری گناہوں سے مغفرت فرما اور میرے دل کی سختی کو دور فرما، اور مجھے جب تک تو زندہ رکھے فتنوں میں بھٹکنے سے محفوظ رکھ) (درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبه واحمد وابن مردویه عن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ کثیرامایدعو یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک قلت یا رسول الله ﷺ ماا کثر ماتدعو بهذاالدعاء فقال لیس من قلب الاوهوبین اصبیعن من اصابع الرحمن اذا شاء ان یقیمه اقامه واذاشاء ان یزیغه ازاغه اماتسمعین قوله تعالٰی "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذهدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب" ولفظ ابن ابی شیبة اذاشاء ان یقلبه الی هدی قلبه واذاشاء ان یقلبه الی ضلال قلبه"

ابن ابی شیبہ اور احمد اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے روایت ذکر کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات یہ دعاء فرماتے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (اے دلوں کو پھیرنے والے میرے

دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اکثر اوقات یہ دعاء کرتے ہیں (اس کی وجہ کیا ہے) آپ نے فرمایا کوئی دل ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں (جو اس کی شان کے لائق ہیں) کے درمیان ہے، جسے سیدھا رکھنا چاہے سیدھا رکھ دیتا ہے، اور جسے ٹیڑھا کرنے چاہے اسے ٹیڑھا کر دیتا ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنتی ہو ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ٥﴾ اے ہمارے رب نہ پھیر (حق سے) ہمارے دلوں کو اس کے بعد کہ تو نے ہدایت دی ہے ہمیں، عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت بیشک تو بڑا عطاء کرنے والا ہے۔

ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں "**اذا شاء ان یقلبه الی هدی قلبه و اذاشاء ان یقلبه الی ضلال قلبه**" جب چاہے اسے ہدایت کی طرف پھیرنا تو اسی کی طرف پھیر دیتا ہے، اور جب چاہے گناہوں کی طرف پھیرنا تو اسی طرف پھیر دیتا ہے۔

۞ **واخرج البخاری فی تاریخه وبن جریر و الطبرانی عن سیرة بن فاتک قال قال النبی ﷺ قلب ابن آدم بین اصبیعن من اصابع الرب فاذا شاء اقامه و اذاشاء ازاغه"**

تاریخ بخاری، ابن جریر، طبرانی میں سبرۃ بن فاتک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابن آدم (انسان) کا دل رب کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے جب سیدھا رکھنا چاہے تو سیدھا رکھتا ہے، اور جب ٹیڑھا کرنا چاہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (درمنثور)

۞ **واخرج ابن ابی الدنیا فی الاخلاص والحاکم وصححه والبیهقی فی شعب الایمان عن ابی عبیدة بن الجراح ان رسول الله ﷺ قال ان قلب ابن آدم مثل العصفور یتقلب فی الیوم سبع مرات"**

ابن ابی الدنیا نے باب الاخلاص میں اور حاکم نے صحیح حدیث اور بیہقی نے شعب ایمان میں عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کا دل چڑیا کی طرح ہے ایک دن میں سات مرتبہ اس کا دل پھرتا ہے۔ (درمنثور)

۞ **واخرج احمد وابن ماجه عن ابی موسی الاشعری عن النبی ﷺ قال ان هذاالقلب کریشة بفلاة من الارض تقیمها الریح ظهر البطن"**

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دل ایک پر کی طرح ہے جو کھلی زمین (جنگل) میں ہو تو ہوائیں اسے الٹ پلٹ کرتی رہتی ہیں۔ (مسند احمد، ابن ماجہ، درمنثور)

۞ **واخرج احمد النسائی وابن ماجه وابن جریر والحاکم وصححه والبیهقی فی الاسماء**

والصفات عن النواس بن سمعان سمعت رسول الله ﷺ يقول الميزان بيد الرحمن يرفعَ اقواما ويضع آخرين الى يوم القيامة وقلب ابن آدم بين اصبعين من اصابع الرحمن اذاشاء اقامة واذاشاء ازاغه وكان يقول يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينک"

نواس بن سمعان فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میزان رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کچھ قوموں کو بلند کرتا ہے کچھ کو پست، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور ابن آدم کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان ہے جب چاہے اسے سیدھا کر دیتا ہے اور جب چاہے اسے ٹیڑھا کر دیتا ہے اور آپ یہ دعاء فرمار ہے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ" (مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، مستدرک حاکم، بیہقی، درمنثور)

❁ واخرج الحاكم وصححه عن المقداد سمعت رسول الله ﷺ يقول لقلب ابن آدم اشدانقلابا من القدر اذا اجتمع غليانا"

حاکم نے اپنی مستدرک میں ایک حدیث بیان کی جسے صحیح کہا ہے کہ حضرت مقداد ﷺ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن آدم کا دل ہنڈیا کے جوش مارنے (کی وجہ سے پانی کے پھرنے) سے بھی زیادہ پھرتا (بدلتا) رہتا ہے۔ (مستدرک حاکم، درمنثور)

❁ واخرج ابن سعد فی طبقاته عن ابی عطاف ان ابا هريرة كان يقول ای رب لاازنين ای رب لااسرقن ای رب لا اكفرن قيل له او تخاف قال آمنت بمحرف القلوب ثلاثا"

ابن سعد نے اپنی طبقات میں روایت نقل کی کہ ابوعطاف کہتے ہیں حضرت ابو ہریرہ ﷺ عرض کر رہے تھے اے میرے رب (میری حفاظت فرما) میں بدکاری نہ کروں اے میرے رب میں چوری نہ کروں، اے میرے رب میں کفر نہ کروں، آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا آپ ڈرتے ہو (کہ یہ چیزیں بھی آپ میں آسکتی ہیں) آپ نے فرمایاہاں میں اس ذات پر ایمان رکھتا ہوں جو دلوں کو پھیرنے والا، تین مرتبہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔ (طبقات سعد، درمنثور)

❁ واخرج الحكيم الرمذی من طريق عتبة بن عبدالله خالد بن معدان عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ انما الايمان بمنزلة القميص مرة تقمصه ومرة تنزعه"

حکیم ترمذی نے بیان کیا ہے کہ عتبہ بن عبد اللہ بن خالد بن معدان نے اپنے باپ دادا سے روایت بیان کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ایمان قمیص کی طرح ہے، جس طرح انسان کبھی قمیص پہن لیتا ہے اور کبھی اتار دیتا ہے۔ (درمنثور)

ایسے ہی انسان کبھی ایمان پر قائم رہتا ہے، کبھی "العیاذ باللہ" مرتد ہو جاتا ہے "الامان و الحفیظ"

❁ واخرج ابوداود النسائی والبيهقی فی الاسماء والصفات عن عائشة ان رسول

اللہ ﷺ کان اذا استیقظ من اللیل قال لا الہ الا انت سبحانک اللھم انی استغفرک لذنبی واسألک رحمتک اللھم زدنی علما ولا تزغ قلبی بعد اذ ھدیتنی وھب لی من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ رات کو جب بیدار ہوتے تھے تو یہ پڑھتے تھے، "لَآ اِلٰـــهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ لِذَنْبِیْ وَاَسْأَلُکَ رَحْمَتَکَ اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنِیْ وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ" کوئی معبود نہیں سوائے تیرے تیری پاک ذات ہے اے اللہ بیشک میں تجھ سے ہی بخشش طلب کرتا ہوں اس کیفیت سے جو دنیا کی طرف مشغول ہونے اور تجھ سے توجہ ہٹنے کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، اور تجھ سے تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ میرا علم زیادہ کر، اور میرا دل ٹیڑھا نہ کر ہدایت دینے کے بعد' اور عطاء کر مجھے اپنی طرف سے رحمت بیشک تو بڑا بخشنے والا ہے۔

(در منثور، ابو داؤد، نسائی، بیہقی باب الاسماء والصفات، در منثور)

❀ حضرت عبداللہ بن عمرو بن اعاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ یہ دعاء فرماتے تھے "اَللّٰھُمَّ یَامُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰی طَاعَتِکَ" اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے"

(مسلم، نسائی، ابن جریر، بیہقی، در منثور)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ "زیغ (کجی) کی نسبت اللہ تعالی کی طرف درست نہیں، یعنی یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالی دلوں کو ٹیڑھا کرتا ہے "فوجب صرف ھذہ الآیۃ الی التاویل" اس لئے ضروری ہے کہ اس آیۃ کی تاویل کی جائے۔

معتزلہ اور اہل سنت کا اصل اختلاف اس میں ہے کہ مذہب یہ ہے کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالی ہے یہاں تک کہ بندوں کے اچھے اعمال یا برے اعمال کا خالق اللہ تعالی ہے، قرآن پاک سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے، ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالی نے تمہیں پیدا کیا اور (پیدا کیا) جو تم عمل کرتے ہو۔

معتزلہ کہتے ہیں نیکیوں کو پیدا کرنے والا تو اللہ تعالی ہے اور برائیوں کا پیدا کرنے والا انسان خود ہے، کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ برائیوں کو پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالی ہے قبیح (بری) چیزوں کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہوگی، جو جائز نہیں۔

اہلسنت کا موقف یہ ہے کہ خلق قبیح قبیح نہیں (یعنی بری چیز کو پیدا کرنا برا نہیں) بلکہ "کسب قبیح قبیح" ہے یعنی

برائیوں پر عمل کرنا برا ہے۔اس لئے رب تعالیٰ کی طرف نسبت خلق کی ہے اس نسبت میں کوئی برائی نہیں بندے کی طرف اس کے برے اعمال منسوب ہیں۔

اس آیۃ میں معتزلہ کی تاویلات:

(۱) ان میں سے ایک تاویل جبائی نے کی ہے،وہ یہ کہتا ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے "لاتمنعها الالطاف التی معها یستمر قلبهم علی صفة الایمان" اے ہمارے رب ہم سے اپنی مہربانیوں کو دور نہ کر جن مہربانیوں کی وجہ سے ہمارے دل صفت ایمان پر قائم رہتے ہیں۔

"وذلک لانه تعالی لما منعهم الطافه عنداستحقاقهم منع ذلک جاز ان یقال ازاغهم"

اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانیوں کو مستحقین سے روک لیا تو اس روکنے کو "زیغ" سے تعبیر کر دیا گیا،اس لئے اردو میں ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ کا یہی معنی کیا جائے گا "ہم سے اپنی مہربانیوں کو دور نہ کر"

اس تاویل کا رد: معتزلہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے۔

"کل ما صح فی قدرة الله تعالی ان یفعل فی حقهم لطفا وجب علیه ذلک وجوبا لوترکه لبطلت الهیته ولصار جاهلا ومحتاجا"

کہ ہر وہ چیز جو رب تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہو سکتی ہو کہ یہ مخلوق پر مہربانی ہو تو وہ رب تعالیٰ پر واجب ہو جاتی ہے اگر رب تعالیٰ اس چیز کو موجود نہ کرے اور مخلوق کو وہ عطاء نہ کرے تو رب تعالیٰ کی الوہیت باطل ہو جاتی ہے۔اور اسکا جاہل ہونا اور محتاج ہونا لازم آتا ہے۔"والشیٔ الذی یکون کذلک فای حاجة الی الدعاء فی طلبه" جو چیز اس طرح ہو،یعنی اللہ تعالیٰ پر واجب ہو کہ وہ اپنی مہربانیاں بندوں پر کرے تو پھر دعاء کا کیا مطلب ہے کہ "ہم سے اپنی مہربانیاں دور نہ کر" یہ دعاء تو اہل سنت ہی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کرتے۔

معتزلہ کی دوسری تاویل:

اصم نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے "لا تبلنا ببلوی تزیغ عندها قلوبنا" ہمیں مصیبتوں میں گرفتار نہ کر جن کی وجہ سے ہمارے دل ٹیڑھے ہو جائیں یعنی "زیغ" کی نسبت مصائب و آلام کی طرف ہے،اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے "لا تحملنی علی ایذائک ای لاتفعل ما اصبر عنده مؤذیا لک" مجھے اپنی ایذاء پر نہ ابھارو،یعنی ایسا کام نہ کرو کہ میں صبر نہ کر سکوں جو تمہیں ایذاء

پہنچانے کا سبب بن جائے۔

اس تاویل کا رد : معتزلہ کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ اللہ تعالی کو جب یہ معلوم ہو کہ اس تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جائے گا، تو دل کا ٹیڑھا ہونا تکلیف کی وجہ سے ہوگا اور تکلیف رب تعالی کی طرف سے جب حاصل ہوگی تو یقیناً ''زیغ'' (دل کا ٹیڑھا پن) رب تعالی کی طرف ہی منسوب ہوگا۔ اور اللہ تعالی کو جب یہ علم حاصل ہے کہ فلاں فلاں بندوں کو تکلیف پہنچائی گئی تو تکلیف ان کے دلوں کو ٹیڑھا نہیں کرے گی ان لوگوں کو تکلیف پہنچانا یا نہ پہنچانا برابر رہے گا، اس تکلیف کی وجہ بندہ عاصی ہوگا تو اس صورت میں دعاء کا کوئی مطلب نہیں ہوگا یعنی اس دعاء کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہمیں تکلیف نہ پہنچا جس کی وجہ سے ہمارے دل ٹیڑھے ہو جائیں، وہ تو رب تعالی جانتا ہے کہ تکلیف ان میں اثر انداز ہی نہیں۔

معتزلہ کی تیسری تاویل:

کعبی نے اور تاویل یہ کی ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا معنی یہ ہے ''لا تسمنا باسم الزائغ'' اے ہمارے رب ہمارا نام ٹیڑھے دلوں والا نہ رکھ، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ''فلان یکفر فلانا'' فلاں شخص نے فلاں کا نام کافر رکھ دیا۔

اس تاویل کا رد : کسی کا نام ''زائغ'' (ٹیڑھے دل والا) اسی وقت رکھا جاتا ہے جب اس کے دل میں ٹیڑھا پن پایا جائے، اسی طرح کسی کا نام ''کافر'' اسی وقت رکھا جاتا ہے جب اس میں کفر پایا جائے جب بندہ اپنے اختیار سے وہ کام کرے جن کی وجہ سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جائے اور رب تعالی بھی اس کے دل میں کجی پیدا کر دے تو اب وہ یہ دعاء کرے کہ اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، یا یہ دعاء کرے ہمارا نام ''ٹیڑھے دلوں والا نہ رکھ'' برابر ہی ہے کوئی فرق نہیں نکلا۔

معتزلہ کی چوتھی تاویل:

جبائی نے ہی اور تاویل یہ کی ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ کا مطلب یہ ہے ''لا تزغ قلوبنا عن جنتک وثوابک بعد اذ ھدیتنا'' اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو اپنی جنت اور اپنے ثواب سے دور نہ رکھ۔ یعنی جب تو جانتا ہے کہ میرے اس سال کے عمل جنتی لوگوں والے ہیں اور آئندہ سال اگر میں زندہ رہا تو میرے عمل

جہنمی لوگوں والے ہوں گے تو وہ اعمال مجھے جنت سے ہٹانے کا ذریعہ ہوں گے اس لئے دعاء یہ کر رہا ہوں کہ مجھے ''جنت سے دور نہ رکھ''۔

اس تاویل کا رد : معتزلہ کے مذہب کے مطابق تو رب تعالیٰ پر واجب ہے کہ بندے کو فائدہ پہنچائے، جب رب تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس شخص نے آنے والے سال میں جہنمیوں والے کام کرنے ہیں تو معتزلہ کے مذہب کے مطابق رب تعالیٰ پر واجب ہوگا کہ وہ اسے آنے والے سال پہلے ہی مار دے اس لئے معتزلہ کے نزدیک اس دعاء کا کوئی مقصد نہیں نکلتا کہ ''ہمیں جنت سے دور نہ رکھ''

معتزلہ کی پانچویں تاویل:

یہ پانچواں قول بھی اصم کا ہے اس نے کہا ''لاتزغ قلوبنابعد اذھدیتنا'' کا معنی یہ ہے (لاتزغ قلوبنا) عن کمال العقل بالجنون (بعداذھدیتںا) بنور العقل ''اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو جنون (پاگل پن) کی وجہ سے کامل عقل سے نہ پھیر، نور عقل کی ہدایت دینے کے بعد۔

اس دلیل کا رد: یہ قول بھی درست نہیں کیونکہ جنوں بھی رب تعالیٰ ہی پیدا کرنے والا ہے، جنون کی وجہ سے عقل کا زوال بھی قبیح چیز ہے جو رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔

معتزلہ کی چھٹی تاویل:

ابو مسلم معتزلی کا قول یہ ہے کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ امعنی یہ ہے ''احرسنامن الشیطان ومن شرور انفسناحتی لا نزیغ'' اے ہمارے رب ہمیں شیطان سے اور نفس کے شر سے محفوظ رکھ تا کہ ہمارے دل ٹیڑھے نہ ہوں۔ اس صورت میں نسبت شیطان اور نفس کے شر کی طرف ہوگی۔

اس تاویل کا رد : معتزلہ کے مذہب کے مطابق اگر شیطان سے اور نفس کے شر سے بچانا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ بچائے، اور اگر اس کی قدرت میں ہی داخل نہیں تو بچانا ممکن ہی نہیں۔ پھر معتزلہ کے مذہب کے مطابق اس دعاء کا کیا فائدہ؟ (ماخوذ از کبیر)

یہ دعاء تو اہل سنت کے مذہب کے مطابق ہی درست ہے کہ اللہ ہماری بد اعمالیوں کی وجہ سے ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا فرما، اگرچہ تجھ پر کوئی چیز واجب تو نہیں لیکن تو ہم پر اپنے فضل و کرم سے مہربانی فرما۔

﴿بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا﴾ ''بعد اس کے کہ تو ہدایت دی ہمیں''

یعنی اے ہمارے رب جب تو نے ہمیں ہدایت عطاء فرما دی تو ہمارے دلوں کو راہ حق سے نہ پھیر، ان میں کجی (ٹیڑھ پن) پیدا نہ فرما، ''اهذا ايضا صريح في ان حصول الهداية في القلب بتخليق الله تعالى'' اس سے یہ بھی واضح طور پر پتہ چل گیا کہ دل میں ہدایت کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے۔ (کبیر)

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً﴾ ''اور عطاء کر ہمیں اپنی طرف سے رحمت''۔

عطاء کرنے کو ھبہ سے تعبیر کرنے میں حکمت:

سألوا بلفظ الهبة المشعرة بالتفضل والاحسان اليهم من غير سبب ولا عمل معاوضة لان الهبة كذلك فكون وخصوصا بانها من عنده''

مؤمنین نے رب تعالیٰ سے رحمت کا سؤال کیا تو ''وهب'' کہا (اور عطاء کر) ''وهب يهب هبة'' کا معنی ہے ''ھبہ کرنا'' یعنی دعاء کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ''اے ہمارے رب تو ہمیں اپنے فضل واحسان سے بغیر کسی سبب کے اپنی رحمت عطاء کر، ہمارے اعمال کو نہ دیکھ، اور تیری عطاء کا ہمارے پاس اعمال کا کوئی معاوضہ بھی نہیں، چونکہ ہبہ اسے ہی کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سبب اور بغیر کسی عمل اور بغیر معاوضہ کے عطاء کر دیا جائے خاص کر کے جب رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہوگی تو اس میں فضل واحسان ہی پایا جائے گا، اسی فضل واحسان کی رب تعالیٰ سے دعاء کی گئی۔

سؤال: رحمت تو صفت ذات ہے، صفت ذات کسی کو عطاء نہیں کی جاتی، تو ''رحمت'' عطاء کرنے کے سؤال کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: یہاں رحمت سے مراد نعمتیں اور ثواب ہے جو رحمت سے صادر ہوتا ہے، لهذا سؤال کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے رب تو اپنی رحمت سے ہمیں اپنی نعمتیں اور ثواب عطاء فرما اور ہمیں توفیق عطاء فرما کہ ہم تیری رحمت سے ایمان وہدایت پر قائم رہیں۔

دوسرا جواب: یہاں مجاز استعمال ہے ''صح ان يسألوا الرحمة اجراء للسبب مجرى المسبب''

یعنی ذکر سبب ہے اور مراد مسبب ہے مطلب پہلے جواب کے قریب ہی ہے انداز بیان مختلف ہے پہلے جواب میں رحمت کا معنی نعمتیں اور ثواب کیا گیا ہے دوسرے میں ذکر رحمت اور مراد نعمتیں اور ثواب ہے

اسے مجاز مرسل کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے: (رحمۃ) مفعول "لھب" وتنوینہ للتفخیم "رحمۃ" مفعول ہے "ھب" کا اور تنوین اس پر بلندئ شان کیلئے ہے۔ (روح المعانی)

"لاینبغی" سے "تطھیر" مقدم ہے ینبغی کی تنویر پر:

"واعلم ان تطھیر القلب عمالا ینبغی مقدم علی تنویرہ مما ینبغی" جان تو کہ بیشک غیر مناسب کاموں سے پہلے دل کا پاک ہونا ضروری ہے پھر مناسب کاموں سے دل منور ہوگا۔ مومنوں نے پہلے سوال کیا اے اللہ تو ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر اور باطل کی طرف مائل نہ کر اور عقائدہ فاسدہ سے ہمیں دور رکھ" یہ غیر مناسب چیزوں سے دل کو پاک رکھنے کا سوال کیا گیا" پھر مناسب چیزوں سے دل کو منور کرنے کا سوال کیا گیا یعنی گویا کہ انہوں نے سوال کیا "طلبوا من ربھم ان ینور قلوبھم بانوار المعرفۃ و جوارحھم و اعضائھم بزینۃ الطاعۃ" کہ ہمارے رب ہمارے دلوں کو انوار معرفت سے منور فرمادے اور ہمارے اعضاء ظاہرہ کو اپنی طاعت سے مزین فرمادے۔

رحمت کا وسیع مفہوم:

"وانما قال رحمۃ لیکون ذلک شاملا لجمیع انواع الرحمۃ" رحمت کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ جمیع انواع رحمت (رحمت کی قسموں) کو شامل ہو جائے یعنی رحمت کا ذکر کر کے گویا کہ چھ چیزوں کا ذکر کر دیا گیا۔

(۱) "اولھا ان یحصل فی القلب نور الایمان والتوحید والمعرفۃ" ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ رحمت کی طلب کر کے گویا کہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو نور ایمان، نور توحید اور نور معرفت سے منور کر دے۔

(۲) "وثانیھا ان یحصل فی الجوارح والاعضاء نور الطاعۃ والعبودیۃ والخدمۃ" اور رحمت طلب کر کے دوسری چیز یہ طلب کی گئی اے ہمارے رب ہمارے ظاہری اعضاء کو نور طاعت نور عبودیت اور نور خدمت عطاء فرما۔

(۳) "وثالثھا ان یحصل فی الدنیا سھولۃ اسباب المعیشۃ من الأمن والصحۃ والکفایۃ" اور رحمت کی طلب کر کے تیسری چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں اسباب معیشت کی وہ سہولت عطاء

فرما جس سے ہمیں امن، صحت اور کفایت حاصل ہو جائے۔

(۴) ''ورابعھا ان یحصل عند الموت سھولة سکرات الموت'' رب کے حضور یہ عرض کر کے اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما گویا کہ یوں عرض کیا گیا کہ اے ہمارے رب ہمیں موت کے وقت سکرات موت میں آسانی عطاء فرما۔

(۵) ''وخامسھا ان یحصل فی القبر سھولة السؤال وسھولة ظلمة القبر ''، رحمت کی طلب سے پانچویں چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں قبر میں سوالوں کے جواب دینے میں آسانی عطاء فرما اور ہمیں قبر کی تاریکی سے آسانی عطاء فرما۔

(۶) ''وسادسھا ان یحصل فی القیامة سھولة العقاب والخطاب وغفران السیأت وترجیح الحسنات'' اور رحمت کی طلب کر کے چھٹی چیز یہ طلب کی گئی کہ اے ہمارے رب ہمیں قیامت میں آسانی عطاء فرما، جس کی وجہ سے ہم عذاب سے محفوظ رہیں اور تیرے غضبناک خطاب سے محفوظ رہیں اور ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما اور ہماری نیکیوں کو ترجیح عطاء فرما، یعنی دنیا میں توفیق عطاء فرما کہ ہم زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر سکیں اور قیامت میں ہماری نیکیوں میں برکت عطاء فرما کر ان کا وزن بڑھادے۔

قرآن تیری عظمت پر قربان:

سبحان اللہ! قرآن پاک کی کیا ہی عظیم شان ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی کو شامل ہوتا ہے ''فقولہ (من لدنک رحمة) یتناول جمیع ھذہ الاقسام'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ ان تمام قسموں کو شامل ہے جب کو ابھی ذکر کیا گیا ہے۔

مقصود اعظم : جب روشن اور غالب پختہ دلائل سے یہ ثابت ہے ''انہ لا رحیم الا ھو ولا کریم الا ھو لا جرم اکد ذلک بقولہ ''من لدنک'' تنبیھا للعقل والقلب والروح علی ان ھذا المقصود لا یحصل الا منہ سبحانہ'' کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی رحیم نہیں اور اس کے بغیر کوئی کریم نہیں تو اسی وجہ سے رحمت کی طلب کو ''من لدنک'' (اپنی طرف سے) کے ساتھ ذکر کیا تا کہ عقل اور دل اور روح کو بھی تنبیہ کر دی جائے کہ مقصود اعظم صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگا۔ (انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے واسطہ سے جو مقصد حاصل ہوگا وہ بھی رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگا)

ولما کان ھذا المطلوب فی غایة العظمة بالنسبة الی العبد لا جرم ذکر ھا علی سبیل التنکیر کأنه یقول اطلب رحمة وایة رحمة اطلب رحمة من لدنک وتلیق بک وذلک یوجب غایة العظمة "

جب بندے کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یہ مطلوب عظیم تھا کہ بندہ اپنے رب سے رحمت طلب کر رہا ہے تو اسی وجہ سے "رحمة "نکرہ ذکر کیا گیا جس کی تنوین عظمت شان کو بیان کر رہی ہے گویا کہ بندہ یوں کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم رحمت طلب کرتے ہیں وہ کون سی رحمت ہم طلب کرتے ہیں وہی جو تیری طرف سے عطاء ہوگی اور تیری شان کے لائق ہوگی، یقیناً جو رحمت تو اپنی شان کے لائق عطاء کرے گا وہ عظیم ہوگی۔ (کبیر)

﴿اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ "بیشک تو ہے بڑا دینے والا"۔

"وھاب" کا معنی اعلی حضرت رحمہ اللہ نے کیا ہے "بڑا دینے والا" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے یہ ترجمہ البحر المحیط کی اس عبارت کے مطابق ہے "واتی بصیغة المبالغه التی علی فعال وان کانوا قد قالوا وھوب لمناسبة رؤوس الأی " "وھاب " مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا وزن "فعال " (عین مشدد) کا ہے اور معنی ہے بڑا دینے والا اگرچہ "وھوب "کا بھی یہی معنی ہے لیکن آیات کے آخری الفاظ کو ایک وزن پر رکھنے کیلئے "وھاب "ذکر کیا گیا ہے۔ (البحر المحیط)

بہت خوب: علامہ رازی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت کو طلباء کرام یاد کرنا چاہیں تو یاد کرلیں" گویا کہ بندہ رب کے حضور یہ عرض کرتا ہے

"الھی ھذا الذی طلبته منک فی ھذا الدعاء عظیم بالنسبة الی لکنه حقیر بالنسبة الی کمال کرمک وغایة جودک ورحمتک فانت الوھاب الذی من ھبتک حصلت حقائق الاشیاء وذواتھا وماھیاتھاو وجوداتھا فکل ما سواک فمن جودک واحسانک وکرمک"

اے میرے اللہ! میں نے اپنی دعاء میں جس چیز کی طلب کی ہے وہ میرے نزدیک تو بہت بڑی چیز ہے لیکن وہ تیرے کرم اور تیرے عظیم جود اور تیری وسیع رحمت کے مقابل بہت چھوٹی چیز ہے اے باری تعالی تیرے بغیر ہر چیز تیرے جودو تیرے احسان اور تیرے کرم سے معرض وجود میں آئی ہے۔

اس کے بعض علامہ رازی رحمہ اللہ نے دعاء فرمائی وہی دعاء میں اپنے لئے بھی کر رہا ہوں، علامہ رازی رحمہ اللہ کے مفرد الفاظ سے ہی میں ہر ایک کی طرف منسوب کرتے ہوئے تمام مؤمنین کیلئے بھی دعاء کر رہا ہوں

"یا دائم المعرف یا قدیم الاحسان لاتخیب رجاء هذاالمسکین ولا ترد دعاءه واجعله بفضلک اهلالرحمتک یا ارحم الراحمین واکرم الاکرمین" (کبیر)

(آمین بحرمة النبی الکریم الامین)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۝﴾ (آیة نمبر ۹)

(1) اے رب ہمارے بیشک تو سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن کیلئے جس میں کوئی شبہ نہیں بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا۔

(2) اے ہمارے رب بیشک تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو اس دن کہ نہیں شک اس میں بیشک اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ میں۔

یہ آیۃ کریمہ بظاہر دعاء ہے لیکن حقیقت میں خبر ہے کیونکہ ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ پختہ علم والوں نے جب دعاء کی "اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر اور ان میں ٹیڑھا پن نہ پیدا کر ہدایت دینے کے بعد" پھر عرض کیا اے ہمارے رب ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما اس کے بعد یہ عرض کیا

(ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیه) "ومعناه انا نعلم انک جامع الناس للجزاء فی یوم القیامة ونعلم ان وعدک حق وانک لا تخلف المیعاد"

یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿رَبَّنَآ اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم یقین سے جانتے ہیں کہ بیشک تو لوگوں کو قیامت کے دن جزاء کیلئے جمع کرنے والا ہے، اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ بیشک تیرا وعدہ حق ہے اور بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ یعنی اے اللہ اگر تو نے ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے، اگر تو نے ہمیں ہدایت و رحمت نہ عطاء کی تو ہم عذاب کے مستحق ہوں گے، اسلئے اے رب کریم ہمیں ہلاکت اور عذاب سے بچالے۔ (ماخوذ از خازن)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ دعاء ہی ہو، اگرچہ بظاہر یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس دعاء میں کیا طلب کیا گیا

ہے لیکن حقیقت میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کی طلب ہے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "واعلم ان هذا الدعاء من بقية كلام الراسخين في العلم "یقین سے جان لو کہ بیشک یہ دعاء ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (پختہ علم والوں) کے کلام کا باقی حصہ ہے کیونکہ جب انہوں نے رب تعالی کے حضور عرض کیا کہ ان کو کجی (ٹیڑھ پن) سے بچا اور ہدایت و رحمت عطاء کر تو اس آیۃ میں گویا کہ ان کی عرض کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب اس سؤال سے ہمارا مقصد دنیاوی چیزوں کا حصول نہیں بلکہ ہمارا مقصد اخروی نعمتوں کا حصول ہے۔

"فانا نعلم انک یا الهنا جامع الناس للجزاء في يوم القيامة ونعلم ان وعدک لایکون خلفاو کلامک لا یکون کذبا فمن زاغ قلبه بقي هناک في العذاب ابد الأباد ومن اعطيته التوفيق والهداية والرحمة وجعلته من المؤمنين بقي هناک في السعادة والكرامة ابد الأباد فا لغرض الاعظم ما يتعلق بالأخرة،،

بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں اے ہمارے رب کہ تو قیامت کے دن لوگوں کو جزاء کیلئے جمع کرنے والا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بیشک تیرا وعدہ حق ہے تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور اے ہمارے رب تیرا کلام جھوٹا نہیں ہوتا، جس شخص کا دل ٹیڑھا ہو گیا وہ دائمی (ہمیشہ کے) عذاب میں مبتلاء ہوگا اور جن کو تو نے توفیق عطاء فرمائی اور ہدایت عطاء کی اور رحمت عطاء کی اور تو نے ان کو مومن بنایا وہ ہمیشہ کیلئے سعادت اور کرامت میں رہیں گے، یعنی اس دعاء کا تعلق آخرت سے ہو کہ اے اللہ ہمیں آخرت کے عذاب سے بچانا اور ہمیں آخرت میں اپنی ہدایت و رحمت کے ذریعے اجر عظیم عطاء فرمانا، حقیقت میں سب سے بڑا اجر تیری رضاء ہے اس لئے اے رب کائنات قیامت کے دن تو ہم سے راضی رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کیلئے چند مسائل:

﴿لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ﴾ میں یا حذف مضاف ہو یعنی اصل عبارت یہ ہے "لحساب يوم لاريب فيه" یا لفظ جزاء محذوف ہو یعنی اصل عبارت یہ ہو "لجزاء يوم لاريب فيه" اب مطلب یہ ہوا کہ "اے ہمارے رب بیشک تو لوگوں کو حساب اور جزاء کے دن جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

وقيل اللام بمعنى الى اى جامعهم في القبور الى يوم (لاريب فيه) الى لاينبغي ان يرتاب في وقوعه ووقوع مافيه من الحشر والحساب والجزاء"

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "لیوم" میں لام بمعنی "الی" کے ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے رب بیشک تو لوگوں کو قبروں میں اس دن تک جمع کرنے والا ہے جس میں شک نہیں بظاہر یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ

قیامت کے منکرین نے تو اس میں شک کیا ہے شک نہ ہونے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دن میں شک کرے اور اس دن میں حشر اور حساب اور جزاء کے واقع ہونے میں شک کرے۔ اس ترکیب کے لحاظ پر ﴿لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ﴾ جملہ صفت ہے "یوم" کی "وقيل الضمير المجرور للحكم اى لاريب فى هذا الحكم" بعض حضرات نے اس کی ترکیب یہ بیان کی ہے کہ "فيه" میں ضمیر مجرور "حکم" کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اس دن میں واقع ہونے والے حکم میں کوئی شک نہیں اس ترکیب کے لحاظ پر یہ جملہ تاکید کیلئے ہے یعنی اے ہمارے رب ہمیں اپنی کامل رحمت وہدایت سے قیامت کے دن بھی نوازنا۔ پہلے دعاؤں میں دنیا میں کجی سے بچانے اور رحمت وہدایت دینے کی دعاء تھی اب قیامت کے دن ان چیزوں کی عطاء کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

"جَامِعُ النَّاسِ" میں ایک ترکیب مضاف الیہ والی ہے اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "جامع" پر تنوین ہو اور "الناس" منصوب ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ "بیشک اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ میں۔"

یعنی جب رب تعالیٰ کے حضور اپنے مطالبات پیش کر دئے اور رب تعالیٰ کی الوہیت (معبود ہونے) کا اقرار کر لیا تو خود بخود یہ لازم آ گیا، "فان الالوهية منافية للاخلاف" کہ اقرار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا کیونکہ وہ معبود حقیقی ہے، معبود حقیقی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ وعدہ کی خلاف ورزی کرے۔ (از روح المعانی)

عجیب نکتہ : اس مقام میں ذکر فرمایا ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ (بیشک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) اور اس سورۃ کے آخر میں ایک دعاء آرہی ہے ﴿رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ اس دعاء میں خطاب پایا گیا ہے "بیشک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا" یہاں غائب کے صیغہ سے اور وہاں خطاب سے ذکر کرنے میں وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت (معبودیت) کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے حشر ونشر کا پتہ چل رہا کہ وہ معبود برحق ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلائے گا۔

یہ مقام ہیبت ہے لھذا ہیبت کے مقام پر رب تعالیٰ کے اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا جسے علم صرف میں درجہ غیب میں رکھا جاتا ہے۔ اور دوسری آیۃ کریمہ جو اس سورہ کے آخر میں آرہی ہے اس میں براہ راست انسان رب تعالیٰ سے

مخاطب ہو کر عرض کر رہا ہے ﴿ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴾ (بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) اسی کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انسان رب تعالیٰ سے یہ طلب کر رہا ہے کہ اے میرے رب اپنے فضل و کرم سے مجھ پر انعام فرما اور میرے گناہوں کو معاف فرما یہ مقام ہیبت نہیں بلکہ مقام امید ہے تو رب تعالیٰ کے حضور خطاب کے صیغہ سے عرض کیا ﴿ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴾ (از کبیر)

خلف فی الوعید: اس مسئلہ سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ وعد اور وعید میں فرق کیا ہے، پھر یہ مسئلہ سمجھ آئے گا کہ وعد کی مخالفت کیا ہے اور وعید کی مخالفت کا حکم کیا ہے۔ اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ پر وعد اور وعید قریب قریب معنی رکھتے ہیں لیکن اصطلاح میں ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اچھی چیز کا ذکر یعنی ثواب و انعام عطاء کرنے کا ذکر کرنا "وعد" ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَّلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ"

جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت اور ہو مسلمان تو ضرور ہم اسے اچھی زندگی جلائیں گے اور ضرور انہیں ان کا نیک (اچھا اجر) دیں گے جو ان کے سب سے بہتر کام کے لائق ہوں۔

اور عذاب وغیرہ کی دھمکی وعید ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا"

اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے اسکا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی اور اس کیلئے تیار رکھا بڑا عذاب۔

وعد اور وعید میں فرق سمجھنے کے بعد یہ سمجھئے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وعد کی مخالفت جائز نہیں لیکن وعید کی مخالف کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ جبائی معتزلی نے اسی زیر بحث آیۃ کریمہ سے دلیل پکڑی ہے کہ وعید کی مخالفت جائز نہیں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ﴿ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴾ (بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) وعد، اور موعد اور میعاد ایک چیز ہے اور رب تعالیٰ نے "وعید" پر بھی وعد کا اطلاق کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمْ حَقًّا ﴾ کہ ہمیں تو مل گیا جو سچا وعدہ ہم سے ہمارے رب نے کیا تھا تو کیا تم نے بھی پایا جو تمھارے رب نے سچا وعدہ تمہیں دیا تھا۔ یہ کلام جنت والے دوزخیوں سے کریں گے۔ جنت والوں کے انعامات کو بھی "وعد" سے ذکر کیا اور جہنم والوں کے عذاب کو بھی

"وعد" سے ذکر کیا۔

واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ "وعد" کے خلاف نہیں کرتا اور وعید کے خلاف بھی نہیں کرتا۔ اہل سنت کا اس مسئلہ میں مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم تو نہیں البتہ وہ اپنے فضل و کرم سے کسی چیز کو اپنے ذمہ کر لیتا ہے جو بظاہر واجب کے درجہ میں ہوتی ہے رب تعالیٰ نے "وعد" اپنے ذمہ کرم پر لیا اسی وجہ سے وہ اپنے فضل و کرم کے مطابق اپنے "وعد" کے خلاف نہیں فرماتا" لیکن وعید چونکہ عذاب کی ہوتی ہے اس لئے اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے عذاب کو دور کر دے تو بظاہر یہ وعید کی مخالفت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر احسان عظیم ہے۔ اہل سنت و جماعت کی دلیل اور قول یہ ہے" وعید الفساق کما ھو مشروطة بعدم التوبة باتفاق بیننا وبینکم کذلک مشروطة بعدم العفو" فاسقوں کو جو وعید فرمائی ہے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما کے اسکی مغفرت (بخشش) فرماتا ہے۔

اس مسئلہ میں اہلسنت کے ساتھ معتزلہ بھی اتفاق رکھتے ہیں اور اہل سنت کا قول یہ ہے کہ جس طرح فاسقوں کو عذاب دینا مشروط ہے توبہ نہ کرنے سے اسی طرح ان کا عذاب مشروط ہے رب تعالیٰ کے معاف نہ کرنے سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات شریفہ اس پر دلالت کر رہے ہیں ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ﴾ بیشک اللہ نہیں مغفرت فرماتا کہ اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ بخشش فرماتا ہے جس کی چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ اور نہیں ناامید ہوتے اپنے رب کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ نہ ناامید ہو اللہ کی رحمت سے۔ اسی طرح اس مسئلہ میں بے شمار احادیث مبارکہ ہیں جس سے پتہ چلا کہ وعید کی مخالفت درحقیقت احسان عظیم ہے جو جائز ہے۔ (ماخوذ از کبیر، مظہری و حاشیہ مسلم الثبوت لمولانا غلام رسول فیصل آبادی رحمہ اللہ)

راقم کا موقف: اللہ تعالیٰ کے وعد کا بھی تعلق خاتمہ بالایمان پر ہے اگر کوئی شخص العیاذ باللہ مرتد ہو جائے تو اسے اجر و ثواب عطا نہیں ہوگا بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گا۔ اور اگر گنہگار رہا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ ہی یہ فرما رکھا ہے کہ چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب دے دے اسی طرح گنہگار نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا توبہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب دے دے۔ اسی لئے خلف فی الوعید کا تعلق ظاہر سے ہے حقیقت سے نہیں حقیقت میں نہ خلف فی الوعد ہے اور نہ خلف فی الوعید ہے۔

طلباء کرام اسلاف کو یاد رکھیں:

ابھی میں نے حاشیہ " مسلم الثبوت" کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حاشیہ عربی میں ہے اگر چہ مختصر ہے لیکن سمجھانے کے لحاظ پر بہت سہل اور اچھا انداز رکھا گیا ہے۔ یہ حاشیہ حضرت علامہ مولنا غلام رسول رضوی (شیخ الحدیث) کا ہے، جن کی بخاری شریف کی شرح اردو" تفہیم البخاری "علماء وطلباء کے حلقہ میں مشہور ومعروف ہے۔ اور آپ حضرت شیخ الحدیث مولنا **سردار احمد** رحمہ اللہ کے داماد ہیں، جنگ اخبار میں لکھنے والا پیر فضل حق آپ کا ہی بیٹا ہے۔ اگر چہ علمی مقام میں اپنے والد مکرم سے بہت پیچھے رہ گیا لیکن سیاست میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ حضرت کا وصال دو سال قبل ہوا، "یَرحَمُ اللّٰهُ عَلَیهِ" آپ ہزاروں علماء کے استاذ تھے، خصوصا مفتی **عبدالقیوم** ہزاروی اور مفتی **محمد سلیمان** رضوی آپ کے شاگرد ہیں۔ اور حضرت مولنا غلام رسول رضوی حضرت علامہ مولنا حافظ **عطاء محمد بندیالوی** کے شاگرد تھے، جبکہ میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولنا محمد اشرف سیالوی بھی حضرت بندیالوی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میرے استاذ مکرم حضرت علامہ مولنا **محب النبی** رحمہ اللہ حضرت مولنا حافظ عطاء محمد بندیالوی رحمہ اللہ کے بھی استاذ ہیں۔ (راقم)

اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان مناظرہ:

ایک مرتبہ ابوعمرو بن علاء کا ایک معتزلہ عمر بن عبید سے مناظرہ ہو گیا۔ ابوعمرو بن علاء نے عمرو بن عبید سے پوچھا تو کبیرہ گناہ والوں کے متعلق کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں یہ کہتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالی نے اپنے بندوں سے وعدہ بھی فرمایا اور وعید بھی "**فهو منجز ايعاده كما هو منجز وعده**" وہ وعید کو بھی اسی طرح ضرور بر ضرور پورا کرے گا جیسا کہ وعدہ کو پورا کرے گا۔ ابوعمرو بن علاء نے عمرو بن عبید کو کہا، تو ایک عجمی شخص ہے "**لا اقول اعجم اللسان ولكن اعجم القلب**" میں یہ نہیں کہتا تو زبان کے لحاظ پر عجمی ہے، بلکہ تو اپنی ناسمجھی کی وجہ سے دل کا عجمی ہے، تجھے پتہ نہیں کہ عرب حضرات کیا کہتے ہیں؟ وہ یہ کہتے ہیں "**ان الرجوع عن الوعد لؤم وعن الايعاد كرم**" وعد سے رجوع ملامت ہے، اور وعید سے رجوع کرم ہے۔ پھر ابوعمرو بن علاء نے ایک شعر پڑھا:

واني وان اوعدته او وعدته — لمكذب ايعادي ومنجز وعدي

بیشک میں اگر اس سے وعید کروں یا اس سے وعد کروں تو اپنے وعید کو چھوڑ دیتا ہوں اور وعد کو پورا کر دیتا ہوں۔

اگر چہ عمرو بن عبید لاجواب ہو گیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد معتزلیوں نے "لمکذب ایعادی" پر غور کر کے حقیقی معنی کا اعتبار کر کے، مجازی معنی کو نہ سمجھتے ہوئے بات یہ گھڑی کہ عمرو بن عبید نے ابو عمرو بن علاء کو یہ کہا "ھل یسمی اللہ مکذب نفسہ" کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے ذات کی تکذیب کرتا ہے؟ تو ابو عمرو نے کہا نہیں۔ تو عمرو بن عبید نے کہا تمہاری حجت ختم ہوگئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وعد اور وعید میں فرق ہے "ان الوعد حق علیہ والوعید حق لہ" وعد، اللہ تعالی اپنے ذمۂ کرم پر لے کر بظاہر درجہ وجوب پر لے آتا ہے۔ اگر چہ اس پر حقیقی طور پر کوئی چیز واجب نہیں لیکن وعید کو وہ اپنے آپ پر لازم نہیں کرتا بلکہ اپنا حق ظاہر کرتا ہے کہ وعید بھی میرا حق ہے۔

"ومن اسقط حق نفسہ فقدالتی بالجود والکرم ومن اسقط حق غیرہ فذلک ھو اللؤم"

جو اپنا حق چھوڑ دے وہ جود و کرم ہے، اور جو غیر کا حق ساقط کر دے یہ ملامت ثابت کرتا ہے۔ تو واضح ہو گیا کہ وعید رب تعالی کا اپنا حق ہے، وہ چھوڑ دیتا ہے، اور وعد میں بندوں کا حق پایا جاتا ہے، لھذا وعد کو وہ نہیں چھوڑتا۔

"واذا جمیع الوعیدات مشروطۃ بعدم العفو فلایلزم من ترکہ دخول الکذب فی کلام اللہ تعالی"

جب تمام وعیدیں مشروط ہیں اللہ تعالی کے معاف نہ کرنے سے تو وعید کو چھوڑنے میں اللہ تعالی کے کلام میں کذب لازم نہیں آتا۔

اصل ساری غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی معانی اور مجازی میں فرق نہیں کیا جاتا اور نہ ہی موقع و محل سمجھا جاتا ہے کہ یہاں کون سا معنی لیا جائے اور دوسری جگہ کون سا معنی لیا جائے۔ بعض اوقات ایک ہی لفظ بندوں کی طرف منسوب ہو کر اور معنی دیتا ہے، اور اللہ تعالی کی طرف منسوب ہو کر اور معنی دیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلف الوعید کرم ہے اور قابل تعریف ہے، اور خلف الوعد دوسروں کی حق تلفی ہے لھذا وہ باعث ملامت ہے۔ اصل میں لفظ خلف کا معنی "مخالفت اور جھوٹ" لے کر لوگ غلطی کا شکار ہوتے ہیں، حالانکہ خلف کا معنی "چھوڑنا" بھی آتا ہے، لھذا "خلف الوعید کرم عن العرب" کا معنی "ترک الوعید کرم عندالعرب" لیا جائے تو کوئی خرابی نہیں، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ وعید کو چھوڑ دینا کرم ہے عرب حضرات کے نزدیک، ایک شاعر نے کیا خوب بیان کیا ہے، جسنے "خلف یا کذب" کے الفاظ نہیں استعمال کئے۔

اذاوعد السراء انجز وعدہ　　وان اوعد الضراء فالعفو مانع

جب وہ خوش کرنے (بھلائی پہنچانے) کا وعدہ کرتا ہے تو وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ اور اگر وہ تکلیف

دینے کی وعید کرتا ہے (دھمکی دیتا ہے) تو اس کا معاف کرنے کا وصف اسے روک دیتا ہے۔

دینی طلباء کرام کیلئے: میعاد اصل میں "موعاد" ہے واؤ ساکن مظہر ماقبل مکسور اسلئے واؤ کو یاء سے بدل دیا۔ "میعاد" مصدر میمی ہے تمام مصادر کی طرح اس میں حدثی معنی پایا گیا ہے۔ یہ ظرف زمان اور مکان نہیں۔ (روح المعانی)

فائدہ جلیلہ: "اخرج ابن النجار فی تاریخه عن جعفر بن محمد الخلدی قال روی عن النبی ﷺ انه قال من قرأ هذه الأية علی شئی ضاع منه رده الله علیه "ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیه ان الله لا یخلف المیعاد اللهم یا جامع الناس لیوم لا ریب فیه اجمع بینی وبین مالی انک علی کل شئی قدیر"

ابن نجار نے اپنی تاریخ میں جعفر بن محمد خلدی سے راویت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس کا مال گم جائے وہ یہ آیۃ (اور دوسرے آنے والے الفاظ) پڑھے تو اللہ اس کا مال اس پر لوٹا دے گا۔ (یعنی یہ پڑھے) "رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ) اَللّٰهُمَّ یَاجَامِعَ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْهِ وَاجْمَعْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ مَالِیْ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" (درمنثور)

تنبیه: جب بے دینوں کی یلغار ہو تو دین کو بچانے کیلئے لوگوں سے علیحدہ ہو کر عبادت میں مشغول رہنا مستحسن کام ہے "قال الجنید رحمه الله من اراد ان یسلم له دینه ویستریح فی بدنه وقلبه فلیعتزل الناس فان هذا فی وحشة والعاقل من اختار الوحدة" حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص ارادہ رکھتا ہو کہ وہ اپنے دین کو سلامتی میں رکھے اور اپنے بدن اور دل کو راحت پہنچائے تو وہ لوگوں سے جدا ہو جائے اس لئے کہ جب بے دین لوگوں میں رہنے سے وحشت حاصل ہو اور دینی احکام پر عمل سے روکیں تو عقلمند شخص اکیلے رہنے کو پسند کرتا ہے۔ (از روح البیان)

فائدہ: جس طرح دانہ زمین میں دفن کرنے سے اگتا ہے اسی طرح محبت اور وجود کا دانہ خاموشی کی زمین میں دفن کرنے سے دل میں حکمت اگتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کے دانہ کو دفن نہیں کرے گا یعنی میں ہوں کا دعوی کرے گا اور دنیا سے یا اغیار سے محبت رکھے گا تو حکمت اس کے دل میں نہیں اگے گی اپنے آپ کو عجز سے مٹا دے یوں کہے میں کچھ نہیں محبت کا محور صرف رب تعالی ہو انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی محبت بھی رب تعالی کی طرف پہنچانے والی ہے لھذا ان سے محبت ہو تو حکمت اسی کے دل میں اگے گی۔ (از روح البیان)

حکمت: "فعلیک بتزکیة النفس واصلاح الوجود کی تدرک نور الشهود وتقبل الی

الاستقامة وتخلص من الزیغ والضلال فی جمیع الاحوال"
تم پر لازم ہے کہ نفس کو پاکیزہ رکھو اور وجود کی اصلاح کرو تا کہ تمہیں نور حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے تمہیں مقام شہود (رب کے ہاں حضوری) حاصل ہو جائے اور تمہیں استقامت حاصل ہو جائے اور تمام احوال میں ٹیڑھ پن اور گمراہی سے تمہیں چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

❁ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان اللہ لا ینظر الی صورکم بل الی قلوبکم واعمالکم" بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔"والقلب ھو محل النظر لاالصورۃ" اس لئے کہ دل ہی محل نظر ہے صورت کو دیکھنے سے حقیقی فائدہ حاصل نہیں۔ (از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ (آیۃ نمبر ۱۰، ۱۱)

(1) بیشک وہ کافر ہوئے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں کچھ نہ بچا سکیں گے، اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں ۝ جیسے فرعون والوں اور ان سے اگلوں کا طریقہ انہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ کا عذاب سخت"

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بچا سکیں گے ان کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ (بھی) اور وہی ایندھن ہیں آگ کا ۝ جیسے طریقہ فرعون والوں اور ان سے پہلے لوگوں کا تھا انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو پکڑ لیا انہیں اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔

ماقبل سے رابطہ : پچھلی آیات میں مؤمنین کی دعاؤں کا ذکر کیا کہ وہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا محتاج اور نیاز مند سمجھتے ہیں اب اس آیۃ کریمہ میں کفار کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنی اولاد پر ناز کرتے ہیں اللہ

تعالی سے اپنے آپ کو بے پرواہ سمجھتے ہیں۔

شان نزول کے لحاظ پر خاص:

کہ یہ آیۃ کریمہ نجران کے وفد میں سے ایک شخص کے ایک قول کے بعد نازل ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کے ایک شخص ابو حارثہ بن علقمہ نے اپنے بھائی کو کہا کہ بیشک میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالی کے سچے رسول ہیں لیکن میں اسے ظاہر نہیں کرتا کیونکہ اگر میں نے اسے ظاہر کیا تو رومی لوگوں نے مجھے جو عزت و مرتبہ عطاء کر رکھا ہے اور میرا مالی وظیفہ مقرر کر رکھا ہے وہ سب مجھ سے چھین لیں گے، حالانکہ میری اور میری اولاد کی آسائش اسی مال پر ہے تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمہیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ (کبیر)

حکم کے لحاظ پر آیۃ کریمہ عام ہے:

"ان اللفظ عام وخصوص السبب لا یمنع عموم اللفظ" آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ عام ہیں شان نزول کے لحاظ پر کوئی خصوصی واقعہ الفاظ کو اپنے عموم پر جاری ہونے سے منع نہیں کرتا اسلئے آیۃ کریمہ تمام کفار کو شامل ہے کہ بیشک کافروں کو ان کا مال اور ان کی اولاد نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ (کبیر)

"وھی عامۃ تتناول کل کافر" یہ آیۃ کریمہ الفاظ کے عموم کی وجہ سے ہر کافر کو شامل ہے۔ (البحر المحیط)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا﴾

بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بچا سکیں گے ان کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ بھی۔

راقم کا یہ ترجمہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے ہی نقل ہے صرف فرق یہ ہے کہ راقم کا ترجمہ الفاظ کی ترتیب کے مطابق ہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مضمون کو سمجھانے کے لحاظ پر خوب ہے۔ یہ ترجمہ البحر المحیط کی اس عبارت کے مطابق ہے۔

"ومعنی من اللہ ای من عذابہ الدنیوی والاخروی ومعنی اغنی عنہ دفع عنہ ومنعہ"

آیۃ کریمہ میں "من اللہ" سے مراد اللہ تعالی کے دنیاوی اور اخروی عذاب سے بچانا اور "اغناء" کا معنی مندفع (دور) کرنا اور روکنا۔ البحر المحیط کی عبارت کو دیکھ کر طلباء کرام اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو ایک بار پھر دیکھیں خوب ترین نظر آئے گا۔

رب تعالیٰ نے کافروں کیلئے اپنے کامل عذاب کا ذکر کیا:

اعلم ان کمال العذاب هو ان یزول عنه کل ما کان منتفعابه ثم یجتمع علیه جمیع الاسباب المؤلمة" کامل عذاب یہ ہے کہ ہر نفع مند چیز کا نفع زائل ہو جائے پھر یہ کہ اس پر تمام درد پہنچانے والے اسباب جمع کر لئے جائیں۔

کفار سے نفع مند چیزوں کے نفع کا زوال:

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ کافروں کو قیامت کے دن مال اور اولاد نفع نہیں پہنچائیں گے کیونکہ "صفة ذلک الیوم مخالفة لصفة الدنیا" قیامت کے دن کی صفات دنیا کی صفات سے مختلف ہوں گی دنیا میں تو کافر بعض اوقات مال اور اولاد سے نفع حاصل کر لیتا ہے لیکن قیامت میں کفار کو مال واولاد کچھ نفع نہیں پہنچا سکیں گے حالانکہ دنیا میں مصائب وآلام میں ان دو چیزوں کو ہی قریب ترین نفع مند سمجھا جاتا ہے لیکن قیامت کے دن "اقرب الطرق الی دفع المضار اذالم یتاب فی ذلک الیوم فما عداہ بالتعذ ر اولی" جب قریب ترین اسباب کام نہیں آئیں گے تو اور کیا کام آئے گا؟ یعنی کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی مضمون کو رب تعالیٰ کے دوسرے ارشادات گرامی میں دیکھئے ﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر۔

﴿اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ سے مراد جو شرک کفر ونفاق سے پاک ہے اس کو اس کا مال بھی نفع دے گا جو راہ خدا میں خرچ کیا ہو اور اولاد بھی جو صالح ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کے عمل منقطع (ختم) ہو جاتے ہیں سوا تین کے ایک صدقہ جاریہ اور دوسرا وہ مال جس سے وہ لوگ نفع اٹھائیں تیسری نیک اولاد جو اس کیلئے دعاء کرے۔ (خزائن العرفان)

اسی طرح اور ارشاد گرامی یہ ہے ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ○﴾ مال اور بیٹے یہ جیتی دنیا کا سنگار ہیں اور باقی رہنے والی اچھی باتیں ان کا ثواب تمہارے رب کے ہاں بہتر اور وہ امید میں سب سے بھلی۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ○﴾ اور جو چیزیں کہہ رہا ہے ان کے ہمیں وارث ہوں گے اور ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔ یعنی کافروں کا یہ کہنا کہ قیامت کے دن بھی ہمیں ہی مال اور اولاد نفع دیں گے باطل ہے ان کے مال وغیرہ کے تو ہم ہی مالک ہیں وہ تو اکیلے ہمارے پاس

آئیں گے نہ ان کی اولاد اور نہ ہی مال ان کو نفع دیں گے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ اور بیشک تم ہمارے پاس اکیلے آئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے جو مال و متاع ہم نے تمہیں دیا تھا۔

کفار کے عذاب کا ذکر:

یعنی کامل عذاب کے اسباب کی دوسری قسم "فهو ان يجتمع عليه اسباب المؤلمة" یہ ہے کہ درد پہنچانے والے اسباب ان کیلئے جمع کر لئے جائیں اسی طرف رب تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ اور وہی ایندھن ہیں آگ کا یہ بہت بڑا عذاب ہوگا۔ "فانه لاعذاب ازيد من انت تشتعل النار فيهم كا شتعالها في الحطب اليابس" بیشک اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہوگا کہ آگ ان پر ایسے شعلے مار رہی ہوگی جیسے خشک لکڑی سے وہ شعلے مارتی ہے۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

"وقود" کی واؤ پر فتح ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے 'ایندھن' اور جب واؤ پر ضمہ ہو تو اس کا مصدری معنی ہوتا ہے "جلانا" وقدت النار وقودا" اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسا کہ "وردت ورودا" استعمال ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مال کا ذکر اولاد کے ذکر سے پہلے کیوں:

"قدم الاموال على الا ولا د لانها اول عدة يفزع اليها عند نزول الخطوب" مال کا ذکر اولاد سے پہلے اس لئے کیا کہ انسان تکالیف میں سب سے پہلے مال کی طرف ہی رجوع کرتا ہے اولاد سے بعد میں امداد لیتا ہے۔ (روح البیان)

اولاد بھی نفع نہیں دے گی حالانکہ دنیا میں انسان اپنی مشکلات میں اولاد کا سہارا بھی لیتا ہے لیکن قیامت کے دن صرف اعمال نے کام آنا ہے ایمان ہو تو مال اور اولاد بھی نفع مند ہوں گے جیسا کہ قریب ہی خزائن العرفان سے ذکر کیا جا چکا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی ضروری ہے۔

❁ "قال رسول الله ﷺ ولا ينفع ذاالجد منك الجد" کسی کوشش کرنے والے کو تمہاری کوشش نفع نہیں پہنچا سکتی۔

والمعنی لن تغنی عنهم بدل رحمة الله او بدل طاعته سبحانه اموالهم ولا اولادهم"
آیہ کریمہ کا مفہوم واضح ہو گیا کہ جو نفع اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حاصل ہونا تھا اسکے مقابل رب تعالیٰ سے دور ہو کر کوئی اپنے مال اور اولاد سے نفع حاصل کرنا چاہے تو یہ اسے نفع نہیں دے سکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طاعت و فرمانبرداری سے جو نفع حاصل ہونا تھا، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے مال و اولاد سے نفع کی امید کرنی باطل ہے یعنی کفار کو ان کے مال و اولاد نے اللہ تعالیٰ کی طاعت و رحمت سے دور کر دیا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت مال اولاد کے ذریعے حاصل کر لیں گے جو چیزیں رب تعالیٰ سے دور کرنے والی ہیں وہ رب تعالیٰ کے قریب کیسے کریں گی؟ (ماخوذ از روح البیان)

تکبر پر وعید:

"وخرج ابن المبارک من حدیث بن عبد المطلب قال قال رسول الله ﷺ یظهر هذا الدین حتی یجاوز البحار وحتی تخاض البحار با لخیل فی سبیل الله تبارک وتعالی ثم یأتی اقوام یقرء ون القرآن فاذا اقرء وه قالوا من اقرء منا من اعلم منا ؟ثم التفت الی اصحابه فقال هل ترون فی اولئکم من خیر ؟قالوا لا قال اولئک منکم واولئک من هذه الامة واولئک هم وقود النار"

ابن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت عباس بن عبد المطلب ﷺ سے حدیث نقل فرمائی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دین پھیل جائے گا یہاں تک کہ سمندروں سے پار ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد میں) اپنی سواریوں کو سمندروں میں ڈال دیا جائے گا پھر کچھ قومیں آئیں گی قرآن پڑھیں گی جب وہ قرآن پڑھیں گے تو کہیں گے ہم سے بڑا قاری کون ہے؟ ہم سے بڑا عالم کون ہے؟ پھر حضور ﷺ نے صحابہ کرام کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا کیا ان لوگوں میں تم کوئی بھلائی دیکھتے ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں (یعنی ان میں ہم بھلائی نہیں دیکھتے) آپ نے فرمایا وہ لوگ تم سے ہی ہوں گے (یعنی ایمان والے ہوں گے) اور اس امت سے ہی ہوں گے اور وہ لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

آگ کے ایندھن ہونے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوئے اور عدل کی بات آئی تو وہ عذاب میں مبتلاء ہوں گے اور عذاب کی مدت پوری کر کے جنت میں آجائیں گے، اس پر فرمان مصطفوی واضح طور پر موجود ہے "من قال لا اله الا الله دخل الجنة "جس نے " لا اله الا الله " کہا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ **یا** آگ کا ایندھن کا مطلب یہ ہے کہ وہ آگ میں جانے کے مستحق تو ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوں گے وہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے ورنہ حقیقت میں آگ کا ایندھن ہمیشہ آگ میں رہنے کیلئے اور ذلت

ورسوائی کیلئے صرف کافر ہی ہوں گے۔ مؤمنوں کو آگ میں اس طرح ڈالا جائے گا جسطرح زرگر سونا آگ کی بھٹی میں ڈالتا ہے جو وہ میل کچیل سے صاف ہوتا ہے اسے نکال لیتا ہے ایسے ہی مؤمن جب گناہوں کی میل کچیل سے صاف ہوجائے گا تو اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ (راقم)

﴿كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾

"جیسے طریقہ والوں اوران سے پہلے لوگوں کا تھا انہوں نے جھلایا ہماری آیتوں کو"۔

"دأب" کا معنی ہے کوشش کرنا، محنت ومشقت کرنا "دابت الشئی ای اجتهدت فی الشئی وتعبت فيه" یعنی "دأبت الشئ" کا معنی یہ ہے کہ میں نے اس چیز میں کوشش کی اور تھکن سے کام کیا، جب کوئی شخص سارا دن چلتا رہے تو کہا جاتا ہے "سار فلان یوما دائبا" پھر عام استعمال میں "دأب" دوام اور ہمیشگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح "دأب" کا معنی عام محاورہ میں "شان، معاملہ، عادت، بھی آتا ہے۔ کہا جاتا ہے "هذا دأب فلان" یہ فلاں کی عادت ہے یہ فلاں کی حالت ہے یہ فلاں کا معاملہ ہے۔

وجوہ تشبیہ : نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے کفار کے فرعونیوں اور ان سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں سے تشبیہ دی گئی ہے، تشبیہ دینے کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) "الاول ان يفسر الداب بالا جتهاد كما هو معناه فی اصل اللغة" ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ "دأب" کا معنی لغوی محنت ومشقت لیا جائے، اب تشبیہ اس طرح ہوگی کہ یہ کافر رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے اور آپ کے دین کا انکار کرنے اور کفر کرنے میں ایسے ہی ہیں جیسا کہ فرعون اور اس کی تابعداری کرنے والے لوگوں نے اور ان سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں نے بڑی محنت وکوشش سے تکذیب کی، اسی طرح یہ بھی پوری محنت ومشقت کررہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے دین کو جھٹلانے میں۔ "ثم انا اهلكنا اولئك بذنوبهم فكذا انهلك هؤلاء" پھر بیشک ہم نے ان لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردیا تو ان کو بھی ہلاک کردیں گے، یہی مطلب ہے ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (اور پکڑلیا ان کو اللہ نے ان کو گناہوں کی وجہ سے اور اللہ سخت عذاب والا ہے) کا۔

(۲) "اوجه الثانی ان يفسر الداب بالشان والصنع" (تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ "دأب" کا معنی "حالت اور فعل" لیا جائے اب اس میں چند وجہ ہوں گی، ایک یہ کہ ان لوگوں کی شان یعنی حالت نبی کریم ﷺ کی تکذیب میں ایسے

ہی تھی جیسے فرعون اور اس کے متبعین اور اس سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں کی حالت تھی۔

ولا فرق بین هذا الوجه وبین ما قبله الا انا حملنا اللفظ فی الوجه الاول علی الاجهتاد فی هذا الوجه علی الصنع والعادة"

اور کوئی فرق نہیں اس وجہ میں اور پہلی وجہ میں جو ہم نے بیان کی ہاں صرف لفظوں کا فرق ہے پہلی وجہ میں "دأب" کا معنی محنت و مشقت لیا گیا ہے اور اب جو وجہ بیان کی گئی ہے اس میں معنی "حالت اور عادت" لیا گیا ہے "دأب" کا معنی شأن (حالت) اور عادت لے کر تشبیہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہو:

"ان الذین کفروا لن تغنی عنهم اموالهم ولااولادهم من الله شیأ ویجعلهم الله وقود النار کعادته وصنعه فی آل فرعون"

بیشک کافروں کو ہرگز نہیں بچا سکیں گے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے کسی عذاب سے اور اللہ ان کو آگ کا ایندھن بنائے گا جیسا کہ اللہ تعالی کی عادت فرعون والوں کو عذاب دینے کی ہوئی۔ یعنی جب انہوں نے اپنے رسول موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور ان سے پہلے لوگوں نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالی نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت (پکڑ) میں لے لیا۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

"والمصدر تارة یضاف الی الفاعل وتارة الی المفعول والمراد ههنا کدأب الله فی آل فرعون فانهم لما کذبوا برسولهم اخذهم الله بذنوبهم"

"داب" مصدر ہے، مصدر کبھی فاعل کی طرف مضاف ہوتا ہے اور کبھی مفعول کی طرف، یہاں یہی مراد ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جیسے اللہ تعالی کی عادت آل فرعون میں ہوئی، کیونکہ انہوں نے جب اپنے رسول کی تکذیب کی تو اللہ تعالی نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا۔ ایسا ہی استعمال ﴿یُحِبُّوْنَهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ﴾ میں ہے، کیونکہ اصل معنوی اعتبار پر "کحبهم الله" ہے اور اسی طرح ﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا﴾ بھی معنوی لحاظ پر اصل میں "سنتی فیمن ارسلنا قبلک" ہے۔ **دوسری** وجہ جو بیان ہو رہی تھی کہ "دأب" کا معنی عادت، حالت، کیفیت مراد ہو، تو اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، اور اس کی **تیسری** وجہ یہ ہے

"یحتمل ان تکون الآیة جامعة للعادة المضافة الی الله تعالی والعادة المضافة الی الکفار، کأنه قیل ان عادة هؤلاء الکفار ومذهبهم ایذاء محمد ﷺ کعادة من قبلهم فی ایذاء رسلهم وعادتنا ایضا فی اهلاک هؤلاء کعادتنا فی اهلاک اولئک الکفار المتقدمین"

کہ اس میں احتمال یہ ہے کہ "دأب" بمعنی "عادت" ہو۔ اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہو اور کفار کی طرف بھی ہو، گویا کہ یوں کہا گیا ہو کہ ان لوگوں کی عادت اور مذھب نبی کریم ﷺ کو ایذاء (تکلیف) دینے میں ایسے ہی ہے، جیسے ان سے پہلے لوگوں کی عادت اپنے رسولوں کو تکلیف دینے کی تھی، اور گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا گیا کہ ہماری عادت بھی ان لوگوں کو ہلاک کرنے میں ایسے ہی ہے جیسے کہ ان سے پہلے لوگوں (رسولوں کی تکذیب کرنے والوں) کو ہم نے ہلاک کیا۔

"والمقصود علی جمیع التقدیرات نصر النبی ﷺ علی ایذاء الکفرة وبشارته بان الله سینتقم منهم"

تمام مطالب میں مقصد بیان کرنے کا یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بشارت دی کہ کفار آپ کو ایذاء (تکلیف) پہنچائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی امداد فرمائے گا، اور کافروں سے انتقام لے گا۔

(۳) "الوجه الثالث فی تفسیر الدأب والدؤب وهو اللبث والدوام وطول البقاء فی الشئ"

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "دأب" اور "دؤب" کا معنی زیادہ دیر ٹھہرنا، یا ہمیشہ ٹھہرنا بھی آتا رہتا ہے، اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والے بھی آگ میں ہمیشہ رہیں گے جیسا کہ آل فرعون اور ان سے پہلے رسولوں کی تکذیب کرنے والے آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۴) "والوجه الرابع ان الدأب هو الاجتهاد کما ذکرناه ومن لوازم ذلک التعب والمشقة"

چوتھی وجہ یہ ہے کہ "دأب" کا معنی "اجتہاد" محنت، جدوجہد ہے، لیکن جب کسی کام میں جدوجہد پائی جائے تو اس میں تھکن اور مشقت بھی پائی جاتی ہے،

"فیکون المعنی ومشقتهم وتعبهم من العذاب کمشقة آل فرعون بالعذاب وتعبهم"

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کفار کو عذاب کی وجہ سے مشقت وتکلیف ایسے ہی ہوگی جیسے آل فرعون کو مشقت وتکلیف حاصل ہو چکی ہے اور ہمیشہ کیلئے ان کو تکلیف حاصل رہے گی۔

آل فرعون سے تشبیہ دے کر ضمناً یہ بھی سمجھا دیا گیا "ان عذابهم حصل فی غایة القرب وهو قوله تعالیٰ 'اغرقوا فادخلوا نارا'" کہ ان کا عذاب بہت قریب ہے، جیسا کہ آل فرعون کو ادھر غرق کیا اور ادھر ساتھ ہی آگ میں داخل کر دیا گیا۔ اور ان کو شدید عذاب دیا جائے گا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَّيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ آگ جس پر صبح وشام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، حکم ہوگا فرعون والوں کو سخت تر عذاب میں داخل کرو۔

(۵) "الوجه الخامس ان المشبه هو ان اموالهم و اولادهم لا تنفعهم فی ازالة العذاب"

پانچویں وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایذاء پہنچانے والے اور تکذیب کرنے والے کافروں کو آل فرعون سے اور ان سے پہلے انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں سے اس چیز میں تشبیہ دی گئی کہ جس طرح پہلے کفار عذاب میں مبتلاء ہوئے تو ان کو ان کے مال اور اولاد نفع نہ پہنچا سکے بلکہ وہ عذاب کے نازل ہونے پر مضطر و مجبور ہو گئے یعنی اس طرح پریشان ہوئے کہ ان کی پریشانی کو کوئی دور کرنے والا نہ تھا، نہ مال، نہ اولاد۔

"فکذلک حالکم ایها الکفار المکذبون بمحمد ﷺ فی انه ینزل بکم مثل ما نزل بالقوم تقدم او تأخر و لا تغنی عنکم الاموال و الاولاد"

اے کافرو نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والو تم پر اسی طرح عذاب نازل ہوگا جیسا کہ پہلے قوموں پر عذاب نازل ہوا، خواہ وہ عذاب جلدی آئے یا دیر سے آئے، جس طرح ان لوگوں کو ان کے مال اور ان کی اولاد نہ بچا سکے ایسے ہی تمہارے مال اولاد تمہیں بھی نہیں بچا سکیں گے۔

(۶) الوجه السادس "یحتمل ان یکون وجه التشبیه انه کما نزل بمن تقدم العذاب المعجل بالاستئصال فکذلک ینزل بکم ایها الکفار بمحمد ﷺ و ذلک من القتل و السبی و سلب الأموال"

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس تشبیہ میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ جس طرح پہلی قوموں پر جلدی عذاب آیا، یعنی ان کو دنیا میں عذاب دے کر تباہ و برباد کر دیا گیا پھر آخرت میں ان کو عذاب دیا جائے گا، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے والے کافرو تمہیں بھی دنیا میں جلدی عذاب دیا جائے گا یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں تمہیں قتل کرا دیا جائے گا، اور قید کرا دیا جائے گا اور تمہارا مال چھین لیا جائے گا، پھر تمہیں اخروی عذاب میں مبتلاء کر دیا جائے گا، دنیاوی اور اخروی عذاب کا تذکرہ آنے والی آیۃ کریمہ میں موجود ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ جلیلہ: مسلمان کے مال و اولاد قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں، اور اس کیلئے باعث ثواب ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بیوی بچوں کو پالنا عبادت ہے حتی کہ بیویوں کے منہ میں لقمہ دینا عبادت ہے، اس سے صحبت کرنا ثواب میں آتا ہے۔ کیونکہ مسلمان کو ان سے دلی تعلق ہوتا ہے، وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے، لھذا یہ تمام چیزیں اس کیلئے جمال الٰہی کا آئینہ ہوتا، وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے، لھذا یہ تمام چیزیں اس کیلئے جمال الٰہی کا آئینہ ہیں، لیکن کفار کی اولاد اور ان کے مال ان کیلئے حجاب کا سبب ہیں، اور رب تعالیٰ سے دوری کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ کفار کو ان چیزوں سے دلی تعلق ہوتا ہے۔ اور یہ ہی اس کے

حقیقی محبوب ہیں۔لہذا یہ چیزیں اسے عذاب سے کیا بچائیں گی، یہ تو اس کیا عذاب کو بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔فرعون اوراس کے متبعین نے مال واولاد پر ہی ناز کرتے ہوئے ایمان نہ لایا تو وہ غرق کردئے گئے اوراخروی عذاب میں بھی مبتلاء کردیئے گئے،گویا کہ ان کا مال اوران کی اولاد عذاب کا سبب بنے۔ (ابن عربی،ازنعیمی)

عظمت قرآن اور مفسرین کا خوبصورت بیان:

(بآیاتنا) یحتمل ان یرید الآیات المتلوۃ ویحتمل ان یرید الآیات المنصوبۃ للدلالۃ علی الوحدانیۃ"

اللہ تعالی نے جو یہ ارشاد فرمایا﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْابِآيَاتِنَا﴾ (اوروہ لوگ جوان سے پہلے ہوئے جھٹلایا ہماری آیات کو۔ (قرطبی)

اس میں "بــآیــاتــنــا" ذکرفرما کرعظیم مطالب کو بیان کردیا گیا جس سے عظمت قرآن واضح طور پر سمجھ آرہی ہے، کیونکہ "آیات" سے مراد عام ہیں خواہ "متـلـو" (پڑھی جانے والی) ہوں یا غیـر متـلـو (نہ پڑھی جانے والی) ہوں یعنی جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی آیات کو جھٹلایا ان کو ان کے مال اولاد نفع نہ پہنچا سکے،اوروہ اللہ تعالی کی گرفت میں آئے اور "غیـر متـلـو" سے مراد انبیاء کرام کے معجزات بھی ہیں کہ ان سے انبیاء کرام کی صداقت واضح ہوگئی،اوراللہ تعالی کی قدرت پر بھی وہ دلیل ہیں، کہ یہ معجزات صرف اسی ذات سے حاصل ہیں جو "وحـده لاشریک له" ہےاور تمام چیزیں جو اللہ تعالی کی وحدت (ایک ہونے) پر دلالت کررہی ہیں وہ "آیـات غیـر متـلـو" میں داخل ہیں۔لھذا سورج،چاند،آسمان، ہوا اور ستارے، روشنی وتاریکی، بارشیں وغیرہ سب ہی اللہ تعالی کی وحدت پر دلالت کررہی ہیں۔ان میں سے کسی ایک کو بھی اللہ تعالی کی مخلوق نہ تسلیم کرنا اوراللہ تعالی کی قدرت وحدت پر دلیل کا انکار باعث عذاب ہے۔

دوگناہوں کا ذکر:

(کـذبـوا بـآیاتنا)فصرفوهافی غیر مصارفهافا فتمعت علیهم معاصی الکفر ومعاصی صرف النعم فی غیر مصارفها"

آیات کی تکذیب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے آیات کو پھیر کر مطالب غلط بیان کئے،اوراللہ تعالی کی قدرت وحدت پر دلالت کرنے والی نشانیوں کی بھی غلط تاویلیں کیں،لھذا ان میں کفر کے معاصی۔(گناہ)اورآیات کو پھیر کر غلط مطالب بیان کرنے کے معاصی جمع ہوگئے۔ (تبصیر الرحمن)

﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

''تو پکڑلیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے''۔

(فاخذهم الله بذنوبهم) ان رحمهم بالاموال والاولاد اولا اذ (الله) كما هو الرحمن الرحيم فهو ايضا شديد العقاب''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مال واولاد عطاء کر کے ان پر پہلے رحم بھی فرمایا، لیکن اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کرنے پر ان کے مال واولاد کو نفع نہ پہنچانے والا بلکہ ضرر پہنچانے والا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم بھی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی لوگوں نے تکذیب کی تو رب تعالیٰ نے ان کو گرفت میں بھی لے لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔ (تبصیر الرحمٰن)

فائدہ: آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے تکذیب باعث کفر ہے، اور باعث عذاب ہے، اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مؤمن کا مال اور اولاد اس کیلئے نفع مند ہے لیکن کافر کیلئے نفع مند نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے اسکی رحمت کی امید بھی کی جائے، لیکن رب تعالیٰ قہار وجبار بھی ہے اس لئے اس کے قہر وجبر سے انسان ڈرتا بھی رہے۔

باء میں دو احتمال:

والباء في قوله بذنوبهم يحتمل ان تكون للملا بسة والمعنى اخذهم الله والحال انهم ملتبسون بذنوبهم يعني من غير توبة''

''بذنوبهم'' کی باء میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ باء ملابست کیلئے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گرفت میں لیا حال یہ ہے کہ وہ گناہوں میں متلبس (مبتلاء) ہیں، اور توبہ بھی نہیں کر رہے۔

''ويحتمل ان تكون للسببية والمعنى اخذهم الله بسبب ذنوبهم'' اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ باء سببیت کیلئے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے ان کو گرفت میں لے لیا بوجہ ان کے گناہوں کے۔ ''والاول ابلغ لان فيه دفع توهم ان موتهم كفارة لما وقع منهم'' ان دونوں احتمالوں میں سے پہلا زیادہ قوی ہے، کیونکہ اس میں یہ وہم نہیں پایا جاتا کہ ہوسکتا ہے کہ موت ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے، پہلے احتمال میں اس وہم کا ازالہ ہو جاتا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ چونکہ گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں، بغیر توبہ کے مرجاتے ہیں، اس لئے

رب تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ (صاوی)

تفنن: ایک مضمون کو مختلف عبارات سے پیش کرنا عرب حضرات کے نزدیک تفنن (اظہارفن) کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں عرب حضرات کے تمام اسلوب کو بیان کیا گیا ہے، اسی لئے ایک مقام میں بیان ہوا﴿كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا﴾ اور دوسری آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا﴿كَفَرُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ اور تیسری آیۃ کریمہ میں استعمال ہوا﴿كَذَّبُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ﴾ (صاوی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے معلوم ہوا کہ کفار سے عذاب دفع نہ ہوگا، اور بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت کی باعث ابوطالب کا عذاب ہلکا ہے۔اور ابولہب کا عذاب حضور ﷺ کی ولادت کی خوشی کی وجہ سے سوموار کو ہلکا ہوتا ہے۔اس آیۃ کریمہ اور احادیث مبارکہ میں مطابقت کیسے؟

جواب: ان احادیث میں عذاب کے ہلکا ہونے کا ذکر ہے، اور اس آیۃ میں عذاب کے دفع ہونے کی نفی کا ذکر ہے۔تخفیف عذاب اور ہے، اور دفع عذاب کچھ اور ہے۔تخفیف کا ثبوت ہے، دفع کی نفی ،لھذا آیۃ کریمہ اور احادیث مبارکہ میں کوئی تعارض نہیں۔ (از نعیمی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ٥﴾

(آیۃ نمبر ۱۲)

(1) فرمادو کافروں سے کوئی دم جاتا ہے کہ تم مغلوب ہوگے، اور دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بہت ہی برا بچھونا۔

(2) فرمادو انہیں جنہوں نے کفر کیا، عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے تم جہنم کی طرف، اور برا ہے وہ ٹھکانا۔

طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

﴿سَتُغْلَبُوْنَ﴾ کا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بامحاورہ ترجمہ کیا ہے کوئی دم جاتا ہے کہ تم مغلوب ہوگے راقم نے "سین" کا لغوی معنیٰ تحریر کیا ہے عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے۔﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ میں "مهاد" کا معنیٰ اعلیٰ

حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے مطابق ہے (بچھونا) "ومھاد" کفراش لفظاو معنی "والمخصوص بالذم مقدر وھو جھنم" (روح المعانی)

"مھاد" کا وزن بھی فراش کی طرح ہے اور معنی بھی فراش (بچھونا) ہے مخصوص بالذم مقدر ہے وہ جہنم ہے اب مکمل مطلب یہ ہو گیا اور وہ بہت ہی برا بچھونا ہے وہ جہنم ہے۔ راقم نے "مھاد" کا معنی کیا ہے "ٹھکانا" چونکہ روح البیان میں یوں بیان کیا گیا ہے "وبئس المھاد ای بئس الفراش والمقر جھنم" برا ہے بچھونا اور برا ٹھکانا وہ جہنم ہے یوں سمجھئے کہ راقم کا ترجمہ ضیاء القرآن سے منقول ہے البتہ روح البیان کے دونوں تراجم سے ایک کے مطابق اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اور دوسرے کے مطابق راقم کا۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلباء کرام کو مختلف معانی یاد ہو جائیں اور وسعت علمی حاصل ہو جائے۔ (راقم)

شان نزول : (۱) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ بدر سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں جب واپس آئے تو آپ نے یہود کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کر کے فرمایا "یا معشر الیھود اسلموا قبل ان یصیبکم اللہ بما اصاب قریشا" اے یہود یو تم اسلام لے آؤ اس سے پہلے کہ تمہیں اللہ تعالی وہ مصیبت پہنچائے جو قریش کو پہنچائی۔

"فقالوا یا محمد لا یغرنک من نفسک ان قتلت نفرا من قریش کانوا اغمارا لا یعرفون القتال انک واللہ لو قاتلنا لعرفت انا نحن الناس وانک لم تلق مثلنا"

(اخرجہ محمد بن اسحاق عن عکرمۃ عن ابن عباس)

تو وہ کہنے لگے اے محمد تم دھوکے میں مبتلاء نہ ہو اگر تم نے قریش کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ناتجربہ کار تھے، جنگ کرنا نہیں جانتے تھے قسم ہے اللہ تعالی کی اگر تمہیں ہمارے ساتھ واسطہ پڑا تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم کتنے بہادر اور تجربہ کار ہیں، تم خود ہی کہو گے کہ ہمیں آج تک ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ان کی اس ڈینگ پر اللہ تعالی نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی کہ بظاہر تم اپنی بہادری اور تجربہ کاری کے دعوے کر رہے ہو لیکن جلدی ہو تمہیں مغلوب کر دیا جائے گا پھر تمہیں جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا وہی جہنم تمہارا ٹھکانا ہو گی یہ ٹھکانا برا ٹھکانا ہو گا۔ (ماخوذ از صابونی و ابن کثیر)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی یہ آیۃ کریمہ بدر کے واقعہ سے پہلے نازل ہوئی اس آیۃ کریمہ میں خطاب مشرکین مکہ کو ہے کہ عنقریب ہو جاؤ گے رب تعالی نے اپنے وعدہ کے مطابق مشرکین کو بدر میں مغلوب

کر دیا۔رسول اللہ ﷺ نے بدر میں مشرکین کو کہا"ان اللہ غالبکم و حاشرکم الی جھنم" بیشک اللہ تعالی تم پر غالب ہے اور وہ تمہیں جہنم کی طرف ہانکنے والا ہے۔ (خازن)

(۳) شان نزول کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ جب بدر میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو کامیابی حاصل ہوئی اور مشرکین کو شکست حاصل ہوئی تو مدینہ کے کئی یہود ایک دوسرے کو کہنے لگے "واللہ النبی الذی بشربہ موسی لا ترد لہ رایۃ وارادوا اتباعہ" قسم ہے اللہ تعالی کی یہی وہ آخری نبی ہیں جن کی بشارت موسی علیہ السلام نے اپنی ظاہری حیات میں دی تھی اسی لئے تو میدان جنگ میں کثیر تعداد دشمن کے مقابلہ میں ان کے جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دیا،ان میں سے کئے لوگوں نے ایمان لانے اور نبی کریم ﷺ کی اتباع کا ارادہ کرلیا دوسرے سال غزوہ احد میں صحابہ کرام شہید ہوئے اور زخمی ہوئے تو "وغلب علیھم الشقاء فلم یسلموا" ان پر بدبختی غالب آ گئی وہ اسلام نہ لائے ۔اور انہوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا وعدہ (کہ تمہارے ساتھ جنگ نہیں کریں اور تمہارے مخالفین کا ساتھ نہیں دیں گے) توڑ دیا، یہاں تک کہ کعب بن اشرف ساٹھ شخصوں کی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر مکہ مکرمہ میں گیا، تا کہ وہاں سے امداد طلب کر کے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) ختم کر دیا جائے ،تو رب تعالی نے نبی کریم ﷺ سے وعدہ کر دیا کہ بیشک یہ لوگ آپ کے خلاف جمع ہو جائیں گے،ایک دوسرے کی امداد کریں گے،لیکن مغلوب ہوں گے (شکست کھائیں گے)۔ (خازن)

جنگ احزاب میں سارے کفار جمع ہو کر نبی کریم ﷺ کو معاذ اللہ مٹانے کیلئے آئے لیکن ذلیل وخوار ہوئے۔یہ بھی ممکن ہے کہ تمام واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہو، پہلے صرف نبی کریم ﷺ کے دل میں القاء کیا گیا ہو،یعنی دل میں ڈال دیا گیا ہو۔

"ان ھذہ الآیۃ واردۃ فیجمع من الکفار باعیانھم علم اللہ تعالی انھم یموتون علی کفرھم ولیس فی الآیۃ مایدل علی انھم من ھم"

مختلف اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ تمام کفار کے متعلق نازل ہوئی ،اللہ تعالی کے علم مطابق تمام وہ کافر جن کی موت کفر پر آنی ہے،ان کو بتایا کہ وہ مغلوب ہوں گے۔(کبیر)

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ﴾ "فرما دو انہیں جنہوں نے کفر کیا،عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے"۔

(ستغلبون) البتۃ عن قریب فی الدنیا وقد صدق اللہ وعدہ بقتل بنی قریظۃ واجلاء بنی النضیر وفتح خیبر وضرب الجزیۃ علی من عداھم وھو من اوضح

شواھدالنبوۃ" (روح البیان)

مطلب یہ ہے کہ عنقریب دنیا میں تم یقیناً مغلوب ہو جاؤ گے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا فرمادیا کہ بنی نضیر کو جلاء وطن کر دیا گیا، بنی قریظہ کو قتل کر دیا گیا، اور خیبر فتح کرلیا گیا، اوران کے سواء باقی لوگوں پر جزیہ مقرر کر دیا گیا، یہ تمام واقعات نبی کریم ﷺ کی نبوت پر واضح دلائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو آپ نے بتادیا وہ ہو کر رہا۔

غیب انبیاء کرام کا معجزہ ہے:

(ستغلبون)اخبار عن امر یحصل فی المستقبل وقد وقع مخبرہ علی موافقتہ فکان ھذا اخبارا عن الغیب وھو معجز ونظیرہ قولہ تعالی غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من غلبھم سیغلبون"آلایۃ ونظیرہ فی حق عیسی علیہ السلام وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ کافروں کو کہہ دیجئے کہ ''عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے'' یہ مستقبل کی خبر ہے، جو واقع ہو کر رہی، یہ غیبی خبر ہے جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ اسی کی مثل سورۃ روم کی ابتداء میں جو مسلمانوں کی فتح ونصرت کی خبر دی گئی وہ بھی ثابت ہوئی، اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو یہ کہنا کہ ''میں تمہیں خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم گھروں میں ذخیرہ بنا کر آتے ہو۔ یہ سب ہی غیبی خبریں ہیں جو انبیاء کرام کا معجزہ ہیں۔ یعنی غیب کا اقرار معجزہ کا اقرار ہے، اور غیب کا انکار معجزہ کا انکار۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: ﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ ''تمہیں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔''

ان الفاظ مبارکہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ قیامت آنی ہے، حشر ونشر پایا جانا ہے۔ اور کافروں کو آگ کی طرف دھکیلا جانا ہے۔ (کبیر)

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ''اور برا ہے وہ ٹھکانا''۔

اللہ تعالیٰ نے جب یہ ذکر فرمایا کہ کافروں کو جہنم کی طرف ہانکا جائے گا تو اس کے بعد کافروں کے برے ٹھکانے کا ذکر فرمایا، کیونکہ 'بئس'' ماخوذ ہے ''باساء'' جس کا معنی ہوتا ہے شراور شدت، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ﴾ اور ہم نے ظالموں کو پکڑا سخت عذاب سے، یا ''برے عذاب سے''۔ (کبیر)

''مہاد'' کا معنی بچھونا بھی ہے، اور ٹھکانا بھی، پہلے تفصیلا بیان ہو چکا ہے۔

تشبیہ کا امکان:

اس آیۃ کریمہ میں بھی اس سے پہلی آیۃ کریمہ کہ طرح تشبیہ پائی گئی ہو،ایک تفسیر اس کے مطابق بھی ہے،

(قل للذین کفروا)بھذا الدین کفرکم به ککفر آل فرعون بموسی وقد فعل بقریش لکفرھم به مارأیتم فسیفعل بکم مافعل بھم"

(فرمادیجئے انہیں جنہوں نے کفر کیا) اس دین سے کہ تمہارا کفر بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ فرعون والوں نے موسی علیہ السلام سے کفر کیا،قریش کو کفر کی سزا (بدر میں) مل چکی ہے، جسے تم نے دیکھ لیا ہے،عنقریب تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جانا ہے جوان سے کیا گیا،یعنی تمہیں بھی شکست فاحش دی جائے گی،

(ستغلبون) کما غلبو وقد صدق الله وعده بقتل قریظة واجلاء بنی النضیر وفتح خیبر وسیفعل بکم ما فعل بآل فرعون آخر(و)ھو انکم(تحشرون الی جھنم)ولا تتخلصون بایام قلائل بل مھدت لکم علی الابد کما مھدت لھم(وبئس المھاد)لکم کما انھا بئس المھاد لھم اذکان کفرکم بآیات محمد علیہ السلام ککفرھم بآیات موسی" (تبصیر الرحمن)

عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے جیسا کہ آل فرعون مغلوب ہوئے، تحقیق اللہ تعالی نے اپنا وعدہ مکمل فرمادیا کہ بنی قریظہ کو قتل کرادیا، بنی نضیر کو جلاء وطن کر دیا،اور خیبر فتح کرادیا،اور عنقریب تمہارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو آل فرعون سے آخر کار کیا گیا،یعنی جس طرح انہیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیل دیا گیا ایسا ہی تمہیں بھی آگ کی طرف ہانک دیا جائے گا،اور تمہیں اس آگ سے چند دن کی بھی خلاصی نہیں ملے گی بلکہ جہنم ہمیشہ کیلئے تمہارا ٹھکانا ہوگی جیسا کہ آل فرعون کیلئے وہ ٹھکانا ہے،''اور یہ برا ٹھکانا ہے''یعنی جس طرح آل فرعون کیلئے جہنم برا ٹھکانا ہے،اسی طرح تمہارے لئے بھی جہنم برا ٹھکانا ہے،اسی کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا نبی کریم ﷺ کے معجزات اور آپ کی صداقت کی نشانیوں سے کفر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آل فرعون نے موسی علیہ السلام کی صداقت کی نشانیوں اور معجزات سے انکار کیا تھا۔

فائدہ: فقتل من فحول قریظة ستمائة حول الخندق وکان لھم علی بن ابی طالب"

خندق کے اردگرد قریظہ کے چھ سو بہادر آدمیوں کو قتل کر دیا گیا تھا، جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ (صاوی)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں قریظہ کے چھ سو بہادر آدمیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ۝﴾ (آیة نمبر ۱۳)

(1) بے شک تمہارے لئے نشانی تھی دو گرہوں میں جو آپس میں بھڑ پڑے ایک جتھا اللہ کی راہ میں لڑتا اور دوسرا کافر کہ انہیں آنکھوں دیکھا اپنے سے دونا سمجھیں، اور اللہ اپنی مدد سے زور دیتا ہے جسے چاہتا ہے، بیشک اس میں عقلندوں کیلئے ضرور دیکھ کر سیکھنا ہے۔

(2) تحقیق تھی تمہارے لئے نشانی دو گرہوں میں جو ایک دوسرے سے ملے، (لڑائی کیلئے) ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ کی راہ میں، اور دوسرا کافر تھا، وہ دیکھ رہے تھے انہیں اپنی دو مثل آنکھوں سے دیکھنا، اور اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے، اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے، بیشک اس میں عبرت ہے عقل والوں کیلئے۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیۃ کریمہ میں ایک شان نزول بیان کیا گیا ہے کہ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سرکردہ لوگوں کے قتل ہو جانے کے بعد مدینہ طیبہ لوٹ کر نبی کریم ﷺ نے یہود کو دعوت اسلام دی "ولکن اظھروا التمرد" لیکن انہوں نے سرکشی کو ظاہر کیا، اور اپنی طاقت اور تجربہ کاری کا ذکر کیا اور کہا کہ قریش ناتجربہ کار تھے، ہمارے ساتھ تمہیں واسطہ پڑا تو تمہیں سمجھ آجائے گا جنگ کسے کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ستغلبون" تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے۔

اب اس آیۃ کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ قریش مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کثیر تعداد میں تھا، لیکن "ان اللہ تعالی قھر الکفار و جعل المسلمین مظفرین منصورین، و ذلک یدل علی ان تلک الغلبۃ کانت بتایید اللہ و نصرہ" اللہ تعالیٰ نے کافروں پر قہر کیا اور مسلمانوں کو کامیاب کیا اور ان کو اپنی امداد سے نوازا، جس سے پتہ چل گیا کہ جنگ میں فتح اللہ تعالیٰ کی تائید اور امداد سے حاصل ہوتی ہے۔ (کبیر)

اسلحہ اور کثرت تعداد عارضی چیزیں ہیں، مسلمان جب اپنی قوت ایمانیہ اور رب تعالیٰ کی امداد سے جنگ کرتا ہے تو کفار

بفضلہ تعالیٰ مغلوب ہی ہوتے ہیں۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾

''تحقیق تھی تمہاری لئے نشانی دو گرہوں میں جو ایک دوسرے سے ملے (لڑائی کیلئے)''

(فئتین)فرقتین،واصلها افئی الحرب لان بعضهم الی بعض '' یعنی اصل میں ''فاء یفئی'' اورفاء یفو کا معنی ہے لوٹنا،لڑائی میں بعض لوگ بعض کی طرف لوٹتے ہیں،اس لئے گروہ،فرقہ،جماعت کو ''فـــــــئة'' کہتے ہیں۔''فئتین'' تثنیہ ہے،یعنی دو گروہ۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اور کبھی ''فأوت رأسه بالسيف'' اور کبھی ''فأيت رأسه بالسيف'' کہا جاتا ہے،جس کا معنی ہوتا ''فلقت رأسه بالسيف'' میں نے تلوار سے اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے،چونکہ لڑائی میں ہر فرقہ ایک دوسرے کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوتا ہے،اسلئے لڑائی میں ہر گروہ،ہر فرقہ کو ''فئة'' کہا جاتا ہے (قرطبی)

''التقتا'' یوم بدر للقتال جب وہ دونوں بدر کے دن ملے لڑائی کیلئے۔ (جلالین)

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ ''ایک گروہ لڑ رہا تھا اللہ کی راہ میں''

یعنی ایک گروہ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اللہ کے حکم سے لڑ رہا تھا،اس گروہ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے تھے۔

﴿وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ﴾ ''اور دوسرا کافر تھا''۔

اس جملہ کو جب ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ کے مقابل ذکر کیا تو اس سے پتہ چل گیا کہ یہ مختصر الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں ''واخرى كافرة يعنى تقاتل فى سبيل الطاغوت'' اور دوسرا گروہ کافر تھا جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ففيه شبه احتباک حيث حذف من كل نظير ما اثبته فى الآخر'' اس میں ''احتباك'' کے پائے جانے کا احتمال واشتباہ ہے۔یعنی دونوں جملوں سے مذکورہ کے مدمقابل کو حذف کیا گیا ہے۔اصل میں مطلب یہ ہے'' کہ ایک گروہ مؤمن تھا اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا،اور دوسرا کافر تھا جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ (صاوی)

اسی طرح طلباء کرام یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ﴾ میں "آیۃ" پر تنوین تعظیم کیلئے ہے اسی وجہ سے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "آیۃ" "ای علامۃ عظیمۃ" اس میں تمہارے لئے بہت بڑی نشانی، بری علامت ہے۔ (روح المعانی)

اور طلباء کرام یہ بھی خیال کریں کہ "کان" اور "آیۃ" کے درمیان "لکم" کا فاصلہ ہے، اسی لئے فعل مذکر ہے۔

نکتہ: (فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ) فھو فی اعلی درجات الایمان ولم یقل متومنۃ مد حالھم بما یلیق بالمقام ورمزا الی الاعتداد بقتالھم" (روح المعانی)

"ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے" یہ لوگ ایمان کے اعلی درجہ پر فائز تھے، ان کے متعلق "مؤمنۃ" کا لفظ نہیں ذکر کیا، جیسا کہ "واخری کافرۃ" میں دوسرے گروہ کو کافر کہا" اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان والوں کی اس میں کامل مدح پائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالی کی راہ میں لڑنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں وہ اعلی درجہ کے مؤمن ہیں، ان کا ایمان سب پر عیاں ہے۔

﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ "وہ دیکھ رہے تھے ان کو اپنی دو مثل آنکھوں سے دیکھنا"۔

وہ دیکھنے والے کون تھے اور دو مثل نظر آنے والے کون تھے؟ اس میں چار احتمال پائے گئے ہیں۔

(۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ مراد یہ ہو کہ "کافروں کا گروہ مسلمانوں کو اپنی تعداد کے دو مثل سمجھ رہا ہو، انہیں یہ دکھائی دے رہا ہو کہ مسلمان دو ہزار کے قریب ہیں، اس معنی کے لحاظ پر کافروں کے دلوں پر رعب طاری کر دیا گیا کہ مسلمان تو ہم سے دوگناہ ہیں، ہم ان سے کیسے مقابلہ کریں گے، وہ تو ہم سے کم تعداد میں بھی ہو تو ہمارے لئے خطرہ ہی خطرہ ہیں، جب تعداد میں زیادہ ہوں تو پھر ہم نے مرنا ہی ہے، اس کے بغیر اور کیا ہونا ہے۔

(۲) "والاحتمال الثانی ان الفئۃ الکافرۃ رأت المسلمین مثلی عدد المسلمین ستمائۃ ونیفا وعشرین"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ کافر مسلمانوں کو مسلمانوں کی تعداد کے دو مثل سمجھ رہے ہوں، کہ مسلمان تو تقریبا چھ سو پچیس، چھبیس کی تعداد میں ہیں۔ اس احتمال میں بھی کافروں کو مسلمان زیادہ کر کے دکھائے، وجہ اس میں بھی وہی جو ذکر کر دی گئی، یعنی "والحکمۃ فی ذلک انہ تعالی کثر المسلمین فی اعین المشرکین مع قلتھم لیھابوا فیحترزوا عن قتالھم" مسلمانوں کو کافروں کی آنکھوں میں زیادہ کر کے دکھانے میں حکمت یہ تھی کہ کافروں کے دلوں پر رعب طاری ہو جائے اور وہ لڑائی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔

اعتراض: یہ دونوں احتمال درست نظر نہیں آتے کیونکہ سورۃ انفال میں تو یہ ذکر ہے۔ "ویقللکم فی اعینهم" اور تمہیں ان کی نگاہوں میں تھوڑا کیا۔ اس آیۃ کریمہ سے تو واضح طور پر یہ سمجھ رہا ہے کہ کافر مؤمنوں کو تھوڑا دیکھ رہے تھے، پھر زیادہ دکھانے کا کیا مطلب؟

جواب: "انه کان التقلیل والتکثیر فی حالین مختلفین فقللوا اولاً فی اعینهم حتی اجترؤا علیهم،فلما تلاقوا کثرهم الله فی اعینهم صاروا مغلوبین"

قلیل تعداد میں دکھانا اور کثیر تعداد میں دکھانا دو مختلف حالتوں میں تھا، پہلے کافروں کو مسلمان تھوڑے دکھائے گئے تاکہ وہ لڑنے پر جرأت پیدا کرلیں کہ یہ تو تعداد میں تھوڑے ہیں، ہم ان کو جلدی ہی ختم کردیں گے۔ جب کافر اور مسلمان لڑنے کیلئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے تو کافروں کو مسلمان زیادہ تعداد میں دکھائے گئے تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر مغلوب ہو جائیں (انہیں شکست ہو جائے) پھر اللہ تعالیٰ کا ابتدائی طور پر کافروں کو مسلمانوں کی تعداد کم دکھانا اور آخر میں زیادہ دکھانا "ابلغ فی القدرة واظهار الآیة" رب تعالیٰ کی کامل قدرت پر دلالت کر رہا ہے اور اس کی نشانی کا کامل اظہار پایا گیا ہے۔

(۳) "والاحتمال الثالث ان الرائین هم المسلمون والمرئیین هم المشرکون فالمسلمون رأوا المشرکین مثلی المسلمین ستمائة وازید"

تیسرا احتمال یہ ہے کہ دیکھنے والے مسلمان ہوں، اور جن کی تعداد کو اپنی دومثل دیکھا ہو وہ کافر ہوں،

یعنی مسلمانوں نے کافروں کو چھ سو سے کچھ زائد مقدار میں دیکھا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا سے لڑنے کا حکم دیا ہے، یعنی ایک مسلمان دو کافروں سے مقابلہ کرے پیچھے نہ ہٹے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ﴾ اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے۔ جب مسلمانوں کو کافر مسلمانوں کی تعداد کی دومثل دکھائے گئے ہوں تو اس میں دو فائدے حاصل ہو گئے، ایک یہ کہ مسلمان سست نہیں ہوئے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم نے اپنے سے دوگنا سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ان کے دل میں خوف پیدا نہیں ہوا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم نے اپنی دومثل سے تو مقابلہ کرنا ہی ہے ان سے پیچھے تو ہم ہٹ ہی نہیں سکتے، دومثل سے لڑنا تو رب تعالیٰ کا حکم ہے۔

اعتراض: کافروں کی تعداد تو مسلمانوں سے تین گنا تھی، دوگنا وہ کیسے دکھائے گئے؟

جواب: دوگناہ دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان بہت زیادہ تعداد دیکھ کر خوف زدہ بھی نہ ہوں، اور مسلمانوں سے کم

تعداد نہ دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کافروں کو کم تعداد میں دیکھ کر جہاد میں سستی سے کام نہ لیں۔

(۴) "والاحتمال الرابع ان الرائین هم المسلمون وانهم رأوا المشركين على الضعف من عدد المشركين، چوتھا احتمال یہ ہے کہ دیکھنے والے مسلمان ہوں، اور انہیں نے مشرکوں کو ان کی اصل تعداد سے دوگنا دیکھا ہو، وہ سمجھ رہے ہوں کہ مشرکین دو ہزار کے قریب ہوں گے۔ لیکن اس احتمال کو ان الفاظ سے رد کیا گیا

"فهذا قول لايمكن ان يقول به احد، لان هذا يوجب نصرة المشركين بايقاع الخوف في قلوب المئومنين تنافي ذلك"

یہ قول درست نہیں اس لئے کہ اس قول کے مطابق تو مشرکین کی امداد ہوگی اور مؤمنین کے دلوں میں رعب ڈالا گیا ہوگا، حالانکہ آیہ کریمہ میں تو مؤمنین کو رب تعالیٰ کی طرف سے امداد حاصل ہونے اور کافروں کے مغلوب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اس آخری قول پر راقم کا موقف یہ ہے کہ اسے رد کرنے کی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کہ رب تعالیٰ نے مؤمنین کو مشرکین ان کی تعداد کی دو مثل دکھادئے ہوں اور ساتھ ساتھ جرأت بھی عطاء کردی ہو، ہر مؤمن یہی خیال کررہا ہو کہ بیشک یہ ہم سے تعداد میں چھ گنا ہیں لیکن ہم ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملادیں گے۔ بیشک رب تعالیٰ نے ایک مسلمان کو دو کافروں سے لڑنے کی اجازت تو فرمائی، لیکن رب تعالیٰ کا اس سے پہلے ارشاد یہ تھا ﴿وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب رہیں گے" (واللہ اعلم بالصواب)

ایک اور احتمال: اس احتمال کا تعلق دوسری قراءت سے ہے جس میں تاء سے "ترونهم" پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں خطاب یہود کو ہوگا، کیونکہ پہلے خطاب "انكم ستغلبون" یہود کو ہی ہے۔ "فيكون المراد ترون ايها اليهود المشركين مثلي المئومنين في القوة والشوكة" اب مطلب یہ ہوگا کہ "اے یہود یو تم مشرکوں کو مؤمنوں کے مقابل تعداد میں، قوت میں، دبدبہ میں دو مثل دیکھ رہے ہو، لیکن کامیابی اسے ہی حاصل ہوتی ہے جسے رب تعالیٰ کی طرف سے امداد حاصل ہوتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک یہ تمام اقوال مجتمع ہوسکتے ہیں، یوں بیان کر کے دیکھا جائے، یہود جو دور سے مؤمنین اور مشرکین کو دیکھ رہے تھے وہ مشرکوں کی تعداد زیادہ دیکھ کر خوش ہورہے تھے کہ مؤمن مغلوب ہوجائیں گے، ان کا رد کیا کہ کامیابی

اللہ تعالیٰ کی نصرت سے حاصل ہوگی۔مشرکین نے ابتدائی طور پر مسلمانوں کو مسلمانوں کی تعداد کے دوگنا سمجھ کر جرأت وبہادری دکھائی، عین جنگ کے موقع میں ان کو مسلمان اپنے سے دوگنا دکھائی دینے لگے اس طرح وہ خوف زدہ اور بزدل ہوکر مغلوب ہو گئے۔مؤمنین کو ابتدائی طور پر مشرکین اپنے سے دوگنا دکھائی دیئے،مؤمنین نے سمجھا کہ ایک دو کا مقابلہ ہے،لیکن بعد میں مؤمنین نے مشرکین کو مشرکین کی دومثل سمجھ کر جرأت وبہادری سے مقابلہ کیا،کفار کو ذلیل وخوار کردیا،اس طرح کافر مغلوب ہو گئے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

اصل ان احتمالات کی وجہ ضمائر کے مرجع کی وجہ سے ہے، کہ ضمائر کے مراجع کیا ہیں،﴿یَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ﴾ میں تین ضمیریں استعمال ہوئی ہیں،ایک واؤ ضمیر،دوسری ''یرونهم'' میں ''هم'' ضمیر منصوب متصل،اور تیسری ''مثليهم'' میں ''هم'' ضمیر مجرور متصل۔

(۱) جب واؤ ضمیر کفار کی طرف لوٹے،اور منصوب اور مجرور کی دونوں ضمیریں مؤمنین کی طرف لوٹیں،تو معنی یہ ہوگا،وہ کفار مؤمنین کو مؤمنین کی دومثل دیکھ رہے تھے۔

(۲) جب واؤ ضمیر کفار کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر مؤمنین کی طرف اور مجرور ضمیر کفار کی طرف لوٹے،تو معنی یہ ہوگا ''وہ کفار مؤمنین کو اپنی دومثل دیکھ رہے تھے''۔

(۳) جب واؤ ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر کفار کی طرف لوٹے اور مجرور ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے،تو معنی یہ ہوگا ''وہ مؤمنین کفار کو اپنی دومثل دیکھ رہے تھے''۔

(۴) جب واؤ ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹے اور منصوب ضمیر اور مجرور ضمیر کفار کی طرف لوٹیں،تو معنی یہ ہو گا ''مؤمنین کفار کو کفار کی دومثل دیکھ رہے تھے۔ (ماخوذ از صاوی)

واقعہ بدر عظیم نشانی کیسے؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں،جن سے اس واقعہ کا عظیم نشانی سمجھ آنا واضح ہے۔

پہلی وجہ: ان المسلمين كان قد اجتمع فيهم من اسباب الضعف عن المقاومة امور''
مسلمان کو کفار کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ضعف کے چند اسباب حاصل تھے،باوجود ضعف کے مسلمانوں کو فتح حاصل

ہونا اور کفار کو شکست حاصل ہونا بہت بڑی نشانی ہے۔

وہ اسباب ضعف کیا تھے: اسباب ضعف یہ تھے (۱) مسلمان کم تعداد میں تھے، اور کفار زیادہ تعداد میں تھے۔ کفار بدر میں ایک ہزار کے قریب تھے، نو سو سے زیادہ تھے اور ہزار سے کچھ کم تھے، اس وقت کسور کو بیان نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے کہیں کفار کی تعداد ایک ہزار بیان کی گئی، اور کہیں نو سو بیان کر دی گئی۔ بعض اوقات کسور کو بیان کر دیا جاتا تھا، اس لئے ساڑھے نو سو کا ذکر بھی ملتا ہے۔ (کبیر بزیادۃ)

مسلمان ان کے مقابل تین سو تیرہ تھے۔ ستتر (۷۷) مرد مہاجرین، اور دو سو چھتیس (۲۳۶) مرد انصار سے تھے۔ مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی ﷺ کے پاس تھا اور انصار کا جھنڈا عبادہ بن صامت کے پاس تھا۔
(معالم التنزیل للبغوی)

کفار کے رئیس عتبہ بن شیبہ، ربیعہ بن عبد الشمس، ابو سفیان اور ابو جہل وغیرہ تھے۔ (روح البیان)

(۲) "ومنها انهم اخرجوا غير قاصدين للحرب فلم يتاهبوا" اسباب ضعف میں سے اور یہ تھا کہ مسلمان جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے اور نہ ہی جنگ کی انہوں نے کوئی تیاری کی ہوئی تھی۔ (کبیر)

کیونکہ مسلمان صرف ایک قافلہ کی سرکوبی کیلئے نکلے تھے، اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ وہ قافلہ ابو سفیان کی زیر قیادت تجارت کیلئے گیا ہوا تھا جس نے بدر سے گذرنا تھا، اور تجارتی نفع تمام کا تمام مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں خرچ کرنا تھا، اس لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمایا، اور رب تعالیٰ کے حکم سے ہی آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ چلو قافلہ کو روکنا ہے۔ (بدر کا تفصیلی واقعہ چوتھے پارہ ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا)

(۳) "ومنها قلة السلاح والفرس" اور اسباب ضعف میں سے یہ تھا کہ مسلمانوں کے بہت ہی تھوڑے ہتھیار کے پاس ستر اونٹ تھے، اور دو گھوڑے، ایک گھوڑا حضرت مقداد بن عمرو ﷺ کا تھا، اور دوسرا گھوڑا حضرت مرثد بن ابی مرثد ﷺ کا تھا، زیادہ حضرات پیدل ہی تھے۔ اور مؤمنین کے پاس صرف چھ زرہ اور دو تلواریں تھیں، (باقیوں کے پاس کھجور کی چھڑیاں تھیں) کافروں کے پاس ایک سو گھوڑے تھے، ہر شخص مسلح تھا، پھر کافروں کو شکست ہونا اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کے فضل سے تھا اس لئے یہ بہت بڑی نشانی ہے۔ (از معالم التنزیل للبغوی)

(۴) "ومنها ان ذلك ابتداء غارة في الحرب لانها اول غزوات رسول الله ﷺ"

اسباب ضعف میں اور یہ تھا کہ مسلمانوں کی یہ پہلی جنگ تھی، جنگی تجربہ نہیں تھا، لیکن مسلمانوں کو بہت بڑی کامیابی کا حاصل ہونا بہت بڑی نشانی ہے۔ کافر مسلمانوں کے مقابل تعداد میں زیادہ تھے۔ وہ جنگ کی تیاری کر کے آئے

تھے۔ان کے پاس ہتھیار اور گھوڑے زیادہ مقدار میں تھے۔وہ لوگ جنگ کے ماہر تھے،کئی مرتبہ لڑائیاں کر چکے تھے۔ان اسباب کے ہوتے ہوئے،یعنی مسلمانوں کو اسباب ضعف حاصل تھے،اور کافروں کو اسباب قوت حاصل تھے لیکن مسلمانوں کو ہی فتح حاصل ہوئی،یہ بہت بڑی نشانی تھی۔"ولما کان خارجاعن العادۃ کان معجزا" جب یہ عادت کے خلاف تھا،ظاہری اسباب کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا،صرف نبی کریم ﷺ کی دعاءاور برکت سے اتنی بڑی کامیابی ہونا درحقیقت نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا۔

دوسری وجہ: نبی کریم ﷺ نے جنگ سے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ اللہ تعالی مؤمنین کو فتح نصیب کرے گا اور قریش کو شکست دے گا،اور ساتھ ساتھ زمین پر نشان لگا کر بتا دیا تھا"ھذا مصرع فلان"ھذا مصرع فلان" یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے۔

"فلما وجد مخبر خبرہ فی المستقبل علی وفق خبرہ کان ذلک اخبارا عن الغیب فکان معجزا"

جب نبی کریم ﷺ کی مستقبل کی خبر مکمل طور پر سچی ثابت ہوئی تو یہ بہت بڑی نشانی ہے اور نبی کریم ﷺ کی غیبی خبر کا کامل طور پر سچا ہونا آپ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

سبحان اللہ! علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب مصطفے کریم ﷺ کا علم غیب ثابت کیا ہے، بلکہ واضح کر دیا آپ کا علم غیب آپ کا معجزہ ہے،آپ کے علم غیب کا انکار آپ کے معجزہ کا انکار ہے،اور اللہ تعالی کے نبی کریم ﷺ معجزہ کا انکار دراصل نبوت کا انکار ہے۔ (راقم)

تیسری وجہ: کہ واقعہ بدر بہت بڑی نشانی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا﴿یَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ وہ ان کو اپنی دومثل دیکھ رہے تھے آنکھوں سے دیکھنا۔

"والاصح فی تفسیر ھذہ الآیۃ ان الرائین ھم المشرکون والمرئیین ھم المؤمنون"

اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ بیشک دیکھنے والے مشرک تھے جو مؤمنوں کو دیکھ رہے تھے،دومثل سے مراد دو احتمال ہیں،ایک یہ کہ مشرک مسلمانوں کو اپنی دومثل سمجھ رہے تھے،یعنی دو ہزار کے قریب۔اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ مشرکین مسلمانوں کو مسلمانوں کی دومثل سمجھ رہے تھے،یعنی چھ سو کے قریب۔مشرکین کے دلوں میں خوف ڈال دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں دیکھ کر ڈر رہے تھے"وذلک معجز" یہ بھی نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

چوتھی وجہ: اللہ تعالی نے مسلمانوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی،جس کی وجہ سے

مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، اس لحاظ پر یہ بہت بڑی نشانی ہے۔ (از کبیر)

﴿رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ ''آنکھوں سے دیکھنا۔''

''نصب علی المصدر یعنی رؤیة ظاهرة مکشوفة لالبس فیها معاینة کسائر المعاینات'' (روح البیان)

مصدریت کی وجہ سے ''رای'' پر نصب ہے۔ یعنی مفعول مطلق ہے، جس کا معنی ہے، دیکھنا، واضح منکشف ہونا۔ اب مطلب یہ ہوگیا (وہ انہیں دومثل دیکھ رہے تھے آنکھوں سے دیکھنا، یعنی ان پر دومثل واضح اور ظاہر تھیں، کسی قسم کا اس معاینہ میں اشتباہ نہیں تھا، نہ ہی وہ کسی چیز سے خلط ملط تھا۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے''۔

''یؤید ای یقول'' یعنی ''یؤید'' کا معنی طاقت دینا، تقویت پہنچانا، مضبوط کرنا، زور پہنچانا، زور دینا۔ ''بنصرہ'' اپنی مدد سے ''من یشاء'' جسے چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اشیاء (چیزوں) کو اسباب پر مرتب فرمایا ہے، لیکن بعض اوقات اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرماتا ہے، بغیر اسباب کے اپنی نعمتیں عطاء فرماتا ہے۔

''(بنصرہ من یشاء) ای یرید من غیر توسیط الاسباب العادیة کما اید الفئة المقاتلة فی سبیله''

اللہ تعالیٰ طاقت پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے، یعنی بغیر اسباب عادیہ کے طاقت پہنچاتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کی امداد فرمائی کہ قلیل تعداد والوں کی بے سروسامانی میں امداد فرمائی کہ کافروں کے دلوں میں رعب وخوف ڈال دیا۔ فرشتوں سے مسلمانوں کی امداد کی، کفار کو شکست فاش دی۔ (از روح البیان)

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ ''بیشک اس میں عبرت ہے عقل والوں کیلئے''

''ذلک'' کا اشارہ ہے، ''قلیل کو کثیر دکھانے'' کی طرف، یعنی عقل والوں کو اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قلیل تعداد والوں کو کثیر کر کے دکھایا، اور قلیل تعداد والوں کو کثیر تعداد پر فتح عطاء کی، نا تجربہ کاروں کو جنگی ماہرین پر فتح عطاء کی، جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے ان سے ہتھیاروں والوں کو شکست دلادی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم کامیابی حاصل ہوئی، اور اس میں عقل والوں کیلئے عبرت ہے۔

''عبرة'' اور ''عبور'' کا ایک ہی معنی ہے ''گذرنا'' جیسا کہ ''جلسة'' اور ''جلوس'' کا ایک ہی معنی ہے ''بیٹھنا'' عبر کا معنی ہے ''نصیحت پکڑنا'' اس میں بھی ''کسی کام سے گذر کر نصیحت حاصل کی جاتی

ہے،لھذا ''گذرنے والا معنی'' نصیحت پکڑنے، میں موجود ہے۔

''لاولی الابصار''لذوی العقول والبصائر''یعنی''اولی الابصار''کا معنی ہے''عقل وبصیرت رکھنے والے''

تنبیہ: ''فعلی العاقل ان یعتبر بالآیات ولایغتر بکثرة الاعدادمن الاموال والاولاد وعدم اجتہادہ لمعادہ فان اللہ یمتعہ قلیلا ثم یضطرہ الی عذاب غلیظ''

عقل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے عبرت پکڑیں، مال اور اولاد کی کثرت پر ناز نہ کریں بلکہ قیامت کیلئے تیاری کریں، اس لئے کہ جو قیامت کی تیاری نہیں کرتے، صرف دنیا کے مال ودولت پر فخر کرتے ہیں، انہیں رب تعالیٰ دنیا میں کچھ دیر کیلئے مہلت دے دیتا ہے، لیکن قیامت میں انہیں شدید عذاب دے گا، بلکہ بعض اوقات دنیا میں بھی انہیں عذاب میں مبتلاء کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص کفر میں مبتلاء ہوتا ہے وہ ازلی طور پر بد بخت ہوتا ہے، اس پر خواہشات، نفس، شیطان اور دنیا کی لذتوں کا غلبہ ہوتا ہے، جب اس پر خواہشات اور نفس کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اس کافر کو''اسفل السافلین''میں پہنچادیتے ہیں۔

''فیعیش فیھا ثم یموت علی ماعاش فیہ ویحشر علی مامات علیہ فی قعر جھنم وبئس المھاد''

وہ کافر رب تعالیٰ سے دوری کی ذلت میں زندگی بسر کرتا ہے، پھر اسی پر وہ مرجاتا ہے، پھر اسے جہنم کے گہرے گڑھے میں پہنچادیا جاتا ہے، یہ اس کا برا ٹھکانا ہے۔ (روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آیۃ نمبر ۱۴)

(1) لوگوں کیلئے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتوں اور بیٹے اور تلے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی یہ جیتی دنیا کی پونجی ہے، اور اللہ تعالی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا۔

(2) آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی یعنی عورتوں اور بیٹوں کی اور کثیر مال جمع کیا ہوا یعنی سونے اور چاندی کی اور خوبصورت گھوڑوں کی اور چوپاؤں اور کھیتی کی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا، اور اللہ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں بدر کا ذکر فرمایا، جس سے واضح ہو رہا تھا کہ کفار اپنے مال و دولت اور اپنی اولاد اور ظاہری اسباب پر سہارا لگائے ہوئے تھے، لیکن مؤمنین رب تعالی پر بھروسہ کئے ہوئے تھے، فتح ان کو ہی حاصل ہوئی جن کا سہارا اللہ پر تھا اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کیلئے خواہشات کی محبت مزین (آراستہ) کر دی گئی، یعنی لوگوں کی عورتوں اور بیٹوں سے محبت کو مزین کر دیا گیا، اور لوگوں کی کثیر جمع ہوئے مال یعنی سونے اور چاندی سے محبت کو آراستہ کر دیا گیا، اور لوگوں کیلئے خوبصورت گھوڑوں اور چوپاؤں اور کھیتی سے محبت کو آراستہ کر دیا گیا لیکن یہ سب دنیا کا سامان ہے اصل یہ ہے کہ رب تعالی کو راضی کیا جائے اسی پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ اسی کے ہاں حاضر ہونا ہے اور اسی نے اجر و ثواب عطاء کرنا ہے اور اسی کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ ''آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی۔''

آراستہ کرنے والا کون ہے؟ یعنی ''زین'' کا فاعل کون سا ہے؟ اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ اس کا فاعل اللہ تعالی ہے، کیونکہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ

عَمَلًا﴾ بیشک ہم نے بنایا جو کچھ زمین پر ہے اس کیلئے زینت، تا کہ ہم ان کو آزمائیں، کون سا ان میں اچھے عمل کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالی نے خواہشات کی محبت کو آراستہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود لوگوں کا امتحان ہے کہ زوجہ بھی حاصل ہو اور بیٹے بھی، اور سونے اور چاندی کا کثیر مال بھی جمع ہو، اور خوبصورت گھوڑے بھی حاصل ہوں، اور چوپائے اور کھیتی بھی حاصل ہو، تو پھر دیکھا جائے کہ ان چیزوں سے کوئی شخص محبت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالی سے دور ہو جاتا ہے، یا کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالی کو یاد کرتا رہتا ہے، اور اچھے عمل کرتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "زین" کا فاعل شیطان ہے، یعنی شیطان نے ان چیزوں کو لوگوں کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے کہ وہ ان چیزوں سے محبت کرنے کی وجہ سے رب تعالی سے دور ہو جائیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ اور آراستہ کیئے ہیں ان کیلئے شیطان نے ان کے اعمال۔ (ماخوذ از روح البیان)

دونوں قولوں میں خوبصورت محاکمہ:

"ویصح اسناد التزیین الی اللہ تعالی بالایجاد و التھیئة للانتفاع و نسبته الی الشیطان بالوسوسة"

مزین کرنے آراستہ کرنے کی نسبت اللہ تعالی کی طرف اس لحاظ پر ہے کہ ہر چیز کا خالق وہی ہے اور ہر چیز کو نفع مند اسی نے بنایا ہے، یعنی اللہ تعالی نے خواہشات کی محبت کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔ اور شیطان کی طرف نسبت اس طرح کرنی صحیح ہے کہ وہ ان چیزوں کی محبت کو آراستہ کر کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، اور لوگوں کو رب تعالی سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"حب الشہوات" ذکر شہوات کا ہے اور مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش کی جائے۔ اس طرح کا استعارہ عام طور پر پایا جاتا ہے جیسا کہ "قدرۃ" ذکر کر کے مراد "مقدور" لیا جاتا ہے اور "رجاء" ذکر کر کے مراد "مرجو" لیا جاتا ہے اور "علم" ذکر کر کے مراد "معلوم" لیا جاتا ہے۔ "یقال ھذہ شھوۃ فلان" ای مشتھاہ" عام طور پر کہا جاتا ہے یہ فلاں شخص کی شہوت ہے، یعنی یہ چیز فلاں کی پسندیدہ ہے اس چیز کی طرف اس کی خواہش پائی جاتی ہے۔

اس استعارہ میں (ذکر شہوت مراد مشتہاۃ) دو فائدے ہیں، **ایک فائدہ** یہ ہے کہ عین چیزیں جن کی خواہش پائی جاتی ہے، ان کو خواہش سے ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں کی انہیں بہت خواہش ہوتی ہے، اور ان کے یہ بہت حریص ہیں کہ ہم ان سے نفع اٹھائیں۔ **دوسرا فائدہ** یہ حاصل ہوا کہ حکماء کے نزدیک شہوت گھٹیا

اور رزیل صفت ہے، شہوت (خواہش) کے پیچھے ہی چلنا مذموم (برا) فعل ہے، کیونکہ صرف خواہشات کی پیروی چوپاؤں کا کام ہے۔ یہاں مشتہاۃ چیزوں (جن چیزوں کی خواہش کی جائے) کو "شھوت" سے تعبیر کر کے ان سے نفرت دلائی گئی ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کو راضی رکھا جائے، صرف خواہشات کے پیچھے چل کر انسان اپنے آپ کو چوپاؤں سے کیسے ممتاز کر سکتا ہے (ماخوذ از کبیر)

متکلمین کا استدلال:

متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ محبت اور شہوت، دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں کیونکہ "حب" اور "شھوات" میں اضافت پائی گئی ہے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرت پائی جاتی ہے، تو پتہ چلا کہ "حب" اور چیز ہے، اور "شھوت" اور چیز ہے۔ خواہش کی نسبت اللہ تعالی کی طرف زیادہ طور پر پائی جاتی ہے، کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شہوت کو پیدا کیا اس ظاہری نسبت کی وجہ سے ہی یوں کہہ لیا جاتا ہے "والشھوة من فعل الله" شہوت اللہ کے افعال سے ہے۔ اور محبت بھی اگر چہ رب تعالی کی ہی تخلیق ہے، لیکن بظاہر بندوں کی طرف یہ زیادہ طور پر منسوب ہوتی ہے، اسلئے کہا جاتا ہے "والمحبة من افعال العباد" محبت بندوں کے افعال سے ہے۔

"وهی عبارة عن ان یجعل الانسان کل غرضه وعیشه فی طلب اللذات والطیبات"
محبت کا بندوں کی طرف منسوب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بندہ اپنی محبت سے ہر غرض اور زندگی کی گزران کے ہر شعبہ میں لذتوں اور پسندیدگی کو طلب کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

حکماء کی خوبصورت بحث:

"قالت الحکماء" "الانسان قد یحب شیئا ولکن یحب ان لایحبه" حکماء حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ انسان کبھی کسی چیز سے محبت کرتا ہے، لیکن وہ یہ بھی چاہتا ہے کاش کہ اس سے میری محبت نہ ہو۔ جیسا کہ مسلمان کبھی حرام چیزوں کی طرف میلان کرتا ہے، بظاہر اسکی ان حرام چیزوں سے محبت ہوتی ہے "ولکنه یحب ان لایحب" لیکن چاہتا وہ یہی ہے کہ کاش ان حرام چیزوں سے میری محبت نہ ہو۔ یہ محبت حقیقت میں محبت نہیں، وہ اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے بظاہر گناہوں سے محبت کر رہا ہے، لیکن وہ گناہوں سے دور رہنے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔

"واما من احب شیئا واحب ان یحبه فذاک هو کمال المحبة" ایک چیز سے محبت ہو، اور تمنا بھی یہی ہو کہ میری محبت اس سے برقرار رہے، بس یہی کام محبت ہے۔ "فان کان ذلک فی جانب الخیر فهو

کمال السعادۃ'' اگر کامل محبت نیکیوں سے ہو، یعنی نیکیوں سے وہ محبت رکھتا ہے، اور اس کی تمنا بھی یہ ہے کہ اس کی نیک کاموں سے محبت برقرار رہے تو یہ کامل سعادت (نیک بختی) ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ﴿فَقَالَ اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ﴾ تو سلیمان نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آتی ہے اپنے رب کی یاد کیلئے۔ ''ومعناہ احب الخیر واحب ان اکون محبا للخیر'' معنی اس کا یہ ہے کہ آپ نے کہا میں اس بہتر مال سے محبت کرتا ہوں اور چاہتا بھی ہوں یہی ہوں کہ اس بہتر مال سے محبت کرتا ہی رہوں، کیونکہ گھوڑے جہاد میں کام آنے والے ہیں، تو آپ کی یہ محبت کامل محبت تھی۔

اگر محبت کا تعلق شر (برائیوں) سے ہو، تو وہی محبت بدبختی ہے، جیسا کہ اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے ''زین للناس حب الشھوات'' یہاں بھی بری خواہشات ہی مراد ہیں کہ ان سے محبت بری ہے اور بدبختی ہے، ورنہ اچھی اور نیک خواہشات سے محبت کس طرح بری ہوسکتی ہے؟ یقیناً وہ اچھی ہوگی، بری نہیں ہوگی۔ (از کبیر)

محبت راسخہ کا دل سے زوال ممکن نہیں:

جب شہوت (خواہش) میں تین چیزیں پائی جائیں تو وہ محبت شدید قوی ہو جاتی ہے ''ولا یکاد ینحل الابتوفیق عظیم من اللہ تعالی'' اس درجہ کی محبت کا زوال سوائے اللہ تعالی کی عظیم توفیق کے ممکن نہیں۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

(۱) جن چیزوں کی طرف خواہش کی جاسکتی ہو ان کی خواہش بھی پائی جائے۔

(۲) ان چیزوں کی خواہش سے انسان محبت بھی رکھتا ہو یعنی ایسا نہ ہو کسی چیز کی خواہش بھی ہو اور دل میں اس کی محبت نہ ہو، بلکہ دل چاہتا ہو کہ کاش یہ چیز مجھے حاصل نہ ہوتی۔

(۳) وہ انسان اپنی خواہش والی چیز سے محبت کو حسین اور فضیلت والا سمجھے۔

''انہ یعتقد ان تلک المحبۃ حسنۃ وفضیلۃ'' یعنی جس چیز کے حصول کی تمنا اور محبت پائی جائے وہ اچھی ہو یا بری ہو لیکن انسان کا عقیدہ یہ ہو کہ یہ اچھی خواہش محبت ہے، اس کے حاصل کرنے میں تو بہت فضیلت پائی گئی ہے۔ (از کبیر)

جسمانی لذتوں کی طرف زیادہ میلان کیوں؟

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لذیذ چیزوں کی دو قسمیں ہیں، ایک جسمانی، دوسری روحانی۔ جسمانی لذیذ چیزیں ہر شخص کو ابتدائی طور پر پیدائش کے وقت سے ہی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ روحانی لذیذ چیزیں بہت کم شخصوں کو

حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر خصوصی فیضان باری تعالی ہوتا ہے۔

"ثم ذلک الانسان انما یحصل له تلک اللذة الروحانية بعد استئناس النفس باللذات الجسمانية"

پھر وہ انسان جو روحانی لذتیں حاصل کرتا ہے، اسے بھی پہلے جسمانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں، کیونکہ ہر انسان خواہ کتنا ہی نیک اور متقی ہو اسے نفس سے انس ہوتا ہی ہے۔

یوں سمجھا جائے کہ جسمانی لذتیں "ملکہ" کی حیثیت میں ہوتی ہیں، "ملکہ" وہ کیفیت جو پختہ ہو، اور راسخ ہوں، وہ زائل نہیں ہوتیں بلکہ وہ عادت کے درجہ میں ہوتی ہیں "وانجذاب النفس الی اللذات الروحانية كالحالة الطارئة التي تزول بادنى سبب" نفس کا روحانی لذتوں کی طرف کھنچنا "حالة طارئة" کی طرح ہوتا ہے، (یعنی وہ کیفیت جو کبھی کبھی حاصل ہو وہ حالت "حالة طارئة" کہلاتی ہے) جو معمولی سبب سے زائل ہو جاتی ہے۔

"فلا جرم كان الغالب على الخلق انما هو الميل الشديد الى اللذات الجسمانية"

یقیناً مخلوق پر غالب طور پر جسمانی لذتوں کی طرف ہی زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔

روحانی لذتوں کی طرف میلان بہت ہی کم، خوش بخت لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اور ان کو بھی کبھی کبھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جسمانی لذتوں کی طرف توجہ اور خواہش ہر شخص کی ہوتی ہے، کسی کی توجہ زیادہ اور کسی کی توجہ کم۔ (ماخوذ از کبیر)

جنت کا حصول مشکل اور جہنم کا آسان:

❁ عن انس عن النبی ﷺ حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات" (مسلم)

حضرت انس ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کو مشکلات سے ڈھانپ دیا گیا اور جہنم کو خواہشات سے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جنت کا حصول سوائے مشکلات کے جنگل کے طے کرنے اور ان مشکلات پر صبر کرنے کے سوا نہیں۔

وجہ واضح ہے کہ بظاہر نیکی کے کام مشکل نظر آتے ہیں، نماز ہو یا زکوۃ، روزہ ہو یا حج، قربانی ہو یا دوسرے صدقات واجبہ، سب ہی انسان کی طبیعت میں مشکل چیزیں ہیں، ان پر عمل کرنا انسان کی طبیعت کے بظاہر خلاف نظر آتا ہے، اور یہی چیزیں ہیں جن پر عمل کرنے کی وجہ سے جنت میں جانا نصیب ہوگا،

حاصل کلام یہ ہے کہ مومن شخص نیکی کے کاموں کے ظاہری مشکلات کو برداشت کر کے نیکی کے کام کرے اور اپنے لئے جنت کی راہ آسان کرے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالی کے فضل کی دعاء بھی کرتا رہے، حقیقی کامیابی اللہ تعالی کے فضل سے حاصل ہوتی ہے اور آگ کو حاصل کرنا آسان ہے کہ انسان خواہشات کی پیروی کرے، حرام کو حلال سمجھے تو وہ کافر ہو

جائے گا یہی راہ ہے جہنم میں جانے کی۔ "العیاذ باللہ من النار" "وان النار لا ینجی منھا الا بترک الشھوات وفطام النفس عنھا" آگ سے نجات اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک ان خواہشات کو نہ چھوڑ دے جو اسے حرام کاموں کا مرتکب بنا دیتی ہیں اور حرام کو حلال سمجھنے کی طرف لے جاتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اپنے نفس کو ان چیزوں سے ہٹا لے۔

❁ "روی عنه ﷺ انه قال طریق الجنة حزن بربوة وطریق النار سھل بسھوة"
نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا جنت کی راہ سخت گھائیوں کو عبور کرنا ہے اور جہنم کی راہ آسان نرم زمین کو عبور کرنا ہے۔

"حزن" (حاء پر فتح اور نون ساکن) سخت جگہ، اور "ربوة" بلند جگہ، دونوں لفظوں کا مجموعی معنیٰ "سخت بلند جگہ" (سخت گھائیاں) "السھل" آسان "السھوة" نرم مٹی والی زمین، "سھل بسھوة" کا مجموعی معنیٰ "آسان نرم زمین" کو عبور کرنا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جنت کی راہ مشکل اور بلند گھاٹیوں کو عبور کرنے کے مترادف ہے۔ اور جہنم کی راہ آسان ہے اس میں کوئی مشکلات نہیں، کوئی رکاوٹ، کوئی پابندی نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

اعتراض: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ میں تو انبیاء کرام بھی داخل ہو جائیں گے، کیونکہ "الناس" تو سب لوگوں کو شامل ہے، حالانکہ "والانبیاء مع انھم معصومون من ذلک" انبیاء کرام شہوات نفسانیہ وغیرہ میں مبتلاء ہونے سے پاک ہیں، تو مطلقاً "الناس" ذکر کرنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: "انه عام مخصوص بما عدا [illegible] واما ھم فھم معصومون من المیل الی ماسوی اللہ" کہ اس مقام میں "الناس" کی عمومیت سے انبیاء کرام کو خارج کیا ہوا ہے، ان کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے سواء اور چیزوں کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ شہوات کی زیب و زینت کو دیکھ کر ان سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے، لیکن انبیاء کرام تو ہر وقت رب تعالیٰ کی طرف مشغول رہتے ہیں، ان کے غافل ہونے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "حبب الی من دنیا کم ثلاث" مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں۔ لیکن یہ ارشاد نہیں فرمایا "من دنیانا" مجھے اپنی دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں۔

واضح ہوا کہ عام لوگوں پر دنیا غالب رہتی ہے جو غفلت کا سبب بنتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دنیا کم" تمہاری دنیا، یعنی تم پر غالب آنے والی دنیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ پر دنیا غالب نہیں تھی، بلکہ آپ دنیا پر غالب تھے، اسی وجہ سے آپ نے اپنی طرف دنیا کو منسوب نہیں فرمایا۔ ایک اور حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا

ارشادگرامی ہے"لست من الدنیا و لاالدنیا منی"نہ میں دنیا سے ہوں اور نہ دنیا مجھ سے۔یعنی دنیا سے مجھے اتنی محبت نہیں کہ وہ مجھے رب تعالی سے دور کردے،اور دنیا مجھ پر چھا جانے والی نہیں۔اگر دنیا مجھ پر غالب آسکتی تو مجھ سے محبت کرتی،جب وہ مجھ پر غالب نہیں ہوسکتی تو اسے مجھ سے محبت بھی نہیں۔ (ماخوذ از صاوی)

شہوات سے کون سی محبت بری ہے؟

(زین للناس)فرجح عند نفوسهم علی مقتضی العقل من الابصار(حب الشهوات)

ای المیل الی اخذها لتنجز ها مع الجهل بعواقبها. (تبصیر الرحمن)

شہوات سے وہ محبت بری ہے جس کی ظاہر زیب وزینت انسان کی عقل پر غالب آجائے،وہ انجام کو نہ دیکھے،یعنی اس کے برے انجام پر نظر کرنے کے بغیر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اسی سے واضح ہوگیا کہ شہوات سے محبت جب تک رب تعالی سے سے غافل نہ کرے،انجام برا نہ ہو تو وہ جائز ہے۔ (راقم)

"(زین للناس)کلام مستانف سیق لبیان حقارة شان الحظوظ الدنیویة باصنافها وتزهید للناس فیها وتوجیه رغبا تهم الی ما عنده تعالی"(تفسیر ابی السعود)

زینت دی گئی لوگوں کیلئے شہوات کی محبت،اس کلام کو ذکر کرنے کا یہی مقصد ہے کہ دنیاوی منافع اور دنیاوی چیزوں پر محبت اتنی غالب آجائے کہ رب تعالی کی رغبت اور توجہ دور ہوجائے۔گویا کہ شہوات سے محبت مذمومہ وہ ہے جو رب تعالی سے دور کرے،جو رب تعالی کے قریب کرے وہ محبت محمودہ ہے۔

❁ "واخرج ابن ابی شیبة عن اسلم قال رایت عبد الله بن ارقم جاء الی عمر بن الخطاب بحلیة آنیة وفضة فقال عمر اللهم انک ذکرت هذاالمال فقلت"زین للناس حب الشهوات"الآیة وقلت"لاتاسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم"وانا لانستطیع الاان نفرح بما زینت لنا اللهم فاجعلنا ننفقه فی حق واعوذبک من شره" (نقل از در منثور)

حضرت اسلم کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن ارقم کو دیکھا جو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس سونے اور چاندی کے برتن لائے،تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا"اے اللہ تو نے اس مال کا ذکر کیا،تو نے فرمایا﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ آپ نے یہ آیۂ کریمہ مکمل پڑھی،پھر عرض کیا اے اللہ تو نے یہ بھی فرمایا﴿وَلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ﴾ جو(مال)تم سے فوت ہوجائے اس پر غم نہ کرو،اور جو تمہیں وہ عطاء کردے اس پر خوش نہ ہو۔

(اے اللہ تعالی)ہم نہیں طاقت رکھتے مگر یہ کہ ہم خوش ہوتے ہیں ان چیزوں پر جن کو تو نے مزین

کیا (سنوارا) ہے۔اے اللہ تو ہی ہمیں توفیق عطاء فرما کہ ہم دنیا کا مال حق راہ میں خرچ کریں۔اے باری تعالی تیری پناہ شر (بری) راہ میں مال خرچ کرنے سے۔

"ان الشهوة مسترذلة عند الحكماء مذموم من اتبعها شاهد على نفسه بالبهيمة،قالوا خلق الله الملائكة عقولا بلاشهوة والبها ئم ذات شهوات بلا عقل وجعلهما في الانسان فمن غلب عقله شهوته فهوافضل من الملائكة ومن غلب عليه شهوته فهوارذل من البهائم" (روح البیان)

حکماء نے بیان فرمایا ہے کہ وہ شہوت رزیل (گھٹیا) ہے، جس کی وجہ سے انسان چوپاؤں کی طرح نظر آئے، اللہ تعالی فرشتوں کو صرف عقل عطاء فرمائی، شہوت ان کو عطاء نہیں کی، اور جانوروں کو پیدا کیا انہیں صرف شہوات عطاء کیں، عقل عطاء نہیں کی۔انسان کو رب تعالی نے عقل بھی عطاء کی اور شہوت بھی۔جب انسان کی عقل شہوت پر غالب ہو تو وہ فرشتوں سے افضل ہے، کیونکہ اس کے کام اللہ تعالی کی رضاء مندی حاصل کرنے کیلئے پائے جائیں گے، شہوات اس پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔

اور اگر انسان پر شہوات غالب آجائیں اور عقل مغلوب ہو جائے تو وہ جانوروں سے بدتر (زیادہ برا) ہوگا، اسلئے کہ اس کے کام شیطان کو خوش کرنے والے ہوں گے اور رب تعالی کو ناراض کرنے والے ہوں گے۔

﴿مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ "یعنی عورتوں اور بیٹوں کی"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے: یہاں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں، ایک یہ کہ "مـــــن" بیانیہ ہو، اس صورت میں "من" کا معنی ہوگا "یعنی" راقم نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی یعنی عورتوں اور بیٹوں کی "الخ" (یہ راقم کا ترجمہ ہے) دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ "حال ہے شہوات سے" اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔آراستہ کی گئی لوگوں کیلئے محبت خواہشات کی حال یہ ہے کہ عورتوں اور بیٹوں کی "الخ" (ماخوذ از روح المعانی)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے لفظ "یعنی" اور لفظ "حال یہ ہے" نہیں ذکر کیا، اسلئے آپ کا ترجمہ دونوں ترکیبوں کو شامل ہے آپ کا ترجمہ یہ ہے "لوگوں کیلئے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتیں اور بیٹے" "الخ"

عورتوں اور بیٹوں سے محبت کی دو قسمیں: "محبت مذمومہ" اور "محبت محمودہ"

عورتوں سے محبت مذمومہ: وہی ہے جس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں کیا گیا ہے، کیونکہ اپنی عورتوں سے ایسی محبت کرنا جو اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ سے دور کردے۔عورت کے کہنے پر حرام مال حاصل کرتا ہے، عورت کے

کہنے پر اور برائیوں کا مرتکب ہوتا رہے تو یہ بری محبت ہے۔

❀ "ثبت فی الصیح انه ﷺ قال ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء"
صحیح بخاری اور مسلم میں ہے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے بعد مردوں کیلئے عورتوں سے زیادہ کوئی ضرر انداز فتنہ نہیں چھوڑا۔ (صابونی ابن کثیر)

حدیث پاک کا مفہوم واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت میرے بعد کئی فتنوں میں مبتلاء ہوگی، ان فتنوں میں سے سب سے زیادہ فتنہ عورتوں کا ہوگا۔

عورتوں میں زیدہ فتنہ کیوں:

عورتوں میں دو فتنے ایسے پائے جاتے ہیں جو بہت سی خرابیوں کا سبب ہیں۔
"فاحداهما ان تؤدی الی قطع الرحم لان المراة تأمر زوجها بقطعة عن الامهات والا خوات"
ان دو فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی عورت سے محبت قطع رحمی (اپنے اقرباء سے قطع تعلق) تک پہنچا دیتی ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماں سے اور بہنوں سے دور کر دیتی ہے۔
ہر وقت **خاوند** کے کان بھرتے رہنا تمہاری ماں نے مجھے یہ کہا ہے، تمہاری بہنوں نے مجھے یہ کہا ہے، آخر کار خاوند تنگ آکر کبھی ماں اور بہنوں سے تعلق توڑ بیٹھتا ہے، اور کبھی عورت کو طلاق دے دیتا ہے، اس طرح عورت کے فتنہ سے ایک گھر کا اتفاق واتحاد برباد ہو کر رہ گیا، اور ایک گھر کا سکون وچین ختم ہو گیا، اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے؟
"والثانیة یبتلی المال من الحلال والحرام" عورت کا دوسرا فتنہ یہ ہے کہ اس کا ہر وقت مطالبہ مال جمع کرنے کا ہوتا ہے۔ خاوند عورت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا کہ وہ مال جمع کرے، یہاں تک کہ وہ عورت کے مطالبات پر حلال اور حرام طریقے سے مال جمع کرنے میں مبتلاء ہو جاتا ہے، یعنی عورت کے فتنے کی وجہ سے حرام طریقے سے مال جمع کرنے میں مبتلاء ہونے سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہوگا؟ (ماخوذ از قرطبی)

عورتوں سے محبت محمودہ:

"واما اذا کان القصد بهن الاعفاف و کثرة الاولاد فهذا مطلوب مرغوب فیه مندوب الیه"
جب عورتوں سے نکاح کرنے کی محبت میں مقصد پاکدامنی کو حاصل کرنا ہو، یعنی ارادہ یہ ہو کہ نکاح کر لوں تا کہ نگاہ کسی

اور کی طرف نہ اٹھے اور مقصد یہ ہو کہ کثیر اولاد ہو گی، ان مقاصد کے پیش نظر عورت سے محبت کرنا مطلوب ہے اور پسندیدہ عمل ہے اور مستحب ہے۔ اسی وجہ سے **راقم** نے اس محبت کا محبت محمودہ پیش کیا ہے۔

❁ **"قال رسول اللهﷺ الدنیامتاع وخیر متاعها المرأة الصالحة ان نظر الیها سرته وان امرها اطاعته وان غاب عنها حفظته فی نفسها وماله"** (اخرجہ النسائی، وروی بعضہ مسلم فی صحیحہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دنیا سامان ہے، اس کے سامان میں سے بہتر نیک عورت ہے، اگر اس کی طرف وہ (اس کا خاوند) دیکھے تو وہ اسے خوش کردے، اور اگر اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی حکم کی فرمانبرداری کرے اور اگر وہ غائب ہو (یعنی اس کا خاوند گھر میں موجود نہ ہو) تو وہ اپنی اور خاوند کے مال کی حفاظت کرے (یعنی عورت مرد کی غیر موجودگی میں پاکدامن رہے، کسی اور کی طرف راغب نہ ہو اور اس کے مال میں خیانت نہ کرے)

❁ **"قال رسول اللهﷺ حبب الی النساء والطیب وجعلت قرة عینی فی الصلوة"**

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری عورتیں میرے لئے محبوب بنادی گئیں، اور خوشبو سے مجھے محبت کرنے والا بنادیا گیا، اور میری آنکھوں ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی۔

حدیث پاک سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے میری ازواج کی محبت ڈال دی تاکہ نگاہ ان پر جمی رہے، کسی اور کی طرف نہ اٹھے۔ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ تو معصوم ہیں، مقصد تعلیم امت تھا کہ اپنی بیبیوں سے محبت رکھو، یہی محبت جس میں پاک دامنی ہو "محبت محمودہ ہو محبت محمودہ ہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

بیٹوں سے محبت کی دو قسمیں: بیٹوں سے محبت کی بھی دو ہی قسمیں ہیں، ایک محبت مذمومہ اور ایک محبت محمودہ۔

بیٹوں سے محبت مذمومہ:

"**وحب البنین تارة یکون للتفاخر والزینة فهو داخل هذا**" اگر بیٹوں سے محبت فخر وتکبر کے طور پر ہو، یا زیب وزینت حاصل کرنے کیلئے ہو تو یہ محبت مذمومہ ہے۔ جو بری محبت ہے اور رب تعالیٰ کو ناپسند ہے، ایسی ہی محبت کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے۔ اور بیٹوں کی محبت میں فتنہ یہ ہے "**وهو ما ابتلی بجمع المال لأجلهم**" کہ انسان بیٹوں کی محبت کی وجہ سے اور ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر مال خرچ کرنے کی وجہ سے، مال جمع کرنے میں مبتلاء ہو جاتا ہے حلال وحرام کی کم ہی پرواہ کرتا ہے، مقصد اس کا مال جمع کرنا ہوتا ہے خواہ کسی قسم کا مال بھی اسے مل جائے۔ (از قرطبی)

بیٹوں سے محبت محمودہ:

"وتارة یکون التکثیر النسل وتکثیر النسل وتکثیر امة محمد ﷺ ممن یعبد الله وحده لاشریک له فهذا محمود ممدوح کما ثبت فی الحدیث "تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الأمم یوم القیامة"

بیٹوں سے کبھی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ ان سے نسل بڑھے گی اور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت زیادہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے گی۔ بیٹوں سے محبت ان وجوہ کے پیش نظر اچھی ہے اور قابل تعریف ہے کیونکہ یہ محبت درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کا ذریعہ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا 'تم محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو، بیشک میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے امت کی کثرت کو پالوں گا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

عورت سے محبت سب سے زیادہ:

اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ میں سات چیزوں کا ذکر فرمایا کہ ان سے انسان کو زیادہ خواہش اور زیادہ محبت ہوتی ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں سے زیادہ محبت عورت سے ہوتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے۔ "لان الالتذاذ بهن اکثر والاستئناس بهن اتم" کیونکہ ان سے انسان زیادہ لذت حاصل کرتا ہے، اور کامل محبت اور انس بھی ان سے ہی زیادہ ہوتا ہے۔

اسی پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کر رہا ہے ﴿خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ "اس (رب تعالیٰ) نے تمہارے لئے تمہارے ہی نفسوں سے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون وچین حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت ورحمت پیدا کر دی" بلکہ غور کیا جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اتنا زیادہ عشق اور اندھادھند محبت عورتوں سے ہی انسان کو حاصل ہے، عورت کی محبت ہی انسان کو کبھی ہلاکت کی طرف پہنچا دیتی ہے، اسی مضمون کو علامہ رازی رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں دیکھئے

"ومما یؤکد ذلک ان العشق الشدید المفلق المهلک لا یتفق الا فی هذا النوع من الشهوة" (کبیر)

بیٹوں کا ذکر کیا گیا بیٹیوں کا نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

بیٹے سے محبت زیادہ ہوتی ہے بنسبت بیٹی کے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفع بیٹوں سے زیادہ حاصل ہوتا ہے، اسلئے بیٹوں کی

کثرت پر انسان خوش ہوتا ہے۔ (کبیر)

بیٹیوں کی حفاظت، پھر دوسرے گھروں میں جا کر آباد ہونا، وہاں کیسے آباد ہوگی، ان لوگوں کا اس سے کیسا سلوک ہوگا وغیرھا اس قسم کے تفکرات کی وجہ سے قدرتی طور پر بیٹیوں سے وہ محبت نہیں ہوتی جو بیٹوں سے ہوتی ہے اور انسان اپنا بازو بیٹوں کو ہی سمجھتا ہے کہ وہ دشمن کے مقابل اس کا ساتھ دیتے ہیں، بیٹیاں اس سے عاجز ہوتی ہیں، اور جہاد میں جو کام بیٹے کر سکتے ہیں وہ بیٹیاں نہیں کر سکتی، لیکن اصل وجہ راقم کے نزدیک یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول عرب میں ہوا، اس وقت کے معاشرہ میں قرآن پاک کے نزول سے قبل بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے کا رواج تھا، اسلئے بیٹوں کا ہی ذکر کیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ "بنین کا ذکر کر کے "بنات" کو بھی ضمناً شامل کر لیا ہو، قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہو، اکثر طور پر قرآن پاک میں مذکر کے صیغے استعمال ہیں جو مؤنث کو شامل ہیں "واللہ اعلم بالصواب" (راقم)

حکمت: اولاد و ازواج کی محبت انسان کے دل میں رب تعالی نے پیدا فرما دی، یہ درحقیقت اللہ تعالی کی حکمت کاملہ ہے "فانه لولا هذا الحب لما حصل التوالد والتناسل، ولأدى ذلك الى انقطاع النسل" اسلئے کہ اگر یہ محبت نہ پائی جاتی تو پیدائش کا سلسلہ اور نسل کی بقاء کا سلسلہ حاصل نہ ہوتا، اس طرح تو نسل ختم ہو کر رہ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ محبت حیوانوں کے درمیان بھی رکھ دیا ہے، تا کہ ان کی نسل بھی برقرار رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اولاد سے محبت کی وجہ بھی اصل میں نسل کو ہی باقی رکھنا ہے، چھوٹے بچوں کو پالنا بہت مشکل کام ہے، یہ ماں ہی جانتی ہے کہ وہ کتنی تکالیف برداشت کر کے اولاد کو پالتی ہے، اور باپ اولاد کے اخراجات کو پورا کرنے کیلئے دن رات مزدوری کرنے میں مشغول ہے، بغیر محبت کے یہ کام کرنا بہت مشکل ہوتا۔ (راقم)

﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ اور کثیر مال جمع کیا ہوا یعنی سونے اور چاندی کی۔

یعنی لوگوں کے دلوں میں کثیر جمع کئے ہوئے مال کی محبت رکھ دی گئی، یعنی سونے اور چاندی سے محبت ان کے دلوں میں رکھ دی گئی۔

(القناطير) الاموال الكثيرة (المقنطرة) المجمعة (جلالین) "قناطیر" کا معنی ہے "کثیر مال" اور "مقنطرۃ" میں دو قول ہیں، ایک یہ ہے کہ نون اصلی ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں نون زائد ہے، ان حضرات کے نزدیک اس کا وزن "مفنعلة" ہوگا۔ (صاوی)

مفردات راغب میں بھی ان کو "قطر" کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک بھی نون

زائد نظر آتا ہے "واللہ اعلم بالصواب"

"القنطار" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گرہ لگا کر پختہ کر دیا جائے، اور مقنطرۃ کا معنی ہے، رسی میں کئی تہہ ملا کر مضبوط کر دیا جائے، انسان کے پاس جب کثیر مال ہوتو اسے وثوق (بھروسہ) ہوتا ہے کہ یہ مال مجھے ہر قسم کی مصیبتوں سے بچالے گا۔ "القناطیر المقنطرۃ" کا صحیح مطلب یہی ہے کہ "کثیر مال جمع کیا ہوا" اس کی کوئی حد مقرر نہیں، اسی قول کے مطابق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا "واعلم ان ھذا ھو الصحیح" یقین کر لے کہ بیشک یہی قول درست ہے۔ بعض روایات میں مختلف حدود اور تعداد بیان کی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ اتنے مال کو بھی "القناطیر المقنطرۃ" کہا جاتا ہے، اور اتنے کو بھی۔ مختلف روایات میں مختلف حدود اور تعداد کا یہی مطلب ہے نہ ہی روایات میں تعارض ہے اور نہ ہی حد معین ہے۔

"روی ابوھریرۃ عن النبی ﷺ انہ قال "القنطار اثنا عشر الف اوقیۃ" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بارہ ہزار اوقیہ قنطار ہے" "اوقیہ" "چالیس درھم کا وزن" ہے۔

"وروی انس عن النبی ﷺ ان القنطار الف دینار" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ قنطار ہزار دینار ہیں۔

"وروی ابی بن کعب انہ علیہ السلام قال القنطار الف ومائتا اوقیۃ" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک ہزار دو سو اوقیہ قنطار ہے۔

"قال ابن عباس القنطار الف دینار او اثناعشر الف درھم" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قنطار ہزار دینار ہیں، یا بارہ ہزار درہم ہیں۔

"وقال الکلبی القنطار بلسان الروم ملء مسک ثور من ذھب او فضۃ" کلبی کہتے ہیں رومی زبان میں قنطار کا یہ مطلب ہے کہ بیل کی کھال کو سونے اور چاندی سے بھر دیا جائے۔

سب روایات کا مطلب وہی ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔ کلبی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "مقنطرۃ" کا لفظ "القناطیر" کی تاکید ہے، قناطیر کی کم از کم مقدار تین ہے۔ اور مقنطرۃ کا مطلب تین کو دو گناہ کرنا، "القناطیر المقنطرۃ" کی مجموعی مقدار کم از کم چھ ہوگی، زیادہ کی کوئی حد نہیں (ماخوذ از کبیر)

﴿من الذھب والفضۃ﴾ یعنی سونا اور چاندی، مطلب یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے کثیر مجتمع مال کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی گئی کہ یہ چیزیں اسے مزین کر کے دکھائی گئی ہیں۔

سونے اور چاندی سے محبت کیوں؟

چونکہ سونے اور چاندی سے ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے، اس لئے جو سونے اور چاندی کا مالک ہوتا ہے اسے ہر چیز کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔ "وصفة المالكية هي القدرة والقدرة صفة كمال والكمال محبوب لذاته" صفت مالکیت حاصل تو قدرت حاصل ہوتی ہے، قدرت صفت کمال ہے، لھذا صفت مالکیت سے صفت کمال حاصل ہوگی، کمال ذاتی طور پر محبوب ہے۔ لھذا صفت مالکیت انسان کو ذاتی طور پر محبوب ہے، کیونکہ اسی میں انسان اپنا کمال سمجھتا ہے، جب سونا اور چاندی اس کمال کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں تو وہ بھی ذاتی طور انسان کو محبوب ہوں گے۔

"وما لا يوجد المحبوب الابه فهو محبوب، لاجرم كانا محبوبين"

جس چیز کے بغیر محبوب حاصل نہ ہو وہ چیز بھی محبوب ہوتی ہے۔ جب سونے اور چاندی کے بغیر صفت مالکیت وقدرت اور صفت کمال حاصل نہیں تو یقیناً سونا اور چاندی ذاتی طور پر محبوب بن گئے (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(من الذهب والفضة) بيان للقناطير وهو في موضع الحال منها" "من الذهب والفضة" میں "من" بیانیہ جو "القناطير" کا بیان ہے، یہ محل حال میں واقع ہے۔ (روح المعانی)

اس لئے راقم نے "یعنی سونے اور چاندی کی (محبت) ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بامحاورہ ہے، جس سے تفاسیر کی طویل بحثوں کو سمو لیا جاتا ہے، آپ نے بہت خوبصورت اور تمام اقوال کو حاوی وشامل ترجمہ کیا ہے، آپ کے ترجمہ پر ایک مرتبہ پھر نظر کیجئے ﴿اَلْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ اور تلے اوپر سونے اور چاندی کے ڈھیر۔ (کنز الایمان)

فائدہ جلیلہ: "عن ابي سعيد الخدري قال من قرأ في ليلة عشر آيات كتب من الذاكرين، ومن قرأ بمائة آية كتب من القانتين، ومن قرأ بخمسمائة آية الى الالف اصبح وله قنطار من الاجر"
(مسند ابی محمد الدارمی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس شخص نے رات کو دس آیتیں تلاوت کیں، اسے ذاکرین کے درجہ میں لکھ دیا جائے گا، اور جس نے ایک سو آیات کی تلاوت کی اسے قانتین (خشوع کرنے والوں) کے درجہ میں لکھ دیا جائے گا، اور جس نے پانچ سو آیات سے لیکر ایک ہزار تک پڑھیں تو وہ اجر وثواب کے ڈھیر حاصل کرنے والا ہوگا (از قرطبی)

مال کی محبت کی دو قسمیں: محبت مذمومہ اور محبت محمودہ

"اذا کانت للفخر والخیلاء والتکبر علی الضعفاء والتجبر علی الفقراء فھذہ مذمومۃ"

مال سے محبت جب تکبر، فخر، ناز نخرے کے طور پر ہو، ضعیف لوگوں پر تکبر کرنے کے طور پر ہو، اور فقیروں پر جبر کرنا مقصود ہو تو یہ محبت مذمومہ ہے۔

اسی کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں کیا گیا ہے، مال سے یہ محبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

"واذا کانت للنفقہ فی القربات وصلۃ الارحام والقرابات ووجوہ البر والطاعات فھذہ ممدوحۃ محمودۃ شرعا"

جب مال سے محبت اس لئے ہو کہ اسے نیکی کی راہ میں خرچ کیا جائے گا، صلہ رحمی کیلئے، قریبی رشتہ داروں سے تعلق جوڑنے کیلئے خرچ کیا جائے گا، اور ہر طرح کی نیکی کے کاموں میں مال خرچ کیا جائے گا تو مال سے محبت قابل تعریف ہوگی اور محبت محمودہ (یعنی اچھی محبت ہوگی) شریعت میں مال کی اس محبت کی تعریف کی گئی ہے، اور اسے جائز قرار دیا گیا۔ (از ابن کثیر، صابونی)

یہ یقینی بات ہے مال کے بغیر نظام دنیا کا چلنا ممکن نہیں، اسلئے مال سے محبت اسی وقت شریعت میں ناپسند ہوگی جب کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے غافل کردے گی۔ اور مال سے وہ محبت جو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے قریب کرے وہ شریعت میں بھی پسندیدہ ہے اور قابل تعریف ہے۔ (راقم)

﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ "اور خوبصورت گھوڑوں کی"

یعنی خوبصورت گھوڑوں کی محبت کو مزین کیا گیا ہے، جو ان کے دلوں میں ڈال دی گئی۔

"والخیل المسومۃ" ای الحسان" (جلالین) المسومۃ کا ترجمہ جلالین میں "خوبصورت" کیا گیا ہے، اس پر محشی نے یوں بیان کیا۔

"الحسان ای المحسنۃ المضمرۃ لان المسومۃ علی ھذا ماخوذ من السماو وھی الحسن فمعنی مسومۃ ذات حسن وجمال"

"الحسان" جو ترجمہ کیا ہے مفسر نے اسی کا مطلب یہ ہے کہ (گھوڑے) حسین جن کو اضمار کیا گیا ہے، مضمر گھوڑے وہ ہوتے تھے جنہیں پہلے زیادہ کھلا کر موٹا کیا جاتا تھا، پھر ان کا چارہ کم کر کے ان کے گوشت کو کم کیا جاتا، اس طرح ان کا

جسم مضبوط ہوتا وہ تیز دوڑتے تھے، "مسومة" کا معنی ہوگیا "حسین وجمیل" (جلالین مع حاشیہ)

"قال ابو مسلم الاصفهانی وهو ماخوذ من السيما بالقصر والسيماء بالمد ومعناه واحد وهو الهيئة الحسنة"

ابومسلم اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ "المسومة" ماخوذ ہے 'سیما' (بغیر مد کے) اور "سیماء" (مد کے ساتھ) سے، دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہے 'خوبصورت شکل' **"وقول ابی مسلم احسن لان الاشارة فی هذه الآیة الی شرائف الاموال"** ابومسلم کا قول اچھا ہے کیونکہ آیۃ کریمہ میں عمدہ مال کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ ان کو عمدہ مال سے محبت ہے، وہ ہیں حسین وجمیل گھوڑے۔

"انها الخیل المطهمة الحسان" وهو قول مجاهد وعكرمة، قال القفال المطهمة المرأة الجميلة"

"والخیل المسومة" کا معنی ہے خوشنما، حسین وجمیل گھوڑے، یہ قول ہے مجاہد اور عکرمہ کا۔ ان حضرات نے لفظ "المطهمة" استعمال کیا، تو قفال نے اس کی وضاحت کی کہ اصل میں خوبصورت عورت کو "المطهمة" کہا جاتا ہے، یہاں خوبصورت گھوڑوں کیلئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "والخیل المسومة" کا ترجمہ کیا ہے 'اور نشان کئے ہوئے گھوڑے' یہی ترجمہ اکثر مترجمین نے کیا ہے۔ جلالین کے محشی نے بیان کیا ہے **"وفسر اکثر المفسرین قوله المسومة بالمعلمة من السومة وهی العلامة"** اکثر مفسرین نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "المسومة" کا معنی کیا ہے 'نشان لگائے ہوئے'، کہ "المسومة" ماخوذ ہے "سومة" سے، جس کا معنی ہے 'علامت' 'نشان لگانا'۔ جب "المسومة" کا معنی کیا جائے 'نشان لگائے ہوئے' تو اس کے تین مطلب ہیں۔

(۱) **"اختلفوا فی تلک العلامة فقیل هی الغرة والتحجیل"** 'علامت لگائے ہوئے' کے مختلف مطالب بتائے گئے ہیں، بعضوں نے کہا اس کا معنی ہے 'غر محجلة' گھوڑے، وہ گھوڑے جن کا وصف بیان کیا گیا ہے 'غر محجلة' یہ وہ اس جن کی پیشانیاں سفید ہوتی ہیں، اور ان کے چار پاؤں بھی سفید ہوتے ہیں۔

(۲) **"وقیل هی الخیل البلق"** بعض حضرات نے 'نشان لگائے ہوئے' کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ 'چتکبرے گھوڑے' مراد ہیں، یعنی جن کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور ان میں چھوٹے چھوٹے سفید نشان ہوتے ہیں، وہ بھی چونکہ جنگ میں خوشنما نظر آتے ہیں جو دشمن کے دلوں پر رعب ڈال دیتے ہیں۔

(۳) **"وقیل هی المعلمة بالكی"** بعض حضرات نے بیان کیا ہے، 'نشان لگائے ہوئے' کا مطلب یہ

ہے ''داغ دیے ہوئے'' یعنی جہاد والے گھوڑوں کو خاص کرنے کیلئے ان کی سرین کے قریب پچھلے حصہ کو داغ دیا جاتا تھا تا کہ پتہ چل جائے کہ یہ ''جنگی گھوڑے'' ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

گھوڑے کو عربی میں ''خیل'' کہنے کی وجہ:

عربی میں الفاظ کے لغوی معنی کے مطابق ہی کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے۔ ''خیل'' اگرچہ جمع ہے اس کا واحد نہیں، جس طرح قوم، نساء، رھط کا واحد ان لفظوں سے نہیں (ہاں کبھی کبھی ''خیل'' واحد پر بول لیا جاتا ہے) ''وسمیت الافراس خیلا لخیلانھا فی مشیھا'' گھوڑوں کو ''خیل'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فاخرانہ انداز پر چلتے ہیں، چونکہ ''خیل'' لیا ہوا ہے ''خیلاء'' سے جس کا معنی ہے تکبر کرنا، فخر کرنا، انسان بھی جب فاخرانہ انداز پر ادھر ادھر چکر کاٹے تو اس کی اس حرکت کو بھی ''اختیال'' کہا جاتا ہے۔ ''خیال اور تخیل'' کو بھی ایک صورت کے ذہن میں آنے کی وجہ سے ''خیل اور تخیل'' کہا جاتا ہے۔ (از کبیر)

فائدہ: خیلاء کا لفظ حدیث پاک میں بھی استعمال ہے، جس کا معنی تکبر اور فخر ہی ہے۔ ضمناً ایک مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

❁ ''عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال من جر ثوبه خیلاء لم ینظر الله الیه یوم القیامة''
(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے فاخرانہ طور پر کپڑا کھینچا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف رحمت نہیں فرمائے گا۔

وضاحت حدیث:

(من جرثوبه) وھو شامل لازاره ورداته وغیرھا'' کپڑا کھینچے کا مطلب عام ہے خواہ کمر سے باندھنے والی چادر لمبی ہو، نیچے زمین سے گھسٹ رہی ہو یا سلوار لمبی ہو، یا اوپر لپیٹنے والی چادر حد سے زائد لمبی ہو۔

''(خیلاء) بضم العجمة وفتح التحتیة وبالمد، وقال النووی وھو والمخحیلة والبطر والکبر والزھو والتبختر کلھا متقاربة''

"خیلاء" کے لفظ میں خاء پر ضمہ (پیش) ہے، اور یاء پر فتحہ (زبر) ہے، اور اس میں مد ہے، اس کا معنی ہے تکبر کرنا، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "خیلاء" "مخیلة"، بطر، کبر، زھو، تبختر سب ہی معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں، یعنی سب کا ہی معنی یہ ہے تکبر کرنا، فخر کرنا، نانخرہ کرنا۔

(لم ینظر اللہ الیه یوم القیامة)ای لا یرحم علیه ولم یلتفت الیه" اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں فرمائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رحم نہیں فرمائے گا اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائے گا۔

یہ خیال رہے کہ اس مقام پر نظر رحمت کی نفی ہے غضب کی نفی نہیں، غیظ و غضب کی نظر وہ فرمائے گا۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۱۳۸)

❁ "وعن ابی هریرة ان رسول اللہ ﷺ قال لا ینظر اللہ یوم القیامة الی من جر ازاره بطرا"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جس نے اپنا کپڑا کھینچا۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب اللباس)

وضاحت حدیث:

"(لا ینظر اللہ یوم القیامة)ای نظر رحمة فیکون الحدیث محمولا علی المستحل اوعلی الزجر اومقیدا بابتداء الامر ویجوز ان یراد لا ینظر نظر لطف وعنایة"

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر نہیں فرمائے گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ حدیث پاک میں لمبا کپڑا ڈھلکا کر پہننے والے پر جو وعید (سخت دھمکی) پائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لمبا ڈھلکا کر کپڑا پہننا بلا کراہیت حلال سمجھے یا مطلقاً زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) پائی گئی ہے یا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ابتدائی طور پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لطف و مہربانی کی نظر نہیں فرمائے گا یعنی نفی نظر رحمت کی ہے۔ (مرقاۃ، ج ۸، ص ۱۳۸)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

کہ میں نے یجوز کا معنیٰ کیا ہے "صحیح یہ ہے" جیسا کہ کافیہ اور جامی میں آپ یقیناً پڑھ چکے ہیں، یجوز بمعنیٰ "یصح" کے بھی آتا ہے، اور یصح بمعنیٰ امکان کے آتا ہے، امکان اپنی جانب مخالف میں وجوب اور امتناع کو شامل ہوتا ہے۔ تفصیل جامی اور اس کی شروح میں دیکھیں۔ (راقم)

(الی من جر ازاره بطرا) بفتحتین ای تکبرا اوفرحا وطغیانا بالغنی" "بطرا" کی باء اور تاء پر فتحہ (زبر) ہے۔ اس کا معنیٰ ہے، تکبر کرنا، اترانا، اور مال و دولت کی وجہ سے سرکش ہونا۔

اب مکمل ترجمہ بمع شرح کے یہ ہو گیا "جو شخص تکبر کے طور پر خوش ہو کر اتراتے ہوئے، مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے حد سے بڑھتے ہوئے اپنی چادر یا سلوار لمبی رکھتا ہے، اسے کھینچ کھینچ کر ڈھلکا ڈھلکا کر چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر لطف و مہربانی اور رحمت کی نظر نہیں کرے گا۔

مقصد عظیم: قال ابن الملک ویفهم منه ان جره لغیر ذلک لایکون حراما لکنه مکروه کراهة تنزیه" (مرقاة ج ۸ ص ۱۳۸)

ابن ملک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حدیث پاک اور اس کی شروح سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ لمبا کپڑا ڈھلکا کر چلنا اسی وقت منع ہے جب اس میں مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے حد سے بڑھتے ہوئے تکبر کے طور پر یہ عادت ہو۔ اگر یہ صورت حال نہیں، یعنی تکبر نہیں، حد سے متجاوز نہیں غریب شخص ہے یا مال دار تو ہے لیکن مال نے اسے متکبر نہیں بنایا تو اس صورت میں لمبا کپڑا ڈھلکا کر چلنا مکروہ تنزیہی ہے۔

مقام افسوس: آج کل پائنچے ذرا ٹخنے سے نیچے ہوں تو یار لوگ نماز نہ ہونے کا فتوی لگا دیتے ہیں جو تکبر اور غیر تکبر کا فرق نہیں کرتے، پھر مکروہ تنزیہی کی تعریف نہیں جانتے۔ کاش کہ وہ یہ جانتے کہ مکروہ تنزیہی وہ ہے کہ جس سے بچنے پر ثواب اور نہ بچنے پر کوئی پکڑ نہیں۔ جب شریعت میں کوئی گرفت نہیں تو دوسرا کون ہے جو نماز کے نہ ہونے کا فتوی دے، درحقیقت وہ اپنے قول سے اپنی جہالت کا اعلان کر رہا ہے۔

❁ "وعن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ بینما رجل یجر ازاره من الخیلاء خسف به فهو یتجلجل فی الارض الی یوم القیامة" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایک شخص چادر کو تکبر کی وجہ سے کھینچتا یعنی لمبی چادر ڈھلکا کر چلتا اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا وہ قیامت کے دن تک اسی طرح دھنستا چلا جائے گا۔

وضاحت حدیث:

"قیل یحتمل ان یکون الرجل من هذه الامة فاخبر بهﷺ انه سیقع وعبر عنه بالماضی لتحقق وقوعه وان یکون اخبارا عمن قبل هذه الامة وهو الصحیح ولذلک ادخله البخاری فی باب ذکر بنی اسرائیل ثم الظاهر من سیاق الحدیث وابهام الرجل انه غیر قارون" (مرقاۃ ج۸ ص۱۳۸)

حدیث پاک میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے کسی شخص کا ذکر کیا ہو۔ واقعہ مستقبل (آنے والے وقت) کا ہو، صیغے ماضی (گذرے ہوئے زمانے) کے ذکر فرمائیں ہوں کہ جس کا واقع ہونا یقینی ہو اسے ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ نبی اسرئیل کے ایک شخص کا واقعہ ہے۔ کیونکہ بخاری نے اس کا جو عنوان ذکر کیا ہے وہ یہ ہے "باب ذکر نبی اسرائیل" نبی اسرائیل کے ذکر کے بیان میں۔ حدیث پاک کے سیاق و سباق سے اور جس شخص کا ذکر ہے اسے مبہم ذکر کیا گیا ہے تو اس سے پتہ چلا کہ

قارون کے بغیر کسی اور بنی اسرائیلی کا یہ ذکر ہے۔

❁ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار
(رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ٹخنوں سے نیچے چادر ہو، وہ آگ میں ہے۔

وضاحت حدیث: "فی النار" کا کیا مطلب ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خبر ہو مبتداء محذوف کی "اصل میں معنوی طور پر عبارت یوں ہو جائے "فهو ای صاحبه فی نار جهنم بسبب الاسبال الناشئ عن التکبر و الاختیال" وہ شخص آگ میں جائے گا جس نے تکبر اور فخر سے چادر، سلوار اور دوسرے کپڑوں کو لمبا رکھا اور مال و دولت کی وجہ سے حد سے بڑھ گیا۔

(۲) "قال الخطابی یتناول هذا علی وجهین احدهما ان مادون الکعبین من قدم صاحبه فی النار عقوبة له علی فعله" اس کا ایک اور معنیٰ جو علامہ خطابی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ٹخنوں کے نیچے اس شخص کے قدموں کو آگ میں جلایا جائے گا، یہ اسے اس کے فعل کی سزا دی جائے گی۔

(۳) "والآخر ان فعله ذلک فی النار الی هو معدود و محسوب من افعال اهل النار" اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تکبر کے طور پر اپنی چادر وغیرہ کو ٹخنوں کے نیچے ڈھلکائے گا تو اس کا یہ فعل ان لوگوں کے افعال کی طرح شمار ہوگا جو آگ میں جائیں گے۔

وعید کا تعلق کس سے ہے؟

"وقد نص الشافعی علی ان لتحریم مخصوص بالخیلاء لدلالة ظواهر الاحادیث علیها فان کان لخیلاء فهو ممنوع منع تحریم و الا فمنع تنزیه"

امام شافعی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر فرمایا کہ تحریم (حرام ہونے) کا تعلق تکبر سے ہے ظاہر احادیث اسی پر دلالت کر رہی ہیں، اسی سے بہت واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ اگر کپڑا لمبا ہو اور انسان ڈھلکا کر چلے اس کی وجہ جب تکبر ہو، اکڑ ہو، نازنخرہ ہو، فاخرانہ انداز ہو، یعنی مال و دولت کی وجہ سے اس میں تکبر آ گیا ہو، تو اس صورت میں اس کا یہ فعل حرام ہے، اگر تکبر نہیں، ایک شخص عاجز ہے، پرہیزگار ہے، صاحب علم ہے اس کے لمبے کپڑے میں کراہت تنزیہی ہے۔
(مرقاۃ ج۸ ص۱۳۹)

صرف سلوار کا یہ مسئلہ نہیں بلکہ ہر کپڑے کا یہی حکم ہے:

"قال النووی الاسبال یکون فی الازار والقمیص والعمامة" علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم شریف میں ذکر فرمایا "جو کپڑے کے لمبا کرنے اور ڈھلکا کر چلنے کی ممانعت ہے" وہ چادر میں بھی ہے اور قمیص میں بھی اور پگڑی میں بھی۔ نووی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق تکبرانہ انداز پر لمبی قمیص پہننا بھی منع ہے اور پگڑی کے لمبے لمبے شملے رکھنا بھی منع ہے۔ (از مرقاۃ ج ۸ ص ۱۳۹)

قمیص ٹخنوں تک پہننا اور پگڑی لمبی رکھنا بغیر کسی کراہیت کے جائز سمجھنا اور صرف سلوار پر زور دینا سوائے جہالت وحماقت کے اور کچھ نہیں۔ آیئے اسی مسئلہ کو حدیث پاک سے بھی دیکھتے چلے جائیں تاکہ مسئلہ صرف علامہ نووی کے قول پر بند نہ ہو۔

❁ "وعن سالم عن ابیه عن النبی ﷺ قال الاسبال فی الازار والقمیص والعمامة من جر منها شيئا خیلاء لم ینظر الله الیه یوم القیامة"

(رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجة، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت سالم اپنے باپ (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کپڑا لمبا ڈھلکانا چادر اور قمیص اور پگڑی میں بھی ہے، جس نے ان کپڑوں کو تکبر کے طور پر کھینچا یعنی لمبا رکھا اور ڈھلکا کر چلا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔

حدیث پاک سے بہت واضح ہوا کہ تکبر کے طور پر کسی کپڑے کو بھی لمبا رکھنا منع ہے خواہ وہ سلوار یا چادر ہو یا قمیص ہو یا پگڑی ہو۔ تکبر کی نیت نہ ہوں تو سب جائز ہیں کراھت تنزیھی جواز کے درجے میں ہی ہے یار لوگ لمبی لمبی قمیصیں پہن کر چلیں، لمبی لمبی پگڑیاں باندھ کر چلیں تو ہم ان پر فتویٰ نہیں لگاتے، اس لئے کہ تکبر دل کی نیت سے پتہ چلتا ہے، ویسے ہی کسی کو متکبر کہنا دیوانگی ہے۔

❁ "عن ابی سعید الخدری قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ازرة المئومن الی انصاف ساقیه لاجناح علیه فیما بینه وبین الکعبین ما اسفل من ذلک ففی النار قال ذلک ثلاث مرات ولاینظر الله یوم القیامة الی من جر ازاره بطرا"

(رواہ ابوداؤد وابن ماجه، مشکوۃ کتاب اللباس)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مومن کی چادر پنڈلیوں کے نصف تک ہوتی ہے، پنڈلی اور ٹخنے کے درمیان چادر کے ہونے میں کوئی گناہ نہیں جو اس سے نیچے ہو وہ آگ میں ہوگا۔ یہ آپ

نے تین مرتبہ فرمایا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت اس پر نہیں فرمائے گا جس نے تکبر کے طور پر چادر کو ڈھلکایا۔

تکمیل مسئلہ :

"واما القدر المستحب فيما ينزل اليه طرف القميص والازار فنصف الساقين والجائز بلا كراهة ماتحته الى الكعبين وبالجملة يكره مازاد على الحاجة والمعتادفى اللباس من الطول والسعة والظاهر ان المعتبرهو المعتاد الشرعى لاالمعتاد العرفى" (مرقاۃ ص ۱۳۹)

مستحب یہ ہے کہ قمیص یا چادر نصف پنڈلیوں تک ہو۔ بغیر کراہیت کے جائز ہے کہ چادر وغیرہ ٹخنوں تک ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو لباس عادت اور حاجت سے زائد ہو لمبائی اور وسعت میں وہ مکروہ ہے، عادت سے مراد عادت شرعیہ ہے، عادت عرفیہ مراد نہیں۔

فیصلہ کن بات حدیث پاک سے:

"عن ابن عمر ان النبى ﷺ قال من جرثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة فقال ابوبكر يارسول الله ازارى يسترخى الاان اتعاهده فقال له رسول الله ﷺ انك لست ممن يفعله خيلاء"

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ کتاب اللباس)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تکبر کی وجہ سے کپڑا کھینچا (لمبا کپڑا رکھا اور اسے ڈھلکایا، زمین پر گھسیٹ کر چلا) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری چادر ڈھلکتی رہتی ہے مگر یہ کہ میں اس کی حفاظت کروں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیشک تم ان میں سے نہیں ہو جو تکبر کے طور پر ایسا کرتے ہیں۔

وضاحت حدیث: "(لم ينظر الله اليه يوم القيامة) الى نظر رحمة اوبعين عناية" نظر نہ فرمانے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص پر خصوصی مہربانی نہیں فرمائے گا۔

"فقال ابو بكر يا رسول الله ازارى يسترخى "اى قد يسترخى بنفسه من غير اختيارى وربما يصل الى كعبى وقدمى"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ عرض کرنا یا رسول اللہ ﷺ میری چادر ڈھلکتی رہتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر میرے اختیار کے میری چادر نیچے آجاتی ہے، کئی مرتبہ وہ ٹخنوں تک آجاتی ہے، اور کئی مرتبہ (ٹخنوں کے نیچے) قدم تک آجاتی ہے۔

الاان اتعاهده"من التعاهدوهو علی فی النهاية بمعنى الحفظ والرعاية يعني وربما يقع منی عدم التعاهد لمانع شرعي اوعرفي فما الحكم في ذلک"

''مگر یہ کہ میں اس کی حفاظت کروں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ میں حفاظت تو کرتا ہوں، چادر کو اوپر تو اٹھاتا رہتا ہوں، لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میں توجہ نہیں کرسکتا، چادر کو اوپر رکھنے کی حفاظت نہیں کرسکتا کسی شرعی مانع یا عرفی مانع کی وجہ سے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟

"تعاھد" کا معنی ہے حفاظت کرنا اور رعایت کرنا۔ (اتعاھدہ، مضارع متکلم بمع ضمیر منصوب متصل کے ہے)

("فقال له رسول الله ﷺ انک لست ممن يفعله خيلاء)والمعنى ان استر خاه من غير قصد لايضر لاسيما ممن لايكون شيعته الخيلاء ولكن الافضل هو المتابعة وبه يظهر ان سبب الحرمة في جر الازار هو الخيلاء كما هو مقيد في الشرطية من الحديث المصدربه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک تم ان میں سے نہیں ہو جو تکبر کے طور پر کرتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری چادر کا ٹخنوں پر پہنچ جانا، یا ٹخنوں سے نیچے آجانا وعید کے ضمن میں نہیں آتا، کیونکہ وہ بلا اختیار فعل ہے۔ غیر اختیاری فعل پر کوئی مؤاخذہ (پکڑ) نہیں۔ خصوصا جب ایک انسان کی عادت ہی نہیں کہ وہ تکبر کرے تو اس کے کپڑے کا گھسٹنا گناہ نہیں۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی کوشش کرے تو افضل ہے۔ اسی سے ظاہر ہوگیا کہ بیشک سبب حرمت کپڑے کو زمین پر گھسیٹ کر چلنے میں تکبر ہے، اگر تکبر نہیں تو یہ مکروہ تنزیہی ہے۔ حدیث شریف میں جملہ شرطیہ استعمال ہے، جملہ شرطیہ کا یہ حکم ہے کہ شرط پائی جائے تو جزاء پائی جاتی ہے۔ شرط نہ پائی جائے تو جزاء نہیں پائی جاتی۔

ایک مرتبہ حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ کو پھر دیکھیں **"من جر ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة"** جس شخص نے کپڑا تکبر کے طور پر کھینچا، گھسیٹ کر چلا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ جس طرح ایک شخص کپڑا کھینچے ہی نہیں وہ اس وعید کے ضمن میں نہیں آتا، اسی طرح اگر کسی کا کپڑا تو لمبا ہے لیکن وہ شخص متکبر نہیں تو وہ بھی اس وعید کے ضمن میں نہیں آتا، اور اسی حدیث کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کے الفاظ کی طرف بھی ایک مرتبہ پھر نظر کرلیں۔

"وربما يقع منى عدم التعاهد لمانع شرعي اوعرفي فماالحكم في ذلک"

بہت ہی مرتبہ مجھ سے چادر کی حفاظت کسی شرعی یا عرفی مانع کی وجہ سے نہیں ہوسکتی تو اس کا کیا حکم ہے؟

اگر چہ پہلے ایک حدیث پاک کی وضاحت میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا قول گذرا کہ، عادت شرعیہ کا

اعتبار کرنا چاہئے، عادت عرفیہ کا اعتبار نہ کیا جائے، لیکن اس کا تعلق افضلیت سے ہے۔ یعنی جب ایک کام مکروہ تنزیہی ہو، لیکن لوگوں کی عادت کے مطابق ہو تو افضل یہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ اب اس حدیث کی وضاحت میں جو یہ بیان کیا ہے، کہ مانع شرعی یا مانع عرفی کی وجہ سے بہت اوقات میں مجھ سے چادر کی حفاظت نہیں ہوسکتی، یہ بیان جواز ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر مکروہ تنزیہی ہو لیکن وہ عرف کے مطابق ہو، تو اس پر عمل کرنا جائز ہے، اگر چہ بہتر یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی پر عمل کرنے سے بچ جائے، جب مکروہ تنزیہی کہتے ہی خلاف اولی (جو بہتر صورت کے خلاف ہو) کو کہتے ہیں، اگر اس پر عمل کرلیا جائے تو اس پر شریعت کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں، اور اگر اس سے بچ جائے تو یہ اس کیلئے بہتر ہے، اس کا اسے ثواب ملے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۸ ص ۱۶۴، ۱۶۵)

فعل میں جو حکم مستحب کا ہے وہی عدم فعل میں مکروہ تنزیہی کا ہے یا لوگ مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا ضد اور عناد کی وجہ سے فساد پھیلاتے رہتے ہیں، ہزاروں مستحبات پر کوئی عمل نہ کرے تو اس سے کوئی نہ پوچھے اور کسی ایک مکروہ تنزیہی پر پہاڑ کھڑے کردیئے جائیں، یہ عقل سے بعید ہے، یہ دین کی خدمت نہیں بلکہ فساد پھیلانا ہے، لوگوں کو دین سے دور کرنا ہے۔

مستحبات کی ترک پر کبھی جھگڑا، کبھی مباح پر عمل کرنے میں جھگڑا، کبھی مستحبات پر عمل کرنے میں جھگڑا، کبھی مکروہ تنزیہی پر عمل کرنے میں جھگڑا یہ سب جاہلوں کا کام ہے، علماء جب سمجھتے ہیں کہ مستحب کا حکم کیا ہے تو وہ اس میں جھگڑا نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں جو عمل کر رہے ہیں ان کو ثواب ہو رہا ہے، جو عمل نہیں کر رہے وہ گنہگار نہیں، شریعت ان سے ترک مستحب پر مؤاخذہ نہیں کرتی، اسی طرح علماء کرام مباح پر عمل کرنے یا نہ کرنے والے پر کوئی جھگڑا نہیں کرتے انہیں معلوم ہے کہ مباح پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ ثواب، لھذا جھگڑا کیا؟

اسی طرح علماء کرام مکروہ تنزیہی کو جھگڑے کا سبب نہیں بناتے وہ جانتے ہیں مکروہ تنزیہی کو چھوڑنا افضل ہے، اس پر عمل کرنے میں کوئی گرفت نہیں (راقم)

گھوڑوں سے محبت کی تین قسمیں:

(۱) ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس میں ثواب ہے "یکون ربطها اصحابها معدة لسبیل الله متی احتاجوا الیها علیها فهؤلاء یثابون" کبھی گھوڑوں کو پالنے سے اس لئے محبت ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیلئے کام آئیں گے، اس محبت میں اور گھوڑوں کو اس نیت سے پالنے میں ثواب ہوگا، چونکہ رب تعالیٰ نے گھوڑے

پالنے کا حکم دیا ہے۔

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (الانفال، آیۃ نمبر ۶۰)

اور ان کیلئے تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے اور جتنے گھوڑے باندھ سکو کہ ان سے، ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ جو اللہ تعالیٰ کے دشمن اور تمہارے دشمن ہیں۔

گھوڑے پالنے کی فضیلت میں احادیث ان شاءاللہ سورۃ الانفال میں ہی آئیں گی۔

(۲) گھوڑے پالنے اور ان سے محبت کرنے کی دوسری قسم وہ ہے جس میں گناہ ہے۔"وتارة تربط فخرا ونواء لاهل الاسلام فهذه على صاحبها وزر" یعنی کبھی لوگ فخر کے طور پر گھوڑے پالتے ہیں اور مسلمانوں سے مقابلہ کیلئے گھوڑے پالتے ہیں، گھوڑوں سے اس قسم کی محبت گناہ کا ذریعہ ہے۔

(۳) تیسری قسم گھوڑوں سے محبت کی یہ ہے کہ انسان گھوڑے اس لئے پالیں کہ ان کی نسل باقی رہے، یہ سواری کے کام آئیں گے، اور ان کو بیچ کر اپنی ضروریات میں خرچ کریں گے، اس میں پھر دو صورتیں ہیں اگر انسان گھوڑوں کے پالنے میں رب تعالیٰ سے غافل نہیں ہوتا تو یہ جائز ہے، کیونکہ کسب معاش ضروری ہے، کسب معاش کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کو بھی یاد کرتا رہے۔

اگر گھوڑوں کے پالنے میں ہی سارا وقت صرف کردے اور نماز نہ ادا کرے اور رب تعالیٰ سے غافل رہے تو یہ محبت گھوڑوں سے محبت مذمومہ ہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر مع وضاحت)

﴿وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ "اور چوپاؤں اور کھیتی کی"

یعنی چوپاؤں اور کھیتی کی محبت کو ان کیلئے مزین کردیا گیا۔

"الانعام" سے مراد" اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں ہیں""سميت بذلك لنعومة مشيها ولينه" ان جانوروں کے چلنے میں نرمی اور آہستگی پائی جاتی ہے، اس وجہ سے ان کو "الانعام" کہا جاتا ہے۔"والنعم فختصة بالابل" اور "نعم" کا لفظ عام استعمال میں اونٹوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہاں مراد تمام جانور ہیں یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں وغیرہ۔"والحرث" مصدر ہے، لیکن معنی مفعول والا ہے، مراد اس سے مزروعات ہیں۔"سواء كان جبوبا ام بقلا ام ثمرا" خواہ دانے ہوں، یا سبزیاں ہوں، یا پھل ہوں۔ (از روح المعانی)

چوپاؤں اور کھیتی سے محبت کی دو قسمیں:

(۱) ایک قسم جو جائز ہے وہ یہ ہے کہ جانوروں کے پالنے میں وقت گزارتا ہے اور کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے، لیکن نماز بھی بروقت ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی کرتا ہے، چوپاؤں اور کھیتی سے صرف اس لئے محبت ہے کہ یہ ذریعہ معاش ہیں، جب تک یہ مال حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک اہل وعیال کے حقوق ادا نہیں ہوں گے، تو یہی محبت جائز ہے اور محمود ہے۔

(۲) اگر چوپاؤں اور کھیتی سے ایسی محبت ہو جو اللہ تعالیٰ سے ہی دور کر دے، نہ نماز کی فکر ہو، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اوامر ونواہی کا خیال ہو تو یہ محبت ناجائز ہے، قابل مذمت ہے، اسی کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں ہے۔

﴿ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا﴾ ''یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا۔''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہاں وہم یہ ہوتا ہے کہ پہلے سات چیزوں کا ذکر ہے، اور ''ذلک'' کا اشارہ واحد مذکر کی طرف ہوتا ہے، واحد کا اشارہ جمع کی طرف کس طرح صحیح ہے؟ ضابطہ کے مطابق ''تلك'' یا ''ھؤلاء'' ذکر ہونا چاہئے تھا، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ ''اراد ذلک المذکور او المتقدم ذکرہ'' کہ ''ذلك'' کا اشارہ ''مذکور'' کی طرف ہے یا ''المتقدم ذکرہ'' (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے) اب اشارہ درست ہو گیا۔
(ماخوذ از البحر المحیط)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ''ذلک'' بعید کی طرف اشارہ کیلئے آتا ہے، یہ چیزیں تو ساتھ ہی متصل مذکورہ ہیں ان کی طرف ''ذلک'' کا اشارہ کس طرح صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی گھٹیا چیز کی طرف اشارہ بعید کا ہوتا ہے کہ یہ مقام حضور سے دور ہے۔ ''والمعنی تحقیر امر الدنیا والاشارة الی فنائھا وفناء مایستمتع به فیھا'' یہاں بھی اشارہ یہ کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان ہیں، دنیا نے اور دنیا کے سامان نے فنا ہو جانا ہے، جو چیزیں فناء ہو جاتی ہیں وہ گھٹیا ہیں، بہتر وہی چیز ہے جس نے ہمیشہ کیلئے باقی رہنا ہے، وہ ہے اخروی زندگی، اور اس اخروی زندگی کی نعمتیں۔ (الماخوذ از البحر المحیط بخضہ معانی)

❁ ''عن عبد الله بن عمر ان رسول الله ﷺ قال انما الدنیا متاع ولیس من متاع الدنیا شئ افضل من المرأة الصالحة'' (رواہ ابن ماجۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک دنیا سامان ہے، دنیا کے سامان میں سے نیک عورت (نیک زوجہ) سے افضل اور کوئی چیز نہیں۔

حدیث پاک سے بھی واضح ہوا کہ دنیا کی زندگی سامان ہے، دنیا کے سامان میں سے زیادہ افضل نیک زوجہ ہے لیکن اسی آیۃ سے واضح ہو گیا کہ زوجہ سے محبت بھی اگر رب تعالی سے غافل کر دے تو وہی محبت بری ہے۔ (از قرطبی)

دنیا سے محبت رب تعالی کے قرب کا ذریعہ:

"قال رسول الله ﷺ "ازهد فی الدنیا یحبک الله" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" دوری اختیار کرو تو اللہ تعالی تم سے محبت کرے گا۔

وضاحت حدیث:

"ازهد فی الدنیا ای فی متاعها من الجاه والمال الزائد علی الضروری" حدیث شریف میں" دنیا سے دور رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مال سے محبت اس لئے کرنا کہ اس سے مجھے دنیا میں مرتبہ حاصل ہوگا، یا انسان ضرورت سے زائد مال جمع کرنے میں مشغول رہ کر اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے غافل رہے۔ جب انسان ضرورت کے مطابق مال سے محبت رکھے، مال اگر مل جائے تو پھر بھی اللہ تعالی کی یاد سے غافل نہ رہے تو اللہ تعالی اس سے محبت کرتا ہے، یعنی اسے اپنا قرب عطاء کر دیتا ہے۔

❁ "عن المقدام بن معدیکرب قال قال رسول الله ﷺ لیس لا بن آدم حق فی سوی هذه الخصال بیت یسکنه وثوب یواری عورته وجلف الخبز والماء" (اخرجه الترمذی)

مقدام بن معدیکرب کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کا حق سوائے ان چیزوں کے نہیں یعنی رہنے کیلئے گھر، اور ستر ڈھانپنے کیلئے کپڑا اور روٹی کا ٹکڑا اور پانی یعنی ان ضرورت کی چیزوں کی علاوہ دنیا میں مشغول نہ ہو۔

"وسئل سهل بن عبد الله بم یسهل علی العبد ترک الدنیا وکل الشهوات؟ قال بتشاغله بما امر به"

حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ بندے کیلئے دنیا کی محبت اور تمام خواہشات سے محبت کو چھوڑنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بندہ ان کاموں میں مشغول ہو جائے جن کا حکم اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے دیا ہے، تو خود بخود اس سے دنیاوی خواہشات چھوٹ جائیں گی، اور دنیا کے سامان سے

محبت اسے ضرورت کی حد تک رہ جائے گی، حلال وحرام میں وہ تمیز کر سکے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ ''اور اللہ تعالی کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔''

''مـآب'' کا معنی ''مرجع'' لوٹنے کی جگہ۔ یہ لفظ لیا ہوا ہے ''آب یـئـوب أوبـا'' سے جس کا معنی ہے لوٹنا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وکل ذی غیبة یئوب وغـائـب الـمـوت لایـئـوب

''ہر غیب ہونے والا شخص لوٹ آتا ہے موت سے غائب ہونے والا لوٹتا نہیں'' (قرطبی)

وهو اشارة الی نعیم الأخره الذی لا یفنی و لا ینقطع '' ان الفاظ مبارکہ سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ اخروی نعمتیں فنا نہیں ہوں گی اور نہ ہی ختم ہوں گی (البحر المحیط)

یعنی بندے کو چاہئے کہ وہ فانی چیزوں سے محبت نہ کرے بلکہ باقی رہنے والی چیزوں سے محبت کرے وہ اخروی نعمتیں ہیں۔

خوبصورت بیان :

''ذکر الـلـه تـعـالـی اربعة اصناف من المال کل نو ع من المال یتمول به صنف من الناس اما الذهب والـفـضـه فیتـمـول بهـا التجار واما الخیل المسومة فیتمول بها الملوک واما الانعام فیتمول بها اهل البوادی واما الـحـرث فیتـمـول بهـا اهـل الـرسـا تیق فـتـکـون فتنة کل صنف فی النو ع الذی یتمول فاماالنساء والبنون ففتنة للجمیع''

سونے اور چاندی کو تاجر لوگ اپنا مال بناتے ہیں کہ وہ ان سے تجارت کرتے ہیں خوبصورت گھوڑے بادشاہوں کا مال ہے کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور شاہانہ انداز پر ان پر سوار ہوتے ہیں یعنی بادشاہوں کی ناز نخرے میں گھوڑے کی سواری بھی ہے چوپاؤں سے محبت باہر جنگل میں رہنے والوں کو ہوتی ہے یعنی ان کا مال چوپائے ہیں اس لئے کہ باہر جنگل میں خیموں میں رہنے والوں کو جانور پالنے آسان ہیں۔

دیہاتیوں کا مال کھیتی باڑی ہے یعنی ان کا زیادہ طور پر ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے آیۃ کریمہ میں ہر قسم کے مال کا ذکر کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ جن لوگوں کو جس مال سے محبت ہوگی اور جس مال کو حاصل کرنے کی وہ زیادہ کوشش کریں گے وہی ان کیلئے فتنہ ہوگا۔ عورتیں اور بیٹے سب لوگوں کیلئے ایک جیسے فتنہ ہیں کیونکہ تاجر ہوں یا بادشاہ جنگل میں رہنے والے ہوں یا دیہات میں سب ہی عورتوں اور بیٹوں سے محبت کرتے ہیں (از قرطبی)

کھیتی جب رب تعالیٰ سے غافل نہ کرے قابل تعریف ہے:

❁ عن انس بن مالک قال قال النبی ﷺ ما من مسلم غرس غرسا اوزرع فیاکل منه طیر او انسان اوبهیمة الاکان له به صدقة" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان درخت نہیں لگاتا یا کھیتی نہیں کاشت کرتا کہ اس سے پرندے یا انسان یا چوپائے کھائیں مگر یہ کہ اس کیلئے یہ صدقہ ہے۔

یعنی جب کوئی انسان درخت لگاتا ہے اور فصل کاشت کرتا ہے اس سے پرندے کھالیں یا جانور کھالیں یا نیچے گرا ہوا پھل وغیرہ انسان کھالیں تو اس کو صدقہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

کھیتی رب تعالیٰ سے دور کرے تو قابل مذمت ہے:

❁ "عن ابی امامة الباهلی قال وقدرای سکة وشیئامن آلة الحرث فقال سمعت رسول الله ﷺ یقول لا یدخل هذا بیت قوم الاادخله الذل" (رواہ البخای)

ابوامامہ باہلی نے "ہل اور کھیتی باڑی کے آلات میں سے کوئی آلہ" دیکھا تو کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ (کھیتی کے آلات) کسی قوم کے گھر داخل نہیں ہوئے مگر یہ کہ اس گھر میں ذلت داخل ہو جاتی ہے۔

وضاحت حدیث:

" قیل ان الذل هنامایلزم اهل الشغل بالحرث من حقوق الارض التی یطالبهم بها الائمه والسلاطین "

حدیث پاک میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کھیتی باڑی کے آلات کا کسی گھر میں داخل ہونا اس گھر میں ذلت کا داخل ہونا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وقت کے حکام اور بادشاہوں کے کہنے پر فقط وہ کھیتی باڑی میں مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بجا آوری سے غافل رہے۔

وقال المهلب معنی قوله فی هذا الحدیث والله اعلم الحض علی معالی الاحوال وطلب الرزق من اشرف الصناعات وذلک لمن خشی النبی ﷺ علی امته من الاشتغال با لحرث وتضییع رکوب الخیل والجهاد فی سبیل الله "

مہلب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب اپنے مالی حالت کو سنوارنے اور بلند کرنے کا حکم بھی موجود ہے اور رزق طلب کرنے کو سب سے اشرف صنعت قرار دیا گیا تو پھر حدیث پاک میں کھیتی باڑی کے آلات کو ذلت سے تعبیر کرنے کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف کھیتی باڑی میں مشغول رہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے

غافل رہے جہاد سے غافل رہے جہاد کیلئے گھوڑے نہ پالے اس طرح کھیتی باڑی میں مشغول رہنے کی حدیث شریف میں مذمت کی گئی ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

مسئلہ واضح ھوا: کہ اس آیۃ کریمہ میں جن چیزوں کا تذکرہ ہے اگر ان کی محبت رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے دور کرنے کا ذریعہ ہو تو قابل مذمت ہے۔ اگر یہی چیزیں رب تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ بن جائیں تو قابل تعریف ہیں البتہ اکثر طور پر ان چیزوں کی محبت غفلت کا ذریعہ ہی ہوتی ہے اسی وجہ سے ان کو دینا کا سامان اور فانی قرار دیا اسی آیۃ کریمہ کے آخری الفاظ اور آنے والی آیۃ کریمہ میں باقی رہنے والی اخروی نعمتوں سے محبت کرنے کا ذکر کیا۔ (راقم)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۱۵)

(1) تم فرماؤ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتادوں پرہیزگاری کیلئے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ستھری بیبیاں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھتا ہے۔

(2) آپ فرمادو ''کیا میں تمہیں خبر دوں اس سے بہتر کی'' ان لوگوں کیلئے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے ان میں اور پاکیزہ بیبیاں ہیں اور رضامندی ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے بندوں کا۔

پچھلی آیۃ کریمہ سے تعلق:

(۱) پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے) اور گویا

کہ یہ بیان فرما دیا"ان ذلک المآب کما انہ حسن فی نفسہ" تو وہ احسن اور افضل ہے اس دنیا سے، لیکن جب اس کا تقابل دنیا کی نعمتوں اور دنیا کے ٹھکانوں سے کیا جائے"فھو احسن و افضل من ھذہ الدنیا" تو وہ احسن اور افضل ہے اس دنیا سے، یعنی اس دنیا سے وہ ٹھکانا زیادہ حسن رکھنے والا ہوگا اور زیادہ بہتر ہوگا۔ پہلے مطلقا اخروی ٹھکانے کا حسن ہونا ذکر کیا، اب اس کا احسن ہونا ذکر کیا اور ارشاد فرمایا ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ "خیر" اسم تفضیل ہے۔ اسم تفضیل میں زیادتی بنسبت غیر کے ہوتی ہے۔

(۲) پچھلی آیۃ کریمہ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا، انسان عام طور پر دنیا کی نعمتوں کو ہی نفع مند سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اس نے دیکھی ہوتی ہیں"فبین فی ھذہ الآیۃ ان منافع الآخرۃ خیر منھا" تو اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر فرمایا کہ بیشک آخرت کے منافع دنیا کے منافع سے زیادہ بہتر ہیں۔ جس طرح ایک اور آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ اور آخرت بہت ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ اس آیۃ میں لفظ"خیر" ہے جو بنسبت غیر کے افضلیت کا تقاضا کرتا ہے۔ لھذا مطلب اس کا بھی یہ ہے کہ آخرت دنیا سے زیادہ اچھی ہے، اور آخرت ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والی ہے اور دنیا فنا ہونے والی ہے۔

(۳) پچھلی آیۃ کریمہ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا، جن میں بظاہر منافع اور حسن انتظام پایا جاتا ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت دنیا سے بہتر و افضل ہے۔"والمقصود منہ ان یعلم العبد انہ کما ان الدنیا اطیب واوسع وافسح من بطن الام فکذلک الآخرۃ اطیب واوسع وافسح من الدنیا" مقصد اس بیان کا یہ ہے کہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ جس طرح دنیا کی نعمتیں ماں کے پیٹ سے اچھی اور وسیع ہیں، اسی طرح آخرت کی نعمتیں دینا سے اچھی اور وسیع ہیں۔ (کبیر)

در حقیقت انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دل لگا لیتا ہے دوسری جگہ منتقل ہونے سے ڈرتا ہے، جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے وہاں ہی اس کا دل لگا ہوتا ہے، پیدا ہونے پر روتا ہے کہ وہ کہاں آگیا۔ پھر دینا سے اس کا دل ایسا لگ جاتا ہے کہ یہاں سے منتقل ہونے سے ڈرتا ہے لیکن یہاں سے جب قبر میں منتقل ہو جاتا ہے تو آخرت کی طرف منتقل ہونے سے ڈرتا ہے۔ جب قبر سے اٹھایا جائے گا تو خوف کی وجہ سے اس کے بال سفید ہو جائیں گے۔ تو رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ میں دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہونے کی رغبت دلائی ہے کہ اخروی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہیں، اس لئے اے انسان اخرت کی طرف منتقل ہونے سے نہ ڈر۔

اخروی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے بہتر کیوں؟

(۱) دنیا کی نعمتیں اگرچہ نفع مند ہیں لیکن ان میں نقصانات بھی پائے جاتے ہیں۔اور تکالیف بھی پائی جاتی ہیں لیکن اخروی نعمتیں نقصانات سے پاک ہوں گی اور ان میں کسی قسم کی تکالیف نہیں ہوں گی۔

(۲) دنیا کی نعمتیں فانی ہیں،اور اخروی نعمتیں باقی ہیں،یقیناً باقی رہنے والی نعمتیں باقی رہنے والی نعمتوں سے بہتر ہیں۔ (از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ﴾ میں ہمزہ استفہام کیلئے استعمال ہے۔اس استفہام میں تین احتمال ہیں۔

(۱) ایک احتمال ان میں سے یہ ہے کہ جملہ استفہامیہ ہو﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا آپ فرمادیں کیا میں تمہیں خبر دوں اسے سے بہتر چیز کی؟اس سے آگے جملہ علیحدہ ہے پرہیزگاروں کیلئے ان کے رب کے ہاں جنتیں ہیں ان کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،اور(ان جنتوں میں ان پرہیزگاروں کیلئے)پاک بیبیاں ہوں گی،اور(ان پرہیزگاروں کو)اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگی۔

(۲) جملہ استفہامیہ ہو﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾اس کے بعد نیا جملہ ہو۔اس ترکیب کے لحاظ پر معنی ہوگا" کیا میں تمہیں خبر دوں اس سے بہتر چیز کی جو پرہیزگاروں کیلئے ہے ان کے رب کے ہاں؟ بعد والا جملہ اس کا بیان ہوگا﴿جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ راقم کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ "پرہیزگاروں کیلئے ہے ان کے رب کے ہاں۔"

تقویٰ کی مکمل وضاحت تو سورۃ بقرۃ کی ابتداء میں کردی گئی کہ تقویٰ کیا ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں،مختصر طور پر یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

(۱) "التقوی عبارۃ عن اتقاء الشرک" تقویٰ کی ایک قسم یہ ہے کہ شرک سے بچنا۔

(۲) "ان الانسان لایکون متقیا الااذا کان آتیا بالواجبات محترزا عن المحظورات"
انسان متقی صرف اس صورت میں ہوگا جب وہ واجبات پر عمل کرے گا اور ممنوع چیزوں سے بچے گا۔

(۳) "التقوی ھو التبتل الی اللہ تعالی والاعراض عما سواہ"

تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ کامل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو اور اس کے سوا تمام چیزوں سے اعراض پایا جائے،یہاں

تقوی کی کون سی قسم مراد ہے؟ روح البیان نے تقوی کی تیسری قسم مراد لی ہے، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے تقوی سے مراد عام لیا ہے کہ شرک سے بچنے والے کو بھی یہ نعمتیں حاصل ہوں گی۔

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ شرک سے بچنے والے خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہوں وہ بھی جنت میں جائیں گے اگر چہ نظام عدل پر وہ عتاب کے بھی مستحق ہوں گے۔اور اوامر پر عمل کرنے والے اور نواہی سے بچنے والے ابتداء طور پر ہی جنت میں داخل کر دئے جائیں گے،اور اللہ تعالی کی طرف کامل طور پر توجہ کرنے والے اور غیروں سے اعراض کرنے والے اس کے خصوصی تقرب کے مستحق بھی ہوں گے۔ (راقم)

﴿جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''جنتیں جاری ہوں گی ان کے نیچے نہریں''

جنت پاکیزہ مقام ہے،اس میں ہر قسم کا طعام صاف ستھرا،اور پاکیزہ ہوگا،اور اس میں پاکیزہ مشروب ہوں گے،اور اچھا لباس اور اچھے فراش اور حسن منظر پایا جائے گا جیسا کہ رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ ان (جنتوں) میں وہ چیزیں ہوں گی جن کی نفوس خواہش کریں گے اور آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ''ہمیشہ رہیں گے ان میں۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں،یعنی ان میں بقاء ہے فنا نہیں کیونکہ کوئی نعمت بھی خواہ کتنی بڑی ہو جب اس پر فنا آئے تو اسے بڑی نعمت نہیں سمجھا جائے گا۔

﴿وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ ''اور پاکیزہ بیبیاں۔''

یعنی جنت کی نعمتوں میں بہت بڑی نعمت یہ ہوگی کہ ان متقی لوگوں کو پاکیزہ بیبیاں حاصل ہوگی۔"وتحقيق القول فيه النعمة وان عظمت فلن تتكامل الابالازواج اللواتى لايحصل الانس الابهن" تحقیق قول کی اس میں یہی ہے کہ بیشک نعمت اگر چہ عظیم ہو وہ ہرگز کامل نہیں ہوتی سوائے بیبیوں کے، کیونکہ ان کے بغیر کامل انس ومحبت حاصل نہیں۔

قرآن پاک کا ایک لفظ کتنے مطالب کو حاوی (شامل) ہے:

اللہ تعالی نے جنتی بیبیوں کی صفت بیان فرمائی "مطهرة" وہ پاکیزہ ہوں گی۔اس ایک لفظ "مطهرة" میں عظیم بیان موجود ہے۔

"ويدخل فى ذلک الطهارة من الحيض والنفاس وسائر الاحوال التى تظهر عن

النسـاء فی الـدنیا مـمـا ینفر عنه الطبع ویدخل فیه کونهن مطهرات من الاخلاق الذمیمة ومن القبح وتشویه الخلقة ویدخل فیه کونهن مطهرات من سوء العشرة“
یعنی وہ جنتی بیبیاں حیض اور نفاس سے پاک ہوں گی۔اور ان کے چہرے پر کوئی بدنما داغ نہیں ہوں گے۔خوبصورت صاف،ستھرا چہرہ ہوگا۔معاشراتی برائیوں سے وہ پاک ہوں گی،یعنی دنیاوی عورتوں کی طرح جھگڑا کرنے والی نہیں ہوگی،وہ جھگڑے،،فساد سے پاک ہوں گی۔ (کبیر)

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور رضاء مندی ہوگی اللہ تعالی کی طرف سے۔

یعنی پرہیز گاروں کو اللہ تعالی کی رضاء مندی حاصل ہوگی۔یہ بہت عظیم نعمت ہوگی اللہ تعالی نے دوسرے مقام میں بیان فرمایا﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ اللہ تعالی کی رضاء مندی سب چیزوں سے بڑی چیز ہے۔
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے: ”رضـوان“ عام قراءت بضم الراء ہے،یہ قیس اور تمیم کی لغت ہے،اس قراءت کے مطابق ”طـغیـان،رجـحـان،کفران،شکران“ کے وزن پر ہے اور باقی قراء کی قراءت میں بالکسر استعمال ہے۔اس صورت میں ”حرمان اور قربان کے وزن پر ہے۔ (کبیر)

متکلمین کا قول:

ثواب کے دو رکن ہیں۔ایک مـنـفـعـت جس کا ذکر ہو چکا ہے یعنی ان کو جنتیں حاصل ہوں گی ان کے نیچے نہریں جاریں ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے،اور ان کو پاکیزہ بیبیاں حاصل ہوں گی۔ثواب کا دوسـرا رکـن تـعـظـیم ہے،رضوان سے وہی مراد ہے۔اس لئے کہ جنت والوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ منفعت والی نعمتوں کے ساتھ ساتھ ان کو اللہ تعالی کی رضاء بھی حاصل ہوگی،اللہ تعالی ان کی تعریف بھی کرے گا۔”فهـو ازیـد فی ایجاب السرور من تلک المنافع“ تو ان کو منفعت سے بڑھ کر اس سے سرور حاصل ہوگا کہ ہمیں اللہ تعالی کی رضاء مندی حاصل ہوئی ہے۔

حکماء کا قول:

جنات کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد جنت جسمانیہ ہے،اور رضوان کا ذکر کر کے جنت روحانیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اعلی مقام جنت روحانیہ ہے۔
”وهو عبارة عـن تـجـلـی نـور جـلال الـلـه تعالی فی روح العبد واستغراق العبد فی

معرفته،ثم بصیر فی اول هذه المقامات راضیا عن الله تعالی وفی آخرها مرضیا عند الله تعالی والیه اشار بقوله "راضیة مرضیة"

رضوان کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نورانی تجلیات بندے کی روح میں آجاتی ہیں، اوران کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہوجاتا ہے، پھراس کو پہلا مقام یہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور دوسرا مقام یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے، اسی کو رب تعالیٰ نے اپنے ارشاد گرامی ﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ سے تعبیر فرمادیا۔

جب اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل ہوگئی تو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ اسی کا پتہ چلا ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ سے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی سب چیزوں سے بڑی چیز ہے۔ (ازکبیر)

❀ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللهﷺ ان الله تبارک وتعالی یقول لا هل الجنة یا اهل الجنة فیقولون لبیک ربنا وسعدیک والخیر فی یدیک فیقول هل رضیتم فیقولون ومالنا لانرضی یا رب وقداعطیتنا مالم تعط احدا من خلقک فیقول الااعطیکم افضل من ذلک فیقولون یا رب وای شئ افضل من ذلک فیقول احل علیکم رضوانی فلا اسخط علیکم بعده ابدا" (بخاری ومسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ جنت والوں کو فرمائے گا ''اے جنت والو'' وہ کہیں گے ''لبیک ربنا وسعدیک' تمام بھلائیاں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں، رب تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں اے ہمارے رب ہم کیوں راضی نہ ہوں، تحقیق تو نے ہمیں وہ نعمتیں عطاء کیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں عطاء کیں، رب تعالیٰ فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے زیادہ بہتر چیز عطاء نہ کروں، وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! اس سے بہتر اور کیا چیز ہوگی؟ تو رب تعالیٰ فرمائے گا'' میں تمہیں اپنی رضاء مندی عطاء کررہا ہوں اس کے بعد تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

حدیث پاک سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنت کی نعمتیں اگرچہ عظیم نعمتیں ہیں، باقی رہنے والی ہیں، فنا ہونے والی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی سب نعمتوں سے بڑی ہے، اعلیٰ اور افضل ہے۔ (ازمظہری)

شاندار ترتیب:

"وقد نبه تعالی فی الآیتین علی مراتب نعمائه فادناها متاع الحیاة الدنیا واعلاها رضوان الله لقوله تعالی (ورضوان من الله اکبر) واوسطها الجنة ونعیمها"

رب تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ ﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر فرمایا، جو گھٹیا ہیں ان کو دنیا کا سامان قرار دیا، جس سے ان کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد جنت اور جنت کی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اگر چہ یہ باقی رہنے والی نعمتیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضاء کے مقابل ان کا مقام بھی کم ہے، لھذا ان کو وسط میں ذکر کیا۔ پھر اعلیٰ درجہ کی نعمت کا ذکر کیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی حاصل ہو گی، اسے ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ سے ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی تمام چیزوں سے اعلیٰ ہونے کا تذکرہ ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ میں ہے۔ (ماخوذ از سراج منیر حاشیہ جلالین)

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ علم رکھنے والا ہے بندوں کا۔''

بصیر کو جب "بصر" بصارت سے لیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے ''دیکھنے والا'' اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ فرمایا ''اور اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھتا ہے'' اور جب "بصیرت" سے لیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے ''دل سے دیکھنا'' یعنی علم رکھنا'' راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''اور اللہ علم رکھنے والا ہے بندوں کا'' راقم نے ترجمہ ''جلالین اور کبیر'' سے لیا ہے، (واللہ بصیر) عالم (بالعباد) فیجازی کلامنهم بعمله'' ''اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو'' تو ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ (جلالین)

(والله بصیر بالعباد) ای عالم بمصالحهم، فیجب ان یرضوا لانفسهم ما اختاره لهم من نعیم الآخرة و ان یزهدوا فیما زهدهم فیه من امور الدنیا" (کبیر)

''اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو'' یعنی ان کے مصالح (بہتر کاموں) کو جاننے والا ہے، اس لئے بندوں کو چاہئے کہ وہ اپنے نفسوں کیلئے وہ کام پسند کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے پسند کئے ہیں اور ان پر آخرت میں نعمتیں عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور بندے صرف دنیاوی کاموں سے دور رہیں جن سے رب تعالیٰ نے دور رہنے کا حکم دیا ہے یا اتنی حد تک ان کو حاصل کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے غافل نہ کریں۔ ورنہ وہ انسان اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت سے دور رہیں گے۔

خیال رہے کہ اس آیۃ کریمہ میں وعدہ پایا گیا ہے کہ اچھے عمل کرنے والوں کو اخروی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اور وعید بھی پائی گئی ہے کہ برے اعمال کرنے والے نظام عدل کے مطابق عذاب و عتاب کے مستحق ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ (از قرطبی)

❁ ''وذکر الله سبحانه ما زاد علی نعماء الدنیا و لا مزید علیه و هو رضون الله فانه هو

الفارق البائن بین نعماء الدنیا ونعماء الجنة فان الدنیا ملعونة وملعون ما فیھا الاما ابتغی بہ وجہ اللہ عزوجل وجی روایة الاذکر اللہ وما والاہ وعالما ومتعلما"
"رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن مسعود"

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ایسی نعمت کا تذکرہ فرمایا، جس سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی وہ ہے "رضوان من اللہ" (اللہ تعالیٰ کی رضاء مندی) بیشک اس سے دنیا کی نعمتوں میں اور جنت کی نعمتوں میں واضح طور پر فرق کو بیان کر دیا گیا۔ دنیا ملعون (لعنت کی مستحق) ہے اور دنیا کا ساز و سامان ملعون ہے، سوائے اس کے کہ دنیا کے سامان سے اللہ تعالیٰ کے رضامندی کو حاصل کیا جائے۔

ایک روایت میں ہے سوائے اس کے کہ (یعنی دنیا کا مال ملعون نہیں جبکہ) وہ دنیا کامل اللہ تعالیٰ کی یاد کا ذریعہ بنے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ولیوں کی یاد آئے اور اس کے ذریعے علماء اور متعلمین (طلباء کرام) کو یاد کرے۔ (از مظہری)

❁ "عن ربیعة الجرسی قال قال رسول اللہ ﷺ قیل لی فی المنام سید بنی دارا وصنع مادبة وارسل داعیا فمن اجاب الداعی دخل الدار واکل من المأدبة ورضی عنه السید ومن لم یجب الداعی لم یدخل الدار ولم یاکل من المادبة وسخط علیه السید قال واللہ سید ومحمد الداعی والدار الاسلام والمادبة الجنة" (رواہ الدارمی)

ربیعہ جرسی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں بتایا گیا کہ مالک نے ایک گھر بنایا، اس میں دستر خوان بچھایا اور ایک شخص کو دعوت دینے کیلئے بھیجا، جس شخص نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا، گھر میں داخل ہو گیا، اس نے دستر خوان سے کھالیا اور مالک مکان بھی اس پر راضی ہو گیا اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہیں کیا، گھر میں داخل نہیں ہوا، اس نے دستر خوان سے کھانا نہیں کھایا اور مالک مکان اس پر ناراض ہو گیا۔ (اس خواب سے یہ بتایا گیا کہ) اللہ تعالیٰ مالک ہے، اور دعوت دینے والے محمد ﷺ ہیں اور گھر سے مراد "دار اسلام ہے اور دستر خوان سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ (از مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁
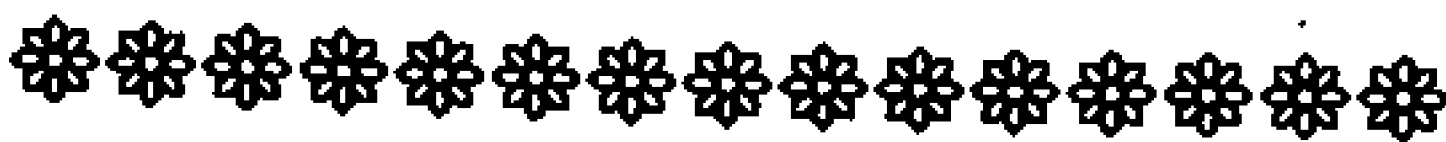
﴿اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ﴾ (آیۃ نمبر ۱۶)

(1) وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہ معاف کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔"

(2) وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا تو بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ جنت متقین (پرہیزگاروں) کیلئے ہے اب اس آیۃ کریمہ میں متقین کی عظیم صفت کو ذکر کیا جارہا ہے جو سب نیکیوں کی اصل ہے وہ ہے ایمان "فبدأ بالایمان الذی هو رأس التقوی" ایمان سے ابتداء کی کیونکہ وہ تقوی کی اصل ہے پھر ان کی دعاء کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ ذکر فرمادیا کہ انہوں نے اپنے ایمان لانے کی خبر دی۔"واکد الجملة بان مبالغة فی الاخبار" اپنی خبر میں مبالغہ ثابت کرنے کیلئے اور زور دینے کیلئے دعائیہ جملہ کو تاکید سے ذکر فرمایا "اننا آمنا" بیشک ہم ایمان لائے' ایمان کے ذکر کے بعد انہوں نے مغفرت کی دعاء کی آگ کے عذاب سے بچانے کی دعاء کی۔ (البحرالمحیط)

"آمنابک وبکتابک وبرسولک" متقین کا یہ کہنا کہ "بیشک ہم ایمان لائے" اس کا یہ مطلب ہے کہ اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر ایمان لایا، اور تیری کتاب پر ایمان لایا 'اور تیرے رسول پر ایمان لایا۔"فاغفرلنا ذنوبنا" ای بایماننابک وبما شرعته لنا فاغفرلنا ذلوبنا بفضلک ورحمتک" بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو' اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب بیشک ہم نے تجھ پر ایمان لایا اور جو تو نے ہمارے لئے کام مشروع فرمائے ان پر ہم نے ایمان لایا، اسلئے اے ہمارے رب تو ہمارے ایمان کی وجہ سے ہماری مغفرت فرما لیکن اے اللہ ہم ایمان لانے کے باوجود تجھ سے تیرے فضل اور رحمت کا سوال کرتے ہیں کہ تو اپنے فضل اور اپنی رحمت سے ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ (صابونی)

"(ربنا اننا آمنا) اجابة لدعوتک (فاغفرلنا ذنوبنا) انجاز الوعدک" (مدارک)

اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا تیری دعوت کو قبول کرتے ہوئے تو بخش دے ہمارے لئے

ہمارے گناہوں کو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے۔

امید ہے کہ طلباء کرام کو راقم کا ترجمہ "لنا" کا ہمارے لئے" سمجھ آ گیا ہوگا کیونکہ راقم کا ترجمہ اس چیز کو ظاہر کر رہا کہ اس میں حذف مضاف ہے اصل مطلب یہ ہو گیا (فاغفر لنا) ای لایماننا (ذنوبنا) ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو معاف فرما'' کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ایمان کی وجہ سے اپنے فضل و کرم سے ہماری مغفرت فرما۔

﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے''

"وقنا" میں ''واؤ'' علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے''اور'' اور "ق" علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے ''بچا'' یہ لفظ لیا ہوا ہے "وقی یقی وقیا" سے اور "نا" علیحدہ لفظ ہے جس کا معنی ہے ''ہمیں''۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الذین یقولون" جملہ کی حرکات کیا ہیں اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ مجرور محلا ہو اور صفت ہو ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ کی اس صورت میں معنی یہ ہوگا پرہیزگار لوگ (جن کا ذکر پہلے آ رہا ہے وہ) یہ کہتے اے ہمارے رب ہم نے ایمان لایا۔

(۲) ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جملہ صفت ہو "بالعباد" کی اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ واولئک هم المتقون الذین لهم عندربهم جنات هم الذین یقولون ربنا اننا آمنا'' اور اللہ جاننے والا ہے بندوں کو وہ متقی لوگ ہیں ان کیلئے ان کے رب کے ہاں جنتیں ہیں، اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا،، الخ۔ خیال رہے کہ اس صورت میں بھی جملہ مجرور محلا ہی رہے گا، کیونکہ "بالعباد" مجرور ہے

(۳) ان میں تیسری وجہ ہے کہ یہ جملہ منصوب محلا ہو اور نصب ہو مدح کے طور پر، اس صورت میں معنی یہ ہوگا وہ لوگ قابل تعریف ہیں جو یہ کہتے ہیں'' اے ہمارے رب بیشک ہم نے ایمان لایا'' الخ

(۴) ان میں سے چوتھی صورت یہ ہے کہ جملہ مرفوع محلا ہو اور رفع تخصیص پر دلالت کرے تقدیر عبارت کی اس طرح ہو "هم الذین یقولون ربنا اننا آمنا" الخ یعنی اللہ کے بندوں سے خاص لوگ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم ایمان لائے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ عظیمہ: اللہ تعالی نے پہلے یہ ذکر فرمایا ﴿اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا﴾ (وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بیشک ہم ایمان لائے) اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ (تو بخش دے ہمارے لئے گناہوں کی)

"وذلک یدل علی انهم تو سلوا بمجرد الایمان الی طلب المغفرة و الله تعالی حکی ذلک عنم فی معرض المدح لهم و الثناء علیهم ،فدل هذا علی ان العبد بمجرد الایمان یستوجب الرحمة و المغفرة من الله تعالی" (کبیر)

اسی سے واضح ہو گیا کہ صرف ایمان کو وسیلہ بنانا مغفرت طلب کرنے کیلئے کافی ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جنہوں نے ایمان کے بعد اللہ تعالی سے مغفرت کا سوال کیا، اسی سے پتہ چل گیا کہ بندہ صرف ایمان لانے سے رب تعالی کی رحمت اور مغفرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ (از کبیر)

"الفاء للسببیة وفیه دلیل علی ان مجرد الایمان سبب لاستحقاق المغفرة"

"فاغفرلنا ذنوبنا" پر فاء سببیت پر دلالت کر رہی ہے جو دلیل ہے اس پر کہ فقط ایمان سبب ہے مستحق مغفرت ہونے کا۔

یہ عام ہے کہ اللہ تعالی اس شخص کو صرف ایمان کی وجہ سے اپنے فضل وکرم سے بخش دے، یا اسے نظام عدل کے مطابق سزا دے پھر وہ سزا کاٹنے کے بعد جنت میں داخل کر دیا جائے، آیئے اسی مسئلہ پر میرے پیارے مصطفی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دیکھئے۔

❁ "عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ حق الله علی العباد ان یعبدوه و لایشر کوا به شیأوحق العباد علی الله ان لا یعذب من لا یشرک به شیأقال معاذ افلاابشربه الناس قال لا تبشرهم فیتکلوا" (بخاری ومسلم)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور (اور اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے بندوں کے حقوق جو اپنے ذمہ لئے ہوئے ہیں) ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ساتھ جو شخص شریک نہ ٹھہرائے اللہ اسے عذاب نہ دے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا ان کو بشارت نہ دے وہ اسی پر بھروسہ کرلیں گے۔ (ماخوذ از مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ○﴾
(آیۃ نمبر ۱۷)

(1) صبر والے اور سچے اور ادب والے اور راہ خدا میں خرچنے والے اور پچھلے پہر سے معافی مانگنے والے۔

(2) صبر کرنے والے اور سچے اور اطاعت کرنے والے اور صدقہ کرنے والے اور بخشش طلب کرنے والے سحری کے وقت۔

تنبیہ: راقم نے ﴿وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ کا ترجمہ جلالین سے لیا ہے (والقانتین) المطیعین للہ (والمنفقین) المتصدقین "**قانتین**" وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور (**منفقین**) وہ ہیں جو صدقہ کرتے ہیں تفصیل انشاء اللہ آگے آرہی ہے۔

﴿اَلصّٰبِرِیْنَ﴾ ''صبر کرنے والے''

نصب علی وجہ المدح ہے یعنی جن صفات کا ذکر کیا ہے ان صفات والے قابل تعریف ہیں، ''صبر'' کا معنی ہے ''نفس کو ان خواہشات سے روکنا جو شرعاً ممنوع ہیں۔ صبر کی تین قسمیں ہیں۔

''الصبر علی الطاعة، والصبر عن المعصية والصبر علی المكروه''

(۱) اطاعت پر صبر کرنا، یعنی واجبات اور مستحباب کو ادا کرنا اور ان پر قائم رہنا۔

(۲) معصیت سے رک جانا یعنی ہر وہ کام جو شریعت میں منع ہے اس سے رک جانا، اس کام کو چھوڑ دینا۔

(۳) محنت ومشقت اور مصائب وآلام، تکالیف پر صبر کرنا یعنی ان چیزوں کو برداشت کرنا، جزع وفزع نہ کرنا، نہ روئے، نہ چلائے، نہ چیخ وپکار کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کی تقدیر پر راضی رہیں۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (صبر کرنے والے) وہ لوگ ہیں جب ان کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بیشک ہم اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں اور بیشک ہم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ اور ہم نے ان میں کچھ امام بنائے کہ ہمارے حکم سے بتاتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر کیا۔

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ ان کو یہ بلند درجات اللہ تعالیٰ کی

طرف سے صبر کی وجہ سے حاصل ہوئے۔اور اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی ﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾ اور صبر والے مصیبت اور سختی میں، اور جہاد کے وقت۔

(ماخوذ از روح البیان وغیرہ)

اولیاءِ عظام کے نزدیک سب سے مشکل صبر:

"ویروی انه وقف رجل علی الشبلی فقال ای صبر اشد علی الصابرین فقال الصبر فی الله تعالی فقال لا فقال الصبر لله تعالی" فقال لا' الصبر مع الله تعالی قال لا قال فایش (فای شئ)قال الصبر عن الله تعالی فصرخ الشبلی صرخة کا دت روحه تتلف"

حضرت شبلی رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے سوال کیا کہ صابرین پر سب زیادہ مشکل صبر کون سا ہے؟ تو انہوں نے کہا "الصبر فی الله" سب سے مشکل صبر ہے "الصبر فی الله "کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ میں صبر کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد میں قائم رہنا یہ بہت مشکل صبر ہے، اس شخص نے کہا یہ صبر سب سے مشکل نہیں۔ حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا "الصبر لله" سب سے زیادہ مشکل ہے گا "الصبر لله " کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضاء پائی جائے اس کی رضاء کیلئے اچھا کام کیا جائے اور اسی کی رضاء کیلئے برے کام سے رک جائے اس پر قائم رہنا اور یہ صبر سب سے زیادہ مشکل ہے۔اس شخص نے کہا نہیں یہ تمام صبروں سے مشکل نہیں، حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا "الصبر مع الله " تمام صبروں سے مشکل ہوگا "الصبر مع الله " کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے اس کی رحمت کی معیت (ساتھ) حاصل کی جائے اس پر قائم رہنا اور اس پر صبر سب صبروں سے مشکل ہے۔اس شخص نے کہا یہ تمام صبروں سے مشکل نہیں، حضرت شبلی رحمہ اللہ نے اس اللہ کے بندے سے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ کہ وہ صبر جو سب صبروں سے مشکل ہے وہ کون سا صبر ہے اس شخص نے کہا وہ "الصبر عن الله تعالی " ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے دور رہنے پر صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ سے غافل رہنے پر قائم رہنا سب صبروں سے مشکل صبر ہے۔حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

حقیقت یہی ہے کہ رب تعالیٰ سے دوری اور اس سے غفلت اللہ کے نیک بندوں کیلئے بہت مشکل کام ہے۔

﴿وَالصَّادِقِينَ﴾ "اور سچے"

"اعلم ان لفظ الصدق قد یجری علی القول والفعل والنية"

جان لو بیشک لفظ "صدق" کبھی قول پر بولا جاتا ہے یعنی سچ بولنے والے، اور کبھی "صدق" فعل پر بولا جاتا

ہے یعنی وہ اپنے فعل میں سچے ہیں اور کبھی ''صدق'' نیت پر بولا جاتا ہے یعنی وہ نیت میں سچے ہیں۔ان تمام قسموں میں سے قول میں صدق زیادہ مشہور ہے۔اس کا مقابل ''کذب'' ہے یعنی اس صورت میں دونوں لفظوں کا معنی ہوگا سچ بولنے والے (صادقین) اور جھوٹ بولنے والے کاذبین ،فعل میں صدق کا یہ مطلب ہے،وہ اپنے کام کو مکمل کرتے ہیں۔مکمل کرنے سے پہلے چھوڑتے نہیں جیسے کہا جاتا ہے ''صدق فلان فی القتال'' فلاں شخص نے جنگ کو سچ کر کے دکھایا یعنی جنگ کرنے کا حق ادا کر دیا ''صدق فلان فی الحملة'' فلاں شخص حملہ کرنے میں جھوٹا ثابت ہوا یعنی بزدلی سے اس نے حملہ کیا۔

نیت میں سچا ہونے کا کیا مطلب؟

''الصدق فی النیة امضاء العزم و الاقامة علیه حتی یبلغ الفعل''

نیت میں سچا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لینا، پھر اس پر قائم رہنا، یہاں تک کہ اسی نیت کے مطابق کام کو مکمل کر لے۔ (ماخوذ از کبیر)

تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو کتنا خوب اور کامل ترجمہ نظر آئے گا۔آپ نے ''والصادقین'' کا ترجمہ کیا ہے ''اور سچے'' راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے کیونکہ اگر ترجمہ کیا جاتا ''سچ بولنے والے'' تو یہ صرف ''صدق فی القول'' (قول کے سچے) کو شامل ہوتا۔''صدق فی الفعل'' (کام کے سچے اور پکے) اور ''صدق فی النیة'' (نیت کے سچے) کو شامل نہ ہوتا لیکن جب ترجمہ صرف یہ کیا ''اور سچے'' یہ تینوں قسموں کو شامل ہے۔

قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت:

''بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ ''الذین یصبرون ویصدقون'' (وہ جو صبر کرتے ہیں اور سچ کو کام میں لاتے ہیں) کا بھی وہی مطلب جو ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ کا مطلب ہے،لیکن جب غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں جو ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ استعمال ہے۔اس میں وہ کمال پایا گیا ہے جو ''الذین یصبرون ویصدقون'' میں نہیں پایا گیا، کیونکہ اس جملہ کا معنی اس وقت بھی صحیح ہوگا جب وہ کبھی کبھی صبر کرتے ہوں اور سچ بولتے ہوں،لیکن

''قوله تعالی (الصابرین و الصادقین) یدل علی ان هذاالمعنی عادتهم و خلقهم و انهم لا ینفکون عنها''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ''الصابرین و الصادقین'' اس پر دلالت کر رہا ہے ان کی عادت اور گویا کہ پیدائشی صفت ہی

یہ ہے کہ ''وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں'' یہ صفت ان سے کبھی زائل نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَالْقَانِتِيْنَ﴾ ''اور اطاعت کرنے والے۔''

''قانتین'' کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں

''قالوا فی القانتین''الحافظین للغیب وقال الزجاج القائمین علی العبادة وقیل القائمین بالحق وقیل الداعین المتضرعین وقیل الخاشعین وقیل المصلین''

(البحر المحیط)

''قانتین'' کا معنی اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی حفاظت کرنا خواہ کوئی دیکھ رہا یا نہیں دیکھ رہا۔ زجاج نے کہا س کا معنی ہے عبادت پر قائم رہنا۔ بعضوں نے کہا ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں بلانے والے، عاجزی کرنے والوں کو'' قانتین کہا جاتا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ **قانتین** کا مطلب ہے خشوع کرنے والے اور بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ **قانتین** کا مطلب ہے ''نماز ادا کرنے والے'' اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ''ادب والے'' سب معانی کو شامل ہے اور راقم نے جو معنی جلالین سے نقل کیا ہے ''اطاعت کرنے والے'' وہ بھی سب معانی کو حاوی ہے۔

﴿وَالْمُنْفِقِيْنَ﴾ ''اور صدقہ کرنے والے''

اصل میں لغوی معنی ''انفاق'' کا خرچ کرنا ہے، لیکن یہاں نیک لوگوں کی صفات بیان کی جارہی ہیں اسلئے مطلقاً بے جا خرچ کرنا تو مراد نہیں ہوسکتا، وہی خرچ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہوگا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی لئے ترجمہ ہی یہ فرمایا ''اور راہ خدا میں خرچنے والے'' راقم نے جلالین سے ترجمہ لیا جو مختصر ہے اور تمام انواع کو شامل ہے یعنی ''صدقہ کرنے والے'' علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کونھم منفقین ویدخل فیه انفاق المرء علی نفسه واهله وأقاربه وصلة رحمه وفی الزکوة والجهاد وسائر وجوه البر'' (کبیر)

خرچ کرنے سے مراد عام ہے خواہ وہ اپنے آپ پر خرچ کریں کہ یہ کپڑا پہن کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، کھانا کھائیں گے تب ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکیں گے تو یہ اپنے پر خرچ کرنا بھی صدقہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اہل وعیال پر خرچ کرتے ہیں کہ ان کے حقوق اللہ تعالیٰ نے میرے ذمہ لگا رکھے ہیں، جن کا پورا کرنا میری ذمہ داری ہے۔ تو یہ مال اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔

حضرت سعد ﷺ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

"ولست تنفق تبتغی بھا وجہ اللہ الا اجرت بھا حتی اللقمة تجعلھا فی فی امرأتک"
(مسلم ج ۲ ص ۴۷ کتاب الوصیة)

اور نہیں خرچ کرو گے تم اللہ تعالی کی رضاء طلب کرنے کیلئے مگر یہ کہ تمہیں اس کا اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی زوجہ کے منہ میں ڈالو گے اس کا اجر بھی ملے گا۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ان الانفاق علی العیال یثاب علیہ اذا قصد بہ وجہ اللہ تعالی" جب انسان اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے تو اسے ثواب دیا جائے گا جبکہ اس نے اللہ تعالی کی رضاء کے ارادہ سے مال خرچ کیا ہوگا، اور علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی حدیث سے یہ سمجھ آیا "ان الانسان اذا فعل شئیا اصلہ علی الاباحة وقصد بہ وجہ اللہ یثاب علیہ" بیشک انسان جب کوئی کام کرتا ہے جو کہ اصل میں مباح ہو لیکن اسنے وہ کام اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر کیا ہو تو اسے ثواب عطاء کیا جاتا ہے۔

اسی طرح قریبی رشتہ داروں پر مال خرچ کرے کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَاُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ﴾ ذی رحم بعض، بعض سے زیادہ حقدار ہیں اور زیادہ قرب ان کو حاصل ہے۔ اور اسی طرح صلہ رحمی کا حکم دیا گیا" تو یہ مال خرچ کرنا بھی اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرنا ہوگا، اور اسے صدقہ کا حکم حاصل ہوگا۔ غرضیکہ ہر طرح نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنا خواہ زکوۃ ہو، یا جہاد ہو سب ہی صدقہ کا درجہ رکھتے ہیں، اور سب ہی طریقوں میں مال خرچ کرنا اللہ تعالی کی راہ میں ہی خرچ کرنا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝﴾ "اور بخشش طلب کرنے والے سحری کے وقت۔"

"سحر" صبح صادق سے پہلے وقت کو کہا جاتا ہے، جو رات کا چھٹا حصہ ہے، وہ سحری کا وقت ہے۔ "سحور" (سین کے فتحہ سے) "سحری کا کھانا" اور "سحور" (سین کے ضمہ سے) سحری کا کھانا کھانا" "تسحر" اس نے سحری کا کھانا کھایا۔

سحری کے وقت بخشش طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات کو بیدار ہو کر تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں، پھر اللہ تعالی سے بخشش طلب کرتے ہیں اور دعاء کرتے ہیں۔

"لان الانسان لایشتغل بالدعاء والاستغفار الا ان یکون قد صلی قبل ذلک"

کیونکہ انسان سحری کے وقت وہی بخشش طلب کرتا ہے اور وہی دعا کرتا ہے جو اس سے پہلے نماز تہجد ادا کرتا ہے۔

قولہ تعالی "والمستغفرین بالاسحار" یدل علی انھم کانوا قد صلوا باللیل"

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جن پرہیزگار لوگوں کی تعریف بیان کی جارہی ہے، ان کا ایک وصف یہ بیان کیا جارہا ہے کہ وہ تہجد گزار ہوتے ہیں۔

سحری کے وقت استغفار کرنے کا بہت زیادہ اثر ہے قوت ایمانیہ میں بھی اور کمال عبودیت میں بھی، چونکہ سحری کا وقت وہ ہے کہ اس کے بعد صبح کی روشنی ظاہر ہو جاتی ہے، رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے اور سوئے ہوئے لوگ جو مردہ کی طرح ہوتے ہیں بیدار ہو کر گویا کہ زندہ ہو جاتے ہیں، اس وقت عبادت کرنے والوں کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کے جلال کی نورانیت کا ظہور ہوتا ہے، جس سے انسان کی قوت ایمانیہ میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ سحری کے وقت نید کا غلبہ ہوتا ہے، جب انسان اس وقت نید سے بیدار ہوتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اور عبادت میں مشغول ہونے کیلئے۔ "فاذا اعرض العبد عن تلک اللذة واقبل علی العبودية كانت الطاعة اكمل" جب انسان اس وقت نیند کی لذت کو چھوڑتا ہے اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ کا بندہ سمجھ کر اس کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اسے کامل طاعت حاصل ہوتی ہے۔

"ونقل عن ابن عباس (والمستغفرين بالاسحار) يريد المصلين صلوة الصبح"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ کا معنی کیا ہے "صبح کی نماز ادا کرنے والے" (ماخوذ از کبیر)

لیکن راقم کے نزدیک اس میں کوئی تعارض نہیں، مطلب یہ ہے کہ پرہیزگار لوگ سحری کے وقت تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے ہیں، پھر صبح کی نماز ادا کرتے ہیں۔

اسی پر حدیث نافع رضی اللہ عنہ شاہد ہے۔

❁ "اخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عمر انه كان يحيى الليل صلوة ثم يقول يانافع اسحرنا فيقال لافيعاود الصلوة فاذا قال نعم قعد يستغفر الله ويدعو حتى يصبح"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رات کو بیدار رہتے نماز ادا کرتے رہتے، پھر حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے پوچھتے کیا سحری کا وقت ہو گیا، وہ کہتے ابھی وقت نہیں ہوا، تو آپ پھر نماز کو جاری رکھتے، جب وہ کہتے ہاں وقت ہو گیا تو آپ بیٹھ جاتے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے، اور دعاء کرتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ (از در منثور)

(والمستغفرين بالاسحار) دل على فضيلة الاستغفار وقت الاسحار"

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ کا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ سحری کے وقت استغفار افضل ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو کہا ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ﴾ میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا۔ "انہ اخرھم الی وقت السحر" بیشک انہوں نے سحری کے وقت تک دعاء کو مؤخر کیا یعنی آپ نے سحری کے وقت اپنے بیٹوں کیلئے بخشش طلب کی۔

❁ **"قال رسول اللہ ﷺ ینزل اللہ تبارک وتعالی فی کل لیلۃ الی السماء الدنیا حتی یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول ھل من سائل فاعطیہ ھل من داع فاستجیب لہ؟ ھل من مستغفر فاغفر لہ؟** (رواہ البخاری ومسلم عن ابی ھریرۃ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کی رحمت کا ہر رات کو آسمان دنیا پر نزول ہوتا ہے یہاں تک کہ رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے کوئی ہے سوال کرنے والا کہ میں اسے عطاء کروں؟ کوئی ہے دعاء کرنے والا کہ میں اس کی دعاء کو قبول کروں؟ کوئی ہے بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کی بخشش کروں؟

❁ **"وقال ابن جریر عن ابراھیم بن حاطب عن ابیہ قال سمعت رجلا فی السحر فی ناحیۃ المسجد وھو یقول یا رب امرتنی فاطعتک وھذا السحر فاغفرلی، فنظرت فاذا ھو ابن مسعود رضی اللہ عنہ"**

ابراہیم بن حاطب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ نے فرمایا میں نے سحری کے وقت مسجد کی ایک طرف ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "اے میرے رب تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری طاعت کی، یہ سحری کا وقت ہے میری مغفرت فرما۔ میں نے دیکھا تو وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

❁ **"وعن انس بن مالک قال کنا نؤمر اذا صلینا من اللیل ان نستغفر فی آخر السحر سبعین مرۃ"** (رواہ ابن مردویہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ جب رات کو ہم نماز ادا کریں تو سحری کے آخری وقت میں ستر مرتبہ اللہ تعالی سے بخشش طلب کریں۔ (ماخوذ از ابن کثیر وصابونی)

❁ **"اخرج ابن ابی شیبۃ واحمد فی الزھد عن ابی سعید الخدری قال بلغنا ان داود علیہ السلام سأل جبریل علیہ السلام فقال یا جبریل ای اللیل افضل قال یا داؤد ماادری الاان العرش یھتز فی السحر"**

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی بیشک داود علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ اے جبریل کون سی رات افضل ہے۔ انہوں نے کہا میں نہیں جانتا ہاں البتہ ہر سحری کے وقت عرش الہی جھومتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی ہر سحری کو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا نزول ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عرش الٰہی بھی خوشی سے جھومتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کتنا فضل و کرم ہے، اور کتنا زیادہ فیضان ہے۔

❁ "وقال سفيان الثوري بلغني انه اذا كان اول الليل نادى منا دليقم القانتون فيقومون كذلك يصلون الى السحر فاذا كان عندالسحر نادى منادا ين المستغفرون فيستغفر اولئك، ويقوم آخرون فيصلون فيلحقون بهم فاذاطلع الفجر نادى منادالاليقم الغافلون فيقومون من فرشهم كالموتى نشروامن قبورهم"

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے خبر ملی کہ بیشک رات کے اول حصہ میں نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہ خشوع کرنے والے لوگ کھڑے ہو جائیں تو وہ کھڑے ہو جاتے ہیں سحری تک وہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں جب سحری کا وقت ہو جاتا ہے نداء دینے والا نداء دیتا ہے کہاں ہیں بخشش طلب کرنے والے تو وہ استغفار کرتے ہیں پھر کچھ اور لوگ کھڑے ہوتے ہیں ان کے ساتھ مل جاتے ہیں پھر جب صبح صادق ہو جاتی ہے تو نداء دینے والا نداء دیتا ہے خبردار اب غافل لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں تو وہ اپنے بستروں سے اس طرح اٹھتے ہیں جیسے مردے قبروں سے اٹھیں گے۔ (از قرطبی)

❁ "وروى عن انس سمعت النبى ﷺ يقول ان الله يقول انى لاهم بعذاب اهل الارض فاذا نظرت الى عمار بيوتى والى المتحابين فى والى المتهجدين والمستغفرين بالاسحار صرفت عنهم العذاب بهم"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں زمین والوں کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو میرے گھروں (مساجد) کو آباد کئے ہوتے ہیں اور میں ان لوگوں کو جب دیکھتا ہوں جو میری رضاء کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور تہجد گذار لوگوں کو جب دیکھتا ہوں اور سحری کے وقت استغفار کرنے والوں کو جب دیکھتا ہوں تو ان سے عذاب کو پھیر دیتا ہوں۔ (از قرطبی)

❁ قال مكحول اذا كان فى امة خمسة عشر رجلا يستغفرون الله كل يوم خمسا وعشرين مرة لم يؤاخذ الله تلك الامة بعذاب العامة "(ذكره ابونعيم فى كتاب الحلية له)

مکحول فرماتے ہیں جب امت میں پندرہ آدمی اللہ تعالیٰ سے ہر روز پچیس پچیس مرتبہ استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ اس امت کو عام عذاب میں مبتلا نہیں فرماتا۔ (از قرطبی)

حقیقت یہی ہے کہ ایسے ہی نیک لوگوں سے دنیا آباد ہے جو راتیں جاگ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزار دیتے ہیں اور سحری کے وقت تہجد ادا کرتے ہیں اور سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں ورنہ ہمارے جیسے گنہگار ہی سب ہوتے

تو دنیا کب سے برباد ہو چکی ہوتی۔

حضرت لقمان رحمہ اللہ کی اپنے بیٹے کو نصیحت:

''وقال لقمان لابنه یا بنی لایکن الدیک اکیس منک ینادی بالاسحار وانت نائم''

حضرت لقمان رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے کو کہا اے میرے بیٹے مرغ تجھ سے زیادہ عقلمند اور زیرک نہ ہو کہ وہ سحری کے وقت اذان دے رب کو یاد کرے اور تو غافل ہو کر سویا رہے۔

سید الاستغفار:

''عن شداد بن اوس قال قال رسول اللہ ﷺ سید الاستغفار ان تقول اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدک وانا علی عهدک ووعدک ما استطعت اعوذ بک من شر ما صنعت ابوء لک بنعمتک علی وابوء بذنبی فاغفرلی فانه لا یغفر الذنوب الاانت ''قال ومن قالها من النهار موقنا بها فمات من یومه قبل ان یمسی فهو من اهل الجنة ومن قالها من اللیل وهو موقن بها فمات من لیلة قبل ان یصبح فهو من اهل الجنة'' (رواہ البخاری)

شداد بن اوس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' سید الاستغفار '' یہ ہے کہ تم کہو

''اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَااِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَاصَنَعْتَ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَ بُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهُ لَایَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّااَنْتَ''

جس شخص نے یہ الفاظ یقین سے پڑھے، اسی دن شام سے پہلے فوت ہو گیا تو وہ جنتی ہوگا اور جس نے رات کو یہ الفاظ یقین سے پڑھے تو وہ اسی رات فوت ہو گیا تو وہ جنت میں جائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی)

بندہ گنہگار ہے رب غفار ہے:

﴿وَالْمُسْتَغْفِرُوْنَ بِالْاَسْحَارِ اَلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ﴾ سحری کے وقت استغفار کرنے والے وہ لوگ بھی ہیں جو جہالت کی وجہ سے برے عمل کرتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یعنی برے اعمال پر قائم رہنا، رب تعالیٰ کا خوف دل میں نہ آنا، توبہ کرنا برا عمل ہے۔ اگر توبہ کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا بلکہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

❁ ”عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون الله فیغفر لهم“

(رواه مسلم،وروی احمد وابویعلی من حدیث ابی سعید نحوه)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرتے (یعنی تم سے کوئی گنہگار نہ ہوتا) تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا اور ایک قول کو لے آتا جو گناہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرتا۔ (ماخوذ از مظہری)

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ایمان واستغفار حاصل ہوتے ہیں:

”والعبد اذالاحظ ان افعاله مخلوقة لله تعالیٰ وانه تعالیٰ من علیه بتوفیقه وارتضاه لنفسه حیث لم یترکه الی غیره“

بندہ جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، تو یقیناً وہ اپنے اعمال میں رب تعالیٰ کی رضا اور اس کے خوف کو مدنظر رکھتا ہے تو رب تعالیٰ بھی اس پر احسان فرماتا ہے، اسے توفیق عطاء فرماتا ہے اور اسے اپنے لئے پسند کر لیتا ہے، غیروں کی طرف اسے نہیں چھوڑتا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح دلیل ہے۔

﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّاتَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾

اے محبوب وہ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے، تم فرماؤ ”اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو“ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں اسلام کی ہدایت کی اگر تم سچے ہو۔

صفات مذکورہ کی شاندار ترتیب:

اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے بندے مختلف عبادات کرتے ہیں، بعض عبادات میں تکالیف بھی پائی جاتی ہیں، ان کو ادا کرنے میں صبر وتحمل کی ضرورت بھی درپیش آتی ہے۔ صابر وہ ہے جو تمام عبادات کے ادا کرنے میں صبر کرے، پھر بندہ کبھی اپنے آپ پر بعض عبادات کو لازم کر لیتا ہے، کبھی نذر مان کر، اور اور کبھی عبادات کو شروع کر کے اپنے آپ پر واجب کر لیتا ہے۔

”وکمال هذه المرتبة انه اذا التزم طاعة ان یصدق نفسه فی التزامه وذلک بان یاتی

بذلک الملتزم من غیر خلل البتة"

اس مرتبہ میں کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کسی عبادت کو اپنے آپ لازم کرے تو وہ اس میں سچا ہو یعنی اس عبادت کو بغیر کسی خلل ونقصان کے مکمل کرے۔ جب یہ مرتبہ پہلے کے بعد ہے "فلاجرم ذکر سبحانہ (الصابرین) اولا، ثم قال (الصادقین) ثانیا" تو یقیناً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے پہلے (الصابرین) کا ذکر فرمایا، پھر (الصادقین) کا ذکر فرمایا، پھر اللہ تعالی کو یہ پسند ہے کہ طاعت کی ان دونوں قسموں پر انسان ہمیشہ کیلئے قائم رہے، پھر رب قدوس نے ذکر فرمایا (والقانتین) طاعت کرنے والے، "فھذہ الالفاظ الثلاثة للترغیب فی المواظبة علی جمیع انواع الطاعات" یہ تینوں الفاظ گرامی ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ﴾ اس چیز کی رغبت دلا رہے ہیں کہ انسان تمام قسم کی طاعات پر ہمیشگی اختیار کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے طاعات معینہ کا ذکر فرمایا، جو قدر ومنزلت کے لحاظ پر عظیم درجہ رکھتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، مالی خدمت اور جانی خدمت، مالی خدمت کی طرف نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "الشفقة علی خلق اللہ" "اللہ تعالی کی مخلوق پر شفقت ہے" یعنی انسان جب اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ تعالی کے بندوں کی حاجات کو پورا کرتا ہے، تو یہ ان پر شفقت واحسان ہے۔

رب تعالی نے ان کی اسی صفت کو ذکر فرمایا "والمنفقین" وہ صدقہ دینے والے ہیں، یعنی اللہ تعالی کی راہ میں وہ مال خرچ کرتے ہیں، جانی خدمت کی طرف بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی سے اشارہ ملتا ہے "التعظیم لامر اللہ" اللہ تعالی کے امر کی تعظیم ہے یعنی اللہ تعالی کے حکم کو معظم سمجھتے ہوئے بجالائے ہیں، یہ ان کی جانی خدمت ہے۔ اسی کو مالک کا یوں بیان فرمایا ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ سحری کے وقت بخشش طلب کرنے والے ہیں۔

سؤال : اللہ تعالی نے "والمنفقین" (صدقہ کرنے والے ہیں) کا ذکر پہلے فرمایا۔ اس کے بعد ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ (سحری کے وقت بخشش طلب کرنے والے ہیں) کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر انسانی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ "اللہ تعالی کی تعظیم کا ذکر پہلے کیا جاتا، اور مخلوق پر شفقت کا ذکر بعد میں کیا جاتا۔

جواب : یہاں بندے کا ذکر اس انداز پر کیا گیا ہے کہ وہ ادنی درجے سے اعلی درجے کی طرف ترقی کرتا ہے اسلئے ﴿وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ کا ذکر پہلے کیا گیا ہے جس میں مخلوق پر شفقت پائی گئی ہے یہ درجہ ذرا ادنی ہے اس کے بعد ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ ذکر کیا ہے جس میں اللہ تعالی کے امر کی تعظیم کا بیان ہے جس کا درجہ بلند ہے ہاں اگر اوپر سے نیچے درجہ کی طرف آنے کا کہیں تذکرہ مقصود ہو تو ترتیب کو الٹ ذکر کرنا پڑے گا جیسا کہ سوال

میں ذکر کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اللہ تعالی نے پانچ صفات کا تذکرہ فرمایا، اوران کے درمیان "واؤ عاطفه "کوذکر کیا اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ موصوف متعدد ہوں کہ کئی لوگ صبر کرنے والے ہوں گے کئی لوگ سچے ہوں گے وغیرہ۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کو تفسیر کبیر کی وضاحت کبیر نظر آئی

"هذه الخمسة اشارة الى تعديد الصفات لموصوف واحد فكان الواجب حذف واو العطف عنها كما فى قوله تعالى "هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ "الا انه ذكر ههنا واو العطف واظن والعلم عند الله ان كل من كان معه واحدة من هذه الخصال دخل تحت المدح العظيم واستوجب هذا الثواب الجزيل ،والله اعلم " (کبیر)

یہ پانچ صفات یہاں مذکور ہیں جو متعدد ہیں موصوف ایک ہے یعنی پرہیز گار شخص کیلئے ان تمام صفات کا پایا جانا ضروری ہے، بظاہر قانون کو دیکھا جائے تو "واؤ عاطفہ" کو حذف ہونا چاہئے تھا جیسا کہ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ میں حذف ہے لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ ذکر فرماتے ہیں کہ حقیقی علم اللہ تعالی کو حاصل ہے البتہ میرا گمان یہ ہے کہ "واؤ عاطفه "کو ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جس شخص میں ان صفات سے ایک صفت بھی پائی گئی وہ بھی بہت بڑی مدح کے قابل ہے اور بہت بڑے ثواب کا مستحق ہے، اسی سے خود اندازہ لگالیں کہ جس اللہ کے بندے میں یہ تمام صفات پائی گئیں وہ کتنا عظیم مقام رکھتا ہوگا اور کتنی بڑی تعریف کے قابل ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

قال الامام القشيرى رحمه الله الصابرين على ما امر الله والصادقين فيما عاهدوا الله والقانتين بالاستقامة فى محبة الله والمنفقين فى سبيل الله والمستغفرين من جميع ما فعلوا لرؤية تقصير هم "

امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالی کے امر پر قائم رہتے ہیں اور صادقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالی کے وعدہ کو پورا کرنے میں سچے ہیں اور قانتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالی کی محبت میں قائم رہتے ہیں اور مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی اللہ تعالی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ (از روح البیان)

سحری کے وقت انسان یہ تسبیحات پڑھے:

"سُبْحَانَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسِ سُبْحَانَ الْکَرِیْمِ "اور یہ پڑھے "سُبْحَانَ الْکَبِیْرِ لَااِلٰهَ اِلَّاھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمِ"

اور یہ پڑھے "سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ سُبْحَانَ الْعَزِیْزِ الْقَهَّارِ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الرَّفِیْعِ"

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ کوئی چیز نہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے تو اشرف المخلوقات کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے۔ "فان الانسان اولی بان یشتغل بالدعاء والتسبیح خصوصا فی الخلوات واوقات الاسحار" بیشک انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے کہ وہ دعاء اور تسبیح میں مشغول رہے، خاص کر کے وہ اللہ تعالیٰ کو خلوت (تنہائی) میں اور سحری کے وقت زیادہ سے زیادہ یاد کرے۔

دلا برخیز و طاعت کن کہ طاعت بہ ز ہر کار است سعادت آں کسی دارد کہ وقت صبح بیدار است

اے دلا اٹھ اور طاعت کر، کیونکہ طاعت ہر کام سے بہتر ہے نیک بختی اس شخص کو ہی حاصل ہے جو صبح کے وقت بیدار ہوتا ہے۔

خروسان در سحر گویند کہ قم یا ایہا الغافل تو از مستی نمی دانی کسے داند کہ ہشیار است

مرغ سحری کے وقت کہتے ہیں، اے غافل اٹھ (جاگ) تو مستی کی وجہ سے نہیں جانتا (کہ یہ کیسا وقت ہے) وہی شخص جانتا ہے جو ہوشیار ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

راقم کو بھی اللہ تعالیٰ نے گرمیوں، سردیوں میں سحری اٹھنے کی توفیق عطاء فرمائی ہے۔ تاہم گنہگار، سیاہ کار اپنے شیخ کامل سید الاولیاء حضرت **پیر مہر علی** شاہ رحمہ اللہ کے ان اشعار کو گنگناتا رہتا ہے۔

گو نامہ سیاہ کردم از بسکہ گنہ گارم اما نظرے بستہ بر رحمت غفارم

اور ارشاد فرمایا:

گرچہ غرق بحر عصیانم ما آیۃ لاتقنطوا خوانیم ما

کن بشایان درت مارا قبول حضرت راگر نشایانیم ما

اور ارشاد فرمایا:

حریف ساغر ومے ہوں غریق بحر عصیاں ہوں۔

سہارا ہے "فترضی" کا مجھے محشر مکانن میں۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾o (آیۃ نمبر ۱۸)

(1) اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا۔

(2) بیان فرمادیا اللہ تعالیٰ نے، بیشک نہیں کوئی معبود سوائے اس کے اور فرشتوں نے اور علم والوں نے قائم رہتے ہوئے انصاف پر، نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے جو عزت والا، حکمت والا ہے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر خود گواہی دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والے حضرات نے بھی انصاف پر قائم رہتے ہوئے گواہی دی کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے جو عزیز حکیم ہے۔

شان نزول:

(۱) جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے، تو وہاں شام کے علاقہ سے یہود کے دو عالم آئے، جب انہوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ایک نے دوسرے کو کہا یہ شہر تو مشابہ ہے آخر الزمان نبی کے مدینہ کے، پھر وہ دونوں جب نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے ان اوصاف کے ذریعے پہچان لیا جن کا تذکرہ ان کی کتب میں آچکا تھا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا "انت محمد؟" کیا تم محمد ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں پھر ان دونوں نے آپ سے سوال کیا "انت احمد؟" کیا آپ احمد بھی ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ تو وہ دونوں کہنے لگے ہم آپ سے شہادت کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں اگر تم نے خبر دے دی تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا تم مجھ سے پوچھو، یعنی تم سوال کرو میں جواب دوں گا" تو انہوں نے کہا "اخبرنا عن اعظم شهادة فی كتاب الله" کہ آپ ہمیں سب سے بڑی شہادت کے متعلق بتائیں کہ کتاب اللہ میں عظیم شہادت کون سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ آپ پر نازل فرمادی، تو آپ ان کو پڑھ کر سنائی۔ "فاسلم الرجلان وصدقا برسول الله ﷺ" تو وہ دونوں شخص اسلام لے آئے اور نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی۔ (از قرطبی)

(۲) دوسری وجہ شان نزول کی یہ بیان کی گئی کہ یہ نجران کے عیسائیوں کے وفد کے رد میں نازل ہوئی، جبکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا تو رب تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر خود ہی شہادت دی۔ (خازن)

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''بیان فرمادیا اللہ نے، بیشک نہیں کوئی معبود سوائے اس کے۔''

''شهدالله يعنى بين الله واظهر لان معنى الشهادة تبين واظهار''

لفظ ''شهادة'' بمعنی ''تبين'' اور ''اظهار'' کے (بیان کرنا، واضح کرنا، ظاہر کرنا) استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اسلئے یہاں یہ معنی ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کردیا، واضح کردیا، ظاہر فرمادیا کہ بیشک اس کے سواء اور کوئی معبود نہیں۔ (خازن)

راقم نے شہادت کا معنی خازن کی اسی تفسیر کے مطابق کیا ہے ''بين الله'' (بیان فرمادیا اللہ تعالیٰ نے)

''وقيل معنى شهد الله حكم الله وقضى'' بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ''شهد الله'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا (بیشک اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں) ''وقيل معناه اعلم الله انه لااله الاهو''، بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''شهد الله'' کا معنی ہے ''اعلم الله'' اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''اللہ علم عطاء کرتا ہے بیشک اس کے سواء کوئی معبود نہیں'' (خازن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ''شهد الله'' کا ترجمہ کیا ہے (اللہ تعالیٰ نے گواہی دی) آپ کا ترجمہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر صابونی کے الفاظ یہ ہیں:

(شهد الله)شهد تعالى و كفى به شهيدا وهو اصدق الشاهدين واعدلهم واصدق القائلين(انه لااله الاهو)اى المنفرد بالالهية لجميع الخلائق،وان الجميع عبيده وخلقه وفقراء اليه،وهو الغنى عما سواه كما قال تعالى(لكن الله يشهد بما انزل اليك)

(اللہ تعالیٰ نے گواہی دی) اور وہ اس میں بحیثیت گواہ کافی ہے اور وہ سب گواہی سے زیادہ سچا گواہ ہے اور سب سے زیادہ انصاف والا ہے اور سب کلام کرنے والوں سے زیادہ سچا کلام کرنے والا ہے (اس نے گواہی دی، بیشک اس کے سواء کوئی معبود نہیں)'' بیشک وہ الٰہ (معبود) ہونے کے لحاظ پر منفرد ہے تمام مخلوق پر'' بیشک تمام کائنات اسی کی غلام ہے، اور اسی کی مخلوق ہے اور اسی کے محتاج ہے، وہ سب سے بے پرواہ ہے، رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے جو اس نے آپ پر نازل کیا'' (از صابونی)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

شہادت کا ایک معنی ہے، خبر دینا جو علم کے ساتھ ملی ہوئی ہو یعنی گواہی دینا۔اس معنی کے لحاظ سے لفظ "شہد اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور اولو العلم میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوگا۔"ان الله تعالی قد اخبر فی القرآن عن کونه واحدا لااله معه" بیشک اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی کہ وہ ایک ہے، اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں اور ملائکہ اور علم والوں کی شہادت کا یہ مطلب ہے "الملائكة و اولوا العلم كلهم اخبروا ان الله تعالى واحد لاشريك له" سب فرشتوں اور سب علم والوں نے یہ خبر دی بیشک اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ (از کبیر)

شہادت بمعنی اظہار و بیان:

اگر شہادت کا معنی بیان و اظہار کیا جائے تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا

"انه تعالى اظهر ذلک وبينه بان خلق مايدل على ذلک اما الملائكة و الوا العلم فقد اظهروا ذلک"

بیشک اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کیا اور بیان کیا کہ اس کی مخلوق اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے، اس کے سواء اور کوئی معبود نہیں، اور فرشتوں اور علماء نے بھی اسے ظاہر کیا ہے اور دلائل و براہین سے بیان کیا ہے کہ وہ ایک ذات ہے اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔فرشتوں نے رسولوں سے یہ بیان کیا اور رسولوں نے علماء سے بیان کیا اور علماء نے عام لوگوں سے بیان کیا اظہار اور بیان کا معنی سب میں پایا گیا ہے، اس لحاظ پر مفہوم ایک ہی ہے۔البتہ اظہار اور بیان اللہ تعالیٰ کا سب سے اعلیٰ ہے، پھر انبیاء کرام کا اظہار ہے، پھر فرشتوں کا پھر علماء کا، یہ درجہ کا لحاظ ہے، ورنہ بتانے کے لحاظ پر فرشتوں کا ذکر پہلے ہوگا۔

ضمناً آنے والی آیۃ کریمہ سے رابطہ بھی واضح ہو گیا، گویا کہ رسول اللہ ﷺ کو رب تعالیٰ نے یہ بتا دیا "اللہ تعالیٰ کی وحدانیت خود اس کی اپنی شہادت سے ثابت ہے اور اس کی مخلوق میں سے جن کو بھی سوچنے، سمجھنے کی رب تعالیٰ نے توفیق دے رکھی ہے وہ بھی اس کی واحدانیت پر شاہد ہیں۔سوائے نصاریٰ، یہود اور بت پرستوں کے، لیکن ان کی جہالت سے دین متین میں اور سیدھے راستہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوسکتا۔

"فاثبت انت وقومک یا محمد علی ذلک فانه هو الاسلام والدين عند الله هو الاسلام"

لھذا اے محمد ﷺ! تم اور تمہاری امت اس پر قائم رہو، یعنی اسلام پر قائم رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دین اسلام ہی پسند ہے یعنی مضمون آنے والی آیۃ کریمہ میں پیش کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

شہادت کا مجازی معنیٰ:

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا اپنی توحید پر گواہی دینے'' کا مطلب یہ ہے ''انه خلق الدلائل الدالة علی توحیده'' اللہ تعالیٰ نے دلائل پیدا فرمائے جو اس کی توحید پر دلالت کررہے ہیں، ملائکہ اور علم والوں کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان دلائل کو دیکھ کر اقرار کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کے سواء کوئی معبود نہیں۔ (از کبیر)

''سئل بعض الاعراب ماالدلیل علی وجود الصانع فقال ان البعرة تدل علی البعیر فھیکل علوی بھذه اللطافة و مرکز سفلی بھذه الکثافة اما یدلان علی وجود الصانع الخبیر''

کسی دیہاتی سے سوال کیا گیا اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا اونٹ کی مینگنیاں اونٹ پر دلالت کرتی ہیں، تو اتنا بڑا ہیکل علوی (آسمانوں کی شکل اور ان کا وجود) جو لطیف ہے، اور مرکز سفلی یعنی زمین جو کثیف ہے کیا یہ صانع خبیر پر دلالت نہیں کرتے۔ (خازن)

''اولوا العلم'' سے مراد کون لوگ ہیں؟

بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد انبیاء کرام ہیں اور بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد مہاجرین وانصار صحابہ کرام اصحاب علم ہیں اور بعض حضرات نے بیان کیا، اس سے مراد اہل کتاب کے علماء ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لیا تھا یعنی عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور بعض حضرات نے بیان کیا اس سے مراد تمام علماء مؤمنین ہیں۔ (خازن)

راقم کا موقف یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام حضرات علم والے ہیں، اس لئے انبیاء کرام اور صحابہ کرام خواہ وہ مہاجرین ہوں یا انصار، یا اہل کتاب کے علماء سے ایمان لانے والے ہوں یا نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء کرام تا قیامت آنے والے ہوں سب ہی مراد ہیں۔

فائدہ جلیلہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوگیا کہ علم کو فضیلت حاصل ہے اور علماء کو شرف وفضیلت حاصل ہے۔

''فانه لو کان احد اشرف من العلماء لقرنھم الله باسمه واسم ملائکته کما قرن اسم العلماء''

اگر کسی ایک کو علماء سے زیادہ فضیلت وشرف حاصل ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے اسم گرامی اور ملائکہ کے ساتھ اس کا بھی ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ملائکہ کے ساتھ کسی اور کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ صرف علماء کرام کا

ذکر کیا ہے تو واضح ہوا کہ علماء کرام سے بڑھ کر کوئی مشرف و افضل نہیں۔

❁ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ اور عرض کروائے میرے رب میرا علم زیادہ کر، اگر کوئی چیز علم سے زیادہ اشرف ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتا کہ جاں چیز کی زیادتی کی دعاء کرو، جب کسی اور چیز کی زیادتی کی دعاء کا حکم نہیں دیا گیا تو پتہ چلا کہ سب چیزوں سے افضل علم ہے۔

❁ "وقال رسول اللہ ﷺ ان العلماء ورثه الانبیاء" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

❁ "وقال رسول اللهﷺ العلماء امناء الله علی خلقه"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، علماء اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر امین (محافظ) ہیں۔

❁ "عن البراء قال قال رسول الله ﷺ العلماء ورثة الانبیاء یحبهم اهل السماء ویستغفرلهم الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامة"

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں، جب ان کی وفات ہوتی ہے تو مچھلیاں دریاؤں میں ان کیلئے قیامت تک استغفار کرتی ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

زیر بحث آیۃ کریمہ کی فضیلت:

"روی غالب القطان قال اتیت الکوفة فی تجارة فنزلت قریبا من الاعمش فکنت اختلف الیه فلما کان لیلة اردت ان انحدر الی البصرة قام فتهجد من اللیل فقرأ بهذه الآیة (شهد الله انه لااله الاهو والملائکة واولوا العلم قائما بالقسط لااله الاهو العزیز الحکیم ٥ ان الدین عندالله الاسلام) قال الاعمش وانا اشهد بما شهد الله به، واستودع الله هذه الشهادة وهی لی (عند الله) ودیعة "وان الدین عند الله الاسلام" قالها مرارا فغدوت الیه وودعته ثم قلت انی سمعت تقرأ هذه الآیة فما بلغک فیها؟ انا عندک منذ سنة لم تحدثنی به قال والله لاحدثتک به سنة قال فاقمت و کتبت علی بابه ذلک الیوم فلما مضت السنة قلت یااباا محمد قد مضت السنة قال حدثنی ابو وائل عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ یجاء بصاحبها یوم القیامة فیقول الله تعالی عبدی عهد الی وانا احق من وفی ادخلوا عبدی الجنة" (رواه الطبرانی فی الکبیر بحواله حاشیه صابونی)

غالب قطان روایت کرتے ہیں کہ میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا، میں اعمش رحمہ اللہ کے قریب اترا، میں ان کے پاس اکثر طور پر آتا جاتا رہتا تھا، جب رات ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں بصرہ جاؤں گا، رات کو کھڑے ہوئے، تہجد

ادا کیئے، یہ آیۃ کریمہ پڑھی۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

اعمش رحمہ اللہ نے کہا میں اسی چیز کی گواہی دیتا ہوں جس کی اللہ تعالی نے گواہی دی، میں اللہ تعالی کے ہاں اس شہادت کو امانت رکھ رہا ہوں، میری یہ امانت اللہ تعالی کے ہاں ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ہے۔آپ نے کئی مرتبہ یہ الفاظ دوہرائے۔صبح میں نے انہیں الوداع کیا، پھر میں نے کہا بیشک میں نے آپ سے یہ آیۃ پڑھتے ہوئے سنی، کس چیز نے تمہیں اس میں پہنچایا ہے؟ میں آپ کے پاس ایک سال سے ہوں (یعنی ایک سال ہو چکا ہے تجارتی غرض سے آپ کے پاس آتے جاتے ہوئے) آپ مجھے نے کوئی حدیث نہیں بیان کی، توانہوں نے کہا قسم ہے الہ تعالی کی میں تمہیں ایک سال بعد حدیث بیان کروں گا (مقصد یہ تھا کہ یہ جانا جائے کہ یہ صرف تاجر ہے یا کہ حدیث حاصل کرنے میں مخلص بھی ہے) یہ کہتے ہیں میں وہاں ہی قائم رہا، ان کے دروازے پر وعدہ کی تاریخ لکھ دی کہ آج سے سال بعد حدیث بیان کرنے کا وعدہ کرلیا گیا، جب سال گزر گیا تو میں نے کہا اے ابومحمد سال گزر چکا ہے۔توانہوں نے کہا مجھے ابو وائل نے عبداللہ بن مسعود سے مروی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس آیۃ کریمہ کو پڑھنے والے شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا، تو اللہ تعالی فرمائے گا اس میرے بندے نے مجھ سے عہد لیا ہے، میں وعدہ کو پورا کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتا ہوں لھذا میرے اس بندے کو جنت میں داخل کردو۔

ابوالفرج جوزی اور ابن عدی کا سند حدیث پر اعتراض:

"قال ابو الفرح الجوزی غالب القطان هو غالب بن خطاف القطان یروی عن الاعمش حدیث شهد الله وهو حدیث معضل،قال ابن عدی الضعف علی حدیثه بین"

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے کہ غالب قطان وہ غالب بن خطاف قطان روایت کرتا ہے اعمش سے اس کی روایت وہ حدیث جس میں "شَهِدَ اللّٰهُ" آیۃ کی فضیلت بیان کی گئی ہے وہ معضل ہے، ابن عدی نے کہا ہے حدیث کا ضعیف ہونا واضح ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا شاندار طریقہ سے رد کرنا:

"وقال احمد بن حنبل غالب بن الخطاف القطان ثقة ثقة وقال ابن معین ثقة وقال ابو حاتم صدوق صالح"

احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا غالب بن الخطاف القطان ثقہ راوی ہیں، ثقہ راوی ہیں، (یعنی دو مرتبہ ان کو ثقہ بیان کر کے بہت پختہ بات بیان کی) اور ابن معین نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ ثقہ راوی ہیں، ابو حاتم نے کہا ہے وہ سچے اور صالح شخص ہیں۔ "قلت یکفیک من عدالتہ وثقتہ ان خرج لہ البخاری ومسلم فی کتابیھما وحسبک" میں کہتا ہوں کہ غالب بن الخطاف القطان کے ثقہ ہونے اور عادل ہونے کیلئے یہی دلیل کافی ہے کہ ان کی روایات کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ (قرطبی)

تنبیہ: طلباء کرام یہ بات ذہن میں رکھیں کہ معضل حدیث وہ ہے جس میں راوی دو واسطے لگا تار چھوڑ دے معضل دراصل مرسل کی ایک قسم ہے، مرسل کے متعلق امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا موقف یہ ہے۔

" المرسل مقبول مطلقا وھم یقولون انما ارسلہ لکمال الوثوق والاعتماد"

کہ مرسل حدیث مطلقا مقبول ہے، وہ کہتے ہیں کہ راوی نے جن راویوں کو چھوڑا ہے ان پر کامل وثوق کرتے ہوئے چھوڑا ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں۔ اور اصل مسئلہ راوی کے ثقہ ہونے پر ہی مقبولیت کا ہے۔ (مقدمہ مشکوۃ)

حدیث اعمش کے تائید میں اور احادیث:

❁ عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ من قرأ ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ عند منامہ خلق اللہ لہ سبعین الف ملک یستغفرون لہ الی یوم القیامۃ"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے سوتے وقت یہ آیہ کریمہ پڑھی ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتا ہے جو قیامت تک اس کیلئے استغفار کرتے رہیں گے۔

❁ "وروی عن سعید بن جبیر انہ قال کان حول الکعبۃ ثلاثمائۃ وستون صنما لکل حی من احیاء العرب صنم او صنمان فلما نزلت ھذہ الآیہ اصبحت الاصنام قد خرت ساجدۃ للہ"

سعید بن جبیر کہتے ہیں کعبہ شریف کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے، عرب کے قبائل میں سے ہر قبیلہ کے ایک ایک، دو دو بت تھے، جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو وہ تمام سجدہ میں گر گئے (یعنی انہوں نے بھی سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دی) (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

میرے عزیز مسلک حنفی پر قائم طلباء کرام میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ ایک حدیث کو ابوالفرج اور ابن عدی نے ضعیف کرنے کی کوشش کی اور ابن معین نے راوی کو ثقہ کہا اور امام احمد رحمہ اللہ نے ثقہ کہا اور ابو حاتم نے صالح اور سچا قرار دیا اسی طرح کئی احادیث کو غیر مقلدین ضعیف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ دوسرے حضرات کے نزدیک ضعیف نہیں کسی ایک کے قول کو لے کر اور دوسرے اقوال کو چھپانا اور توڑ موڑ کر بات پیش کرنا غیر مقلدین کو وطیرہ ہے ان کے جال سے بچنے کیلئے ان کی پیش کردہ احادیث اور ان کی شروح کا ضرور مطالعہ کیا کریں۔ (راقم)

سؤال : فرشتوں اور علم والوں کی گواہی تو سمجھ آجاتی ہے کہ وہ گواہی دے سکتے ہیں "ولکن المدعی للواحدانیة هو الله فکیف یکون المدعی شاهدا؟" لیکن اللہ تعالی خود اپنی وحدانیت کا مدعی بھی ہے تو کس طرح مدعی خود ہی اپنے دعوی کا گواہ بن سکتا ہے؟

جواب نمبر۱: شاہد حقیقی سوائے اللہ تعالی کے اور کوئی نہیں اسلئے کہ اللہ تعالی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ان کو اپنی توحید پر دلائل بنایا اگر یہ دلائل نہ ہوتے تو شہادت بھی صحیح نہ ہوتی، پھر اللہ تعالی نے ان دلائل کے ذریعے علماء کو توفیق عطاء فرمائی کہ انہیں رب تعالی کی وحدانیت کا علم حاصل ہوا

"واذکان الامر کذلک کان الشاهدعلی الوحدانیة لیس الاالله وحده ولهذا قال"(قل ای شیء اکبر شهادة قل الله)

جب معاملہ اس طرح ہو تو اللہ تعالی ہی اپنی وحدانیت پر شاہد ہے اسی وجہ رب تعالی نے فرمایا ﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ﴾ تم فرماؤ سب سے بڑی گواہی کس کی تم فرماؤ کہ اللہ گواہ ہے مجھ میں اور تم میں

جواب نمبر۲: اللہ تعالی ازلی اور ابدی موجود ہے اس کے سواء تمام مخلوق ازل میں موجود نہیں تھی بلکہ معدوم تھی اور معدوم غائب کے مشابہ ہوتا ہے اور موجود حاضر کے مشابہ ہوتا ہے اللہ کے سواء سب چیزیں غائب تھیں وہ اللہ تعالی کی شہادت سے درجہ شہود میں آئیں۔فکان الحق شاهدا علی الکل فلهذا قال (شهد الله انه لا اله الاهو) اللہ تعالی کی شہادت کل پر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالی نے فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾

جواب نمبر۳: اگرچہ بظاہر ذکر ہے شہادت کا لیکن حقیقت میں اقرار ہے کیونکہ جب رب تعالی نے خبر دی

"لا الہ الاھو" کوئی معبود نہیں سوائے اس کے تو اسی سے واضح ہوا کہ تمام مخلوق اس کی غلام ہے۔

"والمولی الکریم لایلیق بہ ان یخل بہ ان یخل بمصالح العبید فکان ھذا الکلام جاریامجری الاقرار بانہ یجب وجوب الکرم علیہ ان یصلح جھات جمیع الخلق"

مولائے کریم کی شان کے یہ لائق نہیں کہ وہ اپنے بندوں اپنے غلاموں کی مصلحت میں کوئی کمی کرے گویا کہ اس کلام میں اقرار پایا گیا ہے کہ رب تعالی نے اپنے ذمہ کرم پر واجب کرلیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہر طرح کی مصلحت پہنچائے گا۔
(ماخوذ از کبیر)

جواب نمبر ۴: "شھد لنفسہ بنفسہ قبل ان خلق الخلق حین کان ولم تکم سماء ولاارض ولا بر ولابحر فقال تعالی شھد اللہ انہ لا الہ الاھو"

اللہ تعالی نے اپنی ذات کیلئے یعنی اپنی واحدنیت پر جوشہادت دی وہ مخلوق کی پیدائش سے پہلے تھی کیونکہ رب تعالی کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء، وہ ازلاً ابداً موجود ہے اسلئے مخلوق کی پیدائش سے پہلے وہ موجود تھا لیکن اس وقت کچھ بھی نہ تھا، نہ آسمان، نہ زمین نہ خشکی، نہ دریا و سمندر اس وقت رب تعالی نے اپنی وحدانیت کی شہادت دی ارشاد فرمایا ﴿شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ﴾ (از خازن)

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ "قائم رہتے ہوئے ان پر"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ میں مختلف تراکیب ہیں، اس لئے ہر ترکیب کے مطابق مطلب علیحدہ ہوگا، "قائما" پر نصب (زبر) کی چند وجوہ ہیں (ایک ان میں سے یہ ہے کہ نصب ہو حالیت کی وجہ سے، اس میں پھر چند وجوہ ہیں، ایک یہ ہے کہ حال ہو "شھد" کے فاعل سے، لیکن صرف معطوف علیہ سے دونوں معطوفوں سے حال نہ ہو، البتہ دونوں معطوفوں کو حال سے پہلے ذکر کیا، ان کی عظمت شان کی وجہ سے تا کہ ملائکہ اور اولو العلم کا ذکر رب تعالی کے قریب ہوجائے، اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا "اللہ تعالی نے بیان کیا" یا "اللہ تعالی نے گواہی دی" کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور علم والوں نے بیان کیا یا گواہی دی، اللہ تعالی کی گواہی انصاف پر مبنی ہے۔

دوسری وجہ حالیت میں سے ہے یہ کہ یہ حال ہے "ھو" سے، تقدیر عبارت کی یہ ہے "لاالہ الاھو قائما بالقسط" کوئی معبود نہیں سوائے اس کے درانحالیکہ وہ قائم ہے انصاف پر۔ اس صورت میں حال مئوکدہ ہو گا، کیونکہ "ھو" سے مراد 'وہ رب تعالی کی ذات ہے' وہ حق و انصاف پر قائم ہے، وہی معنی "قائما بالقسط" سے

سمجھ آ رہا ہے یعنی ''ھو'' سے سمجھ میں آنے والے معنی کی تاکید کر رہا ہے۔

(۲) اور اس میں نصب کی وجہ یہ ہے کہ ''قائما بالقسط'' صفت ہے ''لا الہ'' میں منفی کی، اب تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ''لا الہ قائما بالقسط الا ھو'' کوئی معبود نہیں جو انصاف پر قائم سوائے اس ذات کے۔

(۳) اور وجہ نصب کی یہ ہے کہ ''نصب علی وجه المدح'' ہے، اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا انصاف پر قائم رہنا قابل تعریف ہے، بظاہر اس پر اعتراض یہ ہے کہ مدح کے طور پر نصب معرفہ پر آتی ہے جیسا کہ ''الحمد للہ الحمید'' میں ''الحمید'' پر نصب مدح کے طور پر ہے لیکن یہ معرفہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی مقرر ضابطہ نہیں بلکہ نکرہ پر بھی نصب مدح کے طور پر آ سکتی ہے۔

(۴) ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ حال ہو، اولو العلم سے، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ علم والے بیان کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، یہ شہادت وہ انصاف پر قائم رہتے ہوئے دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے تو یہ بیان کیا ہے ''انه حال من شهد الله'' وهو قول جمهور المفسرین'' کہ یہ ''شهد الله'' سے حال ہے یہی جمہور مفسرین کا قول ہے۔ (کبیر)

لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہاں نفی نہیں فرمائی کہ یہ دونوں معطوفوں سے حال نہیں، اسلئے حال ہو فاعل سے بمع دونوں معطوفوں کے۔ اب معنی یہ ہوگا ''اللہ تعالیٰ نے شہادت دی بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، فرشتوں نے شہادت دی، اور علم والوں نے شہادت دی انصاف پر قائم رہتے ہوئے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، اور فرشتوں سے بھی ہے اور علم والوں سے بھی ہو، جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو تو

''ومعناه انه تعالى قائم بتدبير خلقه كما يقال فلان قائم بامر فلان يعنى انه مد بر له ومتعهد لاسباب وفلان قائم بحق فلان اى انه مجازله، فالله مدبر وأمر خلقه وقائم بارزاقهم ومجازلهم باعمالهم'' (خازن)

معنی یہ ہوگا ''اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تدبیر قائم ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''فلان قائم بامر فلان یعنی انه مدبر له ومتعهد لاسبابه'' یعنی جب یہ کہا جائے ''فلان قائم بامر فلان'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے فلاں شخص فلاں کا مدبر ہے، اور اس کے اسباب کا ذمہ دار ہے، اسی طرح جب یہ کہا جائے ''فلان قائم بحق فلان'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کو جزاء (بدلہ) دینے والا ہے، اب رب تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے سے یہ معنی ہوگا ''اللہ اپنے

بندوں کو جزاء دیتا ہے، اپنی مخلوق کے امور کا مدبر ہے، اور ان کو رزق دینے پر قائم ہے اور ان کے اعمال کی ان کو جزاء دیتا ہے۔ (ماخوذ از خازن)

فائدہ : اللہ تعالیٰ کا عدل یا دنیا سے متصل ہے یا دین سے۔ وہ عدل جو دنیا سے متصل ہو۔

"فانظر اولا فی کیفیۃ خلقۃ اعضاء الانسان حتی تعریف عدل اللہ تعالیٰ فیہا"

اس کو تو دیکھنا چاہے تو انسانوں کے اعضاء کی خلقت کی کیفیت کو دیکھ یہاں تک کہ تو اللہ تعالیٰ کے عدل کو پہچان لے۔

پھر تو مخلوق کے مختلف احوال کو دیکھ لے "کوئی حسین ہے کوئی قبیح (بدصورت) پھر کوئی غنی ہے، کوئی فقیر، کوئی صحیح ہے کوئی بیمار، کسی کی عمر لمبی ہے اور کسی کی چھوٹی، کسی کو لذت حاصل ہے اور کسی کو درد" **واقطع بان کل ذلک عدل من اللہ وحکمۃ وصواب** "ان چیزوں کو دیکھ تو یقین کر لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت سے ہے اور سب کام رب تعالیٰ کے درست ہیں، کسی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں پھر تو عناصر کو دیکھ یعنی آگ، مٹی، پانی اور ہوا کو دیکھ۔

اسی طرح اجرام فلکیہ کو دیکھ، ہر ایک قدر معین پر ہے، اور معین خاصے ان میں پائے گئے ہیں، تو ان کو دیکھ کر "**واقطع بان کل ذلک حکمۃ وصواب**" یقین کر لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے اور اس کا ہر کام درست ہے۔ عدل کا تعلق جب امر دین سے ہو تو تم مخلوق کو دیکھو کوئی عالم نظر آئے گا، کوئی جاہل اور کوئی سمجھ دار نظر آئے گا، کوئی بے وقوف، کوئی ہدایت پر قائم نظر آئے گا اور کوئی بھٹکا ہوا، "**واقطع بان کل ذلک عدل وقسط**" ان چیزوں کو دیکھ کر تم یقین کر لو کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کی وجہ سے ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

معتزلہ کا باطل استدلال:

معتزلہ نے رب تعالیٰ یا اولو العلم کے عدل وانصاف کو اس آیۃ کریمہ سے ثابت نہیں کیا، بلکہ یہ ثابت کیا کہ اسلام وہ عدل وتوحید ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے مودودی صاحب نے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "اے محمد ﷺ! ہم نے جو تجھے بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ (مودودی)

رسول اللہ ﷺ کی رحمت کا انکار کرتے ہوئے عربی ترکیب کو ہی بدل دیا گیا۔ عربی عبارات کے مفہوم کو تبدیل کر کے جہلاء کو الو بنانا تو ممکن ہے لیکن علم والوں کو بھٹکانا مشکل ہے بلکہ علم والوں کے سامنے اپنی جہالت کا اقرار ہے اور معتزلہ کی ہمنوائی کا اعلان ہے۔

جبریہ کا باطل استدلال:

جبریہ کہتے ہیں بندہ بے اختیار ہے، پتھر کی طرح ہے وہ نیکی کرے یا گناہ کرے وہ اپنے فعل میں مجبور ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہے "ان اللہ تعالی عالم بجمیع الجزئیات" کہ بیشک اللہ تعالی تمام جزئیات کو جانتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے "ان العبد لایمکنہ ان یقلب علم اللہ جھلا" بیشک بندے کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ تعالی کے علم کو جہل سے تبدیل کر سکے تو پتہ چلا کہ بندہ اپنے فعل میں مختار نہیں ان کا یہ استدلال باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے بندے کو اختیار عطاء فرمایا بندہ ہر کام اپنے اختیار سے کرتا ہے اللہ تعالی کے علم سے بندے کو مجبور سمجھنا باطل ہے اس مسئلہ کی مکمل تفصیل سورۃ بقرہ کی ابتداء میں دیکھئے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ...... ﴾ کے ضمن میں یہ تفصیلی طور پر ذکر کر دیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر مع وضاحت راقم)

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ "نہیں کوئی معبود سوائے اس کے"

بظاہر اس میں تکرار ہے کہ پہلے ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ﴾ بیان ہو چکا ہے تو پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے ؟ تکرار کے چند فوائد ہیں یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالی کا کلام فائدہ سے خالی ہو یہ ممکن ہی نہیں۔

(۱) ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ واذا شھد بذلک فقد صح انہ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ اللہ تعالی نے بیان فرمایا کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور جب اللہ تعالی نے یہ بیان کر دیا تو صحیح بات یہ ہے کہ بیشک اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اس وجہ کو سمجھنے کیلئے ایک مثال سمجھیں جو محاورات میں استعمال ہوتی رہتی ہے جیسا کہ کوئی کہے "الدلیل دل علی وحدانیۃ اللہ تعالی ومتی کان کذلک صح القول بو حدانیۃ اللہ تعالی " یہ دلیل اللہ تعالی کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے جب اس طرح کی دلیل پائی جائے تو یقیناً یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالی واحد ذات ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

(۲) تکرار کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے اپنی شہادت اور فرشتوں کی شہادت اور علم والوں کی شہادت کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ ﴾ کہ اللہ تعالی کے سواء کوئی معبود نہیں اس پر اللہ تعالی اور اس کے فرشتے اور علم والے گواہ ہیں تو دوبارہ ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ ذکر فرما کر نبی کریم ﷺ کی امت کو گویا کہ یوں کہا:

"یا امۃ محمد فقولوا انتم علی وفق شھادۃ اللہ وشھادۃ الملائکۃ واولی العلم لا الہ الا ھو، فکان

الغرض من الاعادة الامر بذکر ھذہ الکمة علی وفق تلک الشھادات "
اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ! تم بھی گواہی دو کہ "اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں" تا کہ تمھاری گواہی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور علم والوں کی گواہی کے مطابق ہو جائے۔ لھذا ان کلمات یعنی ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ کو لوٹانے کا یہ فائدہ ہے کہ بندوں کہ حکم دیا گیا ہے کہ تمھاری گواہی پہلی گواہیوں کے موافق ہونی چاہئے۔

(۳) تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ ﴾ کو دوبارہ ذکر کر کے یہ مسئلہ بتایا گیا ہے کہ اے مسلمان تو بھی ان کلمات کو ہمیشہ لوٹا تا رہ، بار بار پڑھا کر، "فـان اشـرف کلمة یذکرھا الانسان ھی ھذہ الکمة " اشرف کلمہ یہی ہے کہ انسان اس کلمہ کا ذکر کرتا رہے جب انسان اکثر اوقات ان کلمات کو پڑھتا رہے گا "کـان مشـتـغـلا باعظم انواع العبادات " تو وہ عظیم عبادت میں مشغول رہے گا، "فـکان الغرض من التکریر فی ھذہ الأیة حث العباد علی تکریرھا " ان الفاظ کے تکرار سے بندوں کو اس آیۃ کے بار بار پڑھنے پر برانگیختہ کیا گیا۔

(۴) تکرار سے چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ پہلی مرتبہ جب ارشاد فرمایا ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ﴾ اس سے یہ ثابت کیا کہ مخلوق کو یہ علم حاصل ہو جائے "انـه لاتـحـق الـعبـادة الاله تعالی " کہ بیشک اس ذات کبریاء کے سواء کوئی عبادت کا حقدار نہیں "و ذکرھا ثانیا لیعلم انه القائم لقسط لایجور و لایظلم " دوبارہ ذکر کیا تا کہ معلوم ہو جائے بیشک وہ معبود حقیقی انصاف پر قائم ہے وہ کسی طرح کا ظلم وستم نہیں کرتا (از کبیر)

﴿اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ﴾ "عزت والا حکمت والا ہے۔"

"العزیز " فالعزیز اشارة الی کمال القدرة " سے اشارہ کیا کمال قدرت کی طرف وہ عزت والا ہے یعنی کمال قدرت کا مالک ہے ہر چیز پر اسے غلبہ حاصل ہے۔ "والحکیم اشارة الی کمال العلم " اور "الحکیم " سے اشارہ کمال علم کی طرف پایا گیا ہے کہ وہ حکیم ہے یعنی اسے ہر چیز کا کامل علم حاصل ہے۔ بحر و بر میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس پر چھپی ہوئی ہو کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے ہی وہ جانتا ہے۔

ان دو صفتوں، یعنی کمال قدرت اور کمال علم کے بغیر ممکن ہی نہیں معبود وہی ہو سکتا ہے جسکا علم کامل ہو اور جس کی قدرت کامل ہو۔ اس کا ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہونا بھی اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ تمام مخلوق کی حاجات کو جانتا ہو اور ان کے اہم کاموں کو پورا کرنے پر قادر ہو، چونکہ پہلے بیان کر دیا گیا کہ ﴿قَـآئِـمًـا بِـالْقِسْطِ﴾ کا ایک معنیٰ ہے مخلوق کے تمام امور کا مدبر ہونا۔

"العزیز" کو "الحکیم" پر مقدم ذکر کرنے میں حکمت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے "عزیز" ہونے کا ذکر کیا اور "حکیم" ہونے کا ذکر بعد میں کیا، اس کی وجہ یہ ہے

"ان کونہ تعالی قادرا متقدم بکونہ عالما فی طریق المعرفۃ الاستدلالیۃ فلما کان مقدمافی المعرفۃ الاستدلالیۃ و کان ھذ الخطاب مع المستدلین لاجرم قدم تعالی ذکر العزیز علی الحکیم"

چونکہ آیۃ کریمہ میں خطاب بندوں کو ہے بندوں کا علم استدلالی (دلائل سے حاصل ہونے والا) ہے علم استدلالی کی معرفت اسی وقت ہوسکتی ہے جب مقدمات وغیرہ کو ترتیب دینے کی اسے قدرت حاصل ہو چونکہ "العزیز" سے اشارہ قدرت کی طرف ہے اور "الحکیم" سے اشارہ علم کی طرف ہے اس لئے رب تعالیٰ نے بندوں کو تعلیم دینے کی غرض سے اپنی صفات کو بھی اسی طرح ذکر فرمایا جیسا کہ بندوں کو اپنی صفات کا مظہر بنا کر ان کی صفات میں ترتیب رکھی۔ (ماخوذ از کبیر)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَهُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ○﴾ (آیۃ نمبر ۱۹)

(1) بیشک اللہ کے ہاں اسلام ہی دین ہے، اور پھوٹ میں نہ پڑے کتابی مگر بعد اس کے کہ انہیں علم آچکا اپنے دلوں کی جلن سے اور جو اللہ کی آیتوں کا منکر ہو تو بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

(2) بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے، اور انہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ آگیا ان کے پاس علم، (یہ اختلاف) از روئے باہمی حسد کے تھا اور جو شخص کفر کرتا ہے اللہ کی آیتوں سے بیشک اللہ تعالی جلدی حساب لینے والا ہے۔

شان نزول:

یہود نے دعوی کیا کہ دین یہودیت سے افضل کوئی دین نہیں، اور نصاری نے دعوی کیا دین نصرانیت سے افضل کوئی دین نہیں، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اللہ تعالی کے ہاں پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ (حاشیہ جالین)

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ''بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہے''

"ای لادین مرضی عند الله سوی الاسلام وهو التوحید والتدرع بالشرع الذی جاء به محمد ﷺ"

یعنی اللہ تعالی کے ہاں پسندیدہ دین سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں، وہ دین اسلام دین توحید ہے اور جو شریعت نبی کریم محمد ﷺ نے لائی اس کی زرہ پہننا، یعنی اسے کامل طور پر اپنے آپ پر نافذ کرنا۔ (بیضاوی)

"روی عن ابن عباس رضی الله عنه انه قال نزل قوله ان الدین عند الله الاسلام حین افتخر المشرکون بادیانهم وقال کل فریق منهم لادین الادیننا وهو دین الله تعالی منذ بعث آدم علیه السلام فکذبهم الله تعالی وقال (ان الدین عند الله الاسلام) الذی جاء به محمد ﷺ وهو الدین الحق"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اس وقت نازل ہوا جبکہ مشرکین نے اپنے اپنے دینوں پر فخر کیا، ہر فریق کہہ رہا تھا جب سے آدم علیہ السلام مبعوث ہوئے ہیں اس وقت سے اللہ تعالی کو پسندیدہ دین ہمارا ہی دین تھا۔ رب تعالی نے ان کی تکذیب کی اور فرمایا اللہ تعالی کے پسندیدہ دین اسلام ہی ہے، جو حضرت محمد ﷺ نے لایا ہے، وہی دین حق ہے۔ (از شیخ زادہ)

”ان فسر الاسلام بالشریعة الحمدیة فانه الدین المرضی عند الله فی هذا الزمان بعد نسخ الادیان المنزلة من الله تعالی سابقا قال رسول الله ﷺ لو کان موسی حیا ماوسعه الا اتباعی“ رواہ احمد والبیھقی من حدیث جابر“

اگر اسلام سے مراد نبی کریم ﷺ کی شریعت مراد لی جائے تو اب مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ جب تشریف لے آئے تو پہلے تمام دین منسوخ ہو چکے ہیں، اس لئے آپ کے تشریف لانے کے بعد صرف شریعت محمدیہ ہی رب تعالیٰ کو پسند ہے وہی دین اسلام ہے۔ مسند احمد اور بیہقی نے حضرت جابر ﷺ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کو سوائے میری اتباع کے کوئی وسعت حاصل نہ ہوتی۔ (تفسیر مظہری)

روح البیان کا خوبصورت بیان:

”وحقیقة دین الاسلام التوحید وصورته الشرائع التی هی الشروط وهذا الدین من ذلک الزمان الی یوم القیامة واحد بحسب الحقیقة وسواء بین الکل ومختلف بحسب الصورة والشروط وهذا الاختلاف الصوری لاینافی الاتحاد الاصلی والوحدة الحقیقة“

اسلام کی ایک ہے حقیقت اور ایک ہے صورت۔

دین اسلام کی حقیقت:

حقیقت کے لحاظ پر دین اسلام توحید باری تعالیٰ ہے، اس معنی کے لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ایک ہی دین ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ جب دین اسلام کا یہ معنی لیا جائے تو اب مطلب جو ہو گا اسے تفسیر ابن کثیر اور صابونی کے خوبصورت الفاظ میں دیکھئے:

”وقوله تعالی (ان الدین عند الله الاسلام) اخبار منه تعالی بانه لا دین عنده یقبله من احد سوی الاسلام وهو اتباع الرسل فیما بعثهم الله به فی کل حین حتی ختموا بمحمد ﷺ الذی سد جمیع الطرق الیه الامن جهة محمد ﷺ فمن لقی الله بعد بعثة محمد ﷺ بدین علی شریعته فلیس بمتقبل کما قال الله تعالی ”ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه“

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اس کی طرف سے یہ خبر دی گئی ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں سوائے اسلام کے کوئی دین قبول نہیں، حالانکہ تمام رسولوں کو جو دین دیا گیا اس کو اسلام ہی کہا گیا ہے، اور سب رسولوں کی

اتباع دین اسلام کی اتباع ہی رہی، تو کس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں دین اسلام سے مراد شریعۃ مصطفویہ ﷺ ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے پر رب تعالیٰ تک پہنچنے کے تمام طریقے بند کر دیئے گئے سوائے طریقہ محمدیہ (ﷺ) کے نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کے بعد آپ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور دین کے ذریعے رب تعالیٰ سے کوئی ملنا چاہے تو وہ قبول نہیں ہوگا، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور جس شخص نے اسلام کے بغیر کوئی اور دین تلاش کیا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

غرضیکہ نتیجہ واضح ہوا کہ تمام انبیاء کرام عقیدہ توحید پر قائم رہے، اسی کا نام دین اسلام ہے، یہ حقیقت اسلام ہے حقیقت اسلام میں تمام انبیاء کرام متفق رہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہر نبی کی تابعداری دین اسلام کی تابعداری ہی رہی، لیکن نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر عقیدہ توحید بھی آپ کے ذریعے ہی قابل قبول ہوا، اسی مسئلہ کو عظیم المرتبت اعلیٰ حضرت مولنا شاہ احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

اور خصوصاً جب عقیدہ توحید کو بھی برباد کر دیا گیا تھا، یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور بعض عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو مستقل معبود مانا، اور بعض نے تین خدا مانے جن میں ایک عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا شریک مانا گیا تو یقیناً اس وقت عقیدہ توحید بھی وہی مقبول ہوا جو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے پیش فرمایا باقی تمام دینوں میں تحریف کر کے ان کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔

دین اسلام کی صورت :

شرعی احکام اور ان کی شرائط دین اسلام کی صورت ہے اس میں اختلاف ہوتا رہا یعنی شرعی احکام مختلف شریعتوں میں بدلتے رہے، باوجود اس کے کہ صورت اسلام بدلتی رہی لیکن حقیقت اسلام ہر نبی کے دور میں ایک ہی رہی۔
(از روح البیان مع وضاحت)

لیکن یہود و نصاریٰ کے پیروکار دیکھیں کہ عقیدہ توحید کو بھی یہودیوں اور نصرانیوں نے بدل دیا۔

دین کا لغوی معنی :

"اصل الدين في اللغة الجزاء ثم الطاعة" اصل دین کا لغوی معنی ہے بدلہ پھر طاعت کا نام دین رکھ دیا گیا اسلئے کہ طاعت سبب ہے جزاء کا۔

اسلام کے معانی:

اسلام کے لغوی معنی میں تین وجہ ہیں

(۱) الاول "انہ عبارة عن الدخول فی الاسلام" پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے، یعنی فرمانبرداری اور متابعت کو اسلام کہا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَاتَقُوْلُوْالِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ اور نہ کہو اس شخص کو جو تمھاری طرف اپنا اسلام پیش کرے کہ تو مؤمن نہیں۔ اس مقام میں بھی "السلم" اطاعت وفرمانبرداری کے معنی میں استعمال ہے یعنی جو شخص تمہیں یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں، تمھارا مطیع اور فرمانبردار ہوں تو تم اسے بینہ کہو کہ تو مؤمن نہیں اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر مؤمن سمجھ کر حقیقت حال کو رب تعالی کے سپرد کردو۔

(۲) والثانی "من اسلم ای دخل فی السلم" دوسرا معنی یہ ہے کہ سلامتی میں داخل ہونا جیسا کہ کہا جاتا ہے "اسنی واقحط" وہ قحط سالی خشک سالی میں داخل ہوگیا۔ یعنی "سلم" کا معنی ہے سلامتی اس سے جب ماخوذ ہو "اسلم" تو معنی ہوگیا" وہ سلامتی میں داخل ہوا"

(۳) الثالث" قال ابن الانباری المسلم معنا ہ المخلص للہ عبادتہ" تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی کی عبادت کو خلوص سے ادا کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے "سلم الشئ لفلان ای خلص لہ" فلاں شخص فلاں کا مخلص ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اسلام کا معنی ہوا دین میں خلوص پیدا کرنا اور اللہ تعالی پر خالص عقیدہ رکھنا۔

اس مقام پر اسلام اور ایمان ایک ہے معنی میں استعمال ہیں:

اگر چہ کبھی کبھی اسلام صرف ظاہری طور پر جھکنے اور دل میں صحیح عقیدہ نہ رکھنے پر بولا جاتا ہے۔ اور ایمان دل میں عقیدہ رکھنا یعنی تصدیق قلبی کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی سے یہ واضح ہے ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا﴾ اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، فرمادو تم ایمان نہیں لائے، لیکن یہ کہو ہم اسلام لائے۔

یہاں ایمان تصدیق قلبی اور اسلام ظاہری جھکاؤ پر بولا گیا ہے لیکن حقیقت میں اسلام اور ایمان ایک چیز ہیں، اس پر واضح دلائل موجود ہیں، جن میں سے دو کی طرف توجہ فرمائیں، یہاں زیر بحث آیۃ کریمہ میں فرمایا "ان الدین عند اللہ الاسلام" (بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے)

"یقتضی ان یکون الدین المقبول عند اللہ لیس الا الاسلام فلو کان الایمان غیر

الاسلام وجب ان لا یکون الایمان دنیا مقبولا عند الله، ولاشک فی انه باطل "

جو تقاضا کرتا ہے کہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول صرف اسلام ہی ہے، اگر ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہوں تو لازم آئے گا کہ ایمان اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو، یہ کہنا سراسر باطل ہے، تو پتہ چلا کہ ایمان اور اسلام ایک ہی چیز ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور جو شخص اسلام کے بغیر دین تلاش کرے، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس سے پتہ چلا

"فلو کان الایمان غیر الاسلام لوجب ان لایکون الایمان دینا مقبولا عند الله تعالی"

اگر ایمان، اسلام کا غیر ہو تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان مقبول نہ ہو، حالانکہ یہ کہنا باطل ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ حقیقت میں ایمان اور اسلام ایک چیز ہیں، زیر بحث آیۃ کریمہ میں اگرچہ ذکر اسلام ہے لیکن اس سے مراد ایمان بھی ہے۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾

"اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس علم (یہ اختلاف) از روئے باہمی حسد کے تھا۔"

"بغیا" کا معنی تجاوز کرنا، یعنی ایک دوسرے پر زیادتی کرنا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا "اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، (یہ اختلاف ان کا) ایک دوسرے پر زیادتی اور تجاوز کی وجہ سے تھا۔ اور دوسرا معنی "بغیا" کا عام مفسرین کرام نے "حسد" کیا ہے، حسد چونکہ دوسرے کے کمال پر جلنے کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے کامل طور پر ترجمہ سے ہی مطلب حاصل کرنے کیلئے یوں ترجمہ فرمایا "اپنے دلوں کی جلن سے"

راقم نے ضیاء القرآن سے ترجمہ حاصل کیا ہے، وہ بھی تقریباً تفاسیر کے مطابق عام فہم ہی ہے، ان دونوں معانی کا حسین امتزاج حضرت محمد علی صابونی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے پیش فرمایا:

"بغی بعضهم علی بعض فاختلفوا فی الحق بتحاسدهم وتباغضهم وتدابرهم فحمل بعضهم بغض البعض الآخر علی مخالفته فی جمیع اقواله وافعاله وان کانت حقا" (صابونی)

(بغیا بینهم) کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر زیادتی کی حد سے تجاوز کیا، تو انہوں نے حق میں

اختلاف کیا ایک دوسرے سے حسد اور بغض کی وجہ سے، اور ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر کر رہے یہاں تک کہ بغض کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی اقوال اور افعال میں مخالفت کرنے لگے، خواہ دوسرے فریق کی باتیں حق ہوتیں اور اس کے کام صحیح ہوتے لیکن پھر بھی اس کا مخالف فریق ان کو جھوٹ اور باطل کہتا۔ جن لوگوں کو کتاب دی، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) الاول "المراد بهم اليهود" ان وجوہ سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وصال کے قریب توراۃ ستر (۷۰) اہل علم کے سپرد کی، ان کو اس کا امین و محافظ بنایا، اور حضرت یوشع علیہ اسلام کو خلیفہ بنایا۔ جب کچھ زمانہ گزر گیا تو ان ستر لوگوں کے بیٹوں کے آپس میں اختلاف ہو گئے، باوجود اس کے کہ وہ سب ہی توراۃ کا علم رکھتے تھے، ان کے اختلاف کی وجہ (بغيا بينهم) وتحاسدوا على طلب الدنيا" آپس میں ایک دوسرے سے زیادتی اور تجاوز تھا اور دنیا کی طلب کی وجہ سے ایک دوسرے سے حسد کرنا ان کے اختلاف کی وجہ تھی۔

(۲) والثانی" المراد النصارى واختلافهم في امر عيسى عليه السلام بعد ما جاء هم بانه عبد الله ورسوله" دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ان سے مراد نصاری ہیں۔ ان کا آپس میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختلاف تھا کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہہ رہا تھا اور کوئی خدا کا بیٹا کہہ رہا تھا، حالانکہ ان کے پاس یہ علم آچکا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

(۳) والثالث" المرد اليهود والنصارى" ان میں تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس مقام میں اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاری کے دونوں فریق ہیں، ان کا اختلاف یہ تھا کہ یہود کہہ رہے تھے حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصاری کہہ رہے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں یعنی یہود نصاری کو جھوٹا کہہ رہے تھے اور نصاری یہود کو جھوٹا کہہ رہے تھے، حالانکہ دونوں فریقوں کے پاس علم آچکا تھا کہ وہ اولاد سے پاک ہے۔ اسی طرح یہود و نصاری کا اختلاف مؤمنین سے مراد ہو، کہ انہوں نے مؤمنین سے اختلاف کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور دعویٰ یہ کیا کہ نبوت کے لائق تو صرف ہمارا خاندان ہی تھا، قریش تو امی ہیں (ان پڑھ لوگ ہیں) ان کے پاس نبوت کیسے آسکتی ہے؟ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک تمام قول ہی معتبر ہیں، یعنی یہود نے آپس میں اختلاف کیا اور نصاری نے آپس میں اختلاف کیا اور یہود و نصاری نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا، اور یہود و نصاری مؤمنین سے اختلاف کیا، ان کے پاس علم آچکا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"بغیا" پر نصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ "مفعول لہ" ہو، یہ اخفش نحوی کا قول ہے، اس صورت میں "بغیا" للبغی، کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ کہا جائے "جئتک طلب الخیر ومنع الشر" تو مطلب ہوتا ہے "لطلب الخیر ومنع الشر" دوسرا قول زجاج کا ہے کہ اس پر نصب مفعول مطلق کے طور پر ہے، اصل عبارت ہوگی "یبغون بغیا" "والفرق بین المفعول له وبین المصدر ان المفعول له غرض للفعل واما المصدر فهو المطلق الذی احدثه الفاعل" مفعول لہ اور مفعول مطلق میں یہ فرق ہے کہ مفعول لہ فعل کا سبب ہوتا ہے، لیکن مفعول مطلق کو فاعل تاکید وغیرہ کیلئے لاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾

"اور جو شخص کفر کرتا ہے اللہ کی آیتوں سے بیشک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔"

ان الفاظ مبارکہ میں تہدید پائی گئی ہے، تہدید (ڈرانے اور دھمکی) کی دو صورتیں پائی گئی ہیں۔

(۱) الاول "المعنى فانه سيصير الى الله تعالى سريعا فيحاسبه اى يجازيه على كفره"

ان میں سے پہلی صورت یہ پائی گئی ہے کہ جو لوگ کفر کریں گے ان کو جلدی اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے گا، وہ ان کو کفر کی جزاء دے گا۔

(۲) والثانی "ان الله تعالى سيعلمه باعماله وانواع كفره باحصاء سريع مع كثرة الاعمال"

اور دوسری صورت یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو جانتا ہے اور ان کے کفر کی تمام اقسام کو جانتا ہے، باوجود اس کے کہ ان کے اعمال کثیر ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کو جلدی ہی شمار کرے گا۔ (از کبیر)

حساب بھی دراصل لوگوں کو مطمئن کرنے کیلئے ہوگا کہ اپنا اپنا اعمال نامہ ہر شخص دیکھ لے، کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو، ورنہ اللہ تعالیٰ سے کسی انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوبصورت ارشاد:

"عن علی کرم الله وجهه قال الاسلام هو التسليم والتسليم هو اليقين واليقين هو التصديق والتصديق هو الاقرار والاقرار هو الاداء والاداء هو العمل ثم قال ان المومن اخذ دينه عن ربه ولم ياخذه عن رأيه ان المؤمن من يعرف ايمان فی عمله وان الكافر يعرف كفره بانكاره ايها الناس دينكم دينكم فان

السیئة فیه خیر من الحسنة فی غیرہ ان السیئة فیہ تغفر و ان الحسنة فی غیرہ لاتقبل" (روح المعانی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسلام کا مطلب ہے تسلیم کرنا، تسلیم کرنے کا مطلب ہے یقین کرنا، یقین کرنے کا مطلب ہے تصدیق کرنا، تصدیق کرنے کا مطلب ہے اقرار کرنا اور اقرار کرنے کا مطلب ہے اداء کرنا، ادا کرنے کا مطلب ہے عمل کرنا، پھر آپ نے فرمایا بیشک مؤمن نے اپنا دین اپنے رب تعالی سے حاصل کیا ہے، اپنی رائے سے حاصل نہیں کیا، مؤمن کا ایمان اسکے عمل سے پہچانا جاتا ہے اور کافر کا کفر اس کے انکار سے پہچانا جاتا ہے، اے لوگو اپنے دین کو لازم پکڑو، اے لوگو اپنے دین کو لازم پکڑو، مسلمان کا گناہ بھی کافر کی نیکی سے اچھا ہے، کیونکہ مؤمن اگر غلطی سے گناہ صغیرہ کرلے تو عبادات سے وہ معاف ہوجاتے ہیں، اور اگر مؤمن گناہ کبیرہ غلطی سے کرے تو وہ سچے دل سے توبہ کرنے سے معاف ہوجاتے ہیں لیکن کافر کی نیکی کبھی بھی قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ نیکی کی قبولیت کی شرط ایمان ہے۔ جب ایمان ہی نہ ہو تو نیکی حاصل ہی نہیں ہوتی اگرچہ بظاہر کوئی اچھا کام نیکی دکھائی دیتا ہے۔

اسلام کا ذکر احادیث مبارکہ سے:

عن عمر بن خطاب..... وقال یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله و تقیم الصلوة و تؤتی الزکوة و تصوم رمضان و تحج البیت ان استطعت الیه سبیلا"

(بخاری و مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث مروی ہے، جس میں جبریل کے چند سوالات کا ذکر ہے جو نبی کریم ﷺ کی امت کی تعلیم کیلئے سوال کر رہے تھے اور حضور ﷺ جواب دے رہے تھے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا، اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے متعلق خبر دیں، آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ بیشک کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالی کے، اور بیشک محمد ﷺ اللہ تعالی کے رسول ہیں اور تم نماز قائم رکھنا اور زکوۃ ادا کرنا اور روزہ رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر تمہیں اس کی طرف راہ کی طاقت ہو۔

وضاحت حدیث:

''**اخبرنی**'' کا معنی ہے "**لما تقرر ان الرسول افضل من الملائکة العلویة**" جب یہ ثابت ہے کہ بیشک رسول تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔

(عن الاسلام) مجھے اسلام کے متعلق بتائیں، اسلام کا لغوی معنی ہے مطلقا انقیاد (اطاعت) اور شرعی معنی ظاہری اطاعت کے ساتھ ساتھ باطنی اطاعت بھی پائی جائے، انقیاء باطنی کو ہی ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ رب تعالی

نے بیان فرمایا ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، آپ فرمادو تم ایمان نہیں لائے، تم کہو ہم اسلام لائے ہیں، ایمان نہیں داخل ہوا تمہارے دلوں میں، یعنی ان کو ظاہری انقیاد (اطاعت و عجز وانکساری) حاصل تھی، ان کے دلوں میں ایمان نہیں تھا۔

(الاسلام) پر الف لام عہد خارجی ہے، گویا سوال حقیقت شرعیہ کے متعلق تھا، مطلقاً ظاہری طور پر جھکنے کے متعلق سوال نہیں تھا، اسی لئے اسلام کے پانچ ارکان بیان فرمائے کہ یہ ہے اسلام۔

(قال الاسلام) جواب میں "ھو" ضمیر کو ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ضمیر کا ذکر کرنا کافی تھا، لیکن ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا زیادتی وضاحت کیلئے۔

(ان تشهدان لااله الاالله وان محمد رسول الله) یہ کہ تو گواہی دے کہ بیشک اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں، یہ خطاب عام مخاطب کو، اور "تشھد" ذکر کیا گیا ہے "تعلم" ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ "ان الشهادة ابلغ فی الانكشاف من مطلق العلم و من ثم لم يكف اعلم عن اشهد فی اداء الشهادة" لفظ "شهادة" میں بنسبت "علم" کے زیادہ انکشاف پایا گیا ہے، اسی وجہ سے گواہی دیتے وقت "اشھد" کہنا ہوگا "اشھد" کی جگہ "اعلم" کا استعمال کافی نہیں ہوگا، "ان لااله الاالله" میں "ان" مخففة من المثقله ہے یعنی اصل میں "ان" نون کی شد سے ہے، پھر اس میں تخفیف کر کے اسے "ان" نون کے سکون سے کر دیا گیا اور اس میں اسم ضمیر شان محذوف ہے، اصل میں "انہ" ہے۔ اب ترجمہ یہ ہو گیا "انه لااله معبود بالحق فی الوجود الاالله" کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے سواء اور کوئی معبود بالحق نہیں۔

توحید کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

التوحيد هو الحكم بوحدانية الشئ والعلم بها واصطلاحا اثبات ذات الله بوحدانيته منعوتا بالتنزه عما يشابهه اعتقادا فقولا وعملا فيقينا وعرفانا فمشاهدة وعيانا فثبوتا ودواما"

توحید کا لغوی معنیٰ یہ ہے کسی چیز کو ایک جاننا اور اس پر ایک ہونے کا حکم لگانا۔ اور توحید کا اصطلاحی معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک ماننا کہ اس کا کوئی شریک نہیں، اور اس کو تمام صفات میں ایک ماننا کہ اس کا کوئی مثل نہیں، اسی پر اس کا اعتقاد ہو، اسی کے مطابق اسی کا قول ہو اور اسی کے مطابق اس کا عمل ہو، اسی پر یقین ہو، اسی کی معرفت حاصل ہو، بلکہ انسان اپنے آپ کو اس درجہ پر پہنچائے کہ اس کو رب تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ حاصل ہو کہ وہ ایک ہے، اسی عقیدہ پر

انسان قائم ودائم رہے۔ علامہ غزالی رحمہ اللہ کہتے ہیں، توحید کے دو چھلکے (یعنی دو پردے) اور دو مغز ہیں۔

"فالقشرة العليا القول باللسان المجرد" اور اوپر والا پردہ صرف زبان سے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کی ذات وصفات میں اس کا کوئی مثل نہیں۔ "والثانية الاعتقاد بالقلب جازما" اور دوسرا نیچے والا چھلکا یہ ہے کہ دل میں یہ پختہ اعتقاد رکھے کہ رب تعالیٰ "وحده لا شريك له" ہے۔

"واللب ان ينكشف بنور الله سر التوحيد بان يرى الاشياء الكثيرة صادرة عن فاعل واحد ويعرف سلسلة الاسباب مرتبطة بمسبباتها"

اور توحید کا مغز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نور معرفت عطاء کر رکھا ہے اس سے بندے پر توحید کے راز ظاہر ہو جائیں، وہ کثیر چیزوں کو یہی سمجھے کہ وہ ایک ہی فاعل سے صادر ہیں، اور اس پر یہ منکشف ہو کہ سلسلہ اسباب مسببات پر مرتبط (متعلق) ہے۔

"ولب اللب ان لا يرى فى الوجود الا واحدا ويستغرق فى الواحد الحق غير ملتفت الى غيره"

اور مغز کا مغز یہ ہے کہ صرف ایک ہی ذات کو موجود دیکھے، کہ حقیقی وجود صرف اسی ذات کو حاصل ہے باقی سب ہی اس کے وجود کا عکس ہیں، اس طرح انسان حق تعالیٰ کی توحید میں مستغرق ہو جائے کہ کسی اور کی طرف اس کی توجہ ہی نہ رہے۔

(**وان محمد رسول الله**) اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں یعنی توحید کی شہادت کے بعد رسالت کی شہادت دے، شریف اسلام کی دارومدار توحید اور رسالت پر ہے، اسی وجہ سے اسلام کے بنیادی ارکان دونوں شہادتوں (شہادت توحید اور شہادت رسالت) کو قرار دیا۔

(**وتقيم الصلوة**) اور تو نماز قائم کرے، یعنی اسلام کا اور رکن نماز قائم کرنا ہے، اور مسلم شریف کی روایت "الصلوة المكتوبة" ذکر فرمایا، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "ان النافلة وان كانت من الاسلام لكنها ليست من اركانه" نفلی نماز بھی اگر چہ اسلام میں داخل ہے لیکن وہ اسلام کا رکن نہیں، رکن صرف فرضی نماز ہے۔

"نماز کو قائم کرنا" کہا ہے "نماز ادا کرنا" یعنی "تصلی" نہیں کہا، جس سے اس کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ نماز کے ارکان اور شرائط کو صحیح طور پر ادا کرے، اور نماز ہمیشہ ادا کرے۔

(**وتؤتى الزكوة**) اور تم زکوۃ دو" یعنی اسلام کے ارکان میں سے زکوۃ دینا بھی ایک رکن ہے، یہاں بھی زکوۃ دینا ذکر فرمایا، صرف زکوۃ ادا کرنا نہیں کہا کیونکہ کسی کو مال دے دینے کا مطلب یہ ہے کہ مال کا مالک بنا دیا جائے، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں کامل فصاحت پائی گئی ہے، ایک ایک لفظ سے کئی کئی مسائل سمجھ آتے ہیں۔

(وتصوم رمضان) اورتم روزہ رکھو، اسلام کے ارکان میں سے روزہ بھی رکن ہے۔ رمضان شریف کے مسائل وفضائل دوسرے پارہ میں تفصیلی طور پر ذکر ہو چکے ہیں، یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

(وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلا) اور توحج کرے بیت اللہ کا اگر تجھے اس کی طرف راہ کی طاقت ہو۔ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اسباب سلامتی میں ہوں، آلات صحیح ہوں، یعنی ایک شخص کے اعضاء وغیرہ صحیح وسلامت ہوں آنے جانے کا خرچ ہو، اور واپسی تک اہل وعیال کا خرچ بھی ہو۔ (مرقاۃ ج اول ص ۵۲، ۵۳)

❁ **"عن عبد الله بن عمرو رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمهاجر من هجر مانهی الله عنه لفظ البخاری، ومسلم قال ان رجلاسئال النبی ﷺ ای المسلمین خیر قال من سلم المسلمون من لسانه ویده"**

حضرت عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی میں رہیں، اور کامل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یہ بخاری کے الفاظ ہیں (جن کا ترجمہ پیش کیا ہے) اور مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا مسلمانوں میں سے بہتر کون سا مسلمان ہے، تو آپ نے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی میں رہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) راوی نے اپنے باپ عمرو بن العاص سے پہلے اسلام قبول کیا، باپ اور بیٹے کے درمیان تیرہ سال کا فرق ہے، یعنی باپ عمرو اپنے بیٹے عبداللہ سے تیرہ سال بڑے ہیں، "عمرو" جب عین کے فتحہ اور میم کے سکون سے پڑھا جائے تو اس کے آخر میں "واؤ" لکھی جاتی ہے تا کہ "عمر" (عین کے ضمہ اور میم کے فتحہ) سے فرق ہو جائے، "عمر" غیر منصرف ہے، "عمرو" منصرف ہے، اسی وجہ سے نصبی حالت میں "عمرو" کے آخر میں "واؤ" نہیں لکھی جاتی (مراح الارواح میں یہ مسئلہ اسی طرح لکھا گیا ہے)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وکان غزیر العلم کثیر الاجتهاد فی العبادة عمی آخر عمره وکان اکثر حدیثا من ابی هریرة لانه کان یکتب لکن ماروی عنه وهو سبعما ئة حدیث قلیل بالنسبة لما روی عن ابی هریرة"

کہ وہ بہت بڑے عالم تھے اور بہت ہی زیادہ عبادت گزار تھے، آخری عمر میں آپ کی نظر چلی گئی تھی، ان کی احادیث

حضرت ابوھریرہ ؓ کی احادیث سے زیادہ ہیں، کیونکہ یہ احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے لیکن ان کی بیان کی ہوئی روایات سات سو ہیں، جو بیان کے لحاظ پر حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایات سے کم ہیں۔ "استاذن النبی ﷺ فی ان یکتب حدیثہ فاذن لہ" انہوں نے نبی کریم ﷺ سے احادیث کو لکھنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے لکھنے کی اجازت فرمادی۔ (از مرقاۃ ج اول ص ۲۷)

اہل علم کی خدمت میں درخواست:

حضرت علامہ محمو احمد رضوی فیوض الباری فی شرح البخاری جلد اول ص ۶۸ میں یوں بیان فرماتے ہیں "حضرت عمر ؓ کے سواء صحابہ کرام میں "عمر بن الخطاب" کسی کا نام نہیں اور عمر نامی صحابہ میں ۱۲۳ افراد ہوئے ہیں، اسی لئے عمر کے آخر میں "واؤ" زیادہ لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس عمر سے عمر بن الخطاب مراد نہیں ہیں۔ چونکہ فیوض الباری میں اس مسئلہ پر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا میں نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے یہ مسئلہ کسی کتاب سے مل جائے لیکن ابھی تک ملا نہیں کسی بزرگ کو معلوم ہو تو مجھے مطلع کرے۔

فیوض الباری سے سمجھ آتا ہے کہ سب نام "عمر" عین کے ضمہ اور میم کے فتحہ سے ہیں واؤ آخر میں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ "عمر بن الخطاب" اور باقی "عمر" نام صحابہ میں فرق ہو جائے، راقم نے حضرت علامہ محمود احمد رضوی رحمہ اللہ کے ارشاد کو رد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سمجھنے کی کوشش میں ہوں کیونکہ راقم نے چھ سال حزب الاحناف لاہور میں تدریس کے فرائض سرانجام دے اور راقم بخوبی واقف ہے کہ حضرت علامہ بہت زیادہ مطالعہ میں مشغول رہتے محقق شخص تھے اسلئے بار بار ذہن میں یہی آتا ہے کہ کہیں سے یہ مسئلہ حاصل کیا گیا جو حل نہیں رہا، امید ہے کہ میری اس الجھن کو حل کرنے میں اہل علم معاونت فرمائیں گے، یہ بھی خیال رہے کہ حرکات کا فرق جو میں نے بیان کیا ہے وہ مراح الارواح سے لیا ہے، اگر چہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی عبارت سے کچھ پتہ چلتا ہے لیکن صراحۃً آپ نے ذکر نہیں فرمایا، آپ کی عبارت یہ ہے **(وعن عبد اللہ بن عمرو) و کتب بالواو لیتمیز عن عمر ومن ثمۃ لم یکتب حالۃ النصب لتمیزہ عنہ بالالف وھو ابن العاص القرشی"** (حوالہ مذکور)(راقم)

وضاحت حدیث:

(**قال قال رسول اللہ ﷺ المسلم**) " ای الکامل" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمان وہ ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ "کامل مسلمان وہ ہے" اس لئے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے کو ایذاء (تکلیف) پہنچاتا ہے تو وہ اگر چہ

مسلمان تو رہتا ہے لیکن کامل مسلمان نہیں رہتا۔

(**من سلم المسلون**) ای والمسلمات اما تغلیبا و اما تبعا" نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "مسلمون" اگرچہ مذکر کا صیغہ ہے لیکن مؤنث کو بھی شامل ہے یا تو قاعدۂ تغلیب کے مطابق اور یا مؤنث کو مذکر کے تابع ہونے کہ وجہ سے ضمناً مراد لے لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ حکم ذمی مرد اور عورتوں کو بھی شامل ہے، کیونکہ ابن حبان کی روایت میں "من سلم الناس" کے الفاظ ہیں۔یعنی کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان مرد اور عورتیں، ذمی مرد اور عورتیں محفوظ رہیں۔(لیکن اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ کافر، ظالم، یہود و نصاری مسلمان کے ملک میں آکر تباہی کرتے رہیں اور مسلمان سلامتی کا دامن ہاتھ میں لئے ہوئے ان کے سامنے سر جھکاتے رہیں اور اپنی عزتیں لٹاتے رہیں بلکہ ان ظالموں کا دفاع جس طرح بھی ممکن ہو اسی طرح کیا جائے ایسی صورت حال میں خود کش حملوں کو دہشت گری قرار دینا اور خودکشی حرام ہے کہ فتوے دینا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں، عراق اور فلسطین کے مسلمانوں کی قربانیاں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (راقم)

(**من لسانه**)ای بالشتم واللعن والغیبة والبهتان والنمیة والسعی الی السلطان وغیره ذلک"

زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی گالیوں اور لعنت اور غیبت اور چغلخوری اور بادشاہ کے پاس جا کر کسی کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے سے مسلمان اور ذمی اس سے محفوظ رہیں۔

(**ویده**)"بالضرب والقتل والهدم والدفع والکتابة بالباطل ونحوها"

اور ہاتھ سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مار اور اس کی قتل اور اس کی طرف سے تباہی اور اس کی طرف سے کسی کو راہ حق سے ہٹانے اور کسی کے خلاف باطل طریقہ کی تحریر سے مسلمان اور ذمی محفوظ رہیں۔

زبان کا ذکر ہاتھ کے ذکر سے پہلے کیوں؟ اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) ابتداء لڑائی جھگڑے کی زبان سے ہی شروع ہوتی ہے جو ہاتھ تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے پہلے زبان کی ایذاء کا ذکر کیا۔

(۲) زبان سے کسی کو ایذاء دینا زیادہ پایا جاتا ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے۔

(۳) زبان سے تکلیف دینا آسان ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے۔

(۴) زبان سے تکلیف دینے سے زیادہ درد ہوتا ہے بنسبت ہاتھ سے تکلیف دینے کے، جیسا کہ کہا گیا ہے

جراحات السنان لها التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

نیزوں کے زخم مل جاتے ہیں　　　اور زبان کے زخم نہیں ملتے

(۵) زبان سے تکلیف دینا عام ہے جو زندہ اور مردہ شخص کو تکلیف دی جا سکتی ہے لیکن ہاتھ سے تکلیف صرف زندہ کو ہی دی جاتی ہے۔ کتنا بڑا دشمن بھی مر جائے تو کوئی شخص اس کی قبر کھود کر اسے نہیں مارتا۔

(۶) "وابتلی به الخاص والعام خصوصا فی هذه الایام" زبان سے تکلیف دینے میں عوام و خواص سب ہی مبتلاء ہیں، اسی طرح زبان سے تکلیف عوام اور خواص دونوں کو ہی دی جاتی ہے۔ لیکن ہاتھ سے تکلیف نہ ہی خواص دیتے ہیں اور نہ ہی خواص کو دی جاتی ہے۔

خیال رہے کہ کسی سے ایسا مزاح خوش طبعی پر موقوف ہو، جس سے مزاح کیا جا رہا ہو اسے کوئی تکلیف محسوس نہ ہو تو یہ جائز ہے۔

"(**والمهاجر**)ای الکامل او حقیقة" یعنی حقیقی اور کامل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے۔ یعنی قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں جن چیزوں کو منع کیا گیا ہے، ان سے رک جائے، چونکہ ایک روایت میں یوں ذکر ہے "ما حرم الله علیه" ان چیزوں سے رک جائے جو اللہ تعالی نے حرام کر دی ہیں۔
(ماخوذ از مرقاۃ ج ا ص ۷۴)

❁ "عن العباس بن عبد المطلب قال قال رسول الله ﷺ ذاق طعم الایمان من رضی بالله ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا" (رواه مسلم، مشکوة کتاب الایمان)

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص نے ایمان کی حلاوت اور لذت کو حاصل کیا جو اللہ تعالی کے رب ہونے پر راضی ہوا اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک کے راوی حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کے چچا ہیں، اور آپ سے عمر کے لحاظ پر دو سال بڑے ہیں۔

"ومن لطافة فهمه ومتانة علمه انه لما سئل انت اکبر ام النبی ﷺ قال هو اکبر وانا اسن"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے فہم کی لطافت اور ان کے علم کی متانت یہ ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ بڑے ہیں یا نبی کریم ﷺ بڑے ہیں، تو آپ نے (خوبصورت جواب) ارشاد فرمایا "بڑے تو وہ ہیں، عمر میری زیادہ ہے"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی والدہ نے سب سے پہلے کعبہ شریف کو ریشمی اور دیباج اور مختلف قسم کے کپڑوں سے غلاف تیار کر

کے پہنایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عباس بچپن میں گم ہو گئے تھے، آپ کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ اگر میرا بچہ مل گیا تو میں کعبہ شریف کو غلاف پہناؤں گی، تو بچے کے مل جانے پر انہوں نے اپنی نذر کو پورا کیا۔ حضرت عباس ﷛ زمانہ جاہلیت میں رئیس تھے، مسجد حرام کی تعمیر کرانا آپ کی ہی ذمہ داری تھی جب بھی تعمیر کی ضرورت درپیش آتی تو آپ قریش کو تعمیر کی رغبت دلاتے، اور مسجد میں نیک عمل کرنے اور بیہودہ کلام کے چھوڑنے کا آپ حکم فرماتے اور حاجیوں کو پانی پلانے کی بھی آپ نے ہی ذمہ داری قبول کی ہوئی تھی، حضرت عباس ﷛ نے اپنی زندگی میں ستر غلام آزاد کئے۔ ان کی پیدائش اصحاب فیل کے (ابرہہ اور اس کے چچوں کا کعبہ شریف کو شہید کرنے کی غرض سے آنے اور ان کے ہلاک ہونے کے) واقعہ سے ایک سال اور چند ماہ پہلے ہوئی۔ آپ کی وفات جمعہ کے دن بارہ رجب بتیس ہجری اٹھاسی سال کی عمر میں ہوئی، آپ کو بقیع میں دفن کیا گیا۔

"وکان اسلم قدیما وکتم اسلامہ وخرج مع المشرکین یوم بدر مکرھا فقال النبی ﷺ من لقی العباس فلایقتلہ فانہ خرج مکرھا"

آپ نے مکہ میں ہی اسلام قبول کیا ہوا تھا، بدر کے دن مشرکوں کے ساتھ آپ کو جبراً لایا گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص عباس کو ملے تو انہیں قتل نہ کرے کیونکہ انہیں جبری طور پر لایا گیا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اص ۷۶)

یہ بدر میں قید ہوئے، فدیہ بھی ادا کیا، ظاہری حکم مشرکوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہونے کا یہی تھا۔

(قال رسول اللہ ﷺ ذاق طعم الایمان) ای نال وادرک واصاب ووجد حلاوتہ ولذتہ"

رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ گرامی "**ذاق طعم الایمان**" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے ایمان کی حلاوت اور لذت کو حاصل کر لیا، پالیا۔

"ذوق" کا اصلی معنی یہ ہے کہ منہ میں تھوڑی چیز آجائے جس کا ذائقہ اسے حاصل ہو جائے، یہاں "ذوق" سے مراد "ذوق معنوی" ہے، اگرچہ علامہ ابن حجر شارح بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ذوق حسی اور ذوق معنوی دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔

(من رضی باللہ ربا) جو شخص دل کی خوشی اور انشراح صدر (کھلے سینہ) سے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوا،

(وبالاسلام دینا) اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا، اسلام کا لفظ اس مقام میں ایمان کو بھی شامل ہے، یعنی اسلام اور ایمان کے دین ہونے پر راضی ہوا۔

(وبمحمد ﷺ رسولا) اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔ راضی ہونے سے مراد یہ ہے کہ ظاہری اور

باطنی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع ہو۔

"والکمال ان یکون صابرا علی بلائه وشاکرا علی نعمائه وراضیا ب قدره وقضائه ومنعه واعطائه وان یعمل بجمیع شرائع الاسلام بامتثال الاوامر واجتناب الزواجر" اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر کامل رضاء مندی اس وقت پائی جائے گی جب اس کی طرف سے آنے والی مصیبتوں پر وہ صبر کرے، اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے، اور اس کی تقدیر پر راضی رہے، وہ کوئی نعمت عطاء کرے یا نہ عطاء کرے ہر حال میں راضی رہے، تمام شرائع اسلام پر عمل کرے، رب تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرے، اور جن چیزوں سے رکنے کا حکم دیا ہے ان سے رک جائے۔

حضرت محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے "وان یتبع الحبیب حق متابعته فی سنته وآدابه واخلاقه ومعاشرته" حبیب پاک ﷺ کی کامل طور پر تابعداری کرے، آپ کی سنتوں اور مستحبات کے مطابق عمل کرے، اور آپ کے اخلاق اور آپ کی معاشرت کے مطابق اپنی معاشرت رکھے۔

اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے، "والزهد فی الدنیا والتوجه الکلی الی العقبی" دنیا میں کامل طور پر نیک ہو کر رہے، دنیا کے مال ومتاع کی طرف رغبت نہ ہو، بلکہ کامل طور آخرت کی طرف توجہ پائی جائے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ ص ۷۶)

❁ "عن سفیان بن عبدالله الثقفی قال قلت یا رسول الله قل لی فی الاسلام قولا لاأسئال عنه احدا بعدک وفی روایة غیرک قال قل آمنت بالله ثم استقم" (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمادیں، تاکہ میں آپ کے بعد کسی اور سے سوال نہ کروں، آپ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ پھر اس پر قائم رہو۔

وضاحت حدیث:

"قل لی فی الاسلام" اسلام کے متعلق مجھے بتادو، یعنی آپ وہ چیزیں بیان فرمادیں جن سے اسلام مکمل ہوتا ہو، اور اسلام کے حقوق کی ان میں رعایت پائی جائے، اور آپ کے ارشاد گرامی سے دین کے توابع کی رہنمائی مل جائے، "وقیل التقدیر فی مبادی الاسلام وغایاته" یعنی آپ کے ارشاد سے اسلامی کی بنیادی چیزیں اور انتہائی مقاصد حاصل ہوجائیں (قولا لااسئال عنه احدا بعدک) آپ ایسا (جامع) ارشاد فرمائیں کہ مجھے اسلام کے متعلق

آپ کے بعد کسی ایک سے پوچھنے کی ضرورت درپیش نہ آئے۔

ایک روایت میں ہے "غیرک" کہ میں آپ کے سواء کسی اور سے اسلام کے متعلق نہ پوچھوں۔

"والاول مستلزم لهذا لانه اذالم یسئال احدا بعد سئواله لم یسئل غیره"

پہلے الفاظ ان کو بھی مستلزم ہیں، کیونکہ جو آپ سے سؤال کرنے کے بعد کسی ایک سے سؤال نہیں کرے گا وہ آپ کے سواء کسی اور سے بھی نہیں پوچھے گا۔(قال قل آمنت بالله ثم استقم) آپ نے فرمایا تم کہو میں نے اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر قائم رہو، اللہ تعالیٰ کے رسولوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے فرشتوں، اور قیامت کے دن، اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لانا بھی "آمنت بالله" میں داخل ہے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں (آمنت بالله) ای بجمیع ما یجب الایمان به" میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا یعنی ان تمام پر ایمان لایا جن پر ایمان لانا واجب ہے۔

(**ثم استقم**) پھر اس پر قائم رہا۔ اس حدیث پاک میں قرآن پاک کی ان آیات سے اقتباس حاصل کیا گیا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ بیشک وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے نہ ان پر خوف ہے نہ ان کو غم۔ استقامت کیا ہے؟ اس کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"هذا الحديث من جوامع الكلم لا صول الاسلام التي هي التوحد والطاعة، فالتوحيد حاصل بقوله آمنت بالله والطاعة بانواعها مندرجة تحت قوله ثم استقم لان الاستقامة امتثال كل مامور واجتناب كل محذور فيدخل فيه اعمال القلوب والابدان من الايمان والاسلام والاحسان اذلا تحصل الاستقامة مع شئ من الاعوجاج"

یہ حدیث پاک جوامع الکلم سے ہے (یعنی الفاظ مختصر اور مطالب کثیرہ پائے گئے ہیں) جو کہ تمام اصول اسلام کو شامل ہے، اس میں توحید بھی آگئی اور طاعت کی تمام قسمیں بھی آگئیں۔ "آمنت بالله" میں توحید آگئی کیونکہ رب تعالیٰ کو جب تک "وحده لا شريك له" نہ مانا جائے اس وقت تک ایمان حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اور طاعت کی تمام قسمیں "ثم استقم" میں آگئی ہیں، کیونکہ اصل میں استقامت یہ ہے کہ جن چیزوں کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے

ان کو بجالائے اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے رک جائے، لھذا استقامت میں دل کے اعمال اور بدن کے اعمال داخل ہیں کیونکہ ایمان اور اسلام اور احسان سب ہی اس وقت معتبر ہیں جب ان میں استقامت پائی جائے۔

صدرالافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مرادآبادی رحمہ اللہ" خزائن العرفان" میں فرماتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا استقامت کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ امرونہی پر قائم رہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ عمل میں اخلاص کرے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا استقامت یہ ہے کہ فرائض ادا کرے۔

"روی عن علی رضی اللہ عنہ انه قال قلت یا رسول الله ﷺ اوصنی فقال قل ربی الله ثم استقم قال قلت ربی الله وما توفیقی الابالله علیه توکلت والیه انیب، فقال لیهنک العلم اباالحسن"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں، تو آپ نے فرمایا تم کہو میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہو، میں نے کہا میرا رب اللہ ہے، مجھے نہیں توفیق حاصل ہوئی سوائے اللہ (کی توفیق) کے، اسی پر میرا بھروسہ ہے، اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں، تو آپ نے فرمایا، اے ابوالحسن تمہارا علم تمہارے لئے آسانی پیدا کرتا ہے، یہ علم تمہیں مبارک ہو۔

استقامت بہت عظیم اور مشکل کام ہے، کیونکہ تمام امور کو بجالانا ہے اور تمام نواہی سے رکنا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شیبتنی سورة هود" سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کردیا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اس میں مذکور ہے "فاستقم کما امرت" تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر قائم رہو۔ "وهی جامعة لجمیع انواع التکالیف" یہ تمام انواع تکالیف کو شامل ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں استقامت بہت مشکل کام ہے، استقامت عقائد صحیحہ کو شامل ہے، دین میں استقامت اسے ہی حاصل ہے جس نے عقائد باطلہ سے اجتناب کیا، یعنی تشبیہ اور تعطیل وغیرہ سے دور رہے، یعنی نہ ہی رب تعالی کو عام جسموں کی طرح سمجھے اور نہ ہی معاذ اللہ اس کو تمام کاموں سے معطل مانے۔ استقامت اعمال کو بھی شامل ہے کہ اعمال کو تغیر وتبدل سے بچائے، ایسا نہ ہو کہ نمازیں پانچ کی جگہ چار یا چھ فرض مان لے، اور ایسا بھی نہ ہو کہ چار رکعت والی نماز کو تین یا پانچ رکعت والی سمجھ بیٹھے۔ استقامت اخلاق کو بھی شامل ہے، کہ انسان کے اخلاق میں اعتدال پایا جائے، نہ تو افراط پایا جائے نہ تفریط یعنی بے جا زیادتی اور بے جا کمی سے اجتناب کرے۔

"وقال الغزالی الاستقامة علی الصراط فی الدنیا صعب کالمرور علی صراط جهنم وکل واحد منهما ادق من الشعر واحد من السیف"

علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں صراط پر استقامت اسی طرح مشکل ہے جیسا کہ جہنم کے اوپر پل صراط سے گزرنا مشکل ہوگا، ہرایک بال سے باریک ہیں اور تلوار سے زیادہ تیز ہیں۔

ایک روایت میں ہے "استقیموا ولن تحصوا" دین میں استقامت اختیار کرو، لیکن اسے شمار میں نہ لاؤ، یعنی تم کامل طور پر استقامت کی طاقت نہیں رکھتے ہو، البتہ طاعت میں اپنی کوشش کرو جیسا کہ طاعت کرنے کا حق ہے، "فان مالا یدرک کله لا یترک کله" ایک چیز کو انسان اگر مکمل طور پر حاصل نہیں کرسکتا، تو یہ بھی کوئی عقلمندی کا کام نہیں کہ جس چیز کو حاصل کرنا اسے لازم تھا اسے مکمل ہی چھوڑ دے۔ "وفیه تنبیه نبیه علی ان احد لایظن بنفسه الاستقامة" کامل طور پر انسان کیلئے اس میں تنبیہ پائی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو استقامت پر فائز کامل طور پر نہ سمجھے، اور یہ نہ سمجھے کہ وہ کامل طور پر نفس لوامہ کی صفات سے نکل گیا ہے، اگر انسان یہ سمجھے کہ میں نفس لوامہ کی صفات سے مکمل طور پر نکل چکا ہوں تو وہ اپنے آپ پر تعجب کرے گا، اور اس میں تکبر آجائے گا جو اسے پستی کی طرف لے جائے گا۔ انسان کو مکمل طاعت کی طاقت نہ ملنے میں حکمت یہ ہے کہ

"ان تراب الانسان عجن بماء النسیان الناشیٔ عنه العصیان"

انسان کی مٹی کو بھولنے والے پانی سے گوندھا گیا ہے اسی وجہ سے اس سے وہ نافرمانی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون" تم تمام ہی خطاء کار ہو، بہتر خطاء کار وہ ہے جو خطاء سرزد ہونے کے بعد توبہ کرلے، استقامت کا معنی ہے "سیدھا ہونا" یہ ضد ہے "اعوجاج" کی، جس کا معنی ہے "ٹیڑھا ہونا"، لیکن عمل میں استقامت میانہ روی کو کہا جاتا ہے، کہ اس کے عمل میں اخلاص پایا جائے ریاء کاری، چرچا نہ پایا جائے۔ "واستقامة القلب وهی الثبات علی الصواب" دل کی استقامت یہ ہے کہ وہ درست راہ پر قائم رہے۔ "واستقامة الروح وهی الثبات علی الحق" روح کی استقامت یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہے۔ "ومن لم یکن مستقیما ضاع سعیه وخاب جهده" جس شخص میں امور شرع میں استقامت نہیں، اس کی تمام کوشش برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔

(مرقاۃ ج ۱ ص ۸۴، ۸۵)

❁ "وعن طلحة بن عبید الله قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ من اهل نجد ثائر الرأس تسمع دوی صوته ولا نفقه مایقول حتی دنا من رسول الله ﷺ فاذاهو یسئال عن الاسلام فقال رسول الله ﷺ خمس صلوات فی الیوم واللیلة فقال هل علی غیرهن فقال لا الا ان تطوع قال رسول الله ﷺ وصیام

شهر رمضان فقال هل علی غیره قال لا الا ان تطوع قال وذکرله رسول الله ﷺ الزکوة فقال علی غیرها فقال لا الا ان تطوع ،قال فادبر الرجل وهو یقول والله لا ازید علی هذا ولا انقص منه فقال رسول الله ﷺ افلح الرجل ان صدق'' (بخاری،مسلم،مشکوۃ کتاب الایمان)

حضرت طلحہ بن عبید اللہ کہتے ہیں، ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جو نجد سے آیا اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، جس کی آواز سنائی دے رہے تھی، اور ہم سمجھ نہیں رہے تھے وہ کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوا، تو اس نے اسلام کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ نمازیں ایک دن اور رات میں، تو اس شخص نے کہا، کیا ان کے بغیر بھی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ نفلی نماز ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان کے مہینہ کے روزے، تو اس شخص نے پوچھا کیا اس کے بغیر بھی کوئی روزے ہیں، آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ نفلی روزے ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ کا ذکر فرمایا، تو اس شخص نے پوچھا کیا اس کے بغیر بھی کوئی ہے؟ (یعنی فرض زکوۃ کے بغیر بھی کوئی صدقہ فرض ہے؟) آپ نے فرمایا نہیں، البتہ نفلی ہے، راوی کہتے ہیں، وہ شخص واپس چلا اور کہہ رہا تھا ''قسم ہے اللہ تعالی کی میں اس پر نہ زیادہ کروں گا اور نہ کم کروں گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر یہ شخص سچا ہے تو فلاح پا گیا، یعنی اس نے کامیابی حاصل کر لی اگر یہ اپنے قول میں سچا ہے۔

وضاحت حدیث: ''راوی طلحہ بن عبید اللہ ہیں۔آپ کی کنیت ابو محمد (قرشی) ہے، آپ عشرۃ المبشرین سے ہیں، تمام غزوات میں آپ شریک ہوئے ہیں، سوائے بدر کے، لیکن بدر میں بھی آپ کا مال غنیمت میں حصہ مقرر کیا گیا، اور آپ کا مقام و مرتبہ بھی بدری صحابہ کا ہی تھا، کیونکہ ان کو اور سعید بن زید کو اس قافلہ کا پتہ لگانے کیلئے بھیجا گیا تھا جس کو روکنے کے ارادہ سے واقعہ بدر درپیش آیا، غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے اور آپ کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے آپ کو پچہتر (۷۵) زخم آئے، جن میں سے چوبیس زخم بہت گہرے اور نمایاں تھے۔آپ کی انگلیاں غزوہ احد میں ہی شل ہوگئی تھیں، آپ کا نام رسول اللہ ﷺ نے طلحہ خیر اور طلحہ جود رکھا ہوا تھا۔چھتیس ھجری جنگ جمل میں شہید ہوئے اور بصرہ میں دفن ہوئے۔اس وقت آپ کی عمر چونسٹھ سال تھی۔

(جاء رجل الی رسول الله ﷺ من اهل نجد) نجد والے لوگوں سے ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اس شخص کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا، نجد کا لغوی معنی بلند زمین، اس کے مدمقابل لفظ ''تہامۃ'' ہے، جس کا معنی ہے ''پست زمین'' یہاں مراد خاص جگہ اور شہر ہے، جو عراق اور مکہ کے درمیان ہے۔

(ثائر الرأس) اصل میں ''ثار الغبار'' سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ''غبار کا اٹھنا'' یہاں مراد ہے ''بال

بکھرے ہوئے ہونا''

(نسمع دوی صوته ولا نفقه يقول) عام طور پر لفظ استعمال ہوتا ہے ''دوی النحل او الذباب'' شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، یا عام مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ اب مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی کچھ بات گنگنا رہے تھے جس کی آواز ہم سن رہے تھے، لیکن اس کی بات ہم سمجھ نہیں رہے تھے، کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب آ گیا اور اسلام کے متعلق سوال کرنے لگا یعنی اب اس کی بات کو صحابہ کرام سن رہے اور سمجھ بھی رہے تھے۔

''(يسأل عن الاسلام) ای عن فرائضه التی فرضت علی من وحد الله وصدق رسوله لا عن حقيقته ولذا لم يذكر الشهادتين ولكون السائل متصفابه فلاحاجة الی ذكره''

اس شخص کا سوال فرائض کے متعلق تھا یعنی مطلب یہ تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا ہو تو اس پر اسلام میں کیا چیزیں فرض ہیں، واضح بات ہے کہ حقیقت اسلام کے متعلق اس شخص کا سوال نہیں تھا اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا۔ چونکہ سوال کرنے والا شخص مؤمن تھا، اس لئے حدیث شریف میں بظاہر ذکر نہیں البتہ بخاری شریف کی روایت سے یہ ساری وضاحت سمجھ آ سکتی ہے۔ بخاری شریف میں یہ الفاظ ہیں ''اخبرنی ما ذا فرض الله علی'' (یا رسول اللہ ﷺ) آپ مجھے خبر دیں کہ کیا چیز مجھ پر فرض ہے۔ اور بخاری شریف کے ان الفاظ سے بھی کی گئی وضاحت کو تائید مل رہی ہے۔

''فاخبره النبی ﷺ بشرائع الاسلام'' تو نبی کریم ﷺ نے اسے شرائع اسلام کی خبر دی نبی کریم ﷺ نے اسلام کے فرائض میں سے دن، رات میں پانچ نمازوں کا ذکر فرمایا، تو اس شخص نے سوال کیا، کیا ان کے بغیر بھی نمازیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا، نہیں، ہاں البتہ نفلی ہیں۔ بظاہر اس پر سوال ہوتا ہے کہ وتر جب واجب ہیں اور عید بھی واجب ہے تو ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے:

''وهذا قبل وجوب الوتر او انه تابع لعشاء وصلوة العيد ليست من الفرائض اليومية بل هی من الواجبات السنوية''

کہ یہ حدیث وتر کے واجب ہونے سے پہلے کی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وتر کو اس لئے علیحدہ ذکر نہیں کیا کہ وہ عشاء کے تابع ہیں، علیحدہ مستقل نماز نہیں، اور عید کی نماز ہر دن رات کی نمازوں میں آتی ہی نہیں، کیونکہ وہ سال کے بعد ادا کی جاتی ہے۔

یہ جواب تو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے دیا لیکن راقم کے نزدیک جواب یہ بہتر ہے کہ سوال اسلام میں

فرائض کا تھا، جواب بھی فرائض سے دیا گیا۔ وتر اور عید کی نماز واجب ہیں فرض نہیں لھذا وہ سوال میں ہی داخل نہیں۔ نفلی نماز اوقات مکروھۃ کے بغیر جب چاہے ادا کرے، نہ اس کی تعداد کی کوئی حد ہے اور نہ ہی رکعتوں کی کوئی حد ہے۔ البتہ نفل جب شروع کرے تو ان کو مکمل کرنا ضروری ہے۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَاتُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ﴾ اور اپنے عمل باطل نہ کرو۔ اگر نفل شروع کرکے توڑ دیئے تو ان کی قضاء ضروری ہے۔

پھر نبی کریم ﷺ نے ایک اور فریضہ کا ذکر فرمایا کہ رمضان کے مہینہ کے روزے فرض ہیں، جب اس شخص نے پوچھا کیا ان روزوں کے بغیر بھی کوئی روزے فرض ہیں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، ہاں البتہ نفلی روزے ہیں۔ اسی سے تقریباً واضح ہو جاتا ہے کہ سال میں پانچ دنوں کے علاوہ جب چاہے روزہ رکھے، نفلی روزوں کی کوئی حد نہیں۔ سال میں پانچ دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے وہ دن یہ ہیں ''عید الفطر' عید الاضحیٰ اور ایام تشریق یعنی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحج'' روزوں کے متعلق زیادہ تفصیل **نجوم الفرقان** کے'' حصہ چھارم '' میں ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھیں۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک اور فریضہ کا ذکر فرمایا، کہ زکوۃ دینا فرض ہے، جب اس شخص نے سوال کیا، کہ اس کے بغیر بھی کوئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں'' ہاں البتہ نفلی (صدقات) ہیں۔ یہاں بھی اصلی صدقہ فرضیہ کا ذکر فرمایا۔ صدقات واجبہ یعنی صدقہ فطر وغیرہ کا ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی قربانی کا ذکر کیا کیونکہ یہ واجبات ہیں۔

''قال فادبر الرجل وھو یقول واللہ لا ازید علی ھذا ولا انقص منه''

حضرت طلحہ ﷺ کہتے ہیں، وہ شخص واپس ہوتے ہوئے یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس میں نہ زیادتی کروں گا، اور نہ کمی۔

یعنی اگر میں نے کسی کو تبلیغ کی اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی جوں کا توں پیش کروں گا کمی یا زیادتی آپ کے ارشاد گرامی میں نہیں کروں گا۔ اور جن چیزوں کو نبی کریم ﷺ نے فرض قرار دیا، میں اپنی طرف سے ان فرائض میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کروں گا۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ ہے ''لا اتطوع شیئا ولا انقص مما فرض اللہ علی شیئا'' میں نوافل نہیں ادا کروں گا لیکن اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو مجھ پر فرض کیا ہے، ان میں کوئی کمی بھی نہیں کروں گا'' فقال رسول اللہ ﷺ افلح الرجل ان صدق'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہو گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ان صدق" شرط ہے "افلح الرجل" جزاء مقدم ہے یا قائم مقام جزاء کے ہے۔ راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے پہلے مطلق ذکر کیا "افلح الرجل" یہ شخص کامیاب ہوگیا، پھر یہ خیال فرمایا کہ یہ کہیں غرور میں نہ مبتلاء ہو جائے کہ صرف یہ کہنے سے ہی کامیابی حاصل ہوگی، اسلئے فرمایا، "ان صدق" اگر یہ سچا ہوا (تو پھر کامیابی حاصل ہوگی) کامیابی سے مراد دنیاوی اور اخروی ہی ہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ا ص ۸۶،۸۷)

آجکل کی روشن دماغی اور فرمان مصطفوی ﷺ:

آجکل بے حیائی کو پھیلانے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے، عورتوں اور مردوں کو ایک ساتھ دوڑا کر یہود ونصاریٰ سے یک جہتی منائی جارہی ہے۔ دفاتر میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کو ملازمت دینے کی لالچ میں بے حیاء بنایا جارہا ہے۔ اگر کوئی دین کی بات کرے، تو اسے تنگ نظر، قدامت پسند کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی قرآن وحدیث کی بات کرتا ہے تو کہا جاتا ہے اسلام کو ہم بھی سمجھتے ہیں، صرف مولوی ہی دین اسلام کے ٹھیکیدار نہیں۔ آیئے ایسے لوگوں کے متعلق مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد دیکھئے۔

❀ عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ ليأتين على امتى كما اتى على بنى اسرائيل حذو النعل بالنعل حتى ان كان منهم من اتى امه علانية لكان فى امتى من يصنع ذلك وان بنى اسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة وتفترق امتى على ثلاث وسبعين ملة كلهم فى النار الاملة واحدة، قالوا من هى يا رسول الله قال ما انا عليه واصحابى" (رواه الترمذى، مشكوة باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بضرور آئے گا میری امت پر جیسا کہ آیا بنی اسرائیل پر، (برابر برابر) جس طرح جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے پاس ظاہر طور پر آیا تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والے ہوں گے، بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے، اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سب ہی جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا وہ فرقہ جو اس راہ پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ۔

وضاحت حدیث:

"اتیان" کا معنی ہے آسانی سے آنا، لیکن اس کے بعد جب "علی" آجائے تو اس وقت غلبہ والا معنی ہوتا ہے، یعنی اس

طرح کوئی چیز غالب ہو کر آجائے جو ہلاکت تک پہنچادے، یہاں اس حدیث پاک میں بھی نبی کریم ﷺ نے "لیاتین" کے بعد "علی" ذکر فرمایا اور فعل کو لام تاکید اور نون تاکید ثقیلہ سے مؤکد فرما کر واضح فرمادیا کہ میری امت کے کچھ لوگوں پر ضرور بر ضرور تباہ کن زمانہ آئے گا۔ "لیاتین علی امتی" سے مراد بعض امت ہے، جو کہ "لکان فی امتی من یصنع ذلک" سے واضح ہو رہا ہے 'میری امت میں بھی ایسا کرنے والے ہوں گے' یہ نہیں فرمایا کہ تمام امت ہی ایسا کرے گی۔

"**لیا تین**" میں وسعت پائی گئی ہے اس کا ایک معنی یہ لیا گیا "**لیأتین علی امتی زمان اتیانا مثل الاتیان علی بنی اسرائیل**" ضرور بر ضرور میری امت پر تباہ کن زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر تباہ کن زمانہ آیا۔ اور اس کا معنی یہ ہے:

"**لیأتین علی امتی مخالفة لما انا علیه مثل المخالفة التی اتت علی بنی اسرائیل حتی اهلکتهم**" ضرور بر ضرور میری امت پر میری اور میرے دین کی مخالفت آئے گی جیسا کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی اور اپنے دین کی مخالفت کی یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگئے۔ اور زیادہ عام وسعت والا معنی یہ ہے "**لیأتین علی امتی مثل ما اتی علی بنی اسرائیل**" میری امت کچھ لوگوں پر وہی طور طریقے آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے۔

(**حذو النعل بالنعل**) اگرچہ "حذو" کا لغوی معنی ہے "کاٹنا" اور "**حذو النعل بالنعل**" دونوں جوتوں کے چمڑے کو برابر برابر کاٹنا لیکن یہاں مراد مطلقا برابری ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ یہود کی طرح برابر برابر طور طریقے اختیار کریں گے ذرا بھر بھی ان سے کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے۔ "**ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک**" اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں کے پاس ظاہر طور پر آیا تو میری امت کے کچھ لوگ بھی یہی کام کریں گے۔ "**اتیا نها کنایة عن الزنا**" ماں کے پاس ظاہر طور پر آنے کا مطلب زنا کرنا ہے، یعنی اگر بنی اسرائیل ماں کے ساتھ زنا کے مرتکب ہوئے تو میری امت کے کچھ لوگ بھی اسی فعل کے مرتکب ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب واضح ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ہر برے فعل، بے حیائی کی نقل کرنے والے ان کے بے حیائی کے کاموں کو روشن خیالی سے تعبیر کرنے والے میری امت میں کئی لوگ پائے جائیں گے۔ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد روز روشن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ آجکل بے حیائی کو فروغ دینے کے لیئے روشن خیالی۔ روشن دماغی اور روشن اسلام کا نام دیا جا رہا ہے۔

"**وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة**" بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔

"قال ابن حجر ابر ز ضمیر هم ز یا دۃفی تقبیح صنیعهم وبیا نا لکو ن ذلک دئابهم وعا دتهم "
ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اسم ظاہر ''بنی اسرائیل'' ذکر کیا۔ جس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ ہر برائی ان کی عادت وخصلت میں داخل تھی۔ اسی وجہ سے وہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو کر بھی باطل اور برے فعل کے مرتکب ہوئے۔

"ملة" کالغوی معنی طریقہ، خاص کر کے انبیاء کرام کے ذریعے لوگوں کیلئے جو طریقہ مشروع کیا گیا اسے "ملة" کہا جاتا ہے لیکن بعد میں اس لفظ کا اطلاق عام ہو گیا "الملة کل فعل وقول اجتمع علیه جماعة وهو قد یکون حقا وقد یکون باطلا" "ملة" ہر فعل یا ہر قول کو کہا جاتا ہے جس پر جماعت کا اتفاق ہو، پھر بھی وہ فعل اور قول حق ہوگا جس پر ایک جماعت کا اتفاق ہوگا اور کبھی وہ باطل ہوگا لیکن یہاں مراد یہ ہے "انها اتسعت فاستعملت فی الملل الباطلة" کہ وہ بہتر باطل فرقوں میں بٹ گئے۔ "وتفتر ق امتی علی ثلا ث و سبعین ملة" اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ "کلهم فی النا ر الا ملة" تمام ہی آگ میں جائیں گے۔ سوائے ایک گروہ کے۔ یقیناً آگ میں ہمیشہ رہنے والے وہی فرقے ہیں جو کفار ہوں گے۔

"قا لوا من هی یا رسو ل الله" صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے۔ تو آپ نے فرمایا "قا ل ما انا علیه و اصحا بی" جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ وہ نجات پانے حاصل کرنے والا وہ فرقہ ہوگا۔

" هم المهتدون المتمسکون بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی فلاشک ولاریب انهم هم اهل السنة والجماعة "

یہ وہ لوگ ہوں گے جو میری سنت پر عمل کرنے والے ہوں گے اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ وہ فرقہ یقیناً اہل سنت و جماعت کا مراد ہے وہ ہی حق پر ہیں اور دوسرے تمام فرقے باطل ہیں۔

اصل میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے " من کان علی ماانا علیه واصحابی من الاعتقاد والقول والفعل " کہ جس عقیدہ اور قول وفعل پر میں اور میرے صحابہ ہیں وہ حق ہے اور دوسرے فرقے باطل ہیں۔ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں فرقہ حق پر ہے اور فلاں باطل ہے کیونکہ بظاہر تو ہر فرقہ یہی کہے گا کہ میرا عقیدہ اور قول وفعل نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے مطابق ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

" فان ذلک یعرف بالاجماع فما اجمع علیه علماء الاسلام فهو حق وما عداه باطل "

کہ یہ اجماع امت سے پتہ چلے گا، جس کے حق ہونے پر علماء اسلام کا اجماع ہو وہ حق ہے اور جس کے باطل ہونے پر علماء اسلام کا اجماع ہو وہ باطل ہے۔

تہتر فرقوں میں راقم کا موقف تو یہ ہے کہ جو بھی دعوی اسلام کریں لیکن ان کے عقائد کفریہ ہوں وہ ان بہتر میں شامل ہیں اور ایک فرقہ ناجیہ علیحدہ ہے۔

علامہ ملاعلی قاری رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ باطل فرقے اصولی طور پر آٹھ ہیں اور ان کی شاخوں کو ملائیں تو بہتر فرقے بنتے ہیں ایک **ناجیہ** فرقہ اہل سنت کا ہے، معتزلہ جو اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اور رویت باری تعالی محال ہے اور اللہ تعالی پر واجب ہے عذاب دینا یا ثواب عطاء کرنا وہ بیس فرقے ہیں۔**شیعہ** جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں افراط سے کام لیا وہ بائیس فرقے ہیں۔**خارجی** جنہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیا وہ بیس فرقے ہیں۔**مرجیئہ** فرقہ جو اس کے قائل ہیں کہ جس طرح کافر کو کوئی طاعت فائدہ نہیں دیتی، اسی طرح مؤمن کو کوئی گناہ ضرر نہیں دیتا، یہ پانچ فرقے ہیں۔

نجاریہ فرقہ یہ اہل سنت کے مطابق عقیدہ رکھتے ہیں خلق افعال میں یعنی وہ اس کے قائل ہیں کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالی ہے اور معتزلہ کے ساتھ موافق ہیں نفی صفات میں، اور حدوث کلام میں یہ تین فرقے ہیں۔

جبریہ فرقہ جو اس کا قائل ہے کہ بندہ جو کام بھی کرتا ہے اس میں اس کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ اس کام کرنے میں مجبور ہوتا ہے، یہ ایک ہی فرقہ ہے اور **مشبہۃ** فرقہ، جو اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی عام بندوں کی طرح ہے، اور جسموں میں حلول کر لیتا ہے یہ بھی ایک ہی فرقہ ہے۔ یہ کل بہتر فرقے ہیں جو تمام ناری ہیں ایک فرقہ **اہل سنت** کا نجات حاصل کرنے والا ہے وہی حق پر ہے ناجیہ فرقہ میں عوام شریعت پر عمل کرتے ہیں خواص شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت پر بھی عمل کرتے ہیں اور اخص الخواص شریعت اور طریقت کے ساتھ ساتھ حقیقت پر بھی عمل کرتے ہیں۔

قالا ول نصیب الا بدان الخدمة و الثانی نصیب القلوب من اعلم و المعر فة و الثالث نصیب الارواح من المشاهدة و الرؤية "

اول درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعضاء کو عبادت میں لگائے دوسرا درجہ کہ عبادت کے ساتھ ساتھ دلوں کو اللہ تعالی کی طرف متوجہ کرے تاکہ اسے علم و معرفت حاصل ہو یہ درجہ پہلے درجہ سے افضل ہے تیسرا درجہ روحوں کا حصہ ہے کہ رب تعالی کی تجلیات کا اسے مشاہدہ حاصل ہو۔ یہ درجہ پہلے دونوں درجوں سے زیادہ افضل ہے۔

الا فالزموا سنة الانبیاء　　　الا فاحفظوا سیرة الاصفیاء

ومن یبتدع بدعة لم یکرم　　　　بوجدانه رتبة الاتقیاء

خبردار انبیاء کرام کی سنت کو لازم پکڑو۔ خبردار محافظت کرو اصفیاء، نیک لوگوں کی سیرت کی جو شخص باطل بدعت اختیار کرتا ہے اس کی عزت نہیں ہوتی جو اتقیاء کے درجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۱ص ۲۴۷، ۲۴۸)

ایک روایت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ہے جو ابوداود اور مسند احمد میں ہے، اس میں ہے :

"وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کمایتجاری الکلب بصاحبه لایبقی منه عرق ولا مفصل الادخله" (مشکوة باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت میں کچھ ایسے لوگ آئیں جب میں خواہشات اس طرح جاری ہوں گی جس طرح (پاگل) کتا کسی کو کاٹے تو اس پر اثر ہوتا ہے کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر یہ کہ اس کر زہر کا اثر ہوتا ہے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ باطل خواہشات جو یہود و نصاری سے لائی جائیں گی وہ مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں چھا جائیں گی۔

دین اسلام پر عمل کرنے میں سب متحد ہو جاؤ:

❁ عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله لا یجمع امتی او قال امة محمد علی ضلالة ویدالله علی الجماعة ومن شذ شذ فی النار"

(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی نہیں جمع کرے گا میری امت کو یا آپ نے فرمایا امت محمد کو گمراہی پر، اللہ تعالی کا دست رحمت جماعت پر، جو شخص بکھر گیا، وہ آگ میں جا پہنچا۔

وضاحت حدیث : امت سے مراد امت اجابت ہے یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان لا چکے ہیں اللہ تعالی ان کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی نبی کریم ﷺ کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا لیکن کفر پر قرب قیامت میں جمع کرلے گا کیونکہ احادیث میں وارد ہے " ان الساعة لاتقوم الاعلی الکفار " بیشک قیامت قائم نہیں ہوگی مگر کفار پر۔

" ید الله فوق الجماعة " اللہ تعالی کا دست رحمت ہے جماعت پر اگر چہ "ید" کا معنی ہے ہاتھ لیکن اللہ تعالی تو ہاتھ سے پاک ہے اسلئے اس کے مجازی معانی میں سے کوئی معنی لیا جائے گا وہ مجازی معانی یہ ہیں۔ اللہ تعالی کی

جماعت کو نصرت (امداد) حاصل رہے گی اور معنی ہے غلبہ یعنی معنی یہ ہے کہ جماعت کو اللہ تعالی کی طرف سے غلبہ حاصل رہے گا یا معنی یہ ہوگا کہ جماعت کو اللہ تعالی کی طرف سے حفاظت حاصل ہوگی یا معنی ہوگا کہ اللہ تعالی کی رحمت جماعت پر ہوگی، یا معنی یہ ہو کہ جماعت کو اللہ تعالی کا احسان ہوگا جماعت پر اور اس کی طرف سے جماعت کو توفیق حاصل ہوگی کہ وہ احکام کا استنباط کریں گے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اعتقادات اور عملیات پر لوگوں کو مطلع کریں گے۔

(علی الجماعة) ای المجتمعین علی الدین " جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین پر مجتمع ہوں یعنی جب لوگ دین پر متحد و متفق ہوں گے تو اللہ تعالی کی حفاظت و رحمت و نصرت میں ہوں گے۔

(ومن شذ شذ فی النار) ای انفرد عن الجماعة باعتقاد او قول او فعل لم یکونوا علیه "

جماعت سے بکھرنے سے مراد یہ ہے کہ اہل سنت کے عقائد سے ہٹ کر علیحدہ عقائد رکھ لے یا ان کے خلاف اس کے اقوال ہوں یا ان کے افعال صحیحہ کے خلاف اسکے افعال باطلہ ہوں تو یہ جماعت سے منفرد ہوگیا۔ جب جماعت کے لوگ جنتی ہوں گے تو یہاں سے علیحدہ کر کے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اص ۲۴۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۠﴾ (آیۃ نمبر ۲۰)

(۱) (پھر اے محبوب ﷺ) اگر وہ تم سے حجت کریں تو فرمادو میں اپنا منہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکائے ہوں اور جو میرے پیرو ہوئے اور کتابیوں اور ان پڑھوں سے فرماؤ کیا تم نے گردن رکھی؟ پس اگر وہ گردن رکھیں جب تو راہ پاگئے اور اگر منہ پھیریں تو تم پر یہی حکم پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

(۲) پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرمادو "میں نے جھکا لیا اپنی ذات کو اللہ کیلئے اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی" اور فرمادیں ان کو جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں کو کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ اگر انہوں نے اسلام لایا ہوتا تو وہ ہدایت پاگئے ہوتے اور اگر وہ پھر گئے تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے بندوں کو۔

مختصر مطلب: تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ اگر وہ کافر آپ سے حجت بازی کریں، دین کے متعلق جھگڑا کریں تو آپ فرمادیں کہ میں تو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوں، اور جن لوگوں نے میری تابعداری کی وہ بھی اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں، آپ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری اور ان پڑھ لوگوں یعنی مشرکین سے پوچھو کیا تم اسلام لائے ہو؟ اگر انہوں نے اسلام لایا ہوتا تو وہ ہدایت پا چکے ہوتے، اور اگر وہ پھر گئے، یعنی اسلام نہ لائے تو آپ پر تو کوئی حرج لازم نہیں، کیونکہ آپ پر تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا لازم ہے۔ اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ﴾ پھر اگر وہ جھگڑا کریں تمہارے ساتھ

یعنی آپ نے جو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچایا "ان الدین عند الله الاسلام" (بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہے) اس میں اگر وہ جھگڑا کریں، حجت بازی کریں، دین اسلام کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں (از روح البیان)

"(فان حاجوک) ای جادلوک بالأقاویل المزورة والمغالطات فاسند امرک الی

ماکلفت من الایمان والتبلیغ وعلی اللہ نصرک" (قرطبی)

اگر وہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں، یعنی جھوٹے، من گھڑت اقوال (باتیں) پیش کریں، اور مغالطہ ڈالیں تو آپ کو جو ایمان کی تکلیف دی گئی اور تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا آپ وہ ان تک پہنچا دیں، اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔

''اگر وہ جھگڑا کریں'' اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس سے مراد اہل کتاب یہود و نصاریٰ، یا اس سے مراد نجران کے وفد کے عیسائی ہیں۔ بلکہ تمام لوگ جو دین کی مخالفت کریں، دین اسلام کے خلاف حجت بازی کریں وہ سب ہی اس آیہ کریمہ میں داخل ہیں۔ (از روح المعانی)

﴿فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾

''تو آپ فرما دو میں نے جھکا لیا اپنی ذات کو اللہ کیلئے، اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی۔''

''**اسلمت**'' کا معنی ہے ''انقدت له'' میں اس کا مطیع ہو گیا، اپنے آپ کو جھکا لیا۔ (جلالین)

''**وجھی**'' سے مراد ہے ''میری ذات'' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''سجد وجھی للذی خلقه وصوره'' میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے پیدا کیا اور صورت عطاء کی۔ راقم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''وجہ'' بمعنی قصد کے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''خرج فلان فی وجه کذا'' فلاں شخص اپنے اس طرح کے مقصد کیلئے نکلا۔ ''والاول اولی'' لیکن پہلا معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ (قرطبی)

(**ومن اتبعن**) اور جنہوں نے میری تابعداری کی، ''ای ومن اتبعنی اسلم ایضا'' یعنی جنہوں نے میری تابعداری کی وہ بھی رب تعالیٰ کے مطیع ہو گئے، اور رب تعالیٰ کے سامنے انہوں نے بھی اپنے آپ کو جھکا لیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ومن اتبعن'' اصل میں ''ومن اتبعنی'' ہے یا ضمیر منصوب متصل جو مفعول واقع ہو رہی تھی، اسے حذف کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو کفار کی حجت بازی سے اعراض کرنے کا حکم کیوں دیا؟

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ ان کے سامنے اس سے پہلے کئی مرتبہ اپنی صداقت پر دلائل قائم کر چکے تھے۔ پھر یہ سورت مدنی ہے، اس سے پہلے ان کے سامنے معجزات بھی آ چکے تھے، قرآن پاک بھی رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے، پر وہ

درخت کو دیکھ چکے تھے کہ اس نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو سلام کیا، پھر آپ کے ارشاد پر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ پھر بھیڑیئے کا آپ سے کلام کرنا ان کے سامنے آچکا تھا، اس آیۃ کریمہ سے پہلے کئی آیات میں دین اسلام کی حقانیت بیان کی جا چکی تھی، نصاریٰ نے جو یہ کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں تو ان کا رد "الحی القیوم" سے کیا، پھر جب ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر شک کیا، تو ان کا جواب ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ (نازل کی گئی آپ پر کتاب حق سے) سے دیا، ان کی تمام حجت بازیوں کو دلائل سے رد کیا، پھر بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر فرمایا جو درحقیت نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا، اس کا تذکرہ ان لفاظ مبارکہ سے کیا ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ تحقیق تمہارے لئے نشانی ہے دو جماعتوں کے ملنے میں۔

اس کے بعد توحید کا ذکر فرمایا، اور رب تعالیٰ کی ضد اور مثل اور اس کی زوجہ اور اولاد کی نفی کی، ارشاد فرمایا ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ تعالیٰ نے گواہی دی بیشک کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، پھر ارشاد فرمایا ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ مطلب واضح ہے کہ یہود نصاریٰ کو حق کا علم عطاء کر دیا گیا، لیکن انہوں نے علم حاصل ہونے کے باوجود دین میں حسد و بغاوت کی وجہ سے اختلاف کیا۔ اگر وہ مخلص ہوتے دلائل میں غور و فکر کرتے تو اسلام لے آتے، حق کے مطیع ہو جاتے لیکن انہوں نے فقط حسد اور بغاوت سے دین اسلام کی مخالفت کی۔

"فظهر انه لم يبق من اسباب اقامة الحجة على فرق الكفار شئى الاوقد حصل"
تو واضح ہو گیا کہ بیشک حجت کے قائم کرنے کے کوئی اسباب باقی نہ رہے، کفار کے تمام فرقوں پر مکمل دلائل بیان کر دئے، ان میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی گئی۔

اس کے بعد زیر بحث آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا۔ ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اگر وہ جھگڑا کریں تمہارے ساتھ تو آپ فرما دو میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کیلئے، اور انہوں نے جنہوں نے میری تابعداری کی۔ گویا کہ مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے دلائل بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے کوئی کمی نہیں چھوڑی، اور دلائل کو واضح طور پر بیان کر دیا۔

"فان تركتم الانف والحسد، وتمسكتم بها كنتم انتم المهتدين، وان اعرضتم فان الله تعالى من وراء مجازاتكم"

اگر تم عار اور حسد کو چھوڑ دو، اور تم دلائل سے استنباط کرو (یعنی مسائل حاصل کرو) تو تم ہدایت پا جاؤ گے، اور اگر تم نے

اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ کلام کا طریقہ یہ ہی ہے کہ جب باطل راہ پر چلنے والا جھگڑالو ہو، حق کو سوچنے کی ضرورت اسے محسوس نہ ہو، صرف یہی کہتا پھرے میں نہیں مانتا، تو اسے کہا جائے۔

"اما انا ومن اتبعنی فمنقا دون للحق مستسلمون له مقبلون علی عبودیة الله تعالی فان وافقتم واتبعتم الحق الذی ان علیه بعد هذه الدلائل التی ذکر تها فقداهتدیتم، وان اعرضتم فان الله بالمر صاد"

کہ میں اور میرے متبعین نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر دی، اسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکالیا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی طرف ہم مشغول ہوتے ہیں، اگر تم بھی اس کی موافقت کرو، اور حق کی تابعداری کرو "جس پر میں ہوں اور تمہارے سامنے دلائل بھی پیش کر چکا ہوں" تو تم ہدایت پا جاؤ گے، اور اگر تم نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے عذاب تیار کر رکھا ہے، تم اس کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے، ہر باطل راہ پر چلنے والوں کو یہی جواب دیا جائے۔ (از کبیر)

آجکل غیر مقلدین کا یہی طریقہ ہے:

کہ نہ ماننے کیلئے کبھی یہ کہیں گے کہ حدیث صحاح ستہ سے پیش کریں اگر صحاح ستہ سے کوئی حدیث پیش کریں مثلاً ترمذی، ابوداؤد سے "تو کہیں گے، بخاری و مسلم اور موطأ امام مالک سے حدیث پیش کریں کیونکہ یہ قرون اولیٰ کی حدیثیں ہیں۔ ان جہلاء کو یہ پتہ ہی نہیں کہ قرون اولیٰ میں حدیث کی کوئی ایک کتاب ہی نہیں۔ پھر اگر حدیث ترمذی سے حسن پیش کر دیں تو وہ کہیں گے یہ حدیث ضعیف ہے، جن جاہلوں کو ضعیف اور حسن کا فرق ہی نہ پتہ ہو تو ان کو جواب صرف اتنا کافی ہے کہ ہمارا کام کسی کو منوانا نہیں، بلکہ مسئلہ بتانا ہے۔

اگر نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو سن کر ابوجہل اور ابولہب نے نہیں مانا تو غیر مقلدین دین کے باغی، کسی معتدل شخص کی بات کو کیا مانیں گے، ان کو اپنی مساجد میں دعوت دینا سوائے شدید غلطی کے کچھ بھی نہیں، مساجد کی عزت کو پائمال کرنے کے مترادف ہے، ان کا انداز کلام جاہلانہ ہے، ایسے فسادیوں سے بچ کر رہنا ضروری ہے۔ علماء اہل سنت آستینوں کے سانپوں کو بھی پہچانیں، جو ان کو جنگ و جدال کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، راقم ان بکاؤ مالوں کو بہت قریب سے جان چکا ہے، مفاد پرست ٹولہ ہے۔ (راقم)

"اسلمت لله وجهی" دلیل مثبت ہو، اعراض نہ ہو:

اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ تمام خالق کا اقرار کرتے تھے، اور خالق کو مستحق عبادت بھی سمجھتے تھے، گویا کہ

نبی کریم ﷺ نے قوم کو کہا کہ میں وہ دلیل پیش کرتا ہوں جس پر قول کا اتفاق ہے یعنی میں مخلوق کو خالق کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اور چیزوں میں ہے، لھذا تم اپنا اپنا دعوی پیش کرو۔

"فان الیھود یدعون التشبیہ و الجسمیۃ" تو بیشک یہود نے دعوی کیا کہ اللہ تعالی مخلوق کی طرح ہے، اور اس کا بھی جسم اسی طرح ہے جس طرح مخلوق کے اجسام ہیں۔ "والنصاری یدعون الھیۃ عیسی علیہ السلام" نصاری دعوی کرنے لگے کہ عیسی خدا ہیں، "فان المشرکین یدعون وجوب عبادۃ الأوثان" لیکن مشرکین دعوی کرنے لگے کہ بت معبود ہیں، ان کی عبادت واجب ہے۔ "فھو لاء ھم المدعون لھذہ الاشیاء فعلیھم اثباتھا" یہود ونصاری ومشرکین نے جو جو دعوی کیا ان پر لازم تھا کہ وہ دلائل سے اپنے اپنے دعوی کو ثابت کرتے، لیکن وہ عاجز آ گئے لیکن مصطفی کریم ﷺ نے اپنے دعوی کو گویا کہ یوں پیش کیا۔

"اما انا فلاادعی الا وجوب طاعۃ اللہ تعالی و عبو دیتہ، وھذا القدر متفق علیہ"

کہ میں تو صرف یہ دعوی کرتا ہوں کہ اللہ تعالی کی طاعت واجب ہے، اور بندوں پر لازم ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اپنے عبد ہونے کا اقرار کریں اس میں میرے ساتھ تم بھی متفق ہو، گویا کہ میرا دعوی بلا دلیل ثابت ہو گیا۔

آپ کا یہ ارشاد (اسلمت و جھی للہ) ایسے ہی ہے، جیسے کہ رب تعالی کا ارشاد آپ نے پیش فرمایا ﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْااِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَاوَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّانَعْبُدَاِلَّا اللّٰہَ وَلَانُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا﴾ اے اہل کتاب آؤ ایک کلمہ کی طرف جو برابر ہے ہمارے اور تمہارے درمیان" یہ کہ ہم نہ عبادت کریں سوائے اللہ تعالی کے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں۔

(۲) دوسری وجہ کیفیت استدلال کی ہے کہ یہود ونصاری اور مشرکین تمام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کے قائل تھے اور یہ کہتے تھے کہ وہ حق پر تھے اور اپنے دین میں سچے تھے۔ اگر چہ شرائع اور احکام میں یہود ونصاری ومشرکین کے اپنے اپنے دعوی کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے متعلق نظریات تھے۔ اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی تابعداری کریں ﴿ثُمَّ اَوْحَیْنَااِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا﴾ پھر اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ابراہیم علیہ السلام کے قول کی طرح کہو، ابراہیم علیہ السلام نے کہا ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ بیشک میں نے اپنا منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے۔ ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا ﴿وَجَّھْتُ وَجْھِیَ﴾ اور نبی کریم ﷺ کا یہ کہنا "اسلمت و جھی للہ" کا ایک ہی مفہوم ہے۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اعرضت عن کل معبود سوی الله تعالی وقصدته بالعبادة واخلصت له" میں نے اللہ تعالی کے سواء ہر باطل معبود سے اعراض کیا، اور اسی کا عبادت میں قصد کیا اور میں نے اسی کیلئے اپنے آپ کو خالص کر لیا، اب گویا کہ اس تفسیر کے مطابق اللہ تعالی کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہو گیا۔

"فان نازعوک یا محمد فی هذه التفاصیل فقل انا مستمسک بطریقة ابراهیم وانتم معترفون بان طریقته حقةبعیدة عن کل شبهة وتهمة"

اے محمد ﷺ اگر آپ سے وہ جھگڑا کریں ان تفصیلی دلائل میں تو آپ ان کو مختصر یہ فرما دو کہ میں تو ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کر رہا ہوں، انہوں نے کہا ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ اور میں بھی کہہ رہا ہوں "اسلمت وجهی لله" جب تم ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کو حق مانتے ہو اور شبہ و تہمت سے پاک مانتے ہو، تو یقیناً میرا طریقہ بھی حق ہے کیونکہ یہ وہی راہ ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام چلے ہیں، یہ الزامی جواب ہے۔ اس میں وہی انداز اختیار کیا گیا جس کا رب تعالی نے حکم دیا ہے ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ آپ ان سے جھگڑا کریں اچھے طریقہ سے یعنی الزامی دلائل اور ظنی دلائل سے بھی ان کو مطمئن کریں۔

(۳) تیسری وجہ کیفیت استدلال یہ ہے کہ جب رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (بیشک دین اللہ تعالی کے ہاں اسلام ہے) حضور ﷺ نے پیش فرمایا، تو اس کے بعد رب تعالی نے فرمایا ﴿فَاِنْ حَاجُّوْكَ﴾ اگر وہ تمہارے ساتھ (دین اسلام کی حقانیت میں) جھگڑا کریں، تو آپ بطور دلیل ان کو یہ فرما دو "اسلمت وجهی لله" کیونکہ دین کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کی ربوبیت کو اور اپنی عبودیت کو لازم پکڑے، تو وہ مقصد عظیم ان مختصر الفاظ سے پیش فرما دیا۔

اس لئے کہ جب پیش فرمایا "اسلمت وجهی لله" (میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ کیلئے) تو اس کا مطلب یہ ہو گیا۔

"فلااعبد غیره ولا اتوقع الخیر الامنه ولااخاف الامن قهره وسطوته، ولا اشرک به غیره"

جب میں نے اپنی ذات کو رب تعالی کی لئے جھکا لیا ہے تو میں اس کے بغیر کسی اور کی عبادت نہیں کرتا اور میں بھلائی کی توقع صرف اسی سے رکھتا ہو، اور میں خوف نہیں رکھتا سوائے اس کے قہر اور اس کے دبدبہ کے۔

یہ وجہ جو ابھی بیان کی ہے اس میں کامل طور پر لوازم ربوبیت اور عبودیت کی وفاء پائی گئی ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کامل دین اسلام ہی ہے۔

(۴) چھوتھی وجہ کیفیت استدلال کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے دلیل پکڑ کر

عیسائیوں کا رد کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کی حکایت رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی ﴿لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا یَسۡمَعُ وَلَا یُبۡصِرُ وَلَا یُغۡنِیۡ عَنۡکَ شَیۡئًا﴾ تو کیوں عبادت کرتا ہے ایسے کی جو سن نہیں سکتا اور نہ ہی بے پرواہ کر سکتا ہے تمہیں کسی چیز سے۔

جب اس آیۃ کریمہ سے واضح ہو گیا کہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہو سکتی ہے جو نفع وضرر کا ذاتی طور پر مالک ہو، تو ابراہیم علیہ السلام کا مطلب بھی یہ تھا کہ "انما اعبد من کان امری فی یدیه وحکمی فی قبضة قدرته" میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میرے معاملات ہیں اور میرا حکم جس کے قبضۂ قدرت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے عیسائیوں کو یہ بتایا کہ ادھر تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام سچے تھے اور حق پر تھے اور ادھر تم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہو۔ وہ تو ذاتی طور پر نفع وضرر کے مالک نہیں تھے تو عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ان کو خدا ماننے سے مانع ہیں۔

اس لئے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا، آپ یہ فرمادیں "اسلمت وجهی لله" جھکالیا ہے میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے یعنی میں تو صرف اسے خدا مانتا ہوں جو خیر وشر کا مالک ہے، اور نفع وضرر کا مالک ہے، اور تدبیر وتقدیر کا مالک ہے۔

(۵) پانچویں وجہ کیفیت استدلال کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جو یہ کہلایا گیا "اسلمت وجهی لله" یہ ابراہیم علیہ السلام کے اس کلام کے مناسب ہے ﴿اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ جب کہا ان کو ان کے رب نے مطیع ہو جاؤ۔ آپ نے کہا میں مطیع ہو گیا سب جہانوں کے رب کا، تو نبی کریم ﷺ نے اس کے مطابق کلام فرما کر یہود ونصاریٰ ومشرکین کو سوچنے کا موقع دیا کہ دعویٰ یہ کرنا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں، لیکن ان کے عقائد کے خلاف تم نے اپنے عقائد کفریہ اور شرکیہ رکھے ہوئے ہیں جو سراسر باطل ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ ضمیر مرفوع متصل پر جب عطف کرنا ہو تو ضمیر مرفوع منفصل سے تاکید لانی ضروری ہوتی ہے، جب "ومن اتبعن" کا عطف "اسلمت" کی متکلم ضمیر پر کیا تو "اسلمت انا" کیوں نہیں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضابطہ اس وقت ہے جب معطوف علیہ اور معطوف میں فاصلہ نہ ہو، جب فاصلہ ہو تو بغیر تاکید منفصل کے عطف جائز ہوتا ہے، یہاں "وجهی لله" کا فاصلہ ہے اس لئے یہ جائز ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَقُلْ لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ﴾

''اور فرمادو انہیں جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں کو کیا تم اسلام لے آئے ہو۔''

اہل کتاب سے مراد یہود و نصاری ہیں اور ان پڑھوں سے مراد مشرکین عرب ہیں، کیونکہ انہوں نے کسی کتاب کا دعوی نہیں کیا تھا کہ ہمارے پاس اللہ تعالی کی کتاب ہے''**وصفوا بانهم اميون تشبيها بمن لايقرأ ولا يكتب**'' ان کا وصف ''امی''(ان پڑھ) ہونا بیان کیا گیا ہے کیونکہ انہیں تشبیہ دی گئی ان لوگوں سے جو لکھنا اور پڑھنا نہ جانتے ہوں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں مشرکین عرب میں زیادہ وہی لوگ تھے جو لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے، اکثر کو دیکھ کر حکم کل پر لگا دیا، گویا کہ وہ سب ہی ان پڑھ تھے۔

(**ءاسلمتم**) اگرچہ بظاہر استفہام ہے، لیکن اس کا معنی امر والا ہے کہ تم اسلام لے آؤ جیسا کہ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ میں معنی ''انتھوا'' کا ہے رک جائے (شراب سے)۔

﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ ''اگر وہ اسلام لاتے تو ہدایت پا جاتے۔''

''**وذلک لان الاسلام تمسک بما هدى اليه والمتمسک بهداية الله تعالى يكون مهتديا**''

اس لئے کہ بیشک اسلام کے ساتھ سہارا لگانا ہدایت حاصل کرنا ہے، جس نے اللہ تعالی کی ہدایت حاصل کر لی یعنی اسلام قبول کر لیا وہی ہدایت پر ہوگا، اس کے بغیر سب دعوے باطل ہیں۔ جس نے ہدایت حاصل کر لی اور اس پر ثابت رہا وہی کامیاب ہوا اور اسی نے آخرت میں نجات حاصل کر لی۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ﴾ ''اور اگر وہ پھر گئے تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔''

اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ پر ہمارے احکام پہنچا دینا لازم ہے، آپ پر یہ لازم نہیں کہ آپ ان کو تسلیم بھی کرائیں، اگر وہ اسلام سے پھر جائیں تو آپ پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ آپ نے تو تبلیغ کر دی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ دیکھنے والا ہے بندوں کو۔''

اس میں مؤمنوں کیلئے وعدہ ہے کہ رب تعالی جب بندوں کے اعمال کو دیکھ رہا اس سے کچھ مخفی نہیں تو وہ ایمان والوں کو ثواب و جزاء خیر عطاء کرے گا اور اس میں وعید بھی ہے، یعنی کافروں کو دھمکی دی گئی کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، تمہارا کفر اس سے مخفی نہیں، وہ تمہیں دائمی عذاب میں مبتلا کرے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ (آیۃ نمبر ۲۱،۲۲)

(1) وہ جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے اور انصاف کا حکم کرنے والوں کو قتل کرتے ہیں، انہیں خوشخبری دو دردناک عذاب کی ○ یہ ہیں وہ جن کے اعمال اکارت گئے دنیا و آخرت میں اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔

(2) بیشک وہ جو کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات سے اور شہید کرتے ہیں نبیوں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں انہیں جو حکم دیتے ہیں انصاف کا لوگوں سے، خوشخبری دو ان کو دردناک عذاب کی ○ یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا و آخرت میں اور نہیں ان کا کوئی مددگار۔

ماقبل سے تعلق:

پہلی آیت میں بیان کیا گیا "وان تولوا فانما علیک البلاغ" اگر وہ پھر جائیں تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ اب اس آیہ کریمہ میں ان پھر جانیں والوں کی تین صفات بیان کی جارہی ہیں۔

(۱) ان کی ایک صفت یہ بیان کی گئی، وہ اللہ تعالی کی آیات سے کفر کرتے ہیں حالانکہ وہ صانع کا اقرار بھی کرتے ہیں، ان کا بعض آیات سے کفر کرنا، تمام آیات سے کفر کرنے کی طرح ہی تھا، اسی وجہ سے مطلق ذکر فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ﴾ بیشک وہ کفر کرتے ہیں اللہ کی آیات سے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿بِاٰيَاتِ اللّٰهِ﴾ میں اضافت عہدی ہو، مراد خاص آیات ہوں، یعنی وہ قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ سے کفر کرتے ہیں۔

(۲) ان کی دوسری صفت بیان کی گئی وہ انبیاء کرام کو شہید کرتے ہیں، یعنی بعض انبیاء کرام کو انہوں نے زہر دے کر شہید کیا بعض کو جادو سے، بعض کو آرہ سے چیر دیا وغیرہ

(۳) دین سے پھر جانے والوں کی تیسری صفت یہ بیان گئی کہ وہ ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو انہیں انصاف کرنے

کا حکم دیتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر والبحر المحیط)

ان کے اوصاف قبیحہ کی ترتیب ذکری:

دین سے پھر جانے والوں کی بری صفات کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلے ان کے عظیم جرم کا ذکر کیا کہ ''وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں، ان کا یہ جرم دوسرے جرموں کا سبب بنا۔ ''وھو اقوی الا سباب فی عدم المبالاۃ بمایقع من الافعال القبیحۃ'' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنا بہت بڑا سبب تھا انکے برے افعال سے پرواہ نہ کرنے کا۔

ان کی دوسری بری صفت کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بڑی آیات یعنی انبیاء کرام کو شہید کیا۔ یہ ان کی صفت قبیحہ بنسبت پہلی صفت کے ذرا کم درجہ کی ہے۔

ان کی تیسری صفت قبیحہ بیان کی کہ انہوں نے ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے ان کو اچھے کاموں کا حکم دیا اور برے کاموں سے روکا۔ ان کی یہ صفت قبیحہ بنسبت پہلی دونوں صفات قبیحہ کے ذرا کم درجہ ہے۔

''فھذہ الثلاثۃ بدی فیھا بالاعظم فالاعظم'' ان تین صفات میں پہلے عظیم جرم والی صفت کو بیان کیا، پھر اس کے بعد جو عظیم جرم والی صفت تھی، پھر اس کے بعد جو عظیم جرم والی صفت تھی، اسے ذکر کیا تینوں صفاف عظیم جرم والی ہیں، صرف درجہ بدرجہ کا فرق ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

بنی اسرائیل میں کثیر تعداد میں انبیاء کرام تشریف لائے جن کے پاس مستقل علیحدہ کتاب نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ توراۃ پر عمل کرنے کا حکم دیتے، اور قوم کو وعظ ونصیحت کرتے، قوم کے لوگ ان کو شہید کر دیتے۔

''فیقول رجال ممن آمن بھم وصدقھم فیذکرونھم ویامرونھم بالمعروف وینھوھم عن المنکر فیقتلونھم''

انبیاء کرام کو شہید کرنے پر ان پر ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے ان کو اچھے کاموں کا حکم دینے لگے، اور برے کاموں سے روکنے لگے تو ان لوگوں نے ان نصیحت کرنے والوں کو بھی قتل کر دیا۔

''عن عبیدۃ بن الجراح قال قلت یا رسول اللہ ای الناس اشد عذ ابایوم القیامۃ قال رجل قتل نبیا اورجلا امربالمعروف ونھی عن المنکر ثم قرأ رسول اللہ ﷺ ویقتلون النبیین بغیر حق ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس''

(رواہ ابن ابی حاتم وابن جریر، ابن کثیر، صابونی مع حاشیہ)

عبیدہ بن جراح فرماتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے قیامت کے دن کس کو شدید عذاب دیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے نبی کو شہید کیا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جس نے اسے اچھے کاموں کا حکم دیا اور برے کاموں سے منع کیا'' پھر آپ نے بطور دلیل یہی دو آیتیں ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ سے لے کر ﴿وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ تک تلاوت کیں۔

﴿وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾ ''اور شہید کرتے نبیوں کو ناحق''۔

''النبیین'' پر الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد بعض معین انبیاء کرام ہیں، کیونکہ ''ومعلوم انھم ماقتلوا الکل ولا الاکثر ولا النصف'' یقینی بات ہے کہ بیشک انہوں نے تمام انبیاء کرام کو نہیں شہید کیا تھا اور نہ ہی اکثر اور نہ ہی نصف تعداد کو، بلکہ بعض کو شہید کیا تھا۔ (از کبیر)

سؤال: ''بغیر حق'' کہنے کا کیا مطلب ہے؟ جب کہ انبیاء کرام کو قتل کرنا تو ناحق ہی ہوتا ہے؟

جواب: وہ قتل کرنے والے بھی سمجھتے تھے کہ ہم ان پر ظلم کر رہے ہیں، اور ناحق ان کو شہید کر رہے ہیں اس کی مکمل تفصیل پہلے پارہ **نجوم الفرقان** کی جلد سوم میں دیکھئے۔

﴿فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ ''خوشخبری دو ان کو دردناک عذاب کی۔''

بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ بشارت تو خوشی کی خبر کو کہا جاتا ہے، دردناک عذاب کی خبر کو بشارت کہنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان مظالم پر اتراتے تھے، اپنے کاموں پر فخر کرتے تھے، تو اس وجہ سے انہیں یہ کہا گیا کہ تم اپنے فخریہ کاموں کے انجام پر خوش ہو جاؤ'' اس کو عربی زبان میں ''تھکم'' کہا جاتا ہے۔

سؤال: آیۃ کریمہ میں بظاہر تو یہی سمجھ آ رہا ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود و نصاریٰ کو ہے، انہوں نے تو انبیاء کرام اور انصاف کا حکم دینے والوں کو شہید نہیں کیا تھا، پھر اس ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: ''قتل اولوھم الانبیاء علیھم السلام وقتلوا اتباعھم وھم راضون بما فعلوا'' (تفسیر ابی السعود)

چونکہ پہلے لوگوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا تھا اور ان کے متبعین کو قتل کیا تھا، تو نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود و نصاریٰ اپنے آباء و اجداد کے فعل پر راضی تھے، بلکہ ان کے کارنامے بیان کرتے وقت اس کا بھی تذکرہ کرتے تھے، اس لئے قتل انبیاء کرام ان کی طرف بھی ایسے ہی منسوب ہے جیسے ان کے آباء و اجداد کی طرف تھا۔

دوسری وجہ یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود نے بھی آپ کو شہید کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اگر چہ وہ کامیاب نہیں ہوئے، آپ کو جادو سے شہید کرنے کی انہوں نے کوشش کی اور آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلا کر شہید کرنے کی انہوں نے کوشش کی، اس لئے ان کی طرف قتل انبیاء کرام کی نسبت اس معنی کے لحاظ پر حقیقۃ نسبت ہے۔

فائدہ: ''قال الحسن هذه الآية تدل على ان القائم بالامر بالمعروف والنهى عن المنكر عند الخوف تلى منزلته فى العظم منزلة الانبياء''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ خوف کے وقت اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا انبیاء کرام کے عظیم درجہ کا قرب حاصل کرنا ہے

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا ''ای الجهاد افضل؟فقال ﷺ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر'' کون سا جہاد افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''ظلم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا'' (کبیر)

❁ ''قال الحسن قال النبى ﷺ من امر بالمعروف اونهى عن المنكر فهو خليفة الله فى ارضه وخليفة رسوله وخليفة كتابه'' (قرطبی)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس شخص نے اچھے کاموں کا حکم دیا یا برے کاموں سے منع کیا وہ اللہ تعالی کا خلیفہ ہے اس کی زمین میں، اور اس کے رسول (ﷺ) کا خلیفہ ہے، اور اس کتاب کا خلیفہ ہے۔

❁ ''وعن درة بنت ابى لهب قالت جاء رجل الى النبى ﷺ وهو على المنبر فقال من خير الناس يا رسول الله؟قال آمرهم بالمعروف وانها هم عن المنكر واتقاهم لله واوصلهم لرحمه'' (قرطبی)

درہ بنت وہب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ایسے حال میں کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے، تو وہ پوچھنے لگے ''یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا ''جو شخص اچھے کاموں کو حکم دینے والا ہو اور برے کاموں سے روکنے والا ہے اور اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر دوسروں سے زیادہ تقوی رکھنے والا اور زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہو''

منافقوں اور مؤمنوں کے درمیان بنیادی فرق:

منافقوں کے متعلق رب تعالی نے بیان فرمایا ﴿اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ

بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ﴾ منافق مرد اور منافق عورتیں بعض، بعض کے (دوست) ہیں، برے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے متعلق یہ ارشاد ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں بعض، بعض کے دوست ہیں، اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔

"فجعل الله تعالى الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر فرقا بين المؤمنين والمنافقين"

اللہ تعالیٰ نے "امر بالمعروف" اور" نهي عن المنكر" (اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا) کو مؤمنین اور منافقین کے درمیان وجہ فرق بیان کیا۔

مسئلہ: اگرچہ برے کاموں سے روکنے والے کو خود برائیوں سے اجتناب ضروری ہے تاکہ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (کیا تم لوگوں کو نیکی کے کاموں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلاتے ہو (یعنی اپنے آپ کو نیکی کے کاموں سے دور رکھتے ہو) کا مصداق نہ بنے اور ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ کہو، جو نہ کرو) کی وعید اس پر صادق نہ آئے، لیکن گنہگار شخص کا دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور گناہوں کے چھوڑنے کی ترغیب دینا بہتر ہے بنسبت "امر بالمعروف" اور" نهي عن المنكر" کو ترک کرنے کے۔ (قرطبی)

❁ "عن ابی سعید الخدری قال سمعت رسول الله ﷺ يقول "من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذلک اضعف الايمان"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے تم میں سے کسی برائی کو دیکھا تو اسے ہاتھ سے تبدیل کر دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اسے تبدیل کرے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دل سے (اسے برا سمجھے) یہ اضعف (کمزور) ایمان ہے۔

خوبصورت وضاحت:

"قال العلماء "الا مربالمعروف باليد على الامراء، وباللسان على العلماء، وبالقلب على الضعفاء يعنى عوام الناس"

علماء کرام نے اس حدیث کی وضاحت یہ بیان کی کہ اچھے کاموں کا حکم دینا ہاتھ سے حکام پر لازم ہے اور زبان سے

اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا علماء پر لازم ہے، اور دل سے برے کاموں کو برا سمجھنا ضعیف ایمان والے یعنی عام لوگوں کا کام ہے۔

تنبیہ: حکام بھی ہاتھوں سے سزا اس وقت دے سکیں گے جب زبان سے اس شخص پر اثر نہ ہو، اگر زبان سے وہ اثر قبول کر لے تو اسے سزا دینا منع ہوگا۔ (ماخوذ از قرطبی)

❁ **"وروی عن بعض الصحابة انه قال ان الرجل اذا رأی منکرا لایستطیع النکیر علیه فلیقل ثلاث مرات "اللهم ان هذا منکر" فاذا قال ذلک فقد فعل ما علیه"**

بعض صحابہ کرام سے مروی کہ جب کوئی شخص کسی میں برائی کو دیکھے اور اسے روکنے کی طاقت نہ رکھے، تو تین مرتبہ یہ کہے اے اللہ یہ 'برائی پائی گئی ہے' جب ایسا کر لے (تو اس نے برائی کو دل سے برا مانا) تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ (قرطبی)

❁ **"روی انس بن مالک قال قیل یا رسول الله متی نترک الامر بالمعروف والنهی عن المنکر؟ قال اذا ظهر فیکم ما ظهر فی الامم قبلکم قلنا یا رسول الله وما ظهر فی الامم قبلنا؟ قال الملک فی صغارکم والفاحشة فی کبارکم والعلم فی رذالتکم"**

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کو ہم کب چھوڑ دیں گے؟ آپ نے فرمایا جب تم میں بھی وہ صفات ظاہر ہو جائیں گی جو پہلے لوگوں میں ظاہر ہوئیں (تو تم اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا چھوڑ دو گے) آپ سے پوچھا گیا وہ کون سی صفات ہیں جو پہلے لوگوں میں ظاہر ہوئیں؟ تو آپ نے فرمایا جب بادشاہت تمہارے حقیر لوگوں میں آ جائے گی، اور بڑے لوگوں میں بے حیائی آ جائے گی، اور علم رذیل لوگوں میں آ جائے گا۔ (تو اس وقت تم "امر بالمعروف، نہی عن المنکر" کو چھوڑ دو گے) حضرت زید نے وضاحت کی کہ علم کا رذل لوگوں میں آنے کا یہ مطلب ہے کہ فاسق لوگوں کے پاس علم آ جائے گا۔ (قرطبی)

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ﴾

"یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا میں اور آخرت میں"

اس آیۂ کریمہ اور اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں کفار کو تین وجہ سے وعید کی گئی (عذاب سے ڈرایا گیا)۔

(۱) ایک پچھلی آیۂ کریمہ میں بیان کیا ﴿فبشرھم بعذاب الیم﴾ تو خوشخبری دے دو ان کو دردناک عذاب کی۔

(۲) دوسری وعید اس آیۃ کریمہ میں ان الفاظ مبارکہ سے دی ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ﴾ (یہ ہیں وہ ضائع ہو گئے اعمال ان کے دنیا اور آخرت میں) کافر چونکہ اپنے اعمال کو حسین سمجھتے تھے، اسی لئے علامہ رازی رحمہ اللہ خوبصورت الفاظ سے وضاحت فرماتے ہیں:

"اعلم انہ تعالٰی بین بھذاان محاسن اعمال الکفار محبطۃ فی الدنیا و الآخرۃ"

بیشک اللہ تعالٰی نے کافروں کے اعمال کے محاسن یہ بیان کئے کہ وہ دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے دنیا میں ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدح کی جگہ مذمت ہونے لگی، ثناء (تعریف) کی جگہ ان پر لعنت کا حکم ہوا، اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا گیا، اور ظاہری ذلت وغیرہ ان کو حاصل ہوئی اور آخرت میں اعمال کے ضائع ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو عذاب دیا جائے گا، وہ ثواب سے محروم رہیں گے۔

(۳) تیسری وعید اس آیۃ کریمہ میں ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی "وما لھم من ناصرین" ینصرونھم من بأس اللہ تعالٰی وعذابہ فی احدالدارین" "اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا" کہ ان کو اللہ تعالٰی کی گرفت اور اس کے عذاب سے دونوں جہانوں میں بچا سکے۔ (کبیر و روح المعانی)

تنبیہ: آیۃ کریمہ اگرچہ بظاہر الفاظ کے لحاظ پر عام ہے کہ تمام کفار کو یہ شامل ہے، کیونکہ رب تعالٰی نے مطلقاً ذکر فرمایا ﴿وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ (اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں)

"الاان لہ ھنا موقعا حیث ان ھؤلاء الکفرۃ وصفوا بانھم یقتلون الذین یامرون بالقسط وھم ناصروا الحق"

مگر یہاں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ تعالٰی کی آیات سے کفر کیا، اور انبیاء کرام کو شہید کیا اور ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے انہیں انصاف کرنے کا حکم دیا۔ جب دین حق کی امداد کرنے والوں کو انہوں نے شہید کیا تو ان کا کوئی مددگار نہ رہا، حدیث شریف سے اس طرف اشارہ ملتا ہے

"ولایوجدفیھم ناصر یحول بینھم وبین قتل اولئک الکرام فقوبلوا لذلک بعذاب لاناصرلھم منہ معین لھم فیہ"

ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، کیونکہ مکرم لوگوں کو ان کا قتل کرنا ایسا عظیم جرم ہوگا کہ ان کی مدد کرنے میں یہ جرم حائل ہوگا، اس وجہ سے ان کا کوئی مددگار کرنے والا، اور کوئی معاونت کرنے والا نہیں ہوگا، بلکہ یہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"اولئک" اسم اشارہ ہے، اس کا مشار الیہ وہی صفات ذمیمہ والے لوگ ہیں جن کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں "ان الذین یکفرون بآیات اللہ .. الخ" سے کیا ہے۔ پھر "الذین" موصول کے ذریعے خبر زیادہ بہتر ہے بنسبت فعل کے خبر دینے کے، کیونکہ اس میں انحصار کی قسم پائی گئی ہے۔ پھر موصول کا صلہ فعل اس پر دلالت کررہا ہے کہ یہ سامع کو معلوم تھا، اور اس کے نزدیک پہلے ہی معین تھا، پھر جب موصول کا صلہ وہ اسم لایا جائے جس کا علم مخاطب کو پہلے ہی حاصل تھا تو وہ منسوب ہوگا اس مخبر عنہ کی طرف جو موصول سے شروع کیا گیا، فعل میں یہ صورت نہیں پائی جاسکتی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے ﴿اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ﴾ جب ذکر کیا تو اسی سے واضح کردیا گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر پچھلی آیۃ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ﴾ میں آچکا ہے۔ (البحر المحیط)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ۲۳)

(1) کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ ملا، کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ وہ ان کا فیصلہ کرے، پھر ان میں کا ایک گروہ اس سے روگرداں ہوکر پھر جاتا ہے۔

(2) کیا آپ نے نہیں دیکھا انہیں جنہیں دیا گیا ایک حصہ کتاب سے، بلایا جاتا ہے ان کو اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے درمیان پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے وہ ہیں ہی پھرنے والے۔

ماقبل سے تعلق:

جب پچھلی آیات میں یہود نصاریٰ کی سرکشی اور عناد کا ذکر کیا ﴿فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ تو اگر وہ جھگڑا کریں آپ سے تو آپ فرمادیں میں نے جھکا لیا ہے اپنی ذات کو اللہ کیلئے۔ اور میری تابعد

اری کرنے والوں نے (بھی اپنے آپکو جھکا لیا ہے) اب اس آیۃ کریمہ میں ان کی سرکشی اور عناد کی انتہاء کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ کتنے ہی زیادہ سرکش تھے کہ دعوی ان کا یہ تھا کہ ہمارا اپنی اپنی کتابوں پر ایمان ہے۔ جب ان کو کسی مسئلہ پر دلیل پیش کرنے کیلئے یہ کہا جاتا ہے کہ تم توراۃ لے آؤ، تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔ (از کبیر)

شان نزول:

آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ کو ذکر کیا گیا ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ چند واقعات کے بعد یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جو ان تمام وقعات کو شامل ہے۔اس لحاظ پر سب ہی مجموعی طور پر اس کا شان نزول ہیں۔

(۱) ایک وجہ اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ یہود میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا۔وہ دونوں بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔وہ توراۃ کے مطابق ان دونوں کو رجم نہیں کرنا چاہتے تھے۔وہ اس مقدمہ کا فیصلہ کرانے کیلئے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔آپ نے بھی ان کے حق میں رجم کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اسے تسلیم نہ کیا۔حضور ﷺ نے انہیں توراۃ لانے کیلئے ارشاد فرمایا تو انہوں نے اس میں کج روی (ٹیڑھی چال) سے کام لیا، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی آیئے پورا واقعہ حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ "عن عبد الله بن عمر قال ان رسول الله ﷺ اتی بیهودی ویهودیة قد زنیا فانطلق رسول الله ﷺ حتی جاء یهود فقال ما تجدون فی التورة علی من زنا قالوا تسود وجوههما ونحملهما ونخالف بین وجوههما ویطاف بهما قال فاتوا بالتوراة ان کنتم صادقین فجاء وا بها فقرأ وها حتی اذا مروا بآیة الرجم وضع الفتی الذی یقرأ یده علی آیة الرجم وقرأ مابین یدیها وما ورائها فقال له عبد الله بن سلام وهومع رسول الله ﷺ مره فلیرفع یده فرفعها فاذا تحتها آیة الرجم فامربهما رسول الله ﷺ فرجما قال عبد الله بن عمر کنت فیمن رجمهما فلقد رأیته یقیها من الحجارة بنفسه" (مسلم ج ۲ باب حد الزنا)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، ایک یہودی مرد اور یہودیہ عورت نے زنا کیا نبی کریم ﷺ کو یہود نے فیصلہ کرنے کے متعلق کہا، تو آپ نے فرمایا کہ (اس قسم کے) زنا کی حد توراۃ میں کیا ہے؟ تو وہ کہنے لگے ہم زانی مرد اور عورت کا منہ کالا کر دیتے ہیں، ان کو (گدھے پر) سوار کر دیتے ہیں۔ایک کا منہ آگے اور ایک کا پیچھے کر دیتے ہیں، ان کو (گلیوں مین) پھیر دیتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا توراۃ لے آؤ اگر تم سچے ہو، وہ توراۃ لے آئے۔اسے پڑھنا شروع کیا۔جب آیۃ رجم پر پہنچے۔تو پڑھنے والے جوان نے اس پر ہاتھ رکھ لیا۔اس سے آگے پیچھے پڑھ دیا۔حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔انہوں عرض کیا یا رسول اللہ آپ اسے حکم

دیں کہ یہ اپنا ہاتھ یہاں سے ہٹائے۔ جب اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو اس کے نیچے آیۃ رجم تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ تو ان کو رجم کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ رجم کرنے والوں میں بھی موجود تھا۔ میں نے اس شخص کو دیکھا جو اپنا چہرہ پتھروں سے بچا رہا تھا۔

خیال رہے کہ وہ یہودی ذمی تھے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فیصلہ کیا۔ ذمی کفار اگرچہ احکام شرع کے پابند تو نہیں ہوتے لیکن ان پر حدود اس لئے جاری کی جاتی ہیں کہ ملکی نظام درست رہے اس میں کوئی بگاڑ نہ پیدا ہو اور یہ بھی خیال رہے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بتانے سے نبی کریم ﷺ کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کو خود بھی معلوم ہو اور حضرت عبداللہ بن سلام نے بھی بتا دیا ہو۔ دوسری روایت میں آتا ہے"۔

❁ "عن البراء بن عازب قال مر علی النبی ﷺ بیهودی محمما مجلودا فدعاهم فقل هكذا تجدون حد الزانی فی الزانی فی کتابكم قالوا نعم فد عار جلامن علمائهم فقال انشدک بالله الذی انزل التوارة علی موسی علیه السلام اهكذا تجدون حدالزانی فی کتابکم قال لا ولولا انک نشدتنی بهذا لم اخبرک نجده الرجم ولكنه اكثر فی اشرافنا فكنا اذااخذنا الشريف تركناه واذااخذنا الضعيف اقمنا عليه الحد قلنا تعالوا فلنجتمع علی شئی نقیمه علی الشريف والوضيع فجعلنا التحميم والجلد مكان الرجم فقال رسول الله ﷺ اللهم انی اول من احيی امرک اذ اماتوه فامربه فرجم" (مسلم ج ۲ کتاب الحدود)

حضرت براء بن عازب ؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے قریب سے ایک یہودی کو گذارا گیا جس کا چہرہ سیاہ کیا گیا تھا۔ اسے چھتر اؤ کیا جا رہا تھا، تو آپ نے یہود کو بلایا تو فرمایا کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی حد یہی پاتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے ان کے علماء میں سے ایک عالم کو بلایا، اور فرمایا، میں تم سے اس اللہ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ کو نازل کیا، کیا اسی طرح تم زانی کی حد اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ اس شخص نے کہا نہیں۔ اگر تم مجھ سے قسم دلا کر سوال نہ کرتے تو میں تمہیں خبر نہ دیتا کہ ہم (اپنی کتاب میں) رجم پاتے ہیں لیکن ہمارے بڑے لوگ زیادہ اس فعل کے مرتکب ہوتے، تو ہم بڑے لوگوں کو رجم کرنا چھوڑ دیتے اور غریب لوگوں پر ہم حد نافذ کر دیتے، ہم نے کہا آؤ ہم کسی ایک حد پر اتفاق کر لیں جو بڑوں اور گھٹیا لوگوں سب پر جاری کر دیا کریں تو ہم نے اس پر اتفاق کر لیا کہ رجم (سنگسار) کرنے کے بجائے منہ کالا کر دیا کریں اور چھتر اؤ کر دیا کریں، تو رسول اللہ ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ! سب سے پہلے تیرے حکم کو میں زندہ کر رہا ہوں، جسے ان لوگوں نے مار دیا تھا (ختم کر دیا تھا) تو آپ نے دونوں کو رجم کرا دیا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ نے خود ہی ارشاد فرمایا کیا تم اپنی کتاب میں یہی حد پاتے ہو؟ یہود کے کہنے پر کہ ہم یہی حد اپنی کتاب میں پاتے ہیں، آپ نے ان کے ایک عالم کو رب تعالیٰ کی قسم دلا کر سوال کیا۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے تھا کہ آپ کو علم تھا۔

(۲) آیۃ کریمہ کے شان نزول کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ یہود کے مدرسہ میں تشریف لے گئے تو ان کو دعوت اسلام دی تو وہ کہنے لگے "علی ای دین انت" ؟ تم کس دین پر ہو؟ تو آپ نے فرمایا "علی ملة ابراھیم" میں ملت ابراہیمی پر ہوں۔ تو انہوں نے کہا، ابراہیم علیہ اسلام تو یہودی تھے، فقال صلی الله علیه وسلم هلموا الی التوراة "فابوا ذلک فانزل الله تعالی هذه الایة" تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میرے پاس توراۃ لے آؤ، تو انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

(۳) آیۃ کریمہ کے شان نزول میں تیسری روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کی علامت توراۃ میں مذکور تھی، اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے کے دلائل موجود تھے، نبی کریم ﷺ نے ان کو فرمایا تم توراۃ لے آؤ، اس میں میری نبوت کی نشانیاں اور دلائل دیکھ لو، تو انہوں نے توراۃ لانے سے انکار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

"والمعنی انهم اذا ابوا ان یجیبوا الی التحاکم الی کتابهم فلا تعجب من مخالفتهم کتابک فلذلک قال الله تعالی "قل فاتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صادقین"

مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ جب وہ لوگ اپنی کتاب سے فیصلہ کرانے پر رضامند نہیں تو آپ اس پر تعجب نہ کریں کہ وہ قرآن پاک پر ایمان کیوں نہیں لاتے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ فرما دو، تم توراۃ لے آؤ۔ اس کی تلاوت کرو، اگر تم سچے ہو۔

شان نزول کی اس روایت کے مطابق واضح ہو گیا کہ توراۃ میں وہ دلائل موجود تھے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے پر دلالت کر رہے تھے، "اذلو علموا انه لیس فی التوراة مایدل علی صحة نبوته لسارعوا الی بیان مافیها ولکنهم اسروا ذلک" کیونکہ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ توراۃ میں آپ کی نبوت کی صحت پر کوئی دلائل موجود نہیں تو وہ بہت جلدی اسے بیان کرتے، لیکن وہ خاموش رہے اور اسے مخفی رکھا۔

(۴) شان نزول کی چوتھی روایت یہ ہے کہ یہ حکم یہود و نصاریٰ میں عام ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر

دلائل توراۃ وانجیل میں موجود تھے، جب ان کو توراۃ وانجیل کے حکم کو ماننے کی دعوت دی جاتی تو وہ انکار کردیتے تو اس آیۂ کریمہ کو نازل کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اَلَمْ تَرَ﴾ ''کیا آپ نے نہیں دیکھا''

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، آپ کو تعجب دلانے کیلئے یہ ارشاد فرمایا، اور یہ احتمال بھی ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے ہی خطاب ہو کہ اے دیکھنے والو کیا تم نے اہل کتاب کے حال کو نہیں دیکھا، وہ کتنے ہی برے لوگ ہیں جو اپنی کتاب کا فیصلہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ (از روح البیان)

﴿اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتَابِ﴾ ''ان کی طرف جن کو دیا گیا حصہ کتاب کا۔''

کتاب کا ایک حصہ دیئے جانے کا کیا مطلب؟ جبکہ ان کو مکمل کتاب دی گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو کتاب آدھی دی گئی یا کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا کچھ نہیں دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کتاب کا کچھ علم دیا گیا۔ (کبیر)

اس کی اصل وجہ یہ بیان کی گئی (نصیبا) ای نصیبا حقیرا حیث لا نصیب لهم من بطون الكتاب ولا من الايمان بجميع مافيه'' یعنی ان کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، کیونکہ ان کو کتاب کے ظاہر کا علم دیا گیا، وہ روح کتاب کو نہ سمجھ سکے اور نہ ہی کتاب کے تمام احکام پر انہوں نے ایمان لایا۔ (مظہری)

رسول اللہ ﷺ کے اوصاف ان کی کتاب میں تھے، آپ کی نبوت کے دلائل مذکور تھے، لیکن ان کا ایمان نہ لانا اس پر دلیل تھی کہ گویا کہ وہ اس سے محروم رکھے گئے۔ ''من الکتاب'' اس مقام پر ''کتاب'' سے مراد کون سی کتاب ہے؟ اس سے مراد عام ہے یعنی توراۃ اور انجیل دونوں ہی مراد ہیں، کیونکہ آیۂ کریمہ میں یہود اور انصار دونوں فریقوں کا ذکر ہے۔ (از کبیر)

﴿یُدْعَوْنَ اِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ﴾ ''بلایا جاتا ہے ان کو اللہ کی کتاب کی طرف۔''

ایک قول اگرچہ یہ بھی ہے کہ ''کتاب اللہ'' سے مراد اس مقام میں قرآن پاک ہے، اگرچہ بظاہر اس پر اعتراض بھی وارد ہے کہ جب ان کا ایمان ہی قرآن پاک پر نہ تھا تو ان کو قرآن پاک کی طرف بلانے کا کیا مقصد ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب ان پر یہ حجت قائم ہوگئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، ان کو انکار کی گنجائش نہ رہی

تو ان کو دعوت دی گئی کہ آؤ قرآن پاک سے فیصلہ کرا لیتے ہیں۔ لیکن اکثر مفسرین کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ اس مقام میں "کتاب اللہ" سے مراد "توراۃ" ہے انہوں نے اس پر دلائل بھی قائم کئے ہیں۔

(۱) شان نزول کی تمام روایات اس پر دلالت کر رہی ہیں "ان القوم کانوا یدعون الی التوراۃ فکانوا یابون" کہ بیشک قوم یہود کو توراۃ کی طرف بلایا جاتا تھا، وہ اس کا انکار کرتے تھے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے ان کی سرکشی اور ان کے اعراض کرنے پر تعجب کیا۔

"والتعجب انما یحصل اذا تمردوا عن حکم الکتاب الذی یعتقدون فی صحتہ ویقرون بحقیتہ"

آپ کو تعجب اسی وقت سے حاصل ہوا کہ جب انہوں نے اس کتاب سے سرکشی کی اور انکار کیا جس کے حق ہونے کا وہ اقرار کرتے تھے، اور اس کی صحت کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ کتاب توراۃ ہی تھی۔

(۳) یہاں "کتاب اللہ" سے مراد "توراۃ" لینا ہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ ماقبل آیۃ سے یہی متعلق ہے۔ پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ﴾ آپ پر صرف پہنچا دینا ہے۔ ضمناً اس سے یہ بیان کر دیا گیا "واصبر علی ما قالوا فی تکذیبک مع ظھور الحجۃ" کہ آپ صبر کریں اس پر جو وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں باوجود حجت کے ظاہر ہونے کے۔

اور آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ توراۃ میں جب دلائل موجود تھے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کر رہے تھے، تو ان کا ان دلائل کو چھپانا اور آپ کی نبوت کا انکار کرنا ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا۔ "فھذا یدل علی انھم فی غایۃ التعصب والبعد عن قبول الحق" اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہود بڑے متعصب تھے، اس وجہ سے حق کو قبول کرنے سے دور تھے۔ (از کبیر)

﴿لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ﴾ "تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان"

"فالمعنی لیحکم الکتاب بینھم" مطلب اس کا یہ ہے کہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ فیصلہ کرنے کی نسبت کتاب کی طرف مجاز ہے جیسا کہ قرآن پاک کو بشیر و نذیر مجازی طور پر کہا گیا ہے حقیقی طور پر بشیر و نذیر نبی کریم ﷺ ہیں۔ (از کبیر و روح البیان)

نکتہ: "بینھم" سے یہ مسئلہ واضح ہوا "ان الاختلاف کان واقعا فیما بینھم لا فیما بینھم وبین رسول اللہ ﷺ" کہ اختلاف ان کا آپس میں تھا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ تم توراۃ لاؤ تو کچھ لوگ آپ

کے ساتھ ہو گئے، اپنے علماء کو کہنے لگے تو راۃ لاؤ، کچھ ان کے اصحاب علم انکار کرنے لگے۔ اس مقام میں یہود اور نبی کریم ﷺ کے اختلاف کو ذکر نہیں کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾

''پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے، وہ ہیں ہی پھرنے والے''

یعنی جب ان کو کتاب لانے کی دعوت دی گئی تو ''**یتولی فریق منهم وهم الرؤساء الذين يزعمون انهم هم العلماء**'' ایک فریق ان میں سے پھر گیا، وہ ان کے رئیس لوگ (وڈیرے) تھے، جو یہ گمان کرتے تھے کہ علم والے صرف ہم ہی ہیں۔

''**وهم معرضون**'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ ﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے مراد ان کے رئیس اور علماء ہوں، اور ''**وهم معرضون**'' سے مراد باقی لوگ ہوں جو علماء کے تابع تھے۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''**ثم يتولى العلماء والاتباع معرضون عن القبول من النبي ﷺ لاجل تولى علمائهم**'' کہ علماء پھر گئے، اور ان کے متبعین بھی نبی کریم ﷺ کی نبوت کو ماننے سے پھر گئے کیونکہ جب ان کے علماء پھر گئے تو ان کی وجہ سے یہ لوگ بھی پھر گئے۔ لیکن دوسرا احتمال یہ ہے ''**ان المتولى والمعرض هو ذلك الفريق**'' کہ دونوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے، یعنی جو فریق پھرنے والا ہے، جس کا ذکر ﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ سے کیا، وہی فریق ''**وهم معرضون**'' کا مصداق بھی ہے کہ ''وہی پھرنے والے ہیں''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی دوسرے احتمال کے مطابق ہے ''پھر ان میں کا ایک گروہ اس سے روگرداں ہو کر پھر جاتا ہے۔ راقم نے بھی تقریباً اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے ہی نقل کیا'' پھر پھر گیا ایک فریق ان میں سے وہ ہیں ہی پھرنے والے۔

یہود نے کلی طور پر اعراض کیا:

اسی آیۃ کریمہ سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ یہود مکمل طور پر نبی کریم ﷺ کے دلائل سے اعراض کرنے والے تھے، اور ضمناً نبی کریم ﷺ کو بھی تسلی دے دی گئی تا کہ آپ ان کے اعراض سے پریشان نہ ہوں۔

''**يعنى انهم معرضون عن استماع سائر الحجج في سائر المسائل والمطالب، كانه**

قیل لاتظن انتم تولوا عن هذه المسالة بل هم معرضون عن الکل"

یعنی وہ مکمل طور پر تمام دلائل کے سننے سے اعراض کرتے ہیں کسی مسئلہ کو اور کسی مطلب کو بھی سننے، ماننے کی کوشش نہیں کرتے۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں کے ایک مسئلہ میں اعراض کرنے کو نہ دیکھیں کہ انہوں نے اعراض کیوں کیا ہے، یہ تو ہر مسئلہ میں اعراض کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از بیہ)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁
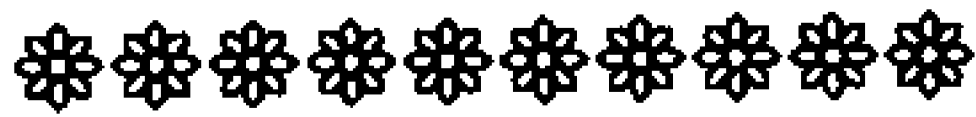
﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِیْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۴)

(۱) یہ جرأت انہیں اس لئے ہوئی کہ وہ کہتے ہیں ہرگز ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دنوں، اور ان کے دین میں انہیں فریب دیا اس جھوٹ نے جو باندھتے تھے۔

(۲) یہ اس وجہ سے تھا کہ بیشک انہوں نے کہا ہرگز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے اور ان کو دھوکا دیا ان کے دین میں اس نے جو وہ افتراء (من گھڑت قول، جھوٹ) باندھے تھے۔

﴿ذٰلِکَ﴾ "یہ"

"ذٰلِکَ" کا مشار الیہ (جس کی طرف اشارہ کیا جائے) کیا ہے؟ اکثر مفسرین کرام نے بیان کیا ہے کہ اشارہ ماقبل مذکور "التولی" اور "الاعراض" کی طرف ہے۔ اگر چہ ان کا ذکر قریب ہے لیکن اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ کبھی کسی گھٹیا چیز کو مقام حضور سے دور سمجھتے ہوئے اشارہ بعید لایا جاتا ہے، خواہ وہ قریب ہی ہو۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان کا یہ گھٹیا فعل یعنی اعراض کرنا، پیٹھ پھیرنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے کہا ہرگز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے۔

"اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ" اور علامہ محمد علی صابونی رحمہ اللہ":

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے "ذلک" کا ترجمہ بمع مشار الیہ کے بیان کے یہ کہا ہے "جرأت انہیں اس لئے ہوئی" آپ

کا ترجمہ تفسیر صابونی کے عین مطابق ہے، آیئے تفسیر صابونی کی عبارت دیکھئے اور کنزالایمان کے حسن کو دیکھئے:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٌ﴾ای انما حملهم وجرأهم علی مخالفة الحق افتراؤهم علی الله فیما ادعوه لانفسهم،انهم انما یعذبون فی النار سبعة ایام عن کالف سنة فی الدنیا یوما"

ان کو ابھارا، ان کو جرأت دلائی حق کی مخالفت پر ان کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے نے، جوانہوں نے اپنے لئے دعویٰ کیا کہ ہمیں تو صرف چند دن یعنی سات دن عذاب ہوگا، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا سات ہزار سال تک رہے گی، ہر سال کے بدلے ہمیں ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ (صابونی)

راقم نے "ذٰلِکَ" کا مشارالیہ ترجمہ میں ذکر نہیں کیا تا کہ طلباء کرام تفاسیر کے مختلف اقوال کو دیکھ کر جس پر چاہیں محمول کرلیں۔

﴿بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾

"بسبب اس کے کہ بیشک انہوں نے کہا ہرگز نہیں مس کرے گی ہمیں آگ مگر چند دن گنتی کے۔"

"ای حاصل لهم بسبب هذاالقول رسخ اعتقادهم له وهو نوابه الخطوب ولم یبالو امعه بارتکاب المعاصی والذنوب" (روح المعانی)

یعنی ان کا حق سے پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دلوں میں یہ بات کامل طور پر راسخ ہو چکی تھی کہ ہمیں عذاب چند دن ہونا ہے۔ وہ سات دن ہوگا۔ یا ہمارے آباء واجداد نے بچھڑے کی عبادت چالیس دن کی تھی۔ اسی کی مقدار ہمیں چالیس دن عذاب ہوگا۔ ان کے اس عقیدہ (کہ ہمیں عذاب چند دن ہوگا) نے ان کو عذاب سے بے خوف کر دیا تھا۔ انہیں نافرمانیوں اور گناہوں کے ارتکاب کے کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا﴾بسبب قولهم ذلک فهو نوا علی انفسهم جمیع الموبقات من قتل الانبیاء وعصیانهم وغیر ذلک"

جب ان کا عقیدہ اس بات پر راسخ ہو گیا کہ ہمیں عذاب تو صرف چند دن ہونا ہے تو ان پر تمام وہ کام "جو عذاب کا سبب تھے اور تباہ کن تھے" آسان ہو گئے۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام کو وہ شہید کرنے لگے۔ اور ہر قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرنے لگے۔

آجکل بھی لوگوں کو بے دین بنانے کیلئے یہود کی ذریت معنوی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے، کوئی پل صراط کا انکار کر کے لوگوں کو بے خوف بنانے کی کوشش میں ہے، اور کوئی عذاب قبر کا انکار کر کے لوگوں کو بے خوف بنا کر رب

تعالی سے دور کر رہا ہے، کوئی فوت ہونے کے بعد قبر میں زندگی کا انکار کر کے لوگوں کو بے دین بنا رہا ہے کہ بس انسان مر گیا تو مر گیا، پھر کوئی عذاب نہیں اور کوئی راحت نہیں کوئی جنت و دوزخ کا ہی انکار کر رہا ہے،

اے مسلمانو! یہودیوں کی معنوی اولاد سے ہوشیار رہو، بے دینوں کے شکنجے میں پھنس کر کے اپنے آپ کو رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ کا باغی نہ بناؤ۔

"والا هتمام بامر الايمان والعمل انما يكون باعتقاد دوامه او اطول مدته"

ایمان اور عمل کا انسان اسی وقت اہتمام کر سکتا ہے جب اس کا عقیدہ یہ ہو کہ کافروں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب ہونا ہے، ان کے عذاب نے ختم نہیں ہونا، جب یہ عقیدہ ہوگا تو وہ ایمان پر قائم و دائم رہے گا، اور جب یہ عقیدہ ہوا کہ گنہگار کو بھی رب تعالی نے اگر اپنی گرفت میں لے لیا تو اس کے گناہ کے مطابق اسے عذاب دیا جائے گا، وہ عذاب بھی طویل ہوگا، تو انسان یقیناً گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا، اگر غلطی سے گناہ کا ارتکاب ہو گیا تو وہ اس پر نادم ہوگا، رب تعالی کے عذاب سے ڈر کر توبہ کر لے گا۔

مذہب اہلسنت:

اللہ تعالی اگر مؤمن کو اپنے فضل سے معاف فرمادے، کسی قسم کی گرفت (پکڑ) اس پر نہ کرے تو اس کی مہربانی ہے۔"ان العفو جائز حسن من الله تعالی" بیشک اللہ تعالی کی طرف سے معاف کرنا جائز ہے اور حسن ہے۔ اگر مستحق عذاب کو کچھ دیر کیلئے عذاب دے کر اللہ تعالی معاف فرمادے تو یہ اس کی مرضی اور فضل ہوگا اگر گناہوں کے مطابق کسی کو مکمل عذاب دے کر جہنم سے نکال دے تو یہ عدل ہوگا۔ یہ سب مؤمنوں کیلئے ہے، لیکن کفار کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عذاب ہوگا، ان کو جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔

معتزلہ کا مذہب:

اگر کسی مسلمان کو عذاب دینے کیلئے جہنم میں داخل کر دیا گیا تو اسے نکالا نہیں جائے گا یہ مذہب عقل و نقل کے خلاف ہے۔ معتزلہ کی دلیل یہی آیۃ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا ہمیں چند دن عذاب ہوگا۔ رب تعالی نے ان کی مذمت بیان کی تو پتہ چلا کہ کسی کو جہنم میں داخل کر کے نہیں نکالا جائے گا۔ یہ دلیل ان کی باطل ہے اس لئے کہ بنی اسرائیل نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنے اور باطل نظریات و عقائد رکھنے کی وجہ سے کافر ہو گئے تھے۔ کافر کا عذاب دائمی ہوگا۔ اور ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ ہمیں عذاب ہمیشہ نہیں ہوگا، بلکہ کچھ دیر عذاب ہوگا جو اللہ تعالی چاہے گا ان کا تو عقیدہ

یہ تھا کہ ہمیں چند معین دن عذاب ہوگا، ان کا یہ عقیدہ ان کو کافر بنانے کیلئے کافی تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾

''اور دھوکا دیا ان کو ان کے دین میں جو وہ افتراء (جھوٹ) باندھتے تھے۔''

"(والغرور) هو الاطماع فيما لا يحصل منه شئ" ایسی چیز میں طمع کرنا جو حاصل نہ ہو سکے اسے غرور (دھوکا) کہا جاتا ہے۔ (والافتراء) اختلاق الكذب، جھوٹ گھڑنے کو "افتراء" کہا جاتا ہے۔

اب مطلب یہ ہوا کہ ان کو جھوٹ گھڑنے، افتراء باندھنے نے ان کے دین میں ایسی چیزوں کی طمع دلائی جو ان کو حاصل نہیں تھیں۔ (معالم التنزیل للبغوی)

ان کا افتراء کیا تھا؟

وہ مختلف جھوٹ گھڑتے رہتے تھے، ایک تو اسی آیہ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا کہ وہ یہ کہتے تھے ہمیں صرف چند دن گنتی کے عذاب ہوگا، وہ کہتے تھے ہمیں سات دن یا چالیس دن عذاب ہوگا اور وہ یہ کہتے تھے کہ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّـآؤُهٗ﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے (معاذ اللہ) ہیں، اور اس کے محبوب ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رب تعالیٰ اپنے محبوبوں کو ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رکھے گا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ جسطرح محبوبوں کو معمولی سرزنش کی جاتی ہے، وہ دائمی نہیں ہوتی بلکہ عارضی ہوتی ہے، اسی طرح ہمیں بھی چند دن گنتی کے سرزنش کی جائے گی۔

اور ان کا افتراء یہ تھا کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کی اولاد کو عذاب نہیں دے، ہاں البتہ صرف اتنا عذاب ہوگا کہ اس کی قسم پوری ہو جائے جو اس نے پل صراط سے گذارنے کی قسم اٹھا رکھی ہے، اور ان کا افتراء یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں اور تم باطل راہ پر ہو۔ یہ سب ان کے جھوٹے اور من گھڑت دعوے تھے، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ (خازن وروح المعانی)

تنبیہ: دین کو اپنی رائے کے مطابق کرنے کی کوشش طریقہ یہود ہے، کہ توراۃ کے سخت احکام سے پھر جاتے تھے اور اپنی مرضی کے مطابق احکام واضع کرتے رہتے تھے۔ **مسلمانوں** کو چاہئے کہ اس سے عبرت پکڑیں، دین اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنے آپ کو دین اسلام کے مطابق ڈھالیں۔ کبھی اسلامی پردہ کی مخالفت، عورتوں کی آزادی کے دعوے، دفاتر میں عورتوں کو مردوں کے سامنے بٹھانا، بظاہر

عورتوں پر مہربانی کی جارہی ہے لیکن حقیقت میں بے حیائی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ اسی طرح سودی کاروبار کو فروغ دینے کیلئے مختلف حربے استعمال کئے جارہے ہیں، جو تمام غیر شرعی طریقے ہیں۔ بظاہر معاشیات کو ترقی دینے کے دعوے ہیں لیکن حقیقت میں سودی کاروبار کی بے برکتی نے ملک کو قرضوں میں جکڑ کر کنگال کردیا ہے۔ کبھی پوتے کو وارث بنانے کیلئے غیر شرعی طریقوں کا سہارا لینا بھی درحقیقت اسلام کو اپنے تابع بنانے کے ناجائز ہتھکنڈے ہیں۔ پوتے کا وارثت میں کب حصہ ہوتا ہے، اور کب نہیں، اس کی تفصیل ان شاءاللہ چوتھے پارہ میں آئے گی۔ (ماخوذ از تفسیر نعیمی)

اے مسلمان! تیری کامیابی صرف مصطفےٰ کریم ﷺ کے تابعداری میں ہے۔ یہود ونصاری کے تابعداری چھوڑ دے، ورنہ ذلیل ہوتا رہے گا، آج تو عراق اور کابل کو دیکھ ذرا اور سمجھنے کی کوشش کر جن لوگوں نے یہود ونصاری سے یاری لگائی رب تعالیٰ نے انہیں کے ہاتھوں مسلمانوں کو کتنی بڑی سزا دی، تصور کرنے پر بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، یہود ونصاری کی زیر قیادت جہاد کرنے والے کبھی مجاہدین کے لقب سے پکارے جاتے تھے، لیکن رب تعالیٰ کو نام نہاد جہادی تنظیموں کا کردار پسند نہ آیا کہ تم میری مرضی کے خلاف یہود ونصاری سے مل کر، ان کی زیر قیادت جہاد کررہے ہو، یہ کون سا جہاد ہے کہ بعض کافروں سے یاری لگانا اور بعض کافروں کو قتل کرنا، رب تعالیٰ جب ان پر ناراض ہوا تو وہی جو مجاہدین کہلاتے تھے ان کو دہشت گرد کہلایا گیا، یہ سب رب تعالیٰ کو ناراض کرنے اور یہود ونصاری کو خوش کرنے اور آئندہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے منصوبے کے کرشمے ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۵)

(1) تو کیسی ہوگی جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن کیلئے جس میں شک نہیں اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھر دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

(2) تو کیسے (حال) ہوگا جب جمع کریں گے ہم ان کو اس دن کہ نہیں شک اس میں، اور پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کسب کیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ خطاب نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کو ہے جس میں یہود و نصاری کے قیامت میں حال سے تعجب دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالی پر افتراء باندھنے والے، معاصی کے ارتکاب میں جرأت کرنے والے یہود و نصاری کا "فکیف یکون حالھم" کیسا حال ہوگا۔ (قرطبی)

اس دن جس میں ہم ان کو جمع کریں گے، جس میں کوئی شک نہیں، وہ قیامت کا دن ہے جس نے یقیناً واقع ہونا ہے۔ پورا پورا ہر نفس کو بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کسب کیا، خواہ شر عمل کیا یا خیر عمل کیا اور ان پر کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، یعنی نہ کسی کے برے عمل کا زیادہ عذاب دیا جائے گا اور نہ ہی کسی اچھے عمل کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے گی۔ (از خازن و مدارک)

❁ "روی ان اول رأیة ترفع یوم القیامة من رأیات الکفر رأیة الیھود فیفضحھم الله عزوجل علی رؤس الاشھاد ثم یامر بھم الی النار" (تفسیر ابی السعود)

روایت بیان کی گئی کہ قیامت کے دن کفر کے جھنڈوں میں سے سب سے پہلے یہود کا جھنڈا بلند کیا جائے گا، ان کو تمام لوگوں کی موجودگی میں رسوا کیا جائے گا، پھر ان کے متعلق حکم دیا جائے کہ ان کو آگ میں داخل کردو۔

تنبیہ اکثر مفسرین کرام نے "فکیف" کی تفسیر "فکیف یکون حالھم" (تو کیسے ہوگا ان کا حال) سے کی ہے، راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ تفسیر تبصیر الرحمٰن نے یوں تفسیر بیان کی "فکیف یصنعون لفضیحتھم علیه" ان کی کیسی رسوائی ہوگی، وہ اس رسوائی کے وقت کیا کریں گے، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ روح المعانی میں (فکیف) تھویل وھدم" سے بھی تفسیر کی گئی ہے، ان کی ہولناکی کیسے ہوگی، ان کی ذلت کیسے ہوگی۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے مطابق بھی ہے، کیونکہ آپ کا ترجمہ (تو کیسی ہوگی) یعنی کیسی

رسوائی، کیسی ہولناکی اور کیسی ذلت ان کی ہوگی۔

بندہ اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو:

جب عدل قائم ہوگا تو ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور اگر رب تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ گنہگار کو جہنم سے نکال کر بخش دے گا، جیسا کہ ایک روایت میں مذکور ہے۔

"انه اذا كان يوم القيامة وسكن اهل الجنة الجنة واهل النار النار اذابصوت حزين ينادى من داخل النار يا حنان يا منان يا ذاالجلال والاكرام فيقول الله تعالى يا جبريل اخرج هذاالعبد الذى فى النار قال فيخرجه اسود كفرخ الحمام قد تناثرلحمه وذاب جسمه فينادى يا جبريل لا توقفنى بين يدى الله فافزع فيئوتى به الى الله فيقول له عبدى اتذكر ذنب كذا وكذا فى سنة كذا وكذا؟فيقول نعم يا رب،فيقول الله اذهبوا بعبدى الى النار،فيكون من العبد التفات،فيقول الله ردوا عبدى الى فيرد اليه،فيقول له عبدى ما كان التفاتك وهواعلم،فيقول يا رب اذنبت ولم اقطع رجاء ى منك،وحاسبتنى ولم اقطع رجائى منك،واد خلتنى النار ولم اقطع رجاء ى منك،واخرجتنى منها اليك ولم اقطع رجاء ى منك ثم رددتنى اليها ولم اقطع رجاء ى منك،فيقول الله تبارك وتعالى وعزتى وجلالى وارتفاعى فى علومكانى لأكونن عند ظن عبدى بى ولأحققن رجاء ه فى،اذهبو بعبدى الى الجنة"

جب قیامت کا دن ہوگا، جنت والے جنت میں ٹھہرادیئے جائیں گے اور آگ والے آگ میں ڈال دیئے جائیں گے، تو آگ سے ایک غمناک آواز آئے گی "یا حنان ،یا منان ،یا ذاالجلال والاکرام" رب تعالیٰ فرمائے گا، اے جبریل اس میرے بندے کو آگ سے نکالو، تو اسے آگ سے نکال لیا جائے گا، وہ کوے کے چھوٹے بچے کی طرح سیاہ رنگ کا ہو چکا ہوگا، اس کا گوشت اس کے جسم سے جھڑ (گر) چکا ہوگا، وہ بندہ کہے گا اے جبریل مجھے میرے رب کے سامنے نہ کھڑا کرنا، میں اپنے رب سے بہت گھبرا رہا ہوں لیکن جبریل اسے (رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق) رب تعالیٰ کے پاس لے آئیں گے۔ رب تعالیٰ فرمائے گا، اے میرے بندے! کیا تو فلاں فلاں سال کے اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ تو بندہ (اعتراف کرتے ہوئے) کہے ہاں میرے رب (میں جانتا ہوں) تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس میرے بندے کو آگ کی طرف لے جاؤ، تو وہ بندہ آگ کی طرف جاتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس میرے بندے کو واپس لوٹاؤ، اسے واپس لوٹا دیا جائے گا، تو رب تعالیٰ سب سے زیادہ جاننے کے باوجود اس سے سوال کرے گا اے میرے بندے تو پیچھے مڑ مڑ کر کیوں دیکھ رہا تھا؟ وہ کہے گا اے میرے رب مجھ

سے گناہ تو سرزد ہو گیا تھا لیکن میں تیری رحمت سے نا امید نہیں ہوا تھا، تو نے مجھ سے حساب لیا لیکن میں نے تیری رحمت سے امید کو ختم نہیں کیا تھا، تو نے مجھے آگ میں ڈال دیا لیکن میں نے تیری رحمت سے امید کو نہیں توڑا تھا، تو نے مجھے جہنم سے اپنی طرف نکال لیا تو میں نے تیری رحمت سے امید کو منقطع (توڑا) نہیں کیا، پھر تو نے مجھے آگ کی طرف لوٹا دیا لیکن میں نے تیری رحمت کی امید کو نہ توڑا، رب تعالیٰ فرمائے گا مجھے میری عزت اور میرے جلال اور میری بلندی شان کی قسم میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں گا، اور میں اپنے بندے کی امید کو ضرور بر ضرور پورا کروں گا، (اے میرے فرشتو) اس میرے بندے کو جنت کی طرف لے جاؤ۔

خدایا بعزت که خوارم مکن　　　بذل بزه شرمسارم مکن

اے میرے رب تجھے تیری عزت کا واسطہ مجھے ذلیل وخوار نہ کرنا، اور گناہوں میں میرے مبتلاء ہونے کی وجہ سے مجھے شرمسار نہ کرنا۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁ **"قال رسول الله ﷺ لیس علی اهل لااله الاالله وحشة عند الموت ولا فی قبورهم ولا فی منشرهم کانی باهل لااله الاالله ینفضون التراب عن رؤوسهم وهم یقولون الحمد الله الذی اذهب عنا الحزن"**

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لاالہ الااللہ" پڑھنے والوں کو موت کے وقت قبر میں جاتے وقت اور قبروں سے اٹھاتے وقت کوئی وحشت حاصل نہیں ہوگی۔ گویا کہ میں بھی "لاالہ الااللہ" پڑھنے والوں سے ہوں گا، وہ قبروں سے اٹھیں گے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے، اور وہ کہہ رہے ہوں گے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحُزْنَ﴾ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمارا غم دور کیا"

اسلئے مؤمن کیلئے یہ ضروری ہے وہ اہل بدعت میں داخل نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو ہدایت دے رکھی ہے وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، اور اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ امت شریفہ میں کامل مسلمان بنا کر رکھے۔

اسی وجہ سے بیان کیا گیا ہے برے انجام کی علامات یہ ہیں کہ بندے کو رب تعالیٰ نے جو ایمان وتوحید عطاء کر رکھے ہیں ان کا وہ شکر یہ ادا نہ کرے، جو لوگ دنیا میں رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا نہ کر کے دھوکے میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ تو قیامت کے دن وہ اسی دھوکے میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے اسے اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ "فلیس لهم عنایة رحمانیة" ان کو عنایت رحمانیہ حاصل نہیں ہوگی۔ بندے کو کامل امید اس وقت حاصل ہو گی، جب اس کے عمل نیک ہوں گے، کامل لوگ وہی ہیں جو تزکیہ نفس میں مبالغہ کرتے ہیں اور ہمیشہ برے انجام سے خوف رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید کرتے ہیں۔

"فکیف بنا ونحن متورطون فی آبار الاوزار لاتوبة لنا ولااستغفار غیر العناد والاصرار"

ہمارا حال کیسا ہوگا کہ ہم گناہوں کے کنوؤں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، نہ ہمیں توبہ حاصل ہے نہ ہی استغفار حاصل ہے، اگر حاصل ہے تو عناد اور گناہوں پر قائم رہنا۔ علامہ غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب منہاج العابدین میں ذکر فرمایا ہے، کہ توبہ کے تین مقدمات ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے "احداھا ذکر غایة قبح الذنوب" گناہگار شخص گناہوں کی بہت زیادہ قباحت کو یاد کرے۔

(۲) "والثانیة ذکر غایة عقوبة اللہ تعالی والیم سخطه وغضبه الذی لا طاقة لک به"

ان میں سے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے عذاب کو یاد رکھے اور یہ یاد رکھے کہ اللہ تعالی ناراضگی اور اس کے غیظ وغضب کے درد کو برداشت کرنا میرے لئے مشکل ہوگا۔

(۳) "والثالثة ذکر ضعفک وقلة حیلتک فان من لا یحتمل حر الشمس ولطمة الشرطی وقرص نملة کیف یحتمل حر نار جهنم وضرب مقامع الزبانیة ولسع حیات کاعناق البخت وعقارب کالبغال خلقت من النار فی دار الغضب والبوار"

اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بہت ہی کمزور سمجھے، اور یہ سمجھے کہ میرے حیلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، جب میں دھوپ کی گرمی کو برداشت نہیں کرسکتا، پولیس کے سپاہی کے ایک تھپڑ کو برداشت نہیں کرسکتا، اور چیونٹی کے ڈنگ کو برداشت نہیں کرسکتا، تو جہنم کی شدید گرم آگ کی تپش کو کیسے برداشت کرسکوں گا، اور زبانیہ فرشتوں کے گرزوں کی ضرب کو کیسے برداشت کروں گا، بختی اونٹوں کی لمبی لمبی گردنوں کی طرح بڑے اور لمبے سانپوں کے ڈنگ کس طرح برداشت کروں گا، اور خچر کی طرح بچھوؤں کے ڈنگ کیسے برداشت کروں گا، جو پیدا ہی جہنم کی آگ سے کئے گئے ہیں۔ یہ عذاب جہنم کے مقام دار غضب اور دار بوار میں حاصل ہونے ہیں، "نعوذ باللہ من سخطه وعذابه" اللہ کی پناہ اس کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے۔ **راقم** کی بھی یہی دعاء ہے کہ اے اللہ اپنا فضل وکرم فرمانا، ہم گنہگار ہیں تو غفار ہے، ستار ہے۔

مرا باید چوں طفلاں گریست ز شرم گناہاں ز طفلانہ زیست

مجھے بچوں کی طرح رونا چاہئے گناہوں سے شرم کرتے ہوئے بچوں کی زندگی بسر کروں۔

نکو گفت لقمان کہ نا زیستن بہ از سالہا بر خطا زیستن

کتنا اچھا لقمان حکیم نے کہا ہے زندہ نہ رہنا اس سے بہتر ہے کہ کئی سال گناہوں کی زندگی بسر کرے۔

(ماخوذ از روح البیان)

چند مذاهب باطلہ:

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ یہود و نصاری نے دین اسلام کی مخالفت صرف سرکشی اور عناد کی وجہ سے کی، ایسے ہی کئی باطل مذاہب کی دراو مدار بھی سرکشی اور عناد پر ہی ہے جنہوں واضح چیزوں کا انکار کیا، حقائق اشیاء کے خلاف نظریات باطلہ کو سمجھنے سے پہلے اس مسئلہ میں اہل سنت کا مذہب سمجھا جائے۔

قال اهل الحق حقائق الاشياء ثابتة: اھل حق کا مذہب یہ ہے کہ حقائق اشیاء ثابت ہیں۔

حقيقة الشی وماهيته مابه الشئ هوهو:

ایک چیز کی حقیقت اور ماہیت "مابه الشی هو هو" کو کہتے ہیں "مابه الشئی هو هو" کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز ذاتیات کے بغیر نہیں پائی جاسکتی، جیسے انسان کا وجود حیوانیت اور ناطقیت کے بغیر نہیں۔ چونکہ انسان کا وجود اس کے ضاحک اور کاتب ہونے (ہنسنے اور لکھنے) پر موقوف نہیں لھذا ضاحک اور کاتب ہونے کو انسان کے 'عوارض' کہا جائے گا۔ "مابه الشئی هو هو" نہیں کہا جائے گا۔ ایک چیز مختلف اعتبارات سے مختلف نام رکھتی ہے، "مابه الشی هو هو" کے باعتبار تحقق و وجود کے حقیقت کہا جائے گا، اور باعتبار تشخص کے "هوية" کہا جائے گا۔ اور تحقق یا تشخص سے قطع نظر اسے "ماهیت" کہا جائے گا۔

"هوية" کے تین معانی ہیں۔ (۱) ماہیت شخصیہ (۲) وجود خارجی (۳) تشخص۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ "ثبوت، وجود، تحقق، کون" مترادف الفاظ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ "حقائق الاشياء ثابتة" جملہ کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، اس لئے کہ حقیقت کا معنی بھی ثابت ہونا، اور "ثابتة" کا معنی بھی ثابت ہونا، تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا "الامور الثابتة ثابتة" "جو امور ثابت ہیں وہ ثابت ہیں" اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہم پہلے اعتقاد رکھیں گے کہ حقائق اشیاء پائی گئی ہیں، پھر ان کے نام رکھیں گے "انسان، فرس، سماء، ارض" کہ یہ چیزیں نفس الامر میں موجود ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے رب تعالی کا نام "واجب الوجود" مانتے ہیں، پھر ہم کہتے "واجب الوجود موجود" واجب الوجوب موجود ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد کچھ باطل مذاہب کو دیکھیں، سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ "دین اسلام" اللہ تعالی کا دین ہے، باقی تمام باطل دین لوگوں کے من گھڑت ہیں، کہاں باری تعالی کا دین اسلام، اور کہاں ادیان باطلہ، نتیجہ لازمی طور پر یہی نکلتا ہے کہ لوگوں کے من گھڑت دین باطل ہیں، رب تعالی کے دین

اسلام سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔

عنادیہ فرقہ: ان لوگوں کا مذہب یہ ہے ''اشیاء کی حقیقتیں موجود نہیں، ان کا گمان یہ ہے کہ سب چیزیں وہمی اور خیالی ہیں، اس فرقہ والوں نے معاذ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی وہمی اور خیالی قرار دیا ہے، اور انبیاء کرام کو بھی وہمی اور خیالی کہا ہے، غرضیکہ ان کے نزدیک ہر چیز وہمی اور خیالی ہے۔

عندیہ فرقہ: ان لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ ہر چیز ہمارے اعتقاد کے تابع ہے، اگر ہم کسی چیز کے جوہر ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ جوہر ہوگی، اور اگر ہم کسی چیز کے عرض ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ عرض ہو جائے گی، اگر ہم کسی چیز کے قدیم ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ قدیم ہو جائے گی، اگر ہم کسی چیز کے حادث ہونے کا اعتقاد کرلیں تو وہ حادث ہو جائے گی۔

لاادریہ فرقہ: یہ لوگ کہتے ہیں کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہیں، سب میں شک پایا جاتا ہے، بلکہ اس فرقہ والوں کا عجیب مذہب باطل یہ ہے کہ یہ اپنے شک میں بھی شک کرتے ہیں، یہ تینوں فرقے سوفسطائیہ ہیں، یعنی من گھڑت حکمت کے دعویدار، یہ وہ فلاسفہ ہیں جو دین سے برگشتہ (پھرے ہوئے) ہیں، ان کے رد کیلئے ہی علماء اہل سنت نے فلسفہ پڑھا اور فلسفی دلائل سے ہی ان کا رد کیا۔

اہلسنت کے مذہب حق پر دلائل:

اہلسنت نے کہا کہ یہ بدیہی بات ہے کہ بعض چیزوں کا ثبوت "عیان" (ظاہر) سے ہے، جیسا کہ زمین کو دیکھنا اور سورج کو دیکھنا اور بعض چیزوں کا ثبوت ''بیان'' سے یعنی خبر متواترہ سے کئی چیزوں کا ثبوت ہے، جس طرح مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ، جن لوگوں نے نہیں دیکھا وہ بھی مانتے ہیں کہ یہ دونوں مبارک شہر موجود ہیں، کیونکہ انہوں نے کثیر لوگوں سے سن رکھا ہے، جس کے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور بعض چیزوں کے موجود ہونے کا دلائل کی وجہ سے یقین آجاتا ہے۔

الزامی جواب: جب بعض چیزوں کا ثبوت واضح ہے جیسے سورج اور چاند، تو ان کی نفی کا قول باطل ہو گیا جب نفی باطل ہے تو ثبوت واضح ہو گیا، اسی سے واضح ہو گیا "حقائق الاشیاء ثابتة'' چیزوں کی حقیقتیں ثابت ہیں۔

باطل نظریات والوں کے باطل دلائل:

وہ کہتے ہیں حسی چیزیں حواس سے معلوم ہوتی ہیں اور حس سے کئی مرتبہ غلطی ہو جاتی ہے، جس طرح بھینگا

شخص ایک کو دو دیکھتا ہے۔ اور صفراوی مرض والا شخص میٹھی چیز کو کڑوا پاتا ہے۔ لیکن ان جہلاء کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ عوارضات یا مرض کی وجہ سے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور صحت کی حالت میں اور عارضہ سے محفوظ صورت میں احکام علیحدہ ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کی باطل دلیل یہ ہے کہ بدیہی چیزوں میں بھی اختلاف ہوتا ہے لھذا بدیہی چیزوں کے وجود کا بھی کوئی یقین نہیں ہوتا۔

ان کی یہ دلیل بھی باطل ہے کیونکہ کسی چیز کی طرف تصور کا نہ پایا جانا اس کے وجود کی نفی نہیں کرتا۔

لاادریہ فرقہ سے مناظرہ ممکن نہیں:

کیونکہ وہ ہر چیز کے وجود کا انکار کرتے ہیں، وہ یہی کہتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ یہ موجود ہے یا نہیں۔ ان سے مناظرہ کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو کسی سوٹے سے خوب مارا جائے، اگر وہ سوٹے کے وجود کا اقرار کرلیں تو ٹھیک ہے، ورنہ ان کی پٹائی جاری رکھی جائے، اور یہی کہا جائے کہ تمہارے مذہب کے مطابق ہم پر کوئی گناہ نہیں، ہم تو وہ چیز چلا رہے ہیں جس کے وجود کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ (ماخوذ از شرح عقائد و نبراس)

متواتر خبر علم یقین کا فائدہ دیتی ہے:

متواتر خبر وہ ہے جو اول زمانہ سے لے کر بعد تک اتنے آدمیوں سے سنی گئی ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو۔

سمنیہ اور براهمہ فرقے:

یہ دونوں فرقے باطل ہیں، کیونکہ یہ خبر متواتر کا انکار کرتے ہیں۔

سمنیہ: (بضم السین وفتح المیم وقد تسکن) یہ پہلے لوگوں میں پائے گئے ہیں، بت پرست ہیں، یہ اپنے آپ کو ایک بت سومنات کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سمنیہ کہلائے۔ سومنات بہت بڑا بت تھا یہ لوگ دور دراز علاقوں سے اس کی طرف سفر کرتے تھے اور گمان کرتے تھے کہ اس میں غیر اختیاری حرکات پائی گئی ہیں، جو شخص اس کی طرف زیارت کیلئے آتا ہے اس کی روح کسی انسان کی طرف ہی لوٹے گی، کسی اور کی طرف نہیں لوٹے گی۔ یہ تناسخ (روح کا کسی انسان کسی حیوان کی طرف منتقل ہونا) سرے سے باطل ہے۔

براهمہ: یہ لوگ اپنے بت برہام کی طرف منسوب تھے، پھر اسی قوم کے ایک سردار برہمن (جس کا نام بت کے نام کی مناسب سے برہمن رکھا گیا) کی طرف منسوب تھے، ہندو قوم تھی۔ (ماخوذ از شرح عقائد و نبراس)

فرشتے، جنات اور نیچری مذہب:

فرشتوں اور جنوں کا نیچری مذہب والوں نے انکار کیا ہے اور اپنی طرف سے منگھڑت تاویلیں پیش کی ہیں اس میں کوئی تعجب نہیں، کیونکہ ہر دور میں حق کے مقابل باطل رہا، لیکن ﴿اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا﴾ بیشک باطل مٹ جانے والا ہے۔ نیچری مذہب کسی وقت زور و شور پر تھا، پھر مٹ گیا، آجکل پھر اس کے پجاری دندنا رہے ہیں، لیکن انشاء اللہ پھر مٹ کر رہیں گے، اسلئے کہ ﴿اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا﴾ معاذ اللہ میرا اور تیرا کلام نہیں بلکہ یہ تو رب قدوس کا کلام ہے جو "اصدق الصادقین" اور "اصدق القائلین" ہے۔

اقسام ملائکہ:

فرشتوں کی چند قسموں کا صراحۃ قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے، ان کا انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے سورج کا انکار کر دیا جائے۔

(۱) فرشتوں کی ایک قسم حاملین عرش ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک نے یوں فرمایا ﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ﴾ (وہ جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں)

(۲) دوسری قسم فرشتوں کی یہ ہے جو عرش کے ارد گرد طواف کرنے والے ہیں، ان کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ اور تم دیکھو گے ان فرشتوں کو جو عرش کے ارد گرد کو ڈھانپے ہوئے ہیں، تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔

(۳) اکابر ملائکہ جن میں جبریل و میکائیل کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ﴾ جو شخص دشمن ہے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائل کا تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

جبریل کے چند اوصاف قرآن پاک میں ذکر کیے گئے۔

(۱) شدید قوت والا ہونا ﴿عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی﴾ سکھایا آپ کو شدید قوت والے نے۔

(۲) روح امین آپ کا وصف ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ آپ پر نازل کیا روح امین نے۔

(۳) آپ کا اور لقب "روح قدس" ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ جب تائید دی آپ کو روح قدس کے ذریعے۔

اسرافیل: کا ذکر احادیث میں کثرت سے ہے، ان کے صور پھونکنے کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے ﴿یَوْمَ

﴿يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ جس دن صور پھونکا جائے گا۔ چونکہ احادیث میں بہت واضح طور پر مذکور ہے کہ قیامت کو صور پھونکنا اسرافیل کا کام ہوگا۔

عزرائیل: کا ذکر بھی احادیث پاک میں کثرت سے آیا ہوا ہے، ان کا لقب ملک الموت ہے، جسے قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے ﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ فرمادو تمہیں فوت کرتا ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

(۴) ملائکہ کی چوتھی قسم وہ ہے جو عزرائیل کے ساتھ ہوتے ہیں، روح اگرچہ عزرائیل قبض کرتے ہیں لیکن روح کے لپیٹنے وغیرہ کے کاموں میں وہ معاون ہوتے ہیں، اگرچہ مجازی طور پر وفات کی نسبت ان کی طرف بھی کردی گئی، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک پر موت آتی ہے تو اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) فوت کرتے ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ کاش کے آپ دیکھتے جب کافروں کو ملائکہ فوت کرتے ہیں (ان کے چہروں اور سرینوں پر مارتے ہیں)

(۵) ملائکہ جنت یہ وہ فرشتے ہیں جو جنت میں جنتی لوگوں کو سلام اور خراج تحسین پیش کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ٥ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ وہ داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے (اور کہیں گے) تم پر سلام ہو کہ تم نے صبر کیا کتنا اچھا ہے آخرت کا گھر۔

(۶) ملائکہ جہنم یہ وہ فرشتے ہیں جو جہنم والے لوگوں پر مقرر رہوں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ اس (جہنم) پر مقرر ہیں انیس (فرشتے) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً﴾ اور نہیں بنائے جہنم کے محافظ سوائے فرشتوں کے، یعنی جہنم کے محافظ فرشتے ہی ہیں۔ ان جہنم کے فرشتوں کے سردار کا نام مالک ہے، رب تعالیٰ نے اسے یوں بیان فرمایا ﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک چاہئے کہ فیصلہ کر دے ہم پر تمہارا رب اس کل فریق کا نام زبانیہ ہے، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ چاہئے کہ وہ اپنے ہم مجلسوں کو بلائے، ہم اپنے زبانیہ کو بلا لیتے ہیں۔

(۷) بنی آدم پر موکل ومحافظ، رب تعالیٰ نے ان کا ذکر یوں فرمایا ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ اور اس کے دائیں اور بائیں ایک محافظ بیٹھا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ آدمی کی ہر بات پر ایک سخت نگہبان ہے اور ارشاد فرمایا ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ﴾ اس کے آگے اور پیچھے مقرر

ہیں (فرشتے) (جو اس کے حفاظت کرتے ہیں اللہ کے امر سے) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ اور وہ بھیجتا ہے تم پر حفاظت کرنے والے فرشتے۔

(۸) ملائکہ کی آٹھویں قسم وہ ہیں جو لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں، جن کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا ﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾ اور بیشک تم پر مقرر ہیں مکرم لکھنے والے (فرشتے) جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

(۹) نویں قسم فرشتوں کی وہ ہے جو اس عالم کے احوال پر مقرر ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں وہی مراد ہیں۔ ﴿وَالذّٰرِيَاتِ ذَرْوًا ○ فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا ○ فَالْجَارِيَاتِ يُسْرًا ○ فَالْمُقَسِّمَاتِ اَمْرًا ○﴾ قسم ہے ان فرشتوں کی جو آندھی چلاتے ہیں، پھر بادل اٹھاتے ہیں، پھر نرم نرم ہوائیں چلاتے ہیں، پھر حصے تقسیم کرتے ہیں۔

فرشتوں کے مختلف اوصاف مذکور ہیں:

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں فرشتوں کے کئی اوصاف ذکر کیے گئے ہیں۔

وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے درمیان واسطہ ہیں، رب تعالیٰ نے اس وصف کو یوں ذکر فرمایا ﴿جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا﴾ ملائکہ کو (انبیاء کرام کی طرف) بھیجا ہوا بنایا گیا۔ اور ارشاد فرمایا ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا﴾ اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے ملائکہ سے (انبیاء کرام کی طرف) بھیجے ہوؤں کو۔

فرشتے عبادت گذار اور سجدہ کرنے والے ہیں ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ بلکہ وہ عبادت گذار مکرم ہیں۔ اور ارشاد فرمایا ﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ وہ تسبیح بیان کرتے ہیں رات اور دن میں وہ تھکتے نہیں۔

اور ارشاد فرمایا ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ وہ سبقت نہیں کرتے اس (رب تعالیٰ) سے بات میں، وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ فرشتوں نے صحابہ کرام کی بدر میں امداد کی "رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾ تمہارے رب نے امداد کی تمہاری پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان لگائے گئے تھے۔

فرشتوں کے بازو اور پر ہیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اُولِيْ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بازو دار بنایا، (پھر بعض کے) دو دو بازو ہیں، بعض کے تین تین اور بعض کے چار چار۔

ملائکہ کی حقیقت:

ملائکہ اجسام لطیفہ ہیں جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور بڑے قوی کام کر سکتے ہیں، انبیاء کرام اور اللہ والوں نے ان کو انسانی شکل میں دیکھا ہے، اور دوسری مختلف صورتوں میں بھی دیکھا ہے۔

جن کی حقیقت:

جن کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، وہ مختلف شکلیں بدل لیتا ہے، جنوں میں مذکر ومؤنث پائے جاتے ہیں۔ جنوں کا تذکرہ قرآن پاک میں بہت جگہ میں ہے، سورۃ جن میں تذکرہ ہی جنات کا ہے دوتین جگہ اور دیکھئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ کافروں نے خدا اور جنوں میں رشتہ قائم کیا۔ اور ارشاد ہوا ﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ﴾ اے جنوں اور انسانوں کے قبیلے اور ارشاد ہوا ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ جنوں اور انسانوں کے شر سے پناہ۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَيَعْبُدُونَ الْجِنَّ﴾ وہ کفار جنوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

شیطان کی حقیقت:

شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا، اس کے مادہ میں ہی ظلمانیت رکھ دی گئی، ابلیس نے آدم علیہ السلام کے مقابل رب تعالیٰ سے کہا ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو مٹی سے۔

تنبیہ: جنوں اور شیطان کی پیدائش آگ سے ہی ہے، اس لئے اصل کے لحاظ پر ایک ہی چیز ہیں، بلکہ جن شیطان کی ہی ذریت (اولاد) ہے۔

جنوں کے مختلف نام:

عرب کے محاورہ میں جنوں پر باعتبار اوصاف کے چند الفاظ بولے جاتے ہیں۔

(۱) جو جن آدمیوں کے ساتھ رہتے تھے ان کو "عامر" کہا جاتا تھا، ہماری زبان میں ان کو "ھمزاد" کہتے ہیں۔

(۲) جو جن چھوٹے بچوں کو ستاتے ہیں، ڈراتے ہیں، دھمکاتے ہیں ان کو "ارواح" کہا جاتا تھا، اہل پسند ان کو بھوت یا آسیب کہتے ہیں۔

(۳) جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہیں، ان کو عرب کے محاورہ میں "شیطان" کہا جاتا تھا۔

(۴) اور جوان سے بھی زیادہ سرکش ہوتے تھے، ان کو "مارد" کہا جاتا تھا۔

(۵) اور جوان سے بھی زیادہ قوی ہوتے تھے ان کو "عفریت" کہا جاتا تھا۔

(۶) اور جو جنگل میں آواز دیتے ہیں اور چیختے ہیں ان کو "ھاتف" کہا جاتا تھا۔

(۷) اور بعض جو مسافروں کو بھولی ہوئی راہ بتلادیتے، ان کو "رجال الغیب" کہا جاتا تھا۔

(۸) اور جو جنگلوں میں "مشعل" وغیرہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں ان کو "شھابہ" کہا جاتا تھا۔

(۹) اور جو رات میں یا بعض اوقات میں بیابان جنگلوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھلائی دیتے ہیں، پھر اچانک کسی اور شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، ان کی پنجابی میں "چھلاوہ" کہا جاتا ہے۔ اہل عرب ان کو "ارواح خبیثہ" کہتے تھے، عملیات والے ان کو "بدروح" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ابلیس کا ذکر قرآن میں جابجا ہے، لھذا آیات کریمہ کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ (ماخوذ از تفسیر حقانی)

نیچری مذہب کی کہانی حقانی کی زبانی:

اصل میں نیچر (نے چر) اگرچہ قدرتی چیزوں پر زیادہ بولا جاتا ہے لیکن جو چیز "من دھن" میں آئے اس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب والے قرآن پاک کو سمجھنے کیلئے اور دین اسلام کو سمجھنے کیلئے مصطفیٰ کریم ﷺ کے اقوال اور صحابہ کرام اور تابعین، اور تبع تابعین اور سلف صالحین کے اقوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ یوں کہیں کہ وہ ان اقوال کو مانتے ہی نہیں، وہ صرف اسی کو مانتے ہیں جو ان کے "نیچر" من، دھن، جی میں آئے۔ (راقم)

جب قرآن پاک کی کثیر آیات فرشتوں کے ایسے حالات پر دلالت کر رہی ہیں کہ وہ کوئی ایسی مخلوق الہی ہے جو اور قسم کی ہے، جسم اور افعال میں ہم لوگوں سے بالکل مغائر ہے۔ اب سید احمد خان صاحب ان آیات کی کہاں تک توجیہ کریں گے اور کہاں تک تاویل کر کے اصلی معنی بدل کر ان قوی بتلائیں گے، قرآن پاک بلکہ توراۃ و انجیل اور وید اور وساتیر کے ماننے والے سے یہ امر ناممکن ہے کہ وہ فرشتوں کا انکار کرے، اور ان کو قوی بتلادے (یعنی سید احمد خان فرشتوں کو نورانی مخلوق نہیں مانتا بلکہ کہتا ہے وہ قوتیں ہیں جن کو ملائکہ کہا گیا ہے) ہاں جو شخص ان کتابوں میں سے کسی کا بھی قائل نہ ہو، اور قدیم اور موجود حکماء کے بھی برخلاف ہو تو وہ جو چاہے سو کرے۔

سید صاحب یا قرآن کا انکار کیجئے یا فرشتوں کا قائل ہو جایئے۔

سر مد گلہ اختصار مے باید کرد　　　یک کار ازیں دو کار مے باید کرد

یاتن برضائے دوست مے باید داد   یا قطع نظر زیارے باید کرد

(اسلام کے خلاف) ہمیشہ گلہ وشکوہ کرتے ہو، اس میں کمی کرلو، دو کاموں میں سے ایک کام کرلو یا اپنے آپ کو رب اور اس کے رسول ﷺ کا بنالو یا ان سے بیزاری کا واضح اعلان کردو۔ (از مقدمہ تفسیر حقانی ص ۱۶)

اسی مضمون کو کسی نے اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا   سراسر موم یا سراسر سنگ ہو جا
دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا   سراسر فقیر یا سراسر ملنگ ہو جا
دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا   سراسر مؤمن یا سراسر قادنیوں کے سنگ ہو جا
(راقم)

نیچری مذہب کا ایک اور قول باطل:

فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور شیطان کا نہ کرنا ایک معما ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ قوی ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی اور بھیمہ (چوپاؤں کی صفت) نے نہ کی"

قول باطل کارد:

"سید صاحب" فرمایئے اگر شیطان آدم کی قوت بھیمہ تھی تو وہ آدم کا وصف بنے گا، پھر اس نے کیا سمجھ کر کہدیا "کہ میرا مادہ آتش ہے۔ اور **جواب** یہ ہے کہ اس میں اجتماع ضدین لازم آئے گا، کیونکہ جناب نے ملائکہ سے مراد قوت ملکیہ لی اور ان کو آدم کیلئے مسخر بنایا تو اب آدم کی قوت بہمیہ کیا سرکشی کرسکتی ہے، اور قوت ملکیہ کی اطاعت کا کیا مقصد بیان کروگے؟ اور تمہارا یہ کہنا کہ قوت بہمیہ نے سرکشی کی وہی شیطان ہے یہ سراسر قرآن پاک کے مخالف ہے، اس لئے کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ بیشک میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس آیۃ کریمہ سے بہت واضح ہے کہ اللہ کے بندوں پر شیطان کو غلبہ حاصل نہیں۔ اور تمہارے قول کے مطابق، قوت بھیمہ ان پر غالب نہیں، پھر یہ بھی کہنا کہ آدم کی قوت بھیمہ نے آدم کی نافرمانی کی اور آدم کی قوت ملکیہ نے آدم کی نافرمانی کی اور آدم کی قوت ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی۔ کیا یہ قرآن پاک کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقی معانی کو چھوڑ کر بغیر کسی قرینہ اور بغیر کسی وجہ کے مجازی معانی بیان کرنا عقل ونقل کے مخالف ہے۔

اگر یہی حال رہا تو سارے قرآن پاک کو معاذ اللہ اپنی مرضی سے بیان کرنا لازم آئے گا، جو جی میں آیا وہی

کہہ دیا، نماز ادا کرنے کا مطلب ہے، دعاء کرلیا کرو، روزہ رکھنے کا مطلب ہے، کچھ دیر کیلئے باتوں سے رک جایا کرو، چور مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سرزش کرو، وہ چوری سے باز آجائیں، اس طرح اس کے چوری کرنے سے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ (معاذ اللہ) اس طرح جس کے دل میں جو آئے گا وہی کہتا رہے گا۔ حقانی نے کہا اب میں دیکھتا ہوں کہ جہاں کہیں سید صاحب قرآن کے معنی متعارف چھوڑ کر برخلاف سلف وخلف الگ راہ چلے ہیں اور دل کھولکر کلام الٰہی میں اپنے آزادنہ خیالات کو دخل دیتے ہیں، وہاں کیا قرینہ ہے اور کونسا امر ہے جو معنی متعارف کو (کہ جس کو پیغمبر علیہ السلام کے ہم زمان وہم زبان سمجھتے آئے ہیں) صحیح نہیں ہونے دیتا؟ اور کونسی مشکل سید صاحب کو پیش آئی جس نے تنہا جمہور اہل اسلام بلکہ کل اہل ادیان یہود وعیسائیوں کے مخالف ہوکر ملائکہ اور جن اور شیطان کے معنی میں یہاں تک تغیر کیا کہ سرے سے کلام ہی کو الٹ پلٹ کردیا۔ (مقدمہ حقانی ص ۱۹)

تنبیہ: افراط وتفریط سے بچنے والے انسان محفوظ رہتے ہیں، جو افراط وتفریط میں مبتلاء ہوتے ہیں وہی بھٹکنے والے ہوتے ہیں۔ قوت وہمیہ کبھی اس قدر پست ہوتی ہے کہ احکام عقل صرف کو قابل العمل نہیں رہنے دیتی، اسی لئے کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہی لوگ جن وملائکہ اپنی وہمی باتوں کو سمجھنے لگتے ہیں، صدہا عورتیں بلکہ بہت سے سادہ آدمی اپنی قوت وہمیہ کے زور سے کسی شے کو جن وبھوت فرض کرلیتے ہیں، اسی سبب سے ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر جنوں، بھوتوں کا اثر ہے، حالانکہ ان کے وہم کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اور قوت وہمیہ کبھی اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہی لوگ ان امور (چیزوں) کو بے اصل سمجھ کر یہاں تک وہم کے گھوڑے دوڑاتے ہیں کہ درحقیقت ان چیزوں کا صفحہ عالم پر وجود ہی نہیں سمجھتے، اور جو چیز محسوس نہ ہو اس کو لاشے محض کہتے ہیں (یعنی یہ تو حقیقت میں کوئی چیز ہی نہیں) پھر جب اس خیال کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے تو جو چیزیں ان کے نزدیک اسباب ظاہرہ پر مبنی نہ ہوں سب غلط ہوجاتی ہیں، نہ پھر وہ اثر دعاء کے قائل رہتے ہیں، اور نہ کبھی کسی نبی یا ولی کے معجزہ یا کرامت کو حق مانتے ہیں، نہ جنوں اور شیطان کے جداگانہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں، نہ وہ خدائے قدیر کی بےانتہاء قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو اس درجہ سے بھی زیادہ ترقی کرجاتے ہیں، زیادہ ہی روشن خیال ہوجاتے ہیں وہ ملحد (بے دین) ہوجاتے ہیں، نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۰)

نیچری اور دہریوں کا اور قول باطل:

یہ کہتے ہیں نہ کوئی خدا ہے، نہ رسول ہے کوئی چیز حلال نہیں، اور کوئی چیز حرام نہیں، نہ قیامت آتی ہے، اور نہ

ہی آخرت میں کچھ جزاء وسزاء۔ ہر زمانہ کے اہل عقل ہی پیغمبر ہیں (العیاذ باللہ) انہوں نے ہی فرضی طور پر جزاء وسزا مقرر کی ہے، اس وقت کی مناسب چیزوں کو فرض کیا اور فرضی جنت کا وعدہ دیا، اور اس وقت کی نامناسب چیزوں کو حرام کیا، اور اس پر فرضی دوزخ اور سزا سے ڈرایا، پھر حد سے وہ یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے جھوٹے نبیوں کیلئے جھوٹی نبوت کے دروازے اس باطل نظریے سے کھولے "کہ نبوت کسی پر ختم نہیں، ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر شہر میں، اور ہر قوم میں ایک نبی ہے" وہ جن باتوں کو حسب زمانہ بہتر بتلادے وہ فرض ہیں، اور جن کو نامناسب سمجھ کر منع کر دے وہ حرام ہیں ہر ملک، اور ہر قوم، اور ہر زمانہ کے واجبات اور محرمات کے احکام الگ ہیں، جو احکام نیچر کے موافق ہیں وہ فرض ہیں ورنہ حرام ہیں، "العیاذ باللہ من هذه الکفریات" یہ سب باتیں دراصل قوت وہمیہ کے افراط سے ہیں، حد سے تجاوز کی وجہ سے وہ کفر والحاد میں مبتلاء ہو گئے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۰)

سید احمد خان کا جبریل ومیکائیل کا انکار درحقیقت وحی کا انکار ہے:

سید صاحب اپنی تفسیر کے ص ۱۴۰ میں بیان کرتے ہیں "جبریل ومیکائیل یہودیوں نے فرشتوں کے لئے نام مقرر کئے تھے، ان کے ہاں یہ فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں، مگر اس کا ثبوت نہیں، کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحف انبیاء میں کوئی صفت صفات باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی، پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔

اس قول کا رد: دیکھئے کتاب دانیال باب نمبر ۸ میں یوں ہے "ایک آواز آئی کہ اے جبریل اس شخص کو اس رویاء (خواب) کا مطلب سمجھادے" اگر دانیال آپ کے نزدیک کے نبی نہیں ہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ دانیال پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جبریل کا نام صاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح انجیل باب ۱۹ میں یوں ہے فرشتے نے خواب میں اس سے کہا میں جبریل ہوں جو خدا کے حضور رہتا ہوں۔ (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

الزامی جواب: تمہارا یہ کہنا کہ "صحف انبیاء...... الخ" دعوی بلا دلیل ہے وہ کونسا صحیفہ ہے کہ جس میں جبریل ومیکائیل کو صفت باری تعالی لکھا ہے، ذرا اس کا تو حوالہ دیجئے۔

سید تمہارا اور یہ کہنا "رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا" یہ آپ کیلئے ہی مضر (نقصان دہ) ہے، کیونکہ جب بقول آپ کے فرشتہ کوئی جداگانہ وجود ہی نہیں رکھتا، تو پھر ان اہل کتاب نے (یہود ونصاری نے) کس چیز کا نام فرشتہ رکھا تھا؟ اگر بالفرض اس صفت کو فرشتے کا نام دے دیا جائے تو فرشتے کی علیحدہ وجود کی نفی

کیسے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکے گا کہ فرشتے علیحدہ علیحدہ مخلوق ہیں، اور بقول تمہارے، قوت عاقلہ کو بھی فرشتہ کہہ لیا گیا، تمہاری اس بات کو مان بھی لیا جائے تو فرشتوں کا علیحدہ وجود ختم نہیں ہو سکتا، بلکہ تمہارے اپنے قول سے ہی ثابت ہو جائے گا کہ فرشتوں کا علیحدہ وجود ہے جو رب تعالیٰ کی مخلوق ہے۔

تحقیقی جواب: جب قرآن مجید میں لفظ ملائکہ کا انہیں معنی میں استعمال ہوا کہ جن معنی میں یہودی استعمال کرتے ہیں تھے تو الحمد للہ آپ ہی کے اقرار سے فرشتوں کا وجود جداگانہ قرآن پاک سے ثابت ہو گیا، کیونکہ بقول آپ کے یہودی فرشتوں کا جداگانہ وجود اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق سمجھتے تھے، اب آپ کا اس معنی سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے، ہمارے لیئے تو اسی قدر کافی ہے کہ قرآن میں لفظ انہیں معنی پر وارد ہے، کو جس کو اہل اسلام نے تسلیم کیا ہے، بلکہ یہود نے بھی یہی معنی تسلیم کیا ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے آپ قرآن پاک کو صحیح مان کر فرشتوں کے وجود کو تسلیم کرلو، یا یہود کے نظریات کو صحیح مان کر، فرشتوں کے وجود کو نہ مانو۔ (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

نیچری مذہب: مگر ہمارے ہاں کے علماء نے بھی یہودیوں کی تقلید سے ان کو فرشتوں کے نام قرار دیئے۔

اس کا رد: سید صاحب یہ طریقہ اچھا نہیں کہ علماء کو یہودیوں کی طرح قرار دینا، علماء کا تو وہ مذہب ہے جو قرآن پاک نے پیش کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ دین اسلام کے مطابق یہودیوں نے بھی فرشتوں کو جداگانہ مخلوق تسلیم کیا ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۱)

راقم کا تو موقف ہی یہ ہے کہ سید صاحب نے یہود و نصاریٰ کی بظاہر بعض مقامات میں مخالفت کی آڑ میں کام انہیں کا کیا، نام نہاد مسلمانوں کو ان کے نقش قدیم پر ہی چلایا، قرآن پاک کے غلط مطالب پیش کر کے دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی ناکام کوشش کی، کیونکہ دین اسلام کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔

نیچری مذہب:

(جبرئیل) عبری (عبرانی) میں اس کے معنی قوت اللہ یا قدرت اللہ کے ہیں، یہ لفظ دانیال پیغمبر کی کتاب میں آیا ہوا ہے۔ الخ۔ لوقا نے جو انجیل لکھی ہے اس کے پہلے باب میں جبرئیل کا ذکر ہے۔

حقانی: اس سہو و نسیان کا کیا ٹھکانا ہے، ابھی ابھی تو آپ فرما چکے ہیں کہ اس کا ثبوت نہیں، کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا یہ فرشتوں کے نام ہیں، آپ کو لازم تھا کہ اس پیرانہ سالی میں کہ انسان کے حواس بجا نہیں رہتے، اس بڑی بھاری بات کا بیڑا نہ اٹھاتے کہ تیرہ سو برس کے بعد میں ہی تو ایک ہوں کہ جو قرآن کے اصلی معنی سمجھا ہوں، اور سب

اگلے پچھلے غیر محقق تھے۔ (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

نیچری مذہب: فرشتے کوئی علیحدہ مخلوق نہیں، بلکہ ان سے مراد قوی اور صفات باری تعالی ہیں، اگر چہ میکائیل کا ذکر بھی دانیال کی کتاب میں ہے، اور ان کی خوابوں میں یہ لفظ آیا ہوا ہے، مشاہدات یوحنا میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے۔ نیچری مذہب کے اقوال باطلہ میں اور یہ ہے ''علماء یہود بھی سمجھتے کہ جبرئیل بڑے زبان دان ہیں۔ الخ۔ غالبا اسی سبب سے مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سن کر یاد کرتے تھے، اور آنحضرت کو سناتے تھے۔

اس کا رد: باوجود اس اقرار کے کہ انبیاء سابقین ان الفاظ کو انہیں معانی میں استعمال کرتے تھے پھر انکار کی کیا وجہ؟ جبریل کے وحی لانے کے متعلق معاذ اللہ مسلمانوں کا من گھڑت عقیدہ نہیں، بلکہ وہی عقیدہ ہے جو قرآن پاک نے پیش کیا ہے، ارشاد باری تعالی ﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى﴾ اور ارشاد فرمایا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ ان آیات کریمہ میں جبریل کے وحی لانے کا ذکر ہی تو ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جبریل کے وحی لانے کا قول یہود کی تقلید ہے، تو اس سے معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ جب رب تعالی نے بیان فرما دیا ہے کہ جبریل وحی لاتا ہے، تو وہ یہود کا مقلد ہوگا۔

آیئے حقانی کے الفاظ من وعن دیکھیں ''پھر یہ تقلید یہود کی بدگمانی آپ خدائے پاک پر کریں، آپ کو اختیار ہے، مگر اس قدر عرض باقی ہے کہ جب قرآن مجید بلکہ اس کا منزل (نازل کرنے والا) آپ کے نزدیک ایسا لچر ٹھہرا کہ جس نے ایک غلط امر میں یہودیوں کی تقلید کی، پھر اس کی تفسیر لکھنا، اور اس کو کلام الہی لکھنا اور بے دیکھے خدا کا قائل ہونا محض بے فائدہ ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۱)

نیچری مذہب: بہر حال ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ الفاظ صفات باری پر مستعمل تھے، آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے گئے۔

اس کا رد: کاش آپ ایک آدھ جگہ بھی قرآن مجید اور توراۃ وانجیل سے ان الفاظ کر جو فرشتوں پر بولے جاتے ہیں صفات باری تعالی پر استعمال ہونے ثابت کر دیتے، تب تو تمھاری کسی قدر تمہاری بات کو تسلیم کیا جاتا تمہارے عقلی ڈھکوسلے تو نہیں مانے جاسکتے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۱)

حقانی صاحب نے اگر چہ بطور استفسار (وضاحت طلب کرتے ہوئے) کہا ہے۔'' سید صاحب آپ نے

تو نفی وجود ملائکہ میں بڑی معقول صرف کردی ذرا فرمائیے تو سہی یہ کون سی دلیل ہے جو آپ نے قائم کی "برھان لمی" "یا برھان انی" (مقدمہ حقانی ص ۲۱)

راقم کہتا ہے سید صاحب اوران کی ذریت معنوی کو کیا پتہ "برھان لمی" کیا ہے، اور "برھان انی" کیا ہے یہ تو دینی مدارس کے طلباء ہی جانتے ہیں کہ علت سے دلیل معلول پر پکڑیں، یعنی حقیقت میں جو علت ہو، اسے ہی قضیہ میں بھی علت بنایا گیا تو "برھان لمی" اور اگر دلیل معلول سے علت پر پکڑی گئی تو "برھان انی" دینی مدارس کے تیسری کلاس کے بچے انشاء اللہ یہ بتائیں گے۔

نیچری مذہب کی دلیل کا کیا کہنا:

دلیل یہ دی گئی "ہم کو کچھ شک نہیں کہ جو الفاظ صفات باری تعالی پر مستعمل تھے آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔

کیسی باطل دلیل:

یہی دعوی اور یہی دلیل "جب دلیل عین دعوی ہو، یا جزء دعوی ہو، یا مساوی دعوی ہو یا جزء مساوی دعوی ہو تو اسے مصادرہ علی المطلوب کہا جاتا ہے، جو بالاتفاق مردود ہے۔ باطل دلیلیں پیش کرنا باطل مذہب والوں کا خاصہ ہے۔
(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۲ و حاشیہ جامی)

نیچری مذہب کا بیہودہ کلام:

قرآن مجید میں اس قسم کا کلام غیر مقصود نہایت کثرت سے ہے، مشرکین واہل کتاب کے عندیہ میں بہت سی ایسی باتیں سمائی ہوئی تھیں جن کا دراصل کچھ وجود نہ تھا، یا وجود تھا مگر اس کی جو حقیقت کہ وہ سمجھتے تھے دراصل وہ نہ تھی، یا وہ بات ظاہر میں دکھائی دیتی تھی اور بطور غلط العام یا باعتماد مشاہدہ اسی کو واقعی سمجھتے تھے، حالانکہ حقیت اور اصلیت بر خلاف اس کے تھی، اور قرآن مجید کو اس سے بحث مقصود نہ تھی، اس لئے اس کو اس طرح بیان کیا جس طرح مشرکین اور اہل کتاب خیال کرتے تھے۔

بیھودہ کلام کا رد:

اللہ تعالی کے کلام کو غیر مقصودی کہنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا، قرآن پاک کی آیات کا غیر مقصودی ہونا آپ سے قیامت تک بھی ثابت نہیں ہو سکے گا۔ یوں ٹکریں رجما بالغیب ضیعف الایمان لوگوں کے دل میں شبہ ڈالنے

کیلئے، آپ جو چاہئے کہے جائیے، قرآن پاک کی آیات مقصودی ہیں، غیر مقصودی ثابت کرنا سوائے اسلام سے دور ہونے کے اور کچھ نہیں۔

اس بیھودہ کلام کا رد: قرآن پاک کی آیات مقصودی ہیں، کیونکہ اللہ تعالی کا کلام کبھی غیر مقصودی نہیں ہوسکتا اس میں چند وجوہ سے بات کرنا ممکن ہے۔

(۱) اول یہ کہ ہر کلام کے مقصودی ہونے یا غیر مقصودی ہونے کو سمجھنے کیلئے، اس کلام کو پیش کرنے والے کے ہمز مان وہمزبان ہی لائق ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے صحبت یافتوں اور ہر وقت آپ کے پاس بیٹھنے والوں خالص عرب کو (جن کے محاورہ میں قرآن اترا) کبھی غیر مقصودی ہونا معلوم نہ ہوا، اور ان کے بعد سے اب تک کسی ملک میں کسی زبان دان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی، اور نہ ہی کسی مفسر کو سوجھی، اگر بیہود بات سوجھی تو تیرہ سو برس بعد ایک ہندی کو سوجھی کہ نہ جس کو صرف سے آشنائی نہ لغت سے تعارف نہ زبان عرب قدیم وجدید سے کچھ مس، اور جس کی عقل سلیم کا یہ حال کہ نہ اس کی دلیل ودعوی میں کچھ ربط نہ اس کو یہ تمیز کہ یہ دلیل میرے دعوی کیلئے مفید ہے یا مضر۔

(۲) دوم ہر کلام کا مقصودی ہونا یا غیر مقصودی ہونا اس کے سیاق وسباق سے معلوم ہو جاتا ہے، جب ان آیات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں غیر مقصودی ہونے کی بو بھی نہیں آتی، بلکہ متعدد جگہ میں نئے نئے اسلوب سے وجود ملائکہ کو بلکہ اعجاز انبیاء کو بیان کیا ہے اور کوئی قرینہ غیر مقصودی ہونے کا ہے ہی نہیں۔

(۳) سوم یہ چیزیں کچھ قرآن ہی میں مزکور نہیں بلکہ ہر کتب سماویہ میں اور ہر نبی کی زبان سے ان کا بیان منقول ہے، پھر اس اتنی بڑی غلطی کو خدائے پاک نے اپنی ہر کتاب میں کیوں دخل دیا۔ اور اس کے انبیاء علیھم السلام نے کیوں غلط وجود کو ثابت کیا۔ کیا لوگوں کو دھوکا دینا منظور تھا (معاذ اللہ) کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ تیرھویں صدی میں سید احمد خان صاحب بہادر دنیا سے نرالے محقق اور فلاسفر ہماری اس دھوکا بازی کو طشت از بام کردینگے؟

(۴) اگر یوں بغیر قرائن ہر کلام کو غیر مقصودی اور مجازی کہہ دیا کریں تو پھر اب سید صاحب کے انکار کا بھی کیا اعتبار ہے کچھ عجب نہیں کہ ملحدوں کیلئے انہوں نے بطور کلام غیر مقصودی کا انکار کر دیا ہو۔ راقم کے نزدیک تو سید صاحب نے کام ہی یہود ونصاری اور ملحدوں کا کیا ہے۔

(۵) ایمان بالغیب میں اول درجہ میں خدا بجمیع صفاتہ، دوم درجہ میں ملائکہ ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ جب ملائکہ کا وجود کلام غیر مقصودی سے آپ نے اڑا دیا، تو اب آپ کے شاگرد اللہ

تعالی کے متعلق یہی احتمالات قائم کر کے دہریئے بن رہے ہیں تو اس پر کوئی تعجب نہیں، جیسا تربیت دینے والا ہو گا۔ایسے ہی اس کے تربیت یافتہ ہوں گے،اس کی ذریت معنوی آجکل روشن خیالی کا پرچم ہاتھ میں لئے دین اسلام کا مزاح اڑا رہی ہے اور عورت کو زیادہ سے زیادہ بے حیا بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص۲۳)

نیچری مذہب کی اور ناقص دلیل:

توراۃ اور صحف انبیاء اور انجیل میں فرشتہ کے لفظ کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں آیا ہے، کتاب ۲ سموئیل باب ۲۴ درس ۱۶، ۱۷ میں، اور کتاب ۲ ملوک باب ۱۹ اور زبور داود وباء پر فرشتہ کا اطلاق ہوا، اور زبور داؤد باب ۴ میں ہواؤں پر فرشتوں کا اطلاق کیا ہے۔

اس من گھڑت دلیل کا رد:

یہ دوسری دلیل نفی وجود ملائکہ پر آپ نے قائم کی ہے، خلاصہ یہ کہ لفظ فرشتہ مشترک، اس کے ایک معنی نہیں ہو سکتے، جناب عالی کو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ اشتراک لفظ کی صفت ہے، یا معنی کی، اب ہم پوچھتے ہیں کون سا لفظ فرشتہ مشترک ہے آیا ملک، یا فرشتہ، یا کوئی اور؟ اور یہ ظاہر ہے کہ تورات وانجیل کی اصلی زبان عبرانی ہے جو فارسی اور عربی سے غیر ہے، اور ملک لفظ عربی ہے اور فرشتہ فارسی ہے۔ میں حیران ہوں کہ عبرانی میں ان دونوں میں سے کون سا لفظ مشترک قرار دیا گیا ہے؟ اگر لفظ فرشتہ ہے تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں کیونکہ اس سے ہماری بحث نہیں، قرآن پاک عربی زبان میں ہے فارسی میں نہیں۔

اگر تم کہو کہ ہماری مراد لفظ ملک ہے تو یہ قابل تسلیم نہیں کہ عبرانی میں یہ لفظ ان معانی میں استعمال ہوا ہو جو تم نے بیان کئے۔اور آپ یہ کہنا کہ کتاب ایوب باب نمبر ا کتاب اول سموئیل باب نمبر ۱۱ اور انجیل لوقا باب نمبر ۷ فرشتہ کا لفظ عام ایلچیوں پر بولا گیا ہے آپ کے تبحر علمی کی دلیل واضح ہے کہ جن مقامات کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہاں لفظ فرشتہ بولا ہی نہیں گیا۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص۲۴)

نیچری مذہب کی اور باطل دلیل:

ملائکہ کا اطلاق ان قدرتی قوی پر ہے جن سے انتظام عالم مربوط ہے اور ان شئونقدرت کاملہ پروردگار پر جو

اس کی ہر ایک مخلوق میں یہ تفاوت درجہ ظاہر ہوتی ہیں، ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے سورۃ والنازعات سے اس کا بخوبی ثبوت ہے، اس کے چار جملوں میں مفسرین میں اختلاف ہے مگر پانچواں جملہ ﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا﴾ کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ "مدبرات" سے ملائکہ مراد ہیں، پس غور کرنا چاہئے کہ "مدبرات" سے کیا مراد ہے؟ یہی قوی ہیں جن کو خدا تعالی نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام امور عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔

اس باطل دلیل کا رد:

آپ کی اس باطل دلیل میں سب سے زیادہ غلطیاں ہیں، آپ کی پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ کے اقوال میں تضاد ہی تضاد ہے، آپ نے اپنے دعوی کو ترک کر دیا ہے آپ نے پہلے بیان کیا ہے کہ ملائکہ ''خدا کی صفات پر بولا گیا ہے'' اور اب اس سے اعراض کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ ملائکہ سے مراد ''قوی مدبرہ عالم'' ہیں، اور تھوڑا آگے چل کر جبریل کو تم نے ملکہ نبوت کہہ دیا ہے۔

اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے تمہاری کون سی بات صحیح ہے؟ اگر تم یہ کہو کہ کوئی بات نہیں ان تینوں کا مطلب ایک ہی ہے (جیسا کہ آجکل پڑھے لگے بے وقوفوں نے دین اسلام کا مزاح ایسے جملوں سے ہی اڑانا شروع کیا ہے'' کچھ نہیں ہوتا'' کچھ فرق نہیں پڑتا، کچھ مضائقہ نہیں، دین میں تنگی نہیں عورتوں کو شمع محفل بناتے رہو، وغیرہ) تو یہ غلط ہے ان تینوں کا مطلب علیحدہ علیحدہ ہے ''ملکہ نبوت، صفات خدا تعالی، قوی مدبر عالم'' آپس میں غیر اور مخالف ہیں کیونکہ ملکہ نبوت جس کو تم جبریل کہہ رہے ہے یہ تو نبی کی صفت ہے ہوسکتا ہے بلکہ یقینی بات ہے تمہیں ''حال اور ملکہ'' دو صفات میں فرق بھی معلوم نہیں کہ حال کیا ہے اور ملکہ کیا ہے یہ تو کسی دینی مدرسہ کے طالب علم سے پوچھئے وہ تمہیں بتائے گا کہ حال کیفیت غیر راسخہ کا نام ہے اور ملکہ کیفیت راسخہ کا نام ہے جب نام ملکہ نبوت ہے تو یہ صفت جبریل کی کیسے یہ تو اسی کی صفت ہے جس کا وہ ملکہ ہے۔ پھر ظاہر بات ہے کہ نبی کی صفت (معاذالله) رب کی صفات کا عین نہیں کیونکہ رب تعالی کی صفات قدیم ہیں اور بندہ کی صفات حادث ہیں۔ پھر قوی مدبرات عالم جو نباتات جمادات حیوانات وغیرہا میں پائے جاتے ہیں ان دونوں سے غیر ہیں اس پریشان بیانی کا کیا ٹھکانا کبھی کیا کہہ دیا کبھی کیا۔

یہ سب غلط بیانیوں کی وجہ سے ہوا، نئی راہ نکالنے، یہود و نصاری اور ملحدین کے کام کرنے نے تمہیں خبط حواسی کا شکار کر دیا کاش کہ تم اسلام کا کام کرتے۔ اور آپ کا یہ کہنا کہ ''مدبرات'' سے مراد قوی مدبرہ عالم ہیں، یہ بھی دعوی بلا دلیل ہے، اسے کیسے تسلیم کر لیا جائے، وہ بھی اس کی زبان سے جس کا وطیرہ ہی ہرزہ سرائی ہو۔ پھر تمہارا یہ کہنا

کہ ''مدبرات'' سے مراد فرشتے ہیں، یہ تو قابل تسلیم ہے، لیکن یہ کہنا کہ اس سے مراد ''قوی'' ہیں یہ غلط ہے، بلکہ اصل بات یہی ہے کہ ''مدبرات عالم'' وہی ملائکہ ہیں جو عالم کیلئے ایسے ہیں کہ جس طرح جسم کیلئے روح مدبر ہے۔

(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۶،۲۵)

نیچری مذهب کا بیهوده، جاهلانه قول:

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں (جبرائیل، اور میکائیل) کے سواء اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں، کیونکہ اور کسی کا نام قرآن میں نہیں ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قوی کو تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لئے تھے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۷)

راقم کے نزدیک تو یہ قول جاہلانہ اور احمقانہ ہے کہ یہودیوں نے یہ نام رکھے ہیں، سید صاحب کو قرآن پاک آتا تو یہ نہ کہتے، رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلاَئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَلَ﴾ ہ نام تو رب تعالی نے ذکر فرمائے ہیں، کیا رب تعالی (معاذ اللہ) یہود کا پابند ہے۔ کاش کہ معمولی عقل ہوتی تو یہ کہنا دشوار نظر آتا، جب عقل ہی چھوڑ جائے تو جو چاہو کہتے پھرو، تمہارے منہ کو کون لگام دے سکتا ہے؟ حقانی صاحب کہتے ہیں ''کسی چیز کا نام مذکور نہ ہونے سے اس کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی، فوجی دفتر میں آپ کا نام مرقوم نہیں کیا اس سے آپ کے وجود میں کچھ خلل آ گیا؟

نیچری مذہب کا ایک اور بیودہ قول:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ﴾ اس آیۃ میں وہ ذکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے، تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا۔

اس بیهوده قول کا رد: یہ آپ کا بہتان صریح ہے اہل اسلام میں سے کوئی مفسر ذی علم تو کیا ادنی مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتا کہ فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا کیا تھا، کیونکہ خدا تعالی فرشتوں کی نسبت فرماتا ہے ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (وہ نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی جو اس نے ان کو حکم دیا، اور کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) کیا فرشتوں کا سمجھنے کیلئے سوال کرنا جھگڑا ہے؟ آپ ایسی بے بنیاد باتوں سے جملہ علماء اہل اسلام کو بے اعتبار بنانا چاہتے ہیں۔ (از مقدمہ حقانی ص ۲۷، ۲۸)

راقم کی ''**نجوم الفرقان**'' کے ''جلد دوم'' کا مطالعہ کریں، سید صاحب کے خیالی باطل اقوال کی احادیث مبارکہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رہے گی۔

نیچری مذہب کا انسانیت سے دور باطل قول:

یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہے، ان کو نوری سمجھ کر گورا گورا سفید برف کا رنگ نوری شمع کی مانند باہیں بلور کی سی، پنڈلیاں ہیرے کی سے پاؤں ایک خوبصورت انسان کی شکل نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ فرشتوں کو نادیدہ جسمانی چیزوں پر خیال کرلیا ہے، اور وہ خیال نسل در نسل چلا آیا، دراصل فرشتے کوئی وجود نہیں رکھتے۔

اس انسانیت سے دور باطل قول کا رد:

یہ تمام گفتگو آپ کی شاعرانہ تک بندی ہے، نہ کوئی مسلمان ان کو بلور کی مانند نہ ہیرے کی مانند سمجھتا ہے، ہاں آپ کے بیہودہ مزاج میں یہ بات آئی ہو تو اور بات ہے، انسانیت سے دور شخصیات سے اس قسم کی باتوں پر کوئی تعجب نہیں
(از مقدمہ حقانی ص ۲۸)

ورنہ مسلمانوں کا صاف وشفاف عقیدہ یہ ہے'' **الملک جسم نوری یتشکل باشکال مختلفة لایذکر ولایؤنث**'' فرشتے نورانی مخلوق ہے، مختلف شکلوں میں آتے رہتے ہیں، حقیقت میں مذکر و مؤنث نہیں البتہ گھٹیا چیزوں کی شکلوں میں نہیں آتے یعنی کتے وغیرہ کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ (راقم)

نیچری مذہب کی شاعرانہ گفتگو:

آسمان ان کے رہنے کی جگہ قرار دی، آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کیلئے ان کے پر لگائے۔

اس قول کا رد: یہ تو قرآن پاک کے صریح ارشاد کا رد ہے، شائد نیچری مذہب کے سید صاحب کو قرآن پاک آتا ہی نہیں تھا، ورنہ رب تعالیٰ نے فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے، ﴿**اُولِیۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ**﴾ وہ پروں والے ہیں، دودو، تین تین، چار چار (پروں والے ہیں) فرشتوں کے پر تو رب تعالیٰ نے بیان فرمائے، کسی انسان نے اپنی طرف سے ثابت نہیں کئے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۸)

نیچری مذہب والے شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کے قول کو نہ سمجھ سکے:

بعض اکابر علماء اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں، اور امام محی الدین ابن العربی نے فصوص الحکم

میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ (سید احمد خان)

سید احمد خان کو فصوص الحکم کیا سمجھ آئے، ہر نتھو کھیرا آپ کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا، غلطی کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام قرآن پاک کے ظاہر مطالب بیان کرتے ہیں، پھر کچھ اشارات بیان کرتے ہیں اشارات کو حقائق سمجھ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی ناپاک جسارت کی۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ (فتوحات مکیہ جلد سوم باب ۳۶۹ ص ۴۸۲،۴۸۳،۴۸۴) میں بیان فرماتے ہیں

"ان اللہ لما خلق الارواح النارية والنورية اعنی الملائکة والجان شرک بینهما فی امروهو الاستتار عن اعین الناس مع حضورهم معهم فی مجالسهم وحیث کانوا وقد جعل الله بینهما وبین اعین الناس حجابا مستورا فلانراهم الااذاشاؤاان یظهروا لنا"

بیشک اللہ تعالیٰ نے جب ارواح ناریہ اور نوریہ کو پیدا کیا، یعنی ارواح نوریہ سے مراد ملائکہ ہیں اور ارواح ناریہ سے مراد جن ہیں، فرشتے اور جن اس بات میں مشترک ہیں کہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ لوگوں کی مجالس میں موجود ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہے، ہاں البتہ جب چاہے ان کو ظاہر بھی کر دیتا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ اور یہ فرماتے ہیں:

"والملائکة رسل من اللہ الی الانسان موکلون به کاتبون افعالنا والشیاطین مسلطون علی الانسان بامر الله"

فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں وہ موکل ہوتے ہیں، یعنی ان کے ذمہ نظام لگا دیا جاتا ہے، وہ ہمارے افعال لکھتے ہیں اور شیاطین انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے امر سے مسلط کئے جاتے ہیں۔

شیخ نے اور ارشاد فرمایا:

"ولا یطلق علی الارواح اسم جن الالاستتارهم فالجنة من الملائکة هم الذین یلازمون الانسان ویتعاقبون فینا باللیل والنهار ولانراهم مادة فاذاارادالله عزوجل ان یراهم من یراهم من الانس من غیر ارادة منهم لذلک رفع اللہ الحجاب عن اعین الذین یریدالله ان یدرکهم فیدرکهم وقد یامر الله الملک والجن بالظهور لنا فیتجسدون لنا نراهم اویرفع الله الغطاء منافراتهم رأی العین وقد نراهم اجسادا علی صورة،وقد نراهم لا علی صور بشرية بل نراهم علی صورهم فی انفسهم کما یدرک کل احد منهم نفسه وهو صورته التی هو علیها فان الملائکة اصل اجسامها نور والجان نار مارج والانس ماء تراب ولکن کمااستحال الانس عن اصل ما خلق منه کذلک الملک والجان عن اصل ما خلق منه الی ماهما علیه من الصور"

اور ارواح پر جن کا اطلاق نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، وہ ملائکہ جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، اور رات دن میں آگے پیچھے انسان کے پاس آتے ہیں، ان کو بھی نظروں سے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہہ لیا جاتا ہے، ہم ان کو عام عادت کے مطابق تو نہیں دیکھ پاتے لیکن اللہ تعالیٰ اگر کسی کو دکھانا چاہے تو حجاب اٹھالیتا ہے، اس وقت انسان انہیں دیکھ لیتا ہے، کبھی ملائکہ اور جن کو حکم دیتا ہے تو وہ ہم کو مجسم ہو کر عیاناً دکھائی دیتے ہیں، اور کبھی ہم انسان کی صورت میں انہیں دیکھتے ہیں، اور کبھی ان کو ان کی اصلی صورتوں میں جس طرح وہ اپنے کو اپنی اصلی صورتوں میں دیکھتے ہیں کیونکہ ملائکہ کا اصل جسم نورانی ہے، اور جن آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور انسان مٹی اور پانی سے جس طرح انسان اپنے اصل سے اس حالت پر آگیا جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے اسی طرح فرشتے اور جن بھی اپنی اصلی حالت سے ظاہری صورتوں کی طرف آجاتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ نے ص ۵۰۶ میں اور ارشاد فرمایا

"اعلم ان اللہ ما جعل للارواح اجنحة الا للملائكة منهم لانهم السفراء من حضرة الامر الى خلقه فلابد لهم من اسباب يكون لهم بها النزول والعروج فان موضع الحكمة تقتضى هذا فجعل لهم اجنحة على قدر مراتبهم فى الذين يسيرون به من حضرة الامر او يعرجون اليه من خضرة الخلق فهم بين الخلق والامر ينزلون ولذلک قالوا ومانتنزل الابامر ربک"

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کیلئے پر نہیں بنائے سوائے فرشتوں کے، یعنی فرشتوں کو رب تعالیٰ نے پر عطاء فرمائے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو تمام امور کا مالک ہے، اس کے درمیان اور مخلوق کے درمیان وہ سفیر ہیں، اس لئے ان کیلئے اترنے اور چڑھنے کیلئے اسباب کا پایا جانا ضروری ہے، یہی دراصل حکمت کا تقاضا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے مراتب کے مطابق پر عطاء فرمائے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مخلوق کی طرف اترتے ہیں، اور مالک امور کی طرف چڑھتے ہیں۔

(ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۲۹)

یہاں تک سید احمد خان صاحب کا تمام تانا باناختم ہو گیا، پچھلی تمام بحث کو غور سے دیکھیں، جتنی وجوہ فرشتوں کے وجود کی نفی پر بیان کی ہیں وہ سب باطل ہوگئیں۔

نیچری مذہب والوں کو شیخ کی ان عبارات سے دھوکا ہوا:

فصوص الحکم میں آپ فرماتے ہیں:

"وكانت الملائكة من بعض قوى تلک الصورة التى هى صورة العام المعبر عنه فى

اصطلاح القوم بالانسان الکبیر"   اور آپ نے فرمایا:

"فکانت الملائکة کالقوی الروحانیة والحسیة التی فی نشأة الانسان"

نیچری مذہب کا رد:

صوفیاء کرام کی باریک اصطلاحوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، ان کی عبارات کو سمجھنے کیلئے شعور کی ضرورت ہے، حضرت شیخ کا قول آپ کی سند ہے، ذرا تم غور کرو کہ یہ تمہارا مدعا ثابت کرتی ہے یا تمہارے مدعا کو مٹاتی ہے، پہلی عبارت کا مطلب تو یہ ہے" کہ وہ صورت عالم کہ جس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں انسان کبیر کہتے ہیں اس کیلئے ملائکہ مجموعہ قوی میں داخل ہیں، یعنی عالم کے تمام کاروبار بغیر ملائکہ کے نہیں ہو سکتے جس طرح کہ انسان کے کاروبار اس کے قوی کے بغیر نہیں انجام پاتے، پس ملائکہ عالم کیلئے بمنزلہ قوی کے ہیں اور دوسری عبارت واضح طور پر اس پر دلالت کر رہی ہے "فکانت الملائکة کالقوی الروحانیة" ملائکہ قوی روحانیہ کی طرح ہیں۔

لیکن بیکار لوگوں کو "کاف تشبیہ" نظر ہی نہ آیا، انہوں نے "عین قوی" مان لیا، عقل کے اندھے "زید کالاسد" کو "زید اسد" پڑھ کر زید کی دم اور چار پاؤں تلاش کرنے لگے کہ یہ ہے تو شیر، لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس کی دم اور دو پاؤں کہاں چلے گئے ہیں۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۳۰)

نیچری مذہب اور ابلیس:

شیطان کی نسبت تو قیصری نے شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی جو ہم نے کہی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بعض نے یہ بات کہی ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم میں جو قوت وہمیہ کلیہ ہے وہی ابلیس ہے، اور ہر ایک انسان میں جو قوت وہمیہ ہے وہی ابلیس کی ذریات ہیں۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۰)

اس قول کا رد: یہاں بھی تشبیہ کا ذکر ہے کہ صورت عالم جسے صوفیاء کرام کبیر انسان کہتے ہیں اس کے قوی میں قوت وہمیہ اس طرح اثر انداز ہے جیسا کہ ابلیس انسان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے، یعنی قوت وہمیہ جو ابلیس کی طرح ہے اس کو عین ابلیس کہنا کیسی ہی عجیب حماقت ہے۔

نیچری مذہب کا اور سیاہ اقتباس:

غرضیکہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں قوی کو جو انسان میں ہیں اور جن کی نفس امارہ یا قوی بہیمیہ سے تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے۔

اس قول کا رد: صرف زبانی کلام دعوی کئے جانا اور دعوی کو ہی دلیل بنائے پھرنا تو انسانیت نہیں، یہ تو فقط حماقت وجہالت ہے، کیونکہ محققین سے مراد ایک نیچری مذہب کا سردار اور اس کی ذریت معنوی مراد ہے تو ان کی جیسی جاہلانہ تحقیق ہے ایسے ہی وہ محققین جو درحقیقت جہلاء مطلق ہیں ان کا اتفاق ہونا تو ضروری ہے، کیونکہ " الکفر ملة واحدة" کا وہ مصداق ہیں۔

لیکن علماء محققین یعنی محدثین کرام اور مفسرین کرام، فقہاء عظام کا تو شیطان کے متعلق وہی عقیدہ ہے جو قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں ہے، جس کا تذکرہ نجوم الفرقان کے دوسرے حصہ میں تفصیلا کر دیا گیا ہے۔

نیچری مذہب کا ملحدوں اور بے دینوں جیسا قول:

اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالی انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوی بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرنا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا۔

اس بیہودہ قول کا رد:

آپ ان چیزوں کے منکر ہو کر اور ان کی باطل تاویلیں کر کے دل میں خوش ہو گئے کہ یہ خیالات پیدا کرنا میرا ہی حصہ ہے کسی اہل اسلام کو یہ باتیں کبھی نصیب نہ ہوئی ہوں گی، اور آپ کے معتقد بھی یہی خیال کر کے آپ کے خیالات کو واجب الایمان سمجھتے ہیں۔

آپ کی عمدہ تحقیقات کا حال یہ ہے کہ وہ ملحدوں اور دہریوں اور بعض حکماء بے دینوں کے پرانے خیالات ہیں کہ جو ان کی کتابوں میں اب تک موجود ہیں، اور کچھ اس وقت کے پادریوں اور لامذہبوں کے اعتراضات ہیں، مگر آپ نے ان کو ذرا بدل کر لکھا ہے، اور ان کے ثبوت میں یہ کمال (بلکہ زوال) ضرور کیا ہے کہ قرآن واحادیث اور متقدمین کے کلام میں تحریف کر کے اور ان کے مطالب ومعانی تبدیل کر کے کم علم لوگوں کو شک میں ڈال دیا ہے، حالانکہ یہ الحاد اور بے دینی کی باتیں آپ سے صدہا سال پہلے مشہور ہو چکی ہیں۔ علماء اسلام نے ان کے جواب شافی دیئے ہیں اور اس زمانہ میں جو کچھ دہریوں کے خیالات انگریزی اور فرانسیسی اور جرمنی اور عربی زبان میں بذریعہ کتب واخبارات جو کچھ یورپ میں مشتہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان سے بھی اہل اسلام غافل نہیں، ان کے دندان شکن

جواب جو اسلامیوں نے دیئے ہیں ان کا عشر عشیر بھی جناب کے کانوں تک نہیں پہنچا، کچھ تنہا آپ ہی نے یورپ کی سیر نہیں کی، اور آپ اچھی طرح نہ عربی قدیم جانتے ہیں نہ جدید، نہ یونانی نہ عبرانی نہ یورپ کی اور زبانوں میں علم رکھتے ہیں آپ کی تحقیقات میں سوائے خود پسندی اور تکبر کے بلکہ بے دینی، الحاد اور یہودیت ونصرانیت کے کچھ نہیں۔

(۱) وجود ملائکہ کا انکار تم نے کیا، خصوصاً جبریل ومیکائیل کا انکار، ملائکہ کے افعال اور متحیز ہونے کا انکار بے دینی اور الحاد نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں ہاں یہ تو صرف بے دینی ہے۔

(۲) شیطان کا انکار کرنا بھی تم سے ہی ہوا ہے، جس کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے ہے، کیا شیطان کے انکار سے قرآن پاک اور حدیث پاک کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ ابلیس کی ذریت معنوی ابلیس کو یا تو واقع میں سمجھ ہی نہ سکی یا انکار کر کے اپنا بچاؤ کیا گیا کہ ہمیں کوئی یہ نہ کہے کہ یہ تو ابلیس کی ذریت ہے۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام کا انکار کر کے اور ''آدم'' سے مراد نوع انسانی لینا قرآن پاک اور حدیث کی تحریف معنوی نہیں تو اور کیا ہے؟

(۴) حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ کے سجدہ کرنے اور شیطان کے تکبر کرنے کا انکار بلکہ اس قصہ کو جو تم نے انسان کے قوی کے جذبات اور قوت بہیمہ کے تمرد پر محمول کیا ہے، کیا یہ حماقت وجہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۵) حضرت آدم علیہ السلام کے جنت میں رہنے پھر وہاں سے نکالے جانے کا انکار کرنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۶) جنت اور اس کی نعمتوں کا انکار، اور انبیاء کرام کے معجزات کا انکار درحقیقت قرآن پاک اور حدیث پاک کا واضح طور پر انکار ہے، یہ ضلالت بھی تمہاری قسمت میں ہی آئی۔

مسلمانوں کے لباس میں گمراہ کن:

صدہا برس سے اہل اسلام میں یہودی اور مجوسی اور دیگر مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے لباس میں قرآن وحدیث کے خلاف گمراہ کرنے والی چیزوں کی ایجاد کرتے ہیں، اسی طرح بہت سے ملحد لوگ فلسفی تقریروں میں مسلمان کہلا کر اصول اسلام کے قلع وقمع (برباد) کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

جب سے اسلام میں ایسے لوگ آگئے، اسی وقت سے مسلمانوں میں اختلاف شروع ہو گئے، درحقیقت ان اختلافات کو بھڑکانے والے، جاہل لوگوں کو پیسے دے کر خریدنے والے ملحد، مجوسی، یہودی، نصرانی، اور دہریئے فلاسفہ

ہی ہیں، جو بظاہر مسلمان بن کر لڑانے کا ذریعہ بنے وہ در حقیقت مسلمان نہیں ہوتے، یا نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں۔

بعض کتب سے یہ بات واضح ہے جیسا کہ دبستان المذاہب کے ص ۸۳ میں آخشون کے متعلق یوں لکھا ہے کہ "صاحبان این مذہب ہمہ اہل اسلام آمیختہ اند وبکسوت ایشاں جلوہ گراند، نام مسلمانان ہم دارندو نام دیگر بر کیش خویش" اس مذہب والے لوگ اہل اسلام سے ملے جلے رہے، مسلمانوں کی طرز اختیار کئے رہے، بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے رہے، لیکن کام ان کے اسلام کے خلاف ہی رہے، اسی طرح مزدکیوں کے متعلق ص ۱۴۴ میں لکھا ہے کہ "اکنوں مزدکیاں درلباس گری بستند درمیان اهل اسلام پنهان شده راه سپر کیش خویش اند"

مزدکی لوگ بھی اپنے بچاؤ کی خاطر اسلامی لباس میں رہے، کام وہ بھی اسلام کے خلاف ہی کرتے رہے اور کتاب دساتیر کے چودہویں نامہ میں اس بات کی پیشین گوئی ہے "کہ مسلمانوں میں جب باہم خصومت پیدا ہوگی تو ایرانی لوگ مذہب اسلام میں داخل ہو کر اپنے قدیم مذہب کی باتوں کو یہاں تک رواج دیں گے کہ اصل اسلام برائے نام رہ جائے گا۔ (حقانی کہتے ہیں) یہ بات تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی ص ۳۱،۳۲)

نیچری مذہب کی ملحدین کے ساتھ اتفاق کی چند مثالیں:

دبستان المذاہب ص ۱۲۶ کی تعلیم اول قواعد زردشتیوں کے بیان میں لکھا ہے کہ "ملائکہ سے مراد صفات حمیدہ ہیں" یہی مذہب نیچریوں کا بھی ہے اور ص ۱۶۷ میں ہے "جہنم کے طبقات اور جنت کے درجات اور اعمال کی جزا و سزا محض خیالی باتیں ہیں" یہی نیچری مذہب والے بھی کہتے ہیں۔ ص ۳۴۳ نظر اول میں عقائد حکماء کے بیان میں یوں لکھا ہے کہ

"پیوستن روح بدن راندن آدم ست از بهشت ومیل به بدن فرمان بردن حوا وکر دارنکو هیده، خوردن شجره منهیه، مار خشم، وطاءس شهوت است، وگفته اندابلیس عبارت از قوت وهمی که پیرو محسوسات است وعالم معقولات رامنکراست وباقوت عقلی در ستیزد، وآنچه درشرع آمده که همه فرشتگان آدم را سجده کردند مگر ابلیس، اشارت است بایں معنی که همه قوی جسمانی که فرشتگاان ارضی اند مطیع روح آدم اند مگر قوت وهمی که سرکش است.

"یعنی آدم کا جنت سے نکالا جانا" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی روح بدن میں ڈالی گئی، یعنی آدم کی روح کا ان کے بدن میں پھونکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا۔ (کیسی ہی احمقانہ قول ہے کہ روح پھونکنا در حقیقت جنت سے نکالنا ہے، جو کسی کے دل میں آئے وہ کہتا پھرے اسے کون روک سکتا ہے) اور مراد

حوا کی فرمانبرداری سے بندن کی طرف میلان کرنا ہے، اور درخت کا پھل کھانے سے روکنے کا مطلب ہے بری خصلتوں سے روکنا، اور سانپ سے مراد غصہ اور مور سے مراد شہوت ہے، اور شیطان سے مراد قوت وہمیہ ہے کہ جو عالم معقولات کی منکر اور محسوسات کی پیرو اور عقل سے معارضۃ کرنے والی ہے، اور جو شرع میں آیا ہے کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے نہ کیا تو اس سے یہ مراد ہے کہ قوی جسمانی جو زمین کے فرشتے ہیں آدم کی روح کی تابع ہو گئیں، اور قوت وہمیہ نے سرکشی کی۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۲)

نیچری مذہب بھی یہی ہے پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف مداری مختلف شکلیں بدل کر آتے رہے مقصد سب کا ایک رہا، بظاہر قرآن پاک کے ترجمان بن کر حقیقت میں قرآن پاک کی تحریف کر کے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرتے رہے، جو قرآن پاک کے ظاہر مطالب ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔

ہاں صوفیاء کرام کی طرح ظاہری مطالب کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اشارات بیان کر دیئے جائیں تو یہ درست ہے۔

نیچری مذہب نے وہی کہا جو مسیلمہ کذاب نے کہا:

یہ حقیت بات ہے کہ کذاب نے کذاب کی طرف ہی رجوع کرنا ہے، فرقہ صادقیہ جو مسیلمہ کذاب کا پیرو ہے ان کے حالات دبستان المذاہب کے ص ۲۹۹ میں یوں لکھے "مسیلمہ کذاب جس کو کتاب آسمانی کہتا تھا اس کی دو جلدیں ہیں، پہلی کا نام فاروق اول اور دوسری کا نام فاروق دوم ہے، اس میں لکھا ہے کہ کوئی شیطان نہیں اور نہ خدا کسی کو غیر اللہ کیلئے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۲)

یعنی جھوٹے نبی نے جو مذہب ایجاد کیا وہی نیچری مذہب کے سردار نے اختیار کیا، کذاب کو کذاب کی بات پسند نہ آئے یہ ممکن نہیں۔

مشائین کے مذہب کو توڑ موڑ کر نیچریوں نے پیش کیا:

محمد بن عبد الکریم شہرستانی جو بہت بڑے فاضل شخص تھے بلکہ حکماء اسلام میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی وہ اپنی "کتاب الملل والنحل" کی جلد دوم ص ۸۶ میں عقائد حکماء مشائین کے بیان میں یوں لکھتے ہیں کہ "جن لوگوں کو قوت قدسیہ نصیب ہوتی ہے (یعنی انبیاء کرام) ان کی قوت خیالیہ اس درجہ کی قوی ہو جاتی کہ وہ

اپنے ادراکات کو بصورت جمیلہ دیکھتے اور ان کا عمدہ کلام سنتے ہیں یعنی دراصل نہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے نہ کوئی آواز یا کلام ان کو سنائی دیتا ہے بلکہ محض ان کے وہ معلومات (جو ان کو مبدأ فیاض سے عطاء ہوئے ہیں) کسی عمدہ شکل میں نظر آتے ہیں اور نہایت دلچسپ کلام کرتے ہیں، پس وہ فرشتہ جو نبی علیہ السلام کو دکھلائی دیتا تھا وہ یہی تھا، اور وہ وحی اور الہام یہی آواز تھی۔ سید صاحب نے اسی بات کو کس برے عنوان سے بیان کیا ہے اور انبیاء کرام کو (معاذ اللہ) مجنون سے تشبیہ دے کر کس طرح گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۲)

یعنی نیچری مذہب نے وہی کچھ بیان کیا جو پہلے باطل راہ پر چلنے والوں نے کہا جن کا ہر دور میں رد کیا گیا ہے، مشائین کا مذہب بھی بظاہر بغیر کسی تاویل کے غلط اور باطل ہے، پھر اس پر ملمع سازی کر کے حقیقت سے برگشتہ صرف من دھن کی بات نیچری مذہب والوں نے بیان کر کے نہلے پر دہلے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نیچری مذہب والوں نے بعض حکماء کے قول کو نہ سمجھا:

کتاب الملل والنحل میں ہی (جلد دوم ص ٦٧) مذکور ہے کہ بعض حکماء نے کہا ''نبی لوگوں کو آخرت کی ترغیب دیا کرتے تھے اور وہاں کے ثواب وعقاب مثالوں کے ذریعے لوگوں کے اطمینان قلوب کیلئے بتلاتے'' اور حقیقت میں وہ ایک امر مجمل ہے کہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ کسی کان نے سنا۔ (مقدمہ حقانی ص ۳۲)

اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ انبیاء کرام نے ثواب اور جنت کا ذکر فرمایا، اس کا علم ان کو ہی دیا گیا عام لوگوں نے اس کو دیکھا تو نہیں لیکن اس پر ایمان لایا ہے، اسی کو ایمان بالغیب، سے تعبیر کیا گیا، یہ مطلب تو بالکل درست ہے قرآن پاک کے مطابق ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ جنت ایک خیالی اور تصوراتی چیز کا نام ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ انبیاء نے صرف لوگوں کے دلوں کو اطمینان دینے کیلئے اسے بیان کیا ہے تو یہ کفر ہے، یہی باطل راہ نیچری مذہب والوں نے اختیار کی ''کل شیء یرجع الی اصلہ'' ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے، کا عملی ثبوت پیش کیا۔

اہل اھواء اور نیچری مذہب میں اتفاق:

اہل اھواء وہ لوگ تھے جو اپنی خواہشات کے مطابق کام کرتے تھے، تقریباً وہ اور نیچری مذہب ایک ہی تھے، کیونکہ ''ھواء'' اور نیچر'' تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

کتاب الملل والنحل جلد اول ص ۱۰۴ میں بعض اہل اھواء کا عقیدہ یہ لکھا گیا ہے کہ ''ان کے نزدیک سوائے

عالم محسوس کے اور کوئی عالم نہیں، ان کا ہر بات میں اپنے ذہن صافی اور فطرت سلیمہ پر اعتماد کلی ہے، اس گروہ کا نام "طبیعہ دہریہ" ہے۔

یہی نیچری مذہب والے بھی کہتے ہیں کہ چونکہ جن، فرشتے، جنت وغیرہ جو چیزیں ہمیں نہیں دکھائی دیتیں وہ واقع میں ہیں ہی نہیں، اسی طرح انبیاء کرام کے معجزات کا بھی وہ انکار کرتے ہیں، اور بعض لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ سمجھتے ہیں (حقیقت میں وہ پستی میں ہیں بلکہ جہنم کے گہرے گڑھے میں ہیں) وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت اور اس کے احکام حرام وحلال مصلحت عباد اور رفاہ بلاد رفامر لوگوں (ناصحین وواعظین) نے اپنی طبیعت صافیہ سے مقرر کر دیئے ہیں اور وہ جن روحانی چیزوں کی خبر دیتے ہیں جیسا کہ لوح وقلم وعرش وکرسی ملائکہ وغیرھا سو وہ درحقیقت ان کے خیالات ہیں کہ جن کو وہ جسمانی صورتوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، اور اسی طرح آخرت کے احوال جنت اور حور وقصور اور نہر ومیوہ جات جو وہ بیان کرتے ہیں محض عوام کی طبیعتوں کو رجوع کرنے کی باتیں ہیں، اور اسی طرح دوزخ اور اس کے عذاب طوق وغیرہ بھی لوگوں کو ڈرانے کیلئے بیان کرتے ہیں، کہ ان سے ڈر کر ان امور مصلحت پر چلیں جن کو انہوں نے واجب وفرض بتایا ہے۔ اور ان چیزوں سے بچیں جن نامناسب چیزوں کو وقتی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے حرام یا مکروہ کہا ہے۔ ورنہ عالم آخرت میں جو کہ علوی عالم ہے صور جسمانی اور اشکال جرمانی کہاں؟ یہ سب قرآن وحدیث کا انکار ہے رب تعالی اور نبی کریم ﷺ نے جو احکام بیان کئے اور جن کاموں سے روکا ہے ان کو واعظین کی طرف منسوب کر دیا ہے، یہی بے دینوں، بدمذہبوں کا کام ہے اور یہ تو عام حکماء مشائین کا عقیدہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور اس میں قدر انواع ہیں، وہ بھی سب قدیم ہیں چنانچہ نوع انسانی بھی قدیم ہے ان کے نزدیک یہ بات کہ ابتداء نوع انسان حضرت آدم علیہ السلام سے غلط ہے۔

کتاب الملل والنحل کی آخری جلد میں اور اس کے سواء اور کتب الٰہیات میں اس کی تصریح ہے، اب رہے انبیاء کرام کے معجزات تو ان کے سینکڑوں لوگ انکار کرنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے حالات سے یہی کتاب اور دبستان المذاہب وغیرہ بھی پڑی ہیں، اور جلال الدین اکبر بادشاہ دہلی کے روبرو تو بڑے زور کے ساتھ ایک بڑے دہریئے نے بمقابلہ اہل اسلام وہل کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عبور قلزم کا انکار کیا تھا چنانچہ دبستان المذاہب میں اس کی خوب تصریح ہے۔ اب فرمایئے سید صاحب آپ نے وہ کونسی نئی بات ایجاد کی ہے؟

ایسے ایسے خیالات کے لوگ ہر زمانہ میں کتب سماویہ کی نسبت اعتراضات کرتے آئے ہیں۔ کوئی واضح طور پر انکار کرتے رہے اور کوئی تاویلیں کرتے رہے۔ واضح ہوا کہ نیچری مذہب والوں نے اپنی طرف سے کوئی نئی تحقیق

نہیں کی، بلکہ پہلے مذاہب باطلہ کے اقوال باطلہ کو ہی توڑ موڑ کر پیش کیا۔ (از مقدمہ حقانی ص ۴۴)

نیچری مذہب نے حضرت آدم علیہ السلام کا انکار کیا:

آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملا باوا آدم کہتے ہیں بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار میں لکھا ہے "ماالمقصود بآدم آدم وحدہ" (از مقدمہ حقانی ص ۴۴)

اس باطل قول کا رد:

کشف الاسرار نے جو بیان کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ "آدم" سے مراد ہر جگہ آپ کی اولاد مراد ہے آپ خود کہیں بھی معتبر نہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں "انا سید ولد آدم" میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن، اس میں خود آدم علیہ السلام بھی داخل ہیں کہ آپ کو ان پر بھی سیادت حاصل ہوگی۔ اسی طرح کہیں آدم علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے مراد اس سے آپ خود بھی ہوتے ہیں، اور آپ کی اولاد بھی ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ کسی کی بات کو نہ سمجھنا، یا پہلے ہی جن اقوال باطلہ کو مختلف زمانوں میں پیش کیا جا چکا ہے ان کو ہی الفاظ بدل کر پیش کرنا نیچری مذہب کا کمال بلکہ زوال سمجھ آیا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد کو مانا جائے یا نیچری مذہب کی غلط تاویلوں کو مانا جائے آیئے ارشادات باری تعالیٰ دیکھئے

(۱) ﴿وَبَدَءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝﴾

اس میں صاف واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور آپ کی اولاد کو نطفہ سے بنایا گیا، اگر آدم سے مراد نوع انسانی ہو اور کوئی آدم نہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا "ہم نے نوع انسانی کو مٹی سے بنایا، پھر ہم نے نوع انسانی کو نطفہ سے بنایا جب تمام نوع انسانی کی تخلیق ایک طرح ہے تو یہ ادھر ادھر کے چکر لگانے کا کیا مطلب؟ نیچری مذہب کی بدحواسی کے بغیر اور کچھ نظر نہیں آتا۔

(۲) ﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾

اگر آدم سے مراد نوع انسانی ہے تو اس میں مرد، عورت دونوں ہی شریک ہیں، پھر مؤنث کو علیحدہ ذکر کرنا اور مرد کے برابر ذکر کر کے تثنیہ کے صیغے ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن پاک کے یہ مطالب بیچارے جہلاء کیا سمجھیں، وہ تو خیالاتی گھوڑے دوڑانے جانتے ہیں۔

(۳) ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾

اس آیۃ میں بھی وضاحت کی ہے کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، ایسے ہی حضرات آدم علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے، مٹی سے پیدا کیا۔

بدحواسی کا یہ عالم کہ کبھی آدم سے مراد نوع انسانی مراد لینا اور آدم علیہ السلام کا کھلا انکار کرنا اور کبھی آدم علیہ السلام کی تخلیق کو تسلیم کر لینا، اسے ہی بدحواسی کہا جاتا ہے، وہ اپنی نام نہاد تفسیر میں سورۃ آل عمران ص ۴ میں لکھتے ہیں ''کیونکہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے، اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں سبحان اللہ، کیا خوب بیان کر دیا گیا کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عام انسانوں کی طرح نہیں ہوئی، گویا یوں سمجھیں کہ جو خیالی تصورات اور من گھڑت اقوال پیش کئے تھے ان کو خود ہی اپنے قول سے رد کر دیا۔ (ماخوذ از مقدمہ حقانی بتصرف ص ۳۴)

آیات متشابہات اور نیچری مذہب کی بدحواسی:

آیات متشابہات کا انکار یوں چرب زبانی سے کیا گیا کہ سمجھ یہ آئے کہ یہ تو بڑا مصلح ہے لیکن منافقین بھی اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے لیکن رب تعالیٰ نے ان کو فسادی کہا، یہ بھی بظاہر مسلمانوں کی اصلاح کا پہلو لے کر قرآن پاک کے مطالب کو بگاڑ کر عظیم فساد کا سبب بنا، جس کا علماء نے رد کیا۔ آج قادیانی علمی سطح پر تو علماء کرام سے مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں، لیکن یہود و نصاریٰ سے ملکر علماء کو قتل کرانے میں آگے آگے ہیں۔

آیئے نیچری مذہب کا نظریہ آیات متشابہات کے متعلق دیکھیے، وہ یوں رقمطراز ہیں۔

قرآن مجید تو تمام لوگوں کی ہدایات کیلئے نازل ہوا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ذی علم دانشمند اس سے ہدایت پاویں اسی طرح جاہل و نادان عوام بھیڑوں اور بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے بھی ویسی ہی ہدایت پاویں۔ جن آیات پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے اگر اس کے ایک پہلو پر خیال کرو تو اس سے وہ مطلب پایا جاتا ہے، جو عوام کے خیالات کے مناسب ہے۔ (از مقدمہ حقانی ص ۳۳)

بظاہر اصلاح کے ضمن فسادی قول کا رد:

اگرچہ بظاہر تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ یہ اصلاحی بات ہے کہ متشابہات کو بھی سب لوگ جانیں تو قرآن پاک مکمل ہر شخص کو سمجھ آئے گا، لیکن حقیقت میں یہ قول فساد پر مبنی ہے کیونکہ اس میں قرآن پاک کا صراحتہً انکار ہے۔ بات یہی

ہے کہ نیچری مذہب کے سردار کی بات کو مانوں یا رب ذوالجلال کے ارشاد کو مانوں؟ یقیناً رب تعالیٰ کے ارشاد کے ماننے کا نام ایمان واسلام ہے، اور اپنے نیچر کی بات کو ماننا، یا نیچری کی بات کو ماننا بے دینی ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾

وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، اس کی کچھ آیات صاف معنی رکھتی ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے، وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے، اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یقینی امر ہے کہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد کے بعد ٹیڑھے دلوں والے متشابہات کی تاویلیں تلاش کریں گے، اپنے من دھن کے مطابق مطالب نکالیں گے، رب تعالیٰ کے ارشاد کے بعد باطل تاویلیں پیش کرنے والوں پر کوئی تعجب نہیں۔

جب نیچری مذہب والوں کا کہنا یہ ہے کہ متشابہات کے بھی ظاہر معانی معتبر ہونے چاہئیں تو خود ان کا محکمات آیات کی تاویلیں کرنا کیسے صحیح ہے، **سبحان اللہ!** اس خبط حواسی کا کیا کہنا' جب محکمات آیات کے حقیقی معانی مراد ہیں تو نیچری مذہب والوں نے اپنے خیالی تصورات کیوں پیش کئے؟

جنت کے متعلق نیچری مذہب:

یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ جنت صرف راحت کا نام ہے ''جنت یا بہشت کی ماہیت جو خدا تعالیٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہ ہے

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا ان کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک (راحت) چھپا رکھی ہے اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔

پیغمبر ﷺ نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ

''قال الله تعالى اعددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولااذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر''

(از مقدمہ حقانی ص ۴۱)

اس کا رد: آیۂ کریمہ اور حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ جنت کو کسی نے دیکھا نہیں، وہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، یعنی جنت کو حقیقی طور پر کوئی نہیں جانتا، لیکن نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات جنت کو دیکھا ہے، مؤمنین

جنت کے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ نے بیان فرمائے، عقلی ڈھکوسلے تو نیچری مذہب والے پیش کرتے ہیں، مسلمان تو اپنے آپ کو قرآن وحدیث اور رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تابع سمجھتے ہیں آیئے جنت کا ذکر زبان مصطفیٰ کریم ﷺ سے سنیے۔

﴿جنت کی عظمت﴾

اللہ کے انعام کی عظمت انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (حدیث قدسی) ہے۔

"اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر، واقرؤا ان شئتم (فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین "

(بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واہلھا)

میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسا مقام تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر کھٹکا نہیں، اگر تم چاہتے ہو تو (قرآن پاک کی یہ آیت) پڑھ لو، (جس کا مطلب ہے) کوئی نفس نہیں جانتا، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے مخفی کر کے رکھی ہوتی ہے۔ اس سے مراد خصوص ثواب اور انعام وکرام ہے

"ای نوع عظیم من الثواب ادخر اللہ لاولئک واخفاہ من جمیع خلائقہ لا یعلمہ الاھو مما تقربہ عیونھم"

یعنی ثواب کی عظیم قسم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے لئے تیار کر رکھی ہے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی نہیں جانتا، یہ وہ عظیم ثواب اور مرتبہ ہوگا جس سے نیک لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

"بلغک اللہ امنیتک حتی ترضی بہ نفسک وتقرعینک و لا تستشرف الی غیرہ"

یعنی اے نیک انسان اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری تمام خواہشوں پر کامیاب کر دے گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے گا، اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی تجھے غیر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

جنت کا کم از کم مقام دنیا کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا ومافیھا" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ واھلھا)

جنت میں کوڑا (چابک، چھڑی) رکھنے کا مقام دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔
چونکہ جنت کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں، یہ یقینی بات ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی سے بہتر ہے۔ "قال ابن الملک سوی کلام اللہ و صفاتہ و جمیع انبیائہ" ابن الملک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا نزول بھی ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا ظہور بھی ہوا ہے اور انبیاء کرام بھی تشریف لائے لیکن یہ حکم ان کو شامل نہیں، ان کے سواء باقی دنیا کی تمام نعمتوں یعنی مال و دولت، عالیشان محلوں سے جنت کا ادنیٰ درجہ بھی اعلیٰ ہوگا۔

کوڑے یعنی چابک یا چھڑی کو ذکر کرنے میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے حقیر سمجھا جاتا ہے، جب کوئی سوار اترنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اپنی چھڑی زمین پر پھینکتا ہے پھر خود اترتا ہے، پہلے اس کے چھڑی پھینکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ یہاں ہی اترنا ہے وہ آگے نہ چلے جائیں، لیکن چھڑی کو زمین پر پھینکنے سے اس کی اور اس کے رکھنے کی جگہ کی حقارت بھی معلوم ہوگئی اس لئے واضح فرمادیا کہ جنت کا ایسا مقام بھی دنیا کی عظیم الشان نعمتوں سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔

جنت کے درخت کی عظمت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"ان فی الجنۃ شجرۃ یسیر الراکب فی ظلھا مائۃ عام لایقطعھا" (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واہلھا)
بیشک جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں چلنے والا سوار اس کو ایک سو سال میں بھی قطع نہیں کر سکے گا اور جنت میں تمہارے ایک کمان کی مقدار کا مقام بھی سورج کے مقام طلوع اور غروب سے بہتر ہے۔

جنت کے درخت کا نام "طوبی" ہے جس طرح ابن جوزی نے فرمایا "یقال انھا طوبی" کہا جاتا ہے بیشک وہ طوبی ہے۔ خیال رہے درخت کے سائے میں چلنے سے مراد اس کے نیچے کنارے پر چلنا ہے کیونکہ دنیا میں سایہ کا اعتبار سورج سے ہے، خصوصاً درخت کے سائے میں چلنے سے مراد سایہ میں اس وقت انسان چلتا ہے جب دھوپ اور سورج کی تمازت (گرمی) سے بچنا چاہتا ہو، لیکن جنت کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا﴾ جنتی لوگ جنت میں نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ سردی، اور ممکن ہے کہ درخت کے اوپر اوپر نورانیت کا ظہور ہو اور اس کے نیچے حجاب ہو جو سایہ نظر آرہا ہو جس طرح ہمارے محاورہ میں رات کو چراغ، بجلی کے قمقموں

کی روشنی میں نظر آنے والے عکس کو بھی سایہ کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح صبح صادق سے لیکر طلوع شمس تک سورج کی شعاعوں کے مقابل اس وقت کو بھی ظل (سایہ) کہا گیا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾ پھیلایا ہوا ظل (سایہ) اس سے مراد یہی وقت ہے۔ جس طرح انسان شکار کرنے کے لئے جائیں تو وہ درخت کے سایہ میں یا اور کسی جگہ آرام کرنے کے لئے اپنا کمان رکھ کر اپنی اپنی جگہ مختص کرتے ہیں اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں اتنی جگہ تم کمان رکھتے ہو وہ طلوع شمس (سورج) اور غروب شمس کے درمیان مقام سے اعلیٰ ہے۔ یعنی تمام دنیا سے اعلیٰ ہے

"وفی الجامع ان فی الجنة لشجرة یسیر الراکب الجواد المضمر السریع"

یعنی بخاری میں مزید وضاحت موجود ہے کہ جنت میں درخت کے نیچے چلنے والے سوار سے مراد وہ سوار ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کے جسم کو بہت پختہ کیا گیا ہو اور وہ بہت تیز چلتا ہو، عمدہ قسم کا گھوڑا ہو۔

﴿جنت کیسی ہے؟﴾

جنت میں شیشے کے خیمے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان للمومن فی الجنة لخیمة من لؤلؤ واحدة مجوفة" جس کا طول وعرض ساٹھ ذراع (نوے فٹ) ہوگا، (ایک روایت طول ساٹھ ذراع کا ذکر ہے اور دوسری راویت میں عرض ساٹھ ذراع کا ذکر ہے) اور ہر کونے میں اس کی اھل ہوں گی کوئی بعض دوسرے بعض کو نہیں دیکھ سکے گا، مومنین ان کے پاس جائیں گے دو جنتیں چاندی کی ہوں گی اور ان کے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہوگی، اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی ان کے برتن اور ان کی تمام اشیاء سونے کی ہوں گی، جنت عدن میں مومن قوم اور رب کو دیکھنے میں صرف رداء (چادر) کبریائی حائل ہوگی۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

"وقد یکون لارباب الکمال جنتان من ذھب وجنتان من فضة" (مرقاۃ المفاتیح)

ارباب کمال کو دو جنتیں چاندی کی اور دو سونے کی حاصل ہوں گی۔ اس طرح چار جنتیں ہوں گی لیکن ان کے طبقات آٹھ ہیں۔ انسان جب جنت میں ہوگا اس کی جسمانی کدورت اٹھالی جائے گی "حسی موانع" ختم ہو جائیں گے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے جلال کا اتنا رعب ہوگا اور اس کی نورانیت کا اتنا غلبہ ہوگا کہ سوائے اس کی رحمت اور مہربانی کے انسان رب تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکے گا، یہ ہی رداء کبریائی ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

جنت فردوس سب سے اعلیٰ جنت ہے:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جنت میں ایک سو درجہ ہے اور ہر درجہ میں اتنی وسعت ہے جس طرح زمین وآسمان کے درمیان وسعت ہے۔

"والفردوس اعلاھا درجة منها تفجر انهار الجنة الاربعة ومن فوقها يكون العرش فاذا سألتم الله فاسئلوا الفردوس" (ترمذی، مشکوۃ باب صفة الجنة واهلها)

فردوس تمام سے اعلیٰ درجہ والی ہے، اس میں جنت کی چار نہریں جاری ہیں، ان تمام (جنتوں کے) اوپر عرش ہے، جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرو تو "فردوس" کا سوال کیا کرو۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں "مائة درجة" ایک سو درجہ کا ذکر ہے لیکن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع حدیث مروی ہے:

"عدددرج الجنة عدد آی القرآن فمن دخل الجنة من اهل القرآن فليس فوقه درجة"

جنت میں قرآن پاک کی آیتوں کے مطابق درجات ہیں، قرآن پاک پڑھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے جس درجہ میں داخل ہوں گے اس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ ان حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ جنت میں بہت سے مدارج ہوں گے، سو کا ذکر کثرت کے لئے ہے، تعداد کے لئے نہیں، اہل عرب ستر، سو، وغیرہ الفاظ سے عام طور پر کثرت والا معنی لیتے تھے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کثیر تعداد میں سے، سو درجے ایک ایک شخص کو حاصل ہوں۔

فردوس کا لغوی معنی ایسا باغ جس میں ہر قسم کے درخت اور انگور کی بیلیں ہوں، لیکن جنت کے طبقات میں فردوس کو وہ خصوصیت اور امتیاز حاصل ہوگا جو دوسرے کسی طبقہ کو حاصل نہیں ہوگا اسی وجہ سے امت مصطفیٰ ﷺ کو اس کی طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی امت تمام امتوں سے اعلیٰ تو اس کو تمام جنتوں سے اعلیٰ جنت طلب کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی امت کی برتری کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (پ۲)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے کیا سب امتوں سے افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کردیں گی تو رب تعالیٰ باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لئے تبلیغ

پرانبیائے کرام سے گواہ طلب کرے گا، انبیاء کرام امت محمد ﷺ کو گواہ پیش کریں گے، پہلی امتیں کہیں گی، تم ہمیں کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے ذریعے پہنچایا جس سے ہمیں علم حاصل ہوا، پھران پر نبی کریم ﷺ کو گواہی دینے کے لئے لایا جائے گا، آپ اپنی امت کے حق میں نگہبان کی حیثیت میں شہادت دیں گے۔

خیال رہے کہ ''نگہبان'' کا لفظ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ میں ہے باقی کسی ترجمے میں نہیں، یہ لفظ آپ نے کیوں زیادہ فرمایا؟ اور باقی مترجمین کس طرح علمی نقطہ سے غافل رہے؟ یہ وضاحت میں نے اپنی کتاب تسکین الجنان میں کی ہے وہاں دیکھیں۔ اور نجوم الفرقان میں اسی آیۃ کے تحت دیکھیں۔

چار نہریں:

﴿فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ (پ ۲۶ ع ٦)

ان (جنتوں) میں ایسی پانی کی نہریں ہیں جو کبھی خراب نہ ہوں اور ایسی دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جس کے پینے میں لذت ہے، اور ایسی شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا ہے۔

ایک نہر پانی کی ہے اور وہ پانی دنیا کے پانیوں سے مختلف ہے کیونکہ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور بو نہیں بدلیں گے حالانکہ دنیا کے پانیوں میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے گل سڑ جاتا ہے۔ سب سے پہلے پانی کا اس لئے ذکر کیا کہ انسان دنیا میں بغیر پانی کے زندگی بسر نہیں کر سکتا سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہی در پیش آتی ہے۔

دوسری نہر دودھ کی ہوگی وہ دودھ بھی دنیا کے دودھ سے مختلف ہوگا، نہ کھٹا ہوگا اور نہ ہی اس میں بدبو پیدا ہوگی بلکہ وہ صرف قدرت سے ہی دودھ معرض وجود میں آئے گا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دودھ کی نہر جانوروں سے دوہا ہوا دودھ نہیں ہوگا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کا دودھ گوبر اور خون کے درمیان نالی سے پیدا ہونے والا نہیں ہوگا۔ دودھ کا ذکر دوسرے مرتبہ پر کیا کیونکہ دودھ کو کثیر اہل عرب طعام کی جگہ بھی استعمال کرتے تھے اس لئے پینے کے بعد گویا کہ کھانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

تیسری نہر ﴿شَرَابًا طَهُورًا﴾ کی ہوگی دنیا کے شراب نشہ والے ہوتے ہیں ان میں بدبو ہوتی ہے بنانے والے کی میل کچیل کی آمیزش کا بھی قوی گمان ہوتا ہے لیکن جنتی شراب ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا۔ تیسرے

مرتبہ پر اس کا ذکر بھی اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر کھانے کے بعد تلذذ والی چیز کا استعمال ہوتا ہے اس لئے جنت میں بھی دودھ کی غذائیت کے بعد شراب سے لذت دی جائے گی لیکن وہ شراب پاکیزہ ہوگا، صاف ستھرا مشروب ہوگا، نشہ سے پاک ہوگا۔

چوتھی نہر شہد کی ہوگی لیکن وہ شہد خالص صاف شفاف ہوگا، دنیا کے شہد میں بعض اوقات لوگ شمع کی یا چینی کی آمیزش کر کے شہد کو خراب کر دیتے ہیں جو خالص نہیں رہتا، اسی طرح دنیا کے شہد میں شہد کی مکھیوں کے فضلات کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے لیکن جنتی شہد ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا کیونکہ وہ فقط قدرت سے معرض وجود میں آیا ہوگا، ظاہری اسباب کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔ شہد کا ذکر چوتھے مرتبہ پر کیا کیونکہ اس میں شفاء ہے، مرض میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے، عام طور پر کھانے پینے کی بے احتیاطی پر مرض لاحق ہوتی ہے اور دواء کی ضرورت در پیش آتی ہے، اس لئے اس کا ذکر سب کے بعد عام عادت کے مطابق ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

ایک حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی چار نہروں کے نام دنیا کی نہروں کے مطابق بیان فرمائے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام نیل ہے دوسری کا دجلہ، تیسری کا فرات اور چوتھی کا ''سیحان'' بعض جگہ ''سیحون'' آیا ہوا ہے۔ یہ صرف ناموں کی مطابقت ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ دنیا کے دریا شائد جنت کے ہی ہیں۔ بیہقی میں حضرت کعب سے مروی ہے۔

''نهر النيل نهر العسل ونهر دجلة نهر اللبن ونهر الفرات نهر الخمر ونهر سيحان نهر الماء في الجنة'' (تفسير روح المعاني)

جنت میں نہر نیل شہد کی نہر ہے، نہر دجلہ دودھ کی نہر ہے، نہر فرات شراب کی نہر ہے اور نہر سیحان، سیحون پانی کی نہر ہے۔

جنت کا بازار: حضرت انس ﷺ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''ان في الجنة لسوقا ياتونها كل جمعة'' بیشک جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی لوگ ہر جمعہ کو آئیں گے ان پر شمالی جانب سے ہوا چلے گی ان کے چہروں اور کپڑوں پر (کستوری اور ہر قسم کی خوشبوئیں) پھیلا دے گی۔ ''فيرجعون الى اهلهم وقد ازدادوا حسنا وجمالا'' اپنے اھل کی طرف جب یہ لوٹ کر آئیں گے تو وہ کہیں گے ''والله لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالا'' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے اور یہ انہیں کہیں گے ''وانتم والله تعالى زدتم بعدنا حسنا وجمالا'' قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمہارا بھی حسن و جمال ہمارے بعد زیادہ ہوگیا ہے۔ (مسلم، مشکوۃ باب صفۃ الجنۃ واھلھا)

وضاحت حدیث:

قیامت میں بھی لوگ علماء کے محتاج ہوں گے، اگر چہ قیامت میں سورج اور رات، دن کا وجود نہیں ہوگا لیکن جمعہ اور عیدین کا اعتبار کرنا یا مبارک دنوں میں زیارت کرنا وغیرہ ان تمام چیزوں کی دارومدار اس پر ہوگی "وانما یعرف وقت اللیل والنھار بارخاء استار الانوار ورفعھا" جنت میں رات اور دن کی پہچان نور سے ہوگی، جب نور پر پردے لٹکا دیئے جائیں گے تو رات ہوگی اور جب پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو دن ہوگا۔

بیشک اہل جنت، جنت میں علماء کے محتاج ہوں گے اس وجہ سے کہ وہ ہر جمعہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کریں گے "فیقول لھم تمنوا علی ماشئتم" رب تعالیٰ انہیں کہے گا جو بھی چاہتے ہو اسی چیز کی تمنا کرو یعنی مجھ سے طلب کرو، اب جنت والوں کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کس چیز کو طلب کریں "فیلتفتون الی العلماء فیقولون ماذا نتمنی فیقولون تمنوا علیہ کذا و کذا" وہ علماء کی طرف توجہ کریں گے، ان سے پوچھیں گے کہ ہم رب تعالیٰ سے کیا مانگیں؟ علماء انہیں بتائیں گے کہ تم فلاں فلاں چیزوں کی طلب کرو "فھم یحتاجون الیھم فی الجنۃ کما یحتاجون الیھم فی الدنیا" وہ جنتی لوگ جنت میں علماء کے اسی طرح محتاج ہوں گے جیسے وہ دنیا میں ان کے محتاج تھے۔ جنت میں جمعہ کا نام یوم المزید (زیادہ نعمتوں کے حاصل ہونے کا دن) بھی ہوگا، اس سے واضح ہوا کہ جمعہ کے دن کو دنیا کی طرح جنت میں بھی باقی دنوں پر سرداری حاصل ہوگی، اہل عرب شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کو برکت والی اور بارش والی ہوا قرار دیتے ہیں اس لئے ذکر فرمایا کہ ان کے چہروں اور کپڑوں کی شمالی جانب سے چلنے والی ہوا کستوری اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کر دے گی جس سے ان کی شکل وصورت اور زیب و زینت میں حسن و جمال زیادہ ہو جائے گا، چونکہ تمام اہل جنت جمعہ کے دن بازار میں جائیں گے اس لئے جب لوٹیں گے تو قبیلہ کا سربراہ اپنی جنتی ازواج سے کلام کرے گا وہ اس سے کلام کریں گی کہ ان کا حسن و جمال زیادہ ہو چکا ہے، اپنے حسن و جمال کی زیادتی کا علم تو ہو نہیں سکے گا، دوسرے کو دیکھ کر کہیں گے تمہارا حسن و جمال زیادہ ہو گیا ہے حالانکہ ہر ایک کا حسن و جمال زیادہ ہوگا۔

احوال جنت کا بہت تفصیلی ذکر راقم کی کتاب "موت کا منظر مع احوال حشر ونشر" کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھئے۔ ان شاء اللہ آپ کو خود بخود سمجھ آئے گا کہ علماء کرام وہی اوصاف جنت بیان کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں عقلی باتیں، من گھڑت اقوال، ارشادات مصطفویہ کا انکار، قرآن وحدیث کی غلط

تاویلیں پیش کرنا نیچری مذہب والوں کا کام ہے، علماء دین کے ہوتے ہوئے ان شاء اللہ مذاہب باطلہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس کے خلاف بے دینوں کی آوازیں اٹھ رہی ہیں، علماء کو قتل کیا جارہا ہے لیکن جسے رب تعالیٰ نے قائم ودائم رکھنا ہے، اسے یہود ونصاریٰ نے کیسے مٹانا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌo﴾
(آیة نمبر ۲۶)

(1) یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے، اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے، اور جسے چاہے عزت دے، اور جسے چاہے ذلت دے، ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بیشک تو سب کچھ کرسکتا ہے۔

(2) عرض کرو اے اللہ ملک کے مالک تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہے، اور چھین لیتا ہے تو ملک جس سے تو چاہے، اور تو عزت دیتا ہے جسے تو چاہے، اور تو ذلت دیتا ہے جسے تو چاہے، تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہر بھلائی ہے، بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

جب رب تعالیٰ نے پہلی آیات میں اہل کتاب کی گمراہی کا ذکر فرمایا اور موت کے بعد ان کے انجام کا ذکر فرمایا تو اب اس آیۂ کریمہ میں ان کا دنیا میں انجام ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کو ذلت حاصل ہوگی، اور ان کی بادشاہتیں تباہ وبرباد ہوں گی، اور مسلمانوں کو عزت حاصل ہوگی، اور ان گمراہوں کے ملک مسلمانوں کو حاصل ہوں گے، اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو دعاء کرنے کا حکم دیا ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ﴾ (وجیز، حاشیہ جلالین)

شان نزول: شان نزول کی چند وجوہ ہیں، جو تمام ہی مراد ہیں، یعنی چند وجوہ کے بعد آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) "اخرج عبدبن حمید وابن ابی جریر وابن حاتم عن قتادة قال ذکر لنا ان نبی اللہ ﷺ

سأل ربه ان یجعل له ملک فارس والروم فی امته فانزل الله "قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء" الآیة" (درمنثور)

حضرت قتادہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ ان کو فارس اور روم کے ملک حاصل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتے رہو، اللہ تعالیٰ آپ کو یہ ملک عطاء فرمادے گا۔

(۲) "واخرج ابن المنذرعن الحسن قال جاء جبریل الی النبی ﷺ فقال یا محمد سل ربک (قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء) الی قوله (وترزق من تشاء بغیر حساب) ثم جاء جبریل فقال یا محمد فسل ربک قل رب ادخلنی مدخل صدق" الآیة. فسأل ربه بقول الله تعالی فاعطاه ذلک" (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جبریل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا "اے محمد ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے سوال کرو، مکمل آیۃ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ بطور دعاء پڑھنے کے متعلق رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، پھر جبریل حاضر ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو کہا آپ بطور دعاء مکمل آیۃ ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ پڑھیں نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق دونوں دعائیں کردیں تو آپ کی دونوں دعاؤں کو رب تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔

(۳) "وقیل ان الیهود قالوا والله لانطیع رجلا جاء بنقل النبوة من بنی اسرائیل الی غیرهم فنزلت هذه الآیة" (خازن)

شان نزول کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بعد نبوت آپ کی اولاد میں آرہی تھی، لیکن نبی کریم ﷺ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تشریف لائے تو یہود حسد سے جل گئے وہ کہنے لگے کہ ہم تو اس شخص پر ایمان نہیں لاتے جو نبی اسرائیل سے نبوت کو دوسرے خاندان کی طرف منتقل کرنے کیلئے آگیا، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ ملک نبوت تو رب تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہے جسے چاہے عطاء فرمادے، اس کی مشیت پر کسی کو دم مارنے کی جرأت حاصل نہیں۔

(۴) "روی الواحدی عن ابن عباس وانس بن مالک انه لما افتتح رسول الله ﷺ مکة وعدامته ملک فارس والروم قالت المنافقون والیهود هیهات هیهات من این لمحمد ملک فارس والروم هم اعزوامنع من ذلک الم یکف محمد امکة والمدینة حتی یطمع فی ملک فارس والروم، فانزل الله

تعالی هذه الآیة" (روح المعانی)

واحدی نے حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ پر اپنی امت سے وعدہ فرمایا کہ روم اور فارس کے ممالک بھی تمہیں حاصل ہوں گے۔ تو منافقین نے اور یہود کہنے لگے یہ بہت بعید ہے، یہ کام محمد سے کیسے ہو سکے گا کہ فارس اور روم کے ممالک کو فتح کر لے، ان لوگوں کو بڑی طاقت حاصل ہے، وہ بہت بڑی دفاعی طاقت رکھتے ہیں تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

(۵) ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ یوم احزاب کو دس دس صحابہ کرام کو چالیس چالیس ذراع (ساٹھ فٹ) خندق کھودنے کا حکم دیا، ایک جگہ پر چٹان آ گئی صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کو بتایا، آپ نے کندال کی ضرب لگائی تو وہ چٹان ریت کے ٹیلے کی طرح ذرہ ذرہ ہو کر ٹوٹ گئی، آپ نے پہلی ضرب پر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ "وقال علیہ السلام اضاء ت لی منها قصور الحیرة" نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے حیرہ کے محلات روشن کر دیئے گئے۔ پھر دوسری ضرب پر آپ نے فرمایا "اضاء ت لی منها القصور الحمر من ارض الروم" مجھ پر اس ضرب سے روم کی زمین کے سرخ محلات روشن کر دیئے گئے۔

پھر تیسری ضرب پر آپ نے فرمایا "اضاء ت لی منها قصور صنعا" مجھ پر صنعاء کے محلات روشن کر دئے گئے۔ اور ساتھ یہ ارشاد فرمایا "واخبرنی جبریل علیہ السلام ان امتی ظاهرة علی کلها فابشروا" اور مجھے جبریل نے خبر دی ہے کہ آپ کی امت ان تمام مقامات کو فتح کر لے گی، اس لئے تم خوش ہو جاؤ، آپ کے اس ارشاد پر منافقین کہنے لگے "کیا تمہیں تعجب نہیں کہ تمہارے نبی تمہارے ساتھ باطل وعدہ کرتے ہیں (معاذ الله) اور تمہیں یہ خبر دیتے ہیں کہ وہ یثرب سے حیرہ کے محلات دیکھ رہے ہو اور کسری کے شہر دیکھ رہے ہیں، اور یہ مقامات مسلمان فتح کر لیں گے، ادھر تم خندق کھود کر اپنا دفاع کر رہے ہو اور کفار سے ڈر کی وجہ سے خندق سے نہیں نکل رہے ہو تو اللہ تعالی نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا، اور منافقین کا رد کیا، وہ اللہ تعالی کی قدرت سے بے خبر تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿قُلْ﴾ "عرض کرو"

طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ کبھی امر کیلئے ہی استعمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر یہ کہے کہ یہ کام کر، تو اسے امر کہا جاتا۔ اور جب ایک شخص اپنے آپ کو دوسرے کے برابر سمجھ کر یہ کہے کہ یہ کام کر تو اسے التماس کہا جاتا ہے۔ اور اگر اپنے آپ کو چھوٹا (کم مرتبہ) سمجھ کر بڑے کو یہ کہے کہ یہ کام کر تو اسے دعاء اور عرض کہا

جاتا۔ یہاں ﴿قُــلْ﴾ کہہ کر نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ تم رب تعالیٰ کے حضور عرض کرو، یہی خوبصورت ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے، جسے راقم نے بھی نقل کردیا ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ﴾ ''اے اللہ''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے: ''اللھم'' اصل میں ''یا اللہ'' ہوتا ہے حرف نداء کو حذف کیا جاتا ہے، اور اس کے عوض آخر میں ''میم'' زیادہ کرلیا جاتا ہے، یہی قول زیادہ مشہور ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اصل میں ہوتا ہے ''اللھم امنا بخیر ای اقصدنا'' حرف نداء کو حذف کردیا گیا، ''امنا'' ام ینوم اما'' سے ماخوذ ہے، ''نا'' ضمیر منصوب متصل ہے یعنی معنی یہ ہے ''اے اللہ ہماری بھلائی کا ارادہ فرما۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

﴿مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ ''ملک کے مالک''

کیا شان ہے قرآن پاک کی: بڑا مختصر لفظ ''مالک الملک'' ہے، لیکن بڑے معانی پر مشتمل ہے۔

(۱) ملک، کا معنی ہے ''قدرۃ'' اور ''مالک'' کا معنی ہے، قادر اب معنی یہ ہوگا ''القادر علی القدرۃ'' قدرت پر قادر یعنی مخلوق کو جو قدرت حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطاء سے ہے وہی ہر مقدور پر قادر ہے وہی ہر مملوک کا مالک ہے۔

(۲) ''مالک الملک'' کا معنی ہے جنس ملک کا مالک، وہ تصرف فرماتا ہے اپنے ملک میں، جیسا کہ بادشاہ اپنے اپنے ملکوں میں تصرف فرماتے ہیں۔

(۳) ملک نبوۃ ورسالت مراد ہو کہ ''اے اللہ تو ہی نبوت ورسالت'' کا مالک ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَقَدْ آتَیْنَا آلَ اِبْرَاھِیْمَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَآتَیْنَاھُمْ مُلْکًا عَظِیْمًا﴾ (تو ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطاء فرمائی اور انہیں بڑا ملک دیا۔ ''والنبوۃ اعظم مراتب الملک'' نبوت ملک کے مراتب میں سے عظیم مرتبہ ہے:

''لان العلماء لھم امر عظیم علی بواطن الخلق والجبابرۃ لھم امر علی ظواھر الخلق والانبیاء امرھم نافذ فی البواطن والظواھر''

اس لئے کہ علماء کو مخلوق کے باطنی امور پر امر عظیم حاصل ہے، اور جابر لوگوں کو مخلوق کے ظاہر پر امر حاصل ہوتا ہے، اور انبیاء کرام کے امور ظاہر و باطن پر نافذ ہیں۔

لیکن باطنی امور کے حاصل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کی امت میں سے ہر شخص پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان کے دین کو اور ان کی شریعت کو قبول کر لے، اور یہ عقیدہ رکھے کہ بیشک نبی برحق ہیں اور ان کے اقوال حق پر ہیں ظاہری امور کے حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ ان کے سامنے سرکشی اور تکبر سے کام لیں ان کے احکام کا انکار کریں، ان کی نبوت کا انکار کریں تو ان کو قتل کرنا واجب ہو جاتا ہے بعض کفار نے یہ بعید سمجھا کہ ''بشر کو رسول بنا کر بھیجا جائے'' جیسا کہ ان کے قول کی رب تعالی نے حکایت بیان فرمائی ﴿اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَسُوْلًا﴾ کیا اللہ تعالی نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا۔ تو اللہ تعالی نے ان کا یوں رد فرمایا ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا﴾ اگر ہم (نبی) کسی فرشتے کو بناتے تو اسے بھی مرد بناتے ''یعنی وہ بھی انسانی اور مرد کی شکل میں آتا''

کچھ اور کفار نے یہ کہا کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی بشر کو رسول بنا کر بھیجے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے محمد یتیم اور فقیر ہیں، ان کو عظیم منصب یعنی منصب نبوت کس طرح عطاء کیا گیا۔ ان کے قول کی حکایت رب تعالی نے یوں بیان فرمائی ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ یہ قرآن دو بستیوں (مکہ و طائف) میں سے کسی بڑے شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ تو ان لوگوں کا رد یوں فرمایا ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ خوب جانتا ہے جہاں اس نے منصب رسالت رکھنا ہے۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت تو ہمارے آباء واجداد میں آ رہی تھی، محمد (ﷺ) کو نبوت کیسے مل گئی اس طرح تو قریش جن کے پاس نبوت نہیں آ رہی تھی وہ بھی یہود کی طرح یہی کہہ رہے کہ محمد کو کیسے نبوت عطاء کر دی گئی۔

منافقین آپ سے نبوت پر حسد کر رہے تھے، ان سب لوگوں کو جواب رب تعالی نے یوں دیا ﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ کیا یہ لوگوں پر حسد کرتے ہیں اس پر کہ اللہ نے ان کو عطاء کیا اپنے فضل سے۔

''ثم انه تعالى رد على جميع هؤلاء الطوائف بان بين انه سبحانه هو مالك الملك فيؤتي ملكه من يشاء فقال (تؤتي الملك من تشاء)

پھر اللہ تعالی نے نبوت کے منکرین وحاسدین کے تمام گروہوں کا اس آیۂ کریمہ کو نازل کر کے رد فرمایا کہ ''مالک الملک' وہی ہے، جسے چاہے ملک نبوت ورسالت کا مالک بنا دے۔ (از کبیر)

اعتراض: اگر ﴿تُؤْتِى الْمُلْكَ﴾ سے مراد ''ملک نبوت کا عطاء کرنا'' لیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ کا مطلب یہ لیا جائے ''انه قد يعزل عن النبوة من جعله نبيا'' بیشک وہ جسے نبی بناتا ہے کبھی اسے معزول بھی کر دیتا ہے۔ ''ومعلوم انه ذلك لا يجوز'' اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے

کہ کسی منصب سے نبوت سے معزول کرنا جائز نہیں۔

پہلا جواب: اللہ تعالی نے نبوت جب ایک خاندان میں رکھی ہو پھر اس خاندان سے دوسرے خاندان کی طرف منتقل کردے "صح ان یقال انه تعالی نزعها منهم" تو صحیح ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالی نے فلاں خاندان سے نبوت کو ہٹا دیا ہے۔ یہود جب یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ نبوت بنی اسرائیل میں ہی ضروری ہے۔

"فلما شرف الله محمدا ﷺ بها صح ان یقال انه ینزع ملک النبوة من نبی اسرائیل الی العرب"

تو جب اللہ تعالی نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبوت سے مشرف فرمایا، تو یہ کہنا صحیح ہے کہ "ملک نبوت کو بنی اسرائیل سے ہٹا کر عرب کو عطاء کر دیا گیا۔

دوسرا جواب: "وتنزع الملک ممن تشاء" کا معنی یہ ہے "تحرمهم ولا تعطیهم هذا الملک لا علی معنی انه یسلبه ذلک بعد ان اعطاه"

کہ اللہ تعالی جنہیں چاہے نبوت سے محروم کردے اور ان کو نبوت نہ عطاء کرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبوت عطاء کرے پھر کسی کو محروم کردے، جیسا کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ اللہ ولی ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان والے پہلے تمام ظلمت کفر میں مبتلاء ہوتے ہیں تو اللہ تعالی ان کو اس سے نکالتا ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی ایمان والوں کو کفر کی تاریکی سے دور رکھتا ہے۔ اسی طرح رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا﴾ اگر چہ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے "تم ہمارے دین میں لوٹ کر آجاؤ" حالانکہ یہ معنی درست نہیں کیونکہ انبیاء کرام کا کافروں کے دین پر ہونا پھر ایمان کی طرف آنا، پھر کافروں کا مطالبہ کرنا کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ یہ مطلب لینا محال ہے، ہاں البتہ یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ (تم ہمارے دین میں آجاؤ) (ماخوذ از کبیر)

ملک عطاء کرنے کا ایک اور مطلب:

ملک سے مراد وہی ہو جو عرف عام میں مراد لیا جاتا ہے۔ ملک چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱) مال زیادہ عطاء کرنا اور زیادہ مرتبہ عطاء کرنا۔ مال کی زیادتی میں، سونا، چاندی روپے داخل ہیں، اور سامان، مکانات، اور کھیتی، اور تمام جانور داخل ہیں۔ مرتبہ کی زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاں بارعب ہوتا ہے، اس کی بات کو قبول کیا جاتا ہے۔ اور مخلوق اس کی اطاعت کرتی ہے۔

(۲) ملک کی عطاء میں یہ بھی ہے کہ غیروں پر اس کی اطاعت کو واجب کر دیا جاتا ہے، اور اس کے امر و نہی کو لوگوں پر لازم کر دیا جاتا ہے۔

(۳) ملک کے عطاء کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ جب کوئی اس کے ملک میں جھگڑا کرتا ہے، تو یہ اس پر قہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اور اس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ ''**ومعلوم ان کل ذلک لا یحصل الا من الله تعالی**'' معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالی سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ بڑے عقلمند شخص بڑی محنت کرنے کے باوجود، اور مشقت اٹھانے کے باوجود زیادہ مال نہیں حاصل کر سکتے، بلکہ تھوڑے مال کے ہی مالک ہوتے ہیں۔ اور ہم کئی بے وقوف جاہل اور غافل لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس اتنا مال ہوتا ہے کہ اس مال کی مقدار کو معلوم کرنا عام شخص کی طاقت میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کئی بادشاہ رعب حاصل کرنے کیلئے مال خرچ کرتے ہیں، لیکن ہر روز ان کی قدر و منزلت کم ہوتی رہتی ہے، وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بادشاہ جن کے عقائد صاف ستھرے ہوتے ہیں، عمل اچھے ہوتے ہیں، عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں ان کا قدرتی رعب ہوتا ہے، ہر چھوٹا، بڑا ان کی عزت کرتا ہے، ان کے قریب رہنے والے ہوں یا دور ہوں سبھی ان سے محبت کرتے ہیں۔

راقم نے یہی حال اساتذہ میں بھی دیکھا، کئی رعب جما کر، **ڈنڈے** برسا کر، طلباء کو ذلیل کر کے بھی رعب حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ طلباء کی نظر میں حقیر ہوتے ہیں اور کئی طلباء پر شفقت کر کے، عجز اختیار کر کے طلباء کے دلوں میں بس جاتے ہیں۔ ﴿ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾

واضح ہوا کہ مال کی زیادتی اور مرتبہ کی زیادتی اللہ تعالی کی عطاء سے ہے، جسے چاہے عطاء فرما دے، اس میں انسان کے عقل و فکر کو دخل حاصل نہیں۔ اسی طرح کسی کو واجب الطاعۃ بنانا کہ لوگ اس کی اطاعت کریں، یہ رب تعالی کی عطاء سے ہے بندہ خود یہ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ملک کا دفاع، نصرت اور کامیابی کا حصول بھی اللہ تعالی کی عطاء سے ہے، ﴿کَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً کَثِیۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ کتنی ہی چھوٹی جماعتوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ اللہ تعالی کے حکم (اس کے فضل و کرم) سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ (ماخوذ از کبیر)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہئے چھین لے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالی کسی کو پسند کر لے تو ملک دے دے، اور نہ پسند کرے تو اس سے ملک چھین لے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے ''فیؤ تیه بالاستحقاق من یقوم به'' کہ اللہ تعالی ملک اسے عطاء کرتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔

"ولا ینزعه الاممن فسق عن امر ربه" ویدل علیه قوله تعالی (لا ینال عهدی الظالمین)

اللہ تعالیٰ ملک صرف اسی سے چھینتا ہے جو اس کے احکام سے عدول کر کے فسق کا مرتکب ہو، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ (میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا) (اس آیۃ کریمہ سے استدلال باطل ہے کیونکہ اس میں نبوت نہ دینے کا ذکر ہے) جبائی معتزلی کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ملک صرف عادل لوگوں کو عطاء کرتا ہے، ظالموں کو عطاء نہیں کرتا۔

اہلسنت کا مذہب: اللہ تعالیٰ جسے چاہے ملک عطاء فرماتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ عادل اور نیک ہی ہو، رب تعالیٰ بعض اوقات ظالموں اور فاسقوں کو بھی ملک عطاء کر دیتا ہے، صرف ملک نبوت کے ساتھ تخصیص ہے کہ وہ صالحین کو عطاء کرتا ہے ظالمین کو نہیں عطاء کرتا، بادشاہت کے ساتھ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی عادل سے حکومت چھین لے یہ اس کے اختیار کی بات ہے، اسی طرح چاہے تو ظالم سے حکومت چھین لے۔

ملک کو چھیننے کی چند وجوہ:

کبھی بادشاہ کی موت کی وجہ سے اس کی حکومت کا زوال ہوتا ہے، کبھی عقل کے زوال سے اس کے ملک کا زوال ہوتا ہے۔ کبھی قدرت، قدر، حواس کے زوال سے اس کے ملک کا بھی زوال ہو جاتا ہے، کبھی مال کی ہلاکت و بربادی سے اس کی حکومت کا زوال ہو جاتا ہے کیونکہ مفاد پرست چمچے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، فوجی منہ موڑ لیتے ہیں تو دوسرے ممالک کے بادشاہ اس پر غالب آجاتے ہیں جو اس کے ملک کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ کبھی اپنے ہی ملک کے لٹھ بردار حاکم بننے کی خواہش کی وجہ سے شرفاء کی حکومت کے زوال کا سبب بنتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کے عطاء کرنے اور چھیننے کی وجہ سے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات ہے، چاہے تو ظالموں کو حکومت دے دے اور چاہے تو نیکوں سے حکومت چھین لے۔

ظالم کو بادشاہت رب تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے:

اگرچہ عقلی احتمال تین ہیں لیکن دو باطل ہیں ایک صحیح ہے، دو جو باطل ہیں وہ یہ ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بادشاہ کو بغیر کسی سبب سے بادشاہت حاصل ہو، یہ قول باطل ہے کیونکہ اس میں صانع و خالق کی نفی ہوتی ہے، حالانکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی خلق میں داخل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کہا جائے کہ ظالم کو ملک اسباب ربانیہ سے

حاصل ہوا، یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اسباب ربانیہ تو تمام مخلوق کیلئے ایک جیسے ہیں، اور ہر شخص بادشاہت حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتا ہے، لیکن سب کو وہ حاصل نہیں ہوتی۔ تیسرا قول ہی معتبر ہے، وہ یہ ہے "ان ملک الظالمین بایتاء الله تعالٰی" بیشک ظالموں کو ملک اللہ تعالیٰ کی عطاء سے حاصل ہے۔

﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾

''تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہتا ہے اور تو چھین لیتا ہے ملک جس سے تو چاہے۔''

ان الفاظ مبارکہ کا مفہوم کافی حد تک واضح ہو چکا ہے جو ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ کی بحث میں بیان ہو چکا ہے، اب مختصر طور پر اتنا سمجھ لیا جائے ''تو جسے چاہے ملک عطاء کرتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ملک کی جمیع اقسام کو شامل ہے، اس میں ''ملک نبوت داخل ہے، ملک علم، ملک عقل، ملک صحت، ملک اخلاق حسنہ، ملک نفاذ، ملک قدرت، ملک اموال داخل ہیں۔ یعنی تو جسے چاہے ملک نبوت عطاء کر دے، جسے چاہے علم عطاء کر دے، سب چیزوں کو اسی طرح بیان کر لیں۔ ﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ میں بھی عموم ہے، مذکورہ بالا تمام چیزیں داخل ہیں، البتہ نبوت کا چھیننا بظاہر درست نہیں، اس کا مطلب وہی جو سوال و جواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک خاندان سے نبوت ہٹا کر دوسرے کو دے دیتا ہے، یا کچھ کو نبوت عطاء فرماتا ہے اور باقیوں کو محروم کر دیتا ہے بس یہی دو معنی ''نزع ملک نبوت'' کے ہیں۔

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾

''اور تو عزت دیتا ہے جسے تو چاہے اور تو ذلت دیتا ہے جسے تو چاہے''۔

یہ بات واضح رہے کہ ''ان العزة قدتكون فی الدين وقدتكون فی الدنيا'' بیشک عزت کبھی دین میں حاصل ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں۔ دین میں عزت کی قسموں میں اعلیٰ واشرف یہ ہے کہ ایمان حاصل ہوا، کیونکہ وہ عزت جسے رب تعالیٰ عزت کہے وہ مومنوں کو ہی حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور اللہ کیلئے عزت ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مومنین کیلئے۔

"لما كان اعز الاشياء الموجبة للعزة هو الايمان واذل الاشياء الموجبة للمذلة هو الكفر"

جب کہ عزت کیلئے سب سے اعلیٰ واشرف ایمان ہے، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ ذلت کیلئے سب سے حقیر اور گھٹیا چیز کفر ہے۔

عزت دینیہ اور ذلت کے حصول میں اگر چہ بظاہر بندے کے کسب کو بھی دخل ہے، لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی خلق سے ہی سب کچھ حاصل ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، اور تمہارے عملوں کو۔ "لھذا عزت وذلت عطاء کرنا" رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

عزت کبھی دنیا میں حاصل ہوتی ہے:

اللہ تعالیٰ کثیر مال عطاء کرتا ہے، سونا، چاندی، روپے، اور حیوانات، اور کھیتی، اور اللہ تعالیٰ اس کا رعب کثیر دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی دنیا اور آخرت میں مدح وتعظیم بندے کو اللہ تعالیٰ کی عطاء سے حاصل ہوتی ہے، بندے کی عقل وفراست کی بات نہیں، اگر چہ بندے کے کسب کو دخل ہوتا ہے۔

ذلت عطاء کرنے میں جبائی معتزلی کا مذہب:

لیکن راقم کو بھی یہ پسند ہے، کیونکہ اہل سنت کا مذہب بھی اس کے قریب ہے، جبائی کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو دنیا اور آخرت میں ذلیل کرتا ہے، اور اپنے اولیاء کو ذلیل نہیں کرتا، البتہ کبھی ان کو فقر ومحتاجی اور مرض عطاء کرتا ہے، لیکن اسے ذلت نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ اعزاز ہے کیونکہ اس کے بدلے رب تعالیٰ دنیا وآخرت میں ثواب وعزت عطاء فرماتا ہے۔

"فصار ذلک کالفصد والحجامة فانهما وان کانا یؤلمان فی الحال الاانهما لما کانا یستعقبان نفعا عظیما لاجرم لایقال فیها انهما تعذیب"

یہ اسی طرح ہے جس طرح خون نکالنا اور پچھوا لگانا بظاہر درد کا سبب ہے، لیکن اس پر صحت جیسا عظیم فائدہ مرتب ہوتا ہے، اسے عذاب نہیں کہا جاتا، اہل سنت کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو ایمان عطاء کر کے عزت عطاء فرماتا ہے، اور بعض کو کفر عطاء کر کے ذلیل کرتا ہے۔ بندے کا ایمان وکفر بندے کے کسب واختیار سے ہوتا ہے، لیکن اختیار رب تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہوتا ہے، اور وہی تمام افعال کا خالق ہے، اس لئے بندوں کے افعال رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

ایک غلطی کا ازالہ:

لوگوں میں جو یہ مشہوت ہے کہ "جسے ملک عطاء کردیا گیا اسے عزت عطاء کردی گئی اور جس سے ملک چھین

لیا گیا اسے ذلیل کر دیا گیا'' یہ درست نہیں یہ چار جملے علیحدہ علیحدہ ہیں، اور ان کے مطالب بھی چار ہیں۔

(۱) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک عطاء کر کے عزت بھی عطاء کر دی جاتی ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ اور اس قسم کے عادل و صالح حکمران، ان کو ملک عطاء کیا گیا اور ساتھ ساتھ عزت بھی عطاء کی گئی۔

(۲) ملک عطاء کر کے ذلیل کر دیا جائے جیسا کہ کفار بادشاہ فرعون، نمرود، بخت نصر اور ظالم وفاسق حکمرانوں کو ملک عطاء کر کے ذلیل کر دیا جاتا ہے، یہ بات واضح ہے کہ ایمان، تقوی اور نیکیوں سے عزت عطاء ہوتی ہے، اور کفر وفسق اور بدکاری وظلم سے ذلت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) ملک لے کر ذلیل کر دیا جائے، کافر اور ظالم، فاسق وفاجر حکمرانوں سے ملک لے کر انہیں ذلیل کر دیا جاتا ہے، وہ پہلے بھی حکمرانی کے دور میں ذلیل تھے، اور ان سے ملک لے کر انہیں اور زیادہ ذلیل کر دیا جاتا ہے۔

(۴) ملک لے کر عزت عطاء کی جاتی، جیسا کہ حضرت امام حسن ﷺ سے ملک لے کر ان کو عظیم مرتبہ عطاء کیا گیا۔ کیونکہ ان کی شان مصطفیٰ کریم ﷺ اپنی ظاہری حیات میں یوں بیان فرما گئے

''ان النبی هذا سید ولعل الله ان یصلح بین فئتین عظیمتین من المسلمین'' (بخاری، مشکوۃ من قب اھل البیت)

بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہوگا اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کو دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ یہ منصب آپ کو اسی وقت حاصل ہوا جب آپ نے ملک سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو خون خرابہ سے بچالیا۔

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ ''تیرے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے۔''

''فاعلم ان المرادمن الید هو القدرة والمعنی بقدرتک الخیر والالف واللام فی الخیریوجبان العموم فالمعنی بقدرتک تحصل کل البرکات والخیرات'' (کبیر)

واضح ہو کہ بیشک ''ید'' سے مراد ''قدرت'' ہے، اور معنی یہ ہے کہ تیرے قبضہ قدرت میں خیر ہے، اور ''الخیر'' پر الف لام'' عموم پر دلالت کرتے ہیں، اب مطلب یہ ہو گیا کہ تیرے قبضہ قدرت میں ہر برکت اور ہر بھلائی حاصل ہوتی ہے۔

''بیدک'' ظرف پہلے ہے، اور ''الخیر'' بعد میں ہے، جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ معنی یہ ہو گیا ''بیدک الخیر لا بید غیرک'' تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے، تیرے بغیر کسی اور کے ہاتھ میں ہر بھلائی

نہیں، جب یہ پتہ چل گیا کہ "بیدک الخیر" میں حصر پائی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ''رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی ہے۔ کسی اور کے ہاتھ میں ہر بھلائی نہیں۔ اسی سے پتہ چلا

''ان جمیع الخیرات منه وبتکوینه وتخلیقه وایجاده وابداعه''

بیشک تمام بھلائیاں رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتی ہیں، وہی ان کا خالق ہے، وہی ان کا مکون ہے، وہی ان کا موجد ہے، وہی ان کا مبدع ہے۔

''اذا عرفت هذا فنقول افضل الخیرات هو الایمان بالله تعالی ومعرفته''

جب تو یہ پہچان چکا ہے تو ہم کہتے ہیں سب بھلائیوں سے افضل اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ جب بھی ایک کام کو دو شخص کریں تو ایک کام افضل واشرف واکمل ہوتا ہے بنسبت دوسرے کے یہ اسی وقت ہوتا ہے جب فاعل افضل واشرف واکمل ہو۔

جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا سب چیزوں سے افضل ہے' تو اسی سے پتہ چل گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔

"فلو کان الایمان بخلق العبد لا بخلق الله لوجب کون العبد زائدا فی الخیریة علی الله تعالی وفی الفضیلة والکمال وذلک کفر قبیح"

اگر یہ کہا جائے کہ ایمان بندے کی تخلیق ہے، اللہ کی تخلیق نہیں (معاذ اللہ) تو اس سے یہ لازم آئے گا بندہ بھلائی میں اللہ تعالیٰ پر زائد مرتبہ رکھتا ہے، اور فضیلت وکمال میں رب تعالیٰ سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بندے کی تخلیق یعنی ایمان سب سے افضل ہے، جو بندے کی افضلیت پر دلالت کر رہا ہے، یہ قول صریح کفر ہے۔

اعتراض: جب یہ کہا گیا کہ "بیدک الخیر' حصر کا معنی دے رہا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ

''انه لیس بیدک الا الخیر'' وهذا یقتضی ان لا یکون الکفر والمعصیة واقعین بتخلیق الله''

بیشک اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں صرف خیر ہے، لھذا اس حصر کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ کفر اور معصیت اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہ ہوں۔ (اس سے تو معتزلہ اور مجوسیوں کا مذہب ثابت ہوگا)

جواب: یہ حصر ثابت ہی نہیں جو تم نے بیان کی ہے، حصر تو وہی ثابت ہے جو ہم نے ذکر دی ہے۔ ''ان بیده الخیر لا بید غیره'' بیشک اسی کے قبضہ قدرت میں ہر بھلائی، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں، اس سے یہ ثابت کرنا کہ اللہ تعالیٰ صرف خیر کا خالق ہے شر کا خالق نہیں یہ قول سراسر باطل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

خیر کو ذکر کیا گیا، شر کو نہیں، کیا وجہ؟

"وانما خص الخیر بالذکر تعلیما لمراعاۃ الادب والا فذکر الاعزاز والاذلال یدل علی ان الخیر والشر کلاھما بیدہ سبحانہ" (روح المعانی)

خیر کو ذکر کیا گیا ہے، شر کا ذکر نہیں کیا گیا، اس کی وجہ ادب کی رعایت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، کہ براہ راست رب تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت نہ کی جائے۔ جب اس سے پہلے یہ ذکر دیا گیا کہ عزت عطاء کرنا اور ذلت دینا رب تعالیٰ کا ہی کام ہے، تو اس سے پتہ چل گیا کہ خیر ہو یا شر سب رب تعالیٰ دست قدرت میں ہیں۔

﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ "بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

اس سے پہلے جب یہ ذکر کیا گیا کہ "اے اللہ ملک کے مالک، تو عطاء کرتا ہے ملک جسے تو چاہتا ہے، اور چھین لیتا ہے تو ملک جس سے تو چاہے، اور تو عزت عطاء کرتا ہے جسے چاہے، اور تو ذلت دیتا ہے جسے چاہے۔ اب یہ جملہ ﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ بطور تاکید ذکر کیا کہ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے، اسی وجہ سے ملک عطاء کرنا، عزت عطاء کرنا یا ذلت تیرے قبضہ قدرت میں ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: شر کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے لحاظ سے تمام چیزوں کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ قسم جس میں شر بالکل نہ پایا جائے۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جس میں شر پایا جائے لیکن خیر اس میں غالب ہو۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جس میں صرف شر پایا جائے، خیر بالکل نہ ہو۔

(۴) چوتھی قسم وہ ہے جس میں شر اور خیر دونوں پائے جائیں لیکن شر غالب ہو خیر پر۔

(۵) پانچویں قسم وہ ہے جس میں شر اور خیر برابر برابر پائے جائیں۔

پہلی اور دوسری قسم میں شر مقصود بالذات نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے فیصلہ کے مطابق تھوڑے شر کو عظیم بھلائی اور بہت بڑے نفع کا سبب بنالیا جاتا ہے۔

"والشر الیسیر متی کان وسیلۃ الی الخیر الکثیر کان ارتکابہ مصلحۃ تقتضیھا الحکمۃ ولا یأباھا الکرم المطلق"

تھوڑا شر جب خیر کثیر کا ذریعہ بنے تو اس کا ارتکاب مصلحت ہوتا ہے، رب تعالیٰ کی حکمت اس کا تقاضا

کرتی ہے، رب تعالی کا مطلق کرم اسے منع نہیں کرتا۔ جیسا کہ خون نکلوانا، کڑوی دوا پینا، بظاہر تکلیف دہ چیزیں ہیں، لیکن حقیقت میں نفع مند ہیں حکمت کے تقاضا کے مطابق ہیں۔''

وکل قضاء اللہ تعالی بما نزاہ شرا من ھذاالقبیل'' اللہ تعالی کا ہر وہ فیصلہ جس کو ہم بظاہر شر سمجھیں وہ حقیقت میں اللہ تعالی کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے، اسی پر توکل ہو، اور اس پر راضی وشاکر ہو، حدیث شریف میں آتا ہے ''**لاتتھم اللہ تعالی علی نفسک**'' اللہ تعالی اپنی ذات پر کوئی تہمت نہیں آنے دیتا۔ (راقم نے معنی کو آسان طریقہ پر ذکر کیا ہے)

اور حدیث میں آتا ہے ''**لا تکرھوا الفتن فان فیھا حصاد المنافقین**'' فتنوں کو ناپسند نہ کرو، ان میں منافقوں کی جڑوں کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے ''**لولم تذنبوا لحفت علیکم ما ھو اکبر من ذلک العجب العجب**'' اگر تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوتا تو تمہیں اس سے بڑی چیزیں اپنی لپیٹ میں لے لیتیں، جو بہت ہی زیادہ باعث تعجب ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اگر خیر کے حصول کیلئے شر کا سامنا کرنے پڑے تو شر کے ارتکاب کی رب تعالی سے معافی طلب کر لے، اور خیر کو حاصل کرے۔ (از روح المعانی)

لیکن یہ اسی وقت ہے جب خیر کثیر ہو، اور شر قلیل ہو، بغیر شر قلیل کے ارتکاب کے خیر کثیر کو حاصل کرنا ممکن نہ ہو۔ لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ آجکل شر کثیر کو حاصل کرنے کیلئے خیر قلیل کا سہارا لیا جاتا ہے۔

﴿قرض اتارنے کی دعاء﴾

"وقال معاذ بن جبل احتبست عن النبی ﷺ یوما فلم اصل معہ الجمعۃ، فقل یا معاذ ما منعک من صلوۃ الجمعۃ؟ قلت یا رسول اللہ ﷺ کان لیوحنابن باریا الیھودی علی اوقیۃ من تبر و کان علی بابی یرصدنی فاشفقت ان یحبسنی دونک، قال قل کل یوم "قل اللھم مالک الملک" الی قولہ بغیر حساب رحمن الدنیا والآخرۃ ورحیمھما تعطی منھما من تشاء و تمنع منھما من تشاء اقض عنی دینی فلو کان علیک مل ء الارض ذھبا لاداہ اللہ عنک" (قرطبی واخرج ابن ابی الدنیا، درمنثور واخرج الطبرانی)

حضرت معاذ بن جبل ؓ فرماتے، میں ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے حاضر نہ ہو سکا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا، تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے ایک یہودی کا قرض دینا تھا، وہ میرے دروازے پر آ گیا تھا، میں اس کے ڈر کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، آپ نے فرمایا، اے معاذ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا قرض اتر جائے؟ تو میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا تم یہ دعاء پڑھ لیا کرو تمہارا قرض اتر جائے گا، خواہ کتنا زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ (وہ دعاء یہ ہے)

(قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ الْحِسَابِ رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِیْمَهُمَا تُعْطِیْ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ وَتَمْنَعُ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ اِقْضِ عَنِّی دَیْنِیْ"

نتیجہ واضح ہوا:

کہ رب تعالی کے دست قدرت میں ہے، جسے چاہے ملک وحکومت عطاء کرے حکمت وہی جانتا ہے، البتہ بظاہر یہ ضروری نہیں کہ حکومت اسے ہی دی جائے جو اہلیت رکھتا ہو، کبھی نااہل، بدھولوگ بھی ڈنڈے کے زور سے حکومت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح رب تعالی جب چاہے کسی سے ملک چھین لے، حکمت تو رب تعالی ہی جانتا ہے، لیکن بظاہر عقلمند، زیرک، شریف لوگوں کی حکومت کو برخواست کیا جاتا ہے۔

اسی طرح جسے چاہے اسے عزت فرمائے، وہ عزت نیکیوں کی توفیق عطاء کرکے عطاء کر دے، خواہ نیک شخص کو ملک عطاء کر کے عزت دے دے۔ اور رب تعالی کے دست قدرت میں ہے جسے چاہے ذلت عطاء کر دے، یعنی گناہوں میں کوئی شخص مبتلاء ہو کر ذلیل ہو جائے، یا کسی نااہل سے حکومت لے کر اسے ذلیل کر دیا جائے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (آیة نمبر ۲۷)

(1) تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے اور مردہ سے زندہ نکالے اور زندہ سے مردہ نکالے اور جسے چاہے بے گنتی دے۔

(2) تو داخل کرتا ہے رات (کے حصہ) کو دن میں، اور تو داخل کرتا ہے دن (کے حصہ) کو رات میں اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور تو رزق دیتا ہے، جسے تو چاہے بغیر حساب کے۔

راقم کا ترجمہ:

جلالین، مظہری وغیرہ کے مطابق ہے ﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ﴾ یعنی تدخل احدهما فی الاخر" مطلب یہ ہے کہ "تولج" باب افعال سے ہے "اولج یولج ایلاجا" مجرد میں "ولج یلج ولجا" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنیٰ "داخل ہونا" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (یہاں تک کہ داخل ہو جائے اونٹ سوئی کے سوراخ میں، یعنی "یلج" کا معنیٰ داخل ہونا، "یولج، تولج" کا معنیٰ داخل کرنا۔

روح المعانی، مدارک اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ:

یعنی روح المعانی اور مدارک میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ان دونوں تفاسیر کے مطابق ہے، میں جب دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نے کتنی محنت اور کتنی تفاسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے تو دل سے دعاء نکلتی ہے اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی قبر پر ان گنت رحمتیں نازل فرمائے اور آخرت میں مدارج بلند فرمائے، آیئے دیکھئے، تفسیر مدارک میں علامہ نسفی رحمہ اللہ قمطراز ہیں:

"فالاج ادخال الشئ فی الشئ وهو مجاز هنا ای تنقص من ساعات اللیل وتزیدفی النهار وتنقص من ساعات النهار وتزید فی اللیل" (مدارک)

"ایلاج" کا معنیٰ ہے ایک چیز کو دوسری میں داخل کرنا، یہاں مجازی معنیٰ لیا گیا ہے کہ تو رات کی ساعتوں کو کم کرکے دن

کو زیادہ کرتا ہے اور دن کی ساعتوں کو کم کر کے رات کو زیادہ کرتا ہے۔

"الولوج فی الاصل الدخول والایلاج الادخال واستعیر لزیادۃ زمان النهار فی اللیل وعکسه بحسب المطالع والمغارب فی اکثر البلدان" (روح المعانی)

"ولــوج" کا اصل میں معنی ہے دخول، اور ایلاج کا معنی ہے داخل کرنا، اور یہاں مجازی طور پر مراد یہ لیا گیا ہے دن کا وقت رات میں زیادہ کرلیا جاتا ہے، اور اس کا عکس یعنی رات کا وقت دن میں زیادہ کرلیا جاتا ہے، یہ طلوع اور غروب کے لحاظ پر اکثر شہروں میں پایا جاتا ہے کہ کبھی دن چھوٹا ہو گیا اور رات بڑی، اور کبھی رات چھوٹی ہو گئی اور دن بڑا۔ اب آپ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کو دیکھئے (تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے) تو بہت خوب نظر آئے گا۔

تنبیہ: **"ولایضر تساوی اللیل والنهار دائما عند خط الاستواء لانه یکفی الزیادۃ والنقصان فیهما فی الاغلب"**

خط استواء کے پاس رہنے والوں کیلئے ہمیشہ دن، رات برابر رہتے ہیں، وہاں دن یا رات کا چھوٹا ہونا، یا بڑا ہونا نہیں پایا جاتا۔ اکثر شہروں میں کبھی دن چھوٹا ہوتا ہے اور رات بڑی، اور کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے اور دن بڑا، اس لئے ﴿تُولِجُ الَّیلَ فِی النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِی الَّیلِ﴾ کہا گیا، اس سے خط استواء کے قرب میں دن رات کی برابری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (روح المعانی)

رات اور دن کو ایک دوسرے میں داخل کرنے کے دو مطلب:

(۱) رات کو کبھی چھوٹا کرلیا جاتا ہے، اتنی قدر دن کو بڑھا دیا جاتا ہے، اور کبھی دن کو چھوٹا کرلیا جاتا ہے اور رات کو اتنی مقدار بڑھا دیا جاتا ہے۔ **"وانما فعل سبحانه وتعالی ذلک لا نه علق قوام العالم ونظامه بذلک"** اللہ تعالیٰ نے دن رات کو کبھی چھوٹا کبھی بڑا کر کے نظام عالم کو اس پر مرتب فرما دیا ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن کے پیچھے لاتا ہے **"فیلبس الدنیا ظلمة بعد ان کان فیها ضوء النهار"** دنیا تاریکی کا لباس پہن لیتی ہے جبکہ پہلے دن کی روشنی موجود رہتی ہے۔ پھر دن کو رات کے پیچھے لاتا ہے **"فیلبس الدنیا ضوءہ فکان المراد من ایلاج احدهما فی الآخر ایجاد کل واحد منهما عقیب الآخر"** تو دنیا روشنی کا لباس پہن لیتی ہے، جبکہ پہلے دن کی روشنی موجود تھی۔ لهذا رات کو دن میں داخل کرنے اور

دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک دوسرے کے پیچھے موجود کرتا ہے۔ تاہم پہلا معنی لفظ کے قریب ہے، یعنی رات کا کچھ حصہ دن میں داخل کر دیا جاتا ہے، اور دن کا کچھ حصہ رات میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی خیلا رہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ پر مطلقاً معنی ہوگا ''تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور تو داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ اس معنی کے لحاظ پر لفظ ''حصہ'' معنی میں نہیں لایا جائے گا۔

دن رات کیا ھیں: فلاسفہ حکمت الٰھیہ میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ستاروں کے دور کا مکمل ہونا ہے دن کہلاتا ہے، اس کے مدمقابل رات ہے۔ ستاروں کے دور کا مطلب یہ ہے کہ نطح سے نطح تک، شرطین سے شرطین تک، بطین سے بطین تک، اس طرح ایک دور جب انتہاء تک پہنچے گا تو اسے دن کہا جائے گا، اس کے مدمقابل رات ہوگی لیکن یہ معنی خواص کیلئے پیش کیا گیا ہے۔ عوام حضرات کے نزدیک حساب کیا جاتا ہے ''طلوع آفتاب'' سے لے غروب تک، اور غروب سے لیکر طلوع آفتاب کا حساب ہوگا۔

یوم کی دو قسمیں ھیں: (۱) یوم جسمانی (۲) یوم روحانی

یوم جسمانی کا طول تین سو ساٹھ درجے، ہے کیونکہ اس میں فلک ظاہر ہوتا ہے، اور اس کی حرکت دکھائی نہیں دیتی، اس جسمانی دن میں ہی اجسام کا تعلق غذاؤں سے، اور غذاؤں کی زیادتی سے، اور (جسم کے) بڑھنے سے اور صحت سے اور بیماری سے اور حیات سے اور موت سے ہے۔ ایام جسمانیہ ظاہر کے لحاظ پر سات قرار دئے گئے ہیں، جن کو ایک ہفتہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ان دنوں میں قوۃ فعالۃ نفس کلی کی طرف برانگیختہ ہوتی ہے۔

یوم روحانی میں عقول کو معرفت حاصل ہوتی ہے، نظروں کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، روحوں کو اسرار حاصل ہوتے ہیں۔ ایام روحانیہ کو ارواح میں احکام حاصل ہوتے ہیں، اور عقلیں صرف قوۃ علامۃ (وہ قوت جس کے ذریعے کئی چیزوں کی علامت کو حاصل کر لیتی ہے) سے حق کی طرف رجوع کرتی ہیں جن سے آسمان و زمین قائم ہیں، وہ حق جس کی طرف ایام روحانیہ میں رجوع پایا جاتا ہے، اس سے مراد ''کلمہ الٰھیہ'' ہے۔

دن رات کتنے چھوٹے، بڑے ہوں گے:

آسان صورت یہ ہے کہ جتنا دن چھوٹا ہوگا، اتنی رات لمبی ہوگی جتنی رات چھوٹی ہوگی اتنا دن لمبا ہوگا، دن رات کی مجموعی مقدار چوبیس گھنٹے ہوگی۔ مختلف علاقوں میں مختلف مقدار طول البلد کی وجہ سے دن رات کی مقدار مختلف ہوگی۔ ہاں البتہ سب سے بڑا دن (حتی یصیر النهار خمس عشرة ساعة وهو اطول ما یکون واللیل تسع

ساعات وھو اقصر ما یکون) پندرہ گھنٹے کا ہوگا، اور سب سے چھوٹی رات نو گھنٹے کی ہوگی۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَتُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ﴾

''اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور تو نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔''

زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے کا وسیع مفہوم:

(۱) فقال عکرمة ھی اخراج الدجاجة وھی حیة من البیضة وھی میتة، واخراج البیضة وھی میتة من الدجاجة وھی حیة''

حضرت عکرمہ ﷺ نے بیان فرمایا، مرغی زندہ کو انڈے سے نکالنا جو مردہ ہے یہ زندہ سے مردہ کو نکالنا ہے، اور انڈے کو مرغی سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔

(۲) ''وقال ابن مسعود ھی النطفة تخرج من الرجل وھو میتة وھی حی ویخرج الرجل منھا حیا وھی میتة''

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں، نطفہ کو مردے سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے، اور نطفہ سے شخص کو نکالنا، یہ زندہ کو مردے سے نکالنا ہے۔

(۳) ''وقال عکرمة والسدی ھی الحبة تخرج من السنبلة والسنبلة تخرج من الحبة، والنواة من النخلة والنخلة تخرج من النواة'' (والحیاة فی النخلة والسنبلة تشبیه)

عکرمہ اور سدی کا قول یہ ہے کہ دانے کو بالی (سٹے) سے نکالنا، اور بالی کو دانے سے نکالنا، اور گٹھلی کو کھجور کے درخت سے اور کھجور کے درخت کو گٹھلی سے نکالنا مراد ہے۔ کھجور کے درخت اور بالی (سٹے) میں مجازی طور پر حیات (زندگی) کا اعتبار کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

(۴) مؤمن کو کافر سے نکالنا، یہ زندہ کو مردے سے نکالنا ہے، کیونکہ مؤمن زندہ کی مثال ہے۔ اور کافر مردہ کی مثال ہے، اور کافر کو مؤمن سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے،

(۵) طیب کو خبیث سے نکالنا، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا، ہے طیب سے مراد زندہ ہے، اور خبیث سے مراد مردہ ہے، اور خبیث کو طیب سے نکالنا، یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔ (از کبیر)

تنبیه: ''وفی الحدیث ان رسول الله ﷺ قال سبحان الله الذی یخرج الحی من المیت، وقد رأی امرأة صالحة مات ابوھا کافرا وھی خالدة بنت الاسود بن عبد

یغوث" (ضعیف اخرجه عبد الرزاق ومن طریقه الطبری وابن سعد فی الطبقات البحر المحیط)

نبی کریم ﷺ نے ایک نیک عورت خالدہ بنت اسود بن یغوث کے کافر باپ کی موت کو دیکھ کر فرمایا "اللہ تعالی کی ذات پاک ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔

(۶) "وقال الماوردی ویحتمل یخرج الجلد الفطن من البلید العاجز والعکس (لان الفطنة حیاة الحس والبلادة موته)

ماوردی نے کہا ہے کہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ سمجھدار عقلمند کو بے قوف، عاجز سے نکالنا، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، اور بے وقوف کو عقلمند سے نکالنا یہ مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے کیونکہ عقلمندی حواس کی زندگی ہے اور بے وقوفی حواس کی مردگی ہے۔

(۷) "وقیل یخرج الحکمة من قلب الفاجر لانها لا تستقر فیه، والسقطة من لسان العارف"

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اسے بھی شامل ہے کہ فاجر کے دل سے حکمت والا قول نکلے، یہ زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، کیونکہ فاسق مردہ کی طرح ہے، حکمت سے بھرا ہوا قول زندہ کی طرح ہے، اور گھٹیا کلام عارف کی زبان سے نکلنا زندہ سے مردہ کو نکالنا ہے کیونکہ عارف زندہ کی طرح ہے، اور گھٹیا کلام مردہ کی طرح ہے۔ (بحر محیط)

(۸) "والعالم من الجاهل والجاهل من العالم"

عالم کو جاہل سے نکالنا زندہ کو مردہ سے نکالنا ہے، کیونکہ عالم زندہ کی طرح ہے اور جاہل مردہ کی طرح ہے، اور جاہل کو عالم سے نکالنا مردہ کو زندہ سے نکالنا ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ: "واخرج ابن مردویه من طریق ابی عثمان النهدی عن سلمان الفارسی قال قال رسول الله ﷺ لما خلق الله آدم علیه السلام اخرج ذریته فقبض قبضة بیمینه فقال هنولاء اهل الجنة ولا ابالی وقبض با لاخری قبضة فجاء فیها کل ردنی فقال هؤ لاء اهل النار ولا ابالی فخلط بعضهم ببعض فیخرج الکافر من المؤمن ویخرج المؤمن من الکافر فذلک قوله (یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی" (درمنثور)

حضرت سلمان فارسی ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو نکالا تو اس نے اپنے دائیں دست قدرت (جو اس کی شان کے لائق ہے) میں (تمام ذریت کو) پکڑا اور ارشاد فرمایا یہ جنتی لوگ ہیں، اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، پھر دوسرے دست قدرت میں گھٹیا ذریت (کافروں) کو پکڑا اور ارشاد فرمایا یہ جہنمی لوگ ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، پھر بعض کو بعض سے ملایا، کافروں کو مومنوں سے اور مومنوں کو کافروں سے

نکالا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ ''اور تو رزق دیتا ہے جسے تو چاہے بغیر حساب کے''

ای من غیر تضییق وتقتیر لا یعرف الخلق عدده ومقداره وان کان معلوما عند الله(مظهری)

بغیر حساب کے رزق دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تنگی اور کمی نہیں پائی جاتی، اس لحاظ پر کہ مخلوق اس کی تعداد اور مقدار کو نہیں جانتی اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اس کی تعداد اور مقدار کا علم ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ مظہری کی اس تفسیر کے مطابق ہے، کیونکہ آپ نے ترجمہ کیا ہے ''جسے چاہے بے گنتی دے۔ راقم نے اپنے ترجمہ میں ''حساب'' کا ترجمہ ''حساب'' سے ہی کیا ہے، ایک تو یہ کہ آجکل اردو میں حساب کا لفظ عام استعمال ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تفسیر مظہری اور روح البیان کو شامل ہو جائے۔

حساب کے تین معانی:

''قال ابو العباس المقری ورد لفظ الحساب فی القرآن علی ثلاثة اوجه بمعنی التعب قال الله تعالیٰ (و ترزق من تشاء بغیر حساب) وبمعنی العدد قال الله تعالیٰ (انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب) وبمعنی المطالبة قال الله تعالیٰ (فامنن او امسک بغیر حساب) (روح البیان، ابوالسعود)

ابو العباس مقری فرماتے ہیں لفظ حساب قرآن پاک میں تین معانی میں استعمال ہے۔

(۱) حساب بمعنی مشقت و تھکن، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ اور تو رزق دیتا ہے جسے تو چاہے بغیر مشقت و تھکن کے۔

(۲) حساب بمعنی عدد کے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ وہ (اللہ) صبر کرنے والوں کو اجر بغیر حساب کے دیتا ہے۔

(۳) حساب بمعنی مطالبہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ احسان کر یا روک لے بغیر مطالبہ کے۔

فائدہ جلیلہ: علامہ بغوی رحمہ اللہ نے مکمل اسناد سے حدیث بیان فرمائی کہ

''جعفر بن محمد عن ابیه عن جده عن علی بن طالب رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ان فاتحة الکتاب

وآیة الکرسی والآیتین من آل عمران(شهد الله)الی قوله(ان الدین عند الله الاسلام)(وقل اللهم مالک الملک)الی قوله(بغیر حساب)مشفعات معلقات بالعرش مابینهن وبین الله عزوجل حجاب،قلن یا رب تهبطنا الی ارضک والی من یعصیک،قال الله عزوجل بی حلفت لا یقرأ کن احد من عبادی دبر کل صلوة الاجعلت الجنة مثواه علی ماکان فیه واسکنته فی حظیرة القدس،ونظرت الیه بعینی المکنونة ،وقضیت له کل یوم سبعین حاجة ادناها المغفرة،واعذته من کل عدوو حاسد نصرته علیهم" (معالم التنزیل للبغوی)

جعفر بن محمد اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک سورۃ فاتحہ اورآیۃ الکرسی اوردوآیتیں﴿شَهِدَاللّٰهُ﴾ سے لیکر ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ تک،اور﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ ﴾ سے لیکر﴿بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ تک کواللہ تعالی نے مقبول الشفاعۃ بنایا، یہ عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں،ان کے درمیان اوراللہ تعالی کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا،توانہوں نے عرض کیا اے ہمارے رب تو اپنی زمین کی طرف اوراپنے نافرمان بندوں کی طرف ہمیں اتاردے،رب تعالی نے فرمایا مجھے اپنی ذات کی قسم کوئی شخص تمہیں نماز کے بعد نہیں پڑھے گا مگر یہ کہ میں جنت اس کا ٹھکانا بناؤں گا جہاں وہ پہلے تھا(یعنی آدم علیہ السلام کی پشت میں جنت میں ہی تھا)اور میں اسے مقدس مقام میں ٹھہراؤں گا اور میں اسے اپنی چھپی آنکھوں سے دیکھتا ہوں،اور میں ہردن اس کی ستر حاجتوں کو پورا کرتا ہوں ان میں سے کم حاجت مغفرت ہے،اور میں اس کو دشمنوں اور حاسدوں سے پناہ دیتا ہوں،اوران کے خلاف اس کی امداد کرتا ہوں(یعنی دشمنوں اور حاسدوں پراسے غالب کرتا ہوں)

جیسے لوگ ہوں گے ایسے حکام ہوں گے:

بعض کتب میں ذکرآتا ہے کہ رب تعالی فرماتا ہے:

"انا الله ملک الملوک قلوب الملوک ونواصیهم بیدی فان العباد اطاعونی جعلتهم لهم رحمه وان العباد عصونی جعلتهم علیهم عقوبة فلا تشتغلوا بسبب الملوک ولکن توبوا الی اعطفهم علیکم"

بیشک میں اللہ ہوں سب بادشاہوں کا بادشاہ ہوں سب بادشاہوں کے دل اوران کی پیشانیاں میرے دست قدرت میں ہیں،بیشک جو بندے میری اطاعت کرتے ہیں،میں ان پر بادشاہوں کوعذاب بنادیتا ہوں،تم بادشاہوں کی طرف مشغول نہ ہو،بلکہ اس ذات کی طرف توبہ کرو اور رجوع کرو جو بادشاہوں کو تم پرمہربان بناتا ہے۔ (روح البیان)

ارشاد مصطفوی ﷺ:

"قوله ﷺ کما تکونون یولی علیکم "معناه ان کنتم من اهل الطاعة یول علیکم اهل الرحمة وان کنتم من اهل المعصیة یول علیکم اهل العقوبة"

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "جیسے تم ہو گے ایسے تم پر حاکم مقرر کئے جائیں گے" اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے "اگر تم فرمانبردار ہوئے تو تم پر رحمت والے لوگوں کو حاکم بنایا جائے گا اور اگر تم نافرمان ہوئے تو تم پر سزا دینے والے حاکم مقرر کئے جائیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کے حضور عرض کرنا:

"یا رب انت فی السماء ونحن فی الارض فما علامة سخطک من رضاک فاوحی الله الیه اذا استعملت علی الناس خیارهم فهو علامة رضای واذا استعملت شرارهم فهو علامة سخطی علیهم"

موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا، اے میرے رب تو بلندی ورفعت میں ہے، ہم زمین میں ہیں، ہمیں کیسے پتہ چلے کہ تو ناراض ہے یا راضی ہے؟ تو رب تعالیٰ نے آپ پر وحی کی جب میں تم پر اچھے لوگوں کو حاکم بناؤں تو یہ میرے راضی ہونے کی علامت ہے، اور جب میں تم پر برے حاکم مقرر کروں تو یہ میرے ناراض ہونے کی علامت ہے۔ (روح البیان)

حجاج بن یوسف کا قول:

حجاج بن یوسف سے کسی نے کہا تو نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا ہے تو ان کی طرح عدل وانصاف کیوں نہیں کرتا؟ تو اس نے جواب دیا۔

"تبذروا العمر لکم "ای کونوا کابی ذر فی الزهد والتقوی اعاملکم معاملة عمر فی العدل والانصاف"

تم حضرت ابوذر کی طرح زاہد و متقی بن جاؤ تو میں عمر کی طرف عدل وانصاف کرنے والا بن جاتا ہوں۔ (روح البیان)

راقم کا موقف: یہ قاعدہ اکثر یہ ہے، کلیہ نہیں، کبھی کبھی نیک لوگوں برے حکام مسلط کر دئے جاتے ہیں، جیسا کہ حجاج بن ابی یوسف ہی کو دیکھئے یہ بدترین ظالم شخص تھا، اس کے زمانہ میں رعایا کے اکثر لوگ نیک تھے، لیکن اس ظالم نے ایک لاکھ چوبیس حضرات کو شہید کر دیا جو کہ صحابہ کرام اور تابعین تھے۔ (ماخوذ از نبراس)

اکثر طور پر ایسا ہوتا ہے: رعایا کے احوال کے مطابق اور ان کے اعمال کے مطابق حاکم مقرر کئے جاتے ہیں، رعایا کے لوگ نیک ہوں تو حکام نیک مقرر کئے جاتے ہیں، اور رعایا کے لوگ برے ہوں تو حاکم

بھی برے مقرر کیے جاتے ہیں۔عوام کی بداعمالیوں اور حکام کے مظالم کا اثر جانوروں کے تھنوں پر پڑتا ہے کہ ان کا دودھ کم ہو جاتا ہے کھیتی سے برکت اٹھ جاتی ہے، درختوں کے پھل کم ہو جاتے ہیں، تجارتی کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے، اور صنعتی کاروبار میں نقصان ہوتا ہے۔

اس تمام صورت حال کی دارومدار اس پر ہے "**وذلک الملک الجائر بشؤم ظلمه وسوء فعله**" کہ ظالم بادشاہ کے ظلم اور اس کے برے اعمال کی وجہ سے یہ ساری بے برکتی حاصل ہوتی ہے۔ "**ویکون الامر علی العکس اذاعدل**" جب حاکم عدل وانصاف کرتا ہے، تو معاملہ اس کے خلاف ہوتا ہے، یعنی برکت ہی برکت ہوتی ہے، نہ سیلاب آتے ہیں نہ طوفان، جانوروں کے دودھ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی ہوتی ہے، کھیتی میں برکت ہوتی ہے، تجارت میں برکت ہوتی ہے صنعتی کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

طاؤس کی نصیحت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو:

جب عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنالیا گیا تو آپ کی طرف طاؤس رحمہ اللہ نے خط لکھا، خط کا مضمون یہ تھا۔

"**ان اردت ان یکون عملک خیرا کله فاستعمل اهل الخیرفقال کفی بها موعظة**"

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے تمام کام اچھے رہیں تو بہتر، نیک لوگوں کو مختلف علاقہ جات کے حاکم مقرر کریں، یعنی عاملین (گورنر، وزراء اعلی) اگر نیک ہوں گے تو تمہارے معالات درست ہوں گے، اگر وہ برے ہوں گے تو تمہارے معاملات درہم برہم رہیں گے، آپ نے فرمایا بہت اچھی نصیحت ہے، اس سے بڑھ کر کسی اور نصیحت کی ضرورت نہیں، یقیناً اگر اس نصیحت پر عمل کرلیا تو نظام حکومت درست ہو جائے گا۔ (ماخوذ از روح البیان)

پندم ار بشنوی ای پادشاہ — درہمہ دفتر بہ ازیں پند نیست

میری نصیحت اگر تو سنے اے بادشاہ بڑی بڑی کتابوں میں اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت نہیں۔

جز بخر مند مفر ما عمل — گرچہ عمل کار خردمند نیست

سوائے عقل مند شخص کے کام کسی کے سپرد نہ کر اگر چہ وہ کام عقلمند کی شایاں شان نہ ہو۔ (ماخوذ از روح البیان)

ارشاد مصطفوی ﷺ:

"**قال النبی ﷺ "سیاتی زمان لامتی یکون امراؤهم علی الجور وعلماؤهم علی الطمع وعبادهم علی الریاء وتجارهم علی اکل الرباء ونساؤهم علی زینة الدنیا**"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت پر عنقریب ایک زمانہ آئے گا، ان کے حکام ظالم ہوں گے، اوران کے علماء لالچی، طمع کرنے والے ہوں گے، اوران کے عبادت کرنے والوں کی عبادت میں دکھلاوا پایا جائے گا، اوران کے تاجر سود کھانے والے ہوں گے، اوران کی عورتیں دنیا کی زینت کرنے والی ہوں گی۔ (از روح البیان)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سورج کی آب وتاب سے بھی زیادہ جگمگا رہا ہے، آج تباہی و بربادی ہورہی ہے، ہر طرف بے ثباتی کی فضاء قائم ہے، ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ایک دوسرے سے برتری کی کوشش میں عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکام مظالم برپا کئے ہوئے ہیں، عدل وانصاف کا نام ونشان نہیں ہاں ہاں مقامات انصاف ہی انصاف سے خالی ہیں، منصفین ہی انصاف سے دور چلے گئے ان کے انصاف کی دارومدار یہ ہے کہ بڑوں کے حق میں فیصلہ دینا ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں اس کا نام انصاف نہیں۔ علماء اسمبلیوں اور پیسے کی لالچ میں مبتلاء ہو کر آجکل مصائب وآلام میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اے علماء کرام! خدارا اس گندے کھیل سے دور ہو جائیں، مظالم برپا کرنے والوں سے پیسے لے کر ایک دوسرے کی مساجد پر قبضہ کرنے، اور فتنہ وفساد برپا کرنے سے باز آجائیں، ورنہ رب تعالی کی گرفت میں آتے ہی رہو گے۔ تاجر بلکہ عام لوگ کسی نہ کسی طرح سود کھانے میں مبتلاء ہیں کیونکہ نظام بنکاری سود پر چل رہا ہے، کوئی بھی سود کے غبار سے بچا ہوا نہیں، اس لئے سودی کاروبار سے رب تعالی سے لڑائی مول لئے بیٹھے ہیں۔ عورتیں دنیا کی زیب وزینت میں یوں مبتلاء ہیں کہ شرم وحیاء کا جنازہ نکل چکا ہے "الامان والحفیظ"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ○﴾ (آیۃ نمبر ۲۸)

(1) مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مسلمانوں کے سوا اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ نہ رہا مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو، اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے۔

(2) نہ بنائیں مومن کافروں کو دوست سوائے مومنوں کے، اور جو شخص کرے گا یہ، تو نہیں وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں مگر یہ کہ تم ڈرو ان سے ڈرنا۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی ذات سے (اپنے غضب سے) اور اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔

مختصر مطلب تقریباً واضح ہے کہ مؤمن اپنے مؤمن بھائیوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، جس شخص نے کافروں کو دوست بنایا اسے اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہ رہا، ہاں البتہ کافروں سے اگر تم ڈرو اور اپنے بچاؤ کی خاطر ان سے ظاہری طور پر تعلق رکھو تو یہ جائز ہے، البتہ دلی محبت نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے کہ اگر تم نے کافروں کو دوست بنایا تو تم اللہ تعالیٰ کے غضب میں آجاؤ گے، اور تم نے اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔

شان نزول:

اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، جو مجموعی طور پر ہی نازل ہونی کی وجوہ ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حجاج بن عمرو، ابن ابی حقیق اور قیس بن زید انصار کے کچھ افراد سے پوشیدہ طور پر تعلق رکھتے تھے، انصار کے ان حضرات کو جن سے ان لوگوں نے تعلقات قائم رکھے تھے "رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ رضی اللہ عنہم نے کہا "اجتنبوا ھؤلاء الیھود لایفتنونکم عن دینکم" ان یہود سے بچ کر رہو تاکہ یہ تمہیں فتنہ میں نہ ڈالیں، لیکن انصار نے ان رابطہ توڑنے سے انکار کر دیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، انہوں نے یہود سے رابطہ ختم کر دیا۔

(۲) مقاتل کا قول یہ ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ وغیرہ جن کے اہل وعیال مکہ میں تھے وہ اہل مکہ سے محبت کرتے

تھے تو ان کو اس سے منع کرنے کیلئے یہ آیہ کریمہ نزل ہوئی۔

(۳) ابو صالح کا قول یہ ہے کہ آیہ کریمہ منافقین کے متعلق نازل ہوئی، وہ بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے لیکن حقیقت میں ان کی دلی محبت یہود اور مشرکین سے تھی، وہ مسلمانوں کی خبریں یہود ونصاری تک پہنچاتے تھے۔ "ویرجون ان یکون لھم الظفر علی رسول اللہ ﷺ "اور امید یہ کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ ﷺ پر کامیاب ہو جائیں گے۔ تو اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اس حرکت سے منع کیا گیا، اور ساتھ ہی "ونھی المؤمنین عن مثل فعلھم" مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ تم ان منافقوں کو حقیقی مؤمن سمجھ کر، ان سے مل کر یہود ونصاری کو خبریں نہ پہچاتے رہنا۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

''نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست سوائے مؤمنوں کے۔''

اللہ تعالی نے کئی آیات کریمہ میں کفار سے دوستی قائم کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد باری تعالی ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا﴾ اے ایمان والو غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے۔

اور ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (المائدة آية نمبر ۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے، بیشک اللہ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا۔

اور ارشاد فرمایا: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (المجادلة، آية نمبر ۲۲)

تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو ایمان (یقین) رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ وہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگر چہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔

اور ارشاد فرمایا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ (الممتحنة، آية نمبر ۱)

اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

کافروں سے تعلقات کی وجوہ:

کافروں سے تعلقات کی تین وجہ ہیں، دو حرام ہیں، اور ایک جائز ہے۔

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ کفار سے محبت ان کے کفر کی وجہ سے ہو، اور ان کے کفر پر راضی ہو، یہ محبت حرام ہے، بلکہ کفر ہے، کیونکہ یہ کفار کو ان کے کفر میں حق بجانب سمجھ رہا ہے، کہ ان کا کفر درست ہے "وتصویب الکفر کفر والرضاء بالکفر کفر فیستحیل ان یبقی مؤمنا مع کونه بهذه الصفة" کفر کو صحیح اور درست سمجھنا کفر ہے، کفر پر راضی رہنا کفر ہے، جب کوئی شخص کافر کے کفر کو صحیح سمجھے اور اس کے کفر پر راضی ہو تو ممکن ہی نہیں کہ وہ شخص خود مؤمن ہو، کافر نہ ہو۔

(۲) دوسری قسم بھی حرام ہے، جو پہلی اور تیسری آنے والی قسم کے درمیان ہے، وہ یہ ہے:

"ان موالاة الکفار بمعنی الرکون الیهم والمعونة والمظاهرة والنصرة اما بسبب القرابة او بسبب المحبة مع اعتقاد ان دینه الباطل فهذا لا یوجب الکفر الا انه منهی عنه، لان الموالاة بهذا المعنی قد تجره الی استحسان طریقته والرضا بدینه وذلک یخرجه عن الاسلام"

کافروں سے اس طرح کی دوستی رکھی جائے کہ ان کی طرف میلان پایا جائے ان کی امداد کی جائے اور ان کی پشت پناہی کی جائے اور ان کی امداد کی جائے خواہ یہ دوستی رشتہ داری کی وجہ سے ہو یا ان سے محبت کی وجہ سے لیکن دل میں اعتقاد یہ ہو کہ کافر باطل راہ پر ہیں، تو یہ تعلق اور دوستی کفر تو نہیں، لیکن حرام ہے، اس لئے کہ اس سے روکا گیا ہے، خاص کر کے اس قسم کی محبت کفر کی راہ آسان کر دیتی ہے کیونکہ وہ کفر سے محبت کرنی شروع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

(۳) کفار سے تیسری وجہ محبت کی یہ ہے "المعاشرة الجمیلة فی الدنیا بحسب الظاهر وذلک غیر ممنوع" کہ ان سے دنیاوی تعلقات رکھے، ان سے تجارت کرے یعنی خرید و فروخت میں ان سے تعلقات رکھے تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ صرف دنیاوی راہ و رسم ہے، ان کے کفر کو پسند نہیں کر رہا، ہاں اگر کسی نے کفار سے دلی محبت کی تو وہ حرام ہے، جسے بیان کیا جا چکا ہے۔ (کبیر بتقدیم و تاخیر)

﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ "سوائے مومنوں کے"

(من دون المؤمنین) یعنی من غیر المؤمنین والمعنی لا یجعل المؤمن ولا یتعلق هو غیر مؤمن نهی الله المؤمنین ان یوالوا الکفار او یلاطفوهم لقرابة بینهم او محبة او معاشرة والمحبة فی الله والبغض فی الله باب عظیم واصل من اصول الایمان" (خازن، مدارک)

"من دون المؤمنین" میں "دون" کا معنی ہے "غیر" یعنی کوئی مؤمن بغیر مؤمن کے کسی کو دوست نہ بنائے، اور مؤمن کے بغیر کفار سے تعلق (محبت کا تعلق) نہ رکھے' اللہ تعالی نے مؤمنوں کو کفار سے دوستی قائم کرنے سے اور ان کے ساتھ رشتہ داری کی وجہ سے محبت کا سلسلہ قائم کرنے سے، یا ان سے محبت کرنے سے، یا ان سے محبت و دوستی کا بھائی چارہ قائم کرنے سے منع فرمایا۔ ایمان کے قوانین میں سے بہت عظیم قانون یہ ہے کہ اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر کسی سے محبت کرے اور اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر کسی سے بغض رکھے۔

مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے محبت کی صورتیں:

دو صورتیں ہیں مؤمنوں کے سواء کافروں سے محبت کرنے کی وہ دونوں ہی منع ہیں۔

(۱) مؤمنوں سے محبت نہ کرے بلکہ کافروں سے محبت کرے، یہ ناجائز اور حرام ہے۔ اس کا مفہوم بھی واضح ہے کہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کوئی مؤمن کافروں سے محبت نہ کرے۔

(۲) مؤمن اپنے دوسرے مؤمن بھائیوں سے محبت تو کرے لیکن ان کی محبت کے ساتھ کافروں کو بھی شریک کرے کہ کفار سے محبت کرے، یہ صورت بھی ناجائز ہے اور حرام ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ "نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست سوائے مؤمنوں کے، یعنی صرف مؤمنوں سے محبت کریں، ان کے ساتھ کافروں کی محبت کو شریک کر کے مؤمنوں کی خالص محبت کو نہ چھوڑیں۔ (ماخوذ از صاوی)

اعتراض: اس آیۃ کریمہ سے ظاہر طور پر تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ کافروں کو مؤمنوں کی محبت سے شریک نہ کرے، بلکہ صرف یہ سمجھ آ رہا ہے کہ مؤمنوں سے محبت کو چھوڑ کر کفار سے محبت نہ کرے۔

جواب: اس آیۃ کریمہ کی وضاحت میں جو دوسری آیات پیش کی ہیں ان میں مطلقاً کفار اور یہود و نصاری سے محبت کو منع کیا ہے، لھذا ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مؤمنین کی محبت کے ساتھ کفار کی محبت کو شریک نہ کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

صاوی سے جو دو صورتیں بیان کی ہیں، وہ صاوی کی عبارت میں طلباء کرام دیکھیں تو کبیر کا جواب واضح سمجھ آئے گا" من دون المؤمنین" ای تارکین قصر الولایۃ علیھم و ذلک الترک یصدق بصورتین کونھا مشترکۃ بین الکفار و المؤمنین او مختصۃ بالکفار فالصورتان داخلتان فی منطوق النھی" (صاوی)

دینی طلباء کرام کیلئے: لفظ "دون" مکان کے ساتھ مختص ہے، جیسے کہا جاتا ہے "جلس زید دون

عمرو ای فی مکان اسفل منه" زید عمرو کے مکان سے نیچے مکان میں بیٹھا اصل میں لفظ دون مکان کی مغایرت کیلئے آتا ہے، پھر مطلقا غیر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ﴾

"اور جو شخص کرے گا یہ تو نہیں وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں۔"

(ومن یفعل ذلک)ای اتخاذھم اولیاء(فلیس من الله)ای من ولایته تعالی(فی شیئ)یصح ان یطلق علیه اسم الولایة یعنی انه منسلخ من ولایة الله رأسا"

(اور جو شخص یہ کرے گا) یعنی اسے اللہ تعالی سے کچھ تعلق نہیں وہ اللہ تعالی کی محبت سے مکمل کٹ کر رہ جائے گا۔ہاں ہاں اس چیز کو عقل بہت جلدی تسلیم کر لیتی ہے"ان موالاة الولی وموالاة عدوہ متنافیان" کہ بیشک دوست کی محبت اور دوست کے دشمن کی محبت دو متنافی چیزیں یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، وہ دوست جھوٹا ہے جو دوست کے مخالف سے محبت کی پینگیں چڑھائے اور یہ دعوی بھی کرے کہ میں تمہارا مخلص دوست ہوں۔

"تود عدوی ثم تزعم اننی صدیقک لیس النوک عنک بعازب"

(تو محبت کرتا ہے میرے دشمنوں سے، پھر تو گمان کرتا ہے بیشک میں تیرا دوست ہوں حماقت تجھ سے، دور ہونے والی نہیں)

"النوک،الحمق،والعازب البعید"النوک کا معنی ہے حماقت،اور عازب کا معنی ہے دور ہونا۔(از روح البیان)

دوست اور دشمن:

"الصدیق ھو من یودک ویبغض عدوک"دوست کامل ومخلص وہی ہے جو تمہارے ساتھ محبت کرے اور تمہارے دشمن سے عداوت رکھے۔دشمن تین ہیں،

(۱) "الاول عدوک"ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمہارا براہ راست دشمن ہو۔

(۲) "والثانی عدو صدیقک"ان میں سے دوسرا یہ ہے کہ وہ تمہارے دوست کا دشمن ہو۔

(۳) "والثالث صدیق عدوک"اور تیسرا وہ ہے جو تمہارے دشمن کا دوست ہو۔

بشوی اے خردمن ازاں دوست دست کہ با دشمنانت بودھم نشست

اے عقلمند شخص اس دوست سے ہاتھ دھو لے جو تیرے دشمنوں کے ساتھ بیٹھنے والا ہو۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً﴾ ''مگر یہ کہ تم ڈرو ان سے ڈرنا''

''ھذا استثناء کأنه قیل لا تتخذوھم اولیاء ظاھرا وباطنا فی حال من الاحوال الاحال اتقائکم (منھم) ای من جھتھم (تقاۃ) ای اتقاء بان تغلب الکفار اویکون المؤمن بینھم''

مطلب یہ ہے کہ تم کفار کو اپنا ظاہری اور باطنی دوست کسی حال میں بھی نہ بناؤ ہاں اگر تمہیں کافروں سے ڈر ہو کہ وہ کفار تم پر غالب آ جائیں، یا کوئی مؤمن کافروں کے گھیرے میں آ جائے تو وہ اپنے بچاؤ کیلئے ان سے ظاہری طور پر تعلق رکھ لے، دل سے ان کو کافر ہی سمجھے تو یہ جائز ہے، یعنی مراد یہ ہے ''کن وسطا وامش جانبا'' درمیان میں ہو جا، اور کنارے پر چل گویا کہ یوں کہا گیا ہے ''کن فیما بینھم صورۃ وتجنب عنھم سیرۃ'' تم بظاہر ان کے درمیان رہو، لیکن اعتقاد اور محبت کے لحاظ پر ان سے دور رہو۔ (از روح البیان)

اس مسئلہ کو اللہ تعالی نے دوسرے مقام پر بہت واضح طور پر بیان فرمادیا ہے۔

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (النحل، آیۃ نمبر ۱۰۶)

جو ایمان اللہ کا منکر ہو سوا اس کے جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو ہاں وہ جو دل کھول کر کافر ہو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

مسئلہ: کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرنے کا جواز دو شرطوں پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ صرف زبان سے کلمہ کفریہ جاری کیا جائے لیکن دل مطمئن رہے، دل میں ایمان قائم رہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمان کافروں کے گھیرے میں اس طرح آ جائے کہ وہ اسے کلمہ کفریہ زبان پر جاری نہ کرنے پر قتل یا کسی عضو کے کاٹنے کی دھمکی دیں۔ اگر صرف قید کرنے یا مارنے کی دھمکی دیں تو اس شخص کیلئے جائز نہیں کہ وہ کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرے۔ (ماخوذ از نور الانوار)

کلمہ زبان پر نہ جاری کرنے کی وجہ سے قتل ہو جانا شہادت ہے:

یعنی کافروں نے قتل کی دھمکی یا عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی تو دل کے ایمان پر قائم رہتے ہوئے کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کی صرف اجازت ہے، واجب نہیں، اگر کفریہ کلمہ زبان پر جاری نہ کیا تو کفار نے قتل کر دیا تو یہ شہید ہوگا۔

❁ ''روی ان مسیلمۃ الکذاب اخذ رجلین من اصحاب النبی ﷺ فقال لاحدھما اتشھد ان محمدا رسول اللہ قال نعم قال اتشھد انی رسول اللہ قال نعم فخلاہ، ثم دعا بالآخر وقال اتشھد ان محمدا رسول اللہ قال نعم قال اتشھد انی رسول اللہ قال انی اصم قالھا ثلاثا فضرب عنقہ فبلغ ذلک

رسول الله ﷺ فقال اما هذاالمقتول فمضی علی صدقه ویقینه واخذ بفضیلة فهنیأله واما الآخر فقبل رخصة الله فلا تبعة علیه"

روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک مسیلمہ کذاب نے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے دو شخصوں کو پکڑ لیا، ایک سے پوچھا کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا ہاں، پھر پوچھا کیا میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو اس نے کہا ہاں، تو مسیلمہ نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے کو بلایا اس سے پوچھا کیا محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہاں ہاں، پھر پوچھا کیا میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو اس نے کہا بیشک میں بہرہ ہوں (سن نہیں سکتا) تین مرتبہ اس کے پوچھنے پر یہی جواب دیا، تو مسیلمہ نے اس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا، گردن اڑا دی گئی۔ یہ خبر جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ شخص جسے قتل کیا گیا وہ اپنے سچ پر قائم رہا اور ایمان پر قائم رہا اور اس نے فضیلت کو پالیا، اس کیلئے مبارک مقام ہے لیکن دوسرے نے اللہ تعالی کی طرف سے عطاء ہونے والی رخصت پر عمل کیا، تو اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ کلمہ کفر زبان پر نہ جاری کرنے کی وجہ سے قتل ہو جانا شہادت ہے، اور اعلی قسم کی فضیلت کو حاصل کرنا ہے۔ اور اگر کلمہ کفر زبان پر جاری کر کے اپنے آپ کو بچالے، تو یہ بھی جائز ہے، اس کی اجازت بھی خود رب تعالی نے دی ہے۔ اگر کوئی شخص رخصت پر عمل کرتے ہوئے کلمہ کفر کو زبان پر جاری کر لے تو اس کی مذمت نہ کی جائے کیونکہ اس نے رب تعالی کی طرف سے عطاء کی ہوئی رخصت پر عمل کیا ہے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

تقیہ کا جواز:

آیۃ کریمہ سے واضح ہوا کہ تقیہ جائز ہے۔ "وعرفوها بمحافظة النفس او العرض او المال من شر الاعداء" تقیہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اپنی جان، اپنی عزت، اپنا مال شریر دشمنوں سے بچانے کیلئے کلمہ کفر زبان پر جاری کرے لیکن دل ایمان پر مطمئن رہے۔

دشمن دو قسم ہیں:

(۱) "الاول من كانت عداوته مبينة علی اختلاف الدين كالكافر والمسلم"

پہلی قسم یہ ہے کہ دشمن کی عداوت صرف دین کی غرض سے ہو، وہ مؤمن کا مخالف صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ مومن کیوں ہے، یہ قرآن اور حدیث کیوں پڑھتا ہے۔ یہ یہودیوں اور نصرانیوں کا دین کیوں نہیں پڑھتا یہ دشمن عام ہے خواہ کافر ہو یا مسلمان ہو۔ یہ عداوت کھلی اور واضح ہو، کیونکہ دشمن پہلے آہستہ آہستہ چھپی چھپی دشمنی کرتا ہے، پھر وہ کھل جاتا ہے۔

(۲) "والثانی من كانت عداوته مبينة علی اغراض دنيوية كالمال والمتاع

والملک والامارة"

دشمن کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کی دشمنی تو کھلی اور واضح وظاہر ہو، لیکن اس کا تعلق دنیاوی اغراض سے ہے جیسا کہ مال ومتاع یا ملک وحکومت چھیننے کیلئے یہ عداوت ہو۔

تقیہ بحیثیت جواز وعدم جواز کے دو قسم:

(۱) جب کوئی مؤمن ایسی جگہ میں ہو، جہاں دشمنوں کی وجہ سے وہ اپنے دین وایمان کو ظاہر نہ کر سکے تو "وجب علیه الهجرة الی محل یقدرفیه علی اظهار دینه" اس پر ایسی جگہ ہجرت کر جانا واجب ہو جاتا ہے جہاں وہ دین کو ظاہر کر سکے۔ وہاں رہنا اس کیلئے جائز نہیں کہ وہ دین کو چھپاتا رہے، اور کمزور ہو کر وہاں رہے، اس لئے کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

اگر ہجرت ممکن نہ ہو تو تقیہ کرے:

اگر ہجرت کرنے سے کوئی عذر شرعی مانع ہو تو ہجرت نہ کرے وہ عذر مثال کے طور پر یہ ہے کہ بچے، عورتیں، نابینے یا قیدی اپنے اہل وعیال میں ہوں جن کو وہاں سے نکالنا ممکن نہ ہو، اور دشمن اسے یا اس کے اہل وعیال یا اس کے آباء واجداد کو قتل کرنے کی دھمکی دیں، تو اس صورت میں "فانه یجوز له المکث مع المخالف والموافقة بقدر الضرورة" اس کیلئے جائز ہے کہ وہاں ٹھہرے، اور بقدر ضرورت دشمنوں سے ظاہری تعلقات رکھے۔

"ویجب علیه ان یسعی فی الحیلة للخروج والفرار بدینه" لیکن واجب ہے اس شخص پر کہ وہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کرتا رہے کہ کس حیلہ سے یہاں سے نکلنا ہے، وہی حیلہ کرے اور وہاں سے بھاگ کر اپنے دین کو بچائے اور ایسی جگہ جائے جہاں اپنے دین وایمان کو ظاہر کر سکے۔

"ولو کان التخویف بفوات المنفعة اوبلحوق المنفعة اوبلحوق المشقة التی یمکنه تحملها کالحبس مع القوت والضرب القلیل الغیر المهلک لا یجوزله موفقتهم"

اگر کفار صرف اسے دنیاوی نفع پہنچانے سے مانع ہوں، خواہ اس کے نفع کو ضائع کر دیں، یا نفع حاصل کرنے دیں، یا اسے مشقت اٹھانی پڑے جسے وہ برداشت کر سکتا ہو جیسا کہ قید کر لیں اور کھانا دیتے رہیں، یا کچھ دیر کیلئے اس کی روزی روک دیں، یا اس کی روزی میں کچھ کمی کر دیں لیکن مکمل روزی نہ روکیں، یا ایسی مار دھمکی دیں جس سے موت واقع نہ ہو

تو ان صورتوں میں وہ کلمہ کفر زبان پر جاری نہیں کر سکتا۔

ہاں اگر اس طرح روزی روک لیں کہ ہلاکت کا خطرہ ہو اس طرح کی مار کی دھمکی دیں جس سے ہلاکت کا خطرہ ہو یا عضو کے کٹ جانے کا خطرہ ہو یا براہ راست قتل کرنے کی دھمکی دیں یا عضو کاٹنے کی دھمکی دیں تو ان صورتوں میں دل کو ایمان پر مطمئن رکھتے ہوئے بظاہر زبان پر کلمہ کفر زبان پر جاری کرنے کی اجازت ہے لیکن صبر پر مرتبہ شہادت حاصل ہوگا جیسا کہ مسیلمہ کذاب کے واقعہ سے مسئلہ واضح کر دیا گیا ہے۔

(۲) دوسری صورت جب مال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو حکم کیا ہے؟ تقیہ جائز ہے نا جائز اسی طرح مال کی حفاظت کیلئے ہجرت واجب ہے یا نہیں۔ علامہ رازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں ذکر فرماتے ہیں۔

"التقية هل هي جائزة لصون المال يحتمل ان يحكم بالجواز"

مال کی حفاظت کیلئے کیا تقیہ جائز ہے؟ ہاں اس میں احتمال یہی ہے کہ اس کے جائز ہونے کا حکم لگایا جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "حرمة مال المسلم كحرمة دمه" مسلمان کا مال اسی طرح محترم ہے جس طرح اس کا خون محترم ہے، یعنی مسلمان کے مال کی حفاظت اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ اس جان کی حفاظت ضروری ہے۔

اور ارشاد مصطفوی ﷺ یہ ہے "من قتل دون ماله فهو شهيد"، جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے (چوروں، ڈاکوں کی مزاحمت پر) قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے۔ مال کی بہت زیادہ ضرورت در پیش آتی ہے، اسی وجہ سے اگر پانی عام طور پر تو نہیں مل رہا، البتہ کوئی شخص قیمت (ثمن) سے بیع کر رہا ہے، لیکن وہ بہت مہنگے داموں دے رہا ہے جو عام، قیمت کو جاننے والوں کی قیمت سے بہت زیادہ ہے تو اس صورت میں مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے مہنگے داموں پانی خرید کر وضوء نہ کیا جائے بلکہ تیمم کیا جائے ہجرت کا حکم بھی در حقیقت یہی ہے کہ کافر مسلمانوں کا مال چھیننا چاہیں۔ مسلمان ان سے اپنا دفاع نہ کر سکیں تو وہاں سے ہجرت کر لیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں تفصیل بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے، بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ مال کے ضائع ہونے کے ڈر سے ہجرت نہ کی جائے، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ مال کے خطرہ میں در حقیقت اپنی جان اور اپنے اقارب کی جانوں کا خطرہ بھی پایا جاتا ہے، بلکہ عزتوں کے غیر محفوظ ہونے کا بھی خطرہ دامن گیر رہتا ہے، اس لئے ہجرت تو ضروری ہو جائے گی، البتہ جب تک جانوں کو خطرہ واضح طور پر نہ ہو صرف مال کی حفاظت کیلئے ہجرت کرنے سے ثواب حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ہجرت صرف دنیاوی مصلحت کیلئے ہے، عبادت کا درجہ

اسے حاصل نہیں۔

تنبیہ: "التقیة تجوز فیما یتعلق باظهار المولاة والمعاداة وقد تجوز ایضا فیما یتعلق باظهار الدین فاما مایرجع ضرورة فاما ما یرجع ضرورة الی الغیر کالقتل والزنا وغصب الاموال والشهادة بالزور وقذف المحصنات واطلاع الکفار علی عورات المسلمین فذلک غیر جائز البتة" (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی فیصلہ کن بات یہ ہے کہ صرف دین کے اظہار میں قتل وغیرہ کی دھمکی سے کفار سے ظاہری دوستی جائز ہے، صرف قتل، زنا، مال کے غصب، جھوٹی شہادت، پاک دامن عورتوں پر تہمت، کفار کا مسلمان عورتوں کے ننگیز پر مطلع ہونے کی وجہ سے کلمہ کفر زبان سے جاری نہ کرے۔

تقیہ کے جواز پر آثار:

❁ دیلمی نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نقل فرمایا "ان اللہ تعالی امرنی بمداراة الناس کما امرنی باقامة الفرائض" بیشک اللہ تعالی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے اچھا سلوک کروں جیسا کہ مجھے میرے رب نے فرائض قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ "وفی روایة "بعث بالمداراة" ایک روایت میں یہ ہے کہ مجھے لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کیلئے مبعوث کیا گیا ہے۔

❁ وفی الجامع "سیاتیکم رکب مبغوضون فاذ جاء وکم فرحبوابهم"
عنقریب تمہارے پاس کچھ سوار آئیں گے جو بغض کے مستحق ہوں، جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کو مرحبا کہو۔

❁ وروی ابن ابی الدنیا رأس العقل بعد الایمان باللہ تعالی مداراة الناس"
ابن ابی الدنیا نے روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالی پر ایمان لانے کے بعد اصل عقل یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھے۔

❁ "وعن بردة عن عائشة رضی اللہ عنها قالت استاذن رجل علی رسول اللہ ﷺ وانا عنده فقال رسول اللہ "بئس ابن العشیره اواخو العشیرة ثم اذن له فالان له القول "فلما خرج قلت یا رسول اللہ قلت ماقلت ثم النت له القول؟فقال یا عائشة ان من اشر الناس من یترکه الناس اویدعه الناس اتقاء فحشة" (رواہ مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، میں آپ کے پاس تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اپنے قبیلہ کا برا شخص ہے، پھر آپ نے اسے آنے کی اجازت دی، تو اس سے

نرم گفتگو کی، جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا تھا جو فرمایا (کہ وہ قبیلے کا برا شخص ہے) پھر آپ نے اس سے نرم گفتگو فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا اے عائشہ وہ شخص لوگوں میں سے بہت برا ہے جس کی فحش کلامی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ جائیں،

حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ کسی کی برائی کو بیان کرنا جائز ہے تاکہ لوگ اس سے بچ کر رہیں تاہم ملاقات کے وقت حسن خلق سے درپیش آنا، نرم گفتگو کرنا بہتر ہے۔

❁ "وفی البحاری عن ابی الدردا،انا لنکثر فی وجوہ اقوام و ان قلوبنا لتلعنھم"

بخاری میں ابوالدرداء ﷛ سے مروی ہے کہ بیشک ہم کئی قوموں کے سامنے ان سے زیادہ کلام کرتے ہیں اور ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ واضح ہوا کہ کافر کو کافر سمجھے اور اسے لعنت کا مستحق سمجھے، البتہ ظاہری طور پر نرم گفتگو کرے۔

(تقیہ کی بحث ماخوذ از روح المعانی)

صوفیاء کرام کا تقیہ:

صوفیاء کرام کے نزدیک اسرار الھیہ کا اغیار سے چھپانا تصوف کا تقیہ ہے اور یہ اہم واجبات میں سے ہے، اسی لئے یہ حضرات اسرار ایسی عبارت میں بیان کر جاتے ہیں۔ جو عام کی سمجھ سے باہر ہو، بعض ظاہرین علماء ان کی ظاہر عبارت پر فتوی کفر دے دیتے ہیں۔ حضرت محی الدین ابن عربی، بایزید بسطامی کی پیچیدہ عبارتیں اسی تقیہ کی مثالیں ہیں اسی لئے فقہاء کرام صوفیاء کرام کے علم کو علم باطن کہتے ہیں یعنی عام سے چھپا ہوا۔ حضرت امام شعرانی نے اپنی کتاب درمنثورۃ فی بیان علوم مشہورہ میں فرمایا کہ بندہ میں جس قدر ادب زیادہ اسی قدر اس کا کلام باریک۔

(روح المعانی منقول از نعیمی)

روافض کا تقیہ: روافض کے نزدیک تقیہ کی نوعیت ہی اور ہے اور اس کے احکام کچھ اور ان کے ضرورت ہو یا ضرورت نہ ہو ہر وقت اور ہر قسم کا تقیہ دینی اور دنیاوی جائز ہے، بلکہ وہ صرف جائز کی حد تک نہیں مانتے، وہ تو تقیہ کو عبادت سمجھتے ہیں۔

روافض کے تقیہ کی چند مثالیں: وہ کہتے ہیں سنی کو دھوکا دینا عبادت ہے، ان کا مذہب یہ ہے اگر کسی نے سنی کو دھوکہ دینے کیلئے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی تو گویا کہ اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔ جھوٹ بولنا، اپنا دین بدلنا، یہاں تک کہ اپنی بیٹی کفار کے نکاح میں دے دینا سب تقیہ کی ہی قسمیں ہیں۔

شیعہ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو (معاذ اللہ) کافر کہتے ہیں:

شیعہ حضرات کی کتاب جلاء العیون ص ۴۵ پر جو عبارت ہے وہ دیکھیں:

''ای عزیز آیا بعد از ایں حدیث کہ ہمہ عامہ روایت کردہ اند ہیچ عاقل را مجال آں ہست کہ شک کند در کفر کسیکہ عمر را مسلمان داند''

اے عزیز کیا اس حدیث کے بعد (حدیث قرطاس) جس کو عام راویوں نے بیان کیا ہے۔ کیا کسی عاقل کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ عمر کے کفر میں یا جو شخص عمر کو مسلمان جانے اس کے کفر میں شک کرے۔

شیعہ کے اس قول سے واضح ہوا کہ ان کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) کافر ہیں، اور ان کو مسلمان جاننے والے بھی کافر ہیں۔ یعنی تمام مسلمان اہل تشیع کے نزدیک کافر ہیں، کیونکہ تمام مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فقط مسلمان ہی نہیں بلکہ عظیم صحابی اور وزیر مصطفیٰ کریم ﷺ مانتے ہیں۔

شیعہ کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ڈرپوک حضرت علی رضی اللہ عنہ بہادر ہیں:

راوندی جو شیعہ مذہب رکھتا ہے اور شیعہ کی معتبر کتاب نہج البلاغۃ کا شارح ہے، وہ حضرت سلمان فارسی سے روایت بیان کرتا ہے۔

''ان علیا بلغه عن عمر انه ذکر شیعته فاستقبله فی بعض طرقات بساتین المدینة وفی یدعلی قوس فقال یا عمر بلغنی عنک ذکرک لشیعتی فقال اربع علی صلعتک فقال علی انک ههنا لم رمی بالقوس علی الارض فاذاهی ثعبان کالبعیر فاغرافاه وقداقبل نحوعمر لیبتلعه فقال عمر الله تعالی یا ابا الحسن لاعدت بعد هافی شئی فجعل یتضرع فضرب بیده علی الثعبان فعادت القوس کما کانت فمضی عمر الی بیته''

بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے دوستوں کو برا بھلا کہتے ہیں، مدینہ طیبہ کے باغات کے راستوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں کمان تھی، انہوں نے کہا اے عمر رضی اللہ عنہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم میرے دوستوں کو برا بھلا کہتے ہو، تو انہوں نے کہا تم اپنے گھر کی راہ پکڑو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ذرا یہیں ٹھہرو، پھر انہوں نے اپنی کمان زمین پر پھینک دی، وہ بہت بڑا اژدھا بن گئی، اس کی اتنی جسامت تھی جتنی اونٹ کی جسامت ہوتی ہے، اس نے اپنا منہ کھولا ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نگل لینے کیلئے ان کی طرف وہ اژدھا

دوڑا، حضرت عمر ﷺ نے کہا خدا کیلئے اے ابوالحسن (علی) مجھے بچالیں، میں آئندہ تمہارے دوستوں کو برا بھلا نہیں کہوں گا، حضرت عمر ﷺ عاجزی کرنے لگے بڑی منت وسماجت کے بعد حضرت علی ﷺ نے وہ اژدھا اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ کمان بن گیا، تو حضرت عمر ﷺ نے اپنے گھر کی راہ لی، حضرت علی ﷺ نے کہا "ان رعب الثعبان فی قلبه الی ان یموت" بیشک اژدھا کا خوف عمر کے دل میں موت تک رہے گا۔

حضرت علی ﷺ نے حضرت عمر ﷺ کی خلافت کو تسلیم کیوں کیا؟

جب شیعہ کے نزدیک حضرت عمر ﷺ (معاذالله) کافر تھے، تو انہوں نے کس طرح حضرت عمر ﷺ کی حکومت کو تسلیم کیا اور ان کی حکومت میں آپ کس طرح ان کے معاون مشیر رہے؟ تو اس کا ایک ہی جواب اہل تشیع کے پاس ہے کہ حضرت علی ﷺ نے تقیہ سے کام لیا۔

حضرت علی ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر ﷺ سے کیوں کیا؟

اگر تشیع سے یہ سوال کیا جائے کہ جب حضرت عمر ﷺ (معاذ اللہ) کافر تھے تو انہوں نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر ﷺ سے کیوں کیا؟ تو اس کا جواب بھی اہل تشیع کے نزدیک یہی ہے کہ حضرت علی ﷺ نے تقیہ سے کام لیا علامہ آلوسی رحمہ اللہ شیعہ حضرات کی کمان والی روایت نقل کرنے کے بعد یوں بیان فرماتے ہیں۔

"وفی هذه الروایة ضرب عنق التقیة ایضا اذصاحب هذه القوس تغنیه قوسه عنها ولا تحوجه ان یزوج ابنته ام کلثوم من عمر خوفا منه وتقیة"

شیعہ کی اس روایت نے تو تقیہ کی گردن کاٹ کر رکھ دی، اس کمان والا شخص تقیہ کیسے کر سکتا ہے جسے بچانے کیلئے کمان ہی کافی تھی، اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح عمر کے ڈر اور تقیہ کی وجہ سے کرتا، جبکہ معاذ اللہ تمہارے نزدیک حضرت عمر ﷺ کافر تھے۔

شیعہ کی ایک اور روایت تقیہ کا رد کرتی ہے:

شیعہ حضرات کے نزدیک نہج البلاغۃ وہ کتاب ہے جو قرآن کے بعد تمام کتب میں زیادہ اصح ہے، آیئے اس کی ایک روایت کو دیکھئے:

"ان الامیر ﷺ قال علامة الایمان ایثارک الصدق حیث یضرک علی الکذاب حیث ینفعک"

بیشک امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان کی نشانی یہ ہے کہ سچائی کو اختیار کرے خواہ سچائی میں نقصان اور جھوٹ میں نفع کیوں نہ ہو۔ پھر اہل تشیع آیہ کریمہ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں "باکثر کم تقیۃ" بیشک تم میں سے اللہ تعالی کے ہاں زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقیہ کرنے والا ہوگا۔

"وفیه ایضا انه کرم الله تعالی وجهه قال انی والله لولقیتهم واحداوهم طلاع الارض کلها مابالیت ولا استوحشت وانی من ضلالتهم التی هم فیها والهدی الذی انا علیه لعلی بصیرة من نفسی ویقین من ربی لقاء الله وحسن ثوابه لمنتظرراج"

اسی نہج البلاغۃ میں شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا میں جانتا ہوں وہ لوگ گمراہ ہیں، میں ہدایت پر ہوں، مجھے اپنے نفس پر بصیرت حاصل ہے، مجھے اپنے رب پر اور اپنے رب سے ملاقات پر یقین ہے، اور اس کے اچھے ثواب کی میں امید کرتا ہوں۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وفی هذادلالة علی ان الامیر لم یخف وهو منفرد من حرب الاعداء وهم جموع، مثله لایتصور ان یتاتی فیما فیه هدم الدین"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے سمجھ آیا کہ آپ کو کبھی ڈر لاحق نہیں ہوا، آپ اکیلئے دشمنوں کی بہت بڑی جماعت سے نہیں ڈرتے تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر کر ان کی بیعت کر لی ہو، حق کو چھوڑ کر دین کی بنیادوں کو منہدم کر (گرا) دیا ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تقیہ کی درا و مدار خوف پر ہے: خوف کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اپنی جان پر خوف ہو کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا، اس خوف کی وجہ سے اماموں (اہل بیت) سے تقیہ ممکن نہیں، کیونکہ شیعہ کے معتبر عالم کلینی نے اپنے کتاب کافی میں لکھا ہے "ان موتهم الطبیعی باختیار هم" بیشک ان کی طبعی موت ان کے اختیار میں ہے، اس نے اس مسئلہ کو مستقل باب میں ذکر کیا ہے، اس مسئلہ میں تمام شیعہ کا اتفاق ہے۔ جب اہل بیت کے ائمہ کی موت کو اللہ تعالی نے ان کے اختیار میں دے دیا ہے تو پھر ان کا موت، ہلاکت، قتل سے ڈرنے کا کیا مطلب؟ اور غور فرمائیں کہ شیعہ حضرات کا مذہب یہ ہے:

"ان الائمة یکون لهم علم بما کان وما یکون فهم یعلمون آجالهم و کیفیات موتهم واوقاته بالتفصیل والتخصیص"

کہ اہل بیت کے امام حضرات کو "ماکان ومایکون" (جو ہو چکا ہے، جو ہونا ہے) کا علم حاصل ہے، وہ اپنی موت کو جانتے ہیں، اپنی موت کی کیفیت کو جانتے ہیں، وہ اپنی موت کا وقت جانتے ہیں، یعنی وہ تفصیلی طور پر آنے والے حالات سے مطلع ہوتے ہیں۔

اس سے یقینی طور پر واضح ہو گیا کہ شیعہ کے اپنے مذہب کے مطابق اہل بیت کے امام کسی سے ڈرتے نہیں، جب ڈرتے نہیں تو تقیہ کرنا بھی ان کی شان کے لائق نہیں۔

(۲) دوسری قسم خوف کی یہ ہے کہ مشقت کا خوف ہو، بدن کو ایذاء (تکلیف) پہنچنے کا خوف ہو، گالی اور ہتک عزت کا خوف ہو، اس خوف کی وجہ سے تقیہ کرنا حرام ہے، تعلیمات نبویہ کے مخالف ہے، صلحاء کے طریقہ کے مخالف ہے۔

"ولا شک ان تحمل هذه الامور والصبر علیها وظیعة الصلحاء فقد کانوا یتحملون البلاء دائما فی امتثال اوامر الله وربما قابلوا السلاطین الجبابرة واهل البیت النبوی اولی بتحمل الشدائد فی نصرة دین جدهم ﷺ"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے امور کو برداشت کرنا اوران پر صبر کرنا صلحاء کا طریقہ ہے، بیشک وہ مصیبتوں کو ہمیشہ برداشت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوامر کو برداشت کرتے ہیں وہ بڑے بڑے جابر بادشاہوں سے صبر وتحمل اور جرأت وبہادری سے مقابلہ کرتے ہیں، اہل بیت کیلئے تو اور زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نانا کے دین کی امداد کیلئے مصائب وآرام کو برداشت کریں۔ (از روح المعانی)

اگر تقیہ واجب ہوتا تو چھ ماہ بعد بیعت کا کیا فائدہ:

"وایضا لو کانت التقیة واجبة لم یتوقف امام الائمة عن بیعة خلیفة رسول الله ﷺ ستة اشهر وماذا منعه من اداء الواجب اول وهلة"

اگر تقیہ واجب ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ توقف نہ فرماتے شروع میں ہی بیعت کر لیتے، تقیہ کے واجب ہونے پر ابتدائی طور پر بیعت سے کیا چیز مانع تھی؟ (معلوم ہوا تقیہ کا قول ہی من گھڑت اور باطل ہے) (ماخوذ از روح المعانی)

تقیہ کے قول سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی لازم آتی ہے:

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقیہ کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے اپنی جان بچالی، تو

کیا وجہ ہے کہ بیٹے نے باپ کے طریقہ کو اختیار کیوں نہیں کیا، تقیہ کے قول سے تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر واجب تھا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے اور اپنی جان کو اور اپنے اقرباء کی جانوں کو بچا لیتے۔ تقیہ کے قول سے تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت باطل ورائیگاں چلی جائے گی بلکہ بیٹا باپ کا بھی گستاخ نظر آئے گا۔ (معاذاللہ)

شیعہ کے تقیہ پر دلائل:

شیعہ نے تقیہ کے جواز پر وہی دلائل پیش کئے ہیں جن کا ذکر بعنوان ''تقیہ کے جواز پر آثار'' ذکر کر دیا گیا ہے اسی طرح وہ یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں " اخرجه عبد بن حميد عن الحسن انه قال التقية جائزة الى يوم القيامة " حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں تقیہ قیامت تک جائز رہے گا اور روایت یہ بیان کی جاتی ہے " اخرج ابن عدى و ابن عساكر " من عاش مدار يا مات شهيدا'' ابن عدی اور ابن عساکر بیان کیا ہے کہ جو شخص لوگوں سے مدارات (تقیہ) کرتے ہوئے فوت گیا تو وہ شہید ہو کر فوت ہوا۔ (از روح المعانی)

وجہ فرق کیا ہے؟

جب یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اہل سنت و جماعت کے محققین نے تقیہ کے جواز پر دلائل قائم کئے ہیں اور تقیہ کے جواز پر آثار کو جمع کیا ہے، جتنی روایات بیان کی گئی ہیں ان میں شیعہ اور اہل سنت و جماعت کا اتفاق ہے۔ تو وجہ کیا ہے کہ شیعہ تقیہ کا قول کریں تو اسے باطل اور من گھڑت قول سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور جو دلائل شیعہ پیش کرتے ہیں، وہی دلائل اہل سنت و جماعت پیش کر کے تقیہ کا جواز ثابت کرتے ہیں تو اہل سنت کے تقیہ کو جائز کہا جائے اور شیعہ کے تقیہ کو ناجائز کہا جائے یہ تو ناانصافی ہے۔

وجہ فرق یہ ہے:

چونکہ بزرگان دین علماء اہل سنت نے بھی لفظ تقیہ استعمال اور اس کے جواز پر دلائل مرتب فرمائے، اور شیعہ نے بھی تقیہ کے جواز پر دلائل مرتب فرمائے لیکن ہر فریق کے نزدیک تقیہ کی تعریف علیحدہ علیحدہ ہے، اہل سنت کے نزدیک جب مؤمن کو کفار قتل کرنے یا عضو کاٹنے کی دھمکی دیں تو مؤمن وہاں سے ہجرت کر لے ہجرت نہ کر سکے کوئی عذر حائل ہو تو اگر دین کو ظاہر کرنے کی وجہ سے کفار اسے قتل کر دیں تو وہ شہید ہوگا اگر جان یا عضو بچانے کیلئے دل میں ایمان کا اعتقاد رکھے اور زبان پر کلمہ کفر جاری کر لے تو یہ جائز ہے۔ شیعہ کا تقیہ عام ہے ذرا ذرا باتوں پر جھوٹ سے کام لے، منافقانہ پالیسی اختیار کرے تو یہ ان کے نزدیک تقیہ ہے یہ فرض و واجب ہے دین کے دس حصوں میں سے نو کی

دار مدار تقیہ پر ہے۔

شیعہ کا تقیہ شیعہ کی کتب سے :

"عن ابن ابی عمیر الاعجمی قال قال لی ابو عبد الله ﷤ یا ابا عمیر ان تسعة اعشار الدین فی التقیة ولادین لمن لاتقیة له" (کافی مصنف ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی باب التقیہ)

یعنی حضرت امام جعفر صادق ﷛ نے اپنے ایک خاص شیعہ ابن ابی عمیر الاعجمی سے فرمایا کہ دین میں نوے فیصد تقیہ اور جھوٹ بولنا ضروری ہے اور فرمایا کہ جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔

اصول کافی کے صفحہ ۴۸۲ اور ۴۸۳ پر بھی کثرت کے ساتھ روایات ہیں جن میں سے دو تین نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں

" عن ابی بصیر قال قال ابو عبد الله ﷤ التقیه من دین الله "

یعنی ابو بصیر جو امام عالی مقام امام جعفر صادق ﷛ کا وزیر و مشیر تھا اور روایت میں اہل تشیع کا مرکز ہے کہتا ہے کہ امام جعفر صادق ﷛ نے فرمایا کہ تقیہ کرنا اللہ کا دین ہے میں نے عرض کیا " کیا اللہ کا دین ہے؟ تو امام صاحب نے فرمایا " اللہ کی قسم ہاں تقیہ اللہ کا دین ہے۔

عن عبد الله ابن ابی یعفو رعن ابی عبد الله ﷤ قال اتقوا علی دینکم واحجبوه بالتقیه فانه لا ایمان لمن لاتقیه له "

یعنی ابن ابی یعفور جو امام عالی مقام حضرت امام جعفر صادق ﷛ کے پاس اکثر اوقات حاضر رہتا وہ کہتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق ﷛ نے فرمایا کہ تم اپنے مذہب پر خوف رکھو اور اس کو ہمیشہ جھوٹ اور تقیہ کے ساتھ چھپائے رکھو کیونکہ جو تقیہ نہیں کرتا اس کا کوئی ایمان نہیں۔

اور اصول کافی کے صفحہ ۴۸۴ سے بھی ایک دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔

" عن معمر بن خلاد قال سئلت ابا الحسن ﷤ عن القیام للولاة فقال قال ابو جعفر علیه السلام التقیة من دینی و دین آبائی ولا ایمان لمن لا تقیة له "

یعنی حضرت امام موسیٰ کاظم ﷛ کا خاص شیعہ معمر بن خلاد کہتا ہے، کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم ﷛ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ان کے امیروں اور حاکموں کے استقبال کیلئے کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ امام محمد باقر ﷛ فرماتے تھے کہ تقیہ کرنا میرا مذہب ہے اور میرے آباء واجداء کا دین ہے (معاذ الله ثم معاذ الله) اور جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔ اصول کافی صفحہ ۴۸۶ پر معلیٰ بن الخنیس کی ایک روایت دیکھیں:

"عن معلی بن خنیس قال قال ابو عبد الله ﷤ یا معلی اکتم امرنا ولا تذعه فانه من کتم امرنا ولم

یذعه اعزه الله به فی الدنیا وجعله نورا بین عینیه فی الأخرة تقوده الی الجنة یا معلی من اذا ع امرنا ولم یکتمه اذله الله به فی الدنیا ونزع نورا من بین عینیه فی الأخرة وجعله ظلمة تقوده الی النار یا معلی ان التقیة من دینی ودین آباء ی ولا دین لمن لا تقیة له "

یعنی امام جعفر صادق صاحب کا شیعہ خاص اور امام صاحب موصوف سے کثیر الروایات معلیٰ بن خنیس کہتا ہے امام صاحب نے مجھے فرمایا کہ ہماری باتوں کو چھپاؤ اور ان کو مت ظاہر کرو کیونکہ جو شخص ہمارے دین کو چھپاتا ہے اور اس کو ظاہر نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ چھپانے کے سبب سے اس کو دنیا میں عزت دے گا اور قیامت میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور پیدا کرے گا جو سیدھا جنت کی طرف اسے لے جائے گا اے معلیٰ جو شخص بھی ہماری باتوں کو ظاہر کرے گا اور ان کو نہ چھپائے گا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ اس سبب سے اس کو ذلیل کرے گا اور آخرت میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے نور کو سلب کرلے گا اور اس کے بجائے ظلمت اور اندھیرا بھر دے گا جو اس کو جہنم کی طرف لے جائے گا اے معلیٰ تقیہ کرنا میرا دین ہے اور میرے آباء واجداء کا دین ہے، جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے۔

ان شیعی روایات سے پتہ چلا کہ امام جعفر صادق ﷺ کا مذہب یہ تھا کہ ہماری باتوں کو چھپایا جائے وہ جنت کا ذریعہ ہے اور آپ نے فرمایا کہ یہی میرے آباء واجداء کا دین ہے جب ان کی باتوں کو چھپانا ضروری تھا تو جو باتیں ظاہر ہیں وہ کس کے اقوال ہیں؟ (ماخوذ از تحفہ حسینیہ المعروف تحفہ شیعہ جلد اول ص ۲۰ تا ۲۲ مصنف استاذی المکرم مولنا محمد اشرف سیالوی)

اس مسئلہ میں اگر کوئی زیادہ تفصیل دیکھنا چاہے تو استاذی المکرم کی اسی مذکو بالا کتاب کا مطالعہ کرے۔

کفار سے امداد لینا کب جائز اور کب ناجائز:

اعلیٰ حضرت مولنا الشاہ احمد رضا خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کفار سے استعانت (امداد طلب کرنے کی) کی تین حالتیں ہیں۔ (۱) التجاء (۲) اعتماد (۳) استخدام۔

التجاء: یہ کہ قلیل گروہ اپنے کو ضعیف و کمزور یا عاجز پا کر کثیر و قوی تر جتھے کی پناہ لے اپنا کام بنانے کیلئے اس کا دامن پکڑے، یہ بدلیہ (ظاہر طور پر) اپنے آپ کو ان کے ہاتھ میں دے دینا ہوگا، اور انہیں خواہی نہ خواہی (ان کو پسند کرے یا نہ کرے) ان کے اشارے پر چلنا اور ان کی پس روی (ان کے پیچھے چلنا) کرنی پڑے گی۔ (یہ استعانت حرام ہے)

اعتماد: یہ کہ گروہ مساوی سے یارانہ گانٹھیں، انہیں اپنا یاور ویار و معین و مددگار بنائیں، ان کی مدد و موافقت سے اپنے لئے غلبہ و عزت و کامیابی چاہیں، یہ اگرچہ اپنے آپ کو ان کے رحم پر چھوڑ دینا نہیں مگر ان کی ہمدردی و خیر

خواہی پر اعتماد یقیناً ہے، کوئی عاقل خون کے پیاسے دشمن بدخواہ کو معین و ناصر نہ بنائے گا، یہاں مساوات کے یہی معنی نہیں کہ ہر طرح قوت میں ہم سنگ ہو، بلکہ خود سر گردہ (ہو) کہ ہمارے ہاتھ میں مجبور نہیں۔ اور ہمارے ساتھ اظہار بدخواہی کر سکتا ہے، اسی شق میں ہے کہ باوصف خودسری اسے ناصر بنانا بے اعتماد نہ ہوگا، یہ دونوں صورتیں کفار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوص قطعیہ قرآنیہ سے حرام قطعیہ ہیں، ہرگز کوئی مسلمان ان کو حلال نہیں کہہ سکتا۔

استخدام: یہ کہ کافر ہم سے دبا ہوا اس کی چٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو کہ کس طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو وہ اگر چہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہوگا مگر بے دست و پا ہے، ہم سے خوف و طمع رکھتا ہے خوف شدید کے باعث اظہار بدخواہی نہ کر سکے بلکہ طمع کے سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہوگا، (ایسے شخص سے امداد لینا جائز ہوگا، لیکن مسلمان اس سے غافل نہ رہیں کہ وہ کافر ہے، ہوسکتا ہے در پردہ کسی وقت نقصان نہ پہنچادے)

الحمدللہ یہ تقریباً فقیر غفرلہ القدیر نے تفقہا (اپنی سمجھ کے مطابق) لکھی تھی پھر امام شمس الائمہ سرخسی کی شرح صغیر امام محمد رضی اللہ عنہ دیکھی عظیم و جلیل تائید ملی۔

سیر الصغیر میں جو کہ کتب ظاہر الروایۃ سے ہے امام محمد نے سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ فرمایا:

"سألته عن المسلمين يستعينون باهل الشرک على اهل الحرب قال لاباس بذلک اذاكان حكم الاسلام هو الظاهر الغالب"

میں نے عرض کیا کہ مسلمان اگر حربیوں پر مشرکوں سے مدد لیں تو کیسا ہے؟ فرمایا مضائقہ (کوئی حرج) نہیں، بشرطیکہ اسلام ہی کا حکم روشن و زبردست ہو۔

مشرکوں سے ذمی مراد ہیں کہ اس سے دو ورق پہلے فرمایا ہے

"لاباس بان يستعين اهل العدل بقوم من اهل البغى واهل الذمة على الخوارج اذاكان حكم العدل ظاهرا"

اگر اہل عدل خارجیوں کے خلاف باغیوں اور ذمیوں سے امداد لیں تو کوئی حرج نہیں، شرط یہی ہے کہ اہل عدل کو باغیوں اور ذمیوں پر غلبہ حاصل ہو۔

یہ بھی خیال رہے کہ علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے تو اور زیادہ تخصیص فرمادی، آپ فرماتے ہیں کہ ذمی سے اس وقت امداد طلب کر سکتے ہیں جب وہ اہل کتاب سے ہو، یعنی یہودی ہو یا نصرانی ہو، اس کے ساتھ بھی شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے دبے ہوئے ہوں، غالب نہ ہوں، اگر غالب ہوں تو ان سے امداد نہ لی جائے، اور مشرکوں سے امداد لینا جائز نہیں۔

راقم کے نزدیک افغانستان کے جہاد میں مسلمانوں سے یہی غلطی ہوئی کہ انہوں نے غالب نصرانیوں سے روسیوں کے خلاف امداد لی، بلکہ یوں کہیں امریکہ کیلئے جہاد کیا، کاش کہ وہ جہاد اسلام کیلئے کیا جاتا تو اس کے نتائج کچھ اور ہوتے۔ ایک خونخوار بھیڑیئے کی زیر قیادت جب جہاد کیا جاتا رہا اور اس سے ڈالر بٹورے جاتے رہے، وہ دینی مدارس پر خرچ کئے جاتے رہے، تو یار کا جب کام نکلا وہ دینی لوگوں کا مخالف ہو گیا دیندار لوگوں کو دہشت گر کہنا شروع کر دیا، دینی مدارس کو دہشت گردی کے اڈے کہنا شروع کر دیا، راقم نے اپنی تقاریر بیسیوں مرتبہ افغانستان کے جہاد کے طریقہ کی مخالفت کی کہ یہ انداز اسلامی جہاد کا نہیں، کاش اس وقت کوئی سنتا۔

کافر کو کتا بنا کر استعانت جائز ہے:

جب کہ وہ ہمارے ہاتھ میں کتے کی طرح مسخر ہو، ارشاد ہوا یعنی سیر صغیر میں ذکر ہے

"لان قتالهم بهذا الصفة لا عزاز الدين و الاستعانة عليهم باهل الشرک كالاستعانة بالكلاب"

دوورق اس سے پہلے ذکر فرمایا "والا ستعانة باهل الذمة كالاستعانة بالكلاب" یعنی اس لئے کہ جب وہ اس حالت پر ہوں تو ان کا لڑنا ہمارے ہی دین کے اعزاز کو ہوگا، اور حربیوں پر ان ذمی مشرکوں سے استعانت ایسی ہوگی جیسے شکار میں کتوں سے مدد لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ہمارے ہاتھ میں کتوں کی طرح مسخر ہوں کہ ان کا فعل ہمارے ہی لئے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز کے واسطے ہو۔

کتے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے؟ جبکہ وہ شکار کے وقت سارا کام ہمارے لئے ہی کرے اس میں اپنے واسطے کچھ نہ کرے، اگر شکار مارا اور ماشہ بھر اس کا گوشت کھا لیا شکار حرام ہے۔

واضح ہوا کہ کافر سے خدمت لینا جائز ہوگا جب کہ وہ کتے کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہوں، قلیل ہوں کثیر نہ ہوں۔ بڑا گروہ ہوا تو ممکن ہے کہ میدان میں پہنچ کر کافروں کا لشکر دیکھ کر شرارت پر آئے اور (سانپ کی طرح) پھن دکھائے۔

ممکن ہے کہ یہی حکمت ہو غزوہ احد میں کہ چھ سو یہود کو واپس فرمادیا کہ یہ بڑا جتھا ہوا، خصوصا اس حالت میں کہ مسلمان صرف سات سو، اور مغلطائی کی روایت کے مطابق چھ سو تھے، اور غزوہ خیبر میں حسب روایت واقدی صرف دس یہود کو ہمراہی کا حکم فرمایا کہ مسلمان ایک ہزار چار سو تھے اور غزوہ حنین میں تو صفوان جیسے ستر اسی بھی مان لیجئے تو کچھ نہ تھے کہ الہی لشکر بارہ ہزار تھا جس کی کثرت کا ذکر خود قرآن پاک میں دسویں پارہ میں موجود ہے۔

صفوان بن امیہ سے استعانت کے روشن جواب:

صفوان ﷺ کا اسلام سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ حنین میں شریک ہونا ثابت تو ہے لیکن ان کا جنگ کرنا ثابت نہیں۔صرف اتنا ثابت ہے کہ انہوں نے سوزرہ، خود، بکتر پیش کئے، اور ایک روایت میں ہے کہ ان سے عاریۃ لئے۔حضور ﷺ نے غنائم سے اتنا عطاء فرمایا کہ بے اختیار کہہ اٹھے "واللہ ماطابت بھذاالانفس نبی" خدا کی قسم اتنی عطائیں خوش دلی سے دینا نبی کے سوا کسی کا کام نہیں۔نبی کریم ﷺ کی رحمت کو دیکھ کر ایمان قبول کر لیا، اور کہا "اشھد ان لاالہ الااللہ واشھدان محمد اعبدہ ورسولہ"

امام ابن سعد طبقات میں، پھر حافظ الشان عسقلانی اصابہ فی تمییز الصحابۃ میں انہیں صفوان ﷺ کی نسبت فرماتے ہیں "لم یبلغنا انہ غزامع النبی ﷺ" ہمیں کوئی روایت نہیں پہنچی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی ہمراہی میں جہاد کیا ہو۔

امام طحاوی مشکل الآثار میں فرماتے ہیں:

"صفوان کان معہ لابالاستعانۃ منہ ففی ھذا مایدل علی انہ انما امتنع من الاستعانۃ بہ وبامثالہ ولم یمنعھم من القتال معہ باختیارھم لذلک"

یعنی صفوان خود حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ہو لئے تھے حضور ﷺ نے ان سے استعانت نہ فرمائی، اس میں دلیل ہے اس پر کہ حضور ﷺ مشرکوں سے استعانت سے باز رہتے تھے، اور وہ اپنے ہمراہی میں لڑیں اس سے منع نہ فرماتے تھے۔ (تمام بحث ماخوذ از الحجۃ المؤتمنہ مصنفہ اعلی حضرت رحمہ اللہ)

مسئلہ نکھر کر واضح ہو گیا کہ کافروں کے ساتھ یاری، مسلمانوں سے غداری حرام ہے۔کافر کبھی مسلمان کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا، وہ مفاد پرست ہے جب مفاد پورا ہوا تو "چل تو کون؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔میں تمہیں سبق سکھاؤں گا، مجھ سے پیسے بٹورنے والو وہ سارے پیسے میں تم سے خرچ کرا کے رہوں گا، میں یاروں کو ذلیل کرتا ہوں، بس یہی میرا کام ہے، تمہیں کس نے کہا تھا میرے ہمنوا بنو۔

﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ "اور ڈراتا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (اپنے غضب سے)"

ان الفاظ مبارکہ میں دو قول پیش کئے گئے ہیں:

(۱) **الاول ان فیہ محذوفا والتقدیر ویحذرکم اللہ عقاب نفسہ"**

پہلا قول یہ ہے کہ اس میں حذف مضاف ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔

ابو مسلم نے کہا ہے ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نافرمانی کرنے پر اپنے عذاب سے ڈراتا ہے "نفس" کے لفظ کو ذکر کرنے کا خاص فائدہ ہے اگر رب تعالیٰ یہ فرماتا ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (اللہ تمہیں ڈراتا ہے) اس کے دو احتمال ہوسکتے تھے، کہ اللہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے عذاب سے" اور دوسرا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تمہیں ڈراتا ہے اور لوگوں کے عذاب سے۔

"فلما ذکر النفس زال هذاالاشتباه ومعلوم ان العقاب الصادر عنه یکون اعظم انواع العقاب لکونه قادرا علی مالا نهایة له وانه لاقدرة لاحد علی دفعه ومنعه ممااراد"

جب نفس کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ اشتباہ زائل ہوگیا (کہ کسی اور کا عذاب بھی مراد ہوسکتا ہے) اور معلوم ہوگیا کہ رب تعالیٰ کا عذاب ہی مراد ہے وہ تمام عذابوں سے بڑا عذاب ہے، اس لئے کہ عظیم قدرت حاصل ہے جس کی انتہاء نہیں، کوئی شخص رب تعالیٰ کے عذاب کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو کوئی منع کرنے پر قادر ہے۔

(۲) **والقول الثانی، ان النفس ههنا تعود الی اتخاذ الاولیاء من الکفار ای ینهاهم الله عن نفس هذاالفعل"**

اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ "نفس" سے مراد اس مقام میں ان لوگوں کا "نفس فعل" ہے، کہ اگر تم نے کافروں کو دوست بنانے کا عمل جاری رکھا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ڈرا رہا ہے یعنی کافروں سے دوستی کا فعل رب تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا ذریعہ ہے۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾ "اور اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے۔"

"والمعنی ان الله یحذرکم عقابه عند مصیرکم الی الله"

مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے جبکہ تمہارا پھرنا، تمہارا لوٹنا رب تعالیٰ کی طرف ہے، یعنی جب تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اس کے سامنے تمہارے اعمال پیش کئے جانے ہیں تو تمہیں اس دن سے اور اس ملاقات سے زیادی ڈرنا چاہے، کیونکہ اگر تم نے کفار سے دوستی کا تعلق برقرار رکھا تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے گا۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'فلا تتعرضوا لسخطه بمخالفة احکامه وموالاة اعدائه وهو تهدید عظیم مشعر بتناهی المنهی فی القبح"

کہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کر کے اور اس کے دشمنوں سے محبت قائم کر کے تم اس

ذات کی ناراضگی کو مول نہ لو جس کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہے، یعنی جس چیز سے روکا گیا کہ کافروں سے دوستی نہ رکھو وہ بہت قبیح ہے، یعنی کفار سے دوستی رکھنا بہت بری چیز ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔

"ضیاء القرآن" کی ضیاء:

اگر چہ کافی کوشش کرتا ہوں کہ "**ضیاء القرآن**" کا لمبا اقتباس نہ نقل کروں تا کہ اس کا جمال اسی کے ساتھ رہے، لیکن مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے محترم پیر صاحب کا ایک ایک لفظ آب زر سے لکھنے کے قابل سمجھتے ہوئے لمبا اقتباس نقل کر رہا ہوں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ کفار کے ساتھ ایسے دوستانہ مراسم کہ انہیں اپنے سیاہ سپید کا مالک بنا دیا جائے اور ہر بات میں انہیں کے مشورہ پر اعتماد کیا جائے، اسے قرآن حکیم نے قطعاً ممنوع قرار دے دیا ہے، ایسا رویہ اختیار کرنا کسی آزاد قوم اور آزاد حکومت کے شایان شان نہیں بلکہ حقیقت میں ذہنی غلامی کا یہ دوسرا نام ہے، جسے غیرت اسلام برداشت نہیں کر سکتی، نیز اگر ایک اسلامی مملکت دوسری اسلامی مملکت کے خلاف کسی کافر کی اعانت کر کے اسے شکست دے دیتے ہیں تو حقیقت میں ہم اپنے آپ کو کمزور کر رہے ہیں، اور اپنے دشمن کی تقویت کا باعث بن رہے ہیں، جو آج تو اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ہماری خوشامد بھی کر رہا ہے اور طرح طرح کے سبز باغ بھی دکھا رہا ہے لیکن کل اس لہ اغراض ہمارے مفاد سے ٹکرائیں گی تو وہ ہمارا مفاد سے ٹکرائیں گی تو وہ ہمارا قلع قمع کرنے میں دریغ نہیں کرے گا اور اس وقت اسے یاد بھی نہیں رہے گا کہ ہم اس کے وہ مخلص دوست ہیں جنہوں نے اس کی خاطر اپنے دینی بھائیوں کا خون بہانے میں ذرا تامل نہ کیا تھا، جو لوگ اندلس کے زوال اور بربادی کی خونچکاں داستان سے واقف ہیں، یا جنہوں نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے دور میں بنگال اور جنوبی ہند کے مسلمان نوابوں کی غلط کاریوں کا جائزہ لیا ہے انہیں قدم قدم پر قرآن حکیم کے اس حکم کی اہمیت اور صداقت کے واضح ثبوت ملیں گے، تفسیر المنار کی یہ عبارت بہت جامع ہے:

"فالممنوع منها مایکون فیه خذلان لدینک و ایذاء لاهله او اضاعة لمصالحهم"

یعنی کفار کے ساتھ ایسی دوستی ممنوع ہے جس سے تیرے دین کی رسوائی ہو، یا تیرے دینی بھائیوں کو اذیت پہنچے یا ان کے وقار اور مفاد کو نقصان پہنچے۔ (ضیاء القرآن)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۲۹)

(1) تم فرمادو کہ اگر تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہر چیز پر اللہ کا قابو ہے۔

(2) آپ فرمادو اگر تم چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں ہے یا تم ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ، اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں کفار سے دوستی رکھنے سے منع کیا، پھر حالت عذر میں اعتقاد صحیح رکھتے ہوئے ظاہری طور پر ان سے دوستی قائم کرنے کی اجازت فرمائی۔ پھر ان سے دلی دوستی رکھنے پر اپنے عذاب سے ڈرایا۔ اب اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، اس سے بندے کو یہ سمجھایا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جانتا ہے تو وہ ضرور دل کے عزم (مصمم ارادہ) کی پکڑ کرے گا، کیونکہ مصمم ارادہ پر گرفت ہے، ہاں وہ اپنے فضل سے معاف فرمادے تو اس کا حکم علیحدہ ہے۔ (از کبیر بزیادۃ)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ میں ﴿اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ﴾ شرط ہے اور ﴿يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ جزا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جزاء شرط پر مترتب ہوتی ہے، اور مؤخر ہوتی ہے، یہ چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، تو اس جملہ شرطیہ کا وقوع کیسے صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک ہے علم اور دوسرا علم کا تعلق یہاں علم کا حادث ہونا نہیں سمجھ آرہا بلکہ انسانوں کے چھپانے یا ظاہر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق حادث ہونا سمجھ آرہا ہے، یہ درست ہے، اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ (ماخوذ از کبیر)

سوال: عام طور پر کسی چیز پر ابھارنا اور کسی چیز کو چھپا کر رکھنا دل کا کام ہے۔ "**قلوب**" ذکر نہیں فرمایا۔ "**صدور**" ذکر کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: "لان القلب فی الصدر فجاز اقامة الصدر مقام القلب کما قال(یوسوس فی صدور الناس)وقال فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور"

جواب یہ ہے کہ دل چونکہ سینہ میں پایا جاتا ہے، اس لئے سینہ کو دل کی جگہ ذکر کر دیا، یعنی مراد دل ہی ہے جیسا کہ رب تعالی نے ﴿یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ میں "صدور" کو "قلوب" کی جگہ رکھا (خناس وہ ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے) اور ایک مقام میں واضح طور پر ذکر فرمایا کہ دل سینہ میں ہے، سمجھنا اور نہ سمجھنا دل کا کام ہے ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ بیشک وہ آنکھوں کے اندھے نہیں، لیکن ان کے دل اندھے ہیں جو سینے میں ہیں۔

خیال رہے کہ دل کے کون سے ارادہ پر پکڑ ہے اور کس ارادہ پر پکڑ نہیں اس کی مکمل تفصیل سورۃ بقرہ کی آیۃ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کے تحت دیکھی جائے۔

مقام تعجب: اس مقام پر مودودی صاحب نے "قل" کا ترجمہ کیا ہے "اے نبی لوگوں کو خبردار کردو" لیکن اعلی حضرت رحمہ اللہ کہیں ﴿قُلْ﴾ کا ترجمہ فرمادیں "(اے محبوب) فرمادو" تو جہلاء یا حاسدیوں اعتراض کرتے ہیں "اے محبوب" کسی لفظ کا ترجمہ نہیں، انہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ضمیر کا مرجع بیان کیا گیا ہے، اس قسم کی کئی مثالیں دیوبندی حضرات کے تراجم سے راقم نے تسکین الجنان کے مقدمہ میں ذکر کی ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے مودودی صاحب کے ترجمہ میں "اے نبی لوگوں کو" کسی ظاہر عربی لفظ کا ترجمہ نہیں لیکن مودودی صاحب پر آج تک کسی نے اعتراض نہیں کیا، کیونکہ یاروں پر اعتراض نہیں کیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے تو "اے نبی" لکھا ہے، ہم نبی کو مانتے ہیں، لیکن مولنا احمد رضا خان (رحمہ اللہ) نے "اے محبوب" ترجمہ کیا ہے، بس ہم محبوب نہیں مانتے کیونکہ ہمیں محبت ہی نہیں تو ہم محبوب کیوں مانیں، تف تمہاری عقل پر تم محبوب نہیں مانتے تو تمہاری وجہ سے کیا دوسرے بھی رسول اللہ ﷺ سے محبت چھوڑ دیں گے، یہ نہیں ہو سکتا ابھی قریب ہی انشاء اللہ محبت مصطفی کریم ﷺ کا ذکر آئے گا۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾

"آپ فرمادو اگر تم چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں یا تم اسے ظاہر کرو، جانتا ہے اسے (اللہ)"

مطلب یہ ہے کہ رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ (اے محبوب) آپ

فرمادو اگر تم چھپاؤ وہ چیز جو تمہارے دلوں میں ہے یعنی کافروں کی محبت یا تم ظاہر کرو اسے، یعنی کافروں کی محبت کو تم ظاہر کرو قول سے یا فعل سے، اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے،

کلبی نے بیان کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے ''اگر تم اپنے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کا تکذیب کو چھپا کر رکھو، یا اسے آپ کے ساتھ جنگ وجدال کے ذریعے ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، اور اس کی تم پر حفاظت کرے گا یہاں تک کہ تمہیں اس کا بدلہ دے گا، (راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ آیۃ کریمہ شان نزول کے لحاظ پر خاص ہے کہ کفار سے محبت کرنے والوں کو خطاب ہے لیکن الفاظ کی عمومیت کے لحاظ پر عام ہے۔ اب مراد یہ ہے کہ کسی قسم کے گناہ کو، کسی قسم کی رب تعالیٰ کے حکم سے عدولی ہو چھپی ہو سینوں اور دلوں میں یا ظاہر ہو رب تعالیٰ اسے جانتا ہے، اس نے ان گناہوں پر گرفت فرمانی ہے، عام لوگوں کو اب یہ حکم شامل ہوگا، خواہ مومن ہوں یا کافر ہوں)

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾

''اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔''

اذا کان لا یخفی علیہ شیٔ فی السماوات ولا فی الارض ''فیکف یخفی علیہ موالاتکم الکفار ومیلکم الیھم بالقلب''

یعنی جب رب تعالیٰ پر آسمانوں اور زمینوں کی کوئی چیز مخفی (چھپی) نہیں تو تمہارا کافروں سے دوستی رکھنا اور تمہارا ان کی طرف میلان اس سے کس طرح مخفی رہ سکتا ہے، لھذا رب تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے ڈرتے رہو۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ''**فیقدر علی عقوبتکم ان لم تنتھوا عما نھیتم عنہ**'' جب رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ تو اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ تمہیں عذاب دینے پر قادر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے تمہیں منع فرمایا ہے اگر تم ان سے نہ رکے تو وہ تمہیں عذاب دے گا۔

والآیۃ بیان لقولہ (ویحذرکم اللہ نفسہ) فکانہ قال ویحذرکم اللہ نفسہ لانھا متصفۃ بعلم ذاتی محیط بالمعلومات کلھا وقدرۃ ذاتیۃ تعم المقدورات باسرھا فلا تجسروا علی عصیانہ اذما من معصیۃ الاوھو مطلع علیھا قادر علی العقاب بھا''

یہ آیۃ کریمہ پچھلی آیہ کریمہ میں مذکور الفاظ مبارکہ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه﴾ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی

ذات سے) کا بیان ہے۔ گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ڈراتا ہے تمہیں اپنی ذات (اپنے عذاب) سے، کیونکہ اس کی ذات علم ذاتی سے متصف ہے، یعنی اس کا علم ذاتی ہے جو کہ تمام معلومات کو شامل ہے، اور اس کی قدرت ذاتی ہے تمام مقدورات کو شامل ہے۔ اس لئے تم گناہوں پر، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر کسی قسم کی جسارت نہ کرنا، وہ ہر قسم کی معصیت پر مطلع ہے، اور اس پر گرفت کرنے اور عذاب دینے کی اسے قدرت حاصل ہے۔ (بیضاوی)

ایک نکتہ طلباء کرام کی توجہ مطلوب:

جب اس سے پہلے ﴿وَيَعْلَمُهُ اللّٰهُ﴾ ذکر کیا جا چکا ہے، جس میں صراحۃً (یعنی ظاہر طور پر) لفظ ''اللہ'' ذکر ہو چکا ہے، تو اب ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہونا چاہئے تھا کیونکہ صریح لفظ جب مذکور ہو اس کے بعد اسی کا ذکر کرنا ہو تو ''ضمیر'' ذکر کر دینا کافی ہوتا ہے، یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو کیوں ذکر کیا؟ اس کا خوبصورت جواب دیکھئے:

''واظهار الاسم الجليل فى موضع الاضمار لتربية المهابة وتهويل الخطب وهو تذييل لما قبله مبين لقوله تعالى ويحذركم الله نفسه بان ذاته المقدسة المتميزة عن سائر المتصفة بما لا يتصف به شئى منها من العلم الذاتى المتعلق بجميع المعلومات متصفة بالقدرة الذاتية الشاملة لجميع المقدورات بحيث لا يخرج من ملكوته شئى قط''

رب جلیل کا اسم علم یعنی لفظ ''اللہ'' ذکر کیا گیا، ضمیر پر اکتفار نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ضمیر کی جگہ کبھی اسم ظاہر ذکر کیا جاتا ہے مقصد اس میں رعب اور ڈرانا ہوتا ہے جیسا کہ بادشاہ کہے ''السلطان يأمرك كذا'' بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے۔ یہ نہیں کہا ''انا آمرک کذا'' میں تمہیں اس طرح حکم دیتا ہوں، مقصد بات کو رعب دار بنانا ہوتا ہے کہ یہ حکم بادشاہ کا ہے کسی اور کا نہیں۔

اسی طرح بلا تشبیہ و تمثیل یہاں رب تعالیٰ نے بھی اپنا اسم مبارک ذکر کیا ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا تا کہ بات رعب دار ہو جائے خطاب ہولناک ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے ڈرایا جس سے واضح کر دیا کہ وہ ذات تمام ذاتوں سے ممتاز ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی مثل ہو سکے، اس کا علم ذاتی ہے، اس کی قدرت ذاتی ہے، اس کے علم اور اس کے قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ (از تفسیر ابی السعود)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ٥﴾ (آیۃ نمبر ۳۰)

(1) جس دن ہر جان نے جو بھلا کام کیا حاضر پائے گی اور جو برا کام کیا امید کرے گی کاش مجھ میں اور اس میں دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

(2) جس دن پائے گا ہر نفس جو اس نے عمل کیا اچھا (وہ) حاضر اور جو عمل کیا اس نے برا وہ تمنا کرے گا کاش کہ بیشک اس (نفس) کے درمیان اور اس (عمل) کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا، اور ڈراتا تمہیں اللہ اپنی ذات (اپنے عذاب) سے، اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا﴾

''جس دن پائے گا ہر نفس جو اس نے عمل کیا اچھا، (وہ) حاضر۔''

''یوم'' کے تعلق کے لحاظ پر کئی معانی:

(۱) ﴿يَوْمَ﴾ کا تعلق ہو ﴿وَيُحَذِّرُكُمْ﴾ سے، اب معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ڈراتا تمہیں اپنے عذاب سے جس دن ہر نفس اپنے اچھے عمل کو پا لے گا، اور برے اعمال کے متعلق وہ تمنا کرے گا کاش میرے اور ان اعمال کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا لیکن ﴿يَـوْمَ﴾ کا تعلق ﴿يُـحَـذِّرُكُـمْ﴾ سے ضعیف سمجھا گیا ہے، اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ کہ ﴿يَوْمَ﴾ اور ﴿يُحَذِّرُكُمْ﴾ کے درمیان کافی فاصلہ ہے، یہ لفظی ضعف ہے۔

''واما من جهة المعنى فلان التحذير موجود، واليوم موعود فلايصح له العمل فيه''

لیکن معنوی ضعف یہ ہے کہ ''تحزیر'' ڈرانا تو اب پایا گیا ہے، اور جس دن کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے وہ قیامت کا دن ہے، اس کا ابھی وعدہ ہے کہ اس نے آنا ہے، لھذا معنوی طور پر اس میں ضعف ہے۔

(۲) ﴿يَـوْمَ﴾ کا تعلق ''الـمـصـيـر'' سے ہو جائے، اب معنی یہ ہوگا اللہ کی طرف ہی پھرنا ہے اس دن جس دن، الخ لیکن یہ بھی ضعیف ہے ''ويـضـعـف انـتـصـابـه بـالـمـصـيـر للفصل بين المصدر ومعموله'' ﴿يَوْمَ﴾ پر ''مصیر'' کی وجہ سے نصب کا آنا ضعیف ہے، کیونکہ ''مصیر'' مصدر ہے، مصدر منفصل معمول

میں عمل نہیں کرتا۔

(۳) ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق "قدیر" سے ہو جائے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا بیشک اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے، وہ قادر ہوگا اس دن جس دن، الخ لیکن یہ قول بھی معتبر نہیں،

ویضعف نصبه بقدير لان قدرته على كل شيء لا تختص بيوم دون يوم بل هو تعالى متصف بالقدرة دائما"

"قدیر" سے ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ضعیف ہے، کیونکہ اس کی قدرت ہر چیز پر کسی دن سے خاص نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے قدرت سے متصف ہے۔

(۴) اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو "اذکر" مقدر سے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا یاد کرو اس دن کو جس دن۔ الخ

(۵) ایک اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو "اتقوا" مقدر سے، اب معنی یہ ہوگا بچ جاؤ اس دن سے جس میں۔ الخ

(۶) اور احتمال یہ ہے کہ ﴿یَوْمَ﴾ کا تعلق ہو "تود" محذوف سے۔ اب معنی یہ ہوگا جس دن پسند کرے گا ہر نفس کہ وہ پالے.......... الخ

لیکن یہ آخری تینوں احتمال بھی ضعیف ہیں "**واما نصبه باضمار فعل على خلاف الاصل**" لیکن لفظ "یَوْمَ" کی نصب کسی محذوف فعل سے ماننا خلاف اصل ہے، یعنی مذکور فعل سے جب تعلق ہو سکے تو محذوف فعل سے تعلق کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۷) زیادہ جمہور حضرات کا قول یہ ہے کہ "یَوْمَ" کا تعلق مذکور فعل "تجد" سے ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

(ماخوذ از البحر المحیط)

اب آپ اعلی حضرت رحمہ اللہ کی ترجمہ کو دیکھئے کیا خوب اور مختصر، جامع نظر آئے گا "جس دن ہر جان نے جو بھلا کام کیا حاضر پائے گی" **راقم** نے بھی یہی نقل کیا لیکن لفظوں کے ساتھ ساتھ ترجمہ کرنے میں مشکلات بھی درپیش آتی ہیں اردو جملہ بظاہر مناسب نظر نہیں آتا، کوشش صرف یہی ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے متوسط درجے کے طلباء اور عوام کو فائدہ حاصل ہو جائے۔ علماء کرام اور بڑی کلاسوں کے طلباء کرام یقیناً مجھ سے زیادہ سمجھ رکھنے والے ہوتے ہیں۔

سوال: عمل عرض ہے، عرض باقی نہیں رہتی، قیامت کے دن عمل کو حاضر پانے کا کیا مطلب؟

پہلا جواب: اس سے مراد یہ ہے "**انه يجد صحائف الاعمال**" ہر شخص اپنی نیکی کے کاموں کا

نامہ اعمال پائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ بیشک ہم لکھتے رہے جو تم عمل کرتے رہے۔ اور ارشاد فرمایا ﴿فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ﴾ ان کو خبر دے گا جو وہ عمل کرتے رہے، وہ رب کے شمار میں ہوں، اور وہ خود اسے بھول چکے ہوں گے۔

دوسرا جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ،

"قوله تعالى "محضرا" يحتمل ان يكون المراد ان تلك الصحائف تكون محضرة يوم القيامة ويحتمل ان يكون المعنى ان جزاء العمل يكون محضرا، كقوله "ووجدوا ماعملوا حاضرا" وعلى كلاالوجهين فالترغيب والترهيب حاصلان"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں "محضرا" کے معنی میں دو احتمال پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے صحائف (نامہ اعمال) کو قیامت کے دن حاضر پائیں گے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ عمل کی جزاء کو حاضر پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ میں بھی یہی دو احتمال ہیں۔ دونوں احتمالوں میں نیکی کے کاموں کی رغبت بھی دلائی گئی ہے، اور گناہوں سے ڈرایا بھی گیا ہے۔ (کبیر)

مؤمن کی نیکیاں اور کافر کی برائیاں ظاہر ہوں گی:

❁ عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله يدنى المؤمن فيضع عليه كنفه ويستر فيقول اتعرف ذنب كذااتعرف ذنب كذا فيقول نعم اى رب حتى قرره بذنوبه ورأى فى نفسه انه قد اهلك قال سترتها عليك فى الدنيا وانا اغفرهالک اليوم فيعطى كتاب حسناته واما الكافر والمنافق فينادى بهم على رؤس الخلائق هؤلاء الذين كذبوا على ربهم الالعنة الله على الظالمين"

(بخاری و مسلم بحوالہ مظہری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب کرے گا، اسکے کندھے پر اپنا دست قدرت رکھے گا، اس کی پردہ پوشی فرماتے ہوئے (در پردہ) اس سے پوچھے گا، کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ کیا تو اپنے فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ وہ عرض کرے ہاں اے میرے رب یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلے گا، اور اپنے دل میں خیال کرے گا بیشک مجھے ہلاک کردیا جائے گا، رب تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی فرمائی، اور میں آج تیری مغفرت کررہا ہوں، تو نیکیوں والا اعمال نامہ اسے دے دیا جائے گا (گناہوں والے کو محو کردیا جائے گا) لیکن کافر اور منافق کو مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا، (اور سب کو بتلایا جائے

گا) یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی تکذیب کی تھی۔خبر دار اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔

﴿وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا﴾

''اور جو عمل کیا اس نے برا وہ تمنا کرے کاش کہ بیشک اس کے (نفس) اور اس کے (عمل) درمیان بہت فاصلہ ہوتا۔''

﴿وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ کا عطف ہے ﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ﴾ پر، اس لئے ﴿مُحْضَرًا﴾ کا تعلق شر سے بھی اسی طرح ہے جس طرح خیر سے ہے۔یعنی جس نفس نے برے عمل کئے وہ اپنے برے اعمال حاضر پائے گا، البتہ خیر کے ساتھ ظاہر طور پر ''محضرا'' کو ذکر کیا ہے اور ''سوء'' یعنی شر کے ساتھ ظاہر طور پر ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے:

''انه خص بالذكر في الخير للاشعار يكون الخير مرادابالذات و كون احضار الشر من مقتضيات الحكمة التشريعية''

کہ خیر کے ساتھ صراحتہ (ظاہر طور) پر ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ اصل میں ذاتی طور پر خیر ہی مراد ہے۔اصل شر کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہوگا، لیکن شریعت کی حکمت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہر نفس کے برے اعمال بھی ظاہر کئے جائیں۔

لیکن یہ عدل کا مسئلہ ہے، فضل ربی ہوا تو برے اعمال کی پردہ پوشی ہوگی، ان کو ظاہر نہیں کیا جائے گا، امید ہے مصطفیٰ کریم ﷺ کی مہربانی سے رب تعالیٰ فضل و کرم فرمائے گا۔

جو آج عیب میرے کھلنے نہیں دیتے ——— وہ کب چاہیں گے حشر میں میری رسوائی ہو

''تود'' ای تتمنى وهو عامل في الظرف اى تتمنى يوم ذلك'' ''تود'' کا معنی ہے تمنا کرنا یعنی اس دن برے عمل کرنے والا نفس تمنا کرے گا کہ میرے اعمال اور میرے درمیان کاش کہ بہت فاصلہ ہوتا۔

ایک احتمال یہ ہے کہ ''بینہ'' میں ضمیر ''یوم'' کی طرف لوٹ رہی ہو، اس صورت میں معنی ہوگا کاش اس کے نفس اور اس دن میں بہت فاصلہ ہوتا۔لیکن اس قول کو پسند نہیں کیا گیا کیونکہ ''یوم'' کا ذکر بعید ہے، مرجع جب قریب ہو تو بعید کی ضرورت نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن تو تمام اعمال نیک یا برے پیش ہوں گے، یہ تمنا تو صرف برے اعمال کو دیکھ کر ہوگی۔

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ''الضمير لما عملت لقربه'' کہ ضمیر ''مَا عَمِلَتْ'' کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ جس نفس نے برے عمل کئے وہ تمنا کرے گا کاش کہ اس (نفس) کے درمیان اور اس کے (اعمال) کے درمیان

بہت فاصلہ ہوتا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

''امدا'' غاية الشیء و منتهاه'' ''امدا'' کا معنی ہے کسی چیز کی غایت اور منتہا۔

امد اور ابد کے درمیان فرق:

''ابد'' کا معنی ہوتا ہے غیر محدود زمانہ کی مدت، اور ''امد'' کا معنی ہوتا ہے ''ایسی مدت جس کی حد مجہول ہو''، ''والمراد هنا الغاية الطويلة'' یہاں مراد غایۃ طویلہ ہے۔ مقدار عمر پر بھی ''امد'' کا اطلاق ہے، مشرق و مغرب کے درمیان چلنے پر بھی ''امد'' کا اطلاق ہے۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں ''ان المراد بالامد البعيد المسافة البعيدة'' ''امدا بعيدا'' سے مسافت بعیدہ ہے، اس معنی کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ''ولعله الاظهر'' یہ معنی زیادہ ظاہر نظر آتا ہے۔ راقم نے اسی کے مطابق ''بہت فاصلہ'' ترجمہ کیا ہے۔ خیال رہے یہ تمنا تو ہوگی لیکن پائی نہیں جائے گی جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ﴾ میں تمنا نہیں پائی جائے گی، ایک شاعر کا قول بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ ہر تمنا کا پایا جانا ضروری نہیں۔

اجل المرء يستحث ولا يدری — اذا يبتغی حصول الامانی

انسان اپنی آرزوؤں کے پائے جانے کی حد مقرر کرتا ہے، فلاں وقت یہ کام ہو جائے گا، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آرزوئیں حاصل ہوں گی، یعنی ضروری نہیں کہ اس کی تمنا اسے حاصل بھی ہو جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی بتصرف)

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ ''اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے نفس (اپنے عذاب) سے''

بعض حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ دوبارہ ذکر کیا ہے تاکید کیلئے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے ''انه تكرار لما سبق واعادة له لكن لا للتاكيد فقط بل لافادة ما يفيده'' کہ اس میں اگرچہ پہلے جملہ تکرار ہے، الفاظ کو لوٹایا گیا ہے، لیکن صرف تاکید کیلئے نہیں بلکہ نئے معنی کا فائدہ دے رہا ہے، وہ نئے معنی کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے کافروں سے دوستی سے منع فرمایا، اس پر اسے مرتب کیا کہ اگر تم نے کافروں سے دوستی کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور یہاں مطلقاً نیک اعمال پر ابھارا گیا ہے اور برے کاموں سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے، اس پر یہ حکم مرتب کیا گیا ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی برا عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے، ان الفاظ مبارکہ میں

اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل کبریائی اور قہاریت کا ذکر فرمادیا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ ''اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے ڈرانا بھی اس کی رحمت اور مہربانی ہے۔

"لانهم اذا عرفوه وحذروه جرمهم ذلک الی طلب رضاه واجتناب سخطه وذلک هو الفوز العظيم"

اس لئے کہ جب وہ اس حکم کو سمجھ لیں گے تو جرم سے پرہیز کریں گے گناہوں سے، اور اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کریں گے اور اس کی ناراضگی سے اجتناب کریں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے، تو واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کا اپنی ذات اور اپنے عذاب سے ڈرانا در حقیقت رب تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ (از روح المعانی)

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا "انه رؤف بالعباد حيث امهلهم للتوبة والتدارک والتلافی" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے کہ ان کو توبہ کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی غلطیوں کا تدارک کرسکیں، جو چیز ان سے رہ گئی ہو اسے پورا کرلیں۔

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ میں وعید پائی گئی، یعنی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، اور ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ میں وعد پایا گیا ہے، گویا کہ نجات حاصل ہونے اور جنت کے عطاء کرنے کا وعدہ پایا گیا ہے "ليعلم العبد ان وعده ورحمته غالب علی وعيده وسخطه" تاکہ بندے کو معلوم ہوجائے کہ بیشک اس کا وعدہ اور رحمت اس کی وعید اور ناراضگی پر غالب ہے۔

❁ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ ذکر فرما کر واضح کردیا کہ پہلے کفار اور فساق کیلئے وعید کا ذکر تھا، اب اطاعت کرنے والے، عبادت کرنے والے لوگوں کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہے۔

"العباد" سے مراد اللہ تعالیٰ کے خاص عبادت گذار بندے ہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کا تذکرہ یوں فرمایا ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ اور رحمٰن کے بندے چلتے ہیں زمین پر آرام آرام سے (پروقار طریقے سے) اور ارشاد فرمایا ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے) (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: علامہ قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ سلوک کی ابتدائی منازل طے کررہے ہوتے ہیں ان کیلئے ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (اور اللہ مہربان ہے اپنے بندوں پر) فرمایا کیونکہ وہ ابھی آسانی طلب کرنے کی

راہ میں ہوتے ہیں۔اور عارفین کے لیے فرمایا﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنی ذات سے) کیونکہ عارفین اپنے آپ کو مقام خوف اور مقام ہولناک میں قائم کئے ہوتے ہیں۔

اور ضمنی طور پر یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں پر مہربان ہے،ان کو مہلت دیتا ہے،لیکن "فیجب ان لا یغتر العبد بامهاله بل یتاهب لیوم حسابه و جزائه" ضروری ہے کہ بندہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے،اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھے بلکہ قیامت کے دن کیلئے تیاری رکھے کیونکہ وہ دن اعمال کے حساب کا ہے،اور وہی دن بندوں کی جزاء کا ہے۔

در خیر باز است وطاعت ولیک — نہ ہر کس تواناست بر فعل نیک

نیکی اور طاعت کا دروازہ کھلا ہے،لیکن ہر شخص نیکی کے کام کی طاقت نہیں رکھتا

ہر خیال کو کند در دل وطن — روز محشر صورتی خواہد شدن

ہر خیال جو دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے قیامت کے دن اس کو ایک خاص صورت حاصل ہوگی۔

سیرتی کان در وجودت غالب است — ہم بر آں تصویر حشرت واجب است

جو سیرت تیرے وجود میں غالب ہو گی قیامت کے دن وہ تصویر تجھے حاصل ہوگی

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تیرے اعمال، تیری عادت، تیری سیرت تیرے سامنے آ جائے گی اس کی تجھے جزاء دی جائے گی،لھذا نیک عمل کر، بروں سے اجتناب کرتا کہ قیامت کے دن تجھے عظیم کامیابی حاصل ہو۔(از روح البیان)

کامیابی کیلئے برے ساتھیوں سے دور رہو:

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں "فلا تصحب اخا الجاهل و ایاک و ایاه،فکم من جاهل اردی حلیما حین اخاه" جاہل کے ساتھ دوستی قائم نہ کر،تو اس سے دور رہ وہ تجھ سے دور رہے، کتنے ہی جاہل بردبار آدمیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جب وہ ان سے بھائی چارہ قائم کرتے ہیں۔"یقاس المرء بالمرء اذاما هوماشاء وللقلب علی القلب دلیل حین یلقاه" انسان کو دوسرے انسان پر ہی قیاس کیا جاتا جب یہ اس کی منشا کے مطابق کام کرے جب دو دل آپس میں مل جاتے ہیں تو ایک دل دوسرے پر دلیل ہوتا ہے۔ (روح البیان)

کامیابی کا راز صبر میں:

حاتم اور شقیق دونوں سفر میں نکلے،ان کے ساتھ ایک بوڑھا فاسق گویا بھی چل پڑا،وہ راستہ میں سارنگی

بجاتا، گانے گاتا، حاتم اس کو روکنے کی کوشش میں سخت نظروں سے دیکھنے لگا تو شقیق نے منع کیا کہ اسے نہ روکو، وہ جو چاہے کرتا رہے، جب تمام کا مشترکہ راستہ طے ہو گیا اور علیحدہ علیحدہ راستہ اختیار کرنے کی ضرورت درپیش آئی تو اس بوڑھے گویے نے کہا میں نے تم جیسا کوئی صابر نہیں پایا کہ میں تمہارے سامنے گانے گاتا رہا تم نے مجھے روکا نہیں۔

حاتم نے اسے کہا اے بوڑھے شخص اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو تم ہم کو معاف کر دینا، میرا نام حاتم ہے یہ میرے دوسرے دوست شقیق ہیں۔ اس شخص نے اپنی سارنگی وغیرہ توڑ دی، کامل توبہ کر کے نیک بن گیا، ان دونوں بزرگوں کی خدمتگذاری میں زندگی بسر کر دی، شقیق نے حاتم کو کہا کیا تم نے صبر کا مقام دیکھ لیا، کہ یہ ہمارے صبر کی برکت ہے جس نے اس شخص کو توبہ کرنے والا بنا دیا۔

نہ آنکہ بر در دعوی نشیند از خلق   کہ گر خلا کنندش بجنگ برخیزد

ایسا نہ ہو کہ اپنے دعوی کے دروازہ پر مخلوق کیلئے بیٹھ جائے، کوئی شخص اس کے خلاف کرے تو یہ جنگ کیلئے اٹھ پڑے۔ اور اگر تو کامیابی چاہتا ہے تو رب تعالی کے احکام کے باغیوں سے قطع تعلق کر لے۔

رب تعالی نے فرمایا ﴿وَاِنْ جَاهَدٰاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَالَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ اگر وہ دونوں (ماں، باپ) تمہارے ساتھ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ شریک ٹھہراؤ، جس کا تمہیں علم نہیں تو تم ان کی فرماں برداری نہ کرو۔

هزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد   فدای یک تن بیگانہ کاشنا باشد

ہزار اپنے جو خدا سے بیگانہ ہیں وہ قربان ہو جائیں اس ایک شخص پر جو بیگانہ ہے لیکن خدا کو پہچاننے والا ہو۔

(ماخوذ از روح البیان زیر آیۃ ﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ﴾

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌرَّحِیْمٌ٥﴾ (آیۃ نمبر ۳۱)

(۱) اے محبوب تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ، اللہ تمہیں دوست رکھے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(۲) (اے محبوب) آپ فرمادو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے، تو تابعداری کرو میری، محبت کرے گا تمہارے ساتھ اللہ اور بخش دے گا تمہارے گناہ، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ماقبل سے تعلق:

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالی نے پہلے اپنی عظمت ذات کا ذکر فرمایا، اسی طرح اپنی سلطنت کے جلال کا ذکر فرمایا۔ یہ ذکر ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ﴾ آیۃ کریمہ میں فرمایا۔ اس آیۃ کریمہ کو دیکھ کر مؤمن بندے کے دل میں عظیم الشان مولی کے ساتھ قلبی تعلق قائم ہوگیا، بندے کو معلوم ہوگیا اللہ تعالی ذو الملک والملوت ہے، اور "ذوالجلال والجبروت" ہے، اس کے بعد مؤمنین کو اپنے دشمنوں (کفار) سے محبت کرنے سے روکا، اور مکمل طور پر اس سے ڈرایا، اس کا تذکرہ ﴿لا یَتَّخِذِالْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ﴾ آیۃ کریمہ میں کیا۔

پھر کافروں سے دوستی کی مکمل جڑیں کاٹ دینے پر متنبہ اس آیۃ کریمہ میں کیا ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْامَافِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْتُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ﴾ اس کے بعد پہلے تمام مسائل کی تاکید کیلئے اس زیر بحث آیۃ کریمہ ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کو نازل کیا۔ گویا کہ رب تعالی سے بندوں نے سوال کیا "بای شیء ینال کمال المحبۃ وموالاۃ الرب" اے اللہ تو ہی بتا کہ تیری کامل محبت اور تیری دوستی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

"فقیل بعد قطع موالاۃ اعدائنا تنال تلک الدرجۃ بالتوجہ الی متابعۃ حبیبنا اذکل طریق سوی طریقہ مسدود وکل عمل سوی ماذن بہ مردود"

تو رب تعالی کی طرف سے گویا کہ یوں جواب دیا گیا کہ اگر تو میرے ساتھ محبت کرنے اور میرے ساتھ دوستی قائم کرنے کا خواہشمند ہے تو پہلے میرے دشمنوں کفار سے دوستی توڑ دے، ان سے منہ موڑ لے، پھر اس درجہ کو حاصل کرنے کیلئے میرے حبیب ﷺ کی اتباع کرلے تو میں تیرا محبوب بن جاؤں تو میرا محبوب بن جائے گا۔

ہاں اس درجہ رفیعہ (بلند درجہ) کو حاصل کرنے کیلئے صرف وہی راہ جو تمہیں بتادی گئی، اس کے بغیر سب راہیں بند ہیں، بس اسی ایک راستہ کی تجھے اجازت دی گئی، اس کے بغیر اور راہ تلاش کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہوگی۔ (از روح المعانی)

شان نزول:

اس آیہ کریمہ کے شان نزول میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، جو تمام ہی مجموعی طور پر اس کا شان نزول ہیں۔

(۱) "اخرج ابن جریر من طریق بکر بن الاسود عن الحسن قال قال قوم علی عهد النبی ﷺ یا محمد انا نحب ربنا فانزل الله "قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم" فحمل اتباع نبیه محمد ﷺ علما لحبه وعذاب من خالفه" (در منثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ یہ کہتے تھے اے محمد ﷺ بیشک ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں تو اس آیہ کریمہ کو نازل کیا، اس دعویٰ پر سچا ہونے کیلئے نبی کریم ﷺ کی اتباع کو شرط قرار دے دیا، کہ اگر تم نے حضور کی اتباع کی تو اپنے دعویٰ محبت میں سچے ہوگے، اور رب تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اگر تم نے نبی کریم ﷺ کی اتباع نہ کی تو تم عذاب کے مستحق ہوگے۔

(۲) "وقال الضحاک عن ابن عباس رضی الله عنهما وقف النبی ﷺ علی قریش وهم فی المسجد الحرام وقد نصبوا اصنامهم وعلقوا علیها بیض النعام وجعلوا فی آذانها الشنوف وهم یسجدون لها فقال والله یا معشر قریش لقد خالفتم ملة ابیکم ابراهیم واسمعیل، فقالت له قریش انما نعبدها حبالله لیقربونا الی الله زلفی، فقال الله تعالی قل لهم یا محمد ان کنتم تحبون الله وتعبدون الاصنام لیقربوکم الیه فاتبعونی یحببکم الله فانا رسوله الیکم وحجته علیکم اتبعوا شریعتی وسنتی یحببکم الله" (معالم التنزیل للبغوی)

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ قریش پر ٹھہرے وہ مسجد حرام میں تھے، انہوں نے بت قائم کر رکھے تھے، ان پر شتر مرغ کے انڈے سجا رکھے تھے اور ان کے کانوں میں بالیاں سجائی تھیں، اور وہ ان کو سجدہ کر رہے تھے، آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اے معشر قریش (قبیلہ قریش) تحقیق تم نے اپنے آباء ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے دین کی مخالفت کی، تو قریش نے کہا ہم تو ان کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرما کر مصطفیٰ کریم ﷺ کو فرمایا" آپ ان کو فرما دیں اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو اور اس لئے بتوں کی عبادت کرتے ہو کہ یہ تمہیں اللہ کے قریب کر دیں گے (یہ دعویٰ تمہارا باطل ہے، بتوں کی عبادت کو چھوڑو) اور میری تابعداری کرو اللہ تمہارے ساتھ محبت کرے گا، میں

اس کا رسول ہوں تمہاری طرف، اور اس کی حجت (دلیل) ہوں تم پر، میری شریعت کی اور میری سنت کی تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا۔

(۳) تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے

"وفی روایۃ ابی صالح ان الیہود لما قالوانحن ابناء اللہ واحباؤہ انزل ھذہ الآیۃ فلما نزلت عرضھا رسول اللہ ﷺ علی الیہود فابوا ان یقبلوھا"

ابوصالح کی روایت میں ذکر ہے کہ یہود نے جب یہ دعویٰ کیا ہم اللہ کے بیٹے ہیں (معاذ اللہ) اور اس کے محبوب ہیں، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اللہ کے وہ محبوب ہیں جو مصطفیٰ کریم ﷺ کی تابعداری کرنے والے ہیں، جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو مصطفیٰ کریم ﷺ نے یہود پر پیش کی، لیکن انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

(۴) **"ونزلت فی نصاری نجران وذلک انھم قالواانما نعظم المسیح ونعبدہ حباللہ تعالی وتعظیما لہ فانزل اللہ ھذہ الآیۃ رداعلیھم"**

اور وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں نے یہ کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی محبت کی غرض کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں تو ان کے رد میں آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا تمہارا دعویٰ صرف اس وقت سچا ہوگا جب تم مصطفیٰ کریم ﷺ کی اتباع کروگے، عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کر کے، شرک کا ارتکاب کر کے تم کس طرح اللہ تعالیٰ کی محب ہونے کا دعویٰ کرتے ہو؟ یہ تمہارا دعویٰ سراسر باطل ہے۔ (از روح المعانی)

﴿قُلْ﴾ "(اے محبوب) آپ فرمادو"

جلالین میں ذکر ہے "قل لھم یا محمد" فرمادو ان کو اے محمد ﷺ۔ جب خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے تو اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا "اے محبوب تم فرمادو"

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے، اسی لئے بریکٹ میں "اے محبوب" کے الفاظ ذکر کر دیئے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ مودودی صاحب نے یہاں بھی ترجمہ کیا ہے اے نبی لوگوں سے کہہ دو" اگرچہ "اے نبی" اور "اے محمد" بھی یار لوگوں کے مزاج کے خلاف ہے، بقول اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ

تیری انکے تو وکیلوں سے کرے استمداد، یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

لیکن ''اے محبوب'' سے تو ان کا مزاج زیادہ ہی بگڑ جاتا ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾

''اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو تابعداری کرو میری، محبت کرے گا تمہارے ساتھ اللہ، اور بخش دے گا تمہارے گناہ۔''

محبت کی تعریف:

المحبة میل النفس الی الشیء لکمال ادرک فیه بحیث یحملها علی مایقربها الیه'' محبت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کا کسی چیز کی طرف میلان پایا جائے، یعنی کسی چیز کا کمال اسے برانگیختہ کرے (ابھارے) کہ یہ اس کے قریب ہو جائے اور دل اس کی طرف میلان کرے۔ (از بیضاوی)

بلکہ یوں کہا جائے محب اپنے دل میں محبوب کو بسا لے۔

بندے کی محبت رب تعالیٰ سے:

''والعبد اذا علم ان الکمال الحقیقی لیس الا الله وان کل مایراه کمالا من نفسه اوغیره فهو من الله وبالله والی الله لم یکن حبه الا لله وفی الله''

بندے کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ بیشک کمال حقیقی اللہ کے بغیر کسی اور کو حاصل ہے، بندہ اپنے نفس کے کمالات یا اپنے بغیر اور چیزوں کے کمالات کو اللہ کی طرف سے سمجھے، اور اللہ کے لیے سمجھے اور یہ سمجھے کہ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچانے والا ہے تو یقیناً اسے محبت اللہ کے ساتھ حاصل ہو گی، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی توجہ میں مستغرق ہو گا۔ ''وذلک یقتضی ارادة طاعته والرغبة فیما یقربه'' جب بندے کو رب تعالیٰ سے محبت حاصل ہو گی تو وہ محبت تقاضا کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اور ان اعمال میں رغبت رکھی جائے جو اسے رب تعالیٰ کے قریب کر دیں۔

''فلذلک فسرت المحبة بارادة الطاعة وجعلت مستلزمة لاتباع الرسول فی عبادته والحرص علی مطاوعته''

اسی لئے محبت کی تفسیر ارادہ طاعت سے کی جاتی ہے، یعنی مطلب یہ ہو گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے

ہو یعنی اس کی طاعت کا دعوی کرتے ہو، تو رب تعالی کی طاعت و عبادت وہی معتبر ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی جائے، وہ عبادت معتبر نہیں جو اتباع رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہو، رب تعالی کی محبت کے دعوی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری پر حریص ہو۔ (ماخوذ از بیضاوی)

اللہ کی محبت بندوں سے:

"وحب الله للمؤمنين ثناؤه عليهم وثوابه وعفوه عنهم" اللہ تعالی کا مؤمنوں سے محبت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالی ان کی تعریف فرماتا ہے اور ان کو ثواب عطاء فرماتا ہے، اور ان کو معاف فرماتا ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اللہ سے محبت کی علامات:

سب سے بڑی علامات علامہ ازہری رحمہ اللہ کا قول ہے "محبة العبد لله ورسوله طاعته لهما واتباعه امرهما" بندے کی محبت اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے، اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی اور مصطفی کریم ﷺ کا مطیع اور ان کے حکم کی تابعداری کرنے والا ہو۔

"وقال سهل بن عبد الله علامة حب الله حب القرآن، وعلامة حب القرآن حب النبی ﷺ وعلامة حب النبی ﷺ حب السنة، وعلامة حب الله وحب القرآن وحب النبی ﷺ وحب السنة حب الآخرة وعلامة حب الآخرة ان يحب نفسه وعلامة حب نفسه ان يبغض الدنيا وعلامة بغض الدنيا الاان يأخذ منها الاالزاد والبلغة"

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالی کی محبت کی علامت قرآن پاک سے محبت ہے، اور قرآن پاک سے محبت کی علامت نبی کریم ﷺ سے محبت ہے، اور نبی کریم ﷺ سے محبت کی علامت آپ کی سنت سے محبت ہے، اور اللہ تعالی کی محبت اور قرآن پاک کی محبت اور نبی کریم ﷺ کی محبت اور آپ کی سنت کی محبت آخرت سے محبت ہے، اور آخرت سے محبت علامت یہ ہے کہ اپنے نفس سے محبت کرے، اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ دنیا کو ناپسند کرے، اور دنیا کو ناپسند کرنے کی علامت ہے کہ جو مل جائے اسی پر اکتفاء کر لے، صرف زادراہ اور ضروریات زندگی پر اکتفاء کرے۔ (قرطبی)

یعنی عیاشی کیلئے دنیا کے پیچھے نہ دوڑتا رہے اور حرام و حلال کی تمیز کے بغیر ہی صرف مال بٹورنے پر زندگی نہ گذارے، بس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت میں زندگی گذارے اگر غنا بھی حاصل ہو جائے، مالدار ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

❁ "واخرج عبدبن حمید عن الحسن قال قال رسول الله ﷺ من رغب عن سنتی فلیس منی ثم تلاهذه الآیة قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله"الی اخرالآیة" (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں، پھر اس پر بطور دلیل یہی آیۂ کریمہ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ تلاوت فرمائی۔

❁ "واخرج الا صبهانی فی الترغیب عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لن یستکمل مؤمن ایمانه حتی یکون هواه تبعا لما جئتکم به" (درمنثور)

اصبہانی نے ترغیب میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی مؤمن کا ایمان ہرگز اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے خواہشات کو اس کے تابع نہ کرلے جو میں نے لایا ہے۔

یعنی قرآن پاک وحدیث کی تابعداری کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا، ایمان کی تکمیل کی دارومدار اتباع مصطفیٰ کریم ﷺ میں ہے۔

❁ "واخرج ابن ابی حاتم عن ابی الدرداء فی قوله"قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی"قال علی البروالتقوی والتواضع وذلة النفس" (درمنثور)

ابوالدرداء ﷺ نے ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ نیکی اور تقوی، عاجزی اور ذلت نفس کو اختیار کرے، یعنی ان چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی کامل طور پر اور خاص طور پہ تابعداری کرے۔

❁ "واخرج ابن ابی حاتم عن سفیان بن عیینة انه سئل عن قوله المرء مع من احب فقال الم تسمع قول الله قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله یقول یقربکم والحب هوالقرب والله لایحب الکافرین لایقرب الکافرین"

سفیان بن عیینہ سے مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی "المرء مع من احب" کے متعلق سوال کیا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے کہا کیا تم نے اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ نہیں سنا۔ اللہ تعالی کے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ تمہیں اپنے قریب کرے گا محبت کا مطلب ہے "قرب" اللہ تعالی کافروں سے محبت نہیں کرتا یعنی کافروں کو اپنے قریب نہیں کرتا۔

یعنی سوال کا جواب خوبصورت انداز پر دے دیا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "المرء مع من احب" کا مطلب یہ ہے کہ انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کی محبت ہوگی، یعنی اس شخص کا اسے قرب حاصل ہوگا۔

"واخرج احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجه وابن حبان والحاکم عن ابی رافع عن النبی ﷺ قال لاالفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به اونهیت عنه فیقول لاندری ماوجد نا فی کتاب الله اتبعناه" (درمنثور)

ابورافع بیان فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں ہرگز تم میں سے کسی ایک کو نہ پاؤں کہ وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہو، اس کے پاس میرے امر سے کوئی امر آئے، یعنی میں نے کسی چیز کا حکم دیا ہو یا کسی چیز سے روکا ہو، وہ کہے ہم نہیں جانتے، ہم نے یہ حکم اللہ کی کتاب (قرآن) میں نہیں پایا، کہ ہم اس کی تابعداری کریں۔

حدیث پاک سے واضح ہوگیا کہ قرآن پاک کی طرح حدیث پاک پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، حدیث پاک کا انکار کرنے والا درحقیقت رسول اللہ ﷺ کا انکار کرنے والا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا منکر دراصل رب کا منکر ہے۔ آجکل منکرین حدیث دندنا رہے ہیں، قادیانی، یہودی ونصرانی کا گٹھ جوڑ ہے، وہ دین اسلام کو (معاذالله) مٹا دینے کی نئی نئی چالیں چل رہے ہیں، لیکن رب تعالی کا وعدہ بھی سچا اور پکا ہے،

﴿یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ﴾ (سورۃ الصف، آیۃ نمبر ۸)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ تعالی اپنا نور پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر ناپسند کریں۔

انشاء اللہ دین کو مٹانے کی کوششیں ناکام ہوں گی، دین کا بول بالا ہوگا، دشمنان دین مٹ جائیں گے۔

مٹے ہیں، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے ۔۔۔ نہ مٹا ہے نہ مٹے گا چرچا تیرا

اتباع رسول اللہ ﷺ لازم ہے:

اس آیہ کریمہ سے دو وجہ سے یہ ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع لازم ہے۔

"احدهما، ان کنتم تحبون الله فاتبعونی "لان المعجزات دلت علی انه تعالی اوجب علیکم متابعتی"

ایک وجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، کیونکہ اللہ تعالی نے مجھے معجزات عطاء کئے ہیں اس لئے تم پر واجب ہے کہ تم میری طاعت کرو۔

والثانی "ان کنتم تحبون الله فاتبعونی "لانکم اذااتبعتمونی فقداطعتم الله والله تعالی یحب کل من اطاعه"

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، بیشک تم نے جب میری تابعداری کی تو تم اللہ کے مطیع ہو جاؤ گے، جو اللہ کا مطیع ہو جاتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تابعداری سے اللہ تعالی کی طاعت اور تعظیم حاصل ہوتی ہے، اور جو شخص آپ کی تابعداری نہیں کرتا وہ رب تعالی کی طاعت اور تعظیم بھی نہیں کرسکتا۔ آپ کی تابعداری کی وجہ سے ہی اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوگی۔

"ومن احب اللہ کان راغبافیه،لان المحبة توجب الاقبال بالکیة علی المحبوب والاعراض بالکلية عن غیر المحبوب"

اور جو شخص اللہ تعالی سے محبت کرے گا وہ کامل طور پر اسی کی طرف راغب ہوگا، کیونکہ محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ محب کی مکمل طور پر توجہ محبوب کی طرف ہوتی ہے، اور غیر محبوب سے وہ مکمل طور پر اعراض کرتا ہے۔ (کبیر)

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ "اور بخش دے گا تمہارے گناہ"

یعنی اللہ تعالی بندے سے محبت کرتا ہے کہ اسے ثواب عطاء کرتا ہے، اور اس کے گناہ معاف کرتا ہے، اور اس سے عذاب دور کرتا ہے، "وھذا غایة مایطلبه کل عاقل" ہر عقلمند کا یہی مطلوب ہے۔

﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ "اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"

"یعنی غفور فی الدنیا یستر علی العبد انواع المعاصی،رحیم فی الآخرة بفضله و کرمه"

یعنی دنیا میں اس کی صفت غفوریت کی جلوہ گری ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں بندوں کے مختلف گناہوں کو دیکھتا ہے لیکن ان کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور ان کے گناہوں کو بخش دیتا ہے کہ انہوں نے میری نبی کی تابعداری کر کے اپنے آپ کو تائب کر لیا ہے۔ اور رب تعالی کی صفت رحیمیت آخرت میں جلوہ گر ہوگی وہ اپنا فضل وکرم فرمائے گا۔ (کبیر)

﴿آیۃ کریمہ سے متعلق چند چیزوں کا ذکر﴾

محب صادق کی علامت:

"عن ابی ایوب النبی ﷺ نزل علیه فنزل النبی ﷺ فی السفل وابوایوب فی العلو فانتبه ابوایوب لیلة فقال نمشی فوق رأس رسول اللہ ﷺ فتنحوافباتوافی جانب ثم قال للنبی ﷺ فقال النبی ﷺ السفل ارفق فقال لا اعلو سقیفة انت تحتها فتحول النبی ﷺ فی العلو وابوایوب فی السفل فکان یصنع للنبی ﷺ طعاما فاذاجیء به الیه سال عن موضع اصابعه فیتتبع موضع اصابعه فصنع له طعاما فیه ثوم فلما ردالیه سال عن موضع اصابع النبی ﷺ فقیل له لم یاکل ففزع وصعدالیه فقال احرام هو قال النبی ﷺ ولکنی اکرهه قال فانی اکره ماتکره اوماکرهت قال کان النبی ﷺ یوتی بالوحی" (مسلم ج ۲ ص ۱۹۱ باب اباحة اکل الثوم)

حضرت ابوایوب ﷜ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ ان کے گھر اترے، آپ نے گھر کے نیچے حصہ میں قیام کیا، اور حضرت ابوایوب نے اوپر والی منزل میں، ایک رات ابوایوب ﷜ (اچانک) بیدار ہو گئے، کہنے لگے ہم تو نبی کریم ﷺ کے سر مبارک کے اوپر چل رہے ہیں سب (اھل خانہ) ایک طرف ہو گئے، ایک کنارے پر رات گذاردی، پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی (آپ اوپر تشریف لائیں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے نیچے رہنے میں آسانی ہے پھر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں اس چھت کے اوپر نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں تو نبی کریم ﷺ اوپر تشریف لے گئے اور حضرت ابوایوب نیچے آ گئے، حضرت ابوایوب نبی کریم ﷺ کیلئے کھانا تیار کرتے تھے جب بچا ہوا کھانا ابوایوب کے پاس آتا وہ نبی کریم ﷺ کی انگلیوں کی جگہ پوچھتے، پھر وہاں سے ہی کھاتے، ایک مرتبہ آپ کیلئے انہوں نے کھانا تیار کیا جس میں تھوم ڈال دیا، جب کھانا واپس آیا تو یہ پوچھنے لگے نبی کریم ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں، آپ کو بتایا گیا رسول اللہ ﷺ نے کھانا تناول نہیں فرمایا، تو یہ گھبراہٹ میں مبتلاء ہو گئے، اوپر منزل میں چڑھے، حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''نہیں'' لیکن میں مکروہ سمجھتا ہوں، ابوایوب ﷜ نے عرض کیا، میں بھی وہ چیز ناپسند کرتا ہوں جو آپ ناپسند سمجھتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی۔

وضاحت حدیث:

راقم نے جس عنوان کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے، اسے دیکھئے، علامہ نووی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

"وفیہ منقبہ ظاھرۃ لابی ایوب الانصاری ﷜ من اوجہ، منھا نزولہ ﷺ ومنھا ادبہ معہ ومنھا موافقتہ فی ترک الثوم، وقولہ انی اکرہ ما تکرہ ومن اوصاف المحب الصادق ان یحب ما احب محبوبہ ویکرہ ما کرہ"

حدیث پاک سے حضرت ابوایوب انصاری ﷜ کی فضیلت واضح طور پر ظاہر ہو گئی، اس کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ کا ان کے گھر تشریف لانا اور ان کے گھر قیام کرنا ان کی عظمت شان پر دلالت کر رہا ہے، خاص کر کے جب سب مؤمنین تمنا کر رہے تھے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو آپ نے فرمایا جہاں رب تعالی چاہے گا وہاں میری اونٹنی خود بخود بیٹھ جائے گی،

(۲) حضرت ابوایوب ﷜ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا کتنا زیادہ ادب واحترام تھا کہ رات کو یہ خیال آنے پر کہ ہم اوپر ہیں اور نبی کریم ﷺ نیچے ہیں یہ تو ادب کے خلاف ہے تو تمام گھر والوں کو جگا کر گھر کی ایک طرف پر کر دیا، رات اسی طرح گذاردی۔

حدیث شریف میں ''فتنحوا فباتوا فی جانب'' جمع کے صیغے واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں کہ سب اہل خانہ

نے گھر کے چھت کے ایک کنارے پر رات گذار دی۔

(۳) حضرت ابوایوب انصاری ﷜ رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ تابعداری فرماتے تھے، یہ واضح ہے کہ انہوں نے تھوم کھانا چھوڑ دیا اور یہ کہا جس کو نبی کریم ﷺ ناپسند کرتے ہیں میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں۔

(۴) محب صادق کی علامت اور اوصاف کا پتہ چل گیا کہ محب صادق وہ ہوتا ہے، جو محبوب کی پسند کو پسند کرے اور محبوب کی ناپسند کو ناپسند کرے۔

اور فوائد حاصل ہوئے:

"اذا بعث الیه فاکل منه حاجة ثم ردالفضلة اکل ابو ایوب من موضع اصابع النبی ﷺ تبرکا، ففیه التبرک بآثار اهل الخیر فی الطعام وغیره"

حضرت ابوایوب ﷜ کھانا تیار کر کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجتے آپ اپنی حاجت کے مطابق تناول فرمالیتے، اور باقی کھانا ان کی طرف واپس بھیج دیتے، دوسری روایت اسی حدیث مذکور سے پہلے مسلم شریف کے اسی صفحہ میں موجود ہے، جس میں صراحۃ ذکر ہے۔

"عن ابی ایوب قال کان رسول الله ﷺ اذا اتی بطعام اکل منه وبعث بفضلة الی" حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کھانا لایا جاتا، تو آپ اس سے (حاجت کے مطابق) کھالیتے اور باقی بچا ہوا میری طرف بھیج دیتے، تو یہ آپ کی انگلیوں کی جگہ سے کھاتے، انگلیوں کی جگہ سے آپ کا کھانا تبرک کی وجہ سے تھا حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ نیک لوگوں کے طعام وغیرہ سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے۔

مسئلہ: تھوم (لہسن) کھا کر مسجد میں جانا، یا کسی محفل ومجلس میں جانا، یا بڑے لوگوں سے (بزرگوں سے) سے کلام کرنا مکروہ ہے، جو حکم لہسن کا ہے وہی پیاز کا ہے اور کوئی سبزی، ساگ اس قسم کا ہو جس کے کھانے میں بو ہو اس کا حکم بھی یہی ہے۔ ہاں اگر پیاز، لہسن کے پکانے سے بو زائل ہو جائے تو پکا کر کھانا اور مسجد وغیرہ میں جانا جائز ہوگا۔

فائدہ: "کان ﷺ یترک الثوم دائما لانه یتوقع مجیء الملائکة والوحی کل ساعة"

نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ لہسن (تھوم) کا استعمال چھوڑے رکھا، کیونکہ آپ کو ہر گھڑی فرشتوں اور خصوصا ملک وحی (وحی کا فرشتہ) کے آنے کی امید ہوتی تھی۔ اسی زیر بحث حدیث پاک سے بھی واضح ہو رہا ہے "وکان النبی ﷺ یؤتی بالوحی" نبی کریم ﷺ کے پاس وحی لائی جاتی تھی یعنی آپ کا لہسن کا استعمال نہ کرنا وحی کے آنے کی انتظار کی وجہ سے تھا، وحی کے آنے کی انتظار کی وجہ سے آپ لہسن کا استعمال کیوں چھوڑتے تھے؟

اس کی وجہ دوسری حدیث میں بہت واضح ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "انی اناجی من لا تناجی وان الملائکة تتأذی ممایتأذی بنو آدم" کہ میں اس ذات سے مناجات کرتا ہوں جس سے تم مناجات نہیں کرتے، اور بیشک فرشتوں کو ہر اس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

اس میں واضح طور پر بیان ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ نے پکا ہوا لہسن بھی فرشتوں کی ملاقات کی امید پر چھوڑے رکھا۔

کھانے والے شخص کیلئے:

"قال العلماء فی ھذاانه یستحب للآکل والشارب ان یفضل ممایاکل ویشرب فضلة لیواسی من بعده لاسیما ان کان ممن یتبرک بفضلة"

علماء کرام نے حدیث پاک کے اس حصہ سے کہ (نبی کریم ﷺ سے جو کھانا بچ جاتا، ابوایوب کی طرف بھیج دیتے) یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ جب کسی کو کھانا پیش کیا جائے تو کھانے، پینے والے کیلئے مستحب یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے کچھ بچادے، تاکہ وہ دوسروں کے کام آسکیں، یہ بعد میں کھانا کھانے والوں کے ساتھ غمخواری کی علامت ہے۔ (خصوصا جب کھانا کھانے والا وہ شخص ہو جس کے باقی بچے ہوئے کھانے کو تبرک سمجھا جائے، اسے بھی کچھ کھانا چھوڑ دینا مستحب ہے۔

"**وکذا اذا کان فی الطعام قلة ولھم الیه حاجة**" اسی طرح کھانا قلیل ہو، دوسرے لوگوں کو بھی کھانے کی حاجت ہو تو جن لوگوں کو پہلے کھانا کھلایا جائے وہ دوسروں کا ضرور خیال رکھیں تھوڑی مقدار میں صرف بھوک کو ختم کرنے کی حد تک کھائیں، باقی کھانا دوسروں کیلئے چھوڑ دیں۔

"ویتاکدھذافی حق الضیف لاسیما ان کانت عادة اھل الطعام ان یخرجوا کل ماعندھم وتنتظر عیالھم الفضلة کما یفعله کثیر من الناس.

مہمان کیلئے بہت ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ سارا کھانا ہڑپ نہ کرجائے کیونکہ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ مہمان کی عزت کیلئے گھر کا پکا ہوا سارا کھانا (خصوصا سالن) اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں اب گھر کے افراد (اہل وعیال) اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کھانا واپس آئے گا تو ہم کھائیں گے۔ (ماخوذ از نووی)

برتن جب واپس آئیں تو گھر والے سمجھیں مہمان مہذب تھا، اس نے مناسب مقدار میں کھانا کھایا، ایک یا دو بوٹیوں پر اکتفاء کیا، ایسا نہ ہو کہ برتن خالی کرکے اٹھے، گھر کے افراد کہیں، کھانے والا کتنا بیہودہ شخص تھا، اسے کھانے

کا کوئی سلیقہ نہ تھا، اس نے پہلے کھانا دیکھا نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ اس طرح کے تبصرہ سے بچنے کیلئے مہمان کو اپنا خود خیال کرنا چاہئے۔

ہاں کمال تو یہی ہے: کامل محب کا یہی تقاضا ہے کہ محبوب کی طاعت وفرمانبرداری کرے۔

تعصی الالہ وانت تظھر حبہ　　　هذا لعمری فی القیاس بدیع

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اور تو اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے، مجھے میری عمر کی قسم یہ تو عجیب بات ہے۔

لو کان حبک صادقا لاطعتہ　　　ان المحب لمن یحب مطیع

اگر تو محبت میں سچا ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا　　بیشک محب تو محبوب کی اطاعت کرتا ہے۔

"ان المحبة سبب لاتباع الرسل والاتباع دلیل علی وجودھا وعدمہ دلیل علی عدمھا فمن ادعی المحبة مع مخالفة سنة الرسول ﷺ فھو کذاب یکذبہ کتاب اللہ"

بیشک اللہ تعالیٰ کی محبت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب رسول اللہ ﷺ کی اتباع حاصل ہو، آپ کی اتباع کا پایا جانا دلیل ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے پائے جانے کی، اور آپ کی اتباع کا نہ پایا جانا دلیل ہے رب تعالیٰ کی محبت کے نہ پائے جانے کی، جو شخص محبت کا دعویٰ کرے اور سنت رسول ﷺ کی مخالفت کرے وہ جھوٹا ہے، اس کا جھوٹا ہونا قرآن پاک کی اسی آیہ کریمہ سے ثابت ہے۔

اصل میں اللہ تعالیٰ کی محبت صرف رائے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو جو محبت پسند ہوگی وہی مقبول ہوگی۔　(ماخوذ از مظہری)

کامل محبت یہ ہے:

"الحب وھو عبارة عن اشتغال قلب المحب بالمحبوب وانسہ بہ بحیث یمنعہ عن الالتفات الی غیرہ ولا یکون لہ بد من دوام التوجہ الیہ والاشتغال بہ"

کامل محبت یہ ہے کہ محب کا دل محبوب کے ساتھ ہی مشغول رہے اور اسی کے ساتھ اسے انس رہے غیروں کی طرف اس کی توجہ نہ رہے، محبوب کی طرف کامل توجہ اور محبوب کے ساتھ دل کے مشغول ہونے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے۔

یہی مطلب ہے اس قول کا "**العشق نار فی القلوب تحرق ماسوی المحبوب**" عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سواء سب چیزوں کو جلا دیتی ہے یعنی محب کامل محبوب کے بغیر سب چیزوں کو بھلا دیتا ہے، گویا کہ اس کے

وجود میں محبوب کے بغیر کوئی چیز سماتی نہیں، یہاں تک اسی کی نظر بصیرت میں اس کی اپنی ذات بھی نہیں رہتی۔

"ومقتضی تلک الصفة ابتغاء مرضات المحبوب و کراهة مایکرهه"

جب اس قسم کی کامل محبت حاصل ہو تو وہ محبت تقاضا کرتی ہے کہ محبوب کی پسند محب کی پسند ہو اور محبوب کی ناپسند محب کی ناپسند ہو۔

رب تعالیٰ سے محبت کرے تو یوں کرے "یحبه بالذات بلاملا حظة طمع فی ثوابه اوخوف من عقابه وان اجتمع مع ذلک طمع و خوف ایضا" محبت صرف اس کی ذات سے ہو، ثواب کی امید اس میں نہ ہو، اور نہ ہی عذاب کے خوف سے بچنے کی اس میں طمع پائی جائے۔ ہاں جب باری تعالیٰ سے محبت بغیر کسی غرض سے ہوگی تو رب تعالیٰ کی مہربانی سے خود بخود نیکیوں پر ثواب حاصل ہوگا، اور عذاب کے خوف سے بھی بچ جائے گا۔ (ماخوذ از مظہری)

گنہگاروں کیلئے امید کی کرن:

﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے "ای یمحها من الصحف فالمحبوب لا یبقی علیه ذنب والمبغوض لا تبقی له طاعة" کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو اس کے نامہ اعمال سے مٹاوے گا، محبوب بندے کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا اور رب تعالیٰ جس سے ناراض ہوگا اسے طاعت کی توفیق حاصل نہیں ہوگی۔

"قال بعض العارفین واجعل سیآتنا سیآت من احببت ولا تجعل حسناتنا حسنات من البغضت فلا حسان لا ینفع مع البغض منک والاساء ة لا تضرمع الحب منک"

کسی عارف نے کیا خوب کہا اے اللہ! ہمارے گناہوں کو وہ درجہ دے دے جسے تو پسند کرے یعنی صغیرہ گناہوں کو توبہ وعبادت کے ذریعے یا اپنے فضل وکرم کے ذریعے مٹادے، اور کبیرہ گناہوں پر ہمیں توبہ کی توفیق عطاء کردے یا اپنے فضل وکرم سے ان پر عفو کا قلم پھیر دے، تو یقیناً وہ گناہ درجہ عفو میں آ کر تیری ناراضگی سے دور ہو جائیں گے۔

اور اے اللہ! ہماری نیکیوں کو ایسی نیکیاں نہ بنا جن کو تو ناپسند کرے یا وہ نیکی جس میں ریاء کاری پائی جائے مغصوبہ زمین میں نماز ادا کی جائے اس کی قسم کی نیکیاں برباد ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہیں۔ وہ نیکیاں جن پر تو ناراض رہے ان کا کوئی نفع نہیں، وہ گناہ جو تیری بخشش میں آ کر گناہ ہی نہ رہیں ان میں کوئی نقصان نہیں۔ (ماخوذ از صاوی)

ارشاد مصطفوی ﷺ دیکھئے:

"عن عمر بن الخطاب ان رجلا اسمه عبدالله یلقب حمارا کان یضحک النبی ﷺ وکان النبی ﷺ قد جلده

فی الشراب فاتی بہ یوما فامر بہ فجلد فقال رجل من القوم اللھم العنہ مااکثر مایؤتی بہ فقال النبی ﷺ لا تلعنوہ فواللہ ما علمت انہ یحب اللہ ورسولہ" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب مالایدعی علی المحدود)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص جس کا نام عبداللہ اور لقب حمار تھا وہ نبی کریم ﷺ کو ہنساتا تھا، نبی کریم ﷺ نے اسے شراب پینے کی وجہ سے کوڑے لگوائے، پھر ایک دن اسے لایا گیا آپ نے اسے پھر کوڑے لگوائے (یعنی دوسری مرتبہ شراب پینے پر دوبارہ کوڑے لگوائے گئے) قوم میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ اس پر لعنت بھیج، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تجھے علم نہیں بیشک یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

وضاحت حدیث: حدیث پاک میں "**ماعرفت**" میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ما موصولہ ہو جائے پھر "**عرفت**" میں دو احتمال ہیں کہ یہ متکلم کا صیغہ ہو یا مخاطب گا، اگر متکلم کا صیغہ ہو تو مطلب یہ ہوگا "اس پر لعنت نہ بھیجو مجھے معلوم ہے یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اگر مخاطب کا صیغہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا اس پر لعنت نہ کرو، تمہیں معلوم ہے یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

حدیث پاک سے اور یہ حاصل ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں قانون کی حکمرانی تھی، اپنے پاس بیٹھنے والے، خوش طبعی کرنے والے کو جرم ثابت ہونے پر حد لگوادی، ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ وہاں کئی قانون نہیں تھے، چھوٹے، بڑے، امیر و غریب، ڈنڈے والے یعنی لٹھ برداروں اور ضعیف و ناتواں لوگوں کیلئے ایک قانون تھا۔

اور حدیث پاک سے عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس شخص کے شراب پینے کے باوجود اللہ و اس کے رسول ﷺ کی محبت اس کے دل سے نہیں نکلی، جس کی گواہی خود مصطفیٰ کریم ﷺ نے دی، تو پتہ چلا کہ معمولی لغزش پر کسی کو محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں جھوٹا نہ سمجھا جائے، ہوسکتا ہے اس لغزش سے باز آکر وہ ظاہرا اور باطنا سچا ہو جائے۔

دینی مدارس کے طلباء کی توجہ کیلئے:

﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ میں "اتبعوا" امر ہے، مضارع جب جواب امر میں آئے تو مجزوم ہوتا ہے، اسی وجہ سے "یُحْبِبْ" اور "یَغْفِرْ" مجزوم ہیں۔

فائدہ جلیلہ: بظاہر ایک سوال و جواب پایا جاتا ہے، جو بہت بڑے فائدہ پر مرتب ہے، سوال یہ ہے کہ آیۂ کریمہ کا بظاہر تقاضا یہ ہے اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبت کرنا ثابت ہوگا، جب اتباع رسول اللہ ﷺ پائی جائے گی، اور آپ کی اتباع تقاضا کرتی ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، اس سے تو یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندے

سے پہلے سے ہے، اور بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت بعد میں ہے، تو یہ کیسے کہا جائے گا کہ بندہ رب تعالیٰ سے محبت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا۔ طلباء کرام قانونی اصطلاح میں یہ سمجھیں کہ یہ مستلزم دور ہے اور دور محال ہے تو اس کا جواب ہی درحقیقت فائدہ جلیلہ ہے، جواب یہ ہے:

"ھذه محبة اخری من الله تعالی سوی المحبة السابقة فمحبة العبد لله محفوف بمحبتین من الله سبحانه سابق و لاحق فالمحبة السابقة ماذکرناه سابقا والمحبة اللاحقة ھی التی تقتضی الرحمة والتفضل الکامل"

یہ محبت اور، اور پہلی محبت اور ہے، بندہ جب رب تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو دو محبتیں حاصل ہوتی ہیں، ایک سابق اور ایک لاحق، سابق محبت وہ ہے جس کے بعد اتباع رسول اللہ ﷺ حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد بندے کو رب تعالیٰ سے محبت حاصل ہوتی ہے۔

اور لاحق وہ ہے جو بندے کی محبت کے بعد رب تعالیٰ کی طرف سے بندے کو حاصل ہوتی ہے یہی محبت رحمت کاملہ اور کامل فضل کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ رحمت کاملہ اور تفضل کامل پتہ کرنا ہو تو اس حدیث پاک کو مدنظر رکھئے:

"ان جزء ا واحدا منھا ای من الرحمة قسمھا الله بین الخلائق وادخر لاولیاء ہ تسعة وتسعین"

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی ایک جزء تمام مخلوق پر تقسیم فردی ہے اور اپنے اولیاء کیلئے ننانوے رحمتیں ذخیرہ بنا رکھی ہیں۔ (مظہری)

یعنی آپ خود اندازہ کریں کہ ماں کو کتنا زیادہ رحم حاصل ہے اولاد سے اور باپ اور بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے، اور بعض اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے، اور بعض مشائخ کو اپنے مریدین سے، یہ ساری رحمتیں ایک فیصد ہیں، باقی ننانوے جب اللہ تعالیٰ اپنے مقربین بندوں کو قیامت کے دن عطاء کرے گا تو کیا ہی شان ہوگی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی۔

عشق ومحبت کا تقاضا:

جو شخص کسی سے محبت کرے اس کی محبت یہ چاہتی ہے کہ اس کے خاص محبوبوں سے اسے محبت ہو، اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے اس کے غلاموں، اس کے گھروں، اس کے گھروں کی دیواروں اور اس کے کتوں اور گدھوں سے بھی اسے محبت ہوتی ہے۔ "فھذا ھو قانون العشق وقاعدة المحبة" یہی وہ قانون عشق ہے، یہی قاعدہ محبت ہے۔ مجنون عامری نے کیا خوب کہا:

امر علی الدیار دیار لیلی | اقبل ذاالجدار وذاالجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی | ولکن حب من سکن الدیارا

میں گھروں سے یعنی لیلیٰ کے گھروں سے گذرتا ہوں میں دیواروں والے گھروں سے گذرتا ہوں کتنی ہی محبت ہے ان گھروں سے جنہوں نے میرے دل کو فریفتہ کر دیا ہے۔لیکن حقیقی محبت تو گھر والوں سے ہے۔(روح البیان)

ہاں ہاں اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ وہی محبت رسول اللہ ﷺ میں سچا ہے جسے آپ کے یاروں یعنی صحابہ کرام سے محبت ہو، جو صحابہ کرام کا دشمن ہے وہ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں جھوٹا ہے، وہ لعنت کا مستحق ہے۔اسی طرح محبت اہل بیت اطہار کے بغیر بھی محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کا دعوی جھوٹا ہے۔وہ بھی لعنت کا مستحق ہے۔ (راقم)

علامہ قاشانی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی محبت آپ کی متابعت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور آپ کے راستے پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے یعنی قول وفعل، عمل وخلق، حال وسیرت اور عقیدہ میں مصطفیٰ کریم ﷺ کی متابعت پائی جائے، اس کے بغیر دعوی محبت درست نہیں، کیونکہ محبت کا قطب (چکی کا کیل) آپ ہی ہیں، محبت کو ظاہر کرنے والے آپ ہی ہیں۔"وطریقته ﷺ المحبة فمن لم یکن له من طریقته نصیب لم یکن له من المحبة نصیب" حبیب پاک ﷺ کا طریقہ ہی محبت ہے، جس کو آپ کے طریقہ سے کچھ حصہ حاصل نہیں اسے محبت کا بھی کوئی حصہ حاصل نہیں۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

محبت اور متابعت میں نسبت عموم وخصوص من وجہ کی ہے متابعت ہو محبت نہ ہو، جیسا کہ منافقین بظاہر آپ کی متابعت کرتے تھے، لیکن ان کے دلوں میں آپ کی محبت نہیں تھی، بلکہ ان کے دلوں میں کدورت، عداوت، نفرت تھی۔محبت ہو متابعت نہ ہو، جیسا کہ حدیث پاک سے ایک صحابی کا واقعہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کو دو مرتبہ شراب پینے پر کوڑے لگائے گئے، لیکن ان کی محبت کی گواہی خود مصطفیٰ کریم ﷺ نے دی، کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔متابعت اور محبت دونوں ہی پائے جائیں تو کمال اسی میں ہے، اعلیٰ درجہ کی محبت رسول اللہ ﷺ کی محبت یہی ہے کہ آپ کے اقوال وافعال کے مطابق مؤمن اپنے اقوال وافعال کو کرلے، تاکہ یہ دعوی محبت سچا متصور ہو۔

صحابہ کرام کی تابعداری:

صحابہ کرام کے دل میں نبی کریم ﷺ کا کتنا ادب احترام تھا اور کس حد کی تابعداری کرتے تھے؟ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھیے:

"عن عبادة بن الصامت قال کان النبی ﷺ اذا نزل علیه الوحی کرب لذلک وتربد

وجهه وفی روایة نکس رأسه ونکس اصحابه رؤسهم فلما اتلی عنه رفع رأسه"
(مسلم،مشکوة باب المبعث وبدء الوحی)

حضرت عبادۃ بن صامت ﷜ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ پر شدت کی کیفیت طاری ہوتی اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اپنا سر جھکا لیا اور صحابہ کرام نے بھی اپنے سر جھکا لئے ،جب آپ سے یہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے سر اٹھالیا۔

وحی کے وقت سر جھکانے کی وجہ تفکر کرنا اور امر وحی کا شدید اہتمام کرنا اور حقوق عبودیت کے مطالبہ پر ڈر رکھنا اور منعم کی نعمتوں کی شکریہ بجالانا ،اپنی امت کے نافرمانوں کو عذاب پہنچنے سے پریشان ہونا اور ڈرنا وغیرہ امور تھے اور ہوسکتا ہے کہ حقیقت میں وحی کے نازل ہونے کی وجہ سے ظاہری شدت طاری ہو جاتی ہو،اور چہرے کا رنگ بدل جاتا ہو، نبی کریم ﷺ کے سر جھکانے کی تو وجوہ تھیں لیکن صحابہ کرام کے سر جھکانے کی وجہ فقط "ونکس اصحابه رؤسهم ای اتبا عاله وتادبامعه" یہ تھی کہ انہوں نے آپ کی تابعداری کرتے ہوئے ادب کے طور پر سر جھکا لئے تھے "رفع رأسه وتبعه اصحابه" حضور ﷺ کے سر اٹھانے پر صحابہ کرام نے سر اٹھا لئے۔

سبحان الله! کتنی تابعداری، کیسا ادب و احترام تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا بھی نہیں کہ میرے سر جھکانے پر تم بھی سر جھکا لینا اور میرے سر اٹھانے پر تم بھی سر اٹھالینا، فقط دیکھ کر عمل کرنا صحابہ کرام کی ہی شان تھی۔

محبت مصطفیٰ کریم ﷺ کے بغیر ایمان مکمل نہیں:

"عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین" (مسلم ج اول ص۴۹ باب وجوب محبة رسول الله ﷺ)

حضرت انس بن مالک ﷜ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" تم میں سے کوئی ایک مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ میں اسے زیادہ محبوب ہوں اس کی اولاد اور اس کے والدین اور سب لوگوں سے۔

وضاحت حدیث: "المحبة المیل الی ما یوافق المحب" محبت کا مطلب یہ ہے کہ محب کے دل میں میلان پایا جائے کہ محب کو محبوب کی موافقت حاصل ہو جائے۔

محبت کی وجوہ: محبت کی دو وجہ ہیں۔ایک ظاہری اور ایک باطنی،معنوی۔

ظاہری وجہ: "ثم المیل قد یکون لما یستلذه الانسان ویستحسنه کحسن الصورة والصوت والطعام ونحوها"

میلان کی وجہ ظاہری یہ ہے کہ انسان کئی چیزوں میں لذت پاتا ہے تو ان کی طرف میلان کرتا ہے، جیسے طعام، پھل وغیرہ۔اور کبھی کسی چیز کو حسین سمجھ کر اس کی طرف میلان کرتا ہے، جیسے حسین صورت اور حسین آواز۔

باطنی ومعنوی وجہ مطلق:

یعنی باطنی ومعنوی میں پھر دو صورتیں ہیں، ایک مطلق اور ایک مقید، مطلق میلان کی وجہ

"وقد یستلذہ بعقلہ للمعانی الباطنة کمحبة الصالحین والعلماء واھل الفضل مطلقا"

کبھی انسان عقل کے ذریعے باطنی اسباب کی وجہ سے لذت محسوس کرتا ہے، جیسا کہ صالحین، علماء اور اہل فضل یعنی اولیاء کرام سے مطلقا محبت پائی جائے، اس میں کسی قسم کی غرض کی کوئی قید نہ ہو، صرف زہد وتقوی اور علم دین اس محبت کا سبب ہو۔

باطنی ومعنوی وجہ مقید:

"وقد یکون لاحسانہ الیہ ودفع المضار والمکارہ عنہ" یعنی کبھی میلان کی وجہ تو عقلی اور باطنی اسباب پائے جاتے ہیں، لیکن مطلق نہیں، بلکہ کسی کے احسان کی وجہ سے اور مصائب وآلام کے دور کرنے کی وجہ سے اس کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ میں تینوں وجوہ محبت پائی گئی ہیں:

"وھذہ المعانی کلھا موجودة فی النبی ﷺ لما جمع من جمال الظاھر والباطن وکمال خلال الجلال وانواع الفضائل واحسانہ الی جمیع المسلمین بھدایتہ الی الصراط المستقیم ودوام النعیم والابعادمن الجحیم"

یہ تمام وجوہ اور اسباب محبت نبی کریم ﷺ میں موجود ہیں، آپ کو جمال ظاہری وباطنی حاصل ہے، اور رب تعالی کی دوستی کا کمال آپ کو حاصل ہے، ہر قسم کے فضیلت والے اوصاف آپ کو حاصل ہیں، تو سمجھ آیا کہ آپ میں محبت ظاہری کی وجہ اور باطنی ومعنوی وجہ مطلق پائی گئی۔اور آپ کے تمام مسلمانوں پر عظیم احسانات ہیں کیونکہ سیدھی راہ کی ہدایت آپ نے دی، اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں یعنی جنت اور جنت کی راہ آپ نے دکھائی اور جہنم سے دور رہنے کی رہنمائی آپ نے فرمائی۔

اب اس سے واضح ہوگیا کہ محبت کی وجوہ میں سے باطنی ومعنوی وجہ مقید بھی آپ کو حاصل ہے۔

فائدہ: محبت مصطفیٰ کریم ﷺ ذریعہ ہے محبت باری تعالیٰ کا یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت ضروری ہے کیونکہ "وھذا منصور فی حق اللہ تعالیٰ فان الخیر کلہ منہ سبحانہ وتعالیٰ" یہ تمام وجوہ محبت رب تعالیٰ میں حقیقی طور پر پائی جاتی ہیں، بیشک ہر قسم کی خیر حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اور اسی کی عطاء سے نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے، اور آپ کے وسیلہ جلیلہ سے مومنین کو حاصل ہے۔ "قال مالک وغیرہ المحبۃ فی اللہ تعالیٰ من واجبات الاسلام" امام مالک رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت واجبات اسلام سے ہے۔

(ماخوذ از نووی حوالہ مذکور)

کس محبت کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں: اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے یہ سمجھا جائے کہ

محبت کی تین قسمیں ہیں: (۱) محبت طبعی (۲) محبت عقلی (۳) محبت ایمانی۔

"عام" لوگوں کیلئے تو یہ حکم ہے کہ وہ محبت طبعی اپنی ذات سے زیادہ رکھ سکتے ہیں بنسبت مصطفیٰ کریم ﷺ کے لیکن محبت عقلی اور محبت ایمانی کے مطابق مصطفیٰ کریم ﷺ سے محبت سب سے زیادہ جب تک نہیں ہوگی اس وقت تک ایمان کی تکمیل نہیں ہوگی۔ "خواص" کو نبی کریم ﷺ کی برکت سے یہ مقام حاصل تھا کہ وہ محبت طبعی کے لحاظ پر بھی سب سے زیادہ مصطفیٰ کریم ﷺ سے کرتے تھے۔ آیئے اس اجمال کی تفصیل علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی زبان سے سنئے۔ آپ فرماتے ہیں:

(۱) "ولیس المراد الحب الطبیعی لانہ لا یدخل تحت الاختیار ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا"

یہاں حدیث پاک میں جس محبت کا ذکر ہے وہ محبت طبعی نہیں کیونکہ یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہوتی بلکہ یہ طبیعت کے تقاضا کے مطابق ہوتی ہے۔ جب محبت طبعی اختیار میں نہیں تو اس کی تکلیف بھی نہیں دی گئی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شان ہی یہ بیان کی گئی ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ آپ اپنی خواہشات کے مطابق کلام نہیں فرماتے بلکہ وحی کے مطابق کلام فرماتے ہیں۔ تو یقیناً آپ بھی اس چیز کی تکلیف نہیں دیں گے جس کی تکلیف رب تعالیٰ نہیں دیتا۔ جب رب تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا تو نبی کریم ﷺ نے بھی کسی کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دی۔

لہٰذا واضح ہوا کہ محبت طبعی سے اپنے آپ سے یا اہل وعیال سے نبی کریم ﷺ سے زیادہ محبت ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ گرفت تو وہاں ہوتی ہے جہاں اختیار ہو، جب اختیار ہی نہ ہو تو اس میں گرفت نہیں ہوتی، ورنہ طاقت سے زائد تکلیف دینا لازم آئے گا جو جائز نہیں۔

(۲)"بل المراد الحب العقلي الذي يوجب ايثار ما يقتضي العقل رجحانه ويستدعي اختياره"

بلکہ مراد محبت عقلی ہے کیونکہ عقل واختیار کے تقاضا کے مطابق وہ نبی کریم ﷺ کی محبت کو سب سے زیادہ ترجیح دے اگرچہ وہ اس کی خواہش کے خلاف ہو۔

اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھیں کہ مریض کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ میٹھی دوا استعمال کرے کڑوی دوا کو اس کا مزاج قبول نہیں کرتا، میٹھی دوا کی طرف میلان محبت طبعی ہے لیکن مریض کو جب پتہ چلتا ہے کہ کڑوی دوا اس کی صحت کیلئے مفید ہے تو وہ اپنے اختیار اور عقل سے کڑوی دوا سے محبت کرتا ہے۔

"لو امره ﷺ تقبل ابويه واولاده الكافرين اوبان يقاتل الكفار حتى يكون شهيدا لا حب ان يختار ذلك لعلمه ان السلامة في امتثال امره ﷺ"

اگر نبی کریم ﷺ کسی کو حکم دیں کہ تم اپنی کافر اولاد یا کافر والدین کو قتل کردو، یا آپ حکم فرمائیں کہ کافروں سے قتال کرتے ہوئے شہید ہوجاؤ تو بظاہر یہ اس کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن وہ اپنے اختیار وعقل سے نبی کریم ﷺ کے حکم کو تسلیم کرے اور آپ کے حکم سے محبت کرے، سلامتی اس انسان کی آپ کے حکم کو تسلیم کرنے میں ہے۔

(۳) محبت ایمانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے محبت تمام چیزوں سے بڑھ کر ہو:

"اوالمراد الحب الايماني الناشيء عن الاجلال والتوقير والاحسان والرحمة وهو ايثار جميع اغراض المحبوب على جميع اغراض غيره حتى القريب والنفس"

محبت ایمان حاصل ہوتی ہے بزرگی، مقام تعظیم، احسان ورحمت کو دیکھ کر، جب محبت ایمانی حاصل ہو تو اس کی وجہ سے محبوب کی اغراض پر باقی تمام کی اغراض کو قربان کردے، یہاں تک کہ اپنے اقرباء اور اپنی جان سے بھی محبوب کر ترجیح دے۔

"ولما كان ﷺ جامعا لموجبات المحبة من حسن الصورة والسيرة وكمال الفضل والاحسان مالم يبلغه غيره استحق ان يكون احب الى المؤمن من نفسه فضلا من غيره سيما وهو الرسول من عندالمحبوب الحقيقي الهادي اليه والدال عليه والمكرم لديه"

جب نبی کریم ﷺ میں تمام وجوہ محبت پائی گئی ہیں، حسن صورت آپ کو حاصل ہے، حسن سیرت آپ کو حاصل ہے، کامل فضل اور کامل احسان آپ کو حاصل ہے، یہ کمالات جو آپ کو حاصل ہیں کسی اور کو حاصل نہیں، کیونکہ آپ کی امت کے بڑے بڑے مقربین کو بھی ان کی ایک جھلک حاصل ہے، کہاں حقیقی طور پر جامع الکمالات (اگر کوئی واسطہ ہے تو صرف اعطاء رب کائنات) اور کہاں آپ کے واسطہ سے بعض کمالات حاصل کرنے والے۔

بس حق یہی ہے کہ مومن اپنی ذات سے زیادہ محبت حضور ﷺ سے کرے، جب اپنی ذات سے زیادہ محبوب آپ کو رکھنے کا حکم ہے تو غیروں سے زیادہ محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سے رکھنے کا حکم تو یقیناً ہوگا۔

پھر جب یہ معلوم ہے کہ آپ محبوب حقیقی یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر آئے، اسی رب کائنات نے آپ کی رسالت کی راہنمائی کی اسی ذات کبریاء نے آپ کو اوصاف عطاء کر کے آپ کی رسالت پر دلالت فرمائی، وہ رسول جو خالق کائنات کے ہاں مکرم ہیں، تو یقیناً وہی حق رکھتے ہیں کہ تمام اغیار و اقرباء سے ان کے ساتھ زیادہ محبت کی جائے بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ آپ کو ہی محبوب رکھا جائے۔

خواص کو محبت طبعی بھی حاصل تھی:

یعنی عوام تو محبت طبعی کے طور پر اپنے آپ سے یا اپنی اولاد اور ماں باپ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن خواص کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ محبت طبعی بھی اپنی جان سے زیادہ مصطفیٰ کریم ﷺ سے رکھتے ہیں، آیئے اس کی درخشاں مثال دیکھئے:

"وممن ارتقی الی غایة هذه المرتبة ونهاية هذه المزية سيدنا عمر ﷺ فانه لما سمع هذا الحديث اخبر بالصدق حتى وصل ببركة صدقه الى كمال ذلک فقال بمقتضى الامر الطبيعي "لانت يا رسول الله احب الیّ من كل شیء الا من نفسی فقال لا والذی نفسی بیده حتى اكون احب اليک من نفسک فقال عمر فانک الآن والله احب الیّ من نفسی فقال الآن يا عمر تم ایمانک" (رواه البخاری)

جس شخص نے اس مرتبہ کی بلندی کو حاصل کیا اور فوقیت کی انتہاء تک پہنچا وہ ہیں ہمارے سردار حضرت عمر ﷺ جنہوں نے اس حدیث کو سنا تو سچ سچ بیان فرما دیا۔ اسی سچ کی برکت کی وجہ ہے (اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی برکت کی وجہ سے) آپ اسی کمال تک پہنچے، جب آپ نے اس حدیث پاک کو سنا "لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعين" تو امر طبعی کے تقاضا کے مطابق یوں عرض کیا "لانت يا رسول الله احب الیّ من كل شیء الامن نفسی فقال الآن يا عمر تم ایمانک" (رواه البخاری)

یا رسول اللہ آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے، آپ نے فرمایا نہیں ایمان کی تکمیل نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ میں محبوب ہوں تمہیں تمہارے نفس سے تو حضرت عمر ﷺ نے عرض کیا، بیشک آپ اب قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ

محبوب ہیں تو آپ نے فرمایا ہاں اے عمر! اب تمہارا ایمان مکمل ہوا۔

اگر چہ حدیث پاک کی شرح میں دو احتمال بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے یہ سمجھا ہو کہ محبت طبعی کے طور پر حضور ﷺ سے اپنی جان سے بھی محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہو تو آپ نے سچ ذکر کر دیا کہ محبت طبعی تو اپنی جان سے زیادہ ہے، پھر سمجھ لیا ہو کہ مراد محبت ایمانی اور محبت عقلی و اختیاری ہے، تو آپ نے عرض کیا ہو کہ ہاں ان دونوں قسموں کی محبتوں کے مطابق تو میں آپ سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں

"و ثانیہما انہ او صلہ اللہ تعالی الی مقام الاتم ببرکۃ توجھہ علیہ الصلوۃ و السلام فطبع فی قلبہ حبہ حتی صار کانہ حیاتہ و لبہ"

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت عمر ﷺ کو نبی کریم ﷺ کی توجہ کی برکت کی وجہ سے یہ کامل مقام عطاء کر دیا کہ ان کے دل میں نبی کریم ﷺ کی محبت کو راسخ کر دیا کہ ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبت نبی کریم ﷺ سے ہو گئی۔ گویا کہ ان کی زندگی ہی نبی کریم ﷺ کی محبت کے ساتھ قائم ہو گئی۔

واضح ہوا کہ طبعی محبت بھی حضرت عمر ﷺ کی نبی کریم ﷺ سے اپنی جان سے زیادہ حاصل ہو گئی، یہ مقام آپ کو نبی کریم ﷺ کی توجہ کی برکت سے ہی حاصل ہوا۔ (مرقاۃ ج ا ص ۷۳، ۷۴)

فائدہ جلیلہ: "قال القرطبی و کل من صح ایمانہ بہ علیہ الصلوۃ و السلام لایخلو عن وجدان شئی من تلک المحبۃ الراجحۃ و ان استغرق بالشھوات و حجب بالغفلات فی اکثر الاوقات بدلیل انا نری اکثرھم اذا ذکر ﷺ اشتاق الی رؤیتہ و آثرھا علی اھلہ و مالہ و ولدہ و والدہ و اوقع نفسہ فی المھالک و المخاوف مع وجدانہ من نفسہ الطمانینۃ بذلک لاتر ددفیہ و شاھد ذلک فی الخارج ایثار کثیرین لزیارۃ قبرہ الشریف و رؤیۃ موضع آثارہ" (مرقاۃ ج ا ص ۷۴)

قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جس کا ایمان نبی کریم ﷺ سے صحیح اور کامل ہو، اس کا دل آپ کی کامل محبت سے خالی نہیں ہوتا اگر چہ وہ شہوات میں مستغرق ہی کیوں نہ ہو اور اکثر اوقات غفلت کے حجابات ہی اس پر کیوں نہ ہوں، اس پر واضح دلیل موجود ہے کہ ہم اکثر اوقات دیکھتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا جائے تو دل آپ کی زیارت کے مشتاق ہو جاتے ہیں، انسان کی قلبی تمنا یہ ہوتی ہے کہ آپ کا دیدار حاصل ہو جائے خواہ میری اہل، میرا مال، میری اولاد اور میرے والدین ہی کیوں نہ اس پر قربان ہو جائیں، وہ اپنے آپ کو خوف و ہلاکت میں ڈال کر بھی اس منصب کو پانے پر اطمینان حاصل کرتا ہے، ہاں ہاں ہم دیکھ رہے ہے لوگ دور دراز سے لمبا سفر طے کر کے، کثیر مال خرچ

جب سچے اور کامل مؤمن کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے مجھے دین و دنیا کا عظیم سرمایہ حاصل ہو گیا۔ پتہ چلا کہ شہوات میں مبتلاء اور غفلت میں گھرے ہوئے لوگ بھی محبت مصطفیٰ کریم ﷺ میں سرشار ہوتے ہیں، اور آپ کے مزار انور کو دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔

"ولا شک ان حظ الصحابة من هذاالمعنی تم لانه ثمرة المعرفة وهم بقدره ومنزلته اعلم"

یقینی بات ہے کہ صحابہ کرام کو نبی کریم ﷺ کی معرفت سب سے زیادہ حاصل تھی، اور آپ کی قدر و منزلت کو وہ لوگ زیادہ جانتے تھے، اس لئے ان کو آپ سے محبت بھی بنسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ حاصل تھی۔

محبت کے تین انداز:

(۱) محبت اجلال، یعنی کسی کی عظمت و بزرگی کو دیکھ کر اس سے محبت کر لی جائے جیسے انسان اپنے والدین سے محبت کرتا ہے۔

(۲) محبت شفقت ورحمت جب انسان کسی پر شفیق ہو اور کسی پر رحم کرنے ولا ہو تو اس سے محبت کرتا ہے، جیسا کہ انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔

(۳) محبت مشاکلت واحسان ایک انسان دوسرے سے محبت کرے دوسرا اس کے جواب میں محبت کرے، ایک شخص دوسرے پر احسان کرے تو وہ اس کے احسان کے بدلے اس سے محبت کرے، اکثر لوگوں میں ایک دوسرے سے یہی محبت پائی جاتی ہے۔

تینوں قسمیں نبی کریم ﷺ میں پائی جاتی ہیں:

نبی کریم ﷺ میں اجلال، بزرگی، عظمت پائی گئی ہے، لھذا آپ کی امت کے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ آپ سے محبت اجلال کریں اور جب کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت پر شفیق اور رحیم ومہربان ہیں تو امت کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق آپ سے محبت، شفقت ورحمت کرے، نبی کریم ﷺ کے اپنی امت پر ان گنت احسان ہیں۔لھذا امت کو چاہئے کہ وہ آپ سے محبت مشاکلت واحسان کرے۔ (ماخوذ از نووی شرح مسلم ج ۱ص ۶۹)

شان کلام مصطفوی ﷺ:

زیر بحث حدیث شریف میں مسلم شریف کی روایت میں "من والده وولده" اور نسائی کی روایت میں "من

ولــدہ ووالــدہ" مذکور ہے۔یعنی ایک روایت میں والد کا ذکر پہلے فرمایا کہ انسان والدین کے احسانات کو دیکھ کر ان سے محبت زیادہ کرتا ہے۔اور دوسری روایت میں "ولـــــد"(اولاد) کا ذکر پہلے فرمایا کہ انسان اپنی اولاد پر شفقت کرتے ہوئے ان سے محبت زیادہ کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے دونوں ارشادات کو یکجا جمع کریں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر کوئی شخص تمام لوگوں سے زیادہ محبت اپنے والدین سے زیادہ کرتا ہے تو اس کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک والدین سے زیادہ محبت زیادہ نہ کرے۔اور اگر کوئی شخص سب لوگوں سے زیادہ محبت اپنی اولاد سے کرتا ہے تو اس کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک وہ اپنی اولاد سے زیادہ محبت مجھ سے نہ کرے۔

خیال رہے کہ والد مذکر کا صیغہ استعمال ہے لیکن مراد والدین ہیں،مؤنث کا ذکر ضمنا موجود ہے۔اسی طرح "ولد" نکرہ ذکر ہے جو مذکر و مونث اور فردا فردا تمام اولاد کو شامل ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۲)

(۱) تم فرمادو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ کو خوش نہیں آتے کافر۔

(۲) آپ فرمادو تم فرنبرداری کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو۔

شانِ نزول:

جب پچھلی آیہ کریمہ نازل ہوئی جس میں حکم دیا گیا، ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ "فرمادو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری تابعداری" تو عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے اپنے اصحاب کو کہا:

"ان محمد ایجعل طاعته کطاعة الله ویامر ان نحبه کما احبت النصاری عیسی بن مریم فنزل قوله تعالی(قل اطیعوا الله والرسول)" الخ

بیشک محمد ﷺ اپنی طاعت کو اللہ تعالی کی طاعت جیسا سمجھتا ہے،اور حکم دیتا ہے کہ ہم اس سے اس طرح محبت کریں جیسے

کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم سے محبت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ﴾ ''آپ فرمادو فرمانبرداری کرو اللہ اور رسول کی''

''الرَّسُوْلَ'' پر الف لام عہد خارجی ہے، خاص رسول، اور مطلقا جب الرسول ذکر کیا جائے تو اس سے مراد بھی ہمارے رسول کریم حضرت محمد ﷺ ہی ہوتے ہیں۔ اب مطلب واضح ہوا:

''ان اطاعة الله و الرسول واحد فان اطاعة الرسول من حيث هو رسول الله انما هي اطاعة الله لاغير''

بیشک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ایک ہی چیز ہے، بیشک رسول اللہ ﷺ اس لحاظ پر کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی تو ہے، کسی اور کی اطاعت نہیں کسی اور کی اطاعت تو تب ہوتی جب وہ اللہ کے رسول نہ ہوتے۔

❁ ''عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ كل امتی يدخلون الجنة الامن ابی قالو ومن يابی يا رسول الله قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقدابی''بخاری ومسلم''

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ'' کون شخص انکار کرے گا'' آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی تحقیق اس نے انکار کیا۔ (ماخوذ از مظہری)

حدیث شریف کی ابتداء میں ہی انکار کرنے والے کو دخول جنت سے مستثنیٰ قرار دے دیا، صحابہ کرام کا سوال تعجب کے طور پر تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ انکار کون کرے گا یعنی ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں کہ آپ کے ارشاد سے بھی کوئی انکار کرے گا۔ صحابہ کرام نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو دیکھ کر تعجب فرما کر سوال کیا۔

میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا جواب کیا خوب تھا کہ جس نے میری فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی وہی منکر ہوا یعنی وہی جنت میں داخل ہونے سے محروم رہا۔ نبی کریم ﷺ کے جواب کی خوبی یہ ہے کہ صحابہ کرام نے سوال منکرین کے متعلق کیا لیکن آپ نے مخلصین کا بھی ذکر فرما کر جواب کی ہر شق کو مکمل فرمادیا۔

❁ ''عن جابر قال جاء ت ملائكة الى النبی ﷺ وهو نائم فقالوا ان لصاحبكم هذا مثلا فاضربوا له مثلا قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا مثله كمثل رجل بنی دارا وجعل فيها مأدبه وبعث داعيا فمن اجاب الداعی دخل الدار واكل من المأدبة ومن لم يجب الداعی

لم یدخل الدار ولم یاکل من المأدبة فقالوا اولوهاله یفقهها قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العین نائمة والقلب یقظان فقالوا الدار الجنة والداعی محمد فمن اطاع محمدافقد اطاع الله ومن عصی محمدافقد عصی الله ومحمد فرق بین الناس" (رواہ البخاری، مشکوۃ کتاب الاعتصام بالسنۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ملائکہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، ایسے حال میں کہ آپ سو رہے تھے، تو انہوں نے کہا بیشک تمہارے ان صاحب کی مثال ہے ان کی مثال بیان کرو بعض نے کہا بیشک یہ تو سو رہے ہیں، اور بعض نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سوتی ہیں، دل جاگتا ہے، تو انہوں نے کہا "ان کی مثال اس شخص کی مثال ہے جس نے گھر بنایا اور اس میں دسترخوان بچھایا دعوت دینے والے کو بھیجا، تو جس شخص نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرلیا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ اس نے دسترخوان سے کھالیا اور جس نے دعوت کو قبول نہ کیا، گھر میں داخل نہ ہوا۔ اس نے دسترخوان سے نہ کھایا فرشتوں نے (بعض نے بعض سے) کہا، اس کی وضاحت کر دو تا کہ وہ سمجھ جائیں کچھ فرشتوں نے کہا بیشک یہ تو سوئے ہوئے ہیں اور کچھ دوسروں نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سوتی ہیں، اور ان کا دل جاگتا ہے، تو انہوں نے بیان کیا کہ "گھر سے مراد جنت ہے اور دعوت دینے والے سے مراد محمد (ﷺ) ہیں جس شخص نے محمد (ﷺ) کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (ﷺ) کی نافرمانی کی تحقیق اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور محمد (ﷺ) لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ (معالم التنزیل میں اسی مقام پر یہ حدیث مندرج ہے)

حدیث پاک کی وضاحت تو ترجمہ سے ہی ثابت ہے کچھ الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

"**مأدبة**" دال پر ضمہ اور فتحہ دونوں حرکتیں پڑھنی جائز ہیں، اس کا معنی طعام عام ہے جس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے جیسے ولیمہ وغیرہ۔

"**فقالوا اولو هاله**" بعض ملائکہ نے بعض کو کہا اس حکایت تمثیلیہ کی وضاحت کرو جو تم نے ان کیلئے بیان کی ہے۔

"**یفقهها**" **بالجزم جواب الامر ای یفهمها**" "یفقهها" میں جواب امر میں واقع ہونے کی وجہ سے اس پر جزم ہے، معنی یہ ہے کہ وہ اس حکایت تمثیلیہ کو سمجھ لیں۔

"**ومحمد فرق بین الناس" روی مشدداعلی صیغة الفعل ومخففا علی المصدر ای فارق بین المؤمن والکافر والصالح والفاسق"**

اور محمد (ﷺ) لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں، "فرق "مشدد بھی پڑھا گیا ہے، ماضی کا صیغہ ہے، اور مخفف بھی پڑھا گیا ہے، مصدر ہے مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ مؤمنوں اور کافروں کے درمیان فرق کرنے والے

ہیں، اور یہ مطلب بھی ہے کہ آپ نیک لوگوں اور برے لوگوں میں فرق کرنے والے ہیں، یعنی آپ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کافر ہیں، یہ مؤمن ہیں، یہ نیک ہیں یہ گنہگار ہیں۔ (از مرقاۃ ج ۱ ص ۲۱۹)

نبی کریم ﷺ کی متابعت و اطاعت جنت کا ذریعہ ہے:

محمود غازی ایک مرتبہ شیخ ربانی ابوالحسن خرقانی قدس سرہ کی زیارت کیلئے ان کے پاس گئے، اور ان کے پاس بیٹھے پھر کہا اے شیخ آپ کی رائے ابو یزید بسطامی کے متعلق کیا ہے، وہ کیسے آدمی تھے، شیخ ربانی نے کہا "**هو رجل من اتبعه اهتدى واتصل بسعادة لاتخفى**" وہ اس ذات کی تابعداری کرنے والے تھے جو ہدایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، اسی تابعداری کی وجہ سے ان کو سعادت (نیک بختی) کا بلند مقام حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی وجہ سے سعادت حاصل کی۔ محمود غازی نے تعجب کرتے ہوئے عرض کیا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا نہیں تو انہوں نے آپ کی تابعداری کر کے سعادت کو حاصل کیا ہو، لیکن ابو جہل نبی کریم ﷺ کو دیکھا بھی ہو اور وہ شقاوت (بدبختی) میں ہی رہا؟ شیخ نے اس کے جواب میں کہا:

"ان ابا جهل مارأى رسول الله انما رأى محمد بن عبد الله حتى لو كان رأى رسول الله ﷺ لخرج من الشقاوة ودخل فى السعادة"

بیشک ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا بلکہ محمد بن عبداللہ کو فقط دیکھا اگر وہ آپ کو اس لحاظ پر دیکھتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو یقیناً اس سے شقاوت دور ہو جاتی اور سعادت حاصل ہو جاتی۔

اس پر انہوں نے قرآن پاک سے ایک دلیل پیش کی کہ ابو جہل کا حال اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے ﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (اور اگر تم انہیں راہ کی طرف بلاؤ تو نہ سنیں، اور تو انہیں دیکھے کہ وہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں، اور انہیں کچھ بھی نہیں سوجھتا)

یعنی مطلب یہ ہے کہ سعادت حاصل کرنے کیلئے صرف سر کی آنکھوں سے دیکھنا کافی نہ تھا۔ ابو جہل نے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ سعادت حاصل نہ کرسکا۔ ہاں سعادت حاصل کرنے کیلئے دل کی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے پھر اسے آپ کی کامل اتباع و اطاعت حاصل ہوگی اور سعادت حاصل ہوگی، کامل سعادت مند وہی ہیں جن کے دل میں محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سما گئی، دنیا کی محبت ان کے دل میں نہ سمائی "**فقد سلكت سبيله الذى يسلكه**" امت کی کامیابی مصطفیٰ کریم ﷺ کی راہ پر چلنے میں ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

اللہ تعالیٰ ہمارے جیسے گنہگاروں کو نبی کریم ﷺ کی تابعداری اور اطاعت نصیب فرمائے جس سے محبت کاملہ حاصل ہو جائے۔

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ ﴾

''پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو۔''

''تَــوَلَّــوْا'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو، اصل میں ''تَتَوَلَّوْا'' ہو، ایک تاء کو حذف کر دیا ہو۔

(لا یحب الکافرین) وضع المظہر موضع الضمیر ولم یقل لا یحبہم لقصد العموم والدلالة علی ان لتولی کفر والکفر ینفی المحبة وان المحبة مخصوصة بالمؤمنین''

یعنی ﴿لا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ﴾ میں اسم ظاہر کو لایا، صرف ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا ''لا یحبہم'' نہیں کہا، تاکہ عموم پر دلالت کرے اور یہ مسئلہ مطلقا ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کے دین سے اعراض کفر ہے کافروں کو نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ سے محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت صرف مؤمنوں کو ہی حاصل ہے۔

اب مطلب واضح ہو گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دین سے کسی نے منہ پھیرا تو وہ کافر ہو جائے گا، کافروں کو رب تعالیٰ اپنے قرب کا حقدار نہیں سمجھتا، اور نہ ہی ان کو پسند کرتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری و روح المعانی)

(فان اللہ لا یحب الکافرین) فدل علی ان مخالفتہ فی الطریقة کفر، واللہ لا یحب من اتصف بذلک وان ادعی وزعم فی نفسہ انہ محب للہ ویتقرب الیہ حتی یتابع الرسول النبی الامی خاتم الرسل ورسول اللہ الی جمیع الثقلین الجن والانس الذی لو کان الانبیا بل المرسلون بل اولوالعزم منہم فی زمانہ ما وسعہم الااتباعہ والدخول فی طاعتہ واتباع شریعتہ''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَاِنَّ اللّٰـہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ﴾ ''اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک اس کے دین کی مخالفت یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی سیدھی راہ کی مخالفت اور اس سے اعراض کرنا کفر ہے، اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا، اگر کوئی دعوی کرے اور اپنے نفس میں گمان کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اسے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہے تو وہ اسی وقت تک اپنے دعوی میں سچا نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے رسول، نبی، امی، خاتم الرسل، خاتم النبیین کی تابعداری نہ کرے، یہ وہ اللہ کے رسول ہیں جو تمام جنوں اور تمام انسانوں کے رسول بن کر آئے، اگر انبیاء کرام، بلکہ مرسلین، بلکہ اولوالعزم رسول بھی آپ کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو بھی آپ کی تابعداری کے بغیر کوئی چارہ کار

نہ ہوتا وہ بھی آپ کی تابعداری میں داخل ہوتے اور آپ کی شریعت کی تابعداری کرتے۔ (ابن کثیر وصابونی)

حضرت جابر ﷜ سے مروی حدیث میں میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بہت واضح ہے

"ولو کان موسی حیا ماوسعه الااتباعی" (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ باب الاعتصام بالسنۃ)
اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کی میری اتباع کے بغیر کوئی وسعت حاصل نہ ہوتی یعنی وہ بھی میرے اقوال وافعال کی تابعداری کرتے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾

(آیۃ نمبر ۳۳)

(۱) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے۔

(۲) بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو تمام جہانوں سے۔

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس کی محبت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک رسول اللہ ﷺ کی تابعداری نہ کی جائے، تو اسی سے سمجھ آ گیا کہ ہر زمانہ میں ہر نبی کی متابعت محبت باری تعالیٰ کیلئے ضروری تھی۔ اسی وجہ سے اس آیۃ کریمہ میں "بین علو درجات الرسل وشرف مناصبهم" اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے بلند درجات اور اعلیٰ منصبوں کا ذکر فرمایا۔ (کبیر)

شانِ نزول: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہود نے کہا ہم ابراہیم علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، ہم ان کے دین پر ہیں، تو ہم برگزیدہ لوگ ہیں، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا "والمعنی ان الله اصطفی هؤلاء بالاسلام والنبوة والرسالة وانتم یا معشر الیهود علی غیر دینهم" مطلب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کرام کو اسلام، نبوت ورسالت کی وجہ سے برگزیدہ بنایا، تم کیسے دعویٰ کرتے ہوائے یہود کہ ہم بھی برگزیدہ ہیں، جب کہ تم ان کے دین پر ہی نہیں ہو۔

(۲) نجران کے عیسائیوں نے جب عیسی علیہ السلام کی شان میں حد سے زیادہ تجاوز کیا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے آپ کو اللہ کا بیٹا کہا اور بعض نے آپ کو "اله" (معبود) کہا، تو ان کے رد میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے عیسی علیہ السلام حضرت مریم کے بیٹے ہیں اور حضرت مریم عمران کی بیٹی ہیں، جو شخص پیدا ہو، مختلف مراحل سے گذرے وہ معبود نہیں بن سکتا، "وهذا وجه مناسبة الآية لما قبلها" شان نزول کی اس وجہ کو ماقبل آیۃ سے مناسبت حاصل ہے۔ (روح المعانی)

ترتیب کا فائدہ:

حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے سے ابتداء کی اس لئے کہ بشر کی ابتداء تخلیق جسمانی آپ سے ہوئی، پھر نوح علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ عام طور پر آپ کو لقب حاصل ہے "آدم اصغر" اور "الاب الثانی" پھر آپ کی اولاد سے ہی آگے نسل انسانی کی بقاء ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ﴾ (اور ہم نے اس کی اولاد باقی رکھی) پھر آل ابراہیم کا ذکر کیا تا کہ وہ لوگ جو ان کی بزرگی کے قائل ہیں، ان پر ایمان بھی لائیں، ان کی نبوت کو تسلیم کریں۔

پھر آل عمران کا ذکر کیا تا کہ لوگ عیسی علیہ السلام کی شان کو اس طرح سمجھیں جس طرح سمجھنے کا حق ہے یہود کی طرح آپ کی نبوت کا انکار آپ کے نسب پر طعنہ زنی کرنا بھی کفر ہے، اور عیسائیوں کی طرح آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدا کا شریک ماننا بھی کفر ہے، آپ کو ماننے کا حق یہ ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے وہ انسان ہیں رب تعالی کی مخلوق ہیں اللہ کے نبی ہیں، نفخ جبریل سے رب تعالی کی قدرت سے دنیا میں تشریف لائے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

انسان افضل ہے:

اللہ تعالی کی مخلوق کی دو قسمیں ہیں، مکلف اور غیر مکلف، اس پر اتفاق ہے کہ مکلف کو غیر مکلف پر افضلیت حاصل ہے مکلفین کی چار قسمیں ہیں، ملائکہ، انسان، جن، شیاطین، ملائکہ کی تخلیق زیادہ مشہور یہی ہے کہ نور سے ہوئی، لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ کی تخلیق ہوا سے ہوئی، علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "والاولی ان یجمع بین القولین فنقول ابدانهم من الريح وارواحهم من النور" بہتر یہ ہے کہ دونوں قول جمع کئے جائیں، اور یوں کہا جائے کہ ملائکہ کے بدن ہوا سے پیدا کئے گئے اور ان کی روحیں نور سے پیدا کی گئیں۔

ملائکہ میں ہوا کے پائے جانے کے مناسب ان کو اڑان حاصل ہے، پرندوں کی طرح پر حاصل ہیں وہ حاملین عرش

ہیں، ان کو روحانیین کہا گیا ہے۔شیاطین کو آگ سے پیدا کیا گیا، وہ کافر ہیں، ابلیس کا کفر رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہے ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ اور کافر ہو گیا اور باقی شیطانوں کا کفر و شرک اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہے ﴿وَاِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ هِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾ اور بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو۔

ان کے حاکم کو ماننا اسی لئے تو شرک ہے کہ وہ خود کافر و مشرک ہیں۔شیطانوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کے دشمن ہیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ﴾

تو اپنے رب کے حکم سے (ابلیس) نکل گیا، بھلا کیا اسے اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں آدمیوں اور جنوں میں سے شیطان۔ جنات کوئی مؤمن ہیں، کوئی کافر ہیں، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾ اور یہ کہ ہم میں کچھ مسلمان ہیں اور کچھ ظالم تو جو اسلام لائے انہوں نے بھلائی سوچی، انسانوں کے پہلے باپ آدم علیہ السلام ہیں، تمام انسان آپ کی ہی ذریت (اولاد) ہیں۔

اس تمہید کے بعد اصل مسئلہ عنوان کے مطابق یہ ہے کہ بشر کو شیاطین اور جنوں پر مطلقاً فضیلت حاصل ہے، اور انبیاء کرام کو تمام فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، مکمل تفصیل پہلے پارہ میں دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہان پر فضیلت ثابت ہوگی نبی کریم ﷺ پر بھی، حالانکہ آپ کو تمام انبیاء کرام پر فضیلت حاصل۔اسی پارہ کی ابتداء میں یہ مسئلہ تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا۔

دوسری خرابی یہ لازم آئے گی کہ عبارت میں عجیب تعارض لازم آئے گا کہ آدم علیہ السلام تمام جہانوں پر افضل ہیں، یعنی نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم اور آل عمران پر بھی کیونکہ وہ بھی تمام جہانوں میں داخل ہیں، نوح علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت حاصل ہے، یعنی آدم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم اور آل عمران پر بھی ان کو فضیلت حاصل ہے کہ وہ بھی سب جہانوں میں داخل ہیں اسی طرح آل ابراہیم کو تمام جہانوں پر افضل مانیں تو آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام اور آل عمران

پر بھی فضیلت لازم آئے گی کیونکہ یہ سب تمام جہانوں میں داخل ہیں۔اور اگر آل عمران کو تمام جہانوں پر افضل مانیں تو ان کو آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام اور آل ابراہیم پر فضیلت لازم آئے گی، کیونکہ یہ تمام جہانوں میں داخل ہیں کس کو کس پر افضل مانا جائے یہ فیصلہ ممکن نظر نہیں آتا۔

پہلا جواب: "المرادبه عالم وزمان کل واحد منهم" مراد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے تمام لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔انبیاء کرام کو جب تمام فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے "فیندرج فیه الملک" تو اس میں فرشتے بھی داخل ہوں گے۔اس جواب سے یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ پر کسی کو فضیلت حاصل نہیں اور تعارض بھی اٹھ گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دوسرا جواب: ترمذی حکیم ابو عبداللہ محمد بن علی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان حضرات کو تمام مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، البتہ اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "العالمین" سے مراد عام مخلوق ہے، جن حضرات کی فضیلت کا ذکر کیا گیا وہ انبیاء کرام ہیں "وذلک ان هؤلاء رسل وانبیاء فهم صفوة الخلق" اور یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ رسولوں اور انبیاء کرام کو مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، ان کو رب تعالیٰ نے عام مخلوق پر چن لیا ہے، برگزیدہ بنایا ہے۔یعنی اس آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام کی ایک دوسرے پر فضیلت کا کوئی ذکر نہیں لھذا یہ اعتراض ہی درست نہیں کہ اس آیۃ کریمہ میں مذکور حضرات کی فضیلت نبی کریم ﷺ پر آئے گی، یہ قول درست نہیں، آیئے علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا محبت بھرا قول دیکھئے۔

"فامامحمد فقد جازت مرتبته الاصطفاء لانه حبیب ورحمة"

لیکن محمد ﷺ کا مرتبہ سب سے بلند و بالا ہے کیونکہ آپ حبیب و رحمت ہیں، یقیناً آپ برگزیدہ ہونے میں اور رب تعالیٰ کے چن لینے میں بھی سب انبیاء کرام سے آپ بلند و بالا ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سب جہانوں کیلئے رحمت) اسی سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہوا "فالرسل خلقوا للرحمة ومحمد خلق بنفسه رحمة" تمام رسول رحمت کیلئے پیدا کیے گئے لیکن نبی کریم حضرت محمد ﷺ کو ذاتی طور پر رحمت پیدا کیا گیا۔

"فلذلک صار امانا للخلق لما بعثه الله امن الخلق العذاب الی نفخة الصور وسائر الانبیاء لم یحلوا هذا المحل"

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کیلئے امان بن کر تشریف لائے پہلی قوموں پر جو عذاب ہوئے تھے کسی کو بندر بنا

دیا، کسی کو خنزیر وغیرہ بنادیا، وہ مسخ والے عذاب آپ کے امن کی وجہ سے تا قیامت اٹھالئے گئے لیکن یہ مقام صرف آپ کو حاصل ہوا باقی انبیاء کرام کو حاصل نہیں ہوا۔

❁ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان رحمة مهداة" میں رحمت اور ہدیہ بن کر آیا ہوں "يخبر انه رحمة للخلق من الله وقوله "مهداة" ای هدية من الله للخلق" نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کی خبر دی کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کیلئے رحمت بن کر آیا ہوں، اور آپ کے ارشاد گرامی میں (مهداة) کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کیلئے ہدیہ اور تحفہ ہوں۔ (قرطبی)

یعنی جسے ہدیہ اور تحفہ دیا جائے اس پر مہربانی کی جاتی ہے اور اس سے اظہار محبت کیا جاتا ہے، یہ اسی وقت ہوتا ہے جب تحفہ کی قدر کی جائے، اب مطلب واضح ہوا کہ رب تعالیٰ نے بندوں پر احسان فرمایا کہ مجھے ان کیلئے بطور ہدیہ و تحفہ کے بھیجا ہے، ہاں رب تعالیٰ کی مہربانی کو اسی وقت حقیقت میں پاسکیں گے جب وہ میری تابعداری کریں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى﴾ میں لفظ "اصطفی" کا اصل مادہ "صفو" ہے، صاد پر تینوں حرکتیں (زبر، زیر، پیش) پڑھی گئی ہیں، جس کا معنی ہے پسند کر لینا، چن لینا، برگزیدہ بنانا،

فمعنى "اصطفاهم" ای جعلهم صفوة خلقه تمثيلا بما يشاهد من الشئی الذی يصفی وينقى من الكدورة"

ان لوگوں کے "اصطفاء" کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ان کو صاف و خالص بنایا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض چیزیں کدورت، مٹیالا پن سے صاف و شفاف ہوتی ہیں۔ (کبیر)

آدم علیہ السلام کی چن لینے کی وجوہ:

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزوں کی وجہ سے پسند فرمایا، ان کو عام مخلوق پر فضیلت دی، ان کو چن لیا۔

(۱) "اولها انه خلقه بيده فی احسن صورة بقدرته" ان چیزوں میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اپنے دست سے تخلیق فرمائی، اور اپنی قدرت سے آپ کو اچھی صورت عطاء فرمائی، وہی اچھی صورت آپ کی اولاد میں بھی آرہی ہے۔

(۲) "والثانی انه علمه الاسماء كلها" اور دوسری چیز جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطاء فرمایا۔

(۳) "والثالث امر الملائكة بان يسجدوا له" ان وجوہ میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔

(۴) "والرابع اسكنه الجنة" اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کو جنت میں ٹھہرایا۔

(۵) "والخامس جعله ابا البشر" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں کا باپ بنایا، آپ کا لقب ہی ابوالبشر بن گیا۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک سب سے بڑی وجہ آپ کو نبوت عطاء کرنا ہے، منصب نبوت کی وجہ سے ہی آپ کو دوسری مخلوق (غیر نبی) پر فضیلت حاصل ہے۔

پانچ وجہ سے نوح علیہ السلام کو چن لیا:

(۱) "اولها انه جعله ابا البشر لان الناس كلهم غرقوا وصار ذريته هم الباقين" پہلی وجہ یہ ہے کہ جب سب لوگ غرق ہو گئے تو آپ کی اولاد کو ہی باقی رکھا گیا، اسی سے پھر لوگ پیدا ہوئے اس لحاظ پر آپ کو آدم علیہ السلام کے بعد ابوالبشر کا خطاب ملا۔

(۲) "والثاني انه اطال عمره ويقال طوبى لمن طال عمره وحسن عمله"
دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک آپ کو لمبی عمر عطاء کی گئی، جب عمل اچھے ہوں تو لمبی عمر قابل تعریف ہے۔

(۳) "والثالث انه استجاب دعاءه على الكافرين والمؤمنين"
تیسری وجہ آپ کو چن لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو کافروں کے خلاف اور مومنوں کے حق میں قبول فرمایا۔

(۴) "والرابع انه حمله على السفينة" اور چوتھی وجہ آپ کو چن لینے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کشتی پر سوار کر کے طوفان سے بچا لیا۔

(۵) "والخامس انه كان اول من نسخ الشرائع وكان قبل ذلك لم يحرم تزويج الخالات والعمات"
پانچویں وجہ ترجیح یہ ہے کہ بیشک آپ نے ہی سب سے پہلے پچھلی شریعت کو منسوخ کیا، کیونکہ آپ کی شریعت میں خالہ، پھوپھی وغیرہ سے نکاح حرام ہوا جبکہ پہلے حرام نہیں تھا۔ (قرطبی)

راقم کے نزدیک یہاں بھی سب سے بڑی وجہ ترجیح آپ کا نبی ہونا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو چن لینے کی پانچ وجوہ:

(۱) "اولها انه جعله اباالانبياء"
ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ابوالانبیاء بنایا گیا، کیونکہ آپ کے آنے والے تمام نبی آپ کی اولاد سے ہیں، باقی تمام اسحق علیہ السلام کی اولاد سے، اور نبی کریم ﷺ اسمعیل علیہ السلام سے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ آیۃ کریمہ میں اولاد ابراہیم سے مراد ہی انبیاء کرام ہیں، غیر نبی مراد نہیں۔

(۲) "والثانی انه اتخذه خليلا" اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا۔

(۳) "والثالث انه انجاه من النار" اور تیسری وجہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات دی جبکہ نمرود نے آپ کو زندہ جلا دینے کی (معاذ اللہ) سرتوڑ کوشش کی۔

(۴) "والرابع انه جعله اما ماللناس" اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کا امام بنایا، امامت سے مراد نبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔

(۵) "والخامس انه ابتلاه بالكلمات فوفقه حتى اتمهن" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چند کلمات سے آزمایا، پھر ان کو پورا کرنے کی آپ کو توفیق عطاء فرمائی، یہاں تک کہ آپ نے ان کو پورا کیا۔ (ماخوذ از قرطبی)

آل عمران کو چن لینے کی وجہ:

"فانه اصطفى له مريم بولادة عيسى بغير اب ولم يكن ذلک لاحدفى العالم (والله اعلم)

عمران کیلئے اللہ تعالیٰ نے مریم کو چنا، اور مریم کو چننے کی اصل وجہ آپ کے شکم سے بغیر باپ کے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہے، جو جہان میں کسی ایک کو بھی حاصل نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

آل عمران سے مراد بھی در حقیقت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے چن لیا، کیونکہ عمران کی اولاد میں سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے اور کوئی نبی نہیں۔

عجیب اتفاق:

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد کا نام بھی عمران ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی مریم ہے، مریم بنت عمران موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی ہے۔ یہ اور مریم ہے اور عمران بھی اور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بھی مریم بنت عمران ہے، لیکن یہ عمران اور مریم اور ہیں۔ "قالوا وبين العمرانين الف

وثمان مائة سنة" اہل علم نے بیان کیا ہے کہ دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے۔

یہاں آیۃ کریمہ میں زیادہ راجح اور قوی صورت یہی ہے کہ عمران سے حضرت عیسی علیہ السلام کے نانا ہیں کیونکہ بعد والی آیات میں ان کا اور ان کی زوجہ کا اور ان کی بیٹی حضرت مریم کا اور ان کے نواسے حضرت عیسی علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔

تاہم علامہ قرطبی نے ایک احتمال یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہوسکتا ہے زیر بحث آیۃ کریمہ میں جو آل عمران کا ذکر کیا گیا ہے اس عمران سے مراد موسی علیہ السلام کے والد ہوں، اور آل عمران۔ سے مراد حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہ السلام ہوں کہ ان کو چن لیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو مرجوح قرار دیا کہ یہ سیاق وسباق سے ہٹ کر قول ہے۔

انبیاء کرام کی فضیلت کا خوبصورت تذکرہ:

حلیمی رحمہ اللہ نے کتاب المنہاج میں ذکر کیا کہ انبیاء کرام دوسرے لوگوں پر جسمانی قوتوں اور روحانی قوتوں میں برتری اور فوقیت حاصل ہے، جسمانی قوتوں کی پھر دو قسمیں ہیں، قوت مدرکہ اور قوت محرکہ۔

قوت مدرکہ کے لحاظ پر فضیلت:

قوت مدرکہ یا حواس ظاہرہ سے ہوتی ہے یا حواس باطنہ سے، حواس ظاہرہ پانچ ہیں، ان میں سے قوت باصرہ ہے۔

قوت باصرہ: کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ وہ کمال حاصل تھا جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

❁ "قال ﷺ "زویت لی الارض فاریت مشارقھا ومغاربھا"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا گیا، تو مجھے زمین کے مشارق ومغارب دکھا دیئے گئے۔

❁ قال ﷺ اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظھری" (رواہ البخاری عن انس)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا صفوں کو درست رکھو، اور مل کر کھڑے ہو، بیشک میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے دیکھ رہا ہوتا ہوں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رب تعالی نے فرمایا ﴿وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ﴾ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بادشاہیاں۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کرام نے لکھا ہے:

"انہ تعالی قوی بصرہ حتی شاھد جمیع الملکوت من الاعلی والاسفل"

بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی بصر کو یہ قوت عطاء فرمائی کہ آپ نے مقام اعلیٰ (بلند مقام یعنی آسمان) کی تمام بادشاہیوں کو دیکھا، اور مقام اسفل (نیچے والا مقام یعنی زمین) کی تمام بادشاہیوں کو دیکھا۔

قوت سامعہ: کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ کو وہ برتری حاصل تھی جو دوسروں کو حاصل نہ تھی۔

❁ ''قال ﷺ اطت السماء وحق لها ان تئط مافیها موضع قدم الاوفیه ملک ساجدلله''
نبی کریم ﷺ نے فرمایا آسمان میں چرچراہٹ پیدا ہوئی، حق بھی یہی تھا کہ اس میں چرچراہٹ پیدا ہوتی، کیونکہ آسمانوں میں کوئی ایک قدم کی جگہ بھی نہیں مگر یہ اس میں فرشتہ اللہ کو سجدہ کرنے والا ہوتا ہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ آسمان کی چرچراہٹ نبی کریم ﷺ نے سنی کسی اور نے نہ سنی تو آپ کو قوت سامعہ میں وہ قوت حاصل تھی جو دوسروں کو حاصل نہیں تھی۔

❁ ''انه ﷺ سمع دویا وذکر انه هوی صخرة قذفت فی جهنم فلم تبلغ قعرها الی الآن''
نبی کریم ﷺ نے آواز سنی اور ذکر فرمایا بیشک یہ پتھر کے گرنے کی آواز ہے جو جہنم کی طرف پھینکا گیا ہے، جو جہنم کی گہرائی میں ابھی تک نہیں پہنچا۔

واضح ہوا کہ صحابہ کرام بھی وہیں موجود تھے وہ آواز کو نہ سن سکے اور فقط نبی کریم ﷺ نے وہ آواز سنی اور آواز پتھر کے گرنے کی سنی، وہ آواز یقیناً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پتھر اپنی جگہ پر پہنچتا ہے لیکن آپ نے پتھر کے جہنم کی گہرائی میں پہنچنے سے پہلے ہی آواز کو سن لیا جس سے پتہ چل گیا کہ آپ کی قوت سامعہ کو باقی لوگوں کی قوت سامعہ سے برتری حاصل تھی اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا چیونٹی کی آواز کو سننا بھی دلالت کرتا ہے کہ انبیاء کرام کی قوت سامعہ کو باقی لوگوں سے برتری اور کمال حاصل ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ چیونٹی (جو دوسروں کی سردار تھی) نے کہا اے چیونٹیو اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ اس آواز کی حضرت سلیمان علیہ السلام نے سنا اور سمجھا۔

پتہ چلا کہ انبیاء کرام جانوروں کی باتوں کو سمجھتے بھی تھے۔ نبی کریم علیہ السلام سے بھیڑیئے اور اونٹ نے کلام کیا، آپ نے ان کی باتوں کو سمجھا۔

قوت شامہ: سونگھنے والی قوت بھی انبیاء کرام کی دوسروں کی قوت شامہ سے بلند ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے بھائیوں کے قافلہ کو کہا ''ارشاد باری تعالیٰ'' ﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَّاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ میرا یہ کرتا لے جاؤ اسے میرے باپ کے منہ

پر ڈالو، ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اپنے سب گھر بھر کو میرے پاس لے آؤ۔ ﴿وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ﴾ اور جب قافلہ مصر سے جدا ہوا یہاں ان کے باپ نے کہا بیشک میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں یوسف علیہ السلام کی قمیص کے مصر سے چلنے پر یوسف علیہ السلام کی خوشبو پالی۔ تو واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی سونگھنے والی قوت دوسروں لوگوں کی قوت سے بلند و بالا ہے۔

قوت ذائقہ: انبیاء کرام کے چکھنے سے جن چیزوں کا علم دے دیا جاتا ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب خیبر میں بکری کا زہر آلودہ گوشت پیش کیا گیا تو آپ نے چکھ کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور ارشاد فرمایا "ان ھذا الزراع یخبرنی انہ مسموم" کہ بیشک (بکری کے) اس ذراع نے مجھے خبر دی ہے کہ اسے زہر آلود کیا گیا ہے۔

قوت لامسہ: انبیاء کرام کی چھو کر محسوس کرنے کی قوت بھی بنسبت دوسرے لوگوں کے بلند و بالا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت لامسہ کی وجہ سے ہی آگ آپ پر گلزار ہو گئی، یعنی آپ کے جسم نے جب آگ کو چھوا تو آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ کی قوت لامسہ کی وجہ سے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آشوب چشم سے شفاء حاصل ہو گئی اور ایک صحابی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ آپ کے ہاتھ پھیرنے سے درست ہو گئی۔ یہ آپ کی قوت لامسہ کا ہی کمال تھا۔

حواس باطنہ: میں سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی قوت حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ﴾ ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ نہیں بھولیں گے۔ آپ کی قوت ذکاء کا اندازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کریں، آپ فرماتے ہیں۔ "علمنی رسول اللہ الف باب من العلم واستنبطت من کل باب الف باب" رسول اللہ ﷺ نے مجھے علم کے ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر باب سے ہزار باب خود استنباط (حاصل) کیے۔ "فاذا کان حال الولی ھکذا فکیف حال النبی ﷺ" جب ولی کا حال اس طرح کا ہے تو نبی کے حال کی بلندی کا مقام کیا ہوگا۔

انبیاء کرام کی قوت محرکہ کی فوقیت:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو وہ قوت محرکہ عطاء فرمائی جو عام لوگوں کو حاصل نہیں، نبی کریم ﷺ کو معراج کرایا، عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھایا، یہ آپ کی قوت محرکہ کا ہی کمال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولیوں کو محرکہ میں وہ کمال عطاء کیا جو دوسرے عام لوگوں کو عطاء نہیں کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ولی آصف برخیا کے بلقیس کے تخت لانے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ﴾

کہااس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں تمہارے پاس وہ لے آؤں تمہاری آنکھ جھپکنے سے پہلے۔

جب ولی کا یہ مقام ہے تو انبیاء کرام کا کتنا ہی بلند و بالا مقام ہوگا۔

قوت روحانیہ عقلیہ:

انبیاء کرم کی بہت کامل درجہ کی ہے اور نہایت صاف ہے، کیونکہ نفس قدسیہ نبویہ کی ماہیت دوسرے نفسوں سے بلند ہے۔ اسی قوت روحانیہ عقلیہ کی وجہ سے انبیاء کرام کامل ذکاء، کامل سمجھ داری، شرافت، بلندی کا اعلیٰ معیار حاصل ہوتا ہے۔ جسمانیات اور خواہشات سے انہیں دوری حاصل ہوتی ہے۔ جب روح کو کامل صفائی اور شرافت حاصل ہوتی ہے تو بدن کو بھی کامل طہارت حاصل ہوگی۔

اس تمہید کے بعد حاصل ہوا:

کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عالم بالا کی مخلوق یعنی فرشتوں پر فضیلت دی اور عالم پست یعنی ارضی مخلوق پر بھی فضیلت دی کیونکہ انبیاء کرام کو فرشتوں جنوں اور انسانوں سب پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر وہی قوت قدسیہ یعنی نبوت آپ کی بعض اولاد میں رکھی، رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی اس پر دلالت کررہا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کہاں رسالت کو رکھنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کو منصب رسالت کا اہل سمجھا ان کو ہی نبوت ورسالت عطاء فرمائی، پھر وہ نور نبوت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا، پھر آپ کے بعد تمام نبی آپ کی اولاد سے ہوئے آپ کی اولاد میں سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو روح قدسیہ یعنی نبوت عطاء فرمائی پھر آپ کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کو پھر یہ سلسلہ نبوت ان کی اولاد میں چلتا رہا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے دوسرے بیٹے عیصو کی اولاد میں سلسلہ بادشاہت چلتا رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی روح قدسیہ یعنی نبوت عطاء کی گئی، لیکن آپ کی اولاد میں سلسلہ نبوت عام نہ ہوا بلکہ خصوصی طور پر ("فجعل اسمعیل مبدأ لظهور الروح القدسية لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم") حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی روح قدسیہ یعنی نبوت کے ظاہر ہونے کا ذریعہ بنایا یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں اگرچہ ایک نبی آئے لیکن وہی افضل الانبیاء وہی سید الانبیاء، وہی امام الانبیاء، وہی خاتم الانبیاء کے منصب پر فائز ہوئے، وہ ہیں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔

"فلما ظهر محمد ﷺ نقل نور النبوة ونور الملك الى محمد ﷺ وبقيا اعنى الدين

والملک لاتباعه الی یوم القیامة"

جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں ظاہر ہوئے تو وہ نور نبوت آپ کی طرف منتقل ہوئے سلسلہ نبوت آپ پر ختم کر دیا گیا، حاکمیت بھی آپ کو ہی نصیب ہوئی، بغیر کسی کی شرکت کے آپ ہی مسلمانوں کے واحد حکمران تھے، آپ جو رب تعالیٰ کے احکام جاری فرماتے ان میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش حاصل نہ تھی۔

دین اور بادشاہت آپ کے متبعین کو تا قیامت حاصل رہیں گے، دین کی حفاظت رب تعالیٰ نے فرمائی ہے، "ومن تأمل فی هذالباب وصل الی اسرار عجیبة" جس نے بھی اس بحث میں تأمل کیا اسی نے عجیب اسرار پائے، حقیقت میں قرآن پاک خزینہ علوم منبع اسرار رموز ہے، جتنا کسی کو رب تعالیٰ نے علم اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے حصہ ملا اتنا ہی قرآن پاک سے اسے حصہ ملا۔ (ماخوذ از تفسیر بالوضاحت)

تنبیہ: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی﴾ میں اگر (اصطفاء) کا مطلب یہ لیا جائے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت کیلئے پسند کیا تو آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد بھی انبیاء کرام ہوں گے، لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے "ولیس المراد الاصطفاء بالنبوة" اصطفاء سے مراد نبوت کیلئے چننا نہیں، اگر یہ معنی لیا جائے تو "آل ابراہیم" اور "آل عمران" سے مراد نبیوں کی تخصیص ضروری نہیں، بلکہ آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ بیشک آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے متقی حضرات اور عمران کی اولاد سے متقی حضرات کو ان کے اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی، اور ان کو چن لیا گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی محبت کیلئے پسند فرما لیا۔

خیال رہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے ان کے زمانہ میں تمام لوگوں پر فضیلت دی کیونکہ نبی غیر نبی پر افضل ہوتا ہے لیکن اولاد ابراہیم اور اولاد عمران میں مسئلہ کو مقید کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم اور اولاد عمران میں سے ان کے اپنے اپنے زمانہ میں اتقیاء و اصفیاء (نیک لوگوں) کو غیر اتقیاء و غیر اصفیاء پر فضیلت دی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ خوب نظر آیا:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے آیۃ کریمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے "بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہاں سے" یہ بامحاورہ ترجمہ ہے اس میں اعتراض وجواب اور لمبی بحثوں کی ضرورت نہیں، یعنی جہان میں سے آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران کو چن لیا ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ

پر ان حضرات کی برتری کا ثابت ہونا پھر یہ جواب دینا کہ اس سے مراد ان کے زمانہ کے لوگ ہیں، اس سوال وجواب کی ضرورت نہیں رہتی۔

بامحاورہ ترجمہ راقم نے اسی لئے کیا ہے کہ لغوی ترجمہ اگر چہ اعتراض وجواب کا محتاج ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (آیۃ نمبر ۳۴)

(1) یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

(2) اولاد کو بعض ان کے بعض سے ہیں اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

﴿ذُرِّيَّةً﴾ یا مشتق ہے "ذرا" سے، جس کا معنی ہے پیدا کرنا یا مشتق ہے "ذر" سے کیونکہ آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی تمام اولاد کو یوم میثاق سے چھوٹے چھوٹے ذرات کی طرح نکالا گیا، اسلئے آپ کی اولاد کو "ذریت" کہا جاتا ہے۔

"ویسمی الاولاد والآباء ذریة فالاولادذریة لانه ذراهم والآباء ذریة لانه ذرأ الابناء منهم"

اولاد اور آباء دونوں پر ذریت کا اطلاق کیا گیا ہے، اولاد اس لئے ذریت ہیں، کہ آباء سے ان کو پھیلایا گیا ہے، یعنی اولاد بمعنی مفعول کے ذریت ہے۔ اور آباء کو ذریت کہا گیا ہے کہ ان سے ان کی اولاد پھیلی ہے، یہ اولاد کے پھیلنے کے ذریعہ ہونے کی وجہ سے ذریت ہیں، یعنی آباء فاعلیت کے معنی کے لحاظ پر ذریت ہیں۔

رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ﴾ اور ان کیلئے ایک نشانی یہ ہے کہ انہیں ان کے بزرگوں کی پیٹھ میں ہم نے بھری کشتی میں سوار کیا۔ (از معالم التنزیل للبغوی)

جلالین میں اس مذکورہ آیۃ کریمہ میں ﴿اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ کا معنی بیان کیا گیا ہے "ای آباء هم الاصول" یعنی ان کے آباء جو ان کے اصول ہیں ان کو کشتی میں سوار کیا۔

جلالین کے اس ترجمہ پر تفسیر جمل نے لکھا ہے "اطلاق الذرية على الاصول صحيح فان لفظ الذرية مشترك بين الضدين" "ذریة" کا اطلاق اصول پر صحیح ہے، کیونکہ لفظ ذریت ضدین کے درمیان مشترک ہے۔

(ذریة) "نصب علی معنی، واصطفی ذریة (بعضها من بعض) ای بعضها من ولد بعض"

"ذریة" پر نصب ہے کہ یہ "اصطفی" کا مفعول ہے، اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا، کہ بیشک اللہ تعالی نے چن لیا ہے ان کی اولاد کو جو بعض کی اولاد ہیں۔

"بعضها من بعض" میں دو احتمال اور ہیں "وقیل بعضها من بعض فی التناصر" بعض بعض سے ہیں یعنی ایک دوسرے کی امداد فرماتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے "بعضها علی دین بعض" بعض بعض سے ہیں، یعنی اولاد اپنے آباء واجداد کے دین پر ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

"(ذریة بعضها من بعض) حال اوبدل من الآلین اومنهما ومن نوح ای انهم ذریة واحدة متشعبة بعضها من بعض"

"ذریة" پر نصب کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ حال ہو، یا بدل ہو "آل ابراہیم" اور آل عمران سے، یا دونوں آل اور نوح سے حال یا بدل ہو۔

اب معنی یہ ہوگا کہ بیشک اللہ نے چن لیا ہے آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو جہان والوں سے ایسے حال میں کہ نوح اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران بعض بعض کی اولاد ہیں یعنی ایک ہی نسل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد تمام نبی بمع آل عمران کے آپ کی اولاد ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

تنبیہ: راقم نے ترجمہ تفسیر معالم التنزیل سے لیا ہے، اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ احکام القرآن للجصاص سے لیا ہے۔

"(ذریة بعضها من بعض) فی التناسل لان جمیعهم ذریة آدم ثم ذریة نوح ثم ذریة ابراهیم علیهم السلام" (جصاص)

یہ ایک نسل ہے کیونکہ تمام آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، پھر نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

فائدہ: "وقال الامام الزاهد ولد بعضها من بعض وهذاشهادة من الله تعالی علی طهارة نسب الانبیاء"

امام زاہد رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ رب تعالی کے ارشاد "بعضها من بعض" سے یہ ثابت کیا گیا کہ انبیاء کرام ایک دوسرے کی اولاد ہیں، یہ اللہ تعالی کی طرف انبیاء کرام کے نسب کے پاکیزہ ہونے پر شہادت مرتب ہوگئی۔

سبحان اللہ! رب تعالی کی گواہی کے بعد بھی انبیاء کرام کے والدین کو کوئی کافر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو وہ بدبخت ہے، اللہ تعالی ہی اسے ہدایت دے تو وہ راہ راست پر آ سکتا ہے ورنہ بھٹکتے بھٹکتے جہنم کے گڑھے میں گر جائے گا۔

"وفیه دلیل علی ان انکحة الکفار صحیحة علی ای وجه یعتقدون فیما بینهم"

اسی زیر بحث آیۃ کریمہ سے ایک اور مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کفار جو بھی عقیدہ رکھتے ہیں، وہ اپنے عقیدہ کے مطابق جس طرح بھی نکاح پڑھائیں گے ان کا نکاح صحیح ہوگا، اگر دونوں میاں بیوی ایمان لے آئیں تو ان کو نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پہلا نکاح ہی کافی ہوگا۔ (از تفسیرات احمدیہ)

اصطفاء و محبت و خلۃ میں فرق:

اصطفاء عام ہے محبت وخلۃ سے، یہ تمام انبیاء کرام کو شامل ہے "لانھم خیرۃ اللہ و صفوتہ" اسلئے کہ تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے برگزیدہ ہیں اور تمام ہی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں، اس کی طرف سے منصب نبوت پر منتخب کیے ہوئے ہیں۔ البتہ بعض انبیاء کرام کو بعض پر مراتب و درجات کے لحاظ پر فضیلت حاصل ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر۔

محبت تمام سے اخص ہے "فاخص المراتب ھو المحبۃ المشار الیھا بقولہ ورفع بعضھم درجات" تمام مراتب سے اخص درجہ محبت کا ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے اشارہ مل رہا ہے اور بعض کے درجات کو بلند کیا۔ "فلذلک کان افضلھم حبیب اللہ محمدا ﷺ" اسی وجہ سے اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔

"ثم الخلۃ التی ھی صفۃ ابراھیم علیہ السلام" محبت کے بعد خلۃ کا مقام ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے، یعنی آپ خلیل اللہ ہی۔ "واعمھا الصفاء الذی ھو صفۃ آدم صفی اللہ" صفاء پہلی دونوں صفتوں کے بعد درجہ میں ہے، اسی لئے آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔ (روح البیان)

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ انبیاء کرام کا بعض کا بعض سے ہونا' اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ وہ دین میں بعض موافق ہیں بعض کے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ بعض اولاد ہیں بعض کی۔ تقریبا اصل معنی میں یہی ہے کہ بعض اولاد ہیں بعض کی، اسی معنی کے ضمن میں پہلے دونوں معانی موجود ہیں آپ اسے دیکھیں۔

ولادت کی دو قسمیں ہیں، صوری اور معنوی، ولادت معنوی کے لحاظ پر ہر نبی دوسرے نبی کے موافق اور متابع ہے توحید اور معرفت میں، اور باطنی عقائد یعنی اصول دین وہ ایک دوسرے کے مطابق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی ذریت معنوی ہوئے، یہ ہے دین میں بعض بعض سے ہیں۔

یہی مطلب ہوگا بعض مشائخ کا بعض کے ساتھ علم تصوف میں موافق ہونے اور معمولات میں ایک

دوسرے کے موافق ہونے کا، اسی وجہ سے مشائخ کو بھی ایک دوسرے کی ذریت معنوی کہا جاتا ہے۔

آباء کی تین قسمیں:

"الآباء ثلاثة اب ولدک واب رباک واب علمک" آباء تین ہیں۔

(۱) وہ جو تمہاری پیدائش کا ذریعہ ہے، یعنی حقیقی باپ۔

(۲) وہ باپ جس نے تمہاری تربیت کی ہے۔

(۳) وہ باپ جس نے تمہیں علم سکھایا۔

خیال رہے کہ بعض حضرات نے تربیت کرنے والے کو علیحدہ ذکر نہیں کیا، حقیقی آباء یا اساتذہ جو مجازی آباء ہیں ان کے ضمن میں لایا ہے۔ البتہ تیسرا باپ انہوں نے سسر بیان کیا ہے۔

حقیقت ومجاز میں مناسبت:

جس طرح ولادت صوریہ میں وجود بدن باپ کے نطفہ سے ماں کی رحم (بچہ دانی) میں پیدا ہوتا ہے، اسی طرح وجود قلب ولادت حقیقیہ میں شیخ اور معلم کی پھونک یعنی ان کی تربیت سے استعداد نفس کی رحم میں پیدا ہوتا ہے۔ اس ولادت معنویہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول دلالت کررہا ہے، آپ فرماتے ہیں "لن یلج ملکوت السماوات من لم یولد مرتین" آسمانوں کی بادشاہیوں میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا جب تک وہ دومرتبہ پیدا نہ ہوا۔

آپ کے اس قول کا مطلب یہی ہے کہ اسے ذریت صوری کے بعد ذریت معنوی ہونے کا بھی شرف حاصل ہوتو اس کی رسائی ملکوت سماوی تک ہوگی، جو ذریت معنوی سے محروم رہا وہ ملکوت سماوات کی رسائی سے بھی محروم رہا۔

ایک عظیم فائدہ اور عظیم تنبیہ:

ذریت معنوی اکثر طور پر ذریت صوریہ کے نسل میں تابع ہوتی ہے، "ولذلک کان الانبیاء فی الظاهر ایضا نسلا واحدا لثمرة شجرة واحدة" اسی وجہ سے انبیاء کرام ظاہرا ایک نسل ہیں، گویا کہ ایک درخت کے پھل ہیں۔

"وسببه ان الروح فی الصفاء والکدورة یناسب المزاج فی القرب من الاعتدال الحقیقی وعدمه وقت التکون"

وجہ اس کی یہ ہے کہ بیشک روح صفاء وکدرت (صاف ہونے، میلا ہونے) میں مزاج کے مناسب ہوتا ہے، تکوین کے (معرض وجود میں لاتے) وقت ہی جس میں اعتدال حقیقی پایا گیا اسے تقرب حاصل ہو گیا اور جسے اعتدال حقیقی حاصل نہ ہوا اس میں تقرب بھی نہیں پایا گیا۔

ہر روح کا مزاج اس کے مناسب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خاص ہوتا ہے کیونکہ فیض مناسبت کی وجہ سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ ارواح ازل وابد میں اللہ کے تقرب اور دوری کے لحاظ پر مختلف مزاج رکھیں گے، کیونکہ جن کو صفائی حاصل ہوگی، انہیں قربت بھی حاصل ہوگی، جنہیں کدورت حاصل ہوگئی انہیں دوری حاصل ہوگی۔ (ماخوذ از روح البیان)

تنبیہ: "فمن كان غذاء ه حلالا طيبا وهيآت نفسه فاضلة نورانية ونياته صادقة حقانية جاء ولده مؤمنا صديقا اووليا اونبيا، ومن كان غذاء ه حراما وهيآت نفسه خبيثة ظلمانية ونياته فاسدة ردينة جاء ولده فاسقا او كافرا اوزنديقا"

اصل میں غذائیں بدن میں مؤثر ہوتی ہیں جس شخص کی غذاء حلال، پاکیزہ ہو اور اس کے نفس کی ہیئتوں میں فضیلت ونورانیت پائی جائے، نیات صادق وحق پائی جائیں تو اس کی اولاد مؤمن وصدیق ہوگی، یا ولی ہوگی یا عظیم منصب کی ذاتوں میں سے کوئی ذات ہوگی جو منصب نبوت پر فائز ہوگی اور جس شخص کی غذا حرام ہوگی، اور اس کی ھیآت نفس خبیث وظلمانی ہوں گی اور اس کی نیات فاسد وردی ہوں گی تو اس کی اولاد بھی فاسق یا کافر یا زندیق ہوگی "العیاذ باللہ"

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح کی غذا ہوگی، اسی طرح کا گوشت اور خون اور نطفہ ہوگا، جیسا نطفہ ہوگا اسی طرح کی اولاد ہوگی۔ (از روح البیان)

روح البیان کے یہ الفاظ دیکھ کر ("والا غذية مؤثرة في البدن") غذائیں بدن میں مؤثر ہوتی ہیں جیسی غذا ہوگی، ایسا ہی بدن ہوگا") میں خیال کرتا ہوں کہ آج تک میں نے کتنا اچھا جواب دیا ہے، جب مجھ سے کسی نے پوچھا میرا دوست یہودی ہے یا عیسائی ہے یا قادیانی ہے یا شیعہ ہے میرا اس کے ساتھ کھانا پینا کیسا ہے؟ تو میں نے ہمیشہ یہ جواب دیا اسے نہیں دیکھا جائے کہ جائز ہے یا ناجائز ہے، بلکہ اسے دیکھا جائے کہ اس کے برے اثرات کتنے مرتب ہوں گے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ "اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے اور ان کے دلوں کی باتوں اور ان کے افعال کو جاننے والا ہے، "وانما يصطفى من خلقه من يعلم استقامته قولا وفعلا" بیشک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ان کو ہی چن لیتا

ہے، جنہیں وہ جانتا ہے کہ انہوں نے قول و فعل میں ثابت رہنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ﴾ اور اسی طرح رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے ﴿اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا وَکَانُوْا لَنَا خَاشِعِیْنَ﴾ بیشک وہ خیرات میں جلدی کرتے ہیں اور ہم سے دعاء کرتے ہیں خوشی اور ڈر میں، وہ ہمارے لئے ہی عجز اختیار کرنے والے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیۃ کریمہ کی ابتداء میں انبیاء کرام اور نیک لوگوں کا تذکرہ ہے اور انتہاء میں بھی ان کا ہی تذکرہ ہے۔ اور ایک دوسری تفسیر کے مطابق ''اللہ سننے جاننے والا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ یہود کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام اور اولاد موسیٰ سے ہیں لہذا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ نصرانی کہتے تھے عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو رب تعالیٰ نے فرمایا اللہ ان کے اقوال باطلہ کو سننے والا ہے اور ان کی اغراض فاسدہ کو جاننے والا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق ابتداء میں انبیاء کرام کا تذکرہ ہے اور انتہاء میں ان کی تکذیب کرنے والوں کو وعید ہے۔ ''واللہ اعلم بالصواب''

(ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَۃُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۵)

(1) جب عمران کی بی بی نے عرض کی اے رب میرے میں تیرے لئے منت مانتی ہوں جو میرے پیٹ میں ہے کہ خالص تیری ہی خدمت میں رہے، تو تو مجھ سے قبول کر لے، بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا۔

(2) یاد کرو جب کہا عمران کی زوجہ نے اے میرے رب بیشک میں نے نذر مانی ہے تیرے لئے، جو میرے پیٹ میں ہے وہ آزاد ہوگا، تو تو قبول کر مجھ سے بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔

مختصر مطلب:

عمران ابن ماثان بنی اسرائیل کے سردار تھے، یہ سارا قبیلہ بنو ماثان بنی اسرائیل کا سردار تھا، اسی قبیلہ کے لوگ اہل علم تھے، اور بادشاہت بھی اسی قبیلہ میں تھی، اور اس قبیلہ کے لوگ نیکی اور تقویٰ میں بھی دوسروں سے آگے تھے، اور

یہی لوگ بیت المقدس کے خدمتگذار بھی تھے، عمران کی زوجہ حنہ بنت فاقوذا بانجھ تھیں، ان کی کوئی اولاد نہ تھی، عمر رسیدہ ہو گئیں، تو ایک دن آپ درخت کے سایہ میں بیٹھی ہوئی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کے منہ میں کھانے کی کوئی چیز (چوگ) ڈال رہا ہے، تو ان کے دل میں ایک حرکت، جوش، تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میری بھی اولاد ہوتی تو میں اس کی پرورش کرتی، اسی حال میں انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا، اے میرے رب مجھے اولاد عطاء فرما، ساتھ ہی نذر مان لی کہ اے میرے رب اگر تو نے مجھے اولاد عطاء کی تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت کیلئے تمام مشاغل سے آزاد کردوں گی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول کرلیا، آپ حاملہ ہوگئیں تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کی ﴿ فَتَقَبَّلْ مِنِّی﴾ "یعنی تقبل منی مانذرته" اے میرے رب جو میں نے نذر مانی تھی اسے قبول فرمالے۔ ﴿ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ بیشک تو میری باتوں کو سننے والا ہے اور میری نیتوں کو جاننے والا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

"محررا" منصوب محل الحالية ای متقا لخدمة بيت المقدس لااشغله بشئی من الدينا خالصا مفرغا لعبادة الله مكان هذا النذر مشروعا فی دينهم فی الغلمان" (مظہری)

"محررا" پرنصب (زبر ہے) اور حال واقع ہے یعنی اے میرے رب بیشک میں نے تیرے لئے نذر مان لی ہے، جو میرے پیٹ میں ہے حال یہ ہے کہ وہ آزاد ہوگا، بیت المقدس کی خدمت کیلئے، اس کو میں دنیا کے کسی کام میں مشغول نہیں رکھوں گی، خالص فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوگا، یہ نذر اس وقت ان کے دین میں بچوں کے حق میں جائز تھی، مذکر بچے بیت المقدس پر وقف کئے جاتے تھے جو بیت المقدس کی خدمت گذاری میں رہتے اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔

"اخرجه ابن جرير عن قتادة والربيع كان اذاحرر غلام جعل فی الكنيسة يكنسها ويخدمها ولا يبرحها حتى يبلغ الحلم ثم يخير ان احب اقام فيه وان احب ذهب حيث شاء" (مظهری)

قتادہ اور ربیع کی روایات میں ہے کہ جب کسی بچے کو دنیاوی کاموں سے آزاد کر کے عبادت خانہ کی خدمتگذاری کیلئے وقف کیا جاتا، تو اسے عبادت خانہ میں داخل کر دیا جاتا وہ جھاڑو دیتا، ہر طرح کی عبادت خانہ کی خدمت کرتا، بالغ ہونے تک وہیں رہتا، پھر اسے اختیار ہوتا، چاہتا تو وہیں رہتا تمام وقت خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا، اور چاہتا تو وہاں سے نکل آتا، جہاں چاہتا وہاں ہی چلا جاتا۔

تنبیہ: "محررا" کا لغوی معنی ہے "آزاد" اور یہاں آیۃ کریمہ میں مراد یہ ہے کہ وہ دنیاوی مشاغل سے آزاد ہوکر بیت المقدس کی خدمت کرے گا، اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے

مرادی ترجمہ کیا ہے ''خالص تیری خدمت میں رہے'' راقم نے لغوی معنی تحریر کیا ہے ''وہ آزاد ہوگا'' تاہم مظہری کی عبارت بمع ترجمہ کے (جو ذکر ہو چکا ہے) دیکھیں تو دونوں معانی مجتمع نظر آئیں گے۔

فائدہ: ''ولم یکن احد من الانبیاء والعلماء الاومن نسله محرر لبیت المقدس''

اس وقت انبیاء کرام اور علماء کرام کی اولاد کو بیت المقدس کی خدمت کیلئے ضرور وقف کیا جاتا، جو بالغ ہونے تک ضرور بیت المقدس کی خدمت میں مشغول ہوتے۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمران کی زوجہ حمنہ نے مذکر اولاد کی دعاء کی کیونکہ نذر ماننے سے پتہ چل گیا کہ بیت المقدس کی خدمت میں مذکر بچے مقرر کئے جاتے، مؤنث بچیاں مقرر نہیں کی جاتی تھیں، لھذا ان کا نذر ماننا مذکر بچے کی دعاء اور نذر کو واضح کرتا ہے۔

لیکن الفاظ عام تھے ﴿مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾ (میرے پیٹ میں جو بھی ہے وہ آزاد ہوگا) ان الفاظ میں مذکر ومؤنث کا کوئی ذکر نہ تھا اسی وجہ سے ان کے زوج عمران نے انہیں کہا:

''ویحک ماصنعت ارأیت ان کان مافی بطنک انثی لایصلح لذلک فوقعا من ذلک فی هم''

تم پر افسوس یہ تم نے کیا نذر مان لی، اگر تمہارے پیٹ میں مؤنث بچی ہوئی جو بیت المقدس کی خدمت پر مقرر نہ کی جاسکی تو تم کیا کروگی؟ اس پر دونوں بہت بڑے غم میں مبتلاء ہو گئے۔

عمران تو اسی غم کے دوران ہی وفات پاگئے، لیکن ان کی زوجہ ان کے بعد زندہ رہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

حضرت عیسی اور حضرت یحیی علیہما السلام میں رشتہ داری:

علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ نے ایک مسئلہ کا حل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس آیۃ کریمہ میں ہامان سے مراد وہی ہامان ہیں جو عیسی علیہ السلام کے نانا اور حضرت مریم کے والد ہیں، یہاں موسی علیہ السلام کے والد ہامان مراد نہیں، اگرچہ اتفاقی امر یہ ہے کہ عیسی علیہ السلام کی والدہ کا نام بھی مریم ہے اور حضرت موسی علیہ السلام کی بہن کا نام بھی مریم ہے، لیکن دونوں عمرانوں میں ایک ہزار آٹھ سو سال کا فرق ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ کا نام اور لقب ''مریم بتول ہے''

لھذا پتہ یہ چلا کہ آیۃ کریمہ میں تذکرہ مریم بتول کا ہے، ان کی کفالت حضرت زکریا علیہ السلام نے کی ہے، حضرت موسی علیہ السلام کی بہن مریم مراد نہیں۔

''وان زکریا بن اذن وعمران بن ماثان کانا فی عصر واحد وقد تزوج زکریا بنته

ایشاع اخت مریم فکان یحیی ویسی علیهما السلام ابنی خالة"

بیشک زکریا بن اذن اور عمران بن ماثان دونوں ایک زمانہ میں تھے، تحقیق زکریا نے عمران کی بیٹی سے نکاح کیا جس کا نام ایشاع تھا جو حضرت مریم کی بہن تھیں، اس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی ہیں۔
(از روح البیان)

ابھی جو رشتہ ذکر کیا ہے اس کے قائل محی السنۃ، علامہ رازی، علامہ بیضاوی وغیرہ (رحمھم اللہ) بھی ہیں ان حضرات نے اپنے موقف پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ بخاری مسلم میں معراج کے واقعہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے "فاذاانا بابنی الخالة عیسی ابن مریم ویحیی ا بن زکریا" پھر میری ملاقات دو خالہ زاد یعنی عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے ہوئی اس حدیث پاک سے بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات خالہ زاد تھے۔

جمہور علماء کرام نے یہ کہا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ حضرت مریم کی خالہ تھیں یعنی ایشاع حنہ کی بہن تھی نہ کہ مریم کی، ان حضرات نے حدیث پاک کی توجیہ یہ بیان کی کہ حدیث پاک میں مجاز پایا گیا ہے، کثیر طور پر خالہ کی بیٹی کو عزت وتکریم کے پیش نظر خالہ کہہ دیا جاتا ہے۔ (جیسے ہمارے رواج میں ماں کی خالہ اور ماموں کو بچے بھی خالہ اور ماموں کہہ دیتے ہیں، یہ بھی مجاز ہے)

"والغرض ان بینهما الصلوة والسلام هذه الجهة من القرابة وهی جهة الخؤلة"

مقصد صرف ان دونوں انبیاء کرام کی قربت کو بیان کرنا ہے کہ ان دنوں میں باعتبار خالہ کے رشتہ پایا گیا ہے۔
(روح المعانی)

جمہور حضرات کی دلیل کی طرف روح البیان میں بھی اشارہ مل رہا ہے کہ عمران کی زوجہ حنہ بانجھ تھیں ان کی کوئی اولاد ہی نہیں تھی، دعاء اور نذر سے حضرت مریم ان کے پیٹ میں آئیں، ابھی مریم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں تو عمران کا وصال ہو گیا، لھذا حضرت یحییٰ کو حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کا خالہ زاد کہنا درست نہیں۔ جمہور کی اس دلیل کا جواب بیضاوی رحمہ اللہ کے ان الفاظ سے دیا گیا ہے۔

"وکان یحیی وعیسی علیهما السلام ابنی خالة من الاب" یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام خالہ زاد بھائی تھے، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کی باپ کی جانب سے بہن تھی، یعنی عمران کی کسی اور زوجہ کی بیٹی تھی۔
(واللہ اعلم بالصواب)

طلباء کرام کے ذوق کیلئے تفصیلی بحث نقل کر دی گئی، دونوں طرف دلائل ہیں جس کے بھی آپ قائل ہوں دلائل ساتھ ہوں گے، راقم بھی کبھی بزرگوں کے اختلاف میں فیصلہ کن بات کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے، شیخ زادہ نے

عجیب انداز پر تطبیق دی ہے، جس میں دونوں قول سمٹ آتے ہیں، وہ یہ ہے، کہ عمران کا نکاح پہلے حنہ کی والدہ فاقوذا سے تھا، جس کے شکم سے ایشاع پیدا ہوئی، حنہ عمران کی ربیبہ تھی یعنی فاقوذا کے پہلے خاوند کی بیٹی تھی، پھر عمران نے اپنی ربیبہ حنہ سے نکاح کیا یہ اس شریعت میں جائز تھا اگر چہ ہماری شریعت میں جب ایک عورت سے نکاح اور مجامعت ہو جائے تو اس کی پہلی بیٹی ربیبہ سے نکاح کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔

حنہ کے شکم سے حضرت مریم پیدا ہوئیں، لھذا ایشاع حضرت مریم کے باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بہن ہیں، اور نانی کی بیٹی ہونے کی وجہ سے خالہ ہیں۔ یہ تطبیق دینے کے بعد آپ لکھتے ہیں " **وھذا توفیق جد الا انه احتمال عقلی لاتؤیده الروایة** " دونوں قولوں میں یہ توفیق بہت عمدہ ہے، لیکن عقلی دلیل ہے، کوئی روایت اس کی تائید نہیں کرتی۔
(شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

" **حنہ** " (حاء مہملہ، نون) عربی میں کسی عورت کا نام نہیں البتہ عامر کی کنیت ابوحنہ بدری ہے، اور ان کو ابوحبہ بھی کہا گیا۔ ایک شام کے علاقہ میں دیر حنہ ہے، ایک اور دیر حنہ حیرہ میں ہے جس کو ابونواس بھی کہا گیا ہے۔

" **خنہ** " (خاء معجمہ اور نون سے) کوئی نام نہیں سوائے خنہ بنت یحیٰ ابن اکثم قاضی کے یہ محمد بن نصر کی ماں ہیں۔

" **جنہ** " (جیم سے) سے کوئی نام عرب میں نہیں پایا گیا سوائے " **ابوجنہ** " کے جو ذوالرمہ شاعر کا ماموں ہے۔ البتہ "حبہ" باء سے یہ نام بہت پایا گیا ہے، ابوحبہ انصاری، اور ابوالسنابل بن بعکک کا نام بھی حدیث سبیعہ (مصغر) میں "حبہ" آیا ہوا ہے۔

حدیث سبیعہ یہ ہے کہ یہ سبیعہ بنت الحارث اسلمیہ سعد بن خولہ کی زوجہ تھی، ان کا خاوند مکہ میں فوت ہوگیا:

" **فقال لها ابو السنابل حبة ان اجلک اربعة اشهر وعشر وقد کانت وضعت بعد وفاة زوجها بلیال قیل خمس وعشرون لیلة وقیل اقل من ذلک فلما قال لها ابو السنابل ذلک اتت الی النبیﷺ فاخبرته فقال لها "قد حللت فانکحی من شئت"** "

تو ان کو ابوالسنابل حبۃ نے بتایا کہ تمہاری عدت چار مہینے دس دن ہے حالانکہ خاوند کی وفات کے پچیس دن یا اس سے بھی کم مدت میں اس کے ہاں ولادت ہوچکی تھی، جب ابوالسنابل نے اس عورت کو عدت بتائی تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئی اور ماجرا بیان کیا تو آپ نے فرمایا، تم عدت سے فارغ ہوچکی ہو جس سے چاہو تم نکاح کرلو۔

مقصد بیان تو صرف یہ ہے کہ ابو السنابل کا نام "حبۃ" تھا۔ (ماخوذ از قرطبی، تھذیب، طبقات ابن سعد)

طلباء کرام ایک اور بات ذہن نشین کریں:

عمران لفظ عجمی ہے، عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اگر لفظ عربی ہو تو عمر سے ماخوذ ہوگا، پھر بھی غیر منصرف ہوگا، ایک سبب علم ہوگا اور دوسرا سبب الف ونون زائدتان۔ (البحر المحیط)

فائدہ جلیلہ: "واخرج ابن سعد وابن ابی حاتم عن جعفر بن محمد عن ابیه عن جده ان علیا قال للحسن قم فاخطب الناس قال انی اهابک ان اخطب وانا اراک فتغیب عنه حیث یسمع کلامه ولا یراه فقام الحسن فحمد الله واثنی علیه وتکلم ثم نزل فقال علی ﷺ "ذریة بعضها من بعض والله سمیع علیم"

ابن سعد اور ابن ابی حاتم نے جعفر بن محمد سے روایت کی وہ اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک حضرت علی ﷺ نے حضرت امام حسن ﷺ کو کہا اٹھو لوگوں کو خطبہ دو، تو انہوں نے عرض کیا بیشک میں آپ سے ڈرتا ہوں کہ آپ کے سامنے میں خطاب کروں، حضرت علی ﷺ وہاں سے ہٹ گئے، وہ سامنے نہیں تھے لیکن حضرت امام حسن ﷺ کا خطاب سن رہے تھے حضرت امام حسن ﷺ نے اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان کی اور کلام فرمایا، تو حضرت علی ﷺ نے (اسی زیر بحث آیۃ کی تلاوت کرتے ہوئے) فرمایا ﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (درمنثور)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، عمران کی زوجہ نے جو نذر مانی وہ درحقیقت اللہ کی طرف سے الہام کے بعد تھی، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس وحی تو نہیں آئی لیکن خواب میں آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں تو سمجھ لیا کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اسی طرح حضرت موسی علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی نہیں آئی البتہ ان کے دل میں القاء کیا کہ اپنے بیٹے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دو۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁
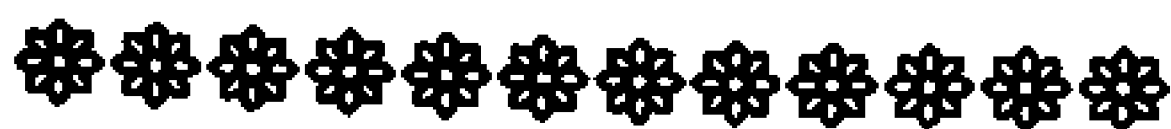
﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ O﴾ (آیة نمبر ۳۶)

(۱) پھر جب اسے جنا بولی اے میرے رب یہ تو میں نے لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم جو کچھ وہ جنی، اور وہ لڑکا جو اس نے مانگا اس لڑکی سا نہیں اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد تیری پناہ میں دیتی ہوں راندہوئے شیطان سے۔

(۲) جب اس عورت نے جنا مؤنث کو بولی اے میرے رب بیشک میں نے جنی ہے لڑکی، اور اللہ خوب جانتا ہے وہ جو اس نے جنی، اور نہیں (وہ لڑکا) مثل (اس) لڑکی کے اور بیشک میں نے اس کا نام رکھا مریم اور بیشک میں اسے تیری پناہ دے رہی ہوں اور اس کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان سے۔

آیۃ کریمہ کا بیان شروع کرنے سے پہلے طلباء کرام سے معذرت یہ ہے کہ ﴿وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ کا لفظوں کے مطابق راقم سے ترجمہ نہیں بن سکا اس لئے کچھ نہ کچھ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے اردو جملہ درست کرنے کیلئے نقل کر دیا ہے۔ لفظی ترجمہ یوں ہونا چاہئے "بیشک میں پناہ میں دیتی ہوں اسے تیری، اور اس کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان سے۔

خیال رہے کہ ضیاء القرآن میں حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کافی حد تک لفظوں کے مطابق ترجمہ لکھتے ہیں، لیکن اس مقام پر آپ کا ترجمہ بھی لفظوں کے مطابق نہیں، آپ کا ترجمہ یہ ہے "میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔

مختصر مطلب: عمران کی زوجہ نے اگرچہ مطلقاً نذر مانی تھی کہ جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کر دوں گی، لیکن ضمناً دعاء مذکر بچے کیلئے ہی تھی، اور نذر بھی مذکر کیلئے، کیونکہ بیت المقدس کی خدمت پر مقرر مذکر ہی ہوا کرتے تھے مؤنث نہیں۔ جب حنہ زوجہ عمران نے بچی جنی تو حسرت سے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا، اے میرے رب! میں نے لڑکی جنی اب میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر کیسے مقرر کروں

گی، تو رب تعالی نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو انے لڑکی جنی، یعنی حسرت و پریشانی کی ضرورت نہیں، تم مطلقا لڑکے کی دعاء کر رہی تھی، تمہاری دعاء میں یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکا خاص منصب یعنی نبوت پر فائز ہو، اس لئے تم جس لڑکے کی دعاء کر رہی تھی وہ اس لڑکی جیسا نہیں جو تم نے جنی ہے، اس لئے کہ اس کو ایک عظیم نبی حضرت عیسی علیہ السلام کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہونا ہے، اور رب تعالی کی قدرت کا ظہور اس بچی کے ذریعے ہونے والا ہے کہ اسے بغیر باپ کے بچہ عطاء کیا جائے گا۔ رب تعالی نے کہا، یا عمران کی زوجہ نے کہا ''بیشک میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا، پھر اس عورت نے رب تعالی کے حضور عرض کیا بیشک میں اس بچی اور اس کی ہونے والی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہی تا کہ یہ شیطان مردود کے شر سے محفوظ رہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا﴾ ''جب اس عورت نے جنا مؤنث کو''

دینی طلباء کرام کی توجہ کی ضرورت:

''وضعت'' میں فاعل کی ضمیر ''امراۃ عمران'' کی طرف لوٹ رہی ہے، ''ھا'' ضمیر منصوب متصل مفعول کی یا تو لفظ ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہے، جو ''مافی بطنی'' میں ہے، لفظ ''ما'' اگر چہ مذکر ہے لیکن معنی مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی ہے لفظ ''نفس'' مقدر کی طرف جو لفظا اور معنی مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی ہے ''حبلة'' مقدر کی طرف جو لفظا اور معنی مؤنث ہے، یا ضمیر لوٹ رہی لفظ ''نسمة'' کی طرف جو لفظا اور معنی مؤنث۔ (از روح المعانی)

سب صورتوں میں تقریبا معنی وہی ہوگا جو راقم نے وضاحت سے ذکر کر دیا یعنی الفاظ کے مطابق معانی یوں ہوں گے، جب اس عورت نے مؤنث کو جنا، جب اس عورت نفس مؤنث کو جنا، جب اس عورت ذی روح مؤنث کو جنا، جب اس عورت مؤنث حمل کو جنا۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّي وَضَعْتُهَا اُنْثٰى﴾ ''بولی اے میرے رب بیشک میں نے جنی لڑکی''

یعنی عمران کی زوجہ کی تمنا تھی کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ بچہ ہو، تا کہ میں اسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کر دوں، جب بچی پیدا ہوئی تو حسرت اور خوف سے کہا، اے میرے رب میں لڑکی جنی ہے، خوف اس لئے ہوا کہ نذر کو کیسے پورا کروں گی، بچی کس طرح بیت المقدس کی خدمت پر مقرر ہوگی۔ تو رب تعالی نے فرمایا ''اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنی۔ رب تعالی کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا:

"واللہ اعلم بما وضعت تعظیما لولدھا وتبجیلا لھا بقدر ذلک الولد"

اور اللہ خوب جانتا ہے جو اسنے عظمت والی بچی جنی، اور وہ بچی جنی جو رب تعالی کے ہاں مقبول اور قدرومنزلت والی ہے، اور اس کے ساتھ بڑے عظیم امور متعلق ہیں، اور اس کا بچہ جہان والوں کیلئے نشانی بنے گا، لیکن عمران کی زوجہ کو پتہ نہیں اس لئے حسرت کر رہی ہے۔

خیال رہے کہ ایک قرأت میں "وضعت" تاء کی پیش سے متکلم کا صیغہ ہے، یعنی عمران کی زوجہ نے کہا "اور اللہ خوب جانتا ہے جو میں نے جنی" "ولبت انھا لما قالت ذلک للاعتذار لا للاعلام" اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ عمران کی زوجہ نے یہ عذر کے طور پر کلام پیش کیا، نہ کہ بتانے کیلئے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى﴾: "اور نہیں (وہ لڑکا مثل (اس) لڑکی کے۔"

"الذکر" اور "الانثی" پر الف لام عہد خارجی ہے، یعنی عمران کی زوجہ نے جو مطلق لڑکا طلب کیا وہ اس لڑکی جیسا نہیں جو اسے عطاء کی گئی۔

مذکر کی فضیلت کی وجوہ:

(۱) وسبب ھذا التفضیل من وجوہ احدھا ان شرعھم انہ یجوز تحریر الذکور دون الاناث"

مذکر کی فضیلت کی کئی وجوہ پائی گئی ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک شریعت نے جائز رکھا کہ مذکر کو بیت المقدس کی خدمت کیلئے مقرر کیا جائے، باقی مشاغل سے اسے آزاد کر دیا جائے، یہ شرف مؤنث کو حاصل نہ تھا۔

(۲) "والثانی ان الذکر یصح ان یستمر علی خدمۃ موضع العبادۃ ولایصح ذلک فی الانثی لمکان الحیض وسائر عوارض النسوان"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بیشک مذکر لگاتار، ہمیشہ مقام عبادت کی خدمت بجا لا سکتا ہے، مؤنث یہ کام ہمیشہ نہیں کر سکتی، کیونکہ حیض اور نسوانی عوارض اس میں پائے جاتے ہیں جو اس کے کام میں ہمیشگی سے مانع ہیں۔

(۳) "والثالث الذکر یصلح لقوتہ وشدتہ للخدمۃ دون الانثی فانھا ضعیفۃ لاتقوی علی الخدمۃ"

تیسری وجہ یہ ہے کہ مذکر میں قوت و بہادری کی وجہ سے خدمت کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے، وہ مؤنث میں نہیں پائی جاتی اسلئے کہ وہ قدرتی طور پر پیدائشی ضعیف، ناتواں، کمزور ہوتی ہے، اسلئے قوت و بہادری والے کام سرانجام دینے سے وہ قاصر ہے۔

(۴) "والرابع ان الذکر لا یلحقه عیب فی الخدمة والا ختلا ط بالناس ولیس کذلک الانثی"
چوتھی وجہ یہ ہے کہ بیشک مذکر کو خدمت پر مقرر کرنے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں کوئی عیب نہیں لیکن عورت میں یہ عیب ہیں کہ وہ لوگوں سے مل جل کر رہے، پردہ کا پاس نہ کرے۔

(۵) "ان الذکر لایلحقه من التهمة عند الاختلاط ما یلحق الانثی"
پانچویں وجہ یہ ہے کہ مرد کو مردوں سے ملنے جلنے میں تہمت کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، لیکن عورت کو تہمت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ (کبیر)

خصوصاً جہاں ایک مرد اور ایک عورت ہوں وہاں مصطفےٰ کریم ﷺ کا ارشاد گرامی صادق آتا ہے۔

"لا یخلون رجل بامرأة الاکان ثالثهما الشیطان" (ترمذی، مشکوۃ باب النظر الی المخطوبۃ)

کوئی شخص ہرگز کسی عورت سے خلوت (ون ٹو ون ملاقات) نہیں کرے گا مگر یہ کہ وہاں ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوگا۔ اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والمعنی یکون الشیطن معهما ویهیج شهوة کل منهما حتی یلقیهما فی الزناء" (مرقاۃ)

شیطان کا ان دونوں کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک خواہشات نفسانیہ ابھریں گی، یہاں تک کہ ان دونوں کو بدکاری میں مبتلاء کردیں گی۔

یہ بھی خیال رہے کہ "لا یـــخـلـون" قسم محذوف کا جواب ہے، گویا کہ کلام میں بہت زیادہ تاکید پائی گئی ہے، اور عظیم خطرات سے ڈرایا گیا ہے، یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اجنبی مرد کی عورت سے علیحدگی کی ملاقات میں شیطان ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔

عمران کی زوجہ اللہ کی یاد میں مستغرق تھی:

رب تعالیٰ کے ارشاد کے بعد اس عورت کا کلام گویا کہ یوں تھا:

"کـان الـذکـر مـطلوبی وهذه الانثی موهوبة الله ولیس الذکر الذی یکون مطلوبی کالانثی التی هی موهوبة لله"

مذکر تو میرا مطلوب تھا، لیکن یہ مؤنث تو رب تعالیٰ کی عطاء ہے، میرا مطلوب مذکر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مؤنث کے برابر نہیں ہوسکتا۔

"وهـذا الـکلام یدل علی ان تلک المرأة کانت مستغرقة فی معرفة جلال الله عالمة بان مایفعله الرب بالعبد خیر مما یریده العبد لنفسه"

اسی سے پتہ چلا کہ وہ عورت اللہ تعالیٰ کے جلال کی معرفت میں مستغرق تھی، اور وہ جانتی تھی کہ جو اللہ تعالیٰ بندے کو بھلائی پہنچائے وہ اس سے بہتر ہے جو بندہ اپنے لئے چاہے۔

﴿وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ﴾ ''اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا۔''

یہ کس کا قول ہے اور کس نے اس بچی کا نام مریم رکھا، اس میں دو قول پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اسی نے بچی کا نام مریم رکھا، جیسا کہ یحیٰ علیہ السلام کا نام رب تعالیٰ نے رکھا۔

"﴿وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ﴾ واثبت الله تعالی لولدها هذا الاسم" اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ہی اللہ تعالیٰ نے اس بچی کا نام رکھا۔ (احکام القرآن للجصاص)

دوسرا قول یہ ہے کہ بچی کا نام عمران کی زوجہ نے رکھا، یہ کلام اس عورت کا ہے۔

"(وانی سمیتها مریم) من مقول حنة عطف علی قولها (انی وضعتها) ای انی جعلت اسمها مریم"

اور بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا یہ مقولہ (کلام) ہے حضرت مریم کی والد حضرت حنہ کا، اس کا عطف ہے۔ ﴿اِنِّیْ وَضَعْتُهَا﴾ پر یعنی عمران کی زوجہ نے کہا بیشک میں نے اس کا نام مریم رکھا، ان کے اس کلام میں غرض کیا تھی؟ جب رب تعالیٰ علام الغیوب ہے، اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ان کی غرض تھی، اور بیٹی کی حفاظت طلب کرنے کی درخواست مقصود تھی۔

اور مقصد عرض یہ تھا کہ اے اللہ اگر چہ میں اپنی نیت اور عرض میں تو کامیاب نہیں ہوسکی کیونکہ میں نے لڑکی جنی ہے جسے بیت المقدس کی خدمت پر مقرر کرنا تو مشکل نظر آتا ہے، اس لئے کہ بیت المقدس کی خدمت پر لڑکے مقرر کئے جاتے ہیں لیکن اے اللہ اگر تو مہربانی فرمائے اور اجازت دے تو اسے بیت المقدس میں عبادت کرنے کیلئے بھیج دیا جائے اور وجہ اس کلام کی یہ تھی کہ اس وقت کے رواج کے مطابق بچوں کے نام ان کا باپ رکھتا تھا، تو حضرت مریم کی والدہ نے عرض کی اے اللہ جیسا کہ تو جانتا ہے کہ اس کا باپ تو فوت ہو چکا ہے، اسلئے اس کا نام میں نے مریم رکھ دیا۔

﴿وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾

''اور بیشک میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہی ہوں راندے ہوئے شیطان سے۔''

"الرجیم" ای المطرود، واصل الرجیم الرمی بالحجارة" رجیم کا معنی ہانکا ہوا، راندہ ہوا اصل میں رجم کا معنی ہے پتھر مارنا۔ رب تعالیٰ نے حضرت مریم کی والدہ کی اس دعاء کو قبول کیا، ارشاد مصطفوی اس پر شاہد ہے۔

"عن ابی هریرة ان رسول اللہ ﷺ قال مامن مولود یولد الانخسه الشیطان فیستھل صارخا من نخسة الشیطان الاابن مریم وامه ثم قال ابوهریرة اقرؤا ان شئتم وانی اعیذها بک وذریتها من الشیطان الرجیم" (مسلم ج ۲ باب فضائل عیسی، مشکوۃ کتاب الوسوسۃ)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی بچہ نہیں پیدا ہوتا مگر یہ کہ شیطان اسے چھوتا ہے، دباتا ہے تو وہ بچہ روتا ہے، سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر تم چاہتے ہو تو یہ آیۃ کریمہ پڑھو" اور بیشک میں اسے اور اس کی اولاد تیری پناہ میں دے رہی ہوں، راندے ہوئے شیطان سے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "یمسه حین یولد فیستھل صارخامن مسة الشیطان" جب بچہ پیدا ہوتا تو شیطان اسے مس کرتا (چھوتا) ہے تو وہ بچہ شیطان کے چھونے سے روتا ہے۔ ایک اور روایت ابی ھریرہ میں یہ الفاظ مذکور ہیں "قال رسول اللہ ﷺ صیاح المولود حین یقع نزعة" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بچہ شیطان کے دبانے سے روتا ہے۔

احادیث مبارکہ میں استعمال الفاظ "مسة، مس، نخسة، نزعة، طعنة" کا ایک ہی معنی ہے، (بچے کو) ایک طرف سے دبانا۔ اس کی وضاحت دوسری حدیث میں صراحۃ موجود ہے "کل ابن آدم یطعن الشطان فی جنبه حین یولد" ہر ابن آدم جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے پہلو میں دباتا ہے۔

اعتراض: "فان قلت الانبیاء معصومون من الشیطن فلا سبیل له علیهم"

انبیاء کرام شیطان سے معصوم (بچے ہوئے ہوتے ہیں) یعنی شیطان کو ان پر غلبہ حاصل نہیں ہوتا، تو حدیث کا مطلب کیسے صحیح ہوگا؟ سوائے حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام کو شیطان ہر بچے کو دباتا ہے۔

پہلا جواب: "اجیب بانهم معصومون من وسوسته واغوائه لا من نخسه فی اجسامهم فان ذلک لا یقدح فی عصمتهم"

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بیشک وہ شیطان کے وسوسہ اور بھٹکانے سے محفوظ ہیں نہ کہ جسموں میں انگلیاں چبھونے اور دبانے سے، کیونکہ جسم کو دبانے سے ان کی محفوظیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی یہ عیب ہے۔ (ماخوذ از صاوی)

دوسرا جواب: اس میں حصر اضافی ہے، کہ عام لوگوں کا تو یہی حکم ہے کہ ان کو پیدائش کے وقت شیطان انگلیوں سے دباتا ہے جس کی وجہ سے بچے روتے ہیں، لیکن یہ حکم ہر ہر فرد کو شامل نہیں۔

طلباء کرام لفظ "**کل**" کی تین قسموں کو مدنظر رکھیں (۱) کل بمعنی کلی (۲) کلی افرادی (۳) کل مجموعی عین ممکن ہے کہ اس مقام کو کل مجموعی کے درجہ میں ہو۔

وقد صح ان رسول الله ﷺ قال لفاطمة حين زوجها عليا "اللهم انى اعيذهابك وزريتها من الشيطن الرجيم وكذا قال لعلى حينئذ" (رواه ابن حبان من حديث انس)

صحیح حدیث پاک سے ثابت ہے جو ابن حبان نے حضرت انس ﷺ سے روایت ہے کہ "بے شک رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی ﷺ کے ساتھ نکاح کیا تو ان کے حق میں یہ دعاء فرمائی "اللھم ﴿اِنِّی اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ "اے اللہ بیشک میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دے رہا ہوں شیطان راندے ہوئے سے" اور اسی موقع پر یہی دعا حضرت علی ﷺ کیلئے بھی فرمائی۔

"ودعاء النبى ﷺ اولى بالقبول من دعاء امرائة عمران فارجو عصمتها واولادها من الشيطن وعدم مسه اياهم"

نبی کریم ﷺ کی دعاء یقیناً زیادہ مقبول ہوگی بنسبت عمران کی زوجہ کے، میں امید رکھتا ہوں کہ آپ کی دعاء سے اللہ تعالی نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت علی ﷺ کو (اس دعاء کے بعد) شیطان سے محفوظ رکھا ہوگا، اور ان دونوں حضرات کی اولاد کو راندے ہوئے شیطان کے مس کرنے اور دبانے سے محفوظ رکھا ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری)

راقم کو بھی اگر چہ جواب یہی پسند ہے تاہم علامہ قرطبی اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حصر حقیقی ہی بنائی ہے کہ حدیث پاک کو ظاہر پر ہی رکھا جائے اور حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام کی تخصیص کی جائے کہ رب تعالی نے حضرت عمران کی زوجہ کی دعاء کو خصوصی شرف قبولیت عطاء فرمایا ہو، لیکن علامہ آلوسی اس پر یوں بحث فرماتے ہیں:

"والقول بانه لا يبعد اختصاص عيسى وامه بهذه الفضيلة دون الانبياء عليهم السلام ولا يلزم منه تفضيله عليهم السلام اذ قد يوجد فى الفاضل مالا يوجد فى الافضل"

جب یہ قول لیا جائے کہ اس فضیلت میں کہ شیطان کے مس سے صرف حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام محفوظ رہے باقی انبیاء کرام محفوظ نہیں رہے تو اس میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی کیونکہ بعض اوقات فاضل کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے جو افضل کو حاصل نہیں ہوتا۔ (روح المعانی)

یعنی جزوی فضیلت سے مکمل طور پر دوسروں پر افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت خزیمہ ﷺ اکیلے کی گواہی دو مردوں کے برابر تھی، یہ مقام خلفاء راشدین میں سے کسی کو بھی حاصل نہ تھا لیکن پھر بھی فضیلت (مجموعی طور پر) خلفاء راشدین کو ہی حاصل رہی۔

نبی کریم ﷺ کی شان ہی بلند و بالا ہے:

نبی کریم ﷺ "کل مولود" کے عموم سے خارج ہیں، اس حدیث مذکور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی رسول اللہ ﷺ پر فضیلت ثابت ہو جائے یہی قول جمہور اہل علم کا ہے، اور اس کی وہ روایت تائید کر رہی ہے جو جلال رحمہ اللہ نے "البهجة السنية" میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

"عن عکرمة قال لما ولد النبی ﷺ اشرقت الارض نورا فقال ابلیس لقد ولد اللیلة ولد یفسد علینا امرنا فقالت له جنوده لو ذهبت الیه فجاء ه فرکضه جبریل علیه السلام فوقع بعدن"

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ کی پیدائش ہوئی تو تمام زمین آپ کے نور کی وجہ سے روشن ہوگئی، ابلیس نے کہارات کو ایک بچہ پیدا ہوا ہے جو ہمارا معاملہ بگاڑ دے گا، تو اس کے لشکر نے کہا، کاش کہ تم اس کے پاس چلے گئے ہوتے (یعنی ایسا دبایا ہوتا کہ وہ بچہ مر چکا ہوتا) تو وہ آپ کے پاس گیا (اس کے اپنے ارادہ پر عمل کرنے سے پہلے ہی) تو جبرئیل علیہ السلام اسے ایک ٹھوکر لگائی جس سے وہ مقام عدن میں جا گرا۔ (روح المعانی)

سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد گرامی اس مسئلہ کو زیادہ واضح کر رہا ہے کہ آپ شیطان سے محفوظ ہیں۔

❁ "عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ مامنکم من احد الا وقد وکل به قرینه من الجن وقرینه من الملائکة قالوا وایاک یا رسول الله ﷺ وایای ولکن الله اعاننی علیه فاسلم فلا یامرنی الا بخیر" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الوسوسة)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی نہیں مگر یہ کہ اس کا ایک اس کے ساتھ موکل ہوتا ہے اور ایک ساتھی فرشتہ اس کے ساتھ موکل ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا آپ کا قرین بھی ہے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا ہاں میرا قرین بھی ہے لیکن اللہ تعالی نے مجھے اس پر غالب کر دیا ہے وہ میرا مطیع ہو گیا وہ مجھے سوائے بھلائی کے کوئی حکم نہیں دیتا۔

وضاحت حدیث: "وکل" مجہول کا صیغہ ہے توکیل سے لیا گیا ہے، یعنی بنی آدم سے جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ابلیس کی اولاد میں سے بھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جو اسے شر کا حکم دیتا ہے، اس کا نام ہوتا ہے اس کا نام ہوتا ہے "وسواس" اور فرشتوں میں سے ایک اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اسے بھلائی کا حکم دیتا ہے اس کا نام ہوتا ہے "ملهم" "ثم الحکمة فی ذلک ظهور خسة العاصی وشرف الطائع" پھر حکمت اس میں عاصی کی خست، ذلت کمینگی کو ظاہر کرنا، اور مطیع کی بزرگی و شرافت کو ظاہر کرنا ہے۔

جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا آپ کا قرین بھی شیطان ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں ہے، (ولکن اللہ اعاننی علیہ) بالعصمة او بالخصوصية" لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خصوصیت عطاء فرمائی ہے کہ میں اس سے محفوظ ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر غالب کر دیا ہے۔

"**فاسلم**" اس لفظ کو دو طرح پڑھا گیا، مجہول کا صیغہ اور میم پر پیش ہے، یعنی مجھے اس سے محفوظ کر دیا گیا ہے، اور دوسرا اس کو معروف کا صیغہ پڑھا گیا اور میم پر زبر ہے "اسلم بالفتح ای استسلم و ذل و انقاد" کہ وہ میرا مطیع ہو گیا، میرے سامنے عاجز ہو گیا، وہ مجھے سوائے بھلائی کے کاموں کے کوئی حکم نہیں دیتا، اس حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ شیطان سے محفوظ ہیں۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج اول ص ۱۳۷، ۱۳۸)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا قَالَ يَا مَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَاءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۷)

(1) تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھی پروان چڑھایا اور اسے زکریا کی نگہبانی میں دیا جب زکریا اس کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے اس کے پاس نیا رزق پاتے کہا اے مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے، بیشک اللہ جسے چاہے بے گنتی دے۔

(2) تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ، اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان اور نگران بنایا اس کا زکریا کو، جب داخل ہوتے اس کے پاس زکریا اس کی عبادت کی جگہ میں، پاتے اس کے ہاں رزق، کہا اے مریم کہاں سے (آتا ہے) تمہارے لئے یہ، بولیں وہ اللہ کے ہاں سے (آتا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ رزق دیتا جسے چاہے بغیر حساب کے۔

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے بنسبت مطلوب بیٹے کے حضرت حنہ کی بیٹی حضرت مریم کو بیت المقدس میں عبادت کیلئے بہت اچھی طرح قبول فرمالیا، اور ان کو اچھی طرح پروان چڑھایا، اور بیت المقدس کے خدام میں سے حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس بچی کا نگہبان مقرر فرمایا۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب ان کی عبادت کے کمرہ میں داخل ہوتے تو ان کے کمرہ میں بے موسم پھل پاتے گرمیوں میں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے گرمیوں میں، تو بڑے تعجب سے پوچھتے اے مریم یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آجاتا ہے، تو حضرت مریم نے ان کے سوال کے جواب میں کہا اللہ تعالیٰ کے حضور سے مجھے یہ رزق ملتا ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾ "تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ۔" اچھی طرح قبول کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کے مطالب یوں بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ''اخرج ابن جریر و ابن المنزرعن ابن جریج فی قوله(فتقبلها ربها بقبول حسن)قال تقبل من امها ما ارادت به الکنیسة فاجرها فیه''

ابن جریج کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ (تو قبول کیا اسے اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمران کی زوجہ نے دعاء کی اور تمنا کی کہ اے اللہ میں نے بچی جنی ہے اسے بیت المقدس کی عبادت کیلئے قبول فرمالے اگر چہ یہ خدمت گذاری تو نہیں کر سکتی، تو اس کی دعاء اور تمنا کو اچھی طرح قبول فرمالیا، بیت المقدس میں عبادت کیلئے بھیجنے کی اجازت دے دی۔ (از درمنثور)

(۲) (فتقبلها)ای رضی بمریم فی النذر مکان الذکر ففیه تشبیه النذر بالهدیة ورضوان الله تعالی بالقبول(ربها)ای رب مریم المبلغ لها الی کمالها اللائق بها(بقبول حسن)ای تقبلها بوجه حسن تقبل به النذائر وهو اختصاصه سبحانه ایا هاباقامتها الذکر فی النذر ولم یقبل قبلها انثی'' (روح المعانی بحذف)

''تو قبول کیا اسے'' ای اللہ تعالی مذکر کی جو نذر مانی گئی تھی اس کی جگہ مریم پر ہی راضی ہو گیا، بلکہ مریم کا انتخاب خود ہی کیا، اللہ تعالی کی رضاء مندی ہی قبولیت ہے۔

ضمناً ایک مسئلہ سمجھ آیا کہ اس مقام میں نذر کو ہدیہ سے تشبیہ دی گئی، اسی وجہ سے قبولیت کا ذکر فرمایا ورنہ نذر کے ساتھ قبولیت کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

''ربها'' (اس کے رب نے) یعنی مریم کے رب نے اسے قبول کیا اور اس اعلی مرتبہ پر پہنچایا جو اس کی شان کے لائق تھا۔

(بقبول حسن) (بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) یعنی جس طرح خاص نذروں کو ہدیہ سمجھ کر قبول کرلیا جائے اسی طرح حضرت مریم کو مذکر کی جگہ قبول کر لینا اللہ تعالی کا خاص فضل و کرم تھا جو اس سے پہلے کسی مؤنث کیلئے اس قسم کی کوئی نذر نہیں قبول کی گئی۔

(۳) ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ المعنی سلک بها طریق السعداء''

(تو قبول کیا اس کے رب نے بہت اچھی قبولیت کے ساتھ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بچی کو نیک بخت لوگوں کی راہ پر چلایا، یعنی نیک بخت بنایا۔ (قرطبی)

(۴) ''عن ابن عباس وقال قوم معنی التقبل التکفل فی التربیة والقیام بشانها''

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں، بعض حضرت نے بیان فرمایا کہ اچھی طرح قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اچھی تربیت فرمائی اور ان کی شان کو اچھا مقام عطاء فرمایا۔ (قرطبی)

(۵) "وقال الحسن معنی التقبل انه ما عذبها ساعة قط من لیل ولا نهار"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کو اچھی طرح قبول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ کسی وقت بھی دن یا رات میں حضرت مریم کو کوئی تکلیف نہیں دی، جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ (قرطبی)

(۶) "والقبول الحسن هو قبول المراد اهل الاجتباء دون قبول المریدین"

اچھی قبولیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو جب مطلوب مذکر سے ترجیح دی تو وہ مرتبہ مراد میں آگئیں، ان کو چن لیا گیا، اس لئے ان کو یوں قبول کیا گیا جیسے مراد اور مجتبیٰ کو پسند کر لیا جاتا ہے ایسا قبول نہیں کیا گیا جیسے مرید ہدیہ قبول کرتے ہیں۔ (مظہری)

(۷) "فتقبلها ربها بقبول حسن "یعنی انه تعالی عصمها و عصم ولدها عیسی علیہ السلام من مس الشیطان"

اچھی طرح قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان کے مس کرنے سے محفوظ رکھا۔ (کبیر)

(۸) اچھی طرح قبول کرنے کی ایک اور وجہ بیان کی گئی ہے:

"روی القفال عن الحسن انه قال ان مریم تکلمت فی صباها کما تکلم المسیح ولم تلتقم ثدیا قط وان رزقها کان یا تیها من الجنة"

قفال حضرت حسن بصری سے روایت کرے ہیں کہ بیشک حضرت مریم نے بچپن میں کلام فرمایا جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کلام فرمایا، اور حضرت مریم نے پستان کو منہ نہیں ڈالا، آپ کو رزق جنت سے عطاء کیا گیا یہ سب عطائیں اچھی قبولیت تھی۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

فعول (فاء کلمہ کی نصب سے) کے وزن پر پانچ مصدر استعمال ہیں: "قبـــول، طهـــور، وضـوء، وقـود، ولوغ" البتہ "وقود" جب مصدر ہو تو زیادہ طور پر اس پر ضمہ آتا ہے نصب آئے تو اس اسم ہوتا ہے ایندھن کو کہا جاتا ہے مصدری معنی ہے جلانا، زجاج نے "قبول" کو بھی ضمہ سے پڑھا ہے۔ یعنی "قبــول" اس مقام میں مصدر استعمال ہے۔

پھر طلباء کرام خصوصی توجہ فرمائیں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ باب تفعل کا مصدر "تـقبـل" استعمال ہونا چاہئے

تھا لیکن اسے استعمال نہ کرنے کی وجہ یہ ہے، ''انـه يفيد نوع تكلف على خلاف الطبع اما القبول فانه يفيد معنى القبول على وفق الطبع'' ''تقبل'' باب تفعل کے مصدر میں معنی ہوتا ہے'' تکلف سے خلاف طبع قبول کرنا'' لیکن'' قبول'' کا مطلب ہوتا ہے کہ طبع کے مطابق بغیر کسی تکلف کے قبول کر لینا۔

"وهـذه الـوجوه وان كانت ممتنعة فى حق الله تعالى الاانها تدل من حيث الاستعارة على حصول العناية العظيمة فى تربيتها وهذاالوجه مناسب معقول"

اللہ تعالی کے حق میں یہ کہنا'' کہ اس نے طبع کے مطابق قبول کر لیا، خلاف طبع تکلف سے قبول نہیں کیا'' مشکل ہے، لیکن مجازی معنی عقل کے مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ'' اچھی طرح اسے قبول کیا'' یعنی بہت بڑی مہربانی سے حضرت مریم کی تربیت کی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ ''اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان''

''نبت، نبات'' اسے کہا جاتا ہے جو زمین سے نکلے اور بڑھنے والا ہو۔''سواء كـان له ساق كالشجر اولم يكن لـه ساق كالنجم'' برابر ہے کہ اس کا تنا ہو جیسے درخت یا اس کا تنا نہ ہو جیسے بیل، عرف میں زیادہ طور پر نبات کا اطلاق بیل پر ہوتا ہے۔ اب زیادہ طور پر ان پودہ جات کو نبات کہا جاتا ہے جسے حیوان کھائیں، انسان کیلئے نبات کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء اور نشو ونما مٹی سے ہوئی، اور بیشک وہ بھی بڑھتا ہے جس طرح پودہ جات بڑھتے ہیں۔

جیسے رب تعالی نے فرمایا ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ﴾ وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر مٹی سے اور ارشاد فرمایا، ﴿وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ اور بڑھایا اسے اچھی طرح بڑھنا۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

اسے ہی کنز الایمان اور ضیاء القرآن میں خوبصورت انداز پر پیش کیا گیا'' اور پروان چڑھایا اسے اچھی پروان'' یہ ترجمہ راقم کا ان دو تراجم سے ہی ماخوذ ہے۔

حضرت مریم کو اچھی پروان چڑھانے کا مطلب ہے کہ دنیا میں آپ کو ایسا بڑھایا گیا، ایسا پروان چڑھایا گیا کہ آپ کو عام بچوں کی بنسبت بہت تیزی سے بڑھایا گیا اور دین میں آپ کو پروان چڑھایا گیا یعنی آپ کو صلاح، درستگی، عفت اور طاعت سے نوازا گیا۔ (کبیر)

﴿وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ ''اور نگران بنایا اس کا زکریا کو''

''کفل'' میں دو قراءتیں ہیں، ایک تشدید سے، جس کا فاعل اللہ تعالی ہے، یعنی ضمیر مرفوع متصل اللہ تعالی کی

طرف لوٹ رہی ہے، اس لحاظ پر تو وہی معنی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔

ایک قراءت میں مخفف ہے فاء پر شد نہیں اس میں فاعل زکریا ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا اور نگران بن گیا اس کا زکریا۔ ہمارے پاس شد والی قراءت ہے، اسلئے مطلب یہ ہو گیا کہ اس بچی کی ضمان اللہ تعالی نے حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی، ان کو اس کا کفیل بنایا، اور ان کی مصلحت کا ضامن بنایا، اور اس کے امور کا مدبر بنایا

"والکافل ھو الذی ینفق علی انسان ویھتم باصلاح مصالحه وفی الحدیث (انا و کافل الیتیم کھاتین)

کفیل اسے کہا جاتا ہے جو دوسرے انسان پر مال خرچ کرے اور اس کی بہتریوں کا اہتمام کرے حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا میں اور یتیم کا کفیل ان (انگلیوں) کی طرح ہوں گے۔ (یعنی اسے میرا قرب حاصل ہوگا) (ماخوذ از روح البیان وبیضاوی)

حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت کا تذکرہ:

حضرت عمران کی زوجہ جب اپنی بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر بیت المقدس میں لے آئیں تو وہاں کے علماء جو بیت المقدس کے خدام کہلاتے تھے ان کے حوالے اس بچی کو کر دیا۔

یہ بچی ان کے امام اور رئیس کی تھی اسلئے ہر ایک نے خواہش کی کہ یہ میری زیر کفالت (میری نگرانی میں) رہے گی، وہاں اس وقت ان علماء کی تعداد انتیس تھی، بعض نے ستائیس کا بھی ذکر کیا ان میں سے حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اس بچی کی کفالت کا میں زیادہ حق رکھتا ہوں کہ اس کی خالہ میری زوجہ ہے، لیکن دوسرے حضرات نے کہا کہ قرعہ ڈالتے ہیں، جس کے نام قرعہ نکلا وہی اس کا کفیل ہوگا۔ قرعہ ڈالنے کا یہ طریقہ منتخب کیا گیا کہ اپنے اپنے قلم سب جمع کر لو، اور ایک کپڑے کے نیچے ان کو ملا جلا کر چھپا دو پھر کسی بچے کو کہو جو ایک قلم ان سے نکال لے۔ جس کا وہ قلم ہوگا وہی کفیل ہوگا اسی طرح کیا گیا، ایک نابالغ لڑکے کو کہا گیا، جس نے ان قلموں میں سے ایک قلم نکالا وہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تھا، اس طرح کفالت کا آپ کو حق بظاہر مل گیا لیکن وہ تمام حضرات کہنے لگے کہ ایک مرتبہ پھر قرعہ ڈالتے ہیں، دیکھتے ہیں وہ کس کے نام نکلتا ہے، اب قرعہ ڈالنے کا یہ طریقہ رکھا گیا کہ نہر اردن میں اپنے اپنے قلم ڈالتے ہیں جن کے قلم ڈوب گئے پانی کی پستی، میں چلے گئے ان کو کفالت کا حق حاصل نہیں ہوگا اور جس کا قلم پانی کے اوپر آ گیا اور رک گیا نہ ڈوبا اسے کفالت کا حق حاصل ہوگا اس قرعہ اندازی میں بھی قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا۔

لیکن ان حضرات نے کہا ایک مرتبہ پھر یعنی تیسری مرتبہ قرعہ ڈالتے ہیں، یہ آخری قرعہ اندازی ہوگی اب قرعہ

اندازی کا طریقہ یہ مقرر کیا گیا کہ اپنے اپنے قلم ڈالتے ہیں، جس کا قلم پانی کے آنے کی طرف الٹ سمت میں گیا اسے کفالت کا حق حاصل ہوگا اور جن کا قلم پانی کے چلنے کی سمت نیچے سیدھے جانب گئے ان کو کفالت کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ تیسری مرتبہ قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے حق میں نکلا تو وہی حضرت مریم مکمل کفیل بنا دیئے گئے۔ (از روح المعانی)

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾

''جب داخل ہوتے اس کے پاس زکریا اس کی عبادت کرنے کی جگہ تو پاتے اس کے ہاں رزق۔''

یہ الفاظ مبارکہ اچھی قبولیت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچی کو اچھی طرح قبول فرمایا کہ اسے جنت سے رزق عطاء فرمایا، یہی وجہ ہے کہ واؤ عاطفہ نہیں ذکر کی، تا کہ یہ جملہ ماقبل سے علیحدہ نہ ہو۔

''**کلما**'' ما مصدریہ ہے، زمان محذوف ہے معنیٰ اس کا ظرفیت والا ہے **یا** نکرہ موصوفہ ہے معنی وقت کا ہے ''**والمعنی کل زمان دخل علیها او کل وقت دخل علیها**'' یعنی جس زمانہ میں اس پر داخل ہوتے، یا جس وقت میں اس پر داخل ہوتے۔

''المحراب علی ماروی عن ابن عباس رضی الله عنهما غرفة بنیت لها فی بیت المقدس وجعلت بابها فی وسط الحائط وکانت لا یصعد علیها الابسلم مثل باب الکعبة''

اس آیۃ کریمہ میں محراب سے مراد وہ کمرہ ہے جو خصوصی طور پر حضرت مریم کیلئے بیت المقدس میں بنایا گیا تھا، اور اس کا دروازہ دیوار کے وسط میں بنایا گیا تھا جیسا کہ کعبہ شریف کا دروازہ بلندی پر ہے، اس کمرہ میں سیڑھی کے بغیر کوئی چڑھ نہیں سکتا تھا۔

''وقیل المراد به المسجد اذقد کانت مساجد هم تسمی المحاریب''

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں محراب سے مسجد ہے، کیونکہ اس وقت مساجد کو محاریب (محراب کی جمع) کہا جاتا تھا۔

ان دونوں معنوں میں کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ میں وہ کمرہ بنایا گیا تھا چاہے تو محراب کا معنیٰ مسجد کر لیا جائے، چاہے تو محراب کا معنیٰ خاص کمرہ کر لیا جائے۔ آیۃ کریمہ میں تو یہ دو معنی معتبر ہیں، البتہ ایک معنی اور بھی ہے، وہ یہ ہے، ''**وقیل اشرف مواضعه ومقدمها وهو مقام الامام من المسجد فی رای**'' بعض حضرات نے بیان کیا کہ محراب اشرف اور مقدم مقام کو کہتے ہیں، مسجد میں جہاں امام کھڑا ہوتا ہے

اسے محراب کہا جاتا ہے۔

محراب کو محراب کیوں کہا جاتا ہے؟ "محراب" "مفعال" کا وزن ہے، اس میں مبالغہ پایا گیا ہے، جیسے "مطعان" میں مبالغہ پایا گیا ہے، "مطعان" کا معنی ہے بڑا نیزہ باز، اسی طرح محراب کا معنی ہے زیادہ لڑائی کرنے والا چونکہ مقام عبادات میں انسان اپنے نفس سے یا شیطان سے لڑائی کرتا ہے اس لئے ان مقامات کو محراب کہہ دیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

مساجد کے محراب کی ایجاد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں ہوئی:

"قال القضاعی واول من احدث ذلک عمر بن عبد العزیز وھو یومئذ عامل للولید بن عبد الملک علی المدینۃ لما اسس مسجد النبی ﷺ وھدمہ وزادفیہ ویسمی موقف الامام من المسجد محرابا"

قضاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے محراب کی ایجاد کی، آپ اس وقت ولید بن عبدالملک کے مدینہ طیبہ پر عامل (گورنر) تھے، آپ نے مسجد نبوی شریف کو شہید کر کے نئی تعمیر فرمائی تو امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو مسجد سے زائد آگے بنادیا اور اس کا نام محراب رکھ دیا۔

مسجد کی اشرف مجالس کو بھی محراب کہا جاتا ہے، محل کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ مقام ہوتا ہے، بادشاہ کی مجلس کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس میں منفرد ہوتا ہے، اور مسجد کے محراب کو بھی اسلئے محراب کہا جاتا ہے کہ امام اس میں منفرد (اکیلے) ہوتا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۲۲۴ باب المساجد و مواضع الصلوۃ)

﴿وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا﴾ "پاتے اس کے ہاں رزق"

حضرت زکریا علیہ السلام کے بغیر کوئی حضرت مریم کے کمرہ میں نہیں جا سکتا تھا، وہ سات دروازوں میں بند تھا آپ جب نکلتے تھے تو تمام دروازے بند کر دیتے تھے، لیکن جب کمرہ میں جاتے تھے تو گرمیوں میں سردیوں کے اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل پاتے۔ "والتنوین للتعظیم" اور "رزقا" میں تنوین تعظیم کی پائی گئی یعنی آپ کے پاس عظیم الشان، بلند قدر والا رزق پاتے۔ (روح المعانی)

راقم کے نزدیک عین ممکن یہ ہے کہ حضرت مریم کو جنت کا دودھ اور شہد بھی میسر ہوتا ہوگا، کیونکہ آپ اس وقت دودھ پینے کی عمر میں تھیں، اسی وجہ سے "رزقا" کہا گیا "طعاما" اور "اکلا" نہیں کہا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ قَالَ یَا مَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا ﴾ ''کہا اے مریم کہاں سے (آتا ہے) تمہارے لئے یہ۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''انی'' اس مقام میں ''من این'' کے معنی میں استعمال ہے یعنی اس کا معنی ہے ''کہاں سے'' اور کبھی ''انی'' ''کیف'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ﴾ تم آؤ اپنی کھیتی میں (اپنی بیبیوں کے پاس) جس طرح تم چاہو، اور کبھی ''انی'' شرط کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ''انی تقعد اقعد'' جہاں تو بیٹھے گا میں بیٹھوں گا۔

﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ ''بولیں وہ اللہ کے ہاں سے (آتا ہے)''

اللہ کے ہاں سے مراد ایک تو یہ ہے کہ یہ رزق میرے پاس جنت سے آتا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ رزق رب تعالی مجھے بغیر کسی انسان کے واسطہ سے عطاء کرتا ہے۔ ''ولا تستعجب ولا تستبعد'' نہ اس میں کوئی تعجب ہے اور نہ ہی اسے آپ بعید سمجھیں، (روح المعانی)

تنبیہ: ''وکل ذلک من آثار قدرته تعالی ولم یکن هناک وحی الیه بذلک'' (روح المعانی)

یہ تمام چیزیں یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کا کفالت کا مطالبہ کرنا، پھر قرعہ اندازی پھر قرعہ آپ کے حق میں نکلنا، پھر علیحدہ کمرہ بنوانا، پھر رزق کے متعلق حضرت مریم سے سوال کرنا صرف اللہ تعالی کی قدرت کی علامات سے ظاہر ہو رہا تھا، اس میں وحی نہیں آئی تھی حالانکہ حضرت زکریا علیہ السلام نبی تھے، اگر وحی آئی ہوتی تو ان چیزوں میں سے کسی کی ضرورت درپیش نہ آتی۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾

''بیشک اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے۔''

یعنی اللہ تعالی کثیر رزق عطاء فرماتا ہے جس کا اندازہ نہیں، اور وہ اس میں محاسبہ نہیں فرماتا، اور گنتی کر کے نہیں دیتا (روح البیان)

کرامت اولیاء کا ثبوت:

''وفی الآیة دلیل علی جوازا لکرامة للاولیاء'' آیۂ کریمہ میں دلیل پائی گئی ہے کہ اولیاء کرام کی

کرامت برحق ہے، بلکہ حضرت مریم کی کرامت عیسی علیہ السلام کیلئے ارہاص بھی تھا، اعلان نبوت سے پہلے معجزہ ظاہر ہو تو اس کا نام ارہاص ہوتا ہے۔ (روح البیان)

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا کلام حضرت مریم کی طرح:

❁ عن جابر ان رسول الله ﷺ اقام ایامالم یطعم طعاما حتی شق ذلک علیه فطاف فی منازل ازواجه فلم یجد عند واحدة منهن شیأ فاتی فاطمة فقال یا بنیة هل عندک شئی آکله فانی جائع؟قالت لا والله بابی انت وامی فلما خرج من عندها بعثت الیها جارة لهابرغیفین وقطعة لحم فاخذته منها فوضعته فی جفنة لهاوقالت والله لاوثرن بهذارسول الله ﷺعلی نفسی ومن عندی،وکانوا اجمعا محتاجین الی شبعة فبعثت حسنا اوحسینا الی رسول الله فرجع الیها فقالت بابی انت وامی قداتی الله بشی ء فخباته لک قال"هلمی یابنیة"قالت فاتیته بالجفنة فکشفت عنها فاذاهی مملوء ة خبزاولحما فلما نظرت الیها بهت وعرفت انها برکة من الله،فحمدت الله وصلیت علی نبیه وقدمته الی رسول الله ﷺ فلما رآه حمده الله وقال من این لک هذایابنیة؟قالت یابت"هو من عن الله﴿ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب﴾فحمد الله وقال"الحمد لله الذی جعلک یا بنیة شبیهة بسیدة نساء بنی اسرائیل فانها کانت اذارزقها الله شیأ وسئلت عنها"قالت هو من الله ان الله یرزق من یشاء بغیر حساب"فبعث رسول الله ﷺالی علی(رضی الله عنه)لم اکل ای رسول الله ﷺواکل علی وفاطمة وحسن وحسین وجمیع ازواج النبی ﷺ واهل بیته حتی شبعوا اجمیعا،قالت وبقیت الجفنة کما هی قالت فاوسعت ببقیتها علی جمیع الجیران وجعل الله فیها برکة وخیرا کثیرا" (رواه حافظ ابو یعلی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ چند دنوں کے بھوکے تھے کچھ کھایا نہ تھا، یہاں تک آپ پر یہ حالت شاق (مشقت میں ڈالنے والی) گذری، تو اپنی بیبیوں کے گھروں میں چکر لگایا کہ کھانے کی کوئی چیز مل جائے لیکن کسی گھر سے کوئی چیز نہ ملی، پھر آپ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے تو فرمایا" کیا تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے میں بھوکا ہوں؟" انہوں نے عرض کیا قسم ہے اللہ تعالی کی کچھ نہیں "بابی انت وامی" جب آپ ان کے ہاں سے نکلے تو ان کے پاس ان کی ایک پڑوسن نے دو روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا بھیجا، آپ نے وہ روٹیاں لے کر ایک برتن میں رکھ دیں، (اسے ڈھانپ دیا) آپ کہنے لگیں "قسم ہے اللہ تعالی اس کی اس کھانے میں، میں اپنے ذات اور اپنے گھر کے افراد سے رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دوں گی" حالانکہ آپ کے گھر کے تمام افراد روٹی سے پیٹ بھرنے کے محتاج تھے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امام حسن یا امام حسین کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، تو آپ تشریف لے آئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے "مرحبا بابی انت وامی" کہا، پھر عرض کیا اللہ تعالیٰ نے کھانے کی کوئی چیز عطاء فرمادی تو وہ میں نے آپ کیلئے رکھ دی، آپ نے فرمایا اے میری پیاری بیٹی وہ لے آؤ۔ آپ فرماتی ہیں جب میں نے وہ برتن لایا، اسے کھولا تو وہ روٹیوں اور گوشت سے بھرا ہوا تھا، جب میں نے اسے دیکھا تو میں حیران رہ گئی، اور میں نے سمجھ لیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی برکت آگئی، تو میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور اللہ تعالیٰ کے نبی پر درود پڑھا اور میں نے وہ کھانا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا تو آپ نے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد کی، اور فرمایا "اے میری پیاری بیٹی یہ کھانا کہاں سے آیا؟ تو انہوں نے عرض کیا اے میرے ابا جان ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (یہ اللہ کے ہاں سے آیا ہے، بیشک اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہے بغیر حساب کے) تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور کہا "سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے تمہیں بنایا ہے، اے بیٹی! بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار عورت (حضرت مریم) کی طرح، ان کو بھی جب اللہ تعالیٰ نے رزق عطاء فرمایا اور ان سے پوچھا گیا کہ یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو وہ بولیں ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بلا لیا گیا، پھر وہ کھانا رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کی تمام ازواج مطہرات (پاکیزہ بیبیوں) اور اہل بیت نے کھایا، سب نے سیر ہو کر کھایا، اور وہ کھانا اسی طرح موجود تھا، پھر تمام پڑوسیوں کو بھی وہ کھانا دیا گیا، ان کو پورا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت اور خیر کثیر رکھ دیا۔ (ابن کثیر، صابونی)

اس حدیث پاک سے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی کرامت اور رسول اللہ ﷺ کا معجزہ واضح طور پر معلوم ہو گیا۔ یہ حدیث روح المعانی، روح البیان، اور شیخ زادہ وغیرہ نے بھی مختصر الفاظ میں ذکر کی ہے۔

کرامت کیسی ہو؟

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں "اکبر الکرامات ان تبدل خلقا مذموما من اخلاقک" سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ تم اپنے برے اخلاق کو اچھے اخلاق سے تبدیل کر لو۔

❁ **"قال الشیخ ابو العباس رحمه الله لیس الشان من تطوی له الارض فاذا هو بمکة وغیرها من البلدان انما الشان من تطوی عنه اوصاف نفسه"**

شیخ ابو العباس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کوئی شان کی بات نہیں کہ کسی شخص کیلئے زمین کو سمیٹ دیا جائے جب وہ مکہ

مکرمہ میں ہو، یا دور دراز مسافت کے شہروں میں ہو مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر لے۔

❁ "وقیل لابی یزید ان فلانا یمشی علی الماء قال الحوت اعجب منه اذھو شانه"

ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی خدمت میں کسی نے ذکر کیا فلاں شخص کی بڑی شان ہے کہ وہ پانی پر چلتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مچھلی کی شان ہوگی، اور اس پر تعجب کیا جائے کیونکہ وہ اس بندے سے زیادہ اچھا پانی پر چلتی ہے۔

❁ "فقیل له ان فلانا یمشی فی الهواء قال الطیر اعجب من ذلک اذھو حاله"

پھر کسی اور شخص نے دوسرے شخص کا کمال بیان کیا کہ وہ فضاء میں اڑتا ہے، اس کی بڑی شان ہے، تو آپ نے فرمایا اس طرح تو پرندے کے حال پر زیادہ تعجب کیا جائے کیونکہ وہ زیادہ اچھی طرح اڑتا ہے۔

❁ "قیل له کان فلان یمشی الی مکة ویرجع من یومه قال ابلیس اعجب من ذلک اذھو حاله تطوی له الارض کلها فی لحظة وھو فی لعنة الله"

پھر کسی اور شخص نے ایک اور صاحب کی تعریف کی کہ فلاں شخص بڑی شان والا اور بڑے کمال والا ہے، کہ وہ مکہ سے ایک دن میں واپس آجاتا ہے، حالانکہ درمیان میں بہت بڑی مسافت ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کیا کمال ہے، اس سے بڑھ کر کمال تو ابلیس کو حاصل ہے کہ وہ تمام زمین کو ایک لحظہ میں طے کر لیتا ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت (پھٹکار) میں ہوتا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا حقیقی شان اور کمال کسی نے دیکھنا ہو تو یوں دیکھیے۔

"فالطی ء الحقیقی ان تطوی مسافة الدنیا عنک حتی تری الآخرة اقرب الیک منک"

حقیقی طے یعنی حقیقی طور پر منازل کے طے کرنے، کسی چیز کے سمٹنے میں کمال ہے تو اس میں ہے کہ تم دنیا کی مسافت کو سمیٹ دو اور آخرت کو اپنے آپ کو بھی زیادہ قریب سمجھو تو یہ حقیقی شان تمہیں حاصل ہوگی، درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ،

"لان الارض تطوی لک فاذاانت حیث شئت من البلاد لان ھذاربما جرالی الاغترار وذلک یؤدی للتعلق بالواحد القھار"

زمین کے لپٹ جانے اور مسافت جلدی طے ہو جانے سے انسان متکبر ہو جاتا ہے، اور دنیا کے سمٹ جانے اور آخرت کی منازل کو جلدی طے کرنے سے انسان کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ (از روح البیان)

حکایت عجیبہ: ابو عنوان واسطی کہتے ہیں کہ کشتی ٹوٹ گئی، میں اور ایک عورت اس کے تختے پر چند دن پانی میں ہی رہے، اسی حالت میں اس عورت نے بچی کو جنم دیا، اس نے مجھے پکارا کہ میں بہت زیادہ پیاس

میں مبتلاء ہوں، میں نے اسی وقت فضاء میں ایک شخص کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر ہے اور سرخ رنگ کا یاقوتی پیالہ پانی کا ہے، اس نے وہ پیالہ مجھے دیا کہ تم دونوں یہ پانی پی لو، وہ پانی ہم نے پیا جو کستوری سے زیادہ خوشبودار اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا تو میں نے اس شخص سے پوچھا اللہ تم پر رحم کرے تم کون ہو؟" قال ان عبد مولاک" اس نے کہا میں تمہارے مولی کا بندہ ہوں۔

"فقلت بم وصلت الی هذافقال ترکت هوای لمرضاته فاجلنی فی الهواء"

میں نے اسے کہا تم اس مرتبہ پر کیسے پہنچے ہو؟ اس نے کہا میں نے اللہ تعالی کی مرضی کیلئے یعنی اس کی رضاء حاصل کرنے کیلئے اپنی خواہشات کو چھوڑ دیا ہے تو اللہ تعالی نے مجھے فضاء میں بٹھا دیا ہے ابو عنوان کہتے ہیں پھر وہ شخص مجھ سے غائب ہو گیا میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ (روح البیان)

حکایت: سفیان ثوری نے ایک مرتبہ شیبان راعی کے ساتھ حج پر تسریف لے گئے راستہ میں ایک درندہ دیکھا تو سفیان کہنے لگے راستہ میں تو درندہ ہے یعنی ہمارا راستہ طے کرنا دشوار نظر آتا ہے تو شیبان کہنے لگے ڈرو نہیں وہ اس درندے کے پاس گئے، اس کو کانوں سے پکڑا اور اس کے کان مروڑے، سفیان نے تعجب کیا۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان جب اللہ تعالی کا ہو جاتا ہے تو تمام مخلوق اس کی ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اسی قسم کے واقعات کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ — کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ
تو بھی گردن اللہ کے حکم سے نہ پھیر — کہ گردن نہیں پھیرے گا تیرے حکم سے کوئی بھی۔
محال ست جوں دوست دارد ترا — کہ در دست دشمن گذارد ترا
محال ہے جب رب تعالی تجھے دوست بنالے، تو پھر تجھے دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔

حضرت مریم کا یہ کلام بچپن میں تھا:

اگر چہ اس مسئلہ میں اختلاف تو پایا گیا ہے کہ یہ کلام اس وقت حضرت مریم نے فرمایا جس عمر میں بچے سوال وجواب کر سکتے ہیں، یا بہت چھوٹی عمر میں یہ کلام کیا جس عمر میں بچے کلام نہیں فرماتے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ یہ کلام بچپن میں کیا ہے اور چند حضرات اور بھی ہیں جنہوں نے بچپن میں کلام کیا، آپ نے ایک نظم کی صورت میں یوں بیان فرمایا۔

تکلم فی المهد النبی محمدﷺ	ویحیی وعیسی والخلیل والمریم
ومبری جریج ثم شاهد یوسف	وطفل الذی الاخدود یرویه مسلم
وطفل علیه مر بالامة التی	یقال لها تزنی ولا تکلم
وما شطة فی عهد فرعون (طفلها)	وفی زمن الهادی (المبارک) یختم

(۱) نبی کریمﷺ نے پیدا ہوتے ہی "اللهم رب هب لی امتی" کلام فرمایا۔

(۲) حضرت یحیی علیہ السلام نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (۳) حضرت عیسی علیہ السلام نے بچپن میں کلام فرمایا۔

(۴) حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (۵) حضرت مریم رضی اللہ عنہا نے بچپن میں کلام فرمایا۔

(۶) جریج سے تہمت زائل کرنے والے بچے نے بچپن میں کلام فرمایا۔

(۷) حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دینے والے بچے نے بچپن میں کلام فرمایا۔

(۸) اصحاب اخدود میں ایک بچے نے ماں کو کہا تم اپنے دین پر قائم رہو، یہ روایت بھی مسلم میں ہے۔

(۹) ایک عورت پر زنا کی تہمت لگا رہے تھے تو وہ خاموش تھی (حقیقت میں پاکدامن تھی) ایک عورت نے اسے دیکھ کر کہا میرے بچے کو اے اللہ اس عورت کی طرح نہ بنانا تو بچے نے بچپن میں کہا اے اللہ مجھے ایسا ہی بنانا کیونکہ یہ عورت بے گناہ ہے۔

(۱۰) فرعون نے جب ایک عورت کو ایمان لانے پر عذاب دیا تو اس کے بچے نے بچپن میں ہی اپنی ماں کو دین پر قائم رہنے کیلئے کہا۔

(۱۱) ہادی کے زمانہ میں مبارک نے بچپن میں کلام فرمایا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿هُنَالِکَ دَعَازَکَرِیَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِن لَّدُنکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِO﴾ (آیۃ نمبر ۳۸)

(1) یہاں پکارا زکریا اپنے رب کو بولا اے رب میرے مجھے اپنے پاس سے دے ستھری اولاد بیشک تو ہی ہے دعاء سننے والا۔

(2) اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے، عرض کیا اے میرے رب عطاء کر مجھے اپنی طرف سے اولاد پاکیزہ بیشک تو ہی سننے والا ہے دعاء۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اللہ تعالی نے اس بچی کو جنتی بے موسم پھل عطاء کئے ہیں، تو رب تعالی سے دعاء کی کہ اے اللہ تعالی میں بے اولاد ہوں، میری عمر بڑھاپے کو پہنچ چکی ہیاور میری زوجہ بھی بانجھ ہے تو ہمیں اولاد یعنی بیٹا عطاء کردے تو تیری قدرت سے بعید نہیں، وہ بیٹا صاف ستھرا پاکیزہ ہو جو منصب نبوت کے لائق ہو، اے اللہ بیشک تو ہی دعا کو سننے والا ہے، یعنی سن کر دعاء کو قبولیت سے تو ہی نوازتا ہے، اسلئے ہماری دعاء قبول فرما۔

﴿هُنَالِکَ دَعَازَکَرِیَّا رَبَّهٗ﴾ ''اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے۔''

"ھنالک" کے متعلق علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"فی ذلک المکان او الوقت اذ یستعار ھنا ولم وحیث للزمان" (بیضاوی)

"ھنالک" کا "حقیقی معنی" مکان ہے، مکان بعید کیلئے زیادہ استعمال ہوتا ہے، لیکن مجازاً مکان قریب کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی لئے اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا "یہاں پکارا زکریا اپنے رب کو" اور کبھی "مجازی" طور پر زمان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے راقم نے ترجمہ کیا ہے "اسی وقت دعاء کی زکریا نے اپنے رب سے" تا کہ طلباء کرام دونوں تراجم ذہن نشین ہو جائیں۔ بیضاوی کی مذکورہ عبارت پر شیخ زادہ رقمطراز (لکھتے) ہیں۔

"جوز حمله علی الزمان وھو معنی مجازی لھنالک مع جواز حمله علی معناہ الحقیقی الذی ھو المکان تکثیر اللفائدۃ لان دعاءہ فی زمان رؤیۃ مارآہ من امر مریم علیھا السلام یستلزم دعاءہ فی مکان تلک الرؤیۃ بخلاف الدعاء فی ذلک المکان فانه لا یستلزم الدعاء فی ذلک الزمان"

"ھنالک" کا مجازی معنی لینا یعنی زمان والا معنی کرنا جائز ہے، باوجود اس کے کہ حقیقی معنی یعنی مکان والا معنی کرنا بھی جائز ہے، تاہم مجازی معنی زیادہ فائدہ پر مشتمل ہے، اس لئے کہ جب آپ نے حضرت مریم کے پاس اللہ تعالیٰ کے ہاں سے آنے والے رزق کو دیکھا تو اسی وقت دعاء کی تو یہ دعاء یقیناً اسی جگہ تھی، کیونکہ بلا تاخیر اسی وقت دعاء اسی جگہ دعاء کو مستلزم ہے، لیکن اسی جگہ دعاء کرنا اسی وقت دعاء کرنے کو مستلزم نہیں۔ (شیخ زادہ)

حضرت زکریا علیہ السلام کو دعاء کرنے کا خیال کیوں آیا؟

اس کی چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) جب حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے پاس بے موسم پھل پائے یعنی سردیوں کے گرمیوں میں اور گرمیوں کے سردیوں میں، جو جبریل ان کے پاس لاتے تھے، تو حضرت مریم سے پوچھا یہ بے موسم پھل تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں؟ انہوں نے بتایا یہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے رزق عطاء فرماتا ہے بغیر حساب کے۔ تو اسی وقت ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیٹا عطاء فرمادے، اللہ تعالیٰ جب قادر مطلق ہے جو مریم کو بے موسم پھل عطاء فرماتا ہے تو اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں کہ وہ میری زوجہ کو بھی اولاد کے قابل بنادے۔ اور ہمیں اولاد عطاء فرمادے، آپ نے یہی خیال آنے پر دعاء رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی۔

"وذلک لثلاث لیال بقین من المحرم قال زکریا فاغتسل ثم ابتھل فی الدعاء الی اللہ تعالیٰ"

محرم شریف کے مہینہ کی تین راتیں باقی تھیں، تو حضرت زکریا علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور قیام کیا غسل کیا پھر اللہ تعالیٰ سے بڑی عاجزی سے دعاء کی۔

(۲) جب آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤنث کو مذکر کی جگہ قبول فرمالیا تو اسی وقت دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے کو جوان بنادے اور بانجھ عورت کو بچے جننے والا بنادے تو اس کی قدرت سے کون سا بعید ہے تو آپ نے رب تعالیٰ سے اولاد کی دعاء کی۔

(۳) بیت المقدس کی خدمت کیلئے جن بچوں کو مقرر کیا جاتا تھا وہ اگرچہ نابالغ ہوتے، لیکن کم از کم اتنی عمر کے ہوتے کہ وہ خود اپنا کام اور بیت المقدس کی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جب حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی ننھی بچی کو بیت المقدس میں عبادت کیلئے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا تو یہ اس ذات کی مہربانی ہے، اسی وقت خیال آیا کہ رب تعالیٰ سے اولاد کی دعاء کی جائے کہ وہ ہم پر بھی مہربانی فرماتے ہوئے

اولاد عطاء فرمادے۔

(۴) جب آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مریم نے بچپن میں کلام فرمایا جس عمر میں بچے کلام نہیں کرتے تو خیال آیا کہ جس ذات نے اس بچی کو کلام کرنے کی طاقت عطاء فرمائی اگر میں بھی اس سے دعاء کروں تو وہ میری بانجھ زوجہ کو بھی اولاد عطاء فرمادے۔

(۵) جب حضرت مریم سے آپ نے سنا ﴿وَاللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (اور اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے) تو اسی وقت دل میں خیال آیا کہ رب تعالیٰ سے اولاد کی میں دعاء کروں تو وہ مجھے بڑھاپے میں اور میری زوجہ کے بانجھ پن کے باوجود اولاد عطاء فرمائے گا "فجاز ان تلد من غیر استعداد" "میری زوجہ بغیر استعداد کے بچہ جنے گی تو یہ رب قدوس کی قدرت ہوگی" (روح المعانی)

﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾

"عرض کیا اے میرے رب عطاء کر مجھے اپنی طرف اولاد پاکیزہ"

یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی دعاء کی وضاحت شروع کی اور اس کی کیفیت کو بیان کیا۔

"**رب**" اصل میں "یا ربی" ہے، جس کا معنی ہے "اے میرے رب"

"**ھب**" امر ہے، "**وھب یھب**" سے، جس کا معنی ہے "عطاء کر" اولاد کے مطالبہ کیلئے لفظ "ھب" ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے "**ان الھبۃ احسان محض لیس فی مقابلۃ شیء**" کہ بیشک ہبہ خالص احسان ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ گویا کہ سوال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جب میں بوڑھا ہوں اور میری زوجہ بھی بانجھ ہے، بظاہر اولاد کے ہونے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا، اسلئے تو اپنا خالص احسان عظیم فرماتے ہوئے ہمیں اولاد عطاء کردے۔

"**ذریۃ طیبۃ**" (اولاد پاکیزہ) طیبۃ کا معنی "مبارکۃ" لیا گیا ہے، برکت والی اولاد عطاء فرما، اور اس کا معنی بیان کیا گیا "**صالحۃ تقیۃ نقیۃ العمل**" "اے میرے رب مجھے نیک، پرہیزگار صاف ستھرے عمل والی اولاد عطاء فرما۔

(ماخوذ از روح المعانی)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء بیٹے کیلئے تھی:

اگر چہ یہاں "ذریۃ طیبۃ" ذکر کیا گیا ہے، جس سے بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "طیبۃ" صفت مؤنث ہے اور موصوف "ذریۃ" بھی مؤنث ہے، لیکن اس کی وضاحت مفسرین کرام کے کلام میں دیکھیں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔

"والذرية في المشهور النسل تقع على الواحد والجمع والذكر والانثى"

ذریۃ کا معنی مشہور "نسل" ہے، اور یہ لفظ "ذریۃ" مذکر ومؤنث اور واحد وجمع پر برابر سچا آتا ہے، "والمراد ههنا ولد واحد" اور یہاں مراد ایک بچہ ہے۔

"وانث الطيبة لتانيث لفظ الذرية والتانيث والتذكير تارة يجيئان على اللفظ واخرى على المعنى وهذا في الاسماء الاجناس"

"الطیبۃ" صفت مؤنث ہے لفظ ذریۃ کو دیکھ کر کہ وہ لفظاً مؤنث ہے، (معنی مذکر ہے) اسماء اجناس میں تذکیروتانیث کبھی الفاظ کو دیکھ کر آتی ہے اور کبھی معانی کو دیکھ کر آتی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہاں ذریۃ معنوی طور پر مذکر ہے کہ بیٹے کی دعاء کی گئی۔ اس پر واضح دلیل سورۃ مریم میں ارشاد باری تعالی ہے ﴿فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ﴾ تو مجھے اپنی طرف سے عطاء فرما جو میرا کام اٹھالے وہ میرا جانشین ہو، اور اولاد یعقوب کا وارث ہو۔

اس دعاء کا مطلب ہی یہ تھا کہ اے اللہ مجھے اپنا اور اولاد یعقوب کا وارث وجانشین عطاء فرما یعنی وہ منصب نبوت پر فائز ہو، نبی چونکہ مذکر ہی ہوتا مؤنث نہیں، لھذا یہ دعاء بھی مذکر (بیٹے) کیلئے کی گئی۔

﴿اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ﴾ "بیشک تو ہی سننے والا ہے دعاء"

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء اپنے جد اعلی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کے مطابق ہے، یعنی آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کی، ان کے کلام کو رب تعالی نے یوں حکایت بیان فرمائی:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ﴾ (سورۃ ابراہیم آیۃ نمبر ۳۹)

سب خوبیاں اللہ کو جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل واسحٰق دیئے بیشک میرا رب دعاء سننے والا ہے۔

"اراد كثير الاجابة لمن يدعوك من خلقك" "بیشک تو ہی دعاء سننے والا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے رب کریم تیری مخلوق سے جب کوئی تیرے حضور دعاء کرتا ہے تو تو ہی اسے قبول فرماتا ہے۔ کثیر دعاؤں کو شرف قبولیت عطاء کرنا تیرا اکرم اور تیری قدرت ہے۔ (از روح المعانی)

جب کسی کو کرم ہی حاصل نہ ہو تو وہ کسی کی التجاء کو قبول نہیں کرتا، جب کسی کو قدرت ہی حاصل نہ ہو تو وہ بھی کسی کو التجاء کو قبول کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

آیۃ کریمۃ سے متعلق فوائد:

حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم سے بچپن میں کلام سنا، اور ان کے پاس بے موسم پھل دیکھے "فشاهد تلک الكرامات دعاربه" تو حضرت مریم کی ان کرامات کو دیکھ کر اولاد کی دعاء کی۔

آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اولیاء کرام کو کرامات حاصل ہیں۔ "والمعتزله ينكرون كرامات الاولياء وارهاصات الانبياء" معتزلہ اولیاء کرام کی کرامات اور انبیاء کرام کے ارہاصات (قبل از اعلان نبوت حاصل ہونے والے کمالات) کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامات کو دیکھ کر دعاء نہیں کی، بلکہ

"لما رأى آثار الصلاح والعفاف والتقوى مجتمعة في حق مريم عليها السلام اشتهى الولد وتمناه فدعا عندذلک"

جب ان میں بھلائی کی علامات اور پاکدامنی اور تقوی کو مجتمع پایا تو بچے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس وقت دعاء کی۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ان کے اس قول کا رد کیا کہ ان چیزوں کو دیکھ بڑھاپے میں "خرق عادت" عادت کے خلاف سرزد ہونے والے فعل کی دعاء کرنا عقل سے بعید ہے۔ صحیح یہی ہے کہ کرامات کو دیکھ کر آپ نے دعاء کی، اسی وجہ پر عبادت کو محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ طلباء کرام اگر علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارت کو دیکھنا چاہیں تو وہ مندرجہ ذیل ہے:

(القول الثاني) وهو قول المعتزلة الذين ينكرون كرامات الاولياء وارهاصات الانبياء، قالو "ان زكريا عليه السلام لما رآى آثار الصلاح والعفاف والتقوى مجتمعة في حق مريم عليها السلام اشتهى الولدوتمناه فدعا عندذلک، واعلم ان القول الاول (اى كرامات الاولياء حق) وذلک لان حصول الزهد والعفاف والسيرة المرضية لايدل على انخراق العادات فرؤية ذلک لا يحمل الانسان على طلب مايخرق العادة، واما رؤية ما يخرق العادة قد يطمعه في ان يطلب ايضا فعلا خارقا للعادة ومعلوم ان حدوث الولد من الشيخ الهرم والزوجة العاقر من خوارق العادات فكان حمل الكلام على هذاالوجه اولى (كبير)

متكلمين کا قول جمیل:

"ان دعاء الانبياء والرسل عليهم الصلوة والسلام لا يكون الابعد الاذن لاحتمال ان لا تكون الاجابة مصلحة فحينئذ تصير دعوته مردودة وذلک نقصان في منصب الانبياء عليهم الصلوة والسلام هكذا قاله المتكلمون" (كبير)

متکلمین حضرات نے بیان کیا ہے کہ انبیاء کرام اور رسولوں کو جب رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملتی ہے تو وہ دعاء کرتے ہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی دعاء کی قبولیت میں مصلحت نہ پائی جائے تو دعاء کورد کردیا جائے تو اس میں انبیاء کرام کے منصب میں نقص لازم آئے۔ **راقم** کو متکلمین کا قول ہی پسند ہے، راقم کا موقف بھی یہی ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اگر چہ یہ بیان فرمایا ہے کہ رب تعالیٰ نے مطلقا دعاء کرنے کی اجازت فرمائی ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان الفاظ سے ہی دعاء کبھی قبول ہوتی ہے اور کبھی دعاء قبول نہیں ہوتی۔ دعاء ہر طرح کی جاسکتی ہے البتہ وہ دعاء معصیت کی نہ ہو، لھذا انبیاء کرام بھی جو چاہیں دعاء کریں رب تعالیٰ قبول فرمالے تو اس کا فضل وکرم ہے، اگر نہ قبول فرمائے تو اس کی مرضی کیونکہ وہ خالق ہے اور انبیاء کرام مخلوق ہیں، اس میں انبیاء کرام کے منصب میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: "دن" کے ذکر میں بھی تقریبا وہی فائدہ ہے جو "ھــــب" میں بیان کیا جاچکا ہے، یعنی عرف اور عادت کے مطابق اولاد اسباب مخصوصہ سے پیدا ہوتی ہے، آپ نے جب اولاد کی دعاء کی اس وقت آپ کے بوڑھے ہونے اور زوجہ کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری اسباب موجود نہ تھے، تو آپ نے گویا یوں عرض کیا:

"ارید منک الھی ان تعزل الاسباب فی ھذہ الوقعة وان تحدث ھذا الولد بمحض قدرتک من غیر توسط شی ء من ھذہ الاسباب"

اے اللہ! میں تیرے حضور یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر چہ ظاہری اسباب تو ختم ہو چکے ہیں لیکن تو اپنی قدرت سے بغیر ظاہری اسباب کے "اپنی طرف سے" اولاد عطاء فرما۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ﴾ میں "ھب" کا معنی ہبہ کر' ہبہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز بغیر ثمن کے دے دینا کہ وہ قبضہ کر لینے کے بعد مالک بن جاتا ہے۔ "حــــر" (آزاد) بیٹے کا کوئی مالک نہیں ہوتا تو ہبہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یہاں ہبہ مجازی معنی میں استعمال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب مجھے عبادت کرنے والا، نبوت وعلم کا وارث عطاء فرما، ایسا بیٹا تیرے خصوصی کرم سے ہی حاصل ہوتا ہے تو وہ ہبہ کے درجہ میں ہی ہوگا، یہ کلام ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کے نفسوں اور مالوں کو جنت کے بدلے۔

اس آیۃ کریمہ میں بھی' جہاد میں نفسوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کو شراء (خریدنے) سے مجازی طور پر

ذکر فرما دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت میں لوگوں کی جانیں اور مال ہیں، جہاد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی "وسمی ذلک شراء لما وعدھم علیه من الثواب الجزیل" اس کو رب تعالیٰ نے شراء سے تعبیر فرمایا ہے جبکہ اس نے بہت عظیم ثواب عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا" (احکام القرآن للجصاص)

اولاد کی دعاء کرنا سنت انبیاء وصدیقین ہے:

اس آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کیلئے دعاء کی تو کوئی شخص بھی اولاد کی دعاء کرے گا تو اسی سنت پر عمل ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ نے بھی اولاد کی دعاء کی، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بیبیاں اور اولاد عطاء فرمانے کا ذکر فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً﴾

اور تحقیق ہم نے بھیجے رسول آپ سے پہلے، اور ہم نے بنائے ان کیلئے بیبیاں اور بچے۔

❁ "عن سعد بن ابی وقاص قال اراد عثمان ان یتبتل فنهاه رسول الله ﷺ ولو اجازله ذلک لاختصینا" (مسلم)

سعد بن ابی وقاص ﷺ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت عثمان ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ بیبیوں سے علیحدہ ہوکرا کیلے زندگی گزاریں (کہ رب تعالیٰ کی طرف کامل رجوع ہو سکے) لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا (سعد کہتے ہیں) اگر آپ اجازت فرماتے، تو ہم اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔

❁ عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی وتزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ومن کان ذا طول فلینکح ومن لم یجد فعلیه بالصوم فان له وجاء" (ابن ماجہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نکاح میری سنت ہے جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں اور نکاح کرو بیشک میں تمہاری کثرت دوسری امتوں پر چاہتا ہوں جو شخص تم میں سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرے، اور جس کے پاس نکاح کرنے کی وسعت نہیں وہ روزے رکھے بیشک اس کی شہوت کو کم کرنے کا یہ ذریعہ ہے۔

حدیث شریف میں لفظ "وجاء" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے "خصیتین کی رگوں کو کوٹ کر" "نر" کی شہوت کو کم کر دینا یہ خصی کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے تو ہم حدیث پاک میں اس کا معنی یہ ہے " اراد ان الصوم

یقطع شھوۃ النکاح کما یقطعھا الوجاء " کہ روزہ نکاح کی شہوت کو اس طرح توڑ دیتا ہے جس طرح خصی کرنے سے شہوت نفسانیہ ٹوٹ جاتی ہے۔

حدیث پاک سے بعض جہلاء صوفیاء کا رد ہو گیا جنہوں نے یہ کہا " **الذی یطلب الولد احمق** " جو اولاد طلب کرتا ہے وہ احمق ہے۔" **وما عرف انه هو الغبی الاخرق** " حقیقت میں یہ قول غبی (کند ذہن) عقل سے دور لوگوں کا ہو سکتا ہے صاحب عقل تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالی کے حضور عرض کرتے ہیں ﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ اے میرے رب مجھے اپنے قرب کے لائق اولاد عطاء فرما۔ رب تعالی نے اپنے نیک بندوں کی شان بیان فرمائی:

﴿ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ ﴾

اور وہ جو عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک"

❁ **قال ﷺ لابی طلحة حین مات ابنه اعرستم اللیلة ؟قال نعم قال بارک الله لکمافی غابر لیلتکماقال فحملت "** (بخاری باب طلب الولد)

نبی کریم ﷺ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بیٹے کی وفات پر (تعزیت کرتے ہوئے) فرمایا کیا تم نے رات کو مجامعت کی ؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ) آپ نے فرمایا اللہ تعالی تمہارے رات کے فعل سے آنے والے (بچے) میں برکت عطاء فرمائے ان کی زوجہ حاملہ ہو گئی۔

❁ **"قال سفیان فقال رجل من الانصار فرأیت تسعة اولاد کلھم قد قرء واالقرآن"**

حضرت سفیان کہتے ہیں میں نے انصار میں سے ایک شخص کے بیٹے دیکھے جو سب ہی حافظ قرآن تھے۔

❁ **"عن انس بن مالک قال قالت ام سلیم یا رسول الله خادمک انس ادع الله له" فقال اللهم اکثر ماله وولده وبارک له فیمااعطیته "**

حضرت انس بن مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں (میری والدہ) ام سلیم نے عرض کیا یا رسول اللہ انس آپ کا خادم ہے آپ اس کیلئے دعاء فرمائیں تو آپ نے ان کیلئے دعاء کی اے اللہ اس کا مال زیادہ کر اور اسے زیادہ اولاد عطاء فرما اور جو تو نے اسے دے رکھا ہے اس میں برکت عطاء فرما۔

❁ **"وقال ﷺ اللهم اغفر لابی سلمة وارفع درجته فی المهدیین واخلفه فی عقبه فی الغابرین "** (بخاری و مسلم)

نبی کریم ﷺ نے عرض کیا اے اللہ ابو سلمہ کی مغفرت فرما اور ان کے درجات کو ہدایت پر قائم لوگوں میں

بلند فرما، اور ان کے پیچھے آنے والے (ان کے بچوں کو) ان کا جانشین بنا۔

❁ "وقال ﷺ تزوجوا لولود الودود فانی مکاثر بکم الامم" (ابو داود)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بچے جننے والی، محبت کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو بیشک دوسری امت پر تمھاری کثرت پر مجھے فخر ہوگا۔

"والاخبار فی هذا المعنی کثیرة تحث علی طلب الولد وتندب الیه لما یرجوه الانسان من نفعه فی حیاته وبعد موته"

اس معنی میں کثیر احادیث موجود ہیں جن میں اولاد کی طلب پر ابھارا گیا ہے اور ان احادیث سے نکاح کرنا اور اولاد کا طلب کر مستحب بلکہ سنت انبیاء کرام اور سنت صحابہ کرام کا ثبوت واضح طور پر پایا گیا ہے اور خاص کر کے انسان کو اولاد سے اپنی زندگی میں بھی نفع ہوتا ہے وہ تابعدار ہوتے ہیں خدمتگذار ہوتے ہیں اور انسان کو اس کی موت کے بعد بھی اولاد سے نفع ہوتا ہے، آیئے اس پر ارشاد مصطفوی ﷺ دیکھئے:

❁ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ اذامات الانسان انقطع عنه عمله الامن ثلاثة الامن صدقة جاریة او علم ینتفع به او ولد صالح یدعوله" (رواه مسلم، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین (اعمال) کے یعنی سوائے صدقہ جاریہ کے یا علم کے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو یا نیک اوولاد کے جو اس کے حق میں دعاء کرے۔

اس حدیث پاک کو نقل کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں "ولو لم یکن الا هذا الحدیث لکان فیه کفایة" اگر اور کوئی حدیث نہ ہوتی تو صرف یہ حدیث ہی اولاد کی طلب کے مستحب ہونے کیلئے کافی تھی۔ (تمام بحث ماخوذ از قرطبی)

فائدہ جلیلہ : حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہوا کہ انسان اپنی اولاد اور زوجہ کی ہدایت کی دعاء کرتا رہے اور ان کی صلاح (نیکی) پاک دامنی، اور احکام شرع کی پاسداری کی دعاء کرتا رہے، تاکہ وہ دین و دنیا میں اس کے مددگار ہوں ان سے دنیا میں اسے نفع حاصل ہو اور آخرت میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعاء میں عرض کیا ﴿وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا﴾ اے میرے رب تو اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔ اور عرض کیا ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اے میرے رب تو مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطاء فرما۔ اور رب تعالیٰ کے نیک

بندے رب سے یہ دعاء کرتے ہیں۔﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ اے ہمارے رب ہمیں دے ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک۔

یقیناً آنکھوں کی ٹھنڈک وہی ہوتے ہیں جو نیک ہوں فاسق وفاجر آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت وبال جان ہوتے ہیں انسان ان سے جلتا ہی رہتا ہے خوش نہیں ہوتا، اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کیلئے جو دعاء فرمائی اس میں خیر وبرکت کی دعاء کی " اللهم اكثر ماله وولده وبارك له فيه " اے اللہ اسے زیادہ مال اور زیادہ اولاد عطاء فرما اور اس میں اسے برکت عطا فرما۔ (ماخوذ از قرطبی)

اس تمام بحث سے واضح ہوا کہ اولاد اور زوجہ کی ہدایت کی دعاء کرتا رہے خصوصاً زوجہ کے خوش اخلاق ہونے کی دعاء کرے، بداخلاق زوجہ دنیا میں عذاب جہنم کی طرح ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے دعاء میں ادب کا لحاظ رکھا:

"وقال الماتريدى كانت تحدثه نفسه بذلك بان يهب الله له ولدا يبقى به الذكر اى يوم القيامة لكنه لم يكن يدعو مراعاة للادب"

ماتریدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں تو یہی بات آ رہی تھی کہ اللہ تعالی بیٹا عطاء فرمائے جس کا تذکرہ قیامت تک قائم رہے، یعنی منصب نبوت پر فائز ہو آپ یہ دعاء اگرچہ اشارۃ ،کنایۃ تو کر رہے تھے لیکن واضح طور پر یہ عرض نہیں کر رہے تا کہ ادب کا لحاظ قائم رہے۔

آپ پہلے ہی عادت کے خلاف بڑھاپے میں اولاد کی دعاء کر رہے تھے اولاد چونکہ عادت کے مطابق مذکر بھی ہوتی ہے اور مؤنث بھی اسلئے آپ مزید دعاء عادت کے خلاف صرف بیٹے کی صراحۃ (واضح طور پر) نہیں کر رہے تھے (البحر المحیط)

سوال: جب حضرت زکریا علیہ السلام کو پہلے بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالی کو ہر چیز کی قدرت حاصل ہے تو آپ نے پہلے اولاد کی دعاء نہیں، حضرت مریم کی کرامات کو دیکھ کر دعاء کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: قلنا قد يزداد الانسان رغبة فى الشئى اذا عاينه وان كان عالما نه قبله "

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو رب تعالی کی قدرت کا پہلے ہی علم تھا البتہ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر زیادہ رغبت اور زیادہ تمنا دل میں پیدا ہو جاتی ہے یہی صورت حال آپ کو بھی حاصل ہوئی۔ (روح البیان)

کیسی تفہیم! تفہیم کا معنی تو سمجھانا ہوتا ہے نہ کہ پھسلانا "تفہیم القرآن کی تحقیق جو حقیقت میں تخریق

ہے" دیکھئے حضرت زکریا جن کی تربیت میں وہ دی گئی تھیں غالبا رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کو ذکر بائبل کے پرانے عہدنامے میں آیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

جمہور مفسرین کرام نے حضرت زکریا علیہ السلام (جن کا یہاں ذکر ہے) کو نبی بیان فرمایا ہے "وکان زکریا راس الاحبار ونبیھم "حضرت زکریا علماء کے سردار تھے اور ان کے نبی تھے۔ (خازن)

آگے آنے والی آیات سے بھی آپ کے بنی ہونا ثابت ہو رہا ہے، یہ وہی زکریا ہیں جو نبی ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوۡرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۳۹)

(1) تو فرشتوں نے اسے آواز دی اور وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا بیشک اللہ تعالیٰ کو مژدہ دیتا ہے یحیٰی کا جو اللہ کی طرف کے ایک کلمہ کی تصدیق کرے گا اور سردار اور ہمیشہ سے عورتوں سے بچنے والا اور نبی ہمارے خاصوں میں سے۔

(2) تو آواز دی ان کو فرشتے نے اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ میں، بیشک اللہ بشارت دیتا ہے آپ کو یحیٰی کی، وہ تصدیق کرنے والا ہوگا ایک کلمہ کی جو اللہ کی طرف سے ہے، اور وہ سردار ہوگا، اور بہت بچنے والا ہوگا (خواہشات سے) اور نبی ہوگا ہمارے خاصوں میں سے۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام عبادت کی جگہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو آپ کی پاس حضرت جبریل آئے جنہوں نے آپ کو یحیٰی کی بشارت دی یعنی آپ کی دعاء کو اللہ تعالیٰ نے قبول کرلیا ہے اور میں آپ کو رب تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پیدا ہونے والے بیٹے یحیٰی کی خوشخبری دینے آیا ہوں، آپ کا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرے گا جو اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں، اور آپ کا بیٹا سردار ہوگا اور آپ کا بیٹا خواہشات نفسانیہ سے رکنے والا ہوگا اور ہمارے خاص قرب کے سزاوار لوگوں میں سے نبی ہوگا۔

﴿فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''تو آواز دی ان کو فرشتے نے۔''

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(فنادته الملائكة) ای من جنسهم كقولهم زيد يركب الخيل فان المنادى كان جبريل وحده''

''لفظ ملائکۃ'' سے مراد جنس ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''زید یرکب الخیل'' تو اس سے مراد ایک گھوڑا لیا جاتا ہے کہ ''وہ گھوڑے پر سوار ہے'' حالانکہ ''خیل'' اور ''ابل'' اسم جمع ہیں لیکن جنس کا اعتبار کرتے ہوئے مراد واحد ''ایک گھوڑا، ایک اونٹ'' لے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں ذکر اگرچہ ''ملائکۃ'' جمع ہے، لیکن جنس کا اعتبار

کرے ہوئے مراد واحد ہے، یعنی پکارنے والا صرف جبریل تھا۔ قرآن پاک میں ذکر فرمایا گیا ﴿الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ﴾ وہ کہا ان کو لوگوں نے، اس آیۂ مبارکہ میں ”الذین“ اور ”لھم“، جمع ہیں لیکن مراد ایک شخص ”نعیم بن مسعود“ ہے اور ”الناس“ سے مراد بھی ایک شخص ابوسفیان ہیں۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

راقم نے ترجمہ اسی وجہ سے مفرد والا کیا ہے، تاکہ یہ مذکور بحث طلباء کرام کے ذہن میں آجائے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ جمع والا کیا ہے ”فرشتوں“

اس کے متعلق مفضل بن سلمہ کہتے ہیں جب کسی رئیس کے متعلق خبر دینی مقصود ہو تو جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اصحاب بھی ہیں۔

”وکان جبریل علیہ السلام رئیس الملائکة وقل مابعث الاومعه جمع فجری علی ذلک قوله تعالیٰ“

حضرت جبریل فرشتوں کے سردار تھے، یہ جب تشریف لاتے تھے تو ان کے اعزاز کی خاطر ان کے ساتھ اور فرشتوں کی جماعت بھی ہوتی تھی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اس قول کے مطابق صیغہ جمع کا اور معنی بھی جمع کا ہے۔ طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ”ملائکة“ جمع مکسر ہے جمع کے ساتھ فعل مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اسی لئے یہاں ”نادت“ مؤنث کا صیغہ استعمال ہے۔

”فالنداء بمعنی القول“ ”فنادته“ قول کے معنی میں ہے، کہا اس کو فرشتوں نے، آواز دی اس کو فرشتوں نے، تقریباً ایک ہی مطلب ہے، اسی طرح پکارنا معنی بھی عام محاورہ کے مطابق ہے کیونکہ پکارنا قریب اور بعید دونوں کیلئے آتا ہے۔

﴿وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ﴾

”اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ“

اس جملہ کی دو ترکیبیں ہیں، ”وھو قائم“ ابتداء وخبر ”یصلی“ فی موضع رفع، ”وان شئت کان نصبا علی الحال من المضمر“ (قرطبی)

ایک ترکیب یہ ہے کہ ”وھو قائم“ مبتداء ہو، اور ”یصلی“ خبر ہو، اس لحاظ پر یہ جملہ مستقل ہے، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے ”اور وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا“

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ حال ہو، اور منصوب محلا ہو، اس ترکیب کے لحاظ سے راقم کا ترجمہ

ہے ''اس حال میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے عبادت کی جگہ''

محراب سے مراد کیا ہے؟

''المحراب موقف الامام من المسجد وهو قول جمهور المفسرين وقيل القبلة،والظاهر ان المحراب هو المحراب الذى قبله فى قوله(كلما دخل عليها زكريا المحراب)ففى المكان الذى رأى فيه خرق العادة فيه دعاء وفيه جاء ته البشارةوهذايدل على مشروعية الصلوة فى شريعتهم''

اگر چہ محراب کا معنی ''مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ'' بھی ہے،اور''قبلہ'' کو بھی محراب کہا جاتا ہے،لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں بھی محراب کا وہی معنی ہے جو پہلے ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ میں بیان کیا جا چکا ہے،یعنی وہ حضرت مریم کی عبادت والا کمرہ ہے،اسی میں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامات دیکھیں،اسی میں آپ نے بیٹے کیلئے دعاء کی،اوراسی میں آپ کو بشارت دی گئی۔

اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ پہلی شریعتوں میں بھی نماز ادا کی جاتی رہی،اور بعض حضرات نے ''صلوۃ'' کا معنی دعاء بھی کیا ہے،کہ آپ دعاء کررہے تھے تو آپ کو بیٹے کی بشارت دی گئی اگر ''یصلی'' کا معنی نماز لیا جائے،بلکہ زیادہ مناسب ہی یہی ہے کہ یہی معنی لیا جائے،تو اس سے ایک اور مسئلہ سمجھ میں آیا۔

''وفى الآية دليل على جواز نداء المتلبس بالصلوة وتكليمه وان كان فى ذلك شغل له عن صلوته''

اس آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آرہا ہے کہ اگر کوئی نماز ادا کررہا ہو،اسے کسی عذر اور مجبوری کی وجہ سے دوران نماز کوئی پیغام دے دیا جائے تو یہ جائز ہے،اگر چہ بظاہر اس کی توجہ نماز سے معمولی ہٹے گی۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

﴿وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي﴾ (وہ کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے تھے) اس سے مندرجہ ذیل مسئلہ واضح ہوا۔

نماز میں قیام فرض ہے:

قیام کے رکن اصلی ہونے میں ائمہ کرام کا اتفاق ہے،قیام رکن اصلی ہے،اورقراءت قیام کی زینت ہے،اسی لئے امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے لیکن امام کا قیام مقتدی کا قیام نہیں۔ (طحطاوی ص ۱۲۲)

قیام رکن ہے فرائض اور واجبات اور سنن (سنتوں) میں۔اگر کچھ رکعتیں ادا کرنے کی نذر مانی ہو تو وہ بھی واجب ہوتی ہیں،ان میں بھی قیام رکن ہے،اگر نفل شروع کر کے توڑ دیئے تھے اوران کی قضا کررہا ہو تو اس میں بھی

قیام رکن ہے۔ (طحطاوی ص۱۲۲)

اصل دلیل اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

"وقوموا للہ قانتین" ای مطیعین وقیل خاشعین وقیل ساکنین وعن ابن عمر ان القنوت طول القیام فی الصلوۃ"

اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالیٰ کیلئے مطیع ہو کر اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالیٰ کیلئے خشوع (عاجزی) سے اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے خاموش ہو کر۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قنوت کا معنی بیان کیا ہے "نماز میں لمبا قیام" اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے لمبے قیام سے۔ (ماخوذ از عنایہ بر فتح القدیر ج اص ۲۳۹)

اور اس پر دلیل ارشاد مصطفوی ﷺ ہے:

"عن عمران بن الحصین قال کانت بی بواسیر فسألت النبی ﷺ عن الصلوۃ فقال صل قائما فان لم تستطع فقاعدا فان لم تستطع فعلی جنب، زاد النسائی فان لم تستطع فمستلقیا لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا" (اخرجہ الجماعۃ الا مسلما)

عمران بن حصین کہتے ہیں مجھے بواسیر کی مرض لاحق تھی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا "نماز ادا کرو کھڑے ہو کر، اگر کھڑے ہونے کی تمہیں طاقت حاصل نہ ہو تو بیٹھ کر نماز ادا کرو، اگر بیٹھنے کی تمہیں طاقت نہ ہو تو کروٹ پر (لیٹ کر) نماز ادا کر لو۔ نسائی میں یہ بھی ذکر ہے، اور تمہیں اس کی بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو سیدھے لیٹ کر نماز ادا کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ (ماخوذ از فتح القدیر ج اص ۴۵۸)

قیام کی حد: "وحد القیام ان یکون بحیث اذا مدیدیہ لاینال رکبتیہ" قیام کی حد یہ ہے کہ وہ کم از کم اس مقدار میں کھڑا ہو کہ وہ اپنے ہاتھ لمبے (نیچے کی جانب) کرے تو اس کے ہاتھ گھٹنوں تک نہ پہنچ سکیں۔ قیام کی یہ حد ادنی درجہ کی ہے۔ اعلی درجے کی حد یہ ہے کہ بالکل سیدھا نیزے کی طرح کھڑا ہو، اس میں خشوع پیدا ہوتا ہے، عارف باللہ احمد زروق رحمہ اللہ نے اپنی پند و نصائح میں یہی ذکر فرمایا ہے۔ (مراقی الفلاح طحطاوی ص۱۲۲)

رکوع کے قریب تکبیر تحریمہ کہنے سے نماز ادا نہیں ہوگی:

"وشرط صحۃ الاتیان بالتحریمۃ قائما او منحنیا قلیلا قبل وجود انحنائہ بما ھو اقرب للرکوع"

تکبیر تحریمہ کے صحیح ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ کہے، یا معمولی جھکنے کی حالت میں تکبیر تحریمہ کہہ لی

تب بھی نماز صحیح ہوگئی اگر رکوع کی حالت میں یا رکوع کے قریب تکبیر تحریمہ کہی تو نماز نہ ہوئی اسلئے کہ قیام نہیں پایا گیا۔
(مراقی الفلاح بر طحطاوی ص ۱۱۹)

فائدہ: صرف تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں مل گیا۔ رکوع کی تکبیر نہ کہی تو نماز ہوگئی "لان مدرک الامام فی الرکوع لایحتاج الی تکبیر مرتین" جس شخص نے امام کو رکوع میں پالیا تو اسے دو تکبیریں کہنے کی محتاجی نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے امام کے ساتھ ملنے کیلئے قیام کی حالت میں یا قیام کے قریب ہی معمولی جھکنے کی حالت میں تکبیر کہی لیکن اس نے اس تکبیر میں رکوع کی تکبیر کی نیت کر لی تو پھر بھی نماز ہو جائے گی، کیونکہ وہ تکبیر، تحریمہ ہی سمجھی جائے گی، اس کی نیت کو لغو (بے فائدہ) قرار دیا جائے گا، وجہ یہی ہے کہ امام کو رکوع میں پالینے والا دو تکبیروں کا محتاج نہیں۔
(ماخوذ از مراقی الفلاح بر طحطاوی بتصرف ص ۱۱۹)

مسئلہ: رکوع کے بعد کھڑا ہونا جسے فقہاء کرام "قومہ" کہتے ہیں، واجب ہے، فرض نہیں۔

مسئلہ: کھڑے ہونے کی طاقت کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر ادا کرنا جائز ہے، البتہ کھڑے ہونے والے کی بنسبت بیٹھنے والے کو ثواب آدھا ملے گا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "**صلوۃ القاعدانصف القائم**" بیٹھنے والی کی نماز کھڑے ہونے والے کی بنسبت آدھی ہے یعنی ثواب آدھا ہے۔

امام کا محراب میں کھڑے ہونے کا حکم:

"**یکرہ قیام الامام بجملته فی المحراب لاقیامه خارجه والکراهة لاشتباه الحال علی القوم واذاضاق المکان فلا کراهة وهکذااذاانتفی الاشتباه انتفت الکراهة وذهب الاکثر الی ان العلة التشبه باهل الکتاب لانهم یخصون امامهم بمکان وحده والتشبه بهم مکروه**"

امام کا محراب میں مکمل طور پر کھڑا ہونا مکروہ، اور پاؤں باہر ہوں تو مکروہ نہیں، مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام جب مکمل طور پر محراب میں کھڑا ہوگا تو اس کا حال لوگوں پر مشتبہ ہوگا، اگر امام کا حال لوگوں پر مشتبہ نہ ہوا تو مکروہ نہیں، اسی طرح اگر جگہ کی تنگی ہو تو پھر بھی مکروہ نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ جگہ کی تنگی کی صورت میں جب لوگ ایک ہی نماز جماعت سے پڑھ رہے ہوں تو اگلی صف والوں کی پیٹھ پر پچھلی صف والے سجدہ کریں تو جائز ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ امام کا محراب میں کھڑا ہونا اس لئے مکروہ ہے کہ اہل کتاب سے مشابہت پائی گئی ہے کیونکہ ان کے امام اپنے لئے مکان مخصوص کرتے تھے، اسلئے

ان سے مشابہت مکروہ ہے۔ (مراقی الفلاح طحطاوی ص ۱۹۹)

"عن ابی موسی الجهنی قال قال رسول الله ﷺ لا یزال امتی بخیر مالم یتخذ وافی مساجدهم مذابح کمذابح النصاری"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "المذابح" کا معنی بیان کیا ہے یعنی" المحاریب"

حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ ابو موسی جہنیؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت ہمیشہ خیر پر رہے گی جب تک مساجد میں وہ نصاری کی طرح محراب نہیں بنائیں گے۔ (روح المعانی)

مقام توجہ: مساجد کے یہ محراب جو آجکل ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے اور نہ ہی آپ کے زمانہ میں نصاری کے محراب تھے۔ اس محراب کی ابتداء تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں ہوئی اس لئے جس محراب سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا وہ یہ تھا۔ "ان اهل الكتاب انما يخصون الامام بمكان مرتفع" بیشک اہل کتاب امام کو بلند مقام پر کھڑا کرنے سے خاص کرتے تھے۔ (طحطاوی ص ۱۹۸)

واضح ہوا کہ اس موجودہ محراب سے رسول اللہ ﷺ نے منع نہیں فرمایا، ہاں البتہ فقہاء کرام نے قیاس کیا ہے کہ نصاری اپنے اماموں کیلئے خاص چبوترہ بناتے تھے، اس لئے ہمارے امام مکمل طور پر محراب میں نہ کھڑے ہوں۔

راقم کا موقف تو یہ ہے کہ زمانہ کے بدلنے سے کئی احکام بدل جاتے ہیں، جب محراب کو مسجد سے جدا سمجھا جاتا تھا اس وقت تو کسی حد تک یہ قول درست ہوسکتا تھا، لیکن آجکل تو محراب کو مسجد کا حصہ سمجھا جاتا ہے، جدا نہیں سمجھا جاتا، اسلئے نصاری سے مشابہت والی علت تو اٹھ گئی۔

البتہ امام کی حالت کے مشتبہ ہونے والی بات باقی رہتی ہے لیکن اس سے مکروہ تنزیہی ثابت ہوگا وہ بھی جگہ کی تنگی پر ختم ہوجائے گا، اور اشتباہ کے نہ ہونے کی صورت میں بھی کراہیت ثابت نہیں ہوگی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

﴿اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ "بیشک اللہ بشارت دیتا آپ کو یحیی کی۔"

"سورۃ مریم" کی آیہ نمبر ے میں اس بشارت کا ذکر یوں فرمایا ﴿یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا﴾ "اے زکریا! ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحیی ہے، اس کے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا" یعنی اللہ تعالی نے آپ کو بیٹے کی بشارت دی۔ نام بھی خود ہی رکھا اور اس سے پہلے وہ کسی اور کا نام بھی نہ تھا۔

یحییٰ نام کی وضاحت:

بعض اہل علم نے کہا کہ یہ نام عجمی ہے۔اس لحاظ پر طلباء کرام یہ خیال کریں کہ یہ لفظ غیر منصرف ہوگا،ایک سبب علم ہوگا اور دوسرا عجمہ ۔طلباء کرام یہ بات بھی نہ بھولیں کہ اس کے آخر میں الف مقصورہ تانیث کیلئے نہیں کہ وہ اکیلے غیر منصرف کا دوسببوں کے برابر سبب بن جائے۔اور بعض حضرات نے کہا یہ لفظ عربی ہے اس صورت میں بھی غیر منصرف ہوگا ایک سبب علمیت اور دوسرا وزن فعل ہوگا۔اگر عربی ہو تو اس نام کے معنی کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ''منهم من وجه تسميته بذلك بان الله تعالى احيابه عقرامه''

بعض حضرات نے آپ کے نام یحییٰ کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے آپ کی ماں کے بانجھ پن کو ختم کر کے رحم کو نئی زندگی عطاء فرمائی تو آپ کا نام یحییٰ رکھ لیا گیا کیونکہ اس کا معنیٰ زندہ کرنا۔

(۲) وروی عن ابن عباس ﷺ ومنهم من وجه تسميته بذلك بان الله تعالى احياقلبه بالايمان''

حضرت ابن عباس ﷺ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ کا نام یحییٰ اس لئے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت ایمان سے سرفراز کر کے حیات جاودانی عطاء فرمادی۔دنیا میں زندگی اور قبر میں بھی زندگی اور حشر میں بھی زندگی۔

(۳) ''وروی عن قتادة وقيل سمى بيحيى لانه علم الله سبحانه ان يتشهد والشهداء احياء عذربهم يرزقون''

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ آپ کا نام یحییٰ اس لئے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہی علم تھا کہ آپ کو شہید کر دیا جائے گا۔شہید زندہ ہوتے ہیں،اللہ کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

(۴) ''لدنه يحيٰ بالعلم والحكمة للظين يؤتا هما''

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ علم وحکمت ذریعے نہیں قلبی وروحانی زندگی کا آپ کو بھی چونکے علم وحکمت عطا کیے گئے تو رب تعالیٰ نے آپ کا نام ہی یحییٰ رکھ دیا

(۵) ''وقيل لان يحيى به الناس بالهدى''

اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہدایت کے ذریعہ لوگوں کو دولت ایمان کی وجہ سے زندہ کر دیا،اسلئے آپ کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا۔ (از روح المعانی)

(۶) ''وقال الحسن بن المفضل حيى بالعصمة والطاعة''

حسن بن المفضل فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو معصوم بنایا،گناہوں سے پاک وصاف رکھا،اور اپنا مطیع بنایا جب

آپ کو عصمت وطاعت سے زندہ رکھا تو آپ کا نام بھی یحییٰ رکھ دیا گیا۔

(۷) "وقال مقاتل سمی یحیی لانه احیاه بین شیخ وعجوز"

اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کا نام یحییٰ اس لئے رکھا گیا آپ کو ان کے والدین کے بڑھاپے کی عمر میں زندہ کیا گیا، یعنی آپ کو پیدا کیا تو آپ کے والدین کی وہ عمر نہ تھی جس عمر میں اولاد ہوتی ہے۔

(۸) ایک عجیب وجہ سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ کبھی نام ضد پر نیک تفاؤل (نیک شگونی) کیلئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ جو شخص سانپ سے ڈسا جائے اسے سلیم کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ اسے سلامتی میں رکھے، حالانکہ اصل میں وہ لدیغ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کسی مقصد کو نہ حاصل کر رہا ہو تو اسے "مفاز" کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیاب فرمائے حالانکہ وہ "متارک" ہوتا ہے،

اسی طرح آپ کا نام یحییٰ رکھا گیا، اصل وجہ یہ ہے کہ بیان کیا گیا کہ آپ پر بظاہر وفات آنی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی حیات جاودانی ہونی ہے، کہ آپ کو شہید کر دیا جائے، لوگ اسے بظاہر موت سمجھیں گے، اور واقع میں وہ زندگی ہوگی۔ (ماخوذ از البحر المحیط بوضاحت)

(۹) "وقال مقاتل اشتق اسمه من اسم الله تعالی حی فسمی یحیی"

مقاتل کا ہی ایک اور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی "حی" ہے۔ اس سے آپ کا نام مشتق کر کے یحییٰ رکھا گیا۔

(۱۰) آپ کا نام کتاب اول میں "حیا" تھا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا زوجہ ابراہیم علیہ السلام کے نام سے "یا" لے کر آپ کی پیدائش سے پہلے کئی سال آپ کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا۔ حضرت سارہ کا اصلی نام یسارہ تھا۔ یہ عجمی لفظ تھا عربی میں اس کا معنی تھا "لاتلد" (نہ جننے والی عورت) جب آپ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو آپ کا نام بھی سارہ بن گیا، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے نام سے ایک لفظ "یا" کیوں حذف کر دیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبریل نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمہارے نام سے لفظ "یا" کو حذف کر کے تمہاری نسل سے کئی سال بعد میں پیدا ہونے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دے دیا گیا ہے کیونکہ نام اصل میں "**حیا**" تھا۔ (قرطبی)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"رأیت فی انجیل متی انه علیه السلام کان یدعی یوحنا المعمدانی لما انه کان یعمدا لناس فی زمانه علی یحکیه کتب النصاری"

میں نے انجیل میں دیکھا کہ یحییٰ علیہ السلام کو یوحنا معمدانی کہا جاتا تھا کہ آپ نصاری کی کتب کو جو بیان کرتے تھے ان پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ (روح المعانی)

﴿مُصَدِّقًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''وہ تصدیق کرنے والا ہوگا ایک کلمہ کی جو اللہ کی طرف سے ہوگا''

''کلمہ'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں یعنی وہ بچہ جس کی تمہیں خوشخبری دی جا رہی ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کریں گے۔

''وکان یحیی اکبر من عیسی بستة اشهر ثم قتل یحیی قبل ان رفع عیسی الی السماء'' (روح البیان)

حضرت یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھانے جانے سے پہلے ہی آپ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ ''وکان یحیی اول من صدق بعیسی و آمن به'' سب سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے اور اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کی تصدیق کی اور ان کے نبی ہونے پر ایمان رکھا۔ (شیخ زادہ)

''کان یحیی اول من صدق بعیسی وشهد انه کلمة من الله''

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ وہ اللہ کی طرف سے ایک کلمہ ہیں۔ (البحر المحیط)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ماں کے پیٹ میں ہی تصدیق کر دی:

''اخرج احمد عن مجاهد قال ''قالت امراة زکریا لمریم انی اجد الذی فی بطنی یتحرک للذی فی بطنک''

امام احمد نے مجاہد سے روایت ذکر کی کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ نے حضرت مریم کو کہا میں اپنے پیٹ میں وہ چیز پاتی ہوں جو حرکت کر رہا ہوتا ہے اس چیز کی جو تمہارے پیٹ میں ہے۔

''واخرج ابن جریر من طریق ابن جریج عن ابن عباس قال کان یحیی وعیسی ابنی خالة وکانت ام یحیی تقول لمریم انی اجد الذی فی بطنی یسجد للذی فی بطنک''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں خالہ زاد بھائی تھے حضرت یحییٰ کی والدہ ایک مرتبہ حضرت مریم کو کہنے لگیں جو میرے پیٹ میں ہے وہ سجدہ کرتا ہے اسے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔

''فذالک تصدیقه له'' یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تصدیق ہے، جو انہوں نے

اپنی پیدائش سے پہلے کی، یعنی تین ماہ دونوں کا حمل میں رہنے کا مشترک ہے، اگرچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ میں چھ ماہ پہلے آئے۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمة الله" کہنے کی وجوہ:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا کئے گئے تو اس وجہ سے آپ کو کلمہ کہہ لیا گیا جس طرح مخلوق کو خلق کہہ لیا جاتا ہے۔

(۲) "والثانی انه تکلم فی الطفولیة" دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے بچپن میں کلام کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچپن کی حالت میں ہی کتاب کا علم دے دیا، آپ نے بچپن میں بلیغ وعظیم کلام فرمایا۔ مبالغہ کے طور پر متکلم کو کلمہ کہہ دیا گیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان جود" حالانکہ وہ جواد ہوتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ کلمہ جس طرح معانی وحقائق کا فائدہ دیتا ہے "کذلک عیسی یرشدنا الی الحقائق والاسرار الالهیة فسمی کلمة" اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام حقائق اور اسرار الہیہ کی طرف راہنمائی فرماتے تھے تو آپ کو کلمہ کہا گیا یعنی اسی طرح جس طرح قرآن پاک کو روح کہا گیا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ قرآن پاک کو روح کیوں کہا گیا ہے؟ اسلئے کہ یہ بھٹکنے سے بچاتا ہے اور انسان کو قلبی زندگی عطاء فرماتا ہے جیسا کہ روح انسان کی ظاہری زندگی کا سبب ہے۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے کئی انبیاء کرام نے ان کی آمد کی بشارت دی "فلما جاء قیل هذا هو تلک الکلمة" جب عیسیٰ علیہ السلام آ گئے تو لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ وہی کلمہ ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا وہ آنے والا ہے، اب وہ آ گیا، یہ مجاز عام طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسا کہا جائے "قد جاء قولی و جاء کلامی" میری بات آ گئی، میرا کلام آ گیا، یعنی میں جو کہتا تھا وہ میرا قول سچا ہو گیا، واقعہ اسی طرح کا درپیش آ گیا جیسے میں کہتا تھا۔ اس کی نظیر (مثال) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ (اور اسی طرح ثابت ہو گیا تمہارے رب کا کلمہ کافروں پر کہ بیشک وہ آگ والے ہیں)

(۵) "والخامس ان الانسان قد یسمی بفضل الله و لطف الله فکذا عیسی علیہ السلام کان اسمه العلم کلمة الله وروح الله"

جس طرح بعض لوگوں کا نام فضل اللہ اور لطف اللہ ہوتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا نام کلمۃ اللہ، اور روح

اللہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے ''بکلمة من الله'' کا معنی کتاب لیا، یعنی توراۃ وانجیل، لیکن جمہور علماء کرام کا وہی مذہب ہے جو ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (کبیر)

﴿وَسَيِّدًا﴾ ''اور وہ سردار ہوگا۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو ساتھ ہی ان کے اوصاف بھی بیان کئے گئے، ایک وصف ان کا ''سید'' (سردار) ہونا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وصف ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی حاصل ہے بلکہ جس طرح آپ کے درجات تمام انبیاء کرام سے اعلیٰ اور ارفع ہیں، اسی طرح آپ کی سیادت بھی تمام انبیاء کرام کی سیادت سے افضل ہے۔

''سید'' کثیر معانی میں استعمال ہے:

(۱) "قال ابن عباس السيد الكريم" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''سید'' کا معنی ہے، کریم ہونا۔

(۲) "وقال قتادة الحليم" حضرت قتادہ کہتے ہیں ''سید'' کا معنی ہے حلیم (بردبار، حوصلہ مند) ہونا۔

(۳) "وقال عكرمة من لا يغلبه الغضب" حضرت عکرمہ کہتے ہیں ''سید'' کا معنی ہے ''وہ شخص جس پر غضب غالب نہ ہو''

(۴) "وقال الضحاك الحسن الخلق" ضحاک نے کہا ہے جس کے اچھے اخلاق ہوں وہ ''سید'' ہے۔

(۵) "وقال سالم التقی" سالم نے کہا ہے متقی، پرہیزگار کو ''سید'' کہا جاتا ہے۔

(۶) "وقال ابن زيد، الشريف" ابن زید نے کہا ہے شریف شخص کو ''سید'' کہا جاتا ہے۔

(۷) "وقال ابن المسيب، الفقيه العالم" ابن مسیب نے کہا ہے کہ فقیہ اور عالم کو ''سید'' کہا جاتا ہے۔

(۸) "وقال احمد بن عاصم الراضی بقضاء الله" احمد بن عاصم کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو اسے ''سید'' کہا جاتا ہے۔

(۹) "وقال الخليل المطاع الفائق اقرانه" خلیل کہتے ہیں جس کی اطاعت کی جائے اور اپنے ساتھیوں پر اسے فوقیت حاصل ہو وہ ''سید'' کہلاتا ہے۔

(۱۰) "وقال ابوبكر الوراق، المتوكل" ابوبکر وراق کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے کو ''سید'' کہا

جاتا ہے۔

(۱۱) "وقال الترمذی العظیم الھمة" ترمذی کہتے ہیں عظیم ہمت والے کو "سید" کہا جاتا ہے۔

(۱۲) "السید من لا یحسد من قولھم الحسود لا یسود" جو شخص حسد نہ کرے اسے "سید" کہا جاتا ہے، اہل علم کا مشہور قول ہے، حسد کرنے والے سردار نہیں بن سکتے۔

(۱۳) "وقال ابو اسحاق السید الذی یفوق فی الخیر قومه" ابو اسحاق نے بیان فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی قوم پر برتری رکھے اسے "سید" کہا جاتا ہے۔

(۱۴) "وقال بعض اھل اللغة السید المالک الذی تجب طاعته" بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ مالک جس کی فرمانبرداری ضروری ہو، اسے "سید" کہا جاتا ہے، "ولھذا قیل للزوج وقیل سید الغلام" اسی وجہ سے خاوند کو سردار کہا جاتا ہے کہ زوجہ پر اس کی اطاعت لازم ہے، اور غلام کے مالک کو سید کہا جاتا ہے کہ غلام پر مالک کی فرمانبرداری لازم ہوتی ہے۔

(۱۵) "وقال سلمة عن الفراء السید المالک والسید الرئیس والسید الحکیم والسید السخی" فراء کہتے ہیں، مالک اور رئیس اور حکیم اور سخی کو سید کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قوموا الی سیدکم" {تم اپنے سردار (سعد) کیلئے کھڑے ہو جاؤ} (بخاری، مسلم، مسند احمد)

حدیث شریف میں "سیدکم" کا معنی "رئیسکم والمطاع" کیا گیا ہے، یعنی تم اپنے رئیس اور مطاع (جس کی فرمانبرداری کی جائے) کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے "سید" کہا ہے۔

"ان ابنی ھذا سید ولعل اللہ یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین"

(بخاری، ترمذی، مسند احمد ابن ماجہ ابن حبان من حدیث ابی بکرة)

بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔

"وقال الزمحشری السید الذی یسود قومه ای یفوقھا فی الشرف"

زمخشری نے بیان کیا ہے جو اپنی قوم کا سردار ہو اور شرافت میں ان سے فوقیت رکھے وہ سید ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام میں یہ تمام اوصاف پائے گئے، اسی وجہ سے آپ کو سید کہا گیا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

"قال الھروی اسید ھو الذی یفوق قومه فی الخیر وقال غیرہ ھو الذی یفزع الیه فی النوائب

والشدائد فیقوم بامرهم ویحتمل عنهم مکارهم ویدفعها عنهم" (النووی شرح المسلم ج ۲ ص ۲۵۳)

ہروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سید وہ ہے جو اپنی قوم میں بھلائیوں کے لحاظ پر فوقیت رکھتا ہو، دوسرے اہل علم نے کہا ہے کہ سید وہ ہے جس کی طرف مصائب وآلام میں لوگ رجوع کریں، وہ ان کے معاملات کو درست کرے اور ان کی مشکلات کو اٹھائے اور ان کے مصائب کو مندفع (دور) کرے۔

تنبیہ: "ولیس السید هو المالک فحسب لانه لو کان کذلک لجاز ان یقال سیدالدبة وسید الثوب کما یقال سید العبد"

سید کا معنی جو "مالک" کیا گیا ہے، اس سے مراد صرف غلام اور لونڈی کا مالک ہے، ہر چیز کے مالک کو سید نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کپڑے کے مالک کو "سید الثوب" نہیں کہا جاتا، اور سواری کے مالک کو "سید الدابة" نہیں کہا جاتا۔
(احکام القرآن للجصاص)

اعتراض: "وقدروی ان وفد بنی عامر قدموا علی النبی ﷺ فقالوا انت سید نا وذوالطول علینا فقال النبی ﷺ هو الله تکلموا بکلامکم ولا یستهو ینکم الشیطان"

نبی کریم ﷺ کے پاس بنی عامر کا ایک وفد آیا۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا آپ ہمارے سردار ہیں۔ آپ ہم پر طاقت رکھتے ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا سردار تو اللہ تعالی ہے تم اپنی بات کرو، شیطان تمہیں خواہشات میں نہ مبتلاء کرے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو "سید" کہنے سے منع فرمایا تو کس طرح کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ "سید" ہیں۔

جواب: "وقد کان النبیا افضل السادة من بنی آدم ولکنه رآهم متکلفین بهذاالقول فانکره علیهم" نبی کریم ﷺ بنی آدم میں افضل السادات (تمام سرداروں سے افضل) ہیں لیکن جب آپ نے دیکھا کہ وہ تکلف سے آپ کی مدح میں یہ قول ذکر کر رہے ہیں تو آپ نے ان کو منع فرمایا یعنی حضور ﷺ کی شان دل اور محبت سے بیان کی جائے، بناوٹ اور تصنع آپکو پسند نہیں تھے، بناوٹ اور تصنع کی ناپسندیدگی پر واضح ارشاد مصطفوی دیکھئے:

"قالان ابغضکم الی اشرثارون المتشدقون المتفیهقون"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے میرے نزدیک وہ لوگ ناپسند ہیں جو ادھر ادھر سے باتیں پھیر کر کرتے ہیں، اور باچھیں کھول کر ٹیڑھی کر کے باتیں کرتے ہیں، اور باتیں بکھیر کر کرتے ہیں۔

مسئلہ بہت واضح ہوا کہ "فکرہ لھم تکلف الکلام علی وجہ التصنع" نبی کریم ﷺ نیت بنی عامر کے بناوٹ والے قول کو ناپسند کر کے فرمایا کہ "سردار تو اللہ تعالیٰ ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

جصاص رحمہ اللہ کے ایمان افروز جواب کے بعد کوئی اور جواب کی ضرورت تو باقی نہیں رہی، تاہم راقم کے نزدیک اگر یہ جواب دیا جائے کہ بنی عامر کے لوگوں کو جو آپ نے ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقی "سید" اللہ تعالیٰ ہے۔ رب تعالیٰ کی عطاء سے جو آپ کو سیادت حاصل ہے اس کی آپ نے نفی نہیں فرمائی۔

منافق کو "سید" کہنا منع ہے:

"وقدروی عن النبی ﷺ انہ قال لا تقولوا للمنافق سیدا فانہ ان یک سیدا فقد ھلکتم"

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ منافق کو سردار نہ کہو، اگر منافق سردار بن گیا تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

منافق کو "سید" کہنے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے "لانہ لا تجب طاعتہ" کہ اس کی طاعت واجب نہیں۔

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا﴾ "اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہم اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کے کہنے پر چلے، تو انہوں نے ہمیں راہ سے بہکا دیا۔" یہ کافروں کے کلام کی حکایت رب قدوس نے بیان فرمائی، (کہ جب ان کو جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا) تو وہ کہیں گے ہم قوم کو سرداروں اور بڑی عمر کے لوگوں نے گمراہ کر دیا ہے کیونکہ ہم ان کی تابعداری کرتے رہے۔ اس "آیۃ کریمہ" میں کفار کو سردار کہا گیا ہے، حدیث پاک میں منافق کو سید کہنے سے منع کیا گیا ہے، ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

جواب: کافروں چونکہ قوم کے سرداروں کو اس درجہ میں سمجھا ہوا تھا کہ ان کی طاعت واجب ہے، حقیقت میں تو وہ سرداری (سیادت) کے مستحق نہ تھے "فکانوا عندھم وفی اعتقاداتھم ساداتھم" وہ لوگ ان کافروں کے عقیدہ میں سردار تھے، حقیقت میں سادات نہیں تھے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمْ﴾ ان کو ان کے معبود بے پرواہ نہ کر سکے، "ولم یکونوا آلھۃ ولکنھم سموھم آلھۃ" ان کے معبودان باطلہ کوئی معبود تو نہیں تھے، البتہ آیۃ کریمہ میں ان کو معبود کہا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے معبود تھے، حقیقت میں معبود نہیں تھے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

﴿وَحَصُوْرًا﴾ ''اور بہت بچنے والا ہوگا خواہشات سے۔''

''(وحصورا)ای مبالغافی حصر النفس وحبسها عن الشهوات مع القدرة''

''حصور'' کا معنی اپنے نفس کو بہت زیادہ روکنے والا خواہشات سے، باوجود اس کے کہ وہ ان خواہشات کی طاقت بھی رکھتا ہو۔

حضرت یحیی علیہ السلام کا بچپن میں دوسرے بچوں سے گذر ہوا، انہوں نے آپ کو کھیلنے کی دعوت دی ''فقال ماللعب خلقت'' تو انہوں نے کہا مجھے کھیل کیلئے پیدا نہیں کیا گیا۔ (روح البیان)

''فقیل کان لایأتی النساء مع القدرة'' بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ کو ''حصورا'' کے لقب سے نوازا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ عورتوں سے بچنے والے تھے باوجود اس کے کہ آپ کو عورتوں سے جماع کرنے کی طاقت حاصل تھی۔ بعض حضرات نے بیان کیا کہ ''انه کان عنینا ای عاجزا عن اتیان النساء'' آپ نامرد تھے یعنی عورتوں سے جماع کرنے پر قادر ہی نہیں تھے''

''وهذاالقول عندنا فاسد لان هذا من صفات نقصان وذکر صفة النقصان فی معرض المدح لا یجوز''
یہ قول ہمارے نزدیک فاسد ہے بیشک یہ صفت نقصان ہے، اور صفت نقصان کا مقام مدح میں ذکر کرنا جائز نہیں۔

اس آیۂ کریمہ میں تو حضرت یحیی علیہ السلام کی صفات بیان ہو رہی ہیں، عیوب نہیں بیان کئے جارہے۔ (کبیر)

''وقد بان لک من هذاان عدم القدرة علی النکاح نقص، وانما الفضل فی کونها موجودة ثم یمنعها''
یہ بات واضح ہے کہ نکاح کی قدرت حاصل نہ ہونا نقص ہے، ''هذه نقیصة وعیب ولا یلیق بالانبیاء علیهم السلام'' اور نقص اور عیب انبیاء کرام کی شان کے لائق نہیں، فضیلت اس میں ہے کہ طاقت اور قدرت حاصل ہو لیکن اللہ تعالی کی عبادت میں مشغول ہونے کی وجہ سے عورتوں کی طرف رغبت کم ہو۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

زیادہ محققین اس طرف ہیں کہ اگر ''حصورا'' کا معنی عورتوں سے بچنے والا معنی لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا:

''انه الذی لایأتی النساء لا للعجز بل لعفة والزهد وذلک لا ن الحصور هوالذی یکثرمنه حصر النفس''

آپ کا عورتوں کے پاس نہ آنا عجز کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عفت اور زہد کی وجہ سے تھا، کیونکہ حصورا سے کہا جاتا ہے جو خود اپنے نفس کو زیادہ روکنے والا ہو، جسے طاقت ہی حاصل نہ ہو وہ حصور نہیں ہوگا بلکہ محصور ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

"فالاولی ان یقال انه کان منوعاحابسا نفسه عن اتباع الشهوات والملاهی"

بہتر یہ ہے کہ "حصورا" کا معنی یہ لیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو خواہشات، کھیل وغیرہ سے بہت زیادہ روکنے والا ہوگا۔ (مظہری)

ابھی جو مظہری سے بیان کیا ہے یہی روح المعانی، صابونی، ابن کثیر وغیرہ میں مختلف الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔

اعتراض: حضرت یحییٰ علیہ السلام کا عنین (نامرد) ہونا تو حدیث پاک سے ثابت ہے کس طرح اس سے انکار کیا جائے گا، حدیث پاک کو دیکھئے:

"واخرج ابن جریر وابن المنذروابن ابی حاتم وابن عساکر عن عمرو بن العاص عن النبی ﷺقال ما من عبد یلقی اللہ الاذاذنب الایحیی بن زکریا فان یقول وسیدا وحصورا قال وانما کان ذکر مثل ھدبة الثوب واشار بانملته" (درمنثور)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی بندہ ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا مگر یہ کہ وہ گنہگار ہوگا، سوائے حضرت یحییٰ بن زکریا کے، بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ﴿سَیِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (وہ سردار ہوں گے اور عورتوں سے بچنے والے) اور آپ نے فرمایا ان کا ذکر (آلہ تناسل) کپڑے کے دھاگوں کی طرح ہے، آپ نے اپنی انگلیوں سے پوروں اشارہ فرمایا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ آپ عنین تھے۔

جواب: حدیث پاک کی سند میں وہ قوت نہیں جس سے معترض حضرات اپنا موقف ثابت کرسکیں ضعیف حدیث سے انبیاء کرام کے نقائص وعیوب کیسے ثابت ہوسکیں گے جبکہ قوی حدیث سے بھی ثابت کرنا ممکن نہیں، راوی کو جھوٹا کہنا آسان ہے، نبی کے عیوب ثابت کرنا مشکل ہے۔

پھر حدیث مکمل طور پر تاویل کی محتاج ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام گناہوں سے پاک وصاف ہیں، اس لئے مطلقاً حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بغیر ہر شخص رب تعالیٰ سے ملاقات کرے تو وہ گنہگار رہو ایسا ممکن نہیں، جس طرح حدیث شریف کے پہلے حصہ سے تمام انبیاء کرام مستثنیٰ ہیں۔

اسی طرح دوسرے حصہ کا مطلب بھی واضح ہے کہ آپ کو عورتوں سے اس طرح رغبت حاصل نہیں تھی جیسا کہ نامرد انسان جس کا آلہ تناسل کپڑے کے دھاگے کی طرح ہو تو اسے رغبت نہیں ہوتی، اکثر طور پر حروف تشبیہ ذکر نہیں ہوتے لیکن حقیقت میں تشبیہ ہوتی ہے، جیسا کہ کہا جائے "زید اسد"، تو حقیقت میں تو یہ "زید کالاسد" ہے۔ (راقم)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی کی تھی یا نہیں؟

اگر چہ بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا ہے "حصورا" کا جب مطلب یہ ہے کہ آپ عورتوں سے بچنے والے ہوں گے تو اس سے پتہ چلا کہ آپ نے شادی نہیں کی تھی لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ آپ نے شادی کی تھی، آپ کی اولاد بھی تھی، آیئے تفاسیر کو دیکھیں:

"والحصور الممتنع من النساء مع القدرة عليهن وقدتزوج مع ذلک ليكون اغض لبصره" (روح البیان)

حصور کا معنی ہے عورتوں سے رک جانا باوجود اس کے کہ وہ عورتوں سے جماع پر قادر ہو آپ نے شادی کی تھی تا کہ آپ کی نظر نیچے رہے (کہیں نہ اٹھے)

"والمقصود انه مدح ليحيى بانه حصور ليس انه لاأتى النساء بل معناه كما قاله هو وغيره انه معصوم من الفواحش والقاذورات،ولا يمنع ذلک من تزويجه بالنساء الحلال وغشيا نهن وايلادهن بل قد يفهم وجودالنسل له من دعاء زكريا المتقدم حيث قال(رب هب لي من لدنک ذرية طيبة)كأنه قال ولداله ذرية ونسل وعقب"والله سبحانه وتعالى اعلم"

مقصد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح بیان کرنا ہے کہ آپ "حصور" ہوں گے، عورتوں کے پاس نہ جانا اس کا مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گناہوں سے اور خواہشات سے بہت بچنے والے ہوں گے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے حلال عورتوں سے نکاح نہیں کیا اور ان سے وطی نہیں کی اور آپ کی اولاد نہیں بلکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء سے ہی یہ سمجھ آ رہا ہے کہ آپ کی اولاد تھی، کیونکہ انہوں نے ﴿ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ کی دعاء کی جس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب مجھے وہ پاکیزہ اولاد عطاء فرما جس کی نسل باقی رہے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ "اور نبی ہوگا میرے خاصوں میں سے"

"يعني انه من اولاد الانبياء الصالحين" یعنی وہ انبیاء کرام جو رب تعالیٰ کے قرب کے سزاوار ہوں گے ان کی اولاد سے ہوں گے اور خود بھی نبی ہوں گے۔ (خازن)

اس سے واضح ہو گیا کہ یہ تمام واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام کا چل رہا ہے جو نبی تھے، یہ کہنا کہ وہ نبی نہیں تھے جن کا تذکرہ یہاں، یہ باطل قول ہے۔ (راقم)

حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی گئی اور اس سے اعلیٰ بشارت اس بیٹے کے نبی ہونے کی دی

گئی، کیونکہ انسانوں میں نبوت سے بڑھ کر کوئی اور وصف نہیں۔ (از صابونی)

(ونبیا من الصالحین)ای من کبار المرسلین القائمین بحقوقک و حقوق عبادک"

وہ بڑے مرسلین جو تیرے حقوق اور بندوں کے حقوق کو پورا کرنے والے ہیں، ان میں سے ہی یہ نبی ہوں گے۔ (صاوی)

حضرت زکریا علیہ السلام جب عبادت خانہ میں عبادت میں مشغول تھے تو آپ کے پاس ایک سفید کپڑوں والا شخص آیا، تو آپ گھبراہٹ میں مبتلاء ہو گئے یعنی اچانک پریشان ہو گئے کہ یہ کون ہے "فناداہ جبریل (یٰزکریا انّ اللّٰہ یُبَشِّرُکَ بِیَحْییٰ﴾ تو آپ کو جبریل نے نداء دی، اے زکریا! بیشک اللہ تمہیں یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ (خازن)

جبریل کا حضرت زکریا کے پاس آنا اور ہم کلام ہونا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ حضرت زکریا نبی تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

آیۂ کریمہ میں استعمال کچھ الفاظ کی وضاحت:

زکریا: "عجمی" لفظ ہے، الف ممدودہ کے مشابہ ہے، اسی مشابہت کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا ہے اور اگر اس لفظ کو نکرہ بنائیں تو پھر بھی غیر منصرف رہتا ہے، اگر علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا تو نکرہ بنانے کی صورت میں منصرف ہو جاتا۔

نادت: لفظ مشتق ہے "نداء" سے "نادی ینادی مناداۃ، النداء، رفع الصوت "نداء کا معنی ہے، آواز کو بلند کرنا، "فلان اندی صوتا" فلاں شخص بلند آواز والا ہے۔

"دار الندوہ" مشورہ (میٹنگ) کا مقام، وہاں چونکہ لوگوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو اسلئے اسے "دار الندوہ" کہا جاتا ہے، یعنی اصلی معنی یہ ہے" آوازوں کے بلند ہونے کا گھر" "منتدی" اور "نادی" کا معنی ہے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ "مجلس" جب یہ لفظ ناقص یائی ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے" بارش ہونا" "الندی، المطر، یقال "ندی یندی ندیا" مہموز اللام اور ناقص یائی "ندأ" اور "ندی" کے باب مفاعلہ میں صیغوں کا رسم الخط ایک جیسا ہوتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

"من الصالحین" میں لفظ "من" میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ "من" ابتدائیہ ہو اس وقت معنی ہوگا وہ نبی ہوں کے نبیوں میں پیدا ہوں گے، یعنی انبیاء کرام ان کے والد ہوں گے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "من" تبعیضیہ ہو، اب معنی یہ ہوگا کہ وہ انبیاء کرام میں سے نبی ہوں گے۔" ومعناہ علی الاول ذونسب وعلی الثانی

معصوم" پہلے احتمال پر یہ ثابت ہوگا کہ آپ صاحب نسب ہیں انبیاء کرام کی اولاد سے ہیں۔ اور دوسرے احتمال میں آپ کا معصوم ہونا ثابت ہوگا کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک یہ اس وقت بحث مراد ہوگی جب صرف "من الصالحين" کو دیکھا جائے، جب مکمل "ونبيا من الصالحين" کو دیکھا جائے تو پہلے احتمال میں بھی آپ کا معصوم ہونا سمجھ آئے گا۔

حضرت یحیی علیہ السلام کی والدہ کا نام:

الیساع تھا جن کو الیسابات بھی کہا جاتا تھا، بیت المقدس جس طرح مسجد اقصی کو کہا جاتا ہے، اسی طرح اس علاقہ اور خطہ کو بھی بیت المقدس کہہ لیا جاتا ہے، یہودی اصطلاح میں اس علاقہ کا نام یروشلم ہے۔ (ماخوذ از حقانی بوضاحت)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ (آیۃ نمبر ۴۰)

(۱) بولا اے میرے رب میرا لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو پہنچ گیا بڑھاپا اور میری عورت بانجھ فرمایا اللہ یونہی کرتا ہے جو چاہے۔

(۲) عرض کیا اے میرے رب کس طرح ہوگا میرا لڑکا، حالانکہ پہنچ گیا مجھے بڑھاپا اور میری عورت بانجھ، فرمایا اسی طرح اللہ تعالی کرتا ہے جو چاہے۔

مختصر مطلب: جب حضرت زکریا علیہ السلام کو جبریل نے رب تعالی کی طرف سے بشارت دی کہ اللہ تعالی تمہیں ایک بیٹا عطاء کرے گا جس کا نام یحیی ہوگا تو آپ نے بطور تعجب کہا میرا بیٹا کیسے ہوگا جب میری عمر بڑھاپے کی ہے اور میری زوجہ بانجھ ہے تو رب تعالی کا ارشاد آپ کو پہنچایا گیا کہ رب تعالی جو چاہے وہی کرتا ہے، اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں، اور اسے کوئی اس کی مشیت سے روک نہیں سکتا۔

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ﴾ ''عرض کیا اے میرے رب کس طرح ہوگا میرا لڑکا۔''

"قال" کا فاعل ضمیر غائب ہے جس سے مراد حضرت زکریا علیہ السلام ہیں یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے رب تعالی کے حضور عرض کیا۔

"رب" اصل میں "یا ربی" ہے، اے میرے رب، زیادہ مشہور اور صحیح قول یہی ہے کہ یہ خطاب رب تعالی کو ہی ہے۔ اے میرے مالک! اے میرے رب! تاہم بعض حضرات نے کہا یہ خطاب حضرت جبریل علیہ السلام کو ہے، اس صورت میں معنی ہوگا ''اے میرے سردار!''

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ﴾ میں لفظ ''انی'' کے دو معنی ہیں ''یعنی من این یکون، و کیف یکون لی غلام'' ایک معنی یہ ہے کہ ''انی'' این کے معنی میں ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میری عورت تو بانجھ ہے، میرا لڑکا کہاں سے آئے گا۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ ''انی'' کیف کے معنی میں ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میرا لڑکا کس طرح ہوگا۔ (خازن)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے پہلا معنی ذکر فرمایا۔ راقم نے دوسرا معنی ذکر کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو دونوں معنی ذہن نشین ہو جائیں۔

بظاہر حضرت زکریا علیہ السلام کے اس قول پر وہم یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو بشارت دے دی گئی تو پھر آپ کا یہ عرض کرنا تو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ کو اللہ تعالی کے وعدہ پر یا اللہ تعالی کی قدرت پر شک تھا، یہ کیسے ممکن ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا

''لم یشک زکریا علیہ السلام فی وعد اللہ وفی قدرتہ وانما قال ذلک علی سبیل الاستفھام والاستعلام والمعنی من ای جھة یکون لی الولد ایکون بازالة العقر عن زوجتی ورد شبابی اویکون ونحن علی حالنا من الکبر والضعف فاجابہ بقولہ کذلک اللہ یفعل مایشاء''

حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالی کے وعدہ اور قدرت میں کوئی شک نہ تھا، بلکہ آپ نے سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی غرض سے یہ سوال کیا، کہ اللہ تعالی میری زوجہ کا بانجھ پن دور کرے اور میری جوانی لوٹا کر ہمیں بیٹا عطاء کر دے گا۔ یا کہ ہمیں اپنے حال پر رکھتے ہوئے بیٹا عطاء کرے گا۔ یہ تھا تعجب، یہ تھی سوال کی وجہ، تو رب تعالی کی طرف سے جواب دیا گیا: ''اسی طرح کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے''

مطلب یہ تھا کہ تم تعجب نہ کرو، اللہ تعالی چاہے تو اسی حال میں تمہیں رکھتے ہوئے اپنی قدرت کاملہ سے بغیر

اسباب کے بیٹا عطاء کر دے، یہ اس کی قدرت سے بعید نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام قدرت کو ظاہری اسباب کے تحت کر دیا ہے، اس لئے تمھاری زوجہ کے بانجھ پن کو دور کر کے تمہاری جوانی کو واپس لوٹا کر تمہیں بیٹا عطاء کر دے تو یہ بھی اس کی قدرت اور مشیت ہے۔ (خازن)

بعض حضرات نے ایک اور وجہ بیان کی ہے، اس پر عکرمہ اور سدی کی ایک روایت پیش کی ہے۔

"لما سمع زکریا نداء الملائکة جاء ہ الشیطان وقال یا زکریا ان الصوت الذی سمعت لیس ھو من اللہ تعالیٰ وانما ھو من الشیطان ولو کان من اللہ لا وحاہ الیک کما یوحی الیک فی سائر الامور فقال ذلک دفعاللوسوسة"

جب حضرت زکریا علیہ السلام نے فرشتوں کی نداء سنی تو آپ کے پاس شیطان آیا۔ اس نے کہا اے زکریا یہ آواز جو تم نے سنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کی جانب سے ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو وہ تمھاری طرف وحی بھیجتا جیسے آپ کی طرف باقی امور میں وحی آتی ہے تو حضرت زکریا علیہ السلام نے اس وسوسہ پر کہا "اے میرے رب میرا لڑکا کیسے ہوگا"

اعتراض: یہ کس طرح جائز ہے کہ انبیاء کرام پر ملائکہ کے کلام اور شیطان کے کلام میں اشتباہ ہو؟ اگر ہم اسے جائز رکھیں " لارتفع الوثوق باخبارھم عن الوحی السماوی " تو انبیاء کرام کی آسمانی خبروں پر اعتماد ہی اٹھ جائے گا۔

جواب: اجیب عن ھذا الاعتراض بانہ لما دلت الدلائل علی سدق الانبیاء فیما یخبرون بہ عن اللہ تعالیٰ بواسطة الملک فلا مدخل للشیطان فیہ وذلک فیما یتعلق بالدین والشرائع فاما ما یتعلق بمصالح الدنیا وبالولد فقد یحتمل فیہ حصول الوسوسة فسأل زکریا ذلک لنزول ھذہ الوسوسة "

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب دلائل واضح طور پر انبیاء کرام کی صداقت پر دلالت کررہے ہیں جو وہ خبر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے کے واسطہ سے وہ سچی ہی سچی خبر ہوتی ہے اس میں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ وہی خبریں ہیں جن کا تعلق دین وشریعت سے ہے۔ البتہ دنیاوی خبروں میں یا بیٹے کی بشارت میں وسوسہ ڈالا جا سکتا ہے، اسی وسوسہ کی وجہ سے آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا۔ (خازن)

تنبیہ: خازن کا یہ جواب راقم کے نزدیک ضعیف ہے شیطان نبی کو وسوسہ نہیں ڈال سکتا، تفصیل پہلے پارہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں دیکھیں۔

بشارت کے وقت حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر:

مختلف اقوال ملتے ہیں، کہ آپ کی عمر بانوے سال تھی، یا ننانوے سال تھی یا ایک سو بیس سال تھی۔ راقم کے نزدیک آسان بات یہ ہے کہ آپ کی عمر نوے سال سے زائد تھی۔ آپ کی زوجہ کی عمر بھی نوے سال سے زائد تھی۔ (ماخوذ از خازن)

آپ کی یہ عرض عجز کی وجہ سے تھی:

"وقیل المعنی بای منزلة استوجب هذا و انا و امرأتی علی هده الحال علی وجه التواضع"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آپ نے عاجزی کے طور پر رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں اور میری زوجہ کس مرتبہ کی وجہ سے یہاں اس مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں، کہ ہمیں بڑھاپے میں اولاد حاصل ہوئی، یہ تو صرف تیرا کرم ہی کرم ورنہ عقل سے یہ بعید ہے ظاہری اسباب اولاد کے بالکل نہیں پائے گئے۔ (ماخوذ از قرطبی)

آپ کے سوال کرنے کی اور وجہ یہ تھی کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے ناامید ہو جائے تو وہ:

" اذاتفق ان حصل له ذلک المقصود فربما صار کالمدهوش من شدة لافرح فیقول کیف حصل هذا ،ومن این وقع هذا کمن یری انسانا وهبه اموالا عظیمة یقول کیف وهبت هذه الاموال ومن این سمحت نفسک بهبتها"

اس چیز کے حاصل ہونے پر اتنا خوش ہوتا ہے کہ یوں سمجھا آتا ہے کہ وہ مدہوش ہو گیا ہے، وہ اسی خوشی کے حال میں یوں کہتا ہے "یہ کیسے حاصل ہو گیا، یہ کہاں سے آ گیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی کو کثیر مال بطور عطیہ دے تو وہ یہ کہے" تم نے اتنا بڑا مال مجھ غریب کو کیسے دے دیا تم نے یہ اتنا مال دے کر کیسے مجھ پر سخاوت کر دی۔

اسی طرح جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کا ملنا بعید سمجھا ہوا تھا، جب آپ کو بیٹے کی بشارت دی گئی "فصار من عظم فرحه وسروره قال ذلک الکلام" تو آپ نے بہت زیادہ خوش ہونے پر یہ کلام کیا، اے میرے رب تیرا اتنا کرم کیسے ہو گیا، مجھ بوڑھے کو کیسے اولاد حاصل ہو گی۔ (ایضاً)

اور وجہ یہ ہے کہ جب مالک اپنے غلام کو کوئی چیز دینے کے متعلق جب وعدہ کرتا ہے جس چیز کا وہ بڑا مشتاق تھا اور مالک سے مانگ بھی چکا تھا، تو مالک سے یہ سن کر کہ وہ چیز تمہیں دینے والا ہے۔

" فالتذ السائل بسماع ذلک الکلام فربما اعادالسوال لیعید ذلک الجواب فحینئذیستلذبسماع تلک الاجابة مرة اخری "

تو وہ سائل لذت محسوس کرتا ہے اس کی بات کو سن کر کہ ہاں مجھے یہ نعمت ملنے والی ہے، وہ پھر سوال کرتا ہے کہ ہاں واقعی مجھے یہ نعمت ملنے والی ہے تو پھر اسے جواب دیا جاتا کہ ہاں تمہیں یہ نعمت عطاء کی جارہی ہے تو وہ سن کر اور زیادہ خوش ہوتا ہے اور لذت محسوس کرتا ہے۔

" فالسبب فی اعادة زکریا هذا الکلام یحتمل ان یکون من هذا الباب "

حضرت زکریا علیہ السلام کا اس کا کلام کو لوٹانے کی وجہ بھی یہ ہو سکتی ہے کہ آپ رب تعالی کے کلام کو بار بار سننا چاہتے ہوں اگر چہ وہ بواسطہ جبریل تھی۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ ﴾ "حالانکہ پہنچ مجھے بڑھاپا۔"

"کبر" مصدر ہے کہا جاتا ہے " کبر الرجل یکبر کبرا" یعنی وہ شخص بوڑھا ہو گیا۔ علم معانی والوں نے کہا ہے " کل شیٔ صادفته وبلغته فقد صادفک وبلغک " ہر وہ چیز جس کو تم نے پالیا ہو، اور تم اس تک پہنچ گئے ہو، تحقیق اس چیز نے تمہیں پالیا ہے اور وہ تم تک پہنچ گئی ہے، اسلئے یہ کہنا بھی درست ہے " بلغت الکبر " میں نے بڑھاپے کو پالیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں استعمال بھی ہوا ہے ﴿ وقد بلغتُ مِنَ الْكِبَرِ ﴾ اور یوں کہنا بھی درست ہے ﴿ بلغنی الکبر ﴾ مجھے پہنچ بڑھاپا۔

اسی کے قریب عرب کا قول ہے " لقیت الحائط ،وتلقانی الحائط " میں دیوار کو ملا، اور دیوار مجھے ملی لیکن یہ خیال کیا جائے کہ " بلغت البلد " (میں شہر میں پہنچا) کہنا تو جائز ہے، لیکن " بلغنی البلد " (مجھے شہر پہنچ گیا) نہیں کہا جاتا۔ وجہ فرق یہ ہے کہ بڑھاپا ایسی چیز ہے کہ جو انسان کو طلب کر رہی ہوتی ہے، وہ اپنے وقت میں انسان کے پاس آ کر رہتا ہے اور انسان بھی جب اپنی عمر کے کئی سال گذار لیتا ہے تو بڑھاپا اس کے پاس آتا ہے۔

"اما البلد فلیس کالطالب للانسان الذاهب فظهر الفرق "

لیکن شہر وہاں جانے والے انسان کو طلب نہیں کر رہا ہوتا اس لئے دونوں مثالوں میں فرق واضح ہو گیا کہ "بلغنی الکبر " کہنا جائز ہے "بلغنی البلد" کہنا جائز نہیں۔ (کبیر)

﴿ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ﴾ "اور میری زوجہ بانجھ ہے۔"

" عاقر " اس عورت کو کہتے جس کی اولاد نہ ہوتی ہو۔ یہ لفظ مؤنث کیلئے استعمال ہوتا ہے اسلئے " عاقرة " کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر چہ فعل مذکر کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کہا جاتا " عقر الرجل " فلاں مرد کی مجامعت سے حمل نہیں

ٹھہرتا۔ یہ بھی خیال رہے ''عقر'' باب ضرب، سمع اور کرم پر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے ''رمل عاقر'' ریت میں اگانے کی طاقت نہیں۔

﴿ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ ﴾ ''فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

''کذلک'' میں کاف تشبیہ کیلئے ہے اور '' ذلک '' کا اشارہ فعل کی طرف ہے یعنی جب دونوں میاں بیوی بوڑھے ہوں تو ان کو اولاد عطاء کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت ہے اسی طرح اللہ ہر کام کرتا ہے جو چاہے۔
(البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(كذلك الله) مبتدأو خبر، اى على نحو هذه الصفة الله، '' ويفعل مايشاء '' بيان له اى يفعل مايريد من الافاعيل الخارقة للعاده '' (کشاف)

''کذلک'' مبتداء ہے اور ''اللہ'' خبر ہے معنی یہ ہے کہ اسی صفت پر ہے اللہ اور '' یفعل مایشاء '' اس کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ عادت کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے جو ارادہ فرماتا ہے وہی کرتا ہے۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَةً قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ﴾ (آیۃ نمبر ۴۱)

(1) عرض کی اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی کردے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تین دن تو لوگوں سے بات نہ کرے مگر اشارہ سے، اور اپنے رب کی بہت یاد کر اور کچھ دن رہے اور تڑکے اس کی پاکی بول۔

(2) عرض کیا اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی نشانی فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تم نہیں کلام کر سکو گے لوگوں سے تین دن سوائے اشارہ کے اور یاد کرو اپنے رب کو بہت، اور تسبیح بیاں کرو دن ڈھلے اور صبح سویرے۔

مختصر مطلب:

حضرت زکریا علیہ السلام بیٹے کی بشارت پر خوش ہو کر رب تعالی کے حضور عرض کیا اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی بنا دے جس سے مجھے پتہ چل جائے کہ میری زوجہ کا حمل قرار پکڑ گیا تاکہ میں تیری اور زیادہ عبادت کر سکوں تو رب تعالی نے فرمایا کہ تمھاری علامت یہ ہے کہ تم لوگوں سے کلام کرنے کی قدرت نہیں رکھو گے، ہاں البتہ اشارہ سے تم لوگوں کو اپنا مطلب سمجھا سکو گے اور اللہ تعالی کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو، سورج ڈھل جانے کے بعد شام تک اور فجر سے چاشت تک صبح سویرے رب تعالی کی تسبیحات ذکر کرو۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَةً﴾ ''عرض کیا اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی نشانی۔''

''(آیۃ) ای علامۃ تدل'' ''آیۃ'' کا معنی ہے علامت یعنی اے میرے رب بنا میرے لئے کوئی علامت نشانی جو دلالت کرے کہ میری زوجہ کا حمل ٹھہر گیا ہے۔

اس سوال میں چند وجوہ و مقاصد پائے گئے:

(۱) وانما سألها لان العلوق امر خفی لا یوقف علیه فاراد ان یطلعه الله علیه لیتلقی تلک النعمة الجلیلة مذ حین حصولها بالشکر ولا یؤخره الی ان یظهر ظهورا معتادا''

آپ کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ نطفہ کا رحم (بچہ دانی) میں قرار پکڑنا حمل کا ٹھہر جانا یہ مخفی امر ہے اس پر کوئی واقف نہیں

ہوسکتا اسلئے سوال کیا کہ اللہ تعالی ان کو مطلع کردے تا کہ وہ نعمت جلیلہ جب ہی آپ کو حاصل ہو اسی وقت اللہ تعالی کا شکر ادا کریں ایسا نہ ہو کہ جسطرح عام عادت کے مطابق کبھی تاخیر ہو جاتی ہے، اس میں تاخیر نہ ہو۔ (روح البیان)

سبحان اللہ! کیسا ایمان افروز قول بیان کیا گیا کہ اے مسلمان! جب تجھے نعمت ملے تو اللہ تعالی کی تو عبادت کر اور شکریہ ادا کر نعمت کے حصول پر ناچ، گانا، بھنگڑا ڈالنا، عورتوں کے گریبان کھولنا لڑکوں اور لڑکیوں کا مل کرنا چنانچہ غیر شرعی امور ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ طلباء کرام کیلئے مختصر عبارت یاد کرنے کے قابل یہ ہے:

(قال) یعنی زکریا (رب اجعل لی آیۃ) ای علامۃ اعلم بھا وقت حمل امرأتی فازید فی العبادۃ والشکر لک"

عرض کیا، یعنی زکریا نے، اے میرے رب بنادے میرے لئے کوئی نشانی جس سے مجھے پتہ چل جائے کہ میری عورت حاملہ ہو چکی ہے تا کہ اس کا میں شکریہ جلدی ہی ادا کروں اور عبادت زیادہ کروں۔

(۲) "وانما سألها استعجالاللسرور" آپ نے یہ سوال اس لئے کیا تا کہ جلدی خوشی حاصل ہو جائے۔ (روح المعانی)

یعنی بیٹے کی بشارت تو مل چکی ہے جب حمل کے قرار کا پتہ چل جائے گا تو اور ہی زیادہ اور جلدی خوشی حاصل ہوگی۔

(۳) (قال رب اجعل لی آیۃ) علامۃ اعرف بھا الحبل لا ستقبلہ بالبشاشۃ واشکر وتریح مشقۃ الانتظار"

عرض کیا اے میرے رب بنادے میری لئے کوئی نشانی تا کہ میں اس کے ذریعے حمل کو پہچان لوں تا کہ اس کا خوشی اور شکر سے استقبال کروں اور انتظار کی مشقت زائل ہو جائے۔ (بیضاوی)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"جعل" ھنا بمعنی صیر لتعدیہ الی مفعولین و (لی) فی موضع المفعول الثانی"

"اجعل" ماخوذ ہے "جعل" سے اس مقام میں "جعل" مرکب ذکر ہے کیونکہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے اس کا ہے "صیر" (پھیر دیا، بنادیا) اس کا ایک مفعول "لی" ہے جو مفعول کے درجہ میں ہے اور ایک مفعول "آیۃ" ہے جس کا صراحۃ مفعول ہونا واضح ہے۔ (از قرطبی)

﴿قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾

"فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تم نہیں کلام کرسکو گے تین دن سوائے اشارہ کے۔"

اس آیۃ کریمہ میں "ثلاثۃ ایام" ذکر کیا ہے کہ تم لوگوں سے تین دن کلام نہیں کرسکو گے اور سورۃ مریم میں "ثلاث

لیال ''ذکر فرمایا ہے کہ تم لوگوں سے تین راتیں کلام نہیں کرسکو گے چونکہ عربی کا ضابطہ یہ ہے.

''ان احدالعددین من الجمیع عند الاطلاق یعقل به مقداره من الوقت الأخر''

دن اور رات میں سے کسی ایک کے ذکر کرنے سے دوسرا خود بخود سمجھ آ جاتا ہے، مقصد مقدار وقت بیان کرنا ہوتا ہے دن یا رات کی تخصیص مراد نہیں ہوتی۔

فیعقل من ثلاثة ایام ثلاث لیال معها و من ثلاث لیال ثلاثة ایام''

اسی ضابطہ کے تحت جس آیۃ کریمہ میں تین دنوں کا ذکر ہے اس کے ساتھ تین راتیں بھی مراد ہیں اور جس آیۃ کریمہ میں تین راتوں کا ذکر ہے اس کے ساتھ تین دن مراد ہیں۔ہاں اگر دن اور راتیں علیحدہ بیان کرنی مقصود ہوں تو علیحدہ علیحدہ ان کو ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ عاد کے عذاب کا ذکر کیا تو فرمایا۔

﴿ وامّاعادٌ فاُهلكُوا بريحٍ صرصرٍ عاتيةٍ o سخّرها عليهم سبع ليالٍ وّثمانية ايّامٍ حُسُوْمًا﴾

(سورۃ الحاقۃ، آیۃ نمبر ۶،۷)

(اور رہے عاد وہ ہلاک کیے گئے نہایت سخت گرجتی آندھی سے وہ ان پر قوت سے لگا دی سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار)

اس آیۃ کریمہ میں دنوں اور راتوں کا ذکر کیا کیونکہ اگر صرف سات راتوں کا ذکر ہوتا تو دن بھی سات سمجھ آتے حالانکہ دن تو آٹھ تھے اور اگر صرف آٹھ دنوں کا ذکر ہوتا تو راتیں بھی آٹھ سمجھ آتیں، حالانکہ راتیں تو سات تھیں

(از احکام القرآن للجصاص)

(ان لاتکلم الناس ثلاثة ایام لارمزا) (تمھاری نشانی یہ ہے) کہ تم کلام نہیں کرسکو گے لوگوں سے تین دن سوائے اشارہ کے)'' ان لاتکلم الناس '' کا مطلب ہے'' ان لاتقدر علی تکیمهم ''تمہیں لوگوں سے کلام کرنے کی قدرت وطاقت ہی حاصل نہیں ہوگی، یہ سلسلہ تین دن اور تین راتوں تک جاری رہے گا۔ہاں البتہ لوگوں کو کوئی بات سمجھانی مقصود ہوئی تو اشارہ سے ان کو سمجھا سکو گے۔

یہ تین دن لوگوں سے کلام کرنے کی طاقت آپ سے ہٹا لینے کا مقصد یہ تھا '' وانما جعلت آیته ذلک لتخلیص المدة لذکر الله وشکره قضاء لحق النعمة '' کہ آپ کو اللہ تعالی کے ذکر اور شکر کا زیادہ سے زیادہ موقع مل جائے، آپ اللہ تعالی کی نعمت کے حاصل ہونے پر اپنی طاقت کے مطابق اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں، اگرچہ حق ادا کرنا مشکل ہے۔

(از روح البیان)

فائدہ جلیلہ : ''قال ابن زید ان زکریا علیه السلام لما حملت زوجه منه یحیی اصبح لا یستطیع ان یکلم احدا وهو مع ذلک یقرأ التوراة ویذکر الله تعالی فاذاارادمقاولة احد لم یطقه '' (قرطبی)

ابن زید کا قول یہ ہے کہ جس رات حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ حضرت یحیی علیہ السلام سے حاملہ ہوگئی تو اسی صبح سے آپ کو طاقت نہ

رہی کہ آپ لوگوں میں سے کسی سے کلام کریں، اگر آپ کلام کرنا بھی چاہتے تو آپ کلام نہ کر سکتے، البتہ آپ توراۃ ان دنوں میں بھی پڑھتے رہے اور اللہ تعالی کا ذکر کرتے رہے اس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

اس ایک نشانی دو فائدے حاصل ہو گئے ایک یہ کہ آپ کو پتہ چل گیا کہ گذشتہ رات میری زوجہ کا حمل قرار پکڑ گیا اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہو گیا کہ آپ اللہ تعالی کے ذکر تسبیح وتہلیل کا موقع زیادہ حاصل ہو گیا۔ پھر یہ واقعہ چند معجزات پر مشتمل ہے۔

" احدها ان قدرته علی التكم بالتسبيح والذكر وعجزه عن لاتكلم بامور الدنيا من اعظم المعجزات "

ایک ان میں سے یہ ہے کہ بیشک آپ کو اللہ تعالی کی تسبیحات اور اس کے ذکر کی طاقت حاصل ہونا، اور امور دنیا کی کلام سے عاجز ہونا آپ کا عظیم معجزہ ہے۔

"وثانيها ان حصول ذلك المعجز فی تلك الايام المقدرة مع سلامة البنية واعتدال المزاج من جملة المعجزات "

تین دن آپ کے لئے جو رب تعالی نے مقرر فرمائے ان دنوں میں اگرچہ آپ لوگوں سے کلام نہ کر سکے تین آپ کی زبان صحیح سلامت رہی اور مزاج مستقل رہا یہ علیحدہ معجزہ ہے۔

"وثالثها ان اخباره بانه متی حصلت هذه الحالة فقد حصل الولد ثم ان الدم خرج علی دفق هذالخبريكون ايضا من المعجزات"

آپ کا تیسرا معجزہ اس واقعہ سے یہ سمجھ آیا کہ آپ کو اللہ تعالی نے خبر دی کہ جب تمھاری یہ کیفیت ہو گی تو تم سمجھ جانا کہ حمل نے قرار پکڑ لیا ہے پھر آپ نے یہ خبر اہل خانہ کو بھی دے دی جب آپ کی خبر کو اہل خانہ نے سچا پایا تو آپ کا معجزہ ثابت ہو گیا۔ (کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام کی غیبی خبریں جو واقع کے مطابق اترتی ہیں یعنی ہر غیبی خبر سچی ہوتی ہے، کسی میں واقع کے مطابق نہ ہونے کا احتمال نہیں پایا جاتا، یہ معجزات ہی ہیں۔

رمز کا معنی :

رمز کا معنی ہے "حرکت کرنا" اسی وجہ سے دریا کو "راموز" کہا جاتا ہے کہ اس کا پانی حرکت کرتا ہے، آیۃ کریمہ میں رمز سے مراد کیا ہے؟ اس مین چند اقوال ہیں:

" احدها انه عبارة عن الا شارة كيف كانت باليد او الرأس او الحاجب او العين او الشفة "

ایک یہ ہے کہ اس سے مراد اشارہ کرنا ہے مطلقاً خواہ وہ ہاتھ سے اشارہ ہو، یا سر سے ہو، یا ابرو سے ہو، یا آنکھوں سے ہو یا ہونٹوں سے ہو۔

"والثانی انه عبارة عن تحریک الشفتین باللفظ من غیر نطق وصوت"

دوسرا قول یہ ہے کہ آیۂ کریمہ میں "رمز" کا مطلب یہ ہے کہ ہونٹوں کو ہلانا بغیر بولنے اور بغیر آواز کے

"والثالث وهو انه کان یمکنه ان یتکلم بالکلام الخفی واما رفع الصوت بالکلام فکان ممنوعا"

تیسرا قول یہ ہے کہ ہوسکتا ہے آیۂ کریمہ میں رمز کا یہ مطلب ہو کہ تم آہستہ آہستہ بہت مخفی آواز سے بات کرسکو گے لیکن تمہاری آواز کسی کو سنائی نہیں جائے گی۔ (کبیر)

راقم کے نزدیک پہلا قول جمیع اقوال پر مشتمل ہے دوسرے اقوال اس میں سمٹ کر آگئے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الا رمزا" مستثنیٰ منقطع ہے جبکہ "کلام" کا معنی عام محاورہ کے مطابق بولنا لیا جائے اور "رمز" کا معنی اشارہ کیا جائے تو اس صورت میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں یعنی ماقبل کے حکم میں داخل نہیں اسے ہی مستثنیٰ منقطع کہا جاتا ہے۔ اور اگر کلام کا معنی لیا جائے جو مقصد کو ادا کرے اور "رمز" کا معنی سر اور ہاتھ سے اشارہ لیا جائے جو مقصد پر دلالت کرے تو مستثنیٰ متصل ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے حکم میں داخل ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

فائدہ: آیۂ کریمہ سے یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ کئی مقامات میں اشارہ کو کلام کے قائم مقام سمجھا گیا ہے اس مسئلہ کو نبی کریم ﷺ کے ایک فیصلہ سے تائید حاصل ہے آپ نے ایک حبشیہ لونڈی سے پوچھا "این اللہ" اللہ کہاں ہے؟ "فاشارت برأسها الی السماء" تو اس نے سر سے اشارہ آسمانوں کی طرف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے مالک کو ارشاد فرمایا "اعتقها فانها مؤمنة" "تم اسے آزاد کردو بیشک یہ مؤمنہ (ایمان والی) ہے۔

یہ آپ نے اس وقت فیصلہ فرمایا جب وہ شخص اپنی ایمان والی غلامہ کو آزاد کرنا چاہتے تھے نبی کریم ﷺ نے اشارہ پر اسلام کا حکم نافذ فرمایا جس سے اس کی دیانت ثابت ہوگئی اس کی جان اور مال محفوظ ہوگئے اس کا جنتی ہونا اور جہنم سے پاک ہونا سمجھ آگیا "فیجب ان تکون الاشارة عاملة فی سائر الدیانة" لهذا ثابت ہوگیا کہ تمام دینی کاموں میں اشارہ کا اعتبار کیا جائے گا، اس پر احکام مرتب ہوں گے۔

ابن قاسم امام مالک رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں "ان الاخرس اذا اشار بالطلاق انه یلزمه"

بیشک گونگا جب طلاق کا اشارہ کرے تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔

"وقال الشافعي رحمه الله في الرجل يمرض فيختل لسانه فهو كالا خرس في الرجعة والطلاق"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک شخص ایسا مریض ہو جائے کہ اس کہ زبان بند ہو جائے تو اس پر طلاق اور طلاق سے رجوع کرنے میں گونگے والے احکام جاری ہوں گے یعنی اس کے اشارہ سے دی ہوئی طلاق واقع ہو جائے گی، اور اشارہ سے کیا ہوا رجوع ثابت ہو جائے گا۔

"وقال ابو حنيفة رحمه الله ذلك جائز اذا كانت اشارته تعرف وان شك فيها فهي باطل"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا یہ جائز ہے جبکہ اشارہ معروف ہو، اور اگر اشارہ میں شک ہو تو باطل ہے، یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے شرط سے حکم کو پختہ کر دیا کہ ہر اشارہ کو طلاق نہ سمجھ لیا جائے۔

طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ مسئلہ کہ اشارہ معتبر ہے اس سے طلاق اور رجوع ثابت ہوگا یہ استحسان سے ثابت ہے نہ کہ قیاس سے۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيرًا﴾ "اور یاد کرو اپنے رب کو بہت۔"

"كثيرا" اى ذكرا كثيرا" بہت زیادہ یاد کرو اس یاد کرنے سے مراد زبان سے یاد کرنا ہے یا دل سے؟ راقم کے نزدیک یہ حکم مطلق ہے ہر قسم کے ذکر کو شامل ہے یعنی زبان سے یاد کرو اور دل سے بھی یاد کرو۔

فائدہ جلیلہ : اگر مراد دل کا ذکر ہو تو اس لحاظ پر بہتر ہوگا۔

"وذلك لان المستغرقين في بحار معرفة الله عادتهم في الاول ان يواظبوا على الذكر اللساني مدة فاذا امتلأ القلب من نور ذكر الله سلت اللسان وبقي الذكر في القلب"

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سمندروں میں مستغرق ہوتے ہیں وہ اپنی عام عادت کے مطابق پہلے اللہ تعالیٰ کا زبانی ذکر کرتے ہیں، جب دل اللہ کے ذکر کے نور سے ان کا بھر جاتا ہے تو دل میں ذکر ہمیشہ کیلئے باقی رہتا ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا "من عرف الله كل لسانه" جس نے اللہ کو پہچانا اس کی زبان تھک گئی یعنی جب رب تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو زبان رک جاتی ہے دل میں ذکر جاری ہو جاتا ہے یہی حال حضرت زکریا علیہ السلام کا بھی تھا کہ زبان سے آپ اگرچہ کلام نہیں کر سکتے تھے لیکن زبان سے ذکر جاری تھا جو قلب (دل) میں آ کر سما گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

زیادہ ذکر کرنے کا حکم دیا گیا اس کی وجہ یہ تھی "يحتمل ان يكون الامر بالذكر شكرا للنعمة مطلقا" کہ اللہ تعالیٰ کی بندے پر ان گنت نعمتیں ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ (روح المعانی)

وقال محمد بن کعب القرظی لو رخص لاحد فی ترک الذکر لرخص زکر یا بقول اللہ عزوجل " الاتکلم الناس ثلاثة ایام الارمزا واذکر ربک کیثرا" ولرخص للرجل یکون فی الحرب بقول اللہ عزوجل اذالقیتم فئة فاثبتو واذکروا اللہ کثیرا"

محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اگر کسی ایک کو ذکر کے چھوڑنے کی اجازت دی جاتی تو حضرت زکریاؑ کو اجازت دی جاتی، حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے" کثیر ذکر کرنے کا حکم دیا باوجود اس کے کہ آپ کو تین دنوں تک لوگوں سے کلام کرنے کی طاقت حاصل نہ تھی سوائے اشارہ کے۔ اسی طرح اگر ذکر چھوڑنے کی اجازت ہوتی تو جنگ میں شریک لوگوں کو اجازت دی جاتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا" جب تمھاری ملاقات ایک جماعت سے ہو تو ثابت رہو اور اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرو۔ (قرطبی)

﴿وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ﴾ "اور تسبیح بیان کرو دن ڈھلے اور صبح سویرے۔"

" (وسبح) ای وعظم ربک ونزھه عن النقائص "

اور تسبیح بیان کرو یعنی رب تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کا ہر قوم کے نقص سے پاک ہونے کا ذکر کرو۔

"قیل وصل لربک وسمیت الصلوة تسبیحالان فیھا تنزیھا للرب سبحانه وتعالی "

بعض حضرات نے بیان کیا ہے" وسبح "کا معنی یہ ہے کہ اپنے رب کیلئے نماز ادا کرو نماز کو تسبیح اس لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ نماز میں تسبیح پائی جاتی ہے کہ رب تعالیٰ کی پاکی بیان کی جاتی ہے نفلی نماز کو " سبحة " کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس میں تسبیحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"بالعشی " (دن ڈھلے) فاما العشی فھو مابین زوال الشمس الی غروبھا ومنه وسمیت صلاتا الظھر والعصر صلاتی العشاء " سورج کے ڈھل جانے اور غروب ہونے کے درمیان وقت کو "عشی "کہا جاتا ہے اسی لئے ظہر اور عصر کی نماز کے وقت پر " عشاء "کا لفظ عام طور پر احادیث میں موجود ہے۔

(والابکار) (اور صبح سویرے) والابکار ھو مابین طلوع الفجر الی الضحی " صبح صادق سے لے کر چاشت کے وقت تک تمام درمیانی وقت " ابکار "کہلاتا ہے۔(از خازن)

یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیحات دن ڈھلے سے لے کر غروب تک اور صبح صادق سے کر چاشت تک بیان کرو،

" ویحتمل ان یکون اراد بالعشی اللیل وبالابکار النھار فعبر بجزء کل واحد منھما عن جملته وھو مجاز حسن "

اور ایک احتمال یہ ہے کہ " عشی "سے مراد رات ہو اور ابکار سے مراد دن ہو ذکر جزء ہو اور مراد کل ہو، یہ مجازی معنی ہے، لیکن خوبصورت معنی ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ کی تسبیحات بیان کرو دن اور رات۔

" وقال الراغب لم یعن التسبیح طرفی النھار فقط بل ادامة العبادة "

علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیحات بیان کرو دن اور رات کی طرفوں میں بلکہ ہمیشہ عبادت کرنے کا حکم دیا گیا۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

اور اگر "وسبح" کا معنی نماز ادا کرنا لیا جائے تو "عشی" سے مراد سورج کے ڈھل جانے سے لے کر رات تک کا وقت ہو تو چار نمازیں اس ایک لفظ سے ثابت ہو جائیں گی۔ اور "ابکار" سے صبح کی نماز ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اگرچہ بظاہر خطاب حضرت زکریا علیہ السلام کو ہے لیکن عموم الفاظ کا اعتبار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کیلئے بھی ان الفاظ مبارکہ سے ہی تمام نمازوں کے اوقات بیان کر دیتے گئے ہوں تو کوئی بعید بات نہیں۔

راقم کو تو اس میں عظمت قرآن نظر آتی ہے کہ مختصر الفاظ وسیع مفہوم کو شامل ہوتے ہیں اور اگر مزید غور کیا جائے تو اسی میں اشراق، چاشت اور اوابین نمازوں کو تذکرہ بھی مل جائے گا۔ بات تو اپنی اپنی سوچ کی ہے یعنی جب یہ بیان کیا جائے کہ خطاب تو حضرت زکریا علیہ السلام کو ہی ہے لیکن ضمنی طور پر یہ مسائل بھی سمجھ آ رہے ہیں اس سے مفہوم قرآن نہیں بدلے گا بلکہ قرآن کا بیان ذیشان سمجھ آئے گا۔ "واللہ اعلم بالصواب"

تنبیہ: محمد بن کعب قرظی کی جو روایت قرطبی سے نقل کی ہے وہ درمنثور میں ابن جریر اور ابن مغذر اور ابن ابی حاتم اور ابونعیم سے نقل کی گئی ہے۔ (راقم)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلائِكَةُ يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰه اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَo﴾ (آیۃ نمبر ۴۲)

(1) اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔

(2) اور یاد کرو جب کہا فرشتوں نے اے مریم بیشک اللہ نے چن لیا ہے تجھے اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور پسند کیا ہے تجھے آج سارے جہان کی عورتوں سے۔

ترجمہ سے ہی مختصر مطلب تو واضح ہے البتہ علیحدہ علیحدہ الفاظ کی وضاحت کی جارہی ہے۔

﴿وَاِذْقَالَتِ الْمَلائِكَةُ﴾ ''اور یاد کرو جب فرشتوں نے۔''

''اذ'' کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ ایک قول بیان کرتے ہیں کہ یہ '' اذکر ''مقدر کا مفعول فیہ اس لحاظ پر ترجمہ وہی ہے جو راقم نے ذکر کر دیا ہے '' المراد بالملائكة ههنا جبريل وحده '' اس مقام میں ملائکہ سے مراد صرف جبریل ہیں، اسی طرح ﴿يُنَزِّلُ الْمَلائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ اَمْرِهٖ﴾ میں بھی ذکر جمع ہے لیکن مراد ملائکہ سے صرف جبریل ہیں ذکر جمع ہو اور مراد واحد ہو بظاہر لفظ کی مراد میں عدول (پھیرنا) نظر آتا ہے لیکن یہ مجازی معنی لینا اس لئے ضروری ہے کہ سورۃ مریم میں ذکر جبریل کا ہی ہے جس حضرت مریم سے کلام کیا۔

﴿يَا مَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ﴾

''اے مریم بیشک اللہ نے چن لیا ہے تجھے اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور پسند کیا ہے تجھے آج سارے جہان کی عورتوں سے۔''

جبریل کا حضرت مریم سے ہمکلام ہونا اس لئے نہیں تھا کہ وہ نبی تھیں وہ نبی نہیں تھیں کیونکہ نبی صرف مردوں کو بنایا گیا عورتوں کو نہیں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر موجود ہے۔

﴿وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحي اليهم من اهل القرى﴾

''اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب مرد ہی تھے، جنہیں ہم وحی کرتے اور سب شہر کے ساکن تھے''

حضرت جبریل کا حضرت مریم سے کلام چند وجوہ سے تھا:

(۱) بعض حضرات نے کہا یہ حضرت مریم کی کرامت کی وجہ سے تھا لیکن کہ مذہب صرف ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک اولیاء کرام سے بطور کرامت فرشتوں کا ظاہراً کلام کرنا جائز ہے لیکن یہ مذہب جمہور علماء کرام کا نہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''ارہاص'' کے پیش نظر تھا۔ یہ ہمارے نزدیک جائز ہے کعبی معتزلی بھی اس کا قائل ہے۔

راقم کے نزدیک جائز ہے کیونکہ نبی کی پیدائش سے پہلے نبی کے کمال کو یا اعلان نبوت سے پہلے کے کمال کو ارہاص کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہاتھی والوں ابرھہ اور اس کے ساتھیوں کو تباہ و برباد کیا جبکہ وہ کعبہ پر حملہ کرنے کیلئے آتے تھے، یہ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے چالیس یا پچاس دن پہلے کا واقعہ ہے اس میں برکت آپ کی ہی شامل تھی اسی وجہ سے یہ آپ کا ارہاص ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو مجھے کعبہ میں آتے جاتے سلام کرتا تھا یہ بھی آپ کا ارہاص ہی ہے۔

(۳) بعض حضرات نے کہا یہ حضرت زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہے کیونکہ حضرت مریم ان کی زیر کفالت تھیں اس لئے ان سے فرشتے کا کلام کرنا حقیقت میں اللہ کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہوا،'' وهو جمهور قول المعتزلة ''لیکن یہ قول جمہور معتزلہ کا ہے اہل سنت و جماعت کا نہیں اس لئے کہ حضرت مریم سے فرشتے کا کلام کرنا ان کا یا ان کے بیٹے کا کمال ہوسکتا ہے نہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا۔

(۴) ومن الناس من قال ان ذلک کان علی سبیل النفث فی الروع والالهام والالقاء فی القلب کما کان فی حق ام موسی علیه السلام فی قوله "واوحینا الی ام موسی "

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کلام براہ راست نہیں تھا بلکہ یہ دل میں ڈالنا اور الہام اور نفس میں پھونکنا تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿واوحینا الی اُمّ مُوسی﴾ اگرچہ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف'' لیکن مراد وہاں بھی یہ ہے کہ (ہم نے موسیٰ کی والدہ کے دل میں ڈالا)

(ماخوذ از کبیر بوضاحت)

پہلے اور دوسرے اصطفاء میں فرق:

اس آیۂ کریمہ میں حضرت مریم کے تین اوصاف بیان فرمائے ہیں پہلا وصف بیان فرمایا '' ان اللـــــه اصطفاک '' بیشک اللہ نے چن لیا تجھے (پسند کرلیا) اور دوسرا وصف ذکر کیا '' وطهرک '' اور خوب صاف ستھرا کیا ہے تجھے، اور تیسرا وصف یہ بیان کیا ہے '' واصطفاک علی نساء العالمین '' اور چن لیا ہے، پسند کرلیا ہے تجھے

آج جہان کی عورتوں پر۔

اصطفاء اول : (۱) پہلے چن لینے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی خدمت گذاری کیلئے حضرت مریم کے آزاد کرنے کو قبول فرمالیا، باوجود اس کے کہ آپ مؤنث تھیں، اور مؤنث کو بیت المقدس کیلئے وقف نہیں کیا جاتا تھا۔

(۲) دوسری وجہ آپ کو چن لینے کی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ آپ نے شروع سے ہی دنیاوی غذا حاصل نہیں کی بلکہ جنت کے رزق سے ہی ان کی پرورش کی گئی۔

(۳) آپ کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کا فارغ وقت عطاء فرمایا، اپنی مہربانیوں اور ہدایت سے نوازا اور آپ کی حفاظت فرمائی۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کفالت اگرچہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ذمہ تھی، لیکن ان کے رزق میں ان پر کسی کا احسان نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رزق ملتا تھا وہی کافی ہو جاتا تھا۔

حضرت زکریا علیہ السلام جب آپ کے مقفل (تالہ لگے ہوئے) کمرہ میں بے موسم پھل پاتے تو یہ سوال کرتے "**انی لک هذا**" یہ پھل تمہیں کہاں سے ملے ہیں؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا "**قالت هو من عندالله**" تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کا کلام آپ نے براہ راست، آمنے سامنے سنا، (یہی قول معتبر ہے، صرف دل میں ڈالنے والا قول معتبر نہیں) یہ وصف کسی اور عورت کو حاصل نہ تھا، صرف آپ کو یہ وصف عطاء کیا گیا۔

اصطفاء دوم: دوسرا اصطفاء (چن لینا) جس کا تذکرہ ﴿**وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ**﴾ میں بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بغیر باپ کے بیٹا عطاء فرمایا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہوئے بولنے کی طاقت عطاء فرمائی اور ان کی کلام سے حضرت مریمؑ کو یہود کی تہمت سے نجات حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿**وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ**﴾ اور بنایا ہم نے اسے (مریم کو) اور اس کے بیٹے کو تمام جہانوں کیلئے نشانی۔

ذکر تطہیر: ان دونوں اصطفاء کے درمیان تطہیر "**وطهرک**" ذکر فرمایا اس میں بھی چند وجوہ ہیں:

(۱) "**احدها انه تعالى طهرها عن الكفر والمعصية فهو كقوله تعالى فى ازواج النبى ﷺ (ويطهركم**

تطهیرا) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو کفر ومعصیت سے پاک رکھا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾

(۲) "وثانیها انه تعالی طهرها عن مسیس الرجال" اوران میں دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مردوں کے چھونے سے پاک رکھا۔

(۳) "وثالثها طهرها عن الحیض قالوا کانت مریم لا تحیض" تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیض سے پاک رکھا، یہی قول اہل علم کا ہے کہ حضرت مریم حیض سے پاک تھیں۔ حیض کا نہ آنا اور بیٹا بھی عطاء ہونا وہ بھی بغیر باپ کے یہ سب حضرت مریم کی کرامات تھیں۔

(۴) "ورابعها، وطهرک من الافعال الذمیمة والعادات القبیحة" اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو برے افعال اور بری عادات سے پاک رکھا۔

(۵) "وخامسها، وطهرک عن مقالة الیهود وتهمتهم وکذبهم" اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہود کی باتوں اوران کی تہمت اوران کے جھوٹ سے پاک رکھا۔ (ماخوذ از کبیر بتقدیم وتاخیر)

تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان سے اقتباس:

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور جہان کی عورتوں کو منتخب کیا ہے" (فتح محمد صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور برگزیدہ کیا تم کو اوپر عورتوں عالموں کے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر" (محمود الحسن صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کیلئے چن لیا" (مودودی صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں میں برگزیدہ کیا ہے" (عبدالماجد صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آپ کو دنیا جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے" (اشرف علی صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے" (شاہ عبدالقادر صاحب)

﴿وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ﴾ "اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا" (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہاں حضرت مریم کو خطاب ہے، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ میں لفظ ''آج'' کی زیادتی ہے۔ جو بظاہر وہم واقع ہوتا ہے اس کا تفاسیر نے بھی ازالہ کیا اور اس وہم کے ازالہ کیلئے تفاسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے بھی ایک لفظ کی زیادتی کی۔

وہ وہم یہ ہے کہ حضرت مریم کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت کیسے حاصل ہے؟ حالانکہ حضرت فاطمۃ الزہرا اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) پر حضرت مریم کو فضیلت حاصل نہیں، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ''ای اھل زمانک'' (جلالین) یعنی تمہیں اپنے زمانے کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اسی مقام پر جلالین کے حاشیہ پر وضاحت موجود ہے۔

(واصطفاک علی نساء العالمین) ای بان وھب لک عیسی من غیراب ولم یکن ذلک لاحد من النساء ھذا وان کان من خصائص مریم علیھا السلام لکنہ لایلزم من ھذہ الفضیلہ افضلیتھا مطلقۃ علی فاطمۃ بنت محمد ﷺ وعائشہ زوجۃ النبی ﷺ ففاطمۃ وعائشۃ رضی اللہ عنھماافضل نساء العالمین من الاولین والأخرین کما ھو المذھب المحقق عند العلماء''

یعنی مفسر رحمہ اللہ نے ''اھل زمانک'' کے الفاظ کو کیوں زیادہ کیا؟ اس لئے کہ حضرت مریم کو بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کا عطاء ہونا اگرچہ آپ کی خصوصیت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو مطلقاً حضرت فاطمہ بنت النبی ﷺ اور حضرت عائشہ زوجۃ النبی ﷺ پر بھی فضیلت حاصل ہو اگرچہ یہ خصوصیت تو ان دونوں کو حاصل نہیں لیکن ان دونوں کو کثیر خصائص حاصل ہیں جو احادیث مبارکہ میں وارد ہیں جو فضائل حضرت مریم میں نہیں پائے جاتے، پس فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنھما کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت ہے، اس پر تحقیق واتفاق موجود ہے۔ (حاشیہ جلالین)

یہ وجہ تھی جس کا مفصل بیان اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ایک لفظ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر مطلقاً عام تراجم کی طرح ترجمہ کیا جاتا تو اعتراض کا اندفاع ممکن نہیں تھا (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۸۰،۸۱)

ارشادات مصطفویہ ﷺ :

اخرج عبد الرزاق وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن سعید بن المسیب فی قولہ '' ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علی نساء العالمین '' قال کان ابوھریرۃ یحدث عن رسول اللہ ﷺ انہ قال خیر نساء رکبن الابل نساء قریش احناہ علی ولدفی صغرہ وارعاہ علی زوج فی ذات یدہ قال ابوھریرۃ ولم ترکب مریم بنت عمران بعیر اقط اخرجہ الشیخان بدون الأیۃ ''

مصنف عبدالرزاق میں ہے اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن المسیب نے روایت ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ

کے ارشادگرامی "ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک واصطفاک علی نساء العالمین" کی وضاحت میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان فرماتے تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا بیشک بہتر عورتیں وہ ہیں جو اونٹوں پر سوار ہوتی ہیں وہ عورتیں قریش کی ہیں جو اپنے چھوٹے بچوں پر شفقت کرتی ہیں خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مریم بنت عمران تو اونٹوں پر سوار نہیں ہوئیں۔ (از درمنثور)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جن عورتوں کو نبی کریم ﷺ نے "خیر النساء" کہا ہے۔ وہ تو اونٹوں پر سوار ہونے والی ہیں حضرت مریم تو اونٹ پر سوار نہیں ہوئیں کہ آپ مطلقا تمام عورتوں سے افضل ہوں یعنی اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ آپ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل تھیں نہ کہ مطلقاً قریش کی وہ کون سی عورتیں ہیں جو مطلقا خیر النساء (سب عورتوں سے بہتر) ہیں، وہ حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھن ہیں۔

❁ اخرج ابن ابی شیبة والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن جریر وابن مردویہ عن علی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول خیر نسائھا مریم بنت عمران وخیر نسائھا خدیجة بنت خویلد"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں میں سے بہتر مریم بنت عمران ہیں اور عورتوں میں سے بہتر خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ (از درمنثور)

حضرت مریم کے ساتھ تو وہی قید لگانی پڑے گی جس کا ذکر جلالین اور اس کے حاشیہ سے کر دیا گیا کہ آپ کو اپنے زمانہ کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے لیکن حضرت خدیجہ کو مطلقا تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

❁ وعن انس ان النبی ﷺ قال حسبک من نساء العالمین مریم بنت عمران وخدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد وآسیة امرأةفرعون"

(رواہ الترمذی وصححہ واحمد وابن المنذر وابن حبان والحاکم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہان کی عورتوں میں سے تمہیں کافی ہیں مریم بنت عمران، اور خدیجہ بنت خویلد، اور فاطمہ بنت محمد ﷺ اور آسیہ زوجہ فرعون۔ (از درمنثور)

(خیال رہے یہ حدیث ابن شیبہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسل ذکر کی ہے)

❁ "عن ابی موسی اشعری قال قال رسول اللہ ﷺ کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الامریم بنت عمران وآسیہ امرأةفرعون وفضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام"

(اخرج ابن ابی شیبة والبخاری والمسلم والترمذی والنسائی وابن ماجة وابن جریر)

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مرد تو بہت ہیں عورتوں میں سے کامل

صرف مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون ہیں اور عائشہ کو تمام عورتوں پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام طعاموں پر فضیلت حاصل ہے۔ (از درمنثور)

"قلت لعل معنی قوله ﷺ لم یکمل من النساء من الامم السابقة الامریم و آسیة" یدل علیه قوله ﷺ وفضل عائشة علی مریم و آسیة" (مظهری)

علامہ قاضی ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے ارشاد "لم یکمل من النساء الامریم بنت عمران و آسیة امرأة فرعون" کا معنی یہ ہے "لم یکمل من النساء من الامم السابقة الامریم و آسیة" کہ پہلی امتوں کی عورتوں میں سے کوئی کامل نہیں سوائے مریم بنت عمران کے اور آسیہ زوجہ فرعون کے۔

اس تشریح اور وضاحت پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام" کہ عائشہ کو تمام عورتوں پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام طعاموں پر فضیلت حاصل ہے۔ آپ کو یہ ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت مریم اور آسیہ پر مطلقاً فضیلت حاصل ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی فضیلت پر احادیث:

"عن عائشه ان رسول الله ﷺ قال یا فاطمة الا ترضین ان تکونی سیدة نساء اهل الجنة او نساء المؤمنین" (رواه البخاری والمسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ کیا تم پسند نہیں کرتی کہ تم جنت کی عورتواں کی سردار بن جاؤ (یا آپ نے فرمایا) کہ تم مؤمنوں کی عورتوں کی سردار بن جاؤ (از مظہری)

❁ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ افضل نساء اهل الجنة خدیجة بنت خویلد وفاطمة بنت محمد ﷺ" (رواه ابو داؤد والنسائی والحاکم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد ﷺ ہیں۔ (از مظہری)

❁ "عن حذیفة ان النبی ﷺ قال نزل ملک من السماء فاستأذن الله ان یسلم علی فبشرنی ان فاطمة سیدة نساء اهل الجنة" (رواه احمد والترمذی والنسائی وابن حبان والحاکم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا آسمانوں سے ایک فرشتہ نازل ہوا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھ پر سلام بھیجے، پھر اس نے (یعنی اترنے کے بعد) مجھے

بشارت دی کہ بیشک جنت والی عورتوں کی سردار فاطمہ ہوں گی۔

"فهذه الاحاديث تدل على ان فاطمة افضل من مريم لان نساء اهل الجنة عام لا يحتمل التخصيص بزمان دون زمان بخلاف قوله تعالى (اصطفاك على نساء العالمين) فانه يحتمل ان يكون المراد منه عالمي زمانها كما قلنا"

ان مذکورہ احادیث سے واضح ہوا کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت مریم سے افضل ہیں اس لئے کہ جنتی تمام عورتوں کی جب سردار حضرت فاطمہ ہوں گی تو جنتی عورت حضرت مریم بھی ہیں لھذا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت مطلقاً ثابت ہوگئی جو کسی زمانہ سے خاص نہیں۔

بخلاف اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں احتمال ہے کہ مراد یہی ہو جو ذکر کر دی گئی کہ حضرت مریم کو اپنے زمانہ کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ (مظہری)

❁ عن ابی سعيد الخدری ان النبی ﷺ قال فاطمة سيدة نساء اهل الجنة الا ما كان من مريم"
(رواہ ابویعلی وابن حبان والحاکم والطبرانی)

حضرت ابو سعید خدری ﷜ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں سوائے مریم کے۔

❁ "عن ام سلمة عن فاطمة قالت اخبرنی رسول الله ﷺ انی سيدة نساء اهل الجنة الا مريم بنت عمران"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت فرماتی ہیں کہ انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ تم تمام جنتی عورتوں کی سردار ہو سوائے مریم بنت عمران کے۔

ان دو حدیثوں سے بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حضرت مریم کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت حاصل ہے لیکن علامہ مظہری رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

فهذان الحديثان يدلان على استثناء مريم من المفضولية ولا يدلان على كونها افضل من فاطمة رضی الله عنها"

یہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت مریم کو مفضولیت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، یہ حدیثیں اس پر دلالت نہیں کر رہیں کہ حضرت مریم کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر فضیلت حاصل ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

❁ "قال رسول الله ﷺ فاطمة بضعة منی" (رواہ البخاری والمسلم عن المسور بن مخرمة)

مسور بن مخرمۃ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔

یہی حدیث مسند احمد اور ترمذی اور مستدرک حاکم میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس حدیث

پاک ہے بعض حضرات نے مطلقا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام مردوں اور عورتوں پر ثابت کی، امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہ قول ہے "لانعدل ببضعة رسول الله ﷺ احدا" ہم رسول اللہ ﷺ کے جسم کے ٹکڑے کے برابر کسی اور کو نہیں سمجھتے۔

"لكن عند جمهور اهل السنة خص منه من علم فضلهم قطعا من الانبياء وبعض الصديقين وبقى من سواهم فى العموم"

لیکن جمہور علماء اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کسی نبی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور بعض صدیقین (خلفاء راشدین) پر بھی فضیلت حاصل نہیں، البتہ عام مردوں پر آپ کو فضیلت حاصل ہے۔

تنبیه: بعض مفسرین حضرات نے مطلقا حضرت مریم کو تمام عورتوں پر فضیلت دی ہے، لیکن راقم نے جو کچھ سمجھا وہ یہ ہے کہ حضرت مریم اور حضرت آسیہ زوجہ فرعون کو اپنے اپنے زمانہ کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو مطلقا تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بحیثیت بنت النبی ﷺ کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بحیثیت زوجۃ النبی ﷺ کے تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے

"والله اعلم بالصواب"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّكِعِينَ٥﴾ (آیة نمبر ۴۳)

(1) اے مریم اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو اور اس کیلئے سجدہ کر اور رکوع والوں کے ساتھ رکوع کر۔

(2) اے مریم ادب سے کھڑی ہو جاؤ اپنے رب کے حضور اور سجدہ کرو اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔

مختصر مطلب: اللہ تعالی نے حضرت مریم کو نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا، البتہ علیحدہ علیحدہ ارکان کا ذکر کیا تا کہ ان کی حفاظت میں مبالغہ کرنے کا حکم پایا جا سکے، "**لما ان فی ذکر الشی تفصیلا تقریرا لیس فی الاجمال**" کیونکہ کسی چیز کی تفصیل میں جو تقریر پائی گئی ہے وہ اجمال میں نہیں۔ (روح المعانی)

﴿يَا مَرْيَمُ﴾ "اے مریم"

"**الحکمة فی ان الله لم یذکر فی القرآن امرأة باسمها الاهی اشارة الی رد ما قاله الکفار من انها زوجته فان العظیم علی الهمة یا نف من ذکر اسم زوجته بین الناس فکان الله یقول لو کانت زوجة لی لما صرحت باسمها**"

اللہ تعالی نے قرآن پاک میں کسی عورت کا نام ذکر نہیں سوائے حضرت مریم کے، اصل میں اس نام کے ذکر کرنے میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس میں کفار کا رد پایا گیا ہے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ آپ کی زوجہ ہیں، اس لئے کہ جو عظیم ہمت والی ہستیاں ہیں وہ اپنی زوجہ کا چرچا لوگوں میں کرنے سے عار محسوس کرتے ہیں، تو گویا کہ اللہ تعالی نے یہ بیان فرما دیا کہ اگر مریم میری زوجہ ہوتی تو میں اس کا واضح طور پر نام ذکر نہ کرتا، اس کا چرچا نہ کرتا۔ (حاشیہ جلالین)

﴿اقْنُتِي لِرَبِّكِ﴾ "اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو"

"قنوت" کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، جلالین میں مذکور ہے "**اطیعیه**" اپنے رب کی اطاعت کرو، "**اطیلی القیام فی الصلوة**" **شکرا** "نماز میں لمبا قیام کرو اللہ تعالی کا شکریہ ادا کرنے کیلئے۔ (مظہری)

"**اعبدی لربک**" اپنے رب کی عبادت کرو۔ (صابونی)

روح المعانی نے پہلے دو معانی بیان کیا ہے "**الاخلاص فی العبادة**" خلوص سے عبادت کرو۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا تقریبا یہی معنی ہے "اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو" راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔ خازن

نے ''لمبا قیام کرو'' معنی بیان کرنے کے بعد یہ ذکر کیا:

''قال الاوزاعی لما قالت الملائکۃ لھاذلک قامت حتی تورمت قدما ھا وسالت دماوقیحا''

اوزاعی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے جب فرشتوں نے آپ کو رب تعالی کا یہ پیغام پہنچایا تو اپ نے اتنا لمبا قیام کرنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر ورم (سوجن) آ گئی، یہاں تک آپ کے قدموں سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ (خازن)

﴿وَاسۡجُدِی وَارۡكَعِی مَعَ الرّٰكِعِیۡنَ﴾

''اور سجدہ کرو، اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔''

''امرت بالصلوۃ بالجماعۃ بذکر ارکانھا مبالغۃ فی ایجاب رعایتھا وایذانا بفضیلۃ کل منھا واصالتہ''

اس آیۃ کریمہ میں حضرت مریم کو نماز جماعت سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا، البتہ علیحدہ علیحدہ ارکان ذکر کئے گے کہ ''قیام کرو'' (ادب سے کھڑی ہو جاؤ) اپنے رب کے حضور، اور سجدہ کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ، تا کہ ان کے وجوب رعایت میں مبالغہ کیا جائے۔ اور ساتھ ساتھ ارکان کی فضیلت کو بھی بیان کر دیا، اور یہ بھی بتا دیا کہ اصل ارکان یہی ہیں جن کا تعلق فعل سے ہے۔ (از تفسیر ابی السعود)

سجدہ کو رکوع سے پہلے کیوں ذکر کیا؟

''وتقدیم السجود علی الرکوع امالکون الترتیب فی شریعتھم کذلک''

سجدہ کو رکوع سے پہلے ذکر کرنے کی ایک وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان کی شریعت میں ترتیب ہی یہ ہو کہ وہ سجدہ پہلے کرتے ہوں اور رکوع بعد میں۔ اگر قوی دلائل سے یہ ثابت ہو جائے تو مسئلہ واضح ہے کہ جس طرح ان پر نماز ادا کرنا لازم تھا اسی طرح ان کو یہاں حکم دیا گیا۔ (از تفسیر ابی السعود)

لیکن زیادہ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی نماز ہماری نماز کی طرح ہی تھی، رکوع پہلے تھا اور سجدہ بعد، اس قول کے مطابق (جو صحیح بھی ہے) ضروری ہے کہ وجہ بیان کی جائے کہ کیوں سجدہ کا ذکر رکوع سے پہلے کیا گیا، اس میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) ''انما قدم السجود علی الرکوع لان الواو لاتقتضی الترتیب انما ھی للجمع کانہ قیل لھا افعلی الرکوع والسجود''

سجدہ کو رکوع پر مقدم ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ واؤ ترتیب کو نہیں چاہتی، صرف جمع کیلئے آتی ہے، حکم صرف یہ دیا گیا کہ

رکوع کرواور سجدہ کرو، یہ مراد نہیں کہ سجدہ پہلے کرواور رکوع بعد میں۔

(۲) **وقال الانباری امرهاامر اعاماو حضهاعلی فعل ارادالعموم فکانه قال استعملی السجودفی حال والرکوع فی حال ولم یرد تقدیم السجودعلی الرکوع بل ارادالعموم بالامر علی اختلاف الحالین "**

ابن انباری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو مطلقا ایک عام حکم دیا ہے، نیکی کے کام پر ابھارا ہے، گویا کہ کہا ہے سجدہ کرو سجدہ کے وقت اور رکوع کرو رکوع کے وقت، سجدہ کو رکوع پر مقدم کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ (خازن)

(۳) **"اولیتقرن(ارکعی)بالراکعین للایذان بان من لیس فی صلوتهم رکوع لیس مصلین"**

اور وجہ یہ ہے کہ سجدہ کا حکم دیا گیا ہے، یعنی ادب سے قیام کرواور سجدہ کرو، رکوع کا مطلقا حکم نہیں بلکہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا، جس کا مطلب ہے"اور نماز جماعت سے ادا کرو"

اسی سے ضمناً یہ سمجھ آ گیا کہ جن کی نماز میں رکوع نہیں وہ حقیقت میں نہ نماز ہے، اور نہ ہی ادا کرنے والوں کو نمازی کہا جائے گا۔

(۴) **"قال الزمخشری ویحتمل ان یکون فی زمناهما من کان یقول ویسجد فی صلوته ولایرکع، وفیه من یرکع فامرت بأن ترکع مع الراکعین ولا تکون مع من لا یرکع"**

زمخشری نے کہا ہے کہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ وہ ہوں جو نماز ادا کرتے ہوں اس میں سجدہ کرتے ہوں اور رکوع نہ کرتے ہوں اور بعض لوگ نماز میں سجدہ اور رکوع دونوں ہی کرتے ہوں، تو حضرت مریم کو حکم دیا گیا ہو تم نماز ان لوگوں کے ساتھ ادا کرو جو سجدہ بھی کرتے ہوں اور رکوع بھی، ان لوگوں کے ساتھ نماز ادا نہ کرو جو سجدہ تو کرتے ہیں اور رکوع نہیں کرتے۔ (روح المعانی)

اعتراض: یہ وجہ تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتی تھی کہ یہ کہہ لیا جاتا **"وارکعی مع الرکعین واسجدی"**

جواب: سجدہ عبادت میں دوسرے ارکان سے اہم ہے، اسی وجہ سے غیر خدا کو سجدہ جائز نہیں اور سجدہ رب تعالیٰ کے قرب کا زیادہ ذریعہ ہے بنسبت دوسرے ارکان کے۔

"قال علیه الصلوة والسلام" اقرب مایکون العبد من ربه اذاسجد"

بندہ رب تعالیٰ کے اس وقت زیادہ قریب ہوتا ہے، جب سجدہ کرتا ہے۔

"فلما کان السجود مختصا بهذاالنوع من الرتبة والفضیلة لاجرم قدمه علی سائر الطاعات "

جب سجدہ کو یہ خصوصی فضیلت اور مرتبہ حاصل ہے تو یقیناً اسی وجہ سے اسے پہلے ذکر کر دیا لیکن پہلے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے ہی ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہو۔ (ماخوذ از کبیر وروح المعانی بتصرف)

(۵) سجدہ کا حقیقی معنی مراد نہ ہو اور رکوع کا حقیقی معنی مراد ہو، یعنی سجدہ کا معنی نماز ہو، اور رکوع کا مطلب رکوع ہی ہو تو اب مطلب یہ ہوگا نماز ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی نماز جماعت سے ادا کرو، سجدہ سے مراد نماز رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں پائی گئی ہے ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ اور کچھ رات گئے اس کی تسبیح کرو اور نمازوں کے بعد۔ اس مقام میں ''سجود'' کا معنی ''نمازیں'' لیا گیا ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے " اذا دخل احدکم المسجد فلیسجد سجدتین " جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نماز ادا کرے۔ حدیث شریف میں بھی " فلیسجد " کا معنی ''چاہیے وہ نماز ادا کرے'' اور سجدتین کا معنی دو رکعت نماز۔ (کبیر بتصرف)

(۶) ایک اور احتمال یہ ہے کہ سجدہ کا معنی حقیقی ہو اور رکوع کا معنی مجازی ہو " یعنی ان یکون المراد من الرکوع التواضع " یعنی رکوع کا معنی خشوع وخضوع، عاجزی مراد ہو۔ اب معنی یہ ہوگا ''اور سجدہ کرو اور عاجزی سے یعنی خشوع وخضوع سے نماز ادا کرو۔ (کبیر بتصرف)

(۷) ایک اور احتمال یہ ہے کہ سجدہ اور رکوع دونوں کا معنی مجازی ہو اب مطلب یہ ہوگا نماز ادا کرو، اور خشوع کرنے والوں کے ساتھ خشوع کرو۔ یہ آخری تینوں احتمال جو پیش کیے گئے ہیں ان پر اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔

" وارکعی مع الراکعات " نہیں کہا، کیا وجہ ہے؟ یعنی یہ نہیں کہا رکوع کرو رکوع کرنے والی عورتوں کے ساتھ بلکہ یہ کہا ہے " وارکعی مع الراکعین " اور رکوع کرو رکوع کرنے والے مردوں سے ساتھ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں چند وجوہ ہیں۔

(۱) والجواب ان الاقتداء بالرجال حال الاختفاء من الرجل افضل من الاقتداء بالنساء "

ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ اس سے یہ مسئلہ ثابت کیا گیا ہے کہ پردے کی حالت میں اقتداء مردوں سے زیادہ بہتر ہے بسبت عورتوں کی اقتداء کے۔ (کبیر)

(۲) وجاء (مع الراکعین) دون الراکعات لان هذا الجمع اعم اذ یشمل الرجال علی سبیل التغلیب "

جمع مذکر کے صیغے تغلیبی طور پر مؤنث کو بھی شامل ہیں، لھذا مؤنث کے صیغہ کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ امامت تو مردوں کی ہے اور ان کی اقتداء میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی پردے میں ان کے ساتھ نماز ادا کر رہی ہیں لھذا تم بھی اس جماعت میں شریک ہو جاؤ۔ (ماخوذ از البحر المحیط بوضاحت)

(۳) (مع الراکعین) لم یقل مع الراکعات اما لدخول جمع المؤنث فی المذکر بالتغلیب

او المعنی صلی کصلوۃ الرجال من حیث الخشیۃ وعو الھمۃ لا کصلوۃ النساء من حیث التفریط وعدم الخشیۃ" (صاوی)

ایک جواب تو علامہ صاوی رحمہ اللہ کا بھی وہی ہے جو البحر المحیط سے بیان کیا گیا ہے البتہ ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مذکر صیغہ ذکر کیا ہے مؤنث نہیں ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے گویا کہ یہ حکم دیا گیا ہے تم مردوں کی طرح خشوع وخضوع سے اور بلند ہمت سے نماز ادا کرو عام عورتوں کی طرح نماز میں کوتاہی سے کام نہ لو، اور عام عورتوں کی طرح نماز بغیر خشوع کے ادا نہ کرو بلکہ خشوع سے ادا کرو۔

بحث مذکور سے راقم نے یہ سمجھا:

بنی اسرائیل کی نماز ہماری نماز کی طرح ہی تھی اس میں رکوع تھا اور سجود بھی، اسی طرح رکوع پہلے تھا اور سجود بعد میں، سجود کے اہم رکن ہونے کی وجہ سے پہلے ذکر کر دیا گیا، واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی اس لئے مطلوب رکوع اور سجود کی ادائیگی ہے ترتیب ذکری ترتیب فعلی پر دلالت نہیں کر رہی۔ راقم نے ﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ پارہ اول میں بھی یہی موقف بیان کیا ہے اسلئے بعض حضرات کا یہ قول کہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا مرجوح نظر آرہا ہے۔ " واللہ اعلم بالصواب "

حضرت مریم کے قرآنی واقعات پر بنی اسرائیل کے اعتراضات:

اس مقام پر عیسائی نکتہ چین قرآن مجید پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مسیح اور مریم کے اور اسی طرح یوحنا یعنی یحیٰی کے قصہ میں چند غلطیاں قرآن میں بیان ہوئیں (معاذ اللہ) جو تاریخی واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں،

(۱) یہ کہ مریم کی ماں کا نذر ماننا اور پھر مریم کو ہیکل میں بھیج دینا اور وہاں کاہنوں میں باہم ان کی پرورش کی بابت گفتگو ہر کریا کے نام قرعہ نکلنا اور زکریا کا مریم کو بے موسم پھل کھاتے دیکھ کر اپنے لئے اولاد کے واسطے دعاء کرنا انجیل سے ثابت نہیں اس لئے کہ باتیں غلط ہیں۔

(۲) قرآن میں لکھا ہے کہ زکریا تین روز تک بغیر اشارہ کے کسی سے کلام نہ کریں گے، حالانکہ انجیل لوقا کے اول باب درس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کو یوں فرشتہ نے کہا کہ تو جب تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں گی گونگا ہو جائے گا کسی سے بول نہ سکے گا اور اسی کے باب ۶۴ درس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یحیٰی پیدا ہوئے اور آٹھویں دن اس کا

ختنہ ہوا اوران کا یحیٰ نام رکھا گیا تب ان کی زبان کھلی جس کی مدت تخمینا مہینے ہوتی ہے قرآن باوجود دعوی الہام اور تصدیق انجیل کے کتنی غلطی کی۔

(۳) لڑکپن میں مسیح کا کلام کرنا اور پھر پرندوں کا معجزہ کہ مٹی کے جانور بنا کر ان میں پھونک مارنا اوران کا زندہ ہوکر اڑ جانا کہیں سے ثابت نہیں قرآن نے اسکو کہاں سے لیا۔

اعتراضات کے جوابات:

اول سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تاریخی باتیں چار انجیلوں کے مصنف نے اپنی مختصر تاریخوں میں نہ لکھیں تو اس سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ امور غلط ہیں، دیکھو زکریا کا فرشتہ سے بشارت پانا اور یحیٰ نام رکھنا وغیرہ باتیں صرف لوقا نے لکھیں اوروں نے نہیں پھر کیا اس وجہ سے وہ غلط ہوں گی؟ اسی طرح مسیح کے پیدا ہونے کے دنوں میں مجوسیوں کو ایک ستارہ دکھائی دینا اور اس کا ان کے آگے آگے چلنا سوائے متی کے اور کسی نے نہیں لکھا اس طرح ان چاروں مؤرخوں کا باہم سیکڑوں باتوں میں اختلاف بیان پایا جاتا ہے

یہی تیسرے اعتراض کا جواب ہے اور تائید اس کی یہ ہے کہ یوحنا اپنی انجیل کے سب سے اخیر میں یہ لکھتا ہے ''کہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کئے، اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں نہ سماتیں'' پھر کیا مسیح نے یہ ہی چند باتیں اور یہی چند کام کئے ہیں جو چار انجیلوں میں ہیں؟ ہرگز نہیں ۔علاوہ اس کے یہودی مؤرخوں اور دوسری انجیلوں سے بھی ان باتوں کا پتہ لگتا ہے اور لوقا کہ بغیر دوسری انجیلوں کے زیادہ معتبر ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سب تاریخی واقعات غلط ہوں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ خود ساختہ انجیلوں کے واقعات کو یقینی بھی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اکثر واقعات ان کے غلط ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ لوقا نے نہ زکریا کو دیکھا نہ یحیٰ کو اور نہ حضرت عیسی کو۔ یہ مؤرخ سنی ہوئی باتیں لکھتا ہے، جس پر گمان ہوسکتا ہے کہ یا راوی نے غلطی کی یا خود لوقا سے سہو ہوگیا یا نسخہ میں اوغلطیوں کی طرح یہ بھی واقع ہوئیں۔قرآن پاک نے اس انجیل کے سچا ہونے کا دعوی کیا ہے جو اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل فرمائی چار انجیلیں جو عیسائی مؤرخوں کی ہیں وہ جب خود ساختہ اور جھوٹی ہیں تو قرآن پاک کا ان کے مخالف ہونا ہی عقل کے مطابق ہے۔ (ماخوذ از حقانی بتصرف قلیل)

آمدم برسر مطلب:

حضرت مریم کو جماعت سے نماز ادا کرنے کا حکم کیسے دیا گیا حالانکہ وہ ایک جوان لڑکی تھی، جوان لڑکی کو مردوں کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کرنے کا حکم عقل وشرع کے خلاف نظر آتا ہے۔

جواب: اس میں چند احتمال پائے گئے جن کو مدنظر رکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ آپ کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ شرع اور عقل کے مطابق ہے۔ خصوصاً رب تعالیٰ کا حکم ہی تو شرع ہے خلاف شرع تو وہ کام ہوتے ہیں جو باری تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہوں آیئے وہ احتمالات دیکھئے

(۱) ایک احتمال اس میں یہ ہے کہ آپ کیلئے جو حجرہ بنایا گیا وہ اس طرح بیت المقدس کے ساتھ متصل تھا کہ جماعت میں صفیں اس تک پہنچ جاتی تھیں، آپ اپنے حجرہ میں نماز ادا کرتی تھیں اس صورت میں نہ مردوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا تصور ہے اور نہ ہی بے پردہ ہونے کا تصور ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ مردوں کی صف کے پیچھے علیحدہ صف میں باپردہ ہوکر نماز ادا کرتی ہوں اس صورت میں مردوں کے ساتھ ملنے اور بے پردہ ہونے کا کوئی تصور نہیں۔

(۳) ایک احتمال یہ ہے کہ بیت المقدس کے تمام خدام آپ کے اقرباء ہوں، یہی وجہ ہے کہ آپ کی کفالت کا ہر شخص تقاضا کررہا تھا۔ لھذا بزرگ اقرباء کے ساتھ اس شریعت میں کسی لڑکی کے کھڑے ہونے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا اسلئے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا شرع وعقل کے مطابق ہے۔

(۴) چوتھا احتمال یہ ہے کہ نماز کے وقت اور عورتیں بھی آتی تھیں جو جماعت سے نماز ادا کرتی تھیں عورتوں کی صف مردوں سے علیحدہ پردے میں ہوتی تھی۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

اگرچہ چار احتمالات میں سے ہر احتمال قوی ہے لیکن راقم کو آخری احتمال زیادہ قوی نظر آتا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ: حضرت مریم کا ایک وصف بیان کیا گیا "وطھرک" اور تجھے صاف وستھرا کیا اس کے متعلق علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے خوب بیان فرمایا:

"والاولی الحمل علی العموم ای طھرک من الاقذار الحسیة والمعنویة والقلبیة والقالبیه"

بہتر یہ ہے کہ معنی عمام ہی مراد لیا جائے، یعنی آپ کو حسی اور معنوی، روحانی اور جسمانی تمام عیوب سے پاک بنایا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾ (آیۃ نمبر ۴۴)

(1) یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر تمہیں بتاتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے کہ مریم کس کی پرورش میں رہیں، اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

(2) یہ غیب کی خبریں ہیں جو خفیہ طور پر ہم تمہیں بتاتے ہیں، اور نہیں تھے پاس ان کے جب وہ ڈال رہے تھے اپنی قلمیں کہ کون کفالت کرے مریم کی، اور نہیں تھے آپ پاس ان کے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

مختصر مطلب:

نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ نے حضرت مریم کی کفالت اور ان کی قلموں کے ذریعے قرعہ اندازی اور ان کے جھگڑے کرنے کی جو خبریں دی ہیں، وہ سب غیبی خبریں ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں ڈالی ہیں، حالانکہ آپ ان کی قرعہ اندازی کے وقت اور ان کے جھگڑے کے دوران ان کے پاس موجود نہ تھے۔

﴿ ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ ﴾

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو خفیہ طور پر ہم تمہیں بتاتے ہیں''

''(ذلک)اشارة الی ماتقدم والمعنی ان الذی مضی ذکره من حدیث حنة وزکریا ویحیی وعیسی بن مریم انما هو من اخبار الغیب فلا یمکنک انه تعلمه الابالوحی''

لفظ ''ذلک'' کا اشارہ ماقبل خبروں کی طرف ہے، یعنی ''مشارالیہ'' ''ماتقدم'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو واقعات بیان کئے گئے ہیں حنہ زوجہ عمران کا واقعہ، زکریا علیہ السلام کا کفیل بننے کا واقعہ، حضرت یحیی اور حضرت عیسی (علیہما السلام) کے واقعات یہ سب غیبی خبریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر مطلع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی عطاء کے بغیر آپ ذاتی طور پر ان خبروں پر مطلع ہونے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ (کبیر)

سبحان اللہ ! کیسے اہل سنت کا مسلک جگمگا تا ہوا ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء کے بغیر حضور ﷺ کو ذاتی طور پر غیبی چیزوں کا علم حاصل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی عطاء سے آپ کو علم حاصل ہے۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کا مشاہدہ نہ کرنا اور ان سے خبروں کو نہ سننا تو واضح ہے، اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟

جواب: چونکہ کفار بھی یقینی طور پر جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے واقعات کو نہ سنا تھا اور نہ ہی پڑھا تھا، لیکن وہ وحی کا انکار کرتے تھے، اس لئے اب صرف مشاہدہ رہ گیا تھا جس کی نفی کی گئی۔ (ماخوذ از تبیہ)

"انباء الغیب" (غیبی خبریں) "انباء" جمع ہے "نبا" کی اور جب باب افعال کا مصدر ہو تو معنی ہوگا "خبر دینا" "ایحاء" کو مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے "ویجمعها تعریف الموحی الیه بامر خفی من اشارة او کتابة او غیرهما" سب معانی اس معنی میں سمٹ کر آ جاتے ہیں کہ جسے خفی طریقہ سے یعنی اشارہ یا کتابت وغیرہ سے کسی چیز کی پہچان کرا دی جائے اسے وحی کہتے ہیں۔

وحی کا مشہور معنی جبریل کا رب تعالیٰ کا پیغام انبیاء کرام کو پہنچانا، اور وحی کا اطلاق الہام پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ﴾ تیرے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی، الخ۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیٰٓئِهِمْ﴾ شیطان اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿فَاَوْحٰی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّعَشِیًّا﴾ تو زکریا نے اشارہ ان کی طرف کہ صبح و شام تسبیح بیان کرو۔ ان سب مقاموں میں وحی کا معنی اشارہ کرنا، اور دل میں ڈالنا۔ (ماخوذ از تبیہ)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے ارشاد کو دیکھیں جو انہوں نے تمام معانی کا جامع معنی بیان کیا، پھر اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں جو راقم نے بھی نقل کیا تو آپ کو بہت خوب نظر آئے گا۔

"ذلک من انباء الغیب" سے یہ واضح ہو گیا "ان هذه القصص وصولها الیک من جهة الوحی اذ لست ممن دارس الکتب ولا صحب من یعرف ذلک" کہ یہ واقعات جو نبی کریم ﷺ نے تفصیلی طور پر بیان فرمائے ہیں، آپ تک وحی کے ذریعے پہنچے، کیونکہ آپ نے کسی مدرسہ میں کتابیں نہیں پڑھی تھیں، اور آپ علماء کی مجلس میں شریک نہ ہوئے تھے، کیونکہ آپ امی قوم میں تشریف لائے، وہاں علماء کی محفل میں بیٹھنے کا تصور ہی نہ تھا لھذا آپ تک ان واقعات کا پہنچنا صرف وحی کے ذریعے سے ہی تھا۔

اسی طرح نوح علیہ السلام کی تفصیلی خبریں بیان کرنے کے بعد رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿تِلْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ یہ غیب کی

خبریں ہم تمہاری طرف وحی کرتے ہیں انہیں نہ تم جانتے تھے نہ تمہاری قوم اس سے پہلے۔

''وفی هذادلیل علی نبوة رسول الله ﷺ اذا کبر بغیوب لم یطلع علیها الامن شاهدها اومن قرأها فی الکتب السابقة اومن اوحی الله الیه بها وقدانتفی العیان والقراء ة فتعین الثالث وهو الوحی من الله تعالی''

اس میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلیل پائی گئی ہے کہ آپ نے غیبی خبریں دیں، جن پر یا وہ لوگ مطلع جنہوں نے ان کا مشاہدہ کیا اور کچھ لوگوں کو پہلی کتابیں پڑھ کر علم حاصل ہوا، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے علم حاصل ہوا، نبی کریم ﷺ نے جب بظاہر مشاہدہ نہیں فرمایا اور کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا تو واضح ہو گیا کہ آپ کو وحی کے ذریعے علم حاصل ہوا، آپ کی طرف وحی کا آنا آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔ (البحرالمحیط)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ذلک'' اور ''الیک'' میں کاف سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے ''ذلک' مبتداء ہے ''من انباء الغیب'' خبر ہے، اور ''نوحیه'' جملہ مستأنفہ ہے، اور ''نوحیه'' میں ضمیر منصوب کی ''غیب'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اب معنی واضح ہو گیا ''ای شاننا اننا نوحی الیک الغیب ونعلمک به'' یعنی ہماری شان یہ ہے کہ بیشک ہم آپ کو غیبی خبروں پر خفیہ طور پر مطلع کر دیتے ہیں، اور آپ کو ان کا علم غیب عطاء کر دیتے ہیں۔

''نوحیه'' مضارع کا صیغہ ذکر کیا، یعنی ہم آپ کو وقتاً فوقتاً (یعنی ہم آپ کو کئی وقتوں میں) غیبی خبروں پر مطلع کرتے رہتے ہیں۔ (البحرالمحیط)

﴿ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ﴾

''اور نہیں تھے تم پاس ان کے جب وہ ڈال رہے اپنی قلمیں کہ کون ان میں سے کفالت کرے مریم کی۔''

یہاں سے غیبی خبروں پر تعجب دلانے کیلئے وضاحت کی کہ اے نبی کریم ﷺ آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ مریم کی کفالت کیلئے اپنی قلموں کو ڈال رہے تھے، پھر آپ کا خبر دینا یقیناً وحی کی وجہ سے تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع کیا۔

قلمیں کہاں ڈال رہے اور کیوں ڈال رہے تھے؟

(اذیلقون اقلامهم) یعنی ''التی کانوا یکتبون بها فی الماء لاجل الاقتراع''

وہ جن قلموں سے لکھتے تھے ان کو پانی میں قرعہ کیلئے ڈال رہے تھے (خازن)

خیال رہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ کے مطابق ہے" ای یرمونها ویطرحونها للاقتراع" (جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے) راقم نے ظاہر الفاظ پر ترجمہ میں اکتفاء کیا ہے قلمیں ڈالنے کی وجہ نہیں بیان کی۔

وہ قلمیں کون سی تھیں ؟:

اگرچہ اس میں مختلف اقوال پائے گئے ہیں لیکن صحیح اور معتبر قول یہ ہے" (والاقلام) جمع قلم وهی کانوا یکتبون بها التوراة واختاروها تبرکا بها" "اقلام" جمع ہے قلم کی، یہ وہ قلمیں تھیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے، ان کو ہی تبرک کیلئے قرعہ اندازی کیلئے پانی میں ڈالا، کہ جس کے حق میں قرعہ نکل آئے وہی مریم کی کفالت کرے گا۔ (از روح المعانی)

قرعہ اندازی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت مریم کے باپ ان کے سردار اور ان کے رئیس تھے اور ان سے افضل تھے، بیت المقدس کے خدمت گذار حضرات میں ہر ایک چاہتا تھا کہ میں کافیل بنوں تو اس لئے قرعہ اندازی کی ضرورت پیش آئی تاکہ نزاع نہ پیدا ہو، اور نہ ہی کسی کی دل شکنی ہو، کیسے انہوں نے قرعہ اندازی کی؟ اس کی تفصیل پہلے ﴿وکفلها زکریا﴾ کے تحت گذر چکی ہے وہاں ہی دیکھی جائے پھر دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وہ قلمیں ڈالنے والے کون لوگ تھے؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے اہل علم کا کہ وہ کون لوگ تھے "فمنهم من قال هم خدمة البيت" بعض حضرات نے بیان کیا کہ وہ بیت المقدس کے خدام تھے۔ "ومنهم من قال بل العلماء والاحبار وکتاب الوحی" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ قرعہ اندازی کرنے والے ان کے علماء اور محققین تھے جو تورات کا علم رکھتے تھے اور تورات لکھتے رہتے تھے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ اپنا مختار ان الفاظ سے تحریر فرما رہے ہیں،

"ولاشبهة فی انهم کانوا من الخواص واهل الفضل فی الدین والرغبة فی الطریق"

یہ بات شبہ سے دور ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالی کے خاص مقربین تھے، اور دین میں خصوصی فضیلت رکھنے والے تھے اور شریعت کی راہ میں خصوصی رغبت رکھنے والے تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ حضرت مریم کی کفالت میں جھگڑا کرنے والے لوگ اور قرعہ ڈالنے والے

اھل فضل اور رب تعالیٰ کے مقرب تھے، وہی علماء و محققین تھے، وہی توراۃ کا علم رکھنے والے تھے، اور وہی توراۃ لکھنے والے تھے، وہ اللہ کے نیک بندے بیت المقدس کے خدمتگذار بھی تھے۔ اس وقت مقربین بیت المقدس کی خدمتگذاری کو اپنے سر کا تاج سمجھتے تھے۔ راقم نے اپنا جو موقف بیان کیا ہے اس میں تمام اقوال مجتمع ہیں ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں۔

﴿ وما كُنتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴾

''اور نہیں تھے آپ پاس ان کے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔''

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ " وما كنت هناک اذ يتقارعون على التكفل بها و اذ يختصمون بسببها" نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ حضرت مریم کی کفالت کیلئے ان کی قرعہ اندازی کے وقت آپ ان کے پاس نہیں تھے، اور نہ ہی آپ ان کے پاس تھے جب وہ قرعہ اندازی میں جھگڑ رہے تھے۔

ایک اور مطلب یہ ہے "فيحتمل ان يكون المراد بهذا الاختصام ما كان قبل الاقراع" کہ اس میں یہ احتمال پایا گیا ہے کہ جب وہ قرعہ اندازی سے پہلے جھگڑا کر رہے تھے تو اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ "ويحتمل ان يكون اختصاما آخر حصل بعد الاقراع" سا یک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ قرعہ کے بعد جب جھگڑا کر رہے تھے اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔

بظاہر اس پر وہم ہے کہ اتنی نیک ہستیوں کے جھگڑا کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس جھگڑے سے مراد وہ جھگڑا نہیں جو ہمارے ذہنوں میں تصور پایا جاتا ہے کہ تو تو، میں میں پائی جائے گالی گلوچ ہو، باہم دست بگریباں ہوں، بلکہ ان کا جھگڑا یہ تھا:

"وبالجملة فالمقصود من الأية شدة رغبتهم فى التكفل بشأنها و القيام باصلاح مهماتها"

حاصل کلام یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں مقصد بیان یہ ہے کہ وہ تمام کے تمام حضرت مریم کی کفالت میں رغبت کر رہے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کے امور کی مصلحت کو میں قائم کروں۔

ایک کہتا تھا یہ حق مجھے مل جائے، دوسرا کہتا تھا یہ حق مجھے مل جائے، قرعہ اندازی سے پہلے ہر ایک کا یہ کہنا اسے جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور قرعہ اندازی کے وقت ایک مرتبہ قرعہ ڈالا گیا، جو حضرت زکریا علیہ السلام کے نام پر نکلا، انہوں نے کہا پھر قرعہ ڈالتے ہیں، دوسری مرتبہ آپ کے نام پر نکلا، تو پھر کہنے لگے تیسری مرتبہ قرعہ ڈالتے ہیں، پھر آپ کے نام پر

نکلتا۔قرعہ اندازی کے وقت تین مرتبہ قرعہ ڈالنے کے مطالبہ کو جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا۔قرعہ اندازی کے بعد ہر ایک کا حسرت بھرا جملہ کاش میرے نام قرعہ نکلتا، مجھے کفالت کا حق ملتا اسے جھگڑا سے تعبیر کر دیا گیا۔ (کبیر بوضاحت)

قرعہ اندازی جائز ھے :

قرعہ اندازی کے جواز پر یہ دلیل پائی گئی ہے۔

❁ روی عن النبی ﷺ انه کان اذاارادسفراقرع بین نسائه"

روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی ازواج مطہرات کے نام پر قرعہ ڈالتے۔جس کے نام قرعہ نکلتا،آپ اسے ساتھ لے جاتے تھے۔سفر ساتھ لے جانے کیلئے اپنی ازواج کے نام قرعہ ڈالنا واجب نہیں بلکہ صرف ان کے دل کی خوشی اوران کی رضاء مندی حاصل کرنے کیلئے بہتر ہے کہ قرعہ ڈال لیا جائے۔اگر خاوند بغیر قرعہ اندازی کے جسے چاہے سفر میں ساتھ لے جائے تو یہ اس کیلئے جائز ہے۔ (احکام القرآن للجصاص بوضاحت)

حضرت مریم کوصدیقیت حاصل تھی نبوت نہیں:

ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے،اس میں حضرت مریم کی بہت شان بیان کی گئی، بڑی شان کے باوجود آپ کو نبوت حاصل نہیں تھی،"والنبوة لیست اولی للنساء" نبوت عورتوں کیلئے بہتر نہیں کیونکہ نبی کیلئے ضروری ہے کہ وہ باہر نکلے،لوگوں کے سامنے جا کر انہیں تبلیغ کرے "وحالهن الاستتار ولا تکون النبوة فی حقهن کما لا بل الکمال فی حقهن الصدیقیة وهی قریب من النبوة" اورعورتوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ پردے میں رہیں لھذا نبوت ان کے حق میں کمال نہیں، بلکہ ان کے حق میں صدیقیت کمال ہے اس لئے کہ صدیقیت نبوت کے قریب ہے۔

"والصدیق من صدق فی جمیع اقواله وافعاله واحواله" صدیق وہ ہے جو اپنے تمام اقوال اور افعال اوراحوال میں سچا ہو۔یہ مقام عورتوں کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ "فمن النساء کاملات عارفات واصلات الی مقام الرجال فهن رجال فی المعنی" بعض عورتیں بھی کامل ولایت کے درجہ میں ہوتی ہیں مقام معرفت ان کو حاصل ہوتا ہے گویا کہ وہ مردوں کے مقام ولایت معرفت تک پہنچی ہوتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ حقیقت میں وہ نیکی وتقوی میں مردوں کا درجہ حاصل کئے ہوتی ہیں۔

بعض بزرگوں سے کسی نے پوچھا ابدال کتنے ہیں؟ توانہوں نے جواب دیا "اربعون نفسا" چالیس نفوس ہیں۔انہیں کہا گیا کہ آپ نے یہ کیوں نہیں کہا چالیس مرد ابدال ہیں۔توانہوں نے کہا "لان فیهم النساء" اس لئے کہ چالیس ابدال میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔

ولو كان النساء كمن ذكرنا　　لفضلت النساء على الرجال

فلاالتانيث لاسم الشمس عيب　　ولا التذكر فخر للهلال

اگر عورتیں ایسی ہو جائیں جس طرح ہم نے ذکر کیا۔تو وہ عورتیں عام مردوں سے فضیلت والی ہوں گی۔شمس (سورج) کے لفظ میں تانیث اس کیلئے عیب نہیں۔ ہلال (چاند کے لفظ میں تذکیر اس کیلئے کمال نہیں۔

حکایت: حضرت شیخ ابوعبداللہ بن خفیف کی والدہ ام محمد عبادت کرنے والی، خشوع وخضوع سے کام لینے والی تھیں، ان کا بیٹا ابوعبداللہ رمضان کی آخری دس راتوں کو اپنے گھر کی چھت پر نماز ادا کرتا، رات کو جاگے رہتا تا کہ لیلۃ القدر کے انوار کی تجلیات کو پالے، ام محمد اپنے گھر کے اندر نماز ادا کرتیں، توجہ صرف رب تعالیٰ کی طرف ہوتی لیلۃ القدر کے انوار کی تجلیات کی طرف توجہ کم ہوتی لیکن خود بخود ان پر تجلیات کا ظہور ہو گیا، انہوں نے اپنے بیٹے ابوعبداللہ محمد کو پکارا "یا محمد الذی تطلبه هو عندنا فتعال" اے محمد جسے تم چھت پر تلاش کر رہے ہو وہ ہمارے پاس ہے آؤ اس کا مشاہدہ کرلو، برکت حاصل کرلو۔ جب وہ اترے اور انہوں نے انوار کو دیکھا تو ماں کے قدموں پر گر گئے وہ اکثر طور پر کہا کرتے تھے کہ جب میں نے انوار کا مشاہدہ کیا تو مجھے اپنی ماں کی قدر ومنزلت کا پتہ چل گیا کہ وہ کس درجہ کی عابدہ، زاہدہ، طاہرہ ہیں۔

جب ماں کا یہ مقام ہے کہ وہ اپنے بیٹے پر اپنی ریاضت وعبادت کے ذریعے فوقیت لے گئیں، بیٹے کی انہوں نے راہنمائی کی تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا "فظهر ان من النساء من هي افضل من الرجال وذلک بالوصول الى جانب القدس" کہ بعض عورتیں اللہ تعالیٰ کے تقرب کی وجہ سے عام مردوں پر فضیلت حاصل کرلیتی ہیں۔ یہ مقام ان خوش قسمت عورتوں کو حاصل ہو گا جن پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فیضان ہو گا، اور ان کو اس مقام کے حصول کی استعداد اور ہدایت خاصہ ہو گی "اسعدنا الله وایاکم"

علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ (جن کی وفات ۱۱۳۷ھ کو ہوئی) اپنے زمانہ کی عورتوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ونعوذ بالله من نساء زماننا حيث لايرى فيهن من هي من اهل التقوى"

اللہ کی پناہ ہمارے زمانہ کی عورتوں سے جہاں ان میں کوئی تقویٰ والی نظر نہیں آتی ان عورتوں پر تو یہ حدیث نبوی سچی آرہی ہے۔

❁ قال رسول الله ﷺ صنفان من اهل النار لم ارهما قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤسهم كاسنمة البخت المائلة لايدخلن الجنة ولا يجدن ريحها وان ريحها ليوجد من مسيرة كذا و كذا" (رواه مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو قسمیں جہنمی ہوں گی، میں نے ان دونوں کو دیکھا نہیں (ان دونوں میں سے ایک وہ) قوم

ہوگی جن کے پاس کوڑے ہوں گے جیسے گائے کی دم، اسکے ساتھ لوگوں کو ماریں گے، (اور دوسری قسم وہ) عورتیں ہوں گی جو لباس پہنے ہوئے بھی ننگی ہوں گی وہ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی، خود غیروں کی طرف میلان کریں گی ان کے سر بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ہوں گے وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی، اور نہ ہی جنت کی خوشبو پائیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو تو اتنے اتنے مسافت سے آجائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(لم ارهما) يعني في عصره عليه السلام لطهارة ذلک العصر بل حدثا بعده "

میں نے ان کو دیکھا نہیں یعنی اپنے زمانہ میں میں نے انہیں نہیں دیکھا وجہ اسکی یہ تھی کہ آپ کا زمانہ پاکیزہ زمانہ تھا یہ دونوں قسمیں بعد کی پیداوار ہیں جن کے متعلق آپ نے پہلے ہی ارشاد فرما دیا (قوم معهم سياط) ایک قوم ہوگی جن کے پاس (یعنی جن کے ہاتھوں میں) کوڑے ہوں گے (کأذناب البقر) جو گائے کے دم کی طرح ہوں گے۔

"وهم الذين يضربون بها السارقين عراة او الطوافون على ابواب الظملة كالكلاب يطردون الناس عنها بالضرب والسباب "

یہ وہ لوگ ہوں جو چوروں کو ننگا کر کے ماریں گے، یا وہ لوگ ہوں گے جو ظالموں کے دروازوں پر چکر کاٹیں گے یعنی ان کے دربان ہوں گے ان کے پاس آنے والے لوگوں کو کتے کی طرح ہانکیں گے، انہیں ماریں گے اور ان کو گالیاں دیں گے۔

سبحان اللہ! آج کے دور میں مصطفیٰ کریم ﷺ کا ارشاد جگمگا رہا ہے۔ حکام کے دروازوں پر پولیس کے پہرہ دار کا یہی حال ہے مطلقاً پولیس کا انداز گفتگو یہی ہے اور ان کے پاس چابک کا ہونا، غریب بے بس لوگوں پر ظلم کا ڈھانا ان کا خاص طریقہ ہے۔

(نساء كاسيات عاريات) دوسری قسم عورتوں کی ہے جو لباس پہنے ہوئے ننگی ہوں گی، یعنی ظاہری لباس ہوگا لیکن تقوی کے لباس سے خالی ہوں گی، اور لباس اسطرح کا باریک ہوگا جس سے ان کے جسم نظر آرہے ہوں گے، یا لباس ہی ادھورا ہوگا آدھے جسم پر لباس ہوگا، آدھا جسم ننگا ہوگا۔

آج آپ دیکھیں تو (العیاذ باللہ) حکومت کی سربراہی میں ایسی عورتیں لاکھوں یا کروڑوں نظر آئیں گی جن کی نشاندہی میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے کردی۔ غیر مردوں کو اپنی طرف دعوت دینا اور خود ان کی طرف میلان کرنا" میرے حبیب پاک کا ارشاد دیکھنا ہو تو، دفاتر، ہسپتالوں، اداکاروں کی محافل، ویگن کے سفر، گلی کوچوں میں پھرنے والیوں اور خاص خاص اڈوں پر بیٹھ کر دعوت گناہ دینے والیوں کو دیکھئے، تو آپ کو مصطفیٰ کریم ﷺ کی

صداقت اوراس کا وجود نظر آجائے گا۔ان کے سربختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ہوں گے یعنی وہ تکبرانہ انداز پر سروں کو بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ایک طرف جھکاتے ہوئے چلیں گی اور سروں پر پگڑی نما اشیاء رکھ کر سروں کو اونٹوں کی کوہانوں کی طرح بلند کیے ہوں گی۔ (ماخوذ از روح البیان بتصرف)

"اسلام میں عورت کا مقام" سے ایک ورق:

راقم نے اپنی کتاب "**اسلام میں عورت کا مقام**" میں اس حدیث پاک کی وضاحت یوں کی ہے "**ھذا الحدیث من معجزات النبوۃ فقد وقع ھذان الصنفان وھما موجودان**" یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے معجزات سے ہے کیونکہ آپ نے جوخبر دی وہ واقع ہو چکی ہے کیونکہ یہ دونوں قسمیں موجود ہیں۔

☆ راقم کے خیال میں پہلی قسم سے مراد آج کی پولیس ہے جو ظالم اور درندہ لوگ ان میں زیادہ پائے جاتے ہیں نیک اور شرفاء کم۔ پیسے لے کر قاتل کو چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں پر مظالم ڈھاتے رہتے ہیں، چوروں کو چھوڑ دیتے ہیں، شرفاء کو پکڑ لیتے ہیں ہر وقت ان کے پاس گائے کی دم کی طرح ڈنڈا موجود رہتا ہے۔

☆ اسی طرح ان سے مراد چور، ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے کی طرح رائفلیں کلاشنکوف لئے پھرتے ہیں ہر وقت ان کے پاس گائے کی دم کی طرح ڈنڈا یعنی اسلحہ موجود رہتا ہے لوگوں کو مار مار کر لوٹ رہے ہیں۔

☆ بدقماش لوگ جو بازاروں اور گلی کوچوں میں لوگوں پر ظلم کرنے والے ہیں، وہ ابھی ایسے ہی لوگ ہیں ان پر بھی حدیث پاک کا صادق آنا واضح ہے، وہ بھی شرفاء پر مظالم ڈھانے میں کم نہیں۔

☆ سرداری نظام میں نام نہاد سردار، وڈیرے جو غرباء کو ناجائز طریقہ سے تنگ کرتے ہیں وہ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

دوسری قسم کی تفصیل علامہ نووی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے عورتوں کو ڈھانپا ہو گا لیکن وہ شکر کرنے سے عاری ہوں گی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے بعض بدن ڈھانپ رکھے ہوں گے اور بعض بدن کو اپنا جمال ظاہر کرنے کیلئے ننگا رکھا ہوگا۔ اگر کل لباس ہوا بھی گا تو اتنا باریک ہوگا کہ ان کے جسم کا رنگ نظر آ رہا ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور فرائض کی بجا آوری سے ہٹ کر ایک طرف میلان کرنے والی ہوں گی یعنی فرائض پر عمل کرنے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کر رہی ہوں گی اور دوسری عورتوں کو بھی اپنی بری حرکات کی طرف

راغب کر رہی ہوں گی، اسی طرح کندھوں کو نازنخرہ سے ہلا ہلا کر، فاحشہ بن کر چل رہی ہوں گی اور دوسری عورتوں کو بھی یہی سبق سکھا رہی ہوں گی۔

(یہ معنی مائلات اور ممیلات کا علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے، اور روح البیان نے بہت مفید معنی جو بیان کیا ہے وہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) تکبرانہ انداز پر سروں کو بختی اونٹوں کی کوہانوں کی طرح ایک طرف جھکاتے ہوئے چلیں گی، اور سروں پر پگڑی نما اشیاء رکھ کر سروں کو اونٹوں کی کوہانوں کی طرح بلند کئے ہوں گی۔

اب آپ دیکھیں کہ ہماری فیشن پرست لڑکیاں جو لباس پہنتی ہیں کیا وہ اس لباس کے باوجود ننگی نہیں ہوتیں؟ وہ کس طرح مٹک مٹک کر چلتی ہیں اور سروں پر جو انہوں نے مصنوعی جوڑے (وگ) رکھے ہوتے ہیں کیا وہ اونٹ کے کوہان کی طرح نظر نہیں آتے؟ وہ اپنا انجام دیکھ لیں، حضور ﷺ نے اپنے نور نبوت سے چودہ سو سال پہلے ہی آج کی مغربی تہذیب کی دلدادہ عورت کی کس طرح نشاندہی فرما دی، اللہ تعالیٰ ہمیں شرم حیاء عطاء فرمائے۔

کاش کہ عورتیں اس طرح چادریں اوڑھ کر نکلیں جن سے ان کا تمام جسم ڈھانک دیا جائے تو انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے گا کہ یہ عفت مآب اور عصمت شعار مؤمنہ ہے، کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ اس کی طرف بری نظر اٹھا کر دیکھ سکے، نیز اگر عورت شرم وحیا کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے اور بن سنور کر باہر نہ نکلے، اپنے لباس اور اپنی چال سے کسی کو دعوت نظارہ نہ دے تو کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ اس کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھے۔

(ماخوذ از نووی شرح مسلم وضیاء القرآن، بحوالہ اسلام میں عورت کا مقام از ص ۱۹۹ تا ۲۰۱)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ (آیۃ نمبر ۴۵)

(1) اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام ہے مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رو دار ہوگا دینا اور آخرت میں اور قرب والا۔

(2) یاد کرو جب کہا فرشتوں نے اے مریم بیشک اللہ خوشخبری دیتا ہے تمہیں ایک کلمہ کی اپنی طرف سے، جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وجاہت والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں، اور خاص قرب والوں سے ہوگا۔

مختصر مطلب: تقریبا ترجمہ سے ہی مختصر مطلب واضح ہے کہ جبریل نے حضرت مریم کو اللہ تعالی کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالی تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ (کلمہ عیسی علیہ السلام کا لقب ہے) کی خوشخبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسی ابن مریم ہوگا، وہ دنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور قدر و منزلت والا ہوگا، اور اللہ تعالی کے مقرب انبیاء کرام سے ہوگا، یعنی وہ نبی ہوگا اور اللہ تعالی کا مقرب ہوگا۔

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''یاد کرو جب کہا فرشتوں نے۔''

''اذ'' مفعول فیہ ہے ''اذکر'' مقدر کا، اسی وجہ سے اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''یاد کرو جب'' راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔

''ملائکہ'' اگر چہ جمع ہے لیکن مراد اس سے جبریل ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، وجہ وہی ہے کہ ذکر جمع، مراد واحد ہے، یہ مجاز ہے، یا وجہ یہ ہے کہ جبریل کے ساتھ اعزازی طور پر فرشتوں کی جماعت آتی تھی، اسلئے اگر چہ حضرت مریم سے کلام کرتے صرف جبریل تھے لیکن دوسرے فرشتے ساتھ تھے لھذا صیغہ جمع کا ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾

''اے مریم بیشک اللہ خوشخبری دیتا ہے تمہیں ایک کلمہ کی اپنی طرف سے''

حضرت عیسی علیہ السلام کو کلمہ کیوں کہا گیا؟ ابھی قریب ہی یہ بحث وضاحت سے بیان ہو چکی ہے

کہ "کلمہ" سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، ان کو چند وجوہ سے کلمہ کہا گیا ہے ﴿مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے، یہاں البتہ موقع ومحل کی مناسبت سے دو وجہ ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ ہر نطفہ کا قرار ماں کی رحم (بچہ دانی) میں اللہ تعالی کے کلمہ "کــن" سے ہوتا ہے، لیکن اس میں مشہور سبب پایا جاتا ہے، یعنی باپ کا ہونا اور مجامعت سبب ہے، عیسی علیہ السلام کا کوئی باپ نہ تھا، اس لئے آپ کی نسبت کلمہ "کــــن" کی طرف کامل اور اتم ہوگئی، اسلئے آپ کو کلمہ کہا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جسے کامل جود، کامل کرم، کامل اقبال حاصل ہوتو مبالغہ کے طور پر کہا جاتا ہے "انـه نـفـس الـجـود ومـحـض الكرم وصـريـح الاقبال" بیشک فلاں شخص عین جود، عین کرم، عین اقبال ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح عادل بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے "انـه ظـل الله في ارضه" بیشک وہ اللہ کی زمین میں اللہ کا سایہ ہے، "انـه سبب لـظهـور ظل العدل" یعنی اس کے عدل کا سایہ لوگوں پر ظاہر ہے۔ اسی طرح احسان کرنے والے بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے "انـه نـور الـلـه" بیشک وہ اللہ کا نور ہے" اس کا مطلب یہ ہے "نـور احسـانـه ظاهر" کہ اس کے احسان کا نور ظاہر ہے یعنی اس کا احسان روشن ہے، جگمگا رہا ہے۔ اسی طرح عیسی علیہ السلام کے کثرت بیان کی وجہ سے اور شبہات اور تحریفات کے ازالہ سے اللہ تعالی کا کلام ظاہر ہوا، اسی وجہ سے آپ کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

بشارت کسے کہتے ہیں؟ بشارت وہ خوشی کی خبر ہے جسے سن کر چہرہ کھل کھلا اٹھے، زیادہ وضاحت دیکھنی ہو تو ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾ کی بحث "نجـوم الفرقان" کو دیکھئے۔

"بـكلمة منه" بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ "منه" میں ضمیر "كلمة" کی طرف لوٹ، جو لفظ مؤنث ہے، تو ضمیر مذکر کی کس طرح لوٹ رہی ہے؟ اسی کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لفظ نکالا گیا ہے "ای ولـد" کلمۃ سے مراد "ولـد" ہے اور "ولد" مذکر ہے لھذا ایسا لفظ جو مؤنث ہو اور اس کا معنی مذکر ہو اس کی طرف مذکر کی ضمیر لوٹانی جائز ہے۔

خازن میں جواب یہ دیا گیا ہے کہ "کلمۃ" عیسی علیہ السلام کا لقب ہے، اسلئے ضمیر "مسمی" یعنی عیسی علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، اسلئے ضمیر مذکر کی لائی گئی۔

خوبصورت بحث:

"منه، ای الله" یعنی فرشتوں نے مریم کو کہا بیشک اللہ تمہیں بشارت دیتا ہے ایک کلمہ کی جو کلمہ اللہ نے اپنی طرف سے بھیجا۔

اعلیٰ حضرت کا خوبصورت محققانہ ترجمہ دیکھئے ''اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی''

"منہ" میں ''من'' ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی میں بھی ''من'' ابتدائیہ استعمال ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ان اللہ خلق نور نبیک من نورہ'' بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔ اس حدیث پاک میں ''من نورہ'' میں 'من' ابتدائیہ ہے۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ایک عیسائی ہارون الرشید کے پاس آیا وہاں ایک عالم حسن بن علی واقدی بھی موجود تھے، اس نصرانی نے خلیفہ اور عالم دونوں کو مخاطب بناتے ہوئے یہ کہا کہ قرآن میں ایک آیۃ ہے جو دلالت کر رہی ہے ''ان عیسی جزء من اللہ'' کہ بیشک عیسیٰ اللہ کی جزء ہیں ''یعنی جب جزء ہونا ثابت ہے تو بیٹا ہونا خود بخود ثابت ہو گیا'' صاحب علم یعنی حسن بن علی واقدی نے اس نصرانی سے پوچھا وہ کون سی آیۃ ہے جس سے تم دلیل پکڑ رہے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جزء ہیں، اس نے یہی آیۃ زیر بحث ذکر کی ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَةٍ مِّنْہُ﴾ اور دلیل یوں پیش کی ''فمن للتبعیض فمقتضی ذلک انہ جزء منہ'' کہ آیۃ کریمہ میں ''منہ'' میں ''من'' تبعیض کیلئے ہے لھذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کا بعض اور جزء ہوں، جب جزء یت اور بعضیت ثابت ہو گی تو خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہیں۔ تو حسن بن علی واقدی نے فی البدیہ جواب دیا کہ اگر ہر جگہ ''من'' تبعیضیہ مانا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے متعلق تم کیا جواب دو گے ﴿وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ﴾ اور مسخر کیا (تابع بنایا) تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی طرف سے ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں بھی ''منہ'' لفظ استعمال ہے، کیا زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی جزء اور بعض ہیں، اور کیا تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں؟ ''فبھت النصرانی واسلم'' نصرانی مبہوت ہو گیا، آگے اس سے کوئی جواب نہ بن سکا، لاجواب ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ''واغدق الخلیفة علی الشیخ اغداقا عظیما'' خلیفہ نے شیخ حسن واقدی کو بہت بڑا انعام عطاء کیا کہ اس نے اچھا جواب دیا کہ ایک نصرانی عالم نے اسلام قبول کر لیا۔ (ماخوذ از صاوی بوضاحت)

پہلے حکمران اس پر خوش ہوتے تھے کہ کوئی عیسائی مسلمان ہو جائے، آجکل کے حکمران یہود و نصاریٰ کے اتنے پٹھو بن گئے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان وضع و تمدن کے لحاظ پر یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح نظر آئیں۔

﴿ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ ﴾ ''جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔''

سوال: مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے، اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے، اور آپ کا نام عیسیٰ ہے، تین کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ صرف ایک کیوں نہیں ذکر کر دیا۔

جواب: ''ویجاب بأنه لما كان لايتميز الابهذه الاشياء كلها جعلت اسما واحدا'' مقصد اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام لوگوں سے ممتاز کر کے ذکر کرنا ہے، وہ اسی وقت حاصل ہوتا تھا جب تینوں کو ذکر کر کے ایک نام کی حیثیت دی جائے۔ (صاوی)

بظاہر ایک اور وہم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نام پہلے ذکر نہیں کیا اور لقب مسیح پہلے ذکر کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''اسمہ'' کی ضمیر ''عیسیٰ'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اسلئے معنوی لحاظ پر وہ پہلے ہی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہنے کی وجہ:

آپ کو مسیح کہنے کی چند وجوہ ہیں۔ خیال رہے کہ مسیح فعیل کا وزن ہے، فعیل کبھی بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے، اور کبھی بمعنی مفعول کے۔ اگر بمعنی فاعل کے ہو تو آپ کو مسیح کہنے کی یہ وجوہ ہیں۔

(۱) جب کوئی شخص آفت زدہ ہوتا یعنی کسی بھی مرض میں مبتلاء ہوتا تو آپ اس پر ہاتھ پھیرتے تھے تو اس کو شفاء حاصل ہو جاتی۔

(۲) ''مسح الارض'' لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے زمین کو قطع کرنا، یعنی سفر کرنا اور سیر کرنا، آپ بھی چونکہ ایک جگہ پر ساکن نہیں رہتے تھے بلکہ چلتے پھرتے رہتے اسلئے آپ کو مسیح کہا گیا۔

(۳) آپ اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس لئے آپ مسیح ہوئے۔

اور اگر فعیل بمعنی مفعول استعمال ہو تو آپ کو مسیح کہنے کی یہ وجوہ ہوں گی:

(۱) ''مسح'' کا ایک معنی ہوتا ہے ''مٹا دینا'' اس معنی کے لحاظ پر آپ کو اس لئے مسیح کہا گیا کہ آپ سے گناہوں اور گناہوں کے بوجھ اور گناہوں کی آلودگی کو مٹا دیا گیا تھا یعنی آپ کو رب تعالیٰ نے گناہوں سے دور رکھا ہوا تھا۔

(۲) آپ کے قدموں سے نشیب کو مٹایا ہوا تھا، یعنی آپ کے قدم بالکل سیدھے تھے۔ عام آدمیوں کی طرح نہیں تھے کہ قدموں کے تلووں کا کچھ حصہ زمین پر نہیں لگتا کیونکہ اس میں نشیب ہوتا ہے۔

(۳) آپ کو زیتوں کا مبارک تیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگا دیا گیا تھا جو تمام انبیاء کرام کو لگایا جاتا تھا جس سے

فرشتوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس ہستی کو نبی بنایا جائے گا۔

(۴) جبریل نے آپ کو اپنے پروں سے مس کیا تھا تا کہ آپ شیطان کے مس سے محفوظ رہیں۔

(۵) آپ جب والدہ کے پیٹ سے باہر تشریف لائے تو آپ کو تیل لگا ہوا تھا عام بچوں کی طرح آپ کے بالوں کو تیل لگانے کی ضرورت درپیش نہیں آئی۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: دجال کو بھی مسیح کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ممسوح العین ہوگا، یعنی اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گی (کانڑا ہوگا) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ زمین کو قطع کرے گا مختلف علاقوں میں پھرے گا۔

اسی مقام پر روح المعانی میں مذکور ہے کہ امام نخعی نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالی کے نبی عیسی علیہ السلام کا جب لقب ہوگا تو اس وقت "مسیـــح" میم کے فتحہ اور سین کی تخفیف، سے پڑھا جائے گا۔ جب اللہ تعالی کے دشمن دجال کا لقب ہوگا تو "مسیح" میم کے کسرہ اور سین کی شد" سے پڑھا جائے گا۔ (روح المعانی)

فائدہ: مسیح آپ کا لقب ہے اور عیسی نام ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے، آپ کا لقب ایسا ہے جو آپ کی شرافت اور مراتب کی بلندی پر دلالت کر رہا ہے جس طرح صدیق لقب ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا، اور فاروق لقب ہے عمر رضی اللہ عنہ کا، ان کے القاب بھی ان کی شرافت اور بلندی مراتب پر دال ہیں، اللہ تعالی نے آپ کے لقب کو پہلے ذکر کیا تا کہ ابتدائی طور پر ہی آپ کی شان کا ہر شخص کو پتہ چل جائے۔

خیال رہے کہ بشارت بھی حضرت مریم کو دی جا رہی ہے، اور پھر ابن مریم بھی کہا جا رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام انبیاء کرام کو ان کے آباء کے ناموں کی طرف منسوب کیا، آپ کو ماں کی طرف منسوب کیا، تا کہ حضرت مریم کو ابتدائی بشارت کے وقت ہی پتہ چل جائے کہ میرا بیٹا بغیر باپ کے ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ "وجاہت والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں۔"

"وجیہ" کا معنی صاحب مرتبہ، صاحب شرافت اور صاحب قدر و منزلت ہے۔ "وجہ الرجل یوجہ وجاھۃ فھو وجیـــہ" یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی شخص کا مرتبہ لوگوں یا بادشاہ کے نزدیک زیادہ بلند و بالا ہو اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے "الوجیـــہ" الکریم "یعنی" وجیہ" کا معنی ہے الکریم "کیونکہ انسان کے تمام اعضاء سے اشرف اس کا چہرہ ہے، اس لئے "الوجہ" کا معنی بطور استعارہ "کرم اور کمال" لیا جاتا ہے۔

آپ دنیا میں وجیہ تھے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات تھے آپ کی دعاء سے اللہ تعالی نے مردوں کو زندہ کیا

،اور مادرزاد اندھوں کو نظر عطاء فرمائی ،اور برص والے مریضوں کو برص سے نجات دی اور دنیا میں آپ کے وجیہ ہونے کی اور وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام عیوب سے بری رکھا جو یہود آپ پر لگاتے تھے ،یعنی آپ کا حقیقت میں عیوب سے بری ہونا ہی آپکے وجیہ ہونے کا سبب تھا۔ اگرچہ آپ پر یہود عیب لگاتے رہے لیکن آپ کی شان میں کوئی فرق نہ آسکا۔

یہود اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی عیب لگاتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی وجیہ کا لقب عطاء فرما ﴿وَكَانَ عِندَ اللّٰهِ وَجِيهًا﴾ اس طرح ان سے بھی یہود کے بیان کردہ عیوب سے پاک رکھا۔

عیسیٰ علیہ السلام آخرت میں بھی وجیہ ہوں گے ،کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے مؤمنین کو حق راہ پر چلنے والوں کا شفیع بنایا ،آپ کی شفاعت کو دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شفاعت کی طرح قبول کیا جائے گا۔ (ماخوذ از بیر)

اور وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ذریعے زیادہ ثواب اور بلند مرتبہ عطاء فرمائے گا۔

﴿وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾ ''اور خاص قرب والوں سے ہوگا''

اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کی عظیم مدح کرتے ہوئے انہیں اپنے مقربین کہا تو آپ کو بھی یہی صفت عطاء فرمائی کیونکہ آپ بھی بلند مراتب اور رفیع درجات رکھتے ہیں اور فرشتوں کے ساتھ ہی زندہ رہیں گے۔ نیز آخرت میں جس شخص کو وجیہ بنایا گیا اس نے مقرب تو ہونا ہی ہے کیونکہ اسے جنت کے اعلیٰ مراتب عطاء ہوں گے۔ (ماخوذ از بیر)

(ومن المقربين)معطوف على قوله "وجيها" وتقديره "ومقربا من جملة المقربين"

یعنی عیسیٰ علیہ السلام مقرب ہوں گے اور مقربین میں داخل ہوں گے۔ طلباء کرام ذہن میں رکھیں کہ "ومن المقربين" کا عطف "وجيها" پر ہے مقربین کون لوگ ہوں گے؟ وهو تقريب من الله تعالى بالمكانة والشرف وعلوا المنزلة " یہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی شرف حاصل ہوگا اور ان و بلندی مراتب حاصل ہوگی۔ اور رب تعالیٰ کے خصوصی درجہ حاصل ہوگا۔ (البحر المحیط)

یقیناً سب سے زیادہ قرب اور درجات کی بلندی انبیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے۔ اسلئے آیۃ کریمہ میں مذکور الفاظ گرامی ﴿ومن المقربين﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نبی ہوں گے جس کی وجہ سے آپ کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا اور آپ دوسرے انبیاء کرام سے ہوں یعنی دوسرے انبیاء کرام مقربین میں داخل ہوں گے۔

(ومن المقربين)يعني عند الله يوم القيامة لان اهل الجنة منازل ودرجات ومنازل

الانبیاء و درجاتھم اعلی من سواھم" (خازن)

تمام جنتی لوگوں کے مراتب اور درجات ہوں گے لیکن انبیاء کرام کے مراتب و درجات اور ہی زیادہ بلند ہوں گے۔آپ چونکہ نبی ہوں گے اور دوسرے انبیاء کرام میں سے ہوں گے یعنی ان کے ساتھ ہوں گے اس لئے آپ مقرب ہوں اور مقربین سے ہوں گے۔

گزشتہ سے پیوستہ:

طلباء کے فائدہ کیلئے تفسیر کبیر سے ایک عبارت نقل کی جارہی ہے۔اگرچہ سوال وجواب پہلے ذکر کیا جاچکا ہے

"الاسم علامة المسمی و معرف له فکأنه قیل الذی یعرف به و مجموع هذه الثلاثة"

اسم کا معنی ہے "مسمی" (جس کا نام ہے) اس کیلئے اسم علامت اور پہچان کا ذریعہ ہے آپ کے تین نام ذکر کر کے یہ واضح کر دیا کہ ان تینوں کا مجموعہ آپ کو دوسرے لوگوں سے کامل طور پر ممتاز کر رہا ہے۔ (از کبیر)

لفظ "عیسی" عبرانی لفظ ہے، اصل میں ایشوع تھا جس کا معنی سردار، اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اصل میں عربی لفظ ہے (لیکن عربی والے قول کو شیخ زادہ میں تکلف کہا گیا ہے اگر عربیت کا قول صحیح ہو تو مشتق ہوگا "عیس" سے جس کا معنی ہے "هو البیاض المشرب بحمرة" سفید سرخ رنگ ملا جلا ہو آپ کا رنگ ایسا تھا تو اسی وجہ سے آپ کا نام عیسی رکھ لیا گیا لیکن صحیح یہی ہے کہ لفظ عبرانی ہے، عربی نہیں۔ (صاوی)

مسیح کے دو معنی ایک دوسرے کی ضد کے طور پر بھی آتے ہیں مسیح کا معنی صدیق، اس معنی کے لحاظ پر عیسی علیہ السلام کو مسیح کہا گیا، اور مسیح کا معنی "کذاب" اس معنی کے لحاظ پر دجال کو مسیح کہا گیا۔ (ماخوذ از خازن)

نیچری مذہب:

ان آیات کے صاف اور سیدھے مطلب کو اسی قاعدہ فاسد پر "کہ معجزات محال ہیں کوئی چیز خرق عادت نہیں ہوسکتی" عجیب عجیب تاویلیں کر کے الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

چنانچہ نیچر مفسر نے اس مقام پر حضرت مریم کو غیب سے روزی پہنچے کا اور حضرت عیسی علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا انکار کیا، اور یہ تاویل کی ہے کہ عیسی یوسف نجار سے پیدا ہوئے تھے۔صرف یہ بات تھی کہ رخصت کر کے لے جانے سے پہلے یوسف مریم سے ہمبستر ہو گئے تھے چونکہ یہ بات یہود میں مذموم (بری) تھی جو دونوں کیلئے شرم وحیاء کا سبب بنا، (یہ مذہب درحقیقت یہود سے لیا گیا ہے وہ معاذ اللہ حضرت مریم کو یوسف نجار کی مزنیہ کہتے ہیں نیچریوں نے

منکوحہ کہا تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی)

اسی طرح زکریا اور مریم سے فرشتوں کا کلام کرنا وہ ان کا خیال مجسم یا خواب تھا، اور چونکہ اس مذہب کا یونانیوں میں رواج دینا منظور تھا اور ان میں ایسی باتیں ہمیشہ سے باعث بزرگی سمجھی جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ حکیم افلاطون کا حمل بھی بغیر باپ کے ان میں مشہور تھا، اس غرض سے عیسائی معلموں نے یہ بات مشہور کردی اور اسی مشہور بات کو مفسروں نے قرآن کی تفاسیر میں لکھ دیا۔ (حقانی جلد اول ص ۴۰۷)

نیچری مذہب باطل کیوں ؟:

اس لئے کہ ان لوگوں نے اپنے رائے کے مطابق قرآن کے معانی پیش کئے ہیں اس طرح کے لوگوں کے متعلق حدیث نبوی کو دیکھئے:

❁ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من قال فی القرآن برأیه فلیتبو أمقعده من النار وفی روایة من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبو أمقعده من النار " (رواه الترمذی، مشکوة کتاب العلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پاک کو رائے سے بیان کیا تو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنائے۔ ایک روایت میں رائے کہ جگہ ''بغیر علم'' کے الفاظ ہیں یعنی جس شخص نے بغیر علم کے قرآن پاک کو بیان کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا آگ بنائے۔

اس حدیث پاک کو دیکھئے، پھر نیچری مذہب کو دیکھئے جس کی دار و مدار اپنی رائے اور اپنی جہالت سے قرآن کو بیان کرنا ہے ارشاد مصطفوی ﷺ کے مطابق وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا رہے ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصَّالِحِيْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ۴۶)

(1) اور لوگوں سے بات کرے پالنے میں اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔

(2) اور کلام کرے گا لوگوں سے پنگھوڑے (پالنے) کی عمر میں، اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔

مہد سے مراد پنگوڑھا یا ماں کی گود' البتہ اس مقام پر یہ معنی لینا زیادہ بہتر ہے۔

"فانه يكلم الناس فی الحالة التی يحتاج الصبی فيها الی المهد"

بیشک وہ اس حالت میں لوگوں سے کلام کرنے والے ہوں گے جب بچہ پنگوڑھے (پالنے) کا محتاج ہوتا ہے۔ (از کبیر)

خواہ وہ پنگوڑھے میں ہو یا ماں کی گود میں، آپ نے بچپن میں ایک مرتنہ کلام فرمایا جس سے اپنی والدہ کی براءت بیان کی اور اپنے اوصاف بیان، پھر آپ نے خاموشی اختیار کی پھر عام بچوں کی طرح بولنے کے وقت بولنا شروع کیا یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور یہی معتبر ہے۔ البتہ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے جب سے کلام شروع فرمایا اسی وقت سے آپ نے اعلان نبوت بھی فرمادیا اور پھر آپ مسلسل تبلیغ فرماتے رہے لیکن یہ قول معتبر نہیں، تحقیق پر مبنی پہلا قول ہی ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب" (روح المعانی)

کہولیت یعنی بڑی عمر میں بھی آپ کلام فرمائیں گے، بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ بڑی عمر میں تو ہر شخص کلام کرتا ہے اس میں آپ کی فضیلت کیسے؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں کا رد پایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کے قائل ہیں کہ جو شخص پہلے چھوٹا ہو پھر بڑا ہو اس میں تغیر آتا ہے جس میں تغیر آئے وہ الٰہ نہیں بن سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے بچپن میں کلام کرنا والدہ کی پاک دامنی بیان کرنے کیلئے بھی معجزہ ہے اور بڑی عمر میں وحی اور نبوت کے ذریعے کلام کرنا بھی معجزہ ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ دونوں حالتوں کا ذکر ایک ساتھ ہے، کہ آپ بچپن میں اسطرح کلام فرمائیں گے جس طرح بڑی عمر میں کوئی کلام کرتا ہے، یعنی آپ کا بچپن کا کلام بڑی عمر کے کلام سے کوئی مختلف نہیں ہوگا۔

خیال رہے کہولیت سے مراد بڑھاپا نہیں بلکہ پختہ عمر ہے "ان الكهل فی اصل اللغة عبارة عن الكامل التام"۔ اصل میں کہولیت کی وہ عمر ہوتی ہے جس میں انسان کی عقل کامل ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

''الکھل بین حال الغلومة وحال الشیخوخة ''بچپن اور بڑھاپے کی عمر کے درمیان عمر کا کہولیت کی عمر کہا جاتا ہے۔
(قرطبی)

کبیر اور قرطبی کی عبارات کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ کتنا حسین وجمیل ہے اور تحقیق پر بنی ہے، آپ کے ترجمہ ہے (اور پکی عمر میں) راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ کہولیت کی عمر تیس سال سے لے کر چالیس سال کی عمر کو کہا جاتا ہے ایک قول کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تینتیس (33) سال کی عمر میں زندہ آسمانوں پر اٹھایا گیا، اور پھر آپ دنیا میں تشریف لا کر لوگوں سے کلام فرمائیں گے اور دجال کو قتل کریں گے، اس عمر میں آپ آسمانون سے اتر کر کلام کرنا آپ کا معجزہ ہے۔ لیکن زیادہ معتبر قول یہ ہے کہ آپ کو ایک سو تینتیس سال کی عمر میں آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ یہی تحقیق استاذی المکرم حضرت مولنا محمد اشرف سیالوی مدظلہ کی ہے۔

آپ کا صالحین سے ہونا:

اللہ تعالیٰ نے آپ کی عظیم صفات کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فامایا ''ومن الصالحین'' آپ صالحین سے ہوں گے، کیونکہ

''لا رتبة اعظم من کون المرء صالحا لانه لا یکون کذلک الا ویکون فی جمیع الافعال والتروک مواظبا علی النهج الاصلح والطریق الاکمل''

اس سے بڑھ کر کوئی اور مرتبہ نہیں کہ انسان صالح ہو اس لئے کہ صالح وہی ہو سکتا ہے جس کے تمام افعال خواہ ان کا تعلق عمل کرنے سے ہو یا عمل کے چھوڑنے سے ہو ہمیشہ وہ افعال بہتر اور کامل طریقہ پر ہوں۔

اس سے معلوم ہوا صالح ہونے کا تعلق تمام مقامات سے ہے خواہ ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے اسی طرح ایسے افعال جو دل سے متعلق ہوں یا ظاہری اعضاء سے تمام میں صالحیت ہوگی۔ (از کبیر)

انسان کے مختلف اطوار میں مختلف نام:

(۱) انه فی الرحم جنین'' جب وہ ماں کے پیٹ (بچہ دانی) میں ہو تو اسے ''جنین'' کہا جاتا ہے۔

(۲) ''فاذا ولد فولید'' جب بچہ پیدا ہو جائے تو وہ ''ولید'' کہلاتا ہے۔

(۳) ''فاذا لم یستتم الاسبوع فصدیع'' جب تک بچے پر ایک ہفتہ مکمل نہ ہو تو اسے ''صدیع'' کہا جاتا ہے

(۴) ''واذا دام یرضع فرضیع'' اور جب تک وہ ماں کا دودھ پیتا رہے تو ''رضیع'' کہا جاتا ہے۔

(۵) ''واذا لم فطم ففطیم'' جب وہ ماں کا دودھ پینا چھوڑ دے تو اسے ''فطیم'' کہا جاتا ہے۔

(۶) ''واذالم یرضع فحجوش'' جب وہ ماں کا دودھ نہ پی رہا ہو تو اسے ''جحوش'' کہا جاتا ہے۔

(۷) ''فاذادب ونما فدارج'' جب زمین پر گھسٹ کر چلانا شروع کردے اور بڑھنا شروع ہو جائے تو ''دارج'' کہلاتا ہے۔

(۸) '' فاذاسقطت رواضعه فمثغور'' جب اس کے دودھ والے دانت گر جائیں تو ''مثغور'' کہلاتا ہے۔

(۹) ''فاذانبتت بعد السقوط فمتغر بالتاء والثاء'' جب دانت گرنے کے بعد پھر دانت نکل آئیں تو اسے ''متغر''(تاء سے) یا ''مثغر''(ثاء سے) کہا جاتا ہے۔

(۱۰) ''فاذا كان يجاوز العشر فمترعرع وناشئ'' جب دس سال سے تجاوز کر جائے تو اسے ''مترعرع'' اور ''ناشئ'' کہا جاتا ہے۔

(۱۱) ''فاذا كان يبلغ الحلم فيافع وهراهق'' جب بلوغ کے قریب پہنچ جائے تو'' یافع '' اور ''مراهق'' کہلاتا ہے۔

(۱۲) ''فاذا احتلم فمحزور'' جب بالغ ہو جائے تو ''محزور ''(اور بالغ) کہلاتا ہے۔

''وهو في جميع هذه الاحوال غلام '' ان تمام صورتوں میں بچے کو غلام (اور بچی کو جارية) کہا جاتا ہے۔

(۱۳) ''فاذا خضر شاربه وسال عذاره فباقل'' جب اس کی مونچھوں اور رخساروں کے بال نکل آئیں تو اسے ''باقل'' کہا جاتا ہے۔

(۱۴) ''فاذا صار ذاقنا ففتى و شارخ '' جب اس کی ٹھوڑی پر بال آجائیں تو اسے ''فتی اور شارخ '' کہا جاتا ہے۔

(۱۵) ''فاذاكملت لحيته فمجتمع'' جب داڑھی مکمل ہو جائے تو اسے ''مجتمع'' کہا جاتا ہے۔

(۱۶) ''ثم مادام بين الثلاثين والاربعين فهو شاب '' پھر تیس سے لے کر چالیس سال تک اسے شاب کہا جاتا ہے۔لیکن زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ اٹھارہ سال سے تیس کے شخص کو ''شاب'' کہا جاتا ہے۔

(۱۷) ''ثم هو كهل الى ان يستوفى الستين'' پھر چالیس سال سے ساٹھ سال تک کے شخص کو ''کهل'' کہا جاتا ہے۔(لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ تیس سال سے چالیس سال تک کے شخص کو ''کهل'' کہا جاتا ہے) (البحر المحیط)

بڑھاپے میں مختلف اطوار پر مختلف نام:

شیب، پھر سمط، پھر شاخ، پھر کبر، پھر ھرم، پھر دلف، پھر خرف، پھر اہتر، پھر محاظلہ، کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

یہ بحث طلباء کرام کے فائدہ کیلئے لکھ دی، عوام بھی اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ عربی کلام میں کیا وسعت اور کیا کمال ہے ہاں ہاں مجھے عربی زبان اس لئے پسند ہے کہ یہ میرے محبوب ﷺ کی زبان ہے۔

یہود و نصاری جن لوگوں کے محبوب ہیں ان کو اپنے محبوں کی زبان پسند ہے، جھگڑا نہیں بلکہ اپنے اپنے محبوبوں کی بات ہے کسی محمد عربی ﷺ سے قرآن سے محبت ہے اور کسی کو یہود و نصاری سے محبت ہے وہ انگلش انگلش کی رٹ لگا رہا ہے کہ مولویوں کو بھی انگلش آنی چاہئے اب مولویوں نے انگلش پڑھنی شروع کر دی تاکہ اسلام کے مخالفین پر انگلش زبان سے ہی ضرب کاری لگائی جا سکے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ: "وحکی عن مجاهد قال قالت مریم کنت اذا خلوت انا وعیسی حدثنی وحدثته فاذا اشغلنی انسان سبح فی بطنی"

مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت مریم فرماتی ہیں جب میں اکیلی ہوتی تو عیسی میرے پیٹ میں میرے ساتھ کلام کرتے اور میں ان سے کلام کرتی، اور اگر کوئی اور شخص میرے پاس ہوتا تو عیسی میرے پیٹ میں تسبیح پڑھتے جسے میں سن رہی ہوتی۔ (سراج منیر بحوالہ حاشیہ جلالین) (معالم التنزیل)

"ومن الصالحین" سے آپ کی نبوت کی طرف اشارہ:

"(ومن الصالحین) ای کانا من الصالحین لا یتطرق الیه نوع من النقص والفساد فی الدین وذلک شان الانبیاء فکان معناه ومن النبین"

یعنی آپ صالحین سے ہوں گے، ان کے دین میں کسی قسم کا کوئی نقص اور فساد کا کھٹکا نہیں پایا جائے گا، یہ انبیاء کرام کی شان ہے، گویا کہ مطلب واضح ہو گیا کہ آپ نبیوں میں ہوں گے، یعنی آپ نبی ہوں گے، اور نبیوں کے ساتھ ہی ہوں گے۔ (ماخوذ از مظہری)

"ومن الصالحین" سے آپ کے کمال کو بیان کیا گیا:

"(ومن الصالحین) ای الکاملین فی الصلاح وهم سادات الرسل قال فی الصالحین لکمال"

"صالحین" سے مراد اس مقام میں وہ حضرات ہیں جن کو صلاح میں کامل درجہ حاصل ہے، وہ بلند مرتبہ رسول ہیں حضرت عیسی

علیہ السلام کے متعلق جب یہ کہا گیا "ومن الصالحین"

تو اس سے یہ واضح کر دیا گیا کہ آپ کو کمال حاصل ہوگا، آپ بلند شان والے نبی ہوں گے۔ (صاوی)

گہوارے میں کلام کرنا کون سا کمال ہے؟

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ عمر ہے جس میں عام بچے کلام نہیں کرتے، آپ کا اس معصومانہ عمر میں کلام کرنا آپ کا معجزہ ہے۔ خوبصورت انداز میں حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''یعنی گہوارے میں بھی وہ جو گفتگو کرے گا وہ بے معنی نہیں ہوگی، بلکہ اس میں بھی نبوت کا وقار اور رسالت کی سنجیدگی پائی جائے گی، اس وقت بھی جو الفاظ ان کی زبان سے نکلیں گے وہ حقائق سے لبریز ہوں گے، اس معصومیت کے زمانہ میں بھی وہ اللہ تعالی کی توحید اور اپنی رسالت کا ایسا زبردست اعلان کرے گا کہ کسی کو انکار کی مجال نہ رہے گی اس کا ذکر سورۃ مریم میں تفصیلا (انشاء اللہ) آئے گا اور یہی وہ معجزانہ پہلو ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر صحت مند بچہ پنگوڑھے میں باتیں کرنے لگتا ہے، لیکن انصاف کے ساتھ یہ کتنا ستم ہوگا اگر بچوں کو غوں غاں اور ان کے بے جوڑ اور بے معنی الفاظ کو حضرت عیسی علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام سے تشبیہ دی جائے۔ (ضیاء القرآن)

تفہیم القرآن کی ناقص لفاظی:

پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسب معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرے ہیں کہ (اللہ تعالی ما فی الضمیر) اور بیان مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ) (تفہیم القرآن)

''مافی الضمیر'' کا مطلب ہوتا ہے ''جو کچھ دل میں ہے'' اللہ تعالی اعضاء سے پاک ہے، وہ اپنے متعلق متشابہ الفاظ ذکر کرتا رہتا ہے، لیکن بندے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے الفاظ ذکر کرے جو شان الوہیت کے خلاف ہوں، اس لئے ''مافی الضمیر'' کا لفظ شان الوہیت کے خلاف ہے ''بیان مدعا'' پر اکتفاء کر لیا جاتا تو بہتر تھا۔ (راقم)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَایَشَآءُ اِذَاقَضٰی اَمْرًافَاِنَّمَایَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴾ (آیۃ نمبر ۴۷)

(1) بولی اے میرے رب میرے بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا، فرمایا اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا وہ فورا ہو جاتا ہے۔

(2) بولی اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ، حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی انسان نے، فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا تو بیشک وہ کہتا ہے اسے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ﴾ ''بولی اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ''

اس سوال میں ایک احتمال یہ ہے ''استفہام مجازی ہو''یعنی مراد تعجب ہے کیونکہ آپ نے عادۃ اسے بعید سمجھا کہ کنواری لڑکی کا بیٹا ہو بغیر کسی مرد کے چھونے کے، تو آپ نے تعجب کے طور پر یہ سوال کر دیا ہو۔

''ویحتمل ان یکون حقیقیا علی معنی انه یکون بتزوج اوغیرہ''

ایک اور احتمال یہ ہے کہ آپ کا سوال حقیقی طور پر ہو، پوچھنے کا مقصد یہ ہو کہ وہ بچہ نکاح سے ہوگا، یا بغیر خاوند کے صرف قدرت باری تعالی سے ہوگا۔

''ویحتمل ان یکون استھاما عن انه من ای شخص یکون'' اور ایک احتمال یہ ہے کہ سوال کا مطلب یہ ہو کہ کس شخص سے میرا بچہ ہوگا، میرا خاوند کون شخص ہوگا۔ (روح المعانی)

''انی یکون بمعنی این یکون''''انی یکون''این یکون'' کے معنی میں ہے۔ یہ ایک محاورہ کلام ہے کہ آپ بہت تعجب کرتے ہوئے کہا کہ وہ بچہ کہاں سے آنے کا، عادت تو یہی ہے کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ (اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے (میرا بچہ کہاں سے ہوگا)

او استفھام علی ان انی یکون بمعنی کیف یکون ھذا الولد ابتزوج یقع فی المستقبل ام یخلق اللہ تعالی ایاہ ابتداء ای من غیر مسیس''

یہ سوال ''انی یکون'' سے ''کیف یکون'' کا سوال ہے۔ یعنی میرا بچہ کیسے ہوگا۔ کیا یہ مستقبل کی بات ہے کہ بچہ نکاح سے خاوند

کے ذریعے ہوگا، یا کہ اس میں خاوند کا واسطہ نہیں ہوگا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ بچہ پیدا ہوگا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

راقم کا ترجمہ دوسری صورت کے مطابق ہے ''اے میرے رب کیسے ہوگا میرا بچہ''

﴿وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ﴾ ''حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی انسان نے۔''

راقم نے اپنے ترجمہ میں ''حالانکہ'' لفظ ذکر کیا ہے ''تفسیر ابی السعود'' کی اس عبارت کو دیکھ کر ''جملة حالية محققة للاستبعاد'' یہ جملہ حالیہ ہے بعد کو ثابت کر رہا ہے، کہ میں تو ابھی کنواری ہوں مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں، نہ میرا کوئی خاوند ہے، اور ﴿وَلَمْ اَکُ بَغِيًّا﴾ اور نہ ہی (معاذ اللہ) میں کوئی بدکارہ عورت ہوں۔ یہ عقل سے بہت بعید ہے، اسباب کے بغیر بچہ کیسے پیدا ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

''بشر'' کا اطلاق واحد پر ہے اور جمع پر بھی، یہاں نکرہ نفی کے تحت آیا ہوا ہے، اسلئے عام ہے یعنی مجھے کسی ایک بشر نے بھی نہیں چھوا۔ ''بشر'' کو بشر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا چمڑا ظاہر ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے ''ابشرت الارض'' زمین نے اپنے پودہ جات نکال دئے (یعنی ظاہر کر دیئے) اور ذکر کیا جاتا ہے ''تباشير الصبح'' جب صبح صادق کی روشنی ظاہر ہو جائے۔ (البحر المحیط)

فائدہ: ''ولم يمسسني بشر'' اى ولم يصبني رجل وانما قالت ذلك تعجبا لا شكا في قدرة الله تعالى اذلم تكن العادة جرت ان يولد ولد من غير اب''

آپ نے تعجب کے طور پر کہا کہ عادت یہی ہے کہ بغیر باپ کے اولاد نہیں ہوتی آپ کا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک نہیں تھا۔ (خازن)

﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ ''فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب تعجب کے طور پر سوال کیا ''اے میرے رب میرا بیٹا کیسے ہوگا'' تو رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ یہاں حضرت مریم کے تعجب کے بعد سوال کرنے پر رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ وجہ فرق کیا ہے؟

''ان ولادة العذراء من غير ان يمسها بشر ابدع واغرب من ولادة عجوز عاقر من شيخ فان فكان الخلق المنبئ عن الاختراع انسب بهذا المقام من مطلق الفعل'' (تفسير ابى السعود)

وجہ فرق یہ ہے کہ کنواری عورت کی بغیر کسی انسان کے چھونے کے اولاد پیدا ہونا عجیب وغریب ہے، جو بظاہر عادت

کے خلاف ہونے کے مشکل نظر آتی ہے۔لیکن بوڑھے مرداور بانجھ عورت سے اولاد پیدا ہونا بہت عجیب وغریب نہیں،اسلئے حضرت مریم کے سؤال کے بعد مطلقا فعل نہیں ذکر کیا، بلکہ ''خلق'' کا ذکر کیا ہے، جو اللہ تعالی کی قدرت سے پیدا کرنے پر دلالت کررہا ہے،اسی وجہ سے بعد میں آنے والے الفاظ مبارکہ سے مزید وضاحت فرمادی۔

﴿اِذَاقَضٰی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ﴾

''جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا بے شک وہ کہتا ہے ھو جا وہ ہو جاتا ہے''۔

''(اذا قضی امرا)من الامور ای ارادشیئا'' جب فیصلہ فرماتا ہے کاموں میں سے کسی کام کا،یعنی جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا۔یہ ایسے ہی ارشاد ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا﴿اِنَّمَا اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا﴾ (بیشک اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ فرماتا ہے کسی چیز کا)

''واصل القضاء الاحکام اطلق علی الارادة الالهیة القطعیة المتعلقة بوجود الشی لایجابها ایاه البتة''

اصل میں قضاء کا معنی ہے حکم دینا،پھر اس کا اطلاق (بولا جانا) اللہ تعالی کے قطعی ارادہ پر ہوتا ہے،جس ارادہ کا تعلق کسی چیز کے لازمی طور پر موجود کرنے سے ہو،یعنی اسے ضروری طور پر عدم سے وجود میں لانا ہے۔یعنی اللہ تعالی کی قدرت اسباب عادیہ کی تابع نہیں بلکہ اس نے اپنی مشیت سے اسباب کے تابع اشیاء کو کردیا ہے۔

خیال رہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اصل لغت کے مطابق ہے (جب کسی کام کا حکم فرمائے) راقم کا ترجمہ بامحاورہ ہے (جب فیصلہ فرمادے کسی کام کا) عام محاورہ یہی ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے اس کام کے کرنے کا فیصلہ کردیا گیا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴾ (آیۃ نمبر ۴۸)

(1) اور اللہ سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل۔

(2) اور سکھائے گا (اللہ) اسے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل۔

﴿ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ ﴾ ''اور سکھائے گا (اللہ) اسے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) کتاب''

''الکتاب'' سے مراد کیا ہے؟ (الکتاب) ای الکتابة والخط بالقلم بالالهام والوحی وکان احسن الناس خطافی زمانه'' (الکتاب) سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام اور وحی کے ذریعے کتابت یعنی قلم سے لکھنا سکھایا، اور آپ اپنے زمانہ میں تمام لوگوں سے اچھے خط والے تھے۔ (روح البیان)

''وذهب کثیرون الی ان ال فیه للجنس والمراد جنس الکتب الالهیة''

اکثر حضرات اس طرف گئے ہیں کہ الف لام جنسی ہے، مراد جنس کتب الہیۃ ہیں، آگے توراۃ وانجیل اس کا بیان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو آسمانی کتابوں کا علم عطاء فرمائے گا، وہ آسمانی کتب کون سی ہیں؟ وہ توراۃ وانجیل ہیں۔

﴿ وَالْحِكْمَةَ ﴾ ''اور (اللہ سکھائے گا اسے) حکمت''

حکمت سے مراد کیا ہے؟ حکمت کے کئی مطالب تحریر کیے گئے ہیں، جو مجموعی طور پر مراد لئے گئے ہیں۔

(۱) ''ای الفقه وعلم الحلال والحرام قاله ابن عباس''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ حکمت سے مراد فقہ (علوم کی سمجھ) اور حلال وحرام کا علم ہے۔

(۲) ''وقیل جمیع ماعلمه من امور الدین'' اور حکمت تمام امور دین کے علم کو بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) ''وقیل سنن الانبیاء علیهم السلام'' اور انبیاء کرام کی سنتوں پر عمل کرنے یعنی ان کے طریقہ پر چلنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔

(۴) ''وقیل الصواب فی القول والعمل'' صحیح بات کرنے اور صحیح کام کرنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔

(۵) ''وقیل اتقان العلوم العقلیة والنقلیة'' اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں پختہ یقین کرنے کو بھی حکمت کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

(۶) ''والحکمة ای العلوم العقلیة او الشرعیه وتهذیب الاخلاق'' اور حکمت سے مراد علوم عقلیہ اور شرعیہ اور تہذیب اخلاق ہے۔

کیونکہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ حق لذاتہ کو پہچانے اور خیر کو پہچانے تا کہ وہ اس پر عمل کرے "ومجموعها هو المسى بالحكمة" علم وعمل کے مجموعہ کو حکمت کہا جاتا ہے۔ (روح البیان)

﴿ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴾ "(اور سکھائے گا اللہ اسے) تو راۃ وانجیل ۔"

"فيحفظها عن ظهر القلب" تو وہ (عیسی علیہ السلام) ان دونوں کتابوں میں اپنے دل میں محفوظ کر لے گا، یعنی اسے وہ دونوں کتابیں یاد ہوں گی۔ (اس سے بھی آپ کے نبی ہونے کی طرف اشارہ مل گیا کیونکہ پہلی آسمانی کتابوں کو صرف نبی یاد کر سکتے تھے عوام کی قسمت میں انہیں یاد کرنا نہ تھا۔ یہ شرف قرآن کو اور نبی کریم ﷺ کی امت کو حاصل ہوا کہ آپ کی امت کے چھوٹے چھوٹے بچے قرآن پاک یاد کر رہے ہیں۔ (راقم)

اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے حضرت مریم کے دل کو خوش کیا گیا، اور ملامت کے اہم خوف کو زائل کیا گیا جوان کو بغیر باپ کے بچے کی پیدائش پر لاحق تھا، جب یہ بتا دیا گیا کہ اس بچے کو کتاب وحکمت اور تو راۃ وانجیل کا علم دیا گیا تو حضرت مریم کو پتہ چل گیا کہ میرے ہاں پیدا ہونے ولا بچہ نبی ہوگا، یہود کی متوقع تہمت کو رب تعالیٰ خود ہی اس بچے کے ذریعے زائل کر دے گا۔ (روح البیان بوضاحت)

چار میں ترتیب کا فائدہ:

یعنی جس طرح چار چیزوں کا ذکر ہے، اسی انداز پر آپ کو علم بھی دیا گیا، کتاب سے مراد خط وکتابت ہے، پہلے اس کا علم دیا گیا۔ حکمت سے مراد علوم کی تعلیم اور تہذیب اخلاق۔

"لان كمال الانسان فى ان يعرف الحق لذاته والخير لاجل العمل به ومجموعهما هو المسمى بالحكمة"

اس لئے کہ انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ حق لذاتہ کا پہچانے اور خیر کا پہچانے تا کہ اس کے مطابق عمل کر سکے، اور علم وعمل کے مجموعہ کو حکمت کہا جاتا ہے۔

جب خط وکتابت کا علم دیا گیا، اور علوم عقلیہ ونقلیہ کا احاطہ کر دیا گیا تو آپ کو تو راۃ کا علم دے دیا گیا۔

"وانما اخر تعليم التوراة عن تعليم الخط والحكمة لان التوراة كتاب الهى وفيه اسرار عظيمة، والانسان مالم يتعلم العلوم الكثيرة لا يمكنه ان يخوض فى البحث على اسرار الكتب الالهية"

خط وکتابت اور حکمت کے علم کے بعد توراۃ کا علم دیا گیا، اس لئے کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے، اس میں اسرار عظیمہ (بہت بڑے راز) پائے گئے ہیں، انسان جب تک علوم کثیرہ نہ حاصل کرلے اس وقت تک اس کیلئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی کتابوں کے اسرار کی بحثوں میں غوروخوض (غوروفکر) کرے۔

''انجیل کا ذکر چوتھے مرتبہ میں کیا'' اور توراۃ سے بعد ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو خط وکتابت کا علم دے دیا، پھر علوم حق یعنی حق کے مطابق علوم عقلیہ کا علم دے دیا اور علوم شرعیہ کا بھی علم دے دیا، اس کے بعد وہ کتاب جو پہلے نبی پر اتری یعنی توراۃ کا علم دے دیا اس کے رازوں پر مطلع کردیا، تو علم کا عظیم درجہ عطاء کردیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک اور کتاب (انجیل) نازل فرمائی۔

''واوقفه على اسراره فذلك هو الغاية القصوى والمرتبة العليا في العلم والفهم والاحاطة بالاسرار العقلية والشرعية والاطلاع على الحكم العلوية والسفلية''

اور آپ کو اس کے اسرار (رازوں) پر واقف کردیا، جس سے آپ کو بلند مرتبہ عطاء کردیا، علم وفہم کی بلندی عطاء کردی، اسرار عقلیہ اور شرعیہ کا احاطہ کردیا، اور عالم دنیا اور عالم بالا کی حکمتوں پر مطلع کردیا۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کا موقف:

اصل میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے یہ ترتیب ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ''فهذا ما عندي في ترتيب هذه الالفاظ الاربعة'' یہ ترتیب ہے میرے نزدیک ان چار قسم کے الفاظ میں، لیکن راقم کا موقف یہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا جو علمی مقام ہے، اس کے سامنے میرے جیسے کم علم کو دم مارنے کی کوئی مجال نہیں، آپ کا ارشاد بھی سر اور آنکھوں پر، لیکن اختلاف رائے رحمت سمجھتے ہوئے یوں عرض کررہا ہوں، کہ جب عطاء کرنے والا رب تعالیٰ ہے اور جسے عطاء کیا جارہا ہے وہ اللہ کا نبی ہے تو اس ترتیب کی ضرورت نہیں۔

جیسے آپ کی تخلیق قدرت باری تعالیٰ سے کلمہ کن سے ہوئی، ایسے ہی آپ کو یہ تمام علوم ایک مرتبہ ہی عطاء کر دیئے گئے، آہستہ آہستہ ترتیب وار عطاء کی ضرورت نہیں، کیونکہ دینے والے کی قدرت میں کوئی کمی نہیں، اور لینے والے کی استعداد میں کوئی کمی نہیں، دینے والے نے ایک لمحہ میں بہت کچھ دے دیا، اور لینے والے نے بہت کچھ لے لیا'' والله اعلم بالصواب'' (راقم)

عیسیٰ علیہ السلام کے حکمت بھرے کلمات:

✿ ''اخرج ابن المبارك في الزهد اخبرنا ابن عيينة عن خلف بن حوشب قال قال عيسى عليه

السلام للحواريين كما ترک لکم الملوک الحکمة فکذلک اتر کوالھم الدنیا''

ابن مبارک نے کتاب الزہد میں ابن عیینہ کی روایت خلف بن حوشب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین کو کہا جس طرح بادشاہوں نے تمہارے حکمت (علم) کو چھوڑ دیا ہے، اسی طرح تم ان کیلئے دنیا کو چھوڑ دو۔ یعنی انہوں نے علم دین حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے، وہ تم نے حاصل کرلیا ہے، لھذا تم دنیاوی مال کی طرف توجہ چھوڑ دو، وہ ان کو ہی حاصل ہے۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج بن عساکر عن یونس عبید قال کان عیسی بن مریم علیہ السلام یقول لا یصیب احد حقیقة الایمان حتی لا یبالی من اکل الدنیا''

ابن عساکر نے یونس بن عبید سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے فرمایا کوئی شخص حقیقت ایمان کو نہیں پاسکتا یہاں تک کہ وہ دنیا کا مال کھانے کی پرواہ نہ کرے۔ یعنی جو شخص دنیا کا مال حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر کھاتا رہے، اسے کوئی پرواہ نہ ہو کہ یہ مال تو حرام ہے، اسے میں نے نہیں کھانا، اسے حقیقت ایمان حاصل نہیں۔

❁ ''واخرج ابن عساکر عن مالک بن دینار قال قال عیسی علیه السلام معاشر الحواریین ان خشیة الله وحب الفردوس یورثان الصبر علی المشقة ویباعدان من زهرة الدنیا''

ابن عساکر نے مالک بن دینار سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت بیشک اللہ تعالیٰ کے ڈر اور الجنۃ الفردوس کی محبت سے مصیبتوں پر صبر کرنا حاصل ہوتا ہے اور دنیا کی زیب وزینت سے اسے دوری حاصل ہوتی ہے۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج ابن عساکر عن عتبة بن یزید قال قال عیسی بن مریم یا ابن آدم الضعیف اتق الله حیثما کنت وکل کسرتک من حلال واتخذ المسجد بیتا وکن فی الدنیا ضعیفا وعود نفسک البکاء وقلبک التفکر وجسدک الصبر ولا تهتم برزقک غدا فانها خطیئة تکتب علیک''

ابن عساکر نے عتبہ بن یزید کی روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے کمزور ابن آدم تو جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ، اور روٹی کا ٹکڑا رزق حلال سے حاصل کر، اور مسجد کو اپنا گھر بنا (یعنی زیادہ وقت مسجد میں عبادت میں مشغول رہ) اور دنیا میں کمزور ہو کر رہ (تکبر نہ کر) اور اپنے آپ کو بار بار (اللہ کی یاد میں) رونے پر لگا، اور اپنے دل کو (اللہ کی یاد کے) تفکر میں لگا، اور اپنے جسم کو صبر پر قائم رکھ، اور اپنے کل کے رزق کا غم نہ کر، بیشک اس کا گناہ تمہارے ذمہ لکھ دیا جائے گا۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج ابن عساکر عن یحیی بن سعید قال کان عیسی یقول اعبروا الدنیا ولا تعمروها وحب الدنیا رأس کل خطیئة والنظر یزرع فی القلب الشهوة''

ابن عساکر نے یحییٰ بن سعید سے روایت ذکر کی کہ عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے' دنیا سے گذر جاؤ، اور اسے آباد نہ کر، دنیا کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے، دنیا کی طرف نظر کرنے سے دل میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ (از درمنثور)

❁ واخرج احمد والبیھقی فی شعب الایمان عن سفیان بن سعید قال کان عیسی علیہ السلام یقول حب الدنیا اصل کل خطیئة والمال فیه داء کبیر قالوا وماداوہ قال لا یسلم من الفخر والخیلاء قالوا فان سلم قال یشغله عن ذکر الله"

مسند احمد میں اور بیہقی کے شعب ایمان میں یہ روایت مذکور ہے کہ سفیان بن سعید نے کہا حضرت عیسی علیہ السلام فرماتے تھے دنیا کی محبت ہر خطاء کی اصل ہے کیونکہ مال میں بہت بڑی بیماری پائی گئی آپ کے حواریین نے کہا وہ کیا بیماری ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مال دار تکبر اور نازنخرے سے نہیں بچ سکتا، انہوں نے کہا اگر وہ بچ جائے؟ (تو پھر کیسے وہ بڑی بیماری ہوگی؟) آپ نے فرمایا (اور کچھ نہ ہوا تو کم از کم یہ اسے ضرور حاصل ہوگا) کہ وہ جتنی دیر مال کی اصلاح میں گذارے گا اتنی دیر وہ اللہ کے ذکر سے دور ہوگا۔ (از منثور)

❁ واخرج ابن المبارک عن عمران الکوفی قال قال عیسی بن مریم للحواریین واعلموا ان فیکم خصلتین من الجهل الضحک من غیر عجب والصبحة من غیر سهر"

ابن مبارک نے عمران کوفی سے روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریین کو فرمایا "تم میں دو خصلتیں (عادتیں) جاہلانہ پائی گئی ہیں، ہنسا بغیر تعجب کے اور صبح کرنا بغیر بیدار ہونے کے۔ یعنی بغیر کسی وجہ کے ہنسنا اور صبح سوئے رہنا اور رب تعالی کو نہ یاد کرنا جاہلانہ رسم ہے۔

❁ واخرج احمد عن خیثمه قال مرت امرأة علی عیسی علیه السلام فقالت طوبی لثدی ارضعک وحجر حملک فقال عیسی علیه السلام طوبی لمن قرأ کتاب الله ثم عمل بمافیه"

امام احمد رحمہ اللہ نے خیثمہ سے روایت ذکر کی ہے کہ ایک عورت عیسی علیہ السلام کے قریب سے گذری اس نے تو کہا کتنی مبارک ہے وہ عورت جس نے تمہیں اپنے پستانوں سے دودھ پلایا اور کتنی برکت والی وہ گود جس نے تمہاری پرورش کی، تو آپ نے فرمایا اس شخص کیلئے خوشی و برکات کا مقام ہے جس نے اللہ کی کتاب کو پڑھا پھر اس پر عمل کیا۔ (از منثور)

❁ واخرج احمد عن وهب بن منبه قال اوحی الله الی عیسی علیه السلام انی وهبت لک حب المسکین ورحمتهم تحبهم ویحبونک ویرضون بک اماما وقائدا وترضی بهم صحابة وتبعا وهما خلقان اعلم ان من لقینی بهما باز کی الاعمال واحبها الی"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب بن منبہ سے روایت بیان کی کہ وہ کہتے ہیں عیسی علیہ السلام کی طرف اللہ تعالی نے وحی کی فرمائی کہ بیشک میں نے تمہیں مسکینوں کی محبت اور رحمت عطا کی تم ان سے محبت رکھنا وہ تم سے محبت رکھیں گے۔ وہ تمہارے امام اور قائد ہونے پر راضی ہوں گے، اور تم ان کے صحابہ ہونے اور تابع ہونے پر راضی رہنا۔ یہ دو عادتیں ایسی ہیں جو ان کے ساتھ مجھے ملے تو وہ پاکیزہ اعمال سے ملا اور پاکیزہ اعمال ہی مجھے پسند ہیں۔ (از منثور)

❀ واخرج عبد الله فی زوائده عن جعفر بن حرفاس ان عیسیٰ علیہ السلام مریم قال رأس الحطیئة حب الدنیا والخمر مفتاح کل شر والنساء حبالة الشیطان''
جعفر بن حرفاس سے مروی کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمام خطاؤں کی اصل دنیا کی محبت ہے اور شراب ہر برائی کی چابی ہے اور عورتیں شیطان جال ہیں۔

❀ واخرج احمد عن سفیان قال قال عیسیٰ علیہ السلام ان للحکمة اهلاوان وضعتها فی غیر اهلها اضعتها وان منعتها من اهلها ضیعتها کن کا لطبیب یضع الدواء حیث ینبغی ''
امام احمد رحمہ اللہ سفیان سے روایت ذکر کی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیشک حکمت کیلئے اہل ہیں اگر تم نااہل میں حکمت کو رکھا تو تم نے ضائع کر دیا اور اگر تم نے اہلیت رکھنے والے سے حکمت کو دور رکھا تو پھر بھی تم نے حکمت کو ضائع کر دیا۔ تم طبیب کی طرح ہو جاؤ جو دوا مناسب جگہ میں رکھتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی بیماری کے مطابق دواء کا انتخاب کرتا ہے بیماری اور ہو دواء اور ہو تو دواء کو ضائع کرنا ہے۔

❀ واخرج احمد عن محمد بن واسع ان عیسیٰ بن مریم قال یا بنی اسرائیل انی اعیذلم بالله ان تکونوا عارا علی اهل الکتاب یا بنی اسرائیل قولکم شفاء یذهب الدواء واعمالکم داء لا تقبل الدواء''
امام احمد رحمہ اللہ نے محمد بن واسع سے روایت ذکر کی کہ بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل تمہارے لئے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تم اہل کتاب کیلئے عار بن جاؤ، اے بنی اسرائیل تمہارا قول شفاء ہے جو دواء کو لے جاتا ہے اور تمہارے اعمال ایسی بیماری ہیں جو دواء کو قبول نہیں کرتی۔ (از درمنثور)

یعنی طلب یہ ہے کہ ایسے کوئی کام نہ کرو جو اہل کتاب کیلئے شرم کا سبب بنے کہ بنی اسرائیل نے یہ کام کیا ہے جو شرمندگی کا سبب ہے، وہ بھی اہل کتاب ہیں، اور ہم بھی اہل کتاب ہیں، ان کے اس فعل نے ندامت سے ہمارے سر جھکا دیئے۔ اور تمہارے اقوال تو اچھے ہیں گویا کہ ان میں شفاء ہے، لیکن تمہارے اعمال برے ہیں، گویا کہ وہ لا علاج مرض کی طرح ہیں۔

❀ ''واخرج احمد عن وهب قال قال عیسیٰ لاحبار بنی اسرائیل لاتکونوا للناس کالذئب السارق وکالثعلب الخدوع وکالحدأ الخاطف''
امام احمد رحمہ اللہ وہب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء کو فرمایا کہ تم لوگوں کیلئے چور بھیڑیئے کی طرح نہ بنو اور دھوکا باز لومڑی کی طرح نہ بنو، اور اچک لینے والی گدھ کی طرح نہ بنو۔ (از درمنثور)

یعنی جس طرح اچانک بھیڑیا حملہ کرتا ہے تم بھی لوگوں پر اچانک حملہ نہ کرو، لومڑی کی طرح لوگوں سے دھوکا بازی سے کام نہ لینا۔ گدھ جس طرح اچانک بچوں کے ہاتھوں سے کوئی چیز اچک لیتی ہے یا مرغی کے بچوں کو اٹھا لیتی

ہے تم ایسے نہ بننا۔

❁ "واخرج احمد عن مکحول قال قال عیسی بن مریم یا معشر الحواریین ایکم یستطیع ان یبنی علی موج البحر دارا قالوا یاروح الله ومن یقدر علی ذلک قال ایاکم والدنیا فلاتتخذوها قرارا"

امام احمد رحمہ اللہ مکحول سے روایت ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت تم میں سے کون ہے جو طاقت رکھتا ہے کہ دریا پر اپنا گھر بنائے؟ انہوں نے کہا اے روح اللہ اس پر کون قدرت رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے آپ کو دنیا سے بچا کر رکھو، اسے قرار نہ پکڑو۔ (از درمنثور)

یعنی جس طرح پانی پر گھر اس لئے نہیں بنا سکتے کہ اسے قرار نہیں، اسی طرح دنیا سے محبت نہ لگاؤ کہ یہ ثابت نہ رہنے والی چیز، جس چیز کو قرار نہیں وہ محبت کے لائق نہیں۔

❁ "واخرج احمد عن زیاد ابی عمرو قال بلغنی ان عیسی علیہ السلام قال انه لیس بنافعک ان تعلم مالم تعلم ولما تعمل بما قد علمت ان کثرة العلم لا تزید الاکبر اذالم تعمل به"

امام احمد رحمہ اللہ نے زیاد ابو عمرو سے روایت ذکر کی کہ مجھے یہ خبر ملی کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تیرے لئے یہ نفع مند نہیں کہ جو تو نہیں جانتا اس کا علم تو حاصل کرلے لیکن علم کے مطابق علم نہ کرے، اس لئے کہ علم کی زیادتی بغیر عمل کے سوائے تکبر کے اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد عن ابراهیم بن الولید العبدی قال بلغنی ان عیسی علیہ السلام قال الزهد یدور فی ثلاثة ایام امس خلا وعظت به والیوم زادک فیه وغدا لا تدری مالک فیه، قال والامرید ور علی ثلاثة امر بان لک رشده فاتبعه وامر بان لک غیه فاجتنبه وامر اشکل علیک فکله الی الله عزوجل"

امام احمد رحمہ اللہ نے ابراہیم بن ولید عبدی سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، زہد تین دنوں میں چکر کاٹتا ہے، کل جو گذر گیا اس میں تمہیں نصیحت کردی گئی، اور آج کے متعلق تمہیں کل گذشتہ سے بھی زیادہ علم حاصل ہے اور آئندہ کل کے متعلق تمہیں پتہ نہیں کہ تمہارے لئے اس میں کیا ہے؟ اور آپ نے فرمایا امر تین قسم کے ہیں، ایک وہ امر ہے جس کے متعلق تمہیں پتہ چل گیا کہ یہ گمراہ کن ہے اور بھٹکانے والا ہے، تو اس سے اجتناب کر، اور تیسرا وہ عمل ہے جس کے متعلق تمہیں کوئی پتہ نہیں (کہ یہ سیدھی راہ پر چلانے والا یا بھٹکانے والا ہے) تو اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ (از درمنثور)

یعنی جس کام کے متعلق تمہیں پتہ نہیں کہ یہ درست ہے یا غلط اس میں توقف اختیار کرو، وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو، جب تمہیں پتہ چلا گیا کہ یہ درست ہے تو اس پر عمل کرلینا، اور جب تمہیں پتہ چل گیا کہ یہ درست نہیں تو اس سے اجتناب کرلینا۔

❁ "واخرج احمد عن قتادة قال قال عیسی علیہ السلام سلونی فان قلبی لین وانی صغیر فی نفسی"

امام احمد رحمہ اللہ نے قتادہ سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھ سے سوال کرلیا کرو، بیشک میرا دل نرم ہے اور بیشک میں اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہوں۔ (از درمنثور)

آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوا کہ سخت دل سوال کا صحیح جواب نہیں دیتا، اور جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے وہ بھی سوال کا جواب صحیح نہیں دیتا، سوال کا جواب وہ دیتا ہے جو نرم دل ہو اور عاجز ہو۔

❁ "واخرج احمد عن بشير الدمشقي قال مر عيسى عليه السلام بقوم فقال اللهم اغفر لنا ثلاثا، فقالوا يا روح الله انا نريد ان نسمع منك اليوم موعظة ونسمع منك شيئا لم فسمعه فيما مضى فاوحى الله الى عيسى ان قل لهم انى من اغفرله مغفرة واحدة اصلح له بها دنياه و آخرته"

امام احمد رحمہ اللہ نے بشیر دمشقی سے روایت ذکر کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قریب سے ایک شخص کا گذر ہوا، آپ نے ایک محفل قائم کر رکھی تھی، آپ نے تین مرتبہ دعا فرمائی "اے اللہ ہماری مغفرت فرما" آپ سے آپ کے متبعین مطالبہ کر رہے تھے کہ آج ہم آپ سے وہ وعظ سننا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے نہ سنا ہو (یعنی آج کوئی نئی بات سناؤ) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی کہ تم انہیں یہ بتاؤ کہ جس کی میں ایک مرتبہ مغفرت کردوں، اس کی اس مغفرت کے ذریعے دین و دنیا درست کر دیتا ہوں۔
(از درمنثور)

❁ "واخرج ابن ابی شيبة واحمد عن عمير ان عيسى عليه السلام كان يلبس الشعر ويأكل من ورق الشجر ويبيت حيث امسى ولا يرفع غداء ولا عشاء لغد ياتى كل يوم برزقه"

ابن ابی شیبہ اور امام رحمہما اللہ نے عبید بن عمیر سے روایت ذکر کی کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام بکریوں کے بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتے اور درخت کے پتے کھاتے، اور رات گذارتے جہاں بھی شام ہو جاتی، اور کل کیلئے نہ صبح کا کھانا ساتھ رکھتے اور نہ شام کا اور فرماتے تھے "ہر شخص کا کھانا ہر دن آتا ہے۔ (از درمنثور)

یعنی اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی روزی دینے والا بھی ہے، لھذا انسان کل کی فکر کیوں کرے وہی ذات باری تعالیٰ جو خالق ہے رازق بھی ہر دن کا رزق وہی عطاء فرماتا ہے۔

❁ "واخرج احمد عن يزيد بن ميسره قال قال عيسى عليه السلام ان احببتم ان تكون اصفياء الله ونور بنى آدم من خلقه فاعفوا عمن ظلمكم وعودوا من لا يعودكم واحسنوا من لا يحسن اليكم واقرضوا من لا يجزيكم"

امام احمد نے یزید بن میسرہ سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تم پسند رکھتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے برگزیدہ بن جاؤ اور اس کی مخلوق میں سے بنی آدم کے نور بن جاؤ تو جو تم پر ظلم کرنے والے ہیں ان کو معاف کردو، اور جو تمہاری عیادت نہیں کرتے تم ان سے اچھا سلوک کرو، اور تم ان کو قرض دو جو تمہیں جزا نہیں دیتے۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن وهب بن منبه قال قال عیسی بن مریم للحواريين بحق اقول لكم و كان عیسی علیه السلام كثيرا مايقول بحق اقوالكم ان اشدكم حباللدنيا اشدكم جزعا على المصيبة''

امام احمد رحمہ اللہ وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریین کو ارشاد فرمایا میں تمہیں حق بات بتاتا ہوں، حالانکہ عیسی علیہ السلام حق بات ہی فرماتے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں یہ بتاتا ہوں بیشک تم میں سے جو دنیا سے زیادہ محبت کرتا ہوگا وہی مصیبت پر جزع وفزع تم سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن عطاء الازرق قال بلغنا ان عیسی علیه السلام قال یا معشر الحواريين كلوا اخبز الشعير ونبات الارض والماء القراح واياكم وخبز البر فانكم لا تقومون بشكره واعلموا ان حلاوة الدنيا مرارة الآخرة واشد مرارة الدنيا حلاوة الآخرة''

امام احمد رحمہ اللہ نے عطاء ازرق سے روایت ذکر کی کہ بیشک عیسی علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت جو کی روٹی کھاؤ اور زمین کی پیداوار کھاؤ، اور خالص پانی پیؤ تم اپنے آپ کو گندم کی روٹی سے بچا کر رکھو کیونکہ تم اس کا شکریہ ادا نہیں کرسکو گے، اور جان لو دنیا کی مٹھاس آخرت کی کڑواہٹ ہے، اور جتنی زیادہ دنیا میں کڑواہٹ حاصل ہوگی اتنی زیادہ آخرت میں مٹھاس حاصل ہوگی۔ (از درمنثور)

یعنی دنیا کی نعمتوں کے حاصل ہونے پر شکر نہ ادا کرنا، اور دنیا کے حصول میں حرام وحلال کا کوئی فرق نہ کرنا اگرچہ حلاوت دنیا ہے لیکن اخروی نقصان ہوگا، اور دنیا کی مصیبتوں پر صبر کرنا مشکل ہے بظاہر اس میں کڑواہٹ ہے لیکن آخرت میں نفع مند ہے۔

❁ ''واخرج ابن احمد في زوائده عن عبدالله بن شوذب قال قال عیسی بن مریم جودة الثياب من خيلاء القلب''

ابن احمد رحمہ اللہ نے زوائد میں عبداللہ بن شوذب سے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا عمدہ لباس وہی پہنتا ہے جس کے دل میں ناز نخرہ ہو۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج احمد عن سفيان قال قال عیسی علیہ السلام انی لیس احدثكم لتعجبوا انما احدثكم لتعملوا''

امام احمد رحمہ اللہ نے سفیان سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ایسا کلام نہیں کرتا کہ تم اس کلام پر فریفتہ ہو جاؤ اور تعجب کرو، بیشک میں تو تمہارے ساتھ وہ کلام کرتا ہوں جس پر تم عمل کرو۔ (از درمنثور)

❁ ''واخرج ابن المبارک واحمد عن ابی غالب قال في وصية عیسی علیہ السلام یا معشر الحواريين تحببوا الى الله ببغض اهل المعاصي وتقربوا اليه بالمقت لهم والتمسوا رضاه بسخطهم قالوا يانبي الله فمن نجالس قال جالسوا من يزيد في علمكم منطقة ومن يذكر كم الله رؤيته ويزهدكم في الدنيا عمله''

ابن مبارک اور امام احمد رحمہما اللہ نے ابو غالب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریین کو نصیحت فرمائی "اے حواریین کی جماعت اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اس کے نافرمانوں سے بغض رکھا کرو، اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرو نافرمانوں کو ناراض کر کے، اور رب تعالیٰ کی رضاء کو چاہو ان کی ناراضگی میں۔ حواریین نے آپ سے پوچھا اے اللہ کے نبی کن لوگوں کے ساتھ بیٹھیں؟"

آپ نے فرمایا تم ان لوگوں کے ساتھ بیٹھو جو اپنے کلام کے ذریعے تمہارے علم میں زیادتی کریں، اور جن کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلائے، اور جن کا عمل تمہیں دنیا میں نیک بنائے۔ (از درمنثور)

❀ "واخرج احمد عن مالک بن دینار قال اوحی الله الی عیسی عظ نفسک فان اتعظت فعظ الناس والا فاستحی منی"

امام احمد رحمہ اللہ نے مالک بن دینار سے روایت بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کی عیسیٰ علیہ السلام کو کہ تم اپنے نفس کو نصیحت کرو، اگر اس نے تمہاری نصیحت قبول کر لی تو لوگوں کو نصیحت کرو، ورنہ مجھ سے حیاء رکھنا۔ (از درمنثور)

اس طرح نبی کو خطاب درحقیقت اس کی امت کو خطاب ہوتا ہے کیونکہ نبی گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، ان کا نفس تو ان کی نصیحت کو پہلے سے ہی قبول کئے ہوتا ہے، تب ہی اسے نبی بنایا گیا۔

اب گویا کہ مطلب یہ ہو گیا اے عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کو سننے والو اپنے اپنے نفسوں کو نصیحت کرو، اگر تمہارے نفسوں نے میری نصیحت کو قبول کر لیا تو بہتر، پھر لوگوں کو بھی نصیحت کرنا، اگر تمہارے نفسوں نے نصیحت کو نہ قبول کیا تو تمہارے لئے باعث شرم و حیاء ہو گا۔ (از درمنثور)

❀ "واخرج احمد عن وهب قال قال عیسی للحواریین بقدر ما تنصبون ههنا تستریحون ههنا وبقدر ما تستریحون ههنا تنصبون ههنا"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب سے روایت بیان کی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو فرمایا یہاں تم (مشقت آمیز اعمال سے) جتنی تھکن اور مشقت پاؤ گے تو وہاں (مقام آخرت میں) اتنی قدر راحت محسوس کرو گے، اور جتنی یہاں راحت پاؤ گے (جو جی چاہے وہی عمل کر لیا، حرام و حلال کی تمیز نہ کی) تو اتنی قدر وہاں تمہیں مشقت اٹھانی پڑے گی۔ (از درمنثور)

❀ "واخرج ابن المبارک واحمد عن سالم بن ابی الجعد قال قال عیسی علیه السلام طوبی لمن خزن لسانه ووسعه بیته وبکی من ذکر خطیئته"

ابن مبارک اور امام احمد رحمہما اللہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، وہ شخص خوش قسمت ہے جس نے اپنی زبان کو خزانہ بنایا اور اپنے گھر کو وسعت دی، اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رو دیا۔ (از درمنثور)

زباب کوخزانہ بنانے کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اپنی زبان سے اچھے اچھے کلمات بیان کئے اور انہیں اپنی زبان پر محفوظ رکھا، اور اپنے گھر کو وسیع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گھر کے اہل وعیال کیلئے آسانی پیدا کرے تا کہ اس کے گھر کا ماحول اس کیلئے وسعت کا سبب بنے۔ اور مہمانوں کیلئے گھر کو وسیع کر، اور گناہوں کو یاد کرکے رونے کا یہ مطلب ہے کہ ان پر سچے دل سے توبہ کرے۔

❁ "واخرج احمد عن ابی الجلد قال قال عیسی بن مریم فسکرت فی الخلق فاذامن یخلق کان اغبط عندی ممن خلق وقال لاتنظروا ای ذنوب الناس کانکم ارباب ولکن انظروا فی ذنوبکم کانکم عبید والناس رجلان مبتلی ومهاقی فارحموا اهل البلاء واحمد والله علی العافیة"

امام احمد رحمہ اللہ نے ابوالجلد سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں مخلوق کی یاد میں مخمور رہتا ہوں جو لوگ ابھی تک نہیں پیدا ہونے وہ میرے نزدیک باقی مخلوق میں سے زیادہ قابل رشک ہیں، اور آپ نے فرمایا تم لوگوں کے گناہوں کو نہ دیکھو صاکہ لوگ اپنے غلاموں کو دیکھتے ہیں، بلکہ تم اپنے گناہوں کو دیکھو جیسا کہ غلام اپنے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔ لوگ دو قسم ہیں، ایک وہ جو مصائب میں بتلاء ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو قابل عافیت ہوتے ہیں تم مصیبت زدہ پر رحم کرو اور اللہ کی حمد بیان کرو عافیت پر۔ (از در منثور)

❁ "اخرج ابن ابی شیبة واحمد عن جعفر بن برقان قال کان عیسی علیہ السلام یقول اللهم انی اصبحت لا استطیع دفع ماا کره ولا املک نفع ماارجو واصبح الامربید غیری واصبحت مرتهنا بعملی فلا فقیر افقرمنی ولا تشمت بی عدوی ولاتسئی بی صدیقی ولا تجعل مصیبتی فی دینی ولا تسلط علی من لا یرحمنی"

ابن ابی شیبہ اور امام احمد رحمہما اللہ نے جعفر بن برقان سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے "اے اللہ میں نہیں طاقت رکھتا اس چیز کو مندفع کرنے کی جسے میں مکروہ سمجھتا ہوں، اور میں نفع حاصل کرنے کا مالک نہیں جس کی میں امید رکھتا ہوں، میرے امور میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی اور کے قبضہ میں ہیں، اور میں اپنے عمل کی وجہ سے مرتھن بن گیا (رہن رکھ لیا گیا) مجھ سے زیادہ کوئی فقیر (محتاج) نہیں، اے اللہ مجھے تکالیف پہنچا کر میرے دشمنوں کو خوش نہ کرنا، اور مجھے تکالیف پہنچا کر میرے دوستوں کو غم میں ڈالنا، اور مجھے میرے دین میں کوئی مصیبت نہ پہنچا (یعنی مجھے ایسی مصیبت نہ پہنچا جو مجھے دین سے دور کردے) اور مجھ پر وہ مسلط نہ کر جو مجھ پر رحم نہ کرے۔ (از در منثور)

❁ "واخرج احمد عن الحسن بن علی الصنعانی قال بلغنا ان عیسی علیہ السلام قال یا معشر الحواریین ادع الله ان یخفف عنی هذه المسکرة یعنی الموت ثم قال عیسی لقد خفت الموت خوفا اوقفنی مخافتی من الموت علی الموت"

امام احمد رحمہ اللہ نے حسن بن علی صنعانی سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا اے حواریین کی جماعت اللہ سے دعاء کرو کہ مجھ سے سکرات موت کو آسان فرمادے، پھر آپ نے فرمایا میں موت سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں، تیرے موت کے ڈر نے مجھے موت کے کنارے کھڑا کردیا ہے۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج ابن عساکر عن یزید بن میسرہ قال قال بن مریم کما تواضعون کذلک ترفعون و کما ترحمون کذلک ترحمون و کما تقضون من حوائج الناس کذلک یقضی اللہ من حوائحبکم"

ابن عساکر نے یزید بن میسرہ سے روایت بیان کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا جتنی تم عاجزی کرو گے اتنا ہی اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ بلند ہوگا، اور جتنا تم لوگوں پر رحم کرو گے اتنا ہی تم پر رحم کیا جائے گا، اور جتنا تم لوگوں پر رحم کرو گے اتنا ہی تم پر رحم کیا جائے گا، اور جتنا تم لوگوں کی حاجات کو پورا کرو گے اتنا ہی اللہ تعالی تمہاری حاجات کو پورا کرے گا۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد بن وھب قال قال المسیح علیہ السلام اکثرواذکر اللہ وحمدہ وتقدیسہ واطیعوہ فانما یکفی احد کم من الدعاء اذاکان اللہ تبارک وتعالی راضیا علیہ ان یقول اللھم اغفرلی خطیئتی واصلح لی معیشتی وعافنی من المکارہ یا الھی"

امام احمد رحمہ اللہ نے وہب سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا اللہ کا ذکر زیادہ کرو اور اس کی تحمید وتقدیس زیادہ کرو، اور اس کی اطاعت کرو، بیشک تم میں سے ہر اس شخص کو یہ دعاء کافی ہوگی جب اللہ اس سے راضی ہوگا وہ یہ دعاء کرے اے اللہ میری خطاؤں کی مغفرت فرما، اور میری معیشت کو درست فرما، اور مجھے مصائب وآلام سے بچا۔ (از درمنثور)

❁ "واخرج احمد عن سعید بن عبد العزیز قال بلغنی انہ ما من کلمۃ کانت تقال لعیسی علیہ السلام احب الیہ من ان یقال ھذاالمسکین"

امام احمد رحمہ اللہ نے سعید بن عبد العزیز سے روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو سب سے زیادہ پسند یہ تھا کہ آپ کو "ھذاالمسکین" (یہ مسکین) کہہ کر پکارا جائے۔ (از درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَرَسُولًا اِلٰی بَنِی اِسْرَائِیْلَ اَنِّی قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّی اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝﴾ (آیة نمبر ۴۹)

(1) اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فورا پرند ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو بے شک ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

(2) اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف، بیشک میں نے تمہارے پاس لائی ہے نشانی تمہارے رب کی طرف سے بیشک میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے مثل شکل پرندے کے، تو میں پھونک مارتا ہوں اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں درست کرتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو، اور میں زندہ کرتا ہوں مردہ کو اللہ کے حکم سے، اور میں خبر دیتا ہوں تمہیں جو تم کھاتے ہو، اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں، بیشک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ﴾ ''اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

''ورسولا'' میں واؤ عاطفہ ہے اس کا عطف ہے '' **یعلمه** '' پر اگر لفظ ''**یکون** '' مقدر ہو، تو معنی یہ ہے ''اور رسول ہو

گا بنی اسرائیل کی طرف اوراگر "نجعله "مقدر ہو تو معنی ہوگا" ہم بنائیں گے اسے رسول، اوراگر "نبعثه "مقدر ہو تو معنی یہ ہوگا" اور ہم بھیجیں گے اسے رسول بنا کر۔" والتنوین للتعظیم تقدیره ونجعله رسولا عظیما" لفظ "رسولا "پر تنوین تعظیم کیلئے ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ" وہ عظیم رسول ہوگا"

"اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی زبان میں نام ہے جس کی تحقیق پہلے پارہ میں بیان ہو چکی "بنی اسرائیل" کا مطلب ہے" اولاد اسرائیل" اولاد یعقوب علیہ السلام سے نبوت کی ابتداء حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی اور انتہاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوئی۔ (ماخوذ از مظہری بوضاحت)

﴿انّی قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾

"بیشک میں تمھارے پاس لائی ہے نشانی تمھارے رب کی طرف سے۔"

یعنی میں نے تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نشانی لائی جو میرے قول کی تصدیق کرتی ہے

اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو کئی نشانیاں لائیں، صرف ایک نشانی تو نہیں لائی لهذا چاہئے تو یہ تھا کہ جمع کا صیغہ "بأيات "لایا جاتا واحد کا صیغہ کیوں لایا گیا۔

جواب: "ان الكل دل على شئى واحد وهو صدقه فى الرسالة " بیشک ہر ایک نشانی ایک چیز پر دلالت کرتی ہے، وہ ہے آپ کی رسالت کی تصدیق۔ (عالم التنزیل للبغوی)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ میں نے تمھارے رب کی طرف تمھارے پاس نشانی لائی ،تو انہوں نے کہا کہ وہ کون سی نشانی تم لائے ہو؟ تو آپ نے اپنے معجزات بیان کئے یعنی ہر معجزہ ایک نشانی ہے جو آپ کی صداقت پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿ انّی اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

"بیشک میں بناتا ہوں تمھارے لئے مٹی سے مثل شکل پرندے کی تو پھونک مارتا ہوں اس میں تو ہو جاتا ہے وہ پرندہ اللہ کے حکم سے۔"

"اخلق" ای اصور واقدر" تصویر بنانا، گھڑنا، بنانا اندازہ کرنا وغیرہ معانی یہاں بن سکتے ہیں۔

خلق کے چند معانی ہیں:

(۱) "الخلق اصله التقدیر المستقیم" خلق کا ایک معنی ہے درست اندازہ کرنا۔

(۲) "ویستعمل فی ابداع الشیء من غیر اصل ولا احتذا" اور اس کا اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ کسی چیز کو بغیر نمونہ کے بغیر سانچہ کے بنانا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ یہی معنی اس مقام میں مذکور ہے اس کی تائید رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے حاصل ہو رہی ہے ﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ " اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق زمین و آسمان کا بغیر نمونہ کے پیدا کرنے کا ذکر ہے

(۳) ویستعمل فی ایجاد الشیء من الشیء نحو "خلقکم من نفس واحدة" اور خلق کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی چیز سے پیدا کرنا، موجود کرنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ اس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے۔

تنبیہ: بغیر نمونہ کے نئے سرے سے پیدا کرنا صرف رب تعالیٰ کو حاصل ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ کیا وہ جو پیدا کرتا ایسے ہے جو نہیں پیدا کرتا تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

مخلوق کی طرف خلق کی نسبت دو معنی سے ہے:

ایک معنی تقدیر اور بنانا، گھڑنا جیسا کہ اسی زیر بحث آیۃ میں ہے ﴿اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ﴾ بیشک میں بناتا ہوں تمہارے لئے" والثانی فی الکذب نحو قوله تعالی " وتخلقون افكا" دوسرا معنی ہے جھوٹ گھڑنا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا "وتخلقون افكا" اور تم جھوٹ گھڑتے ہو۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ تو برکت والا ہے اللہ جو تمام خالقوں سے اچھا خالق ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ کے بغیر اور بھی خالق ہیں، تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے بغیر کوئی خالق نہیں۔

جواب اول: "قیل ان ذلک معناه احسن المقدرین" اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس مقام میں خلق کا معنی بنانا، گھڑنا، صورت بنانا ہے یعنی تمام صورتیں، شکلیں بنانے والوں میں سے اللہ تعالیٰ اچھی صورتیں بناتا ہے جو ماؤں کی پیٹوں میں بچہ دانیوں میں صورتیں بناتا ہے۔

جواب دوم : "اویکون علی تقدیر ما کانوا یعتقدون ویزعمون ان غیر الله یبدع"
دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ارشادِ گرامی ان کے اعتقاد کے مطابق ہے، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر انسان بھی بغیر نمونہ کے نئے سرے سے پیدا کر سکتے ہیں تو رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ تمہارا گمان باطل ہے، حقیقی طور پر خالق رب تعالیٰ ہی ہے، وہی "احسن الخالقین" ہے۔

ضابطہ: "وکل موضع استعمل الخلق فی وصف الکلام فالمراد به الکذب" کلام کے ساتھ جب بھی "خلق" کا استعمال ہوگا اس کا معنی "جھوٹ" ہوگا، اسی وجہ سے کثیر حضرات نے قرآن پاک کے ساتھ "خلق" کا استعمال منع قرار دیا ہے۔

توجہ کی ضرورت:

خلق (خاء کی زبر سے) اور "خلق" (خاء کی پیش سے) کا اصل میں ایک ہی معنی ہے، لیکن زبر کی صورت میں اس کا معنی ظاہری صورت ہوتا ہے جو نظر سے دیکھی جا سکے، اور پیش کی صورت میں باطنی عادات سے تعلق ہوتا جو بصیرت سے مدرک ہوں، یعنی جن کو عقل سے پایا جا سکے۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

"کھیئة الطیر" ای مثل صورة الطیر" مثل شکل پرندے" راقم نے یہی ترجمہ پیش کیا ہے، جو روح البیان کے مذکورہ بالا الفاظ سے لیا گیا ہے۔

"فانفخ فیه" ضمیر مجرور جو "فیه" میں ہے وہ "کھیئة" میں کاف کی طرف لوٹ رہی ہے جو مماثل کے معنی میں ہے۔

"فیکون طیرا" "حیا طیارا کسائر الطیور" وہ پرندہ ہو جاتا ہے، یعنی جس طرح باقی پرندے حقیقۃً زندہ ہوتے ہیں وہ جو بناتا ہو وہ بھی حقیقۃً زندہ ہوتا ہے، اسی لئے اڑتا ہے، اس میں کوئی جادو وغیرہ کا (معاذ اللہ) تعلق نہیں۔

"باذن الله" ای بامر الله" اللہ کے حکم سے، اب مکمل مطلب واضح ہو گیا کہ آپ نے اپنے معجزہ کو یوں بیان فرمایا کہ "میں بیشک مٹی سے پرندے کی شکل وصورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حقیقی طور پر زندہ پرندہ بن جاتا ہے۔ "باذن اللہ" کہہ کر یہ مسئلہ بیان کر دیا کہ مٹی کی مورتی سے حقیقی طور پر پرندہ اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے صرف پرندے کی شکل وصورت بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں، لیکن زندگی اسے اللہ تعالیٰ ہی عطاء کرتا ہے

"لان الله هو الذی خلق الموت والحیاة فهو یخلق الحیاة فی ذلک الجسم بقدرته عند نفخ عیسی علیه السلام فیه علی سبیل اظهار المعجزات"

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی موت وحیات کو پیدا فرماتا ہے،لھذا جس جسم میں عیسیٰ پھونکتا ہے،اسے جو حیات حاصل ہوتی ہے اس میں قدرت باری تعالیٰ کی ہوتی ہے،اور معجزہ عیسیٰ کا ہوتا ہے۔ (روح البیان)

عیسیٰ علیہ السلام نے چمگادڑ بنائی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اعلان نبوت فرمایا تو بنی اسرائیل نے آپ سے معجزہ طلب کیا،ان کا معجزہ طلب کرنا اس وجہ سے تھا۔

''طلبوا منه علی سبیل التعنت جریا علی عادتھم مع انبیاء ھم ان یخلق لھم خفاشا فلما فعل قالوا ساحر''

کہ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے معجزہ طلب کیا تھا،انبیاء کرام سے ان کا یہی طریقہ آرہا تھا،انہوں نے مطالبہ ہی چمگادڑ بنانے کا کیا تھا،جب آپ نے مٹی سے چمگادڑ کی مورتی بنائی اور اس میں پھونک ماری وہ اڑگئی تو وہ اپنی پہلی روش کی مطابق کہنے لگے کہ یہ جادوگر ہے۔

انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیوں کیا تھا:

اس کی وجہ یہ تھی کہ چمگادڑ میں پرندوں،حیوانوں اور انسانوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں،اس کے بنانے میں ان کے نزدیک بہت مشکل کام تھا۔

چمگادڑ کے اعضاءواوصاف یہ تھے:

چمگادڑ کی داڑھیں اور دانت ہوتے ہیں،اسے حیض آتا ہے،اس کے بچے پیدا ہوتے ہیں،عام پرندوں کی طرح یہ انڈے نہیں دیتی،اور بغیر پروں کے اڑتی ہے،اور اس کے کان ہوتے ہیں جیسے انسانوں کے کان ہوتے ہیں،اور اس کے پستان ہوتے ہیں،اور ان پر تھن ہوتے ہیں،یعنی پستان انسانوں کی طرح اور تھن حیوانوں کی طرح،اور ان سے دودھ آتا ہے،اور ایسے ہنستی ہے جیسے انسان ہنستے ہیں،اور اسے نہ دن میں نظر آتا ہے،اور نہ ہی رات کو اسے نظر آتا ہے صرف دو مختصر وقتوں میں اسے نظر آتا ہے،ایک غروب کے بعد اندھیرا چھا جانے سے پہلے،اور دوسرا طلوع فجر کے بعد روشنی سے پہلے۔

زیادہ مشہور یہی ہے کہ آپ نے چمگادڑ کے بغیر کوئی اور پرندہ نہیں بنایا،البتہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ نے

مختلف پرندے بنائے ہیں "واللہ اعلم بالصواب"

وہب کا قول یہ ہے کہ آپ نے جو پرندہ بنایا ہے اس کی آگے نہ نسل چلی اور نہ ہی وہ زیادہ دیر زندہ رہا

"کان یطیر مادام الناس ینظرون الیه فاذاغاب عن اعینهم سقط میتا لیتمیز عن خلق اللہ تعالی بلاواسطة"

بلکہ وہ لوگوں کے سامنے اڑتا، جب لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہوتا تو مرکر گر جاتا، تا کہ اللہ تعالی کی مخلوق بلاواسطہ اور باواسطہ میں فرق ہو جائے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ ﴾

"اور میں درست کرتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو۔"

"الاکمه" ماخوذ ہے "کمه" سے، اس کا ایک معنی ہے "هو الذی ولد اعمی" کہ جو نابینا پیدا ہو، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جو جریر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ "اکمه" اسے کہتے ہیں "انه الممسوح العین الذی لم یشق بصره ولم یخلق له حدقة" جس کی آنکھیں ہی نہ ہوں اور اس کی نہ نظر ہو، اور نہ ہی اس کی آنکھ کی پتلی پیدا کی گئی ہو، یہ قول عطاء کا ہے جا ابن ابی حاتم نے پیش کیا ہے اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اکمه" اسے کہا جاتا ہے "انه الذی یبصر بالنهار ولایبصر باللیل" جسے دن کو نظر آئے اور رات کو نظر نہ آئے۔ "وعن عکرمة انه الاعمش ای اخلص" حضرت عکرمہ فرماتے ہیں "اکمه" خالص نابینا کو کہتے ہیں۔

خیال رہے کہ "اکمه" کے تو سارے معانی معتبر ہیں، البتہ حضرت عیسی علی علیہ السلام نے جن اندھوں کی نظر کو درست کیا وہ وہی تھے جو پیدائشی اندھے تھے جن کے علاج سے بڑے بڑے ماہر طبیب عاجز آگئے تھے، اسی وجہ سے یہ آپ کا معجزہ کہلایا، اگر طبیب اس کا علاج کر سکتے تو آپ کی اس میں تخصیص ثابت نہ ہوتی۔

"والابرص" سفید داغوں والے (کو میں درست کرتا ہوں) جسم سے اصلی چمڑا اتر جاتا ہے سفید داغ پڑ جاتے ہیں اسے "برص کی مرض کہا جاتا ہے" آجکل یہودیوں، نصرانیوں اور ہندوؤں سے تجارت کے یہ اثرات ظاہر ہو رہے ہیں کہ اکثر لوگ ملک پاکستان میں اس مرض مبتلاء ہو چکے ہیں، کیونکہ سائنسی ترقی، خوراکوں میں کیمیائی اجزاء کے استعمال نے لوگوں کی صحتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، اسی وجہ سے ہسپتالوں میں جگہ نہیں مل رہی۔

صرف دو مرضوں کا ذکر کیوں؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دو مرض اس قسم کی تھیں جن سے طبیب عاجز آگئے تھے، باوجود اس کے حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے ماہر طبیب موجود تھے، آپ کو یہ معجزہ اسی لئے دیا گیا تھا کہ اس وقت کے نامور لوگ آپ کے سامنے عاجز ہو جائیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگری کا زور تھا، اس وقت کے نامور لوگ جادوگر تھے، آپ کو عصا اور ید بیضاء عطاء فرمائے جن کی وجہ سے آپ کے زمانہ کے مشہور معروف لوگ عاجز آگئے۔ اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا، تو آپ کو فصیح و بلیغ کتاب قرآن پاک عطاء کیا گیا، جس کی وجہ سے بڑے بڑے فصیح و بلیغ شعراء اور قصیدہ خواں عاجز آگئے۔

آپ نے کئی مریضوں کو صحیح فرمایا:

"والا قتصار علی هذین الامرین لا یدل علی نفی ماعداهما ،فقدروی انه علیه السلام ابرأایضاغیرهما"

ان دو قسم کی مرضوں کے ذکر سے باقیوں کی نفی نہیں پائی گئی، بلکہ آپ نے کئی قسم کی مرضوں سے لوگوں کو رب تعالیٰ کے حکم سے شفاء عطاء کی۔

"من اطاق منهم ان یبلغه بلغه ومن لم یطق زلک منهم اتاه عیسی علیه السلام فمشی الیه وکان یدا ویهم بالدعاء الی الله تعالی بشرط الایمان"

اگر کوئی مریض آپ کے پاس آنے کی طاقت رکھتا تو وہ آجاتا، اور اگر کوئی طاقت نہ رکھتا تو آپ خود اس کے پاس آتے، آپ مریض پر ہاتھ پھیرتے اور دعاء فرماتے تو اللہ تعالیٰ اسے شفاء عطاء فرمادیتا تھا، البتہ آپ صرف مؤمنوں کیلئے دعاء فرماتے تھے، کافروں کیلئے نہیں۔

آپ کی دعاء سے مختلف مرضوں میں مبتلاء لوگ شفاء یاب ہوئے، چلنے پھرنے سے عاجز لوگوں کو آپ کی دعاء سے چلنے پھرنے کی طاقت مل گئی اور پاگل صحیح ہو گئے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی دعاء:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اِلٰهُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وَاِلٰهُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا اِلٰهَ فِیهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ جَبَّارُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وجَبَّارُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا جَبَّارَ فِیهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ مَلِکُ مَنْ فِی السَّمَاءِ وَمَلِکُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا مَلِکَ فِیهِمَا غَرُکَ قُدْرَتُکَ فِی الْاَرْضِ کَقُدْرَتِکَ فِی

السَّمَاءِ وَسُلْطَانُکَ فِی الْاَرْضِ کَسُلْطَانِکَ فِی السَّمَاءِ اَسْاَلُکَ بِاسْمِکَ الْکَرِیْمِ وَوَجْهِکَ الْمُنِیْرِ وَمُلْکِکَ الْقَدِیْمِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ"

فائدہ جلیلہ: "ومن خواص هذا الدعاء كما قال وهب انه اذاقرى على الفزع والمجنون وكتب له وسقى منه ان شاء الله تعالى"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو دعاء فرماتے تھے اس دعاء میں رب تعالیٰ نے یہ خیر و برکت رکھی ہے کہ جب کسی پریشان یا پاگل پر پڑھی جائے اور اسے لکھ کر پانی میں حل کر کے پلائی جائے تو اسے ان شاء اللہ فائدہ حاصل ہوگا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ "اور میں مردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔"

اس مقام میں بھی "باذن الله" اللہ کے حکم کی قید ذکر کی، کیونکہ یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ تھا، اور اس معجزہ سے آپ کی الوہیت کا وہم بھی ہوسکتا تھا اسلئے کہ یہ کام انسان نہیں کر سکتے تھے، تو آپ نے "باذن الله" کہہ کر واضح کر دیا کہ اگرچہ بظاہر میری دعاء سے مردے زندہ ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں قدرت باری تعالیٰ سے ہی مردے زندہ ہوتے ہیں۔

آپ نے چار مردے زندہ فرمائے:

(۱) عازر، (۲) ایک بڑھیا کا بیٹا، (۳) اور عاشر (شہر کے باہر تجارتی مال کا عشر لینے والا) (۴) اور سام بن نوح کو۔

عازر: آپ کا دوست تھا۔ اس کی بہن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کا بھائی عازر فوت ہوگیا ہے آپ کے اور عازر کے گاؤں کے درمیان تین دن کی راہ کا فاصلہ تھا، آپ اور آپ کے کچھ اور احباب آئے، جو کچھ دنوں سے فوت ہو چکا تھا، آپ نے اس کی بہن کو کہا مجھے اس کی قبر پر لے چلو، وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بھائی کی قبر پر لے گئی، آپ نے اس کے زندہ ہونے کیلئے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، وہ قبر سے نکلنے کے بعد کچھ دیر زندہ رہا یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی ہوئی۔

بڑھیا کا بیٹا: فوت ہوگیا، اس کا جنازہ اٹھا کر جا رہے تھے، (آپ کی اس کی بوڑھی ماں کے بے سہارا ہونے پر رحم آگیا) تو آپ کے قریب سے جب جنازہ گذرا تو آپ نے اس کے زندہ ہونے کی دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، وہ چارپائی کے اوپر ہی زندہ ہو کر بیٹھ گیا، اس نے کپڑے پہنے، خود ہی اپنے جنازہ والی

چارپائی کو اٹھا کر لایا، اپنے گھر والوں کے پاس زندہ ہو کر لوٹ آیا، کچھ دیر زندہ رہا، یہاں تک کہ اس کی بھی اولاد ہوئی، پھر بعد میں کچھ عرصہ کے بعد فوت ہوا۔

عاشر کی بیٹی: شہر کے باہر تجارتی مال سے عشر وصول کرنے والے شخص کی بیٹی فوت ہوگئی، آپ نے (اس کے کہنے پر) موت اور دفن کے دوسرے دن بعد اس کے حق میں دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا، یہ بھی زندہ ہونے کے بعد کچھ عرصہ زندہ رہی، اس کی بھی زندہ ہونے کے بعد اولاد ہوئی۔

سام بن نوح: بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی قبر پر آئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم "یاحی یاقیوم" پڑھا، اس کے زندہ ہونے کی دعاء کی تو وہ زندہ ہو کر قبر سے باہر آ گیا،

"وقد شاب نصف راسه خوفا من قيام الساعة ولم يكونوا يشيبون في ذلك الزمان"

تو قیامت کے خوف کی وجہ سے اس کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا، حالانکہ اس وقت یعنی ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے سر سفید نہیں ہوا کرتا تھا، سر سفید ہونے کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ وہ جب قبر سے نکلا تو اس نے پوچھا "اقدقامت الساعة" کیا قیامت ہوگئی؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، نہیں قیامت تو قائم نہیں ہوئی، البتہ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس سے دعاء کر کے زندہ کیا ہے۔ پھر اس سے پوچھا کیا تو زندہ رہنا چاہتا ہے یا کہ پھر فوت ہو کر قبر میں رہنا پسند کرتا ہے، اس نے قبر کی زندگی کو پسند کیا، البتہ آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے موت تو ابھی آ جائے البتہ میں سکرات موت سے محفوظ رہوں، آپ نے رب تعالیٰ کی حضور دعاء کی، آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔ بغیر سکرات موت کے اللہ تعالیٰ نے اسے پھر موت عطاء کر دی۔

سام بن نوح کو زندہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟

پہلے جن تین شخصوں کو زندہ کرنے کے واقعات بیان کیے گئے ان کو زندہ کرنے پر قوم نے کہا کہ ان کی موت میں زیادہ وقت نہیں گذرا تھا، ہو سکتا ہے ان پر غشی طاری ہو، وہ حقیقت میں مرے ہی نہ ہوں۔ انہوں نے آپ سے سام بن نوح کو زندہ کرنے کا مطالبہ کیا جسے فوت ہوئے تقریباً چار ہزار سال گذر چکے تھے، آپ نے اسم اعظم پڑھا اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کی، آپ کی دعاء کو شرف قبولیت بخشا گیا تو اسے زندہ کر دیا گیا۔ اسے زندہ کرنے کے بعد آپ نے قوم سے مطالبہ کیا کہ تم میرے نبی ہونے کی تصدیق کرو، لیکن "فامن به بعضهم و كذبه آخرون" تو بعض لوگوں نے آپ پر ایمان لایا، اور بعض نے آپ کی (معاذ اللہ) تکذیب کر دی، اور کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے، البتہ کوئی اور

معجزہ دکھاؤ،تو آپ نے آنے والے معجزہ کا ذکر فرمایا۔

﴿ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ﴾

''اور میں تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو،اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ''ما''دونوں جگہ میں''ما تاکلون''میں،اور''ما تدخرون''میں موصولہ ہے،یا دونوں جگہ''ما''نکرہ،موصوفہ ہے،عائد محذوف ہے،اصل معنوی لحاظ پر عبارت یہ ہوگئی''ما تاکلونہ وما تدخرونہ''(جس چیز کو تم کھاتے ہو اور جس چیز کو تم ذخیرہ بناتے ہو)اور''فی بیوتکم''کا تعلق''ما''سے ہے،

''تدخرون''کو''ذخیرہ''سے ماخوذ کیا گیا ہے،جب باب افتعال پر لے گئے تو یوں ہو گیا''اذتخر یذتخر اذتخارا''پھر قاعدہ کے مطابق''تاء افتعال''کو دال سے بدلنا واجب ہو گیا،تو اب یوں ہو گیا''اذدخر،یذدخر،اذدخارا''اس میں ایک وجہ تو یہ بھی جائز ہے کہ بغیر ادغام کے یونہی پڑھا جائے،اور دوسری صورت یہ ہے کہ''دال''کو''ذال''سے تبدیل کر کے اور ادغام کر کے''اذخر،یذخر،اذخارا''ذال کی شد سے پڑھا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ''ذال''کو دال کر کے،پھر ادغام کر کے پڑھا جائے''ادخر،یدخر،ادخارا''دال کی شد کے ساتھ۔آیۃ کریمہ میں یہ تیسری صورت ہی استعمال ہے،جس کا مطلب ہے''ذخیرہ بنانا،جمع کرنا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ: ''وقد كان هذا الاخبار بعد النبوة واحيائه الموتى عليه السلام على مافى الاخبار''

صحیح قول یہی ہے کہ یہ واقعات یعنی آپ کا خبر دینا کہ میں جانتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم گھروں میں جمع کرتے ہو،اور اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ معجزات بعد از نبوت آپ سے ظاہر ہوئے ہیں۔

بعض حضرات نے بچپن کے متعلق ایک روایت ذکر کی:

ابن عساکر عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ایک روایت ذکر کی کہ حضرت عیسی علیہ السلام بچپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے تو آپ نے ایک لڑکے کو کہا''تريد ان خبرك ماخبات لك امك''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تمھاری ماں نے تمھارے لئے کیا چھپا کر رکھا ہوا ہے؟اس لڑکے نے کہا ہاں آپ مجھے

بتائیں۔آپ نے اسے بتادیا،فلاں فلاں چیزیں تیری ماں نے تیرے لئے چھپارکھی ہیں۔وہ گھر آیا،اس نے ماں کو کہا جو چیزیں آپ نے چھپارکھی ہیں وہ مجھے کھانے کیلئے دو،ماں نے پوچھا وہ کیا چیزیں ہیں جو میں نے چھپارکھی ہیں؟ بچے نے وہ بتادیں۔ماں نے پوچھا تمہیں کس نے بتایا؟اس نے کہا''عیسی بن مریم نے''ان لوگوں نے یہ سن کر ایک دوسرے کو کہا کہ بچوں کو عیسی بن مریم کے ساتھ نہ کھیلنے دیں ورنہ ان کو (معاذ اللہ) بگاڑ دے گا۔انہوں نے بچوں کو آپ کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے کیلئے ایک گھر میں بند کردیا ادھر حضرت عیسی علیہ السلام بچوں کو تلاش کرتے ہوئے اس مکان پر پہنچ گئے جس میں بچوں کو بند کیا گیا تھا۔آپ نے بچوں کے متعلق پوچھا کہ میرے دوست کہاں گئے ہیں؟انہوں نے کہا ہمیں تو پتہ نہیں آپ نے فرمایا اس مکان سے ان کی آواز آرہی ہے۔

ان لوگوں نے کہا،اس گھر میں تو بندر اور خنزیر ہیں۔آپ نے یہ سن کر یوں دعاء کردی ''اللھم اجعلھم قردۃ وخنازیر فکانوا کذلک''اے اللہ ان کو بندر اور خنزیر بنادے تو رب تعالی نے ان کو بندر اور خنزیر بنادیا۔

راقم کو اس روایت سے ذرا بھی اتفاق نہیں کیونکہ نبی قبل از نبوت (نبوت سے پہلے) بھی اس قسم کی دعاء ہلاکت بچوں کیلئے بغیر کسی وجہ سے نہیں کرتا۔روایت کو رد کرنا آسان ہے نبی کی گستاخی کے پہلو کو قبول کرنا پسند نہیں۔ (راقم)

ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ جب ان پر آسمانوں سے دسترخوان نازل کیا گیا تو انہیں کہا گیا کہ تم جتنا کھاسکو ،کھالو،جمع نہ کرو،لیکن انہوں نے جمع کرنا شروع کردیا،تو عیسی علیہ السلام نے فرمایا ﴿ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ﴾ اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم (اس مائدہ (دسترخوان سے) اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔''وخانوا فجعلوا قردۃ وخنازیر'' انہوں نے خیانت کی،اور انہوں نے مائدہ کے کھانے کو گھروں میں جمع کیا تو رب تعالی نے ان کو بندر اور خنزیر بنادیا۔

راقم نے ابن عساکر کی راویت کے متعلق اپنا موقف پیش کردیا،اگرچہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تینوں اقوال میں سے کسی کو رد نہیں کیا،بلکہ یوں کہا ہے ''ویمکن ان یقال ان کل ذلک قد وقع'' ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ تمام قسم کے مذکور واقعات کے پائے گئے ہوں،''واللہ اعلم بالصواب''

کیا ان دونوں خبروں پر حکم بند ہے؟

''فالمراد الاخبار بخصوصیۃ ھذین الامرین کما یشعر بہ الظاھر''

آیۃ کریمہ سے ظاہر طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دو چیزوں کو جوذکر کیا گیا ہے ان کی خبر ہی مراد ہے کہ آپ نے یہ خبر دی

کہ تم جو کھا کر آتے ہو یا گھروں میں جمع کر کے آتے ہو اس کی میں تمہیں خبر دیتا ہوں لیکن راقم کو یہ قول زیادہ پسند ہے

"وقیل المراد الاخبار بالمغیبات الاانه قد اقتصر علی ذکر امرین منها"

بعض نے حضرات نے بیان کیا کہ آپ ہر قسم کی غیبی خبریں دیتے تھے، اگر چہ یہاں ذکر دو چیزوں کا کیا گیا ہے۔

دو چیزوں کے ذکر پر اقتصار کی وجہ یہ ہے کہ ان دو پر ان کو یقین تھا کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ ایک اور وجہ یہ ہے:

"والسر فی ذکر هذین الامرین بخصوصهما ان غالب سعی الانسان وصرف ذهنه لتحصیل الأکل الذی به وقوامه والادخار الذی یطمئن به اکثر القلوب ویسکن منه غالب النفوس فلیفهم"

اگر چہ آپ نے ہر قسم کی غیبی خبر دی، البتہ صرف دو کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان کی غالب کوشش یہ ہوتی ہے، اور ذہن کو انسان اس طرف لگا دیتا ہے کہ کھانے کی چیزیں حاصل کرے تا کہ ان کے ذریعے اس کا جسم اور بدن صحیح سلامت رہے۔

اور جمع کر کے رکھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان عام طور پر کامل متوکل نہیں ہوتا، بلکہ کل کی فکرات لاحق ہوتی ہے کل کیا کھاؤں، اھل وعیال کو کل کیا کھلاؤں، جب وہ کل کیلئے جمع کر لیتا ہے تو اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کے نفس کو سکون مل جاتا ہے ان مسائل کو آپ بھی سمجھ لیں۔ (روح البیان)

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾

"بیشک اس میں نشانی ہے تمھارے لئے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔"

"ذلک" کا اشارہ واحد کا ہے جبکہ معجزات چار ذکر ہوئے ہیں اشارہ جمع کا کیوں ذکر نہیں ہوا۔

تو اس کا جواب یہ ہے (ان فی ذلک) ای المذکور من الخوارق الاربعة" ہاں یہ ٹھیک بات ہے کہ معجزات چار ہیں جن کی طرف "ذلک" کا اشارہ ہے لیکن "المذکور" کی تاویل میں ہے۔ یعنی ہر معجزہ جو مذکور ہے اس میں تمھارے لئے نشانی ہے۔

اس کلام میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہو اور رب تعالی نے اس کی حکایت بیان کی ہو اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ رب تعالی نے خود ان لوگوں کی توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کیلئے ذکر فرمایا ہو "لآیة" میں دو احتمال ہیں (لآیة) ای جنسها وقرئی لأیات" ایک احتمال یہ ہے کہ مراد مطلقاً جنس آیۃ ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں ایک قراءت میں جمع (لأیات) بھی پڑھا گیا ہے یعنی اس میں تمھارے لئے نشانیاں ہیں۔

"لکم" (تمھارے لئے) یعنی اس میں نشانی ہے تمھارے لئے جو عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ

آپ نے مادرزاد اندھے اور برص والے کو شفاء دی تو اس میں کوئی اسباب عادیہ نہیں پائے گئے جیسا کہ طبیب حضرات دواؤں کے ذریعے شفاء دیتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ ان دونوں مرضوں سے طبیب عاجز آچکے تھے اسی وجہ سے آپ کا معجزہ ظاہر ہوگیا کسی نے تسلیم کیا اور کسی نے انکار کیا۔

پرندہ کی مورتی بنا کر، اس میں پھونک مار کر اللہ کے حکم سے اسے صحیح پرندہ بنا دینا تو صرف آپ کا معجزہ ہی تھا ورنہ عام انسان کی طاقت میں ہی یہ نہیں تھا۔ اور مردہ کو زندہ کرنا بھی آپ کا معجزہ تھا، عام انسان اس سے عاجز تھے، اسی وجہ سے ''لکم'' ذکر کیا ہے''اس میں تمھارے لئے نشانی ہے''یعنی عقلمند انسان تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ معجزہ ہے، اگر تمہیں بھی عقل وشعور حاصل ہو تو تم بھی سمجھ سکتے ہو۔

تنبیہ: آپ کا یہ ارشاد کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔ یہ بھی معجزہ تھا، اس میں نجومیوں کے علوم اور قواعد وضوابط کا کوئی دخل نہ تھا۔

اس سے واضح ہوگیا کہ ''علم جفر'' اور ''علم فلکیات'' کو علوم غیبیہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ان علوم میں قواعد وضوابط کا دخل پایا گیا ہے ان قواعد کا لحاظ کیا جائے تب ہی نجومیوں کی ہزار میں سے کوئی ایک خبر سچی ہو جاتی ہے، اگر وہ ان قوانین کو مدنظر نہ رکھیں تو ہزار میں سے ایک خبر کا سچا ہونا بھی ممکن نہیں رہتا۔

''ان علم الغيب شرطه ان يكون مجردا عن المواد والو سا ئط الكونية''

بیشک علوم غیبیہ کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ مادہ اور وسائط کونیہ سے (جو واسطے کسی چیز کو موجود کریں ان سے) سے خالی ہو۔

''وليس ذلك كالعلم بالوحی لانه غير مكتسب بل الله تعالى يختص به من يشاء''

علم جفر اور فلکیات وحی کی طرح نہیں۔ وحی سے علم غیب حاصل ہوتا ہے اس میں بندے کے کسب کو دخل نہیں بلکہ اللہ تعالی جسے چاہے خاص کر دے اور اپنے فضل سے بغیر کسب کے عطاء کر دے لیکن علم جفر اور علم فلکیات کو حاصل کرنا پڑتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ علم غیب موہبی (رب کی عطاء سے) ہے، اور علم جفر وفلکیات کسبی (انسان کے عمل سے حاصل ہوتا) ہے۔

''وكذا العلم بالالهام فانه لامادة له الا الموهوبة الالهية والمخة الازلية''

اسی طرح الہام کے ذریعے حاصل ہونے والا علم بھی کسی مادے کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالی کی عطاء سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

واضح ہوا کہ الہام کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کے برابر بھی علم جفر اور علم فلکیات نہیں ہوسکتا۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ﴾ ''اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

یعنی ہر معجزہ جو ذکر کیا گیا ہے، اس میں تمہارے لئے نشانی ہے لیکن اس نشانی سے تم نفع اسی وقت حاصل کرسکتے ہو جب تمہیں اللہ تعالی ایمان کی توفیق عطاء فرمائے، تم نبی کی تصدیق کرو، اور اللہ کے نبی کے لائے ہوئے احکام کی تصدیق کرو۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ﴾ کا جب معنی کیا جائے ''ان کنتم موفقین للایمان'' (اگر تمہیں ایمان کی توفیق حاصل ہو) تو اسے ''مجاز مشارفة'' کہا جاتا ہے، ایک لفظ کے لغوی معنی کے قریب دوسرا معنی لیا جائے جسے لغوی معنی کی مجاورت حاصل ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اعلی حضرت رحمہ اللہ اور روح البیان:

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ''ان فی ذلک لایة لکم'' کا ترجمہ کیا ہے ''ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے'' راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے صرف لفظوں کی ترتیب کے مطابق ترجمہ کرنے کی وجہ سے اعلی حضرت رحمہ اللہ اور راقم کی ترتیب میں فرق ہے۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان سے منقول ہے

''(ان فی ذلک)ای ماذکر من الخوارق والامور العظام (لأية)عظيمة (لكم) دالة على صحة رسالتي دلالة واضحة .
(روح البیان)

بیشک ان باتوں میں جو مذکور ہیں یعنی آپ کے معجزات اور بڑے بڑے امور میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر واضح طور پر دلالت کررہی ہے۔

فائدہ: جالینوس (جو علم طب میں بہت بڑی مہارت رکھتا تھا) سے جب لوگوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق سوال کیا کہ وہ نبی ہیں یا طبیب ہیں تو اس نے جواب دیا۔

''الميت لايحى بالعلاج فان كان هو يحيى الموتى فهو نبى وليس بطبيب ''

کہ میت علاج سے زندہ نہیں ہوسکتا اگر وہ مردہ کو زندہ کرتے ہیں تو نبی ہیں، طبیب نہیں۔ (روح المعانی)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ (آیۃ نمبر ۵۰)

(1) اور تصدیق کرتا آیا ہوں اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی اور اس لئے کہ حلال کروں تمہارے لئے کچھ وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو۔

(2) اور تصدیق کرتے ہوئے اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی، اور تا کہ حلال کروں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئیں تم پر، اور لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، تو اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو۔

﴿وَمُصَدِّقًا﴾ کا تعلق ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ﴾ محذوف سے ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''اور تصدیق کرتا آیا ہوں'' راقم نے ظاہر الفاظ کے مطابق ترجمہ پر اکتفاء کیا ہے۔

''لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ'' ای، لما تقدمنی التوراۃ ای موافقا علی ما کان قبلی'' (روح البیان)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح البیان کی مذکورہ عبارت کے مطابق ہے، آپ کا ترجمہ پھر سے دیکھئے ''اپنے سے پہلے کتاب توراۃ کی'' راقم نے بھی اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی نقل کیا ہے، صرف ترتیب لفظی کا لحاظ کیا ہے۔

فائدہ: تمام انبیاء کرام ایک دوسرے کی تصدیق کرتے رہے۔ بلکہ انبیاء کرام پر ایک دوسرے کی تصدیق واجب تھی۔

'' فلهذا قلنا بان عیسی علیہ السلام یجب ان یکون مصدقا لموسی بالتوراۃ ولعل من جملۃ الاغراض فی بعثۃ عیسی علیہ السلام تقریر التوراۃ وازالۃ شبهات المنکرین وتحریفات الجاهلین''

اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام پر واجب تھا کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ کی تصدیق کریں عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی وجہ یہ تھی کہ توراۃ کی تصدیق کی جائے، اور منکرین کے شبہات کو زائل کیا جائے اور جہلاء کی تحریفات کو زائل کیا جائے۔ (کبیر)

﴿ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ﴾

اور تا کہ حلال کروں بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئیں تم پر۔

اس کا تعلق بھی '' جئتکم '' سے ہے کہ میں تمہارے پاس آیا ہوں تا کہ حلال کروں .... الخ.

اعتراض : ان دونوں عبارات میں تو بظاہر تعارض پایا گیا ہے۔ پہلے بیان ہوا کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس اپنے سے پہلے کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ نے توراۃ کے تمام احکام کو تسلیم کیا، اور ان پر عمل کیا۔ اور دوسرے الفاظ مبارکہ سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس تا کہ توراۃ میں بعض حرام چیزوں کو حلال کروں۔

ان دونوں عبارات میں کیسے تطبیق پائی جائے گی کہ تعارض اٹھ جائے؟

جواب اول : انہ لاتناقض بین الکلامین وذلک لان التصدیق بالتوراۃ لامعنی لہ الاالاعتقاد ان کل مافیھا فھو حق وصواب .

دونوں کلاموں میں کوئی تناقض نہیں، اسلئے کہ توراۃ کی تصدیق کا صرف یہ مطلب تھا کہ توراۃ میں جن مسائل واحکام کو ذکر کیا گیا ہے، ان کے حق اور صواب ہونے کا ہمیں اعتقاد ہے۔

جواب دوم : جو احکام توراۃ میں تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو عطا نہیں کئے گئے لھذا انجیل میں جن چیزوں کو حلال کیا گیا، وہ باوجود اس کے کہ توراۃ میں حرام کی گئیں لیکن توراۃ کی تصدیق کے منافی نہیں۔

طلباء کرام تفسیر کبیر کی عبارت دیکھیں، شائد یہ جواب بھی صرف طلباء کرام ہی سمجھ سکیں۔

" واذلم یکن الثانی مذکورا فی التوراۃ لم یکن حکم عیسی بتحلیل ماکان محرما فیھا مناقضا لکونہ مصدقا بالتوراۃ "

جب ثانی یعنی حکم حلت توراۃ میں موجود ہی نہ تھا تو عیسیٰ علیہ السلام کا توراۃ میں حرام اشیاء کو حلال کرنا توراۃ کی تصدیق کے مخالف نہیں۔

جواب سوم : وایضا اذا کانت البشارۃ بعیسی علیہ السلام موجودۃ فی التوراۃ لم یکن مجیء عیسی علیہ السلام وشرعہ مناقضا للتوراۃ " جب عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی بشارت توراۃ میں موجود تھی تو آپ کا تشریف لانا اور آپ کی شریعت توراۃ کے مخالف نہیں۔

بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے کا کیا مطلب ؟:

اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ یہود کے اہل علم لوگوں نے اپنی طرف سے بعض چیزوں کو حرام کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا تھا کہ ان اشیاء کو موسیٰ علیہ السلام نے حرام کیا تھا، اور توراۃ میں ان کی حرمت کا تذکرہ موجود ہے۔" **فجاء عیسی علیہ السلام ورفعها وابطلها واعاد الامرالی ماکان فی زمن موسی علیہ السلام** "تو عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، آپ نے ان کی خود ساختہ حرمت کو اٹھا دیا، اور اسے باطل قرار دیا جو انہوں نے توراۃ اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر رکھا تھا، اور آپ نے ان چیزوں کا تذکرہ اس طرح کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھیں یعنی جو چیزیں موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حلال تھیں لیکن آپ کے بعد یہود کے اہل علم نے حرام کر دی تھیں، عیسیٰ علیہ السلام نے آکر ان کو حلال کر دیا۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر ان کی جنایت، سرکشی، حدود سے تجاوز کی وجہ سے بعض چیزوں کو ان پر بطور سزا حرام کر دیا تھا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ تو یہودیوں کے بڑے ظلم کے سبب ہم نے وہ بعض ستھری چیزیں کہ ان کیلئے حلال تھیں ان پر حرام فرما دیں۔

> " **وقال آخرون ان عیسی علیہ السلام رفع کثیرا من احکام التوراة ولم یکن ذلک قادحا فی کونه مصدقا بالتوراة** "
>
> اور کچھ حضرات نے بیان کیا ہے کہ بیشک عیسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے کئی احکام کو ختم کیا ہے لیکن اس میں آپ کی توراۃ کی تصدیق میں کوئی عیب لازم نہیں آتا۔

آپ نے ہفتہ کا احترام ختم کر کے اتوار قائم کر دیا، لیکن سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اسلئے آپ کا ہر عمل اور ہر حکم حق تھا، اصل وجہ یہ ہے "**ان الناسخ والمنسوخ کلاهما حق وصدق**" کہ ناسخ اور منسوخ دونوں ہی حق ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ رب تعالیٰ کے حکم سے جب ایک کتاب کے احکام دوسری کتاب و شریعت میں منسوخ کر دیئے گئے تو کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو حق کہے اور کسی کو باطل۔ (ماخوذ از کبیر)

عیسیٰ علیہ السلام کی حلال کی ہوئی کچھ اشیاء کا تذکرہ:

مچھلی کا گوشت اور اونٹوں کا گوشت جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرام تھے، وہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال کر دئے

گئے۔اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾

(سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۶)

اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور، اور گائے اور بکری کی چربی مگر جو ان کی پیٹھ میں لگی ہو یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا، اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں۔ ان اشیاء کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال کر دیا گیا۔ (از روح البیان بوضاحت)

تنبیہ: " ولم یحل لهم القتل و لا السرقة و لا الفاحشة " حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دوسرے کو قتل کرنا، اور چوری کرنا، اور بے حیائی کے اقوال افعال حلال نہیں کیے تھے۔ (قرطبی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں نرمی:

روی عن قتادة انه قال جاء هم عیسی بالین مما جاء به موسی "صلی الله علیهما و علی نبینا" لان موسی جاء هم بتحریم الابل و اشیاء من الشحوم فجاء هم عیسی بتحلیل بعضها"

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نرم طبیعت رکھتے تھے، اس لئے آپ کو جو شریعت دی گئی وہ بنسبت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے نرم تھی، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اونٹوں کا گوشت اور گائے اور بھیڑ بکری کی چربی حرام تھی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ان کو حلال کر دیا گیا۔

اعتراض: جلالین میں ذکر کیا گیا ہے "وقیل احل الجمیع بمعنی کل" اور بیان کیا گیا ہے کہ "بعض" بمعنی "کل" آتا رہتا ہے۔ لھذا اب معنی یہ ہوگا "اور تاکہ میں حلال کروں تمام وہ چیزیں تمہارے لئے جو تم پر حرام تھیں" اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ آپ نے قتل، چوری اور بے حیائی کو بھی حلال کیا ہوگا۔

جواب: "ان المراد جمیع ما طرأ تحریمه من اجل التشدید لا ما كان محرما بالاصالة" اس مراد وہ حرام چیزیں ہیں جو یہود کی بغاوت، سرکشی کی وجہ سے ان پر بطور شدت حرام کر دی گئی تھیں وہ تمام چیزیں مراد نہیں جو اصل میں ہی حرام تھیں۔ (صاوی)

"واستدلاله علی بعضا تأتی بمعنی کل بقول لبید لیس بصحیح"

لبید کے قول سے یہ دلیل پکڑنا ہی صحیح نہیں کہ لفظ بعض ''کل'' کے معنی میں آتا ہے۔ (البحر المحیط)

﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾

''اور میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

پہلے توراۃ کی تصدیق کا ذکر کیا، پھر بعض چیزوں کے حلال کرنے کا ذکر کیا، اسی طرح پہلے معجزات کا ذکر کیا اور ان کے متعلق فرمایا ﴿اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ تو دوبارہ ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کو لوٹانے یعنی دوبارہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی طبیعت کے مطابق جو کام ہو، اور اسے اس کام سے الفت ہو چکی ہے اور اس پر عرصہ بھی گذر چکا ہو، تو اس شخص کو اس کام سے ہٹانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے معجزات کا ذکر کیا تاکہ کلام ان کے دلوں میں اثر انداز ہو جائے، تو پھر ان کو خوف دلایا، اور ارشاد فرمایا۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ (تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) اسلئے کہ اللہ سے تقوی کیلئے لازم ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کی جائے۔

"فبین انه اذالزمکم ان تتقوا اللہ لزمکم ان تطیعونی فیما آمرکم به عن ربی"

تو آپ نے یوں بیان فرمادیا کہ جب تم پر لازم ہے کہ تم اللہ سے ڈرو، یعنی تقوی کو لازم پکڑو، تو لازم ہے تم پر کہ جن کاموں کا میں تمہیں حکم دوں کہ یہ میرے رب کی طرف سے حکم آیا ہے تو اس میں میری اطاعت کرنا تم پر لازم ہے۔ (کبیر)

(وجئتكم بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) "شاهدة علی صحة رسالتي، وقرئ بآيات" اور میں تمہارے پاس نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے'' جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر وہ نشانیاں دلالت کر رہی ہیں، ایک قرات میں جمع کا صیغہ ''آیات'' آیا ہوا ہے۔

(فاتقوا اللّٰه) فی عدم قبولها و مخالفة مدلولها" تو اللہ سے ڈرو'' ان نشانیوں کو نہ قبول کرنے میں اور ان کے مطالب کی مخالفت میں۔

(واطیعون) فیما آمرکم به وانهاکم عنه بامر اللہ تعالی" اور میری اطاعت کرو'' ان احکام میں جن کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اللہ کے حکم سے، اور ان کاموں میں میری اطاعت کرو جن سے میں تمہیں روکتا ہوں اللہ کے حکم

ہے۔ (ابوالسعود)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ وَاَطِیْعُونِ ﴾ نون کے نیچے کسرہ ہے، جو دلالت کر رہا ہے کہ اصل میں یہ لفظ ''اطیعونی '' ہے، یاء متکلم محذوف ہے، جس کے محذوف ہونے پر کسرہ دلالت کر رہا ہے، اسی لئے اس کا معنی ہے ''اور میری اطاعت کرو'' (راقم)

مقام توجہ: اگر ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ میں ''بآیة'' سے مراد معجزات ہو تو پھر تکرار ہے، لیکن خازن نے یوں بیان کیا ہے ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ای بحجة واضحة شاهدة علی صحة رسالتی ''میں تمہارے پاس نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، یعنی واضح حجت لایا ہوں جو میری رسالت کے صحیح ہونے پر شاہد ہے اس صورت میں تکرار نہیں، بلکہ نیا معنی ہے۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۝﴾ (آیة نمبر ۵۱)

(1) بیشک میرا تمہارا سب کا رب اللہ ہے تو اسی کو پوجو یہ ہے سیدھا راستہ۔

(2) بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے، تو عبادت کرو اسی کی، یہ سیدھا راستہ ہے۔

ماقبل سے تعلق:

پہلے بیان کیا کہ ''اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اب یہ بیان کیا ہے کہ میں جس چیز کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ میرا اور تمہارا رب ایک ہے، اس لئے تو اسی ذات کی عبادت کرو جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہی دعوت دی جو تمام رسول دیتے آئے۔'' **لان جمیع الرسل کانوا علی دین واحد وھو التوحید ولم یختلفوا فی اللہ تعالیٰ**'' اسلئے کہ تمام رسول ایک چیز پر متفق رہے وہ ہے توحید باری تعالیٰ، اس میں تمام انبیاء کرام میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف نہ تھا۔ (خازن)

عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ﴾ **اقرار بالعبودیة ونفی الربوبیة عن نفسه بخلاف مایزعم النصاریٰ**'' کہ ''بیشک اللہ میرا اور تمہارا رب ہے'' یہ اپنے عبد ہونے کا اقرار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، میں رب نہیں، نصاریٰ کا آپ کے متعلق باطل گمان تھا کہ آپ رب ہیں۔ (مدارک)

اس سورۃ پاک میں نجران کے عیسائیوں کا نبی کریم ﷺ سے مناظرہ کرنا، اور ان کے اقوال باطلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، اس آیہ کریمہ میں بھی ان کا مکمل طور پر رد کر دیا گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ تو ایک ہے وہی جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ میں تو اس کا بندہ ہوں۔ مجھے رب کہنے والے جھوٹے ہیں۔ ان کا قول باطل ہے، یہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ان لوگوں کے باطل اقوال کا رد۔ (ماخوذ از خازن)

'' **ھذا صراط مستقیم** '' **ای ھذا الذی آمرکم به (صراط) طریق مستقیم فکذبوہ ولم یؤمنوا به**'' (جلالین)

یعنی یہ راہ جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں، یہی وہ سیدھی راہ ہے، لیکن انہوں نے آپ کی تکذیب کی اور ایمان نہ لایا۔ گویا کہ یہ واضح کر دیا کہ یہی سیدھی راہ ہے اور دین قیم ہے، جس نے اس سے دلیل پکڑی وہ نجات پا گیا اور جو اس سے پھر گیا وہ ذلیل وخوار ہوا۔ (صاوی)

فائدہ جلیلہ: (اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ) **اشارہ الی استکمال القوۃ النظریة بالاعتقاد**

الحق الذی غایته التوحید" رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی (اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ) سے توحید حاصل ہو رہی ہے، لھذا اس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ حق کا اعتقاد رکھنا جس کی غایت توحید ہے، اس سے قوت نظریہ کی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔

(فَاعْبُدُوْهُ) اشارة الی استکمال القوة العملیة فانه یلازم الطاعة التی هی الاتیان بالاوامر والانتهاء بالنواهی " رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی (فَاعْبُدُوْهُ) سے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ عبادت سے ہی قوت عملیہ کی تکمیل حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ قوت عملیہ کیلئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ضروری ہے، اطاعت اس وقت حاصل ہوگی جبکہ اوامر (احکام) پر عمل کرے، اور جن کاموں سے اسے روکا گیا ہے ان سے رک جائے۔ جب قوت عملیہ اور قوت نظریہ دونوں پائی جائیں، یعنی حق کا اعتقاد پایا جائے اور کامل عمل اس پر تو اسی کو استقامت کہا جاتا ہے۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "قل آمنت ثم استقم" تم کہو میں ایمان لایا، پھر اس پر قائم رہو۔" **فالعلم والعمل من مبادی الاستقامة فعلیک بالتمسک بالحجة القویة** "علم اور عمل استقامت کے مبادیات ہیں، تم پر لازم ہے کہ قوی دلائل سے ان کو لازم پکڑو۔ (روح البیان)

رب تعالیٰ کے قرب کے لئے حضرت جنید رحمہ اللہ کا ارشاد:

حضرت جنید رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کس طرح انسان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا سچے دل سے توبہ کرے، پھر خوف درجاء (خوف اور امید) کے درمیان رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا مختلف اوقات میں ذکر کرے، پھر اپنے نفس کی توہین کرے، یعنی اپنے نفس کی ہر تمنا پوری نہ کرے، بلکہ اپنے نفس کو یہ بتائے کہ موت قریب ہے اور امیدیں دور ہیں۔

"قیل له فیماذا یصل العبد الی هذا؟ فقال بقلب مفرد فیه توحید مجرد"

آپ سے پوچھا گیا کہ انسان جب اس مقام پر پہنچ گیا، تو کیا حاصل ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت اسکا دل تمام چیزوں سے ہٹ جائے گا، منفرد ہوگا، اور اسے خالص توحید حاصل ہوگی۔ (روح البیان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جنت کے حاصل کرنے کے حاصل کرنے کیلئے عبادات میں کامل عمل کرنا ضروری ہے، اور پھر ان پر قائم رہنا ضروری ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوا

رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿ (بیشک) وہ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھراس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، اور خوشی ہو اس جنت پر جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ استقامت صرف علم والے اور تقوی والے بزرگوں کو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ عادات اور رسم اور ذہن وضمیر راسخ چیزوں کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے، یہ ہر انسان کو حاصل نہیں۔ ارشاد مصطفوی ﷺ اس پر واضح دلیل ہے، آپ فرماتے ہیں

" لایکونن احدکم کالعبد السوء ان خاف عمل ولا کالا جیر السوء ان لم یعط لم یعمل "

تم میں سے کوئی اس برے غلام کی طرح نہ ہو جسے ڈر ہو تو کام کرے، اور نہ ہی اس گھٹیا مزدور کی طرح بنو کہ اسے مال نہ دیا جائے تو وہ کام نہ کرے۔ یعنی نہ جنت کو دیکھو، نہ دوزخ کو صرف رب تعالی کی رضاء کیلئے اچھے کام کرو، اور برے کاموں سے رک جاؤ۔

"فاذا جرد عمله وتوحیده عن الاغراض فقد استقام واتخذ الصراط المستقیم مذهبا"

جب انسان کا عمل اور توحید باری تعالی پر اعتقاد اغراض سے دور رہا تو اسے استقامت حاصل ہوگئی۔ وہ "صراط مستقیم" پر چلنے والا ہوا۔

" فعلیک بخدمة الکاملین والاستقامة فی طریق الیقین " تجھ پر لازم ہے کہ کاملین کی خدمت کر، اور راہ یقین پر قائم رہ۔

زخود بہتری جوی وفرصت شمار — کہ باچوں خودی کم کنی روزگار

اپنے آپ سے بہتر تلاش کر، فرصت کو غنیمت شمار، اس طرح اپنی خودی کو زمانہ میں کم کر کے کامیاب ہوجا۔

اسی وجہ سے عیسی علیہ السلام نے فرمایا "فاتقوا الله واطیعون " اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ " فاذا داوم العبد الاتباع یصل الی الاستقامة " جب بندہ اتباع پر ہمیشگی اختیار کرتا ہے تو اسے استقامت حاصل ہوجاتی ہے۔ علامہ جلال الدین رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سالها باید که اندر آفتاب — لعل یابد رنگ درخشانی وتاب

کئی سال سورج میں رہنے سے لعل رنگ، چمک اور تابندگی حاصل کرتا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَلَمَّا اَحَسَّ عِيۡسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الۡحَـوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۲)

(1) پھر جب عیسی علیہ السلام نے ان سے کفر پایا بولا کون میرے مددگار ہوتے ہیں۔اللہ کی طرف،حواریوں نے کہا ہم دین خدا کے مددگار ہیں،ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

(2) پھر جب محسوس کیا عیسی علیہ السلام نے ان سے کفر،کہا کون ہیں میرے مددگار اللہ کی طرف ؟ کہا حواریوں نے ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے،ہم ایمان لائے اللہ پر،اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

جب حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حکیمانہ کلام اور اپنے معجزات اس قوم کے سامنے پیش کیے تو انہوں نے بجائے اطاعت کے ان کے قتل کرنے کی تدبیر کی لھذا عیسی علیہ السلام نے انکے اس ارادہ اور پختہ کفر کو علامات سے محسوس فرمایا تو اپنے متبعین سے خطاب کیا کہ فی سبیل اللہ میرا مددگار کون ہے؟ انکے خاص دوستوں نے کہا ہم اللہ تعالی کے دین کے مددگار ہیں،اے عیسی علیہ السلام ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے،اس مدد پر کوئی دینوی اجرت نہیں مانگتے اور نہ ہی اس کے بدلہ میں کوئی اور چیز مانگتے ہیں صرف خواہش یہ ہے کہ آپ قیامت کے دن ہماری اطاعت اور فرمانبرداری اور ہمارے مسلمان ہونے کی گواہی دیں۔ (از نعیمی)

﴿فَلَمَّا اَحَسَّ عِيۡسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ﴾ ''پھر جب محسوس کیا عیسی نے ان سے کفر''

''احساس'' کا لغوی معنی یہ ہے''کسی چیز کو حواس کے ذریعے پانا'' اب بظاہر اس پر وہم یہ ہوتا ہے کہ کفر تو دل کے اعتقاد کفریہ کو کہا جاتا،اس کا حواس ظاہرہ سے تعلق نہیں تو ﴿فَلَمَّا اَحَسَّ﴾ کیسے کہا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے یہاں اس لفظ کے استعمال کی دو وجہ ہوسکتی ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک یہ کہ لفظ اپنے ظاہری معنی میں استعمال ہوا اور مطلب یہ ہے''وھو انھم تکلموا بالکفر فاحس ذلک باذنہ'' کہ انھوں نے کفر یہ کلام کیا جس کو آپ نے اپنے کانوں سے سنا،اس

طرح حاسہ سے کفر کا پانا ثابت ہو گیا۔

(۲) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ تاویل کی جائے کہ مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا کفر پر قائم رہنا پا لیا، اور آپ کو جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ میرے قتل کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو آپ کے اس علم جس میں کوئی شبہ نہیں تھا اس علم کی طرح قرار دیا جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، "لاجرم عبر ذلک العلم بالا حساس" یقیناً اس علم کو احساس سے تعبیر فرما دیا۔ (کبیر)

اس مقام پر مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بہت خوب وجہ بیان کی جو راقم کو بہت پسند آئی، آپ بھی دیکھئے آپ کیا خوب ذکر فرماتے ہیں۔" قوی تر یہ ہے کہ "احس" بالکل ظاہری معنی میں ہو، اگر چہ کفر و ایمان محبت و بغض محسوس چیزیں نہیں اور قیامت میں تو ہر شخص اپنے اعمال کو مختلف شکلوں میں دیکھے گا یہ ہی اعمال تولے جائیں گے۔ (نعیمی)

ان کے کفر کو محسوس کرنے کی چند وجوہ:

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی وہ سرکش اور نافرمان ہو گئے تو آپ نے ان سے مخفی رہنے کا فیصلہ فرمایا تا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں، آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا مکہ مکرمہ میں حال تھا کہ آپ کفار کے خوف سے ابتداء میں مخفی طور پر نمازیں ادا فرماتے رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تا کہ کچھ دیر کیلئے ان سے کنارہ کش ہو جائیں، تو آپ نے ایک بستی میں ایک شخص کے پاس قیام کیا، اس نے بہت اچھی طرح مہمان نوازی کی، اس شہر کا بادشاہ بہت بڑا ظالم تھا، ایک دن وہ شخص جو آپ کا مہمان نواز تھا غمگین تھا، آپ نے اس سے پوچھا تم اتنے پریشان اور غمگین کیوں ہو؟

اس نے کہا اس شہر کا بادشاہ بڑا ظالم ہے اور اس کی عادت ہے کہ وہ ہم میں سے ہر شخص پر باری باری دعوت کو لازم کر دیتا ہے کہ اس کی اور اس کے لشکر کی دعوت کرے، انہیں کھانا کھلائے اور شراب پلائے، آج میری باری ہے اور میرے پاس اتنا مال نہیں کہ میں اس دعوت کا انتظام کر سکوں۔ جب حضرت مریم علیہا السلام نے سنا تو آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا اے اللہ تعالیٰ کے نبی اس کیلئے دعا کرو تا کہ اس کی مشکل حل ہو جائے، آپ نے کہا اے میری امی اگر میں نے اس کیلئے دعاء کر دی تو اس میں فتنہ برپا ہو جائے گا، لیکن حضرت مریم علیہا السلام نے کہا اس شخص نے ہماری بہت عزت کی، بہت احسان و اکرام کیا اس پر بھی احسان ہونا چاہئے۔ والدہ کے ارشاد و اصرار پر آپ نے اسے

کہا کہ جب بادشاہ اور اس کے لشکر کے آنے کا وقت قریب ہو جائے تو ہنڈیا اور مٹکے پانی سے بھر لینا اور مجھے مطلع کرنا۔

جب اس شخص نے آپ کے ارشاد پر عمل کر لیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی، جتنی ہنڈیا پانی سے بھری تھیں سب میں پکا ہوا گوشت ہو گیا اور سب پانی سے بھرے ہوئے مٹکے شراب سے بھر گئے۔ جب وہ بادشاہ اور اس کے لشکری آئے تو انہوں نے کھانا کھایا اور شراب پی تو اس شراب کو عام شہریوں سے مختلف لذت والا پا کر سوال کیا کہ شراب تم کہاں سے لائے؟ پہلے تو اس شخص نے ٹال مٹول سے کام لیا لیکن بادشاہ کے زیادہ مجبور کرنے پر اس نے بتا دیا، بادشاہ کا ایک بیٹا چند دن پہلے مر گیا تھا اس نے خیال کیا کہ جس شخص کی دعاء سے اللہ تعالیٰ پانی کو شراب بنا دیتا ہے، اس کی دعاء سے اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کو بھی زندہ کر دے گا۔ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ دعاء کریں تا کہ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کو زندہ کر دے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ زندہ ہو گیا تو اس پر فتنہ برپا ہو جائے گا۔ اس بادشاہ نے کہا جب میرا بیٹا نظر آ جائے گا تو مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہو گی۔ اور جب تم میرے بیٹے کو زندہ کر دو گے تو میں تمہیں ہر قسم کی آزادی دے دوں گا تم جو چاہو وہی کرو، تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی، عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس کا لڑکا زندہ ہو گیا، جب اس کی بادشاہی کے لوگوں کو پتہ چلا کہ اس کا لڑکا زندہ ہو گیا تو وہ فوراً اپنے اپنے ہتھیار لے کر آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی جب زیادہ شہرت ہونے لگی تو یہود نے حسد کرنا شروع کر دیا، آپ کے نسب میں طعنہ زنی شروع کر دی، اور آپ کو قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگے، تو آپ نے ان کے کفر کو محسوس کیا۔

(۲) عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی بشارت توراۃ میں رب تعالیٰ نے دے دی تھی، اس لئے یہود کو معلوم تھا کہ انہوں نے توراۃ کے کئی احکام منسوخ کر دیئے ہیں، اس لیئے پہلے انہوں نے آپ کے نسب پر طعنہ زنی شروع کی پھر آپ کے قتل کے منصوبے بنانے لگے یعنی آپ نے جب دین حق کی دعوت دینی شروع کی تو یہود کا غیظ و غضب بڑھ گیا اور آپ کو ایذاء پہنچائی اور وحشت پھیلانی شروع کی اور آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی، تو آپ کو ان کے کفر کا پتہ چل گیا۔ (کبیر)

﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ ''کہا کون ہیں میرے مددگار اللہ کی طرف''۔

عیسیٰ علیہ السلام نے گمان کیا کہ آپ نے قوم کو دعوت ایمان دی ہے، لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے، اور میری دعوت ایمان کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا، تو آپ نے پسند فرمایا کہ ان کا امتحان لے لیں تا کہ آپ کے ذہن میں جو

بات آئی ہے اس کی تحقیق ہو جائے، تو آپ نے فرمایا ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ کون میرے مددگار اللہ کی طرف ؟ تو اس کا جواب صرف حواریین نے دیا کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں، تو آپ کو محسوس ہو گیا کہ سوائے حواریین کے سب کافر ہیں۔ انکار دین پر ان کا اصرار ہے، اور آپ کے قتل کرنے کے وہ منصوبے بنا رہے ہیں۔ (کبیر)

اس سے امداد طلب کرنے کی ایک وجہ کا بھی پتہ چل گیا، اور ان کے کفر کا ظاہر ہونے، اور آپ کو پتہ چل جانے کی تیسری وجہ بھی معلوم ہوگئی۔

حواریین کون تھے : حواریون جمع ہے حواری کی عام طور پر کہا جاتا ہے ''فلاں حواری فلاں'' فلاں شخص فلاں کے مددگاروں اور دوستوں میں سے خاص ہے۔ خیال رہے کہ بظاہر وہم ہوتا ہے ''حواری'' جمع ہے ''کراسی'' کی طرح لیکن ایسا نہیں ''**بل هو مفرد منصرف كما صرح به المحققون**'' بلکہ وہ مفرد منصرف ہے جیسا کہ محققین نے وضاحت کی ہے۔

حواری کے معانی:

حواری سفید ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ گھروں میں با پردہ رہنے والی سورج کی گرمی سے بچنے والی عورتوں کو بھی حواریات کہا جاتا ہے۔ ان کو بھی حواریات کہنے کی اصل وجہ تو یہی نظر آتی ہے کہ سورج کی گرمی اور باہر کے راستوں کی گرد و غبار سے بچنے والی عورتوں کا رنگ صاف ہوتا ہے، اس لئے ان کو حواریات کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دھوبی کو بھی حواری کہا جاتا ہے کہ وہ کپڑوں کو سفید کرتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین کی وجہ تسمیہ:

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریون کو حواریین کہنے کی وجہ میں مختلف اقوال ہیں۔ وہ سفید کپڑے پہنتے تھے اس لئے ان کو حواریین کہا گیا **یا** وہ دھوبی تھے لوگوں کے کپڑے سفید کرتے تھے اس لئے ان کو حواریین کہا گیا **یا** ان کے دل صاف اور اخلاق پاکیزہ تھے اس لیے ان کا یہ نام ہوا۔

وہ لوگ کیا کام کرتے تھے:

اس میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مچھلی کا شکار کرتے تھے، ان میں یعقوب، شمعون، اور یوحنا نامی

آدمی تھے، عیسی علیہ السلام ان کے قریب سے گذرے تو انہیں کہا تم مچھلی کا شکار کرتے ہو۔ فان اتبعتمونی صرتم بحیث تصیدون الناس بالحیاۃ الا بدیۃ" اگر تم میری تابعداری کرو تو ہمیشہ لوگوں کا شکار کرو گے، یعنی مجھ پر ایمان لاؤ تو تمہیں حیات جاودانی حاصل ہوگی، لوگ خود بخود تمہاری تابعداری کریں گے، تمہارے احکام پر چلیں گے، گویا وہ تمہارے شکار ہوں گے، انہوں نے آپ سے پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا "عیسی ابن مریم اللہ تعالی کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ ان لوگوں نے آپ سے معجزہ طلب کیا، آپ نے شمعون کو پانی میں جال ڈالنے کیلئے کہا، جب اس نے جال ڈالا تو اتنی مچھلیاں نکلیں کہ دو کشتیاں بھر گئیں، حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنی کوشش کر چکا تھا کئی مرتبہ جال ڈالنے پر کوئی مچھلی نہیں نکلی تھی۔

عیسی علیہ السلام کے اس معجزہ کو دیکھ وہ لوگ ایمان لے آئے، اس وقت وہاں جتنے لوگ تھے بارہ یا انتیس سب ہی ایمان لے آئے، یہ جب بھوکے ہوتے تو کہتے اے روح اللہ ہم بھوکے ہیں تو عیسی علیہ السلام اپنا ہاتھ زمین پر مارتے ہر ایک کو دو دو روٹیاں نکال دیتے، جب وہ پیاسے ہوتے تو پیاس کی شکایت کرتے تو آپ زمین پر ہاتھ مار کر ہر ایک کو پانی نکال دیتے تو وہ پانی پی لیتے۔ وہ کہنے لگے ہم سے افضل کون ہوگا؟ جب ہم طعام طلب کرتے ہیں تو آپ طعام کھلا دیتے ہیں، اور جب ہم پانی طلب کرتے ہیں تو ہمیں پانی پلا دیتے ہیں، تحقیق ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ عیسی علیہ السلام نے فرمایا "افضل منکم من یعمل بیدہ و یا کل من کسبہ" تم میں سے افضل وہ ہے جو اپنے ہاتھوں سے کام کرے اور اس سے حاصل کردہ مال کھائے۔ آپ کے اس ارشاد کے بعد انہوں نے محنت و مزدوری شروع کر دی وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کی حاصل شدہ مزدوری کو ہی اپنا خرچ بناتے، حواریین کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے ایک مرتبہ لوگوں کی دعوت کی، طعام تیار ہو گیا تقسیم کے وقت ایک پیالے پر حضرت عیسی علیہ السلام مقرر ہوئے، آپ نے تقسیم کرنا شروع کیا ایک پیالہ سب لوگوں سے ختم نہ ہو سکا، بادشاہ نے جب آپ کے معجزہ کو دیکھا تو اس نے اپنی بادشاہت چھوڑ دی آپ کی تابعداری اختیار کر لی، بادشاہ کے کچھ قریبی لوگ بھی اس کے ساتھ عیسی علیہ السلام کے تابع ہو گئے، ان ہی لوگوں کو حواریین کہا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے آپ کو ایک کپڑے رنگنے والے شخص کے پاس چھوڑا کہ یہ کپڑے رنگنا سیکھ جائیں وہ آپ کو جب بھی کوئی اپنے فن کی بات بتانا چاہتا تو وہ آپ پہلے جانتے ہوتے، ایک دن وہ شخص کسی کام کو جانے لگا تو آپ کو کہا کہ یہ کپڑے ہیں ہر ایک پر میں نے نشان لگا دیا ہے اس کے مطابق تم کپڑے رنگ دینا وہ چلا گیا تو آپ نے تمام رنگ ایک برتن میں ڈال کر پکائے، اور اسی برتن میں تمام کپڑے بھی ڈال دیئے۔ اور کپڑوں سے

مخاطب ہوکر کہا "کونوا باذن الله کما ارید" تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسے ہو جاؤ جیسے میں چاہتا ہوں۔

جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے پوچھا کیا تم نے کپڑے رنگ دیئے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں نے سب رنگے اور سب کپڑے ایک برتن میں ڈال دیئے ہیں، رنگے جا چکے ہیں، آپ نکال لیں، اس نے جب یہ سنا تو کہنے لگا تم نے کپڑے برباد کر دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا اٹھ کر دیکھو تو شائد صحیح رنگے ہوں، اس نے جب کپڑے نکالنا شروع کیے تو وہ اسی طرح رنگے ہوئے تھے جیسے اس نے نشان لگائے تھے کوئی سرخ کوئی زرد اور کوئی سبز رنگ تھا، یہ ماجرا دیکھ کر وہاں سب حاضرین متعجب ہوئے اور سب نے ایمان قبول کر لیا، ان لوگوں کو ہی حواریین کہا جاتا ہے۔ ان تمام اقوال کے متعلق قفال کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ان میں سے بعض بادشاہ اور اس کے قریبی تھے، اور کچھ شکاری تھے، کچھ کپڑے رنگنے والے۔ اور کچھ دھوبی تھے۔ ان تمام کو حواریین کہا گیا کیونکہ وہ تمام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار تھے، اور ان کے ساتھ محبت کرنے والے اور ان کی اطاعت میں مخلص تھے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں مجازی معنی لینا زیادہ مناسب ہے کہ آپ کے جتنے لوگ بھی معاون تھے اور خلوص سے آپ کے ساتھ محبت کرنے والے تھے وہ تمام حواریین تھے۔ (روح المعانی ج۲ص۱۷۶)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ﴾ میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) "الاول التقدير من انصاری حال ذهابی الله اوحال التجائی الی الله"

ان میں سے پہلی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان الفاظ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہوئے میرا مددگار کون ہے؟ یا یوں معنی ہوگا "کہ اللہ کی طرف میری التجاء میں میرا مددگار کون ہے؟

(۲) "والثانی التقدير من انصاری الی ان ابين امر الله تعالی والی ان اظهر دينه"

ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ کہ میرا مددگار کون ہوگا اس وقت تک کہ میں بیان کروں اللہ تعالیٰ کے امر کو اور یہ کہ میں ظاہر کروں اللہ کے دین کو۔

"ويكون الی ههنا غاية كانه اراد من يثبت علی نصرتی الی ان تتم دعوتی ويظهر امر الله تعالی"

"الی" اس مقام میں اس معنی مذکور کے لحاظ سے "غاية" کیلئے استعمال ہے، یعنی کون ہے جو میرا مددگار رہوگا جس کی امداد میری اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کی تکمیل تک جاری رہے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے ظاہرو

غالب ہونے تک اس کی امداد رہے گی۔

(۳) "والثالث قال الاکثرون من اهل اللغة الی ههنا بمعنی مع"

ان وجوہ میں تیسری وجہ یہ ہے کہ "الی" اس مقام میں "مع" کے معنی میں استعمال ہے، لیکن اس قول کو زجاج نحوی نے رد کیا ہے کہ "الی" کو "مع" کے معنی میں استعمال کرنا درست نہیں، کیونکہ "الی" غایۃ کیلئے استعمال ہوتا ہے، اور "مع" کا مطلب ہوتا ہے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانا، لیکن زجاج کے قول دوسرے نحویوں نے رد کر دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ﴾ میں "الی" بمعنی مع کے استعمال ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اور نہ کھاؤ ان (یتامی) کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا "الذود الی الذود ابل" اس میں بھی "الی" بمعنی "مع" کے استعمال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "ذود" ذود" سے مل کر "ابل" ہے۔ یعنی "ابل" کا لفظ واحد اونٹ پر بھی بولا جاتا ہے، اور جمع پر بھی۔

(۴) "والرابع ان یکون المعنی من انصاری فیما یکون قربة الی الله ووسیلة الیه"

ان وجوہ میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ میرا مددگار کون ہے کہ اس کی مدد قربت الٰہی بن سکے اور اس کی طرف وسیلہ بن سکے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ جب قربانی کرتے تو یہ پڑھتے "اللهم منک والیک" اے اللہ یہ تیری توفیق سے ہے اور تیرے قرب کا ذریعہ ہے۔

اس لئے مطلب یہ ہو گیا "من انصاری فیما یکون قربة الی الله" میرے مددگار کون ہیں، جن کو مدد قربت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح کوئی شخص دوسرے کے قرب کی دعاء کرتا ہے تو کہتا ہے "اللهم اياه الی" اے اللہ اسے میرے قریب کر دے۔

(۵) "الخامس ان یکون "الی" بمعنی اللام کانه قال من انصاری لله"

ان وجوہ میں سے پانچویں وجہ یہ ہے کہ "الی" بمعنی لام کے استعمال ہو، معنی یہ ہو کہ کون ہیں جو میری امداد کریں اللہ کیلئے۔

(۶) "والسادس تقدیر الآیة من انصاری فی سبیل الله، والی بمعنی فی جائز وهذاقول الحسن"

ان میں وجوہ میں چھٹی وجہ جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اس مقام میں "الی" بمعنی "فی" استعمال ہے۔ "الی" بمعنی "فی" استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہو گا "کون ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار رہوں گے" (ماخوذ از کبیر)

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''کہا حواریون ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے''

''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ''ای نحن انصار دین اللہ وانصار انبیائہ''لان نصرۃ اللہ تعالی فی الحقیقۃ محال فالمراد منہ ماذکرناہ''

﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ''ہم مددگار ہیں اللہ کے دین کے''اور ہم مددگار ہیں اللہ کے انبیاء کے، کیونکہ یہ معنی درست نہیں کہ''ہم اللہ کے مددگار ہیں'' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کرنا حقیقت میں محال ہے۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس بحث کے بعد راقم کی''**تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان**'' کو دیکھیں۔

﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾

''ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی''	(محمود الحسن صاحب)
''ہم اللہ کے مددگار ہیں''	(مودودی صاحب)
''ہم ہیں اللہ کے مددگار''	(عبدالماجد صاحب)
''ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''کہ ہم ہیں مدد دینے والے اللہ کی''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں''	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہاں ذکر کیا جارہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ کون شخص ہے جو اللہ کے دین میں میری مدد کرے گا؟ تو آپ کے حواریون نے کہا﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ہم اللہ کے دین کی مدد کریں گے۔

اب اس مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کرنا کہ''ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے'' یہ بظاہر بہت بڑی غلطی کا عام آدمی کیلئے سبب بن جاتا ہے، کیونکہ عام لوگ صرف ترجمہ کو دیکھ کر خود بخود مطالب حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، جو یقیناً اس سے یہ مطلب حاصل کریں گے کہ اللہ تعالیٰ بھی مدد کا محتاج ہے لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے''ہم دین خدا کے مددگار ہیں'' تو اس میں یہ وہم نہیں ہوتا بلکہ مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو

دین خدا کے پھیلانے میں مدد کرنے کا ارشاد فرمایا اور اسی کا انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم دین خدا کے مددگار ہیں'' اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی کے ترجمہ کو تفاسیر بھی واضح کرتی ہیں:

(نحن انصار الله)اعوان دینه" (مدارک)

''ہم اس کے دین کے مددگار ہیں'' بعینہ ان الفاظ سے ہی جلالین میں تفسیر کی گئی ہے (دوسری تفاسیر میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے) (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۸۲)

﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ''ہم ایمان لائے اللہ پر''

حواریین کا یہ قول علت کے درجے میں ہے، یعنی ہم پر واجب ہے کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں کیونکہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔

"فان الایمان بالله یوجب نصرة دین الله والذب عن اولیائه والمحاربة معن اعدائه"

بیشک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا واجب کرتا ہے کہ اس کے دین کی امداد واجب ہے، اور اس کے ولیوں کی اور اس کے نبیوں کی امداد کی جائے اور ان کے دشمنوں کے ساتھ لڑائی کی جائے۔

﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ''اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے اپنے مسلم ہونے پر گواہ بنایا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گواہ ہونے کو لکھ لینے کی درخواست کی جس کا ذکر آنے والی آیۃ میں آرہا ہے۔ اسلام کا کون سا معنی معتبر ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہاں لغوی معنی معتبر ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ آپ گواہ بن جائیں کہ جو آپ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے مددگا بن جائیں، ہم اس میں آپ کے مطیع وفرمانبردار ہیں، اور آپ کے دشمنوں کا آپ سے دفاع کریں گے ''ان مستسلمون لامر الله تعالی'' ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ گواہ بن جائیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے، اور یہی تمام انبیاء کرام کا دین ہے۔ (کبیر)

راقم کا اس میں مؤقف یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو گواہ بنایا کہ آپ گواہ بن جائیں کہ ہم نے ایمان لایا ہے اور آپ کی اطاعت کرتے ہیں اس میں جو آپ نے امداد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس طرح دونوں معنی مراد ہوں

گے، علیحدہ علیحدہ اقوال مراد لینے کی ضرورت درپیش نہیں آئے گی۔

اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جہاد فرض ہی نہیں تھا تو آپ کا حواریین سے امداد طلب کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: آپ نے ان لوگوں سے جہاد کرنے کا مطالبہ نہیں کیا کہ تم نے مجھ پر ایمان لایا ہے تو میرے ساتھ یہ معاہدہ بھی کرو کہ تم جہاد میں شریک ہو گے، بلکہ آپ کا امداد طلب کرنے میں مقصد یہ تھا:

"انہ علیہ السلام لما علم ان الیھود یریدون قتلہ استنصر لحمایۃ منھم کما قالہ الحسن ومجاھد"

آپ کو جب یہ پتہ چلا کہ یہود آپ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ نے حواریین سے اپنی حفاظت کیلئے امداد طلب کی، اس میں عام قتال کی بات نہیں تھی، حضرت حسن اور مجاہد نے یہی بیان کیا ہے۔ (روح المعانی)

فائدہ: "حواری" کا معنی جو پہلے بیان کیا ہے "ناصر ومخلص" اسی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عن جابر عبداللہ قال ندب النبی ﷺ یوم الخندق فانتدب الزبیر ثم ندبھم فانتدب الزبیر ثم ندبھم فانتدب الزبیر فقال النبی ﷺ ان لکل نبی حواریا وحواری الزبیر" "رواہ البخاری ومسلم"

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے خندق کے دن امداد کیلئے طلب کیا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ امداد کیلئے حاضر ہوئے، یعنی آپ کے ارشاد کو قبول کیا آپ نے پھر امداد کیلئے طلب کیا پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ہی آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ پھر آپ نے امداد کیلئے بلایا تو پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ہی حاضر ہوئے، تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے حواری (مددگار) ہوتے ہیں، میرے حواری (یعنی میرے مددگار) زبیر ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

نبی کے امداد کرنے کا کیا مطلب:

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام کا ظاہری اسباب کی امداد طلب کرنا جائز ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے کہا ﴿اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ﴾ یا کسی مضبوط پائے کی پناہ لیتا" نبی کریم ﷺ نے فرمایا "یرحم اللہ لوطا لقد کان یاوی الی رکن شدید" اللہ تعالیٰ لوط پر رحم فرمائے آپ کسی مضبوط پائے کی پناہ لینا چاہتے تھے۔

بظاہر یہاں وہم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے یہ کیوں کہا؟ (معاذ اللہ) آپ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اس کا جواب ذکر کرتے ہوئے حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"انه كان بمقتضى الجبلة البشرية بعض الامور الضرورية يميل الى الاستعانة بالعشيرة القوية"(مرقاة المفاتيح باب بدء الخلق و ذكر الانبياء)

انسان کی جبلت بشری کا تقاضا ہے کہ وہ بعض امور ضروریہ میں اپنے قوی قبیلہ سے امداد طلب کرتا ہے، یہ انبیاء کرام کی شان کے مخالف نہیں بلکہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام نے بھی اپنے قبائل کے کئی افراد سے امداد طلب کی، اس میں اللہ کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں پائی گئی۔

نبی کریم ﷺ کا امداد طلب کرنا:

"كان النبى ﷺ يقول فى مواسم الحج قبل ان يهاجر"من رجل يؤوينى حتى ابلغ كلام ربى"فان قريشا قد منعونى ان ابلغ كلام ربى"

نبی کریم ﷺ ہجرت سے پہلے اوقات حج میں یہ فرما رہے تھے"وہ کون شخص ہے جو میری حفاظت کرے تاکہ میں اپنے رب کا کلام (لوگوں تک) پہنچا سکوں، بیشک قریش مجھے اللہ کا کلام پہنچانے میں منع کرتے ہیں (یعنی وہ رکاوٹ کا ذریعہ ہیں) اسی وجہ سے آپ نے ان کی طرف ہجرت کی اور انہوں نے آپ کے غمخوراگی کی اور ہر سیاہ وسفید کو آپ سے دور رکھا۔ (صاوی، ابن کثیر)

نبی کریم ﷺ نے امداد طلب کرنا ترک کر دیا:

جب آیۃ کریمہ ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ نے کسی سے اپنی حفاظت کی امداد طلب نہیں کی، جس کا ذکر اسی آیۃ کریمہ کی وضاحت کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۳)

(1) اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو اتارا اور رسول کے تابع ہوئے تو ہمیں حق پر گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

(2) اے ہمارے رب ایمان لایا ہم نے اس پر جو تو نے نازل کی، اور تابعداری کی ہم نے رسول کی پس تو لکھ دے ہمیں گواہی دینے والوں میں۔

جب قوم نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایمان اور اپنے اسلام پر گواہ بنایا، پھر انہوں عاجزی سے رب تعالیٰ کے حضور جو عرض کیا وہ اس آیۃ کریمہ میں ذکر کر دیا گیا۔ قوم نے جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا تو عرض کیا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم ایمان لائے اللہ پر' اس کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں ہو چکا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لایا تو کہا ﴿رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ﴾ اے ہمارے تب ہم نے ایمان لایا جو تو نے نازل کیا اور انہوں نے اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا ذکر یوں کیا ﴿وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ '' اور ہم نے تابعداری کی رسول کی۔ پھر انہوں رب تعالیٰ کے قرب اور ثواب کا مطالبہ کرتے ہوئے عرض کیا ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ تو ہمیں لکھ دے گواہی دینے والوں میں۔

"وهذا يقتضي ان يكون للشاهدين فضل يزيد على فضل الحواريين وبفضل على درجته"

اس سے پتہ چلا کہ شاہدین کا مرتبہ بلند ہے حواریین کے مرتبہ پر، تو انہوں نے اپنے درجہ کی بلندی کا مطالبہ کیا۔

شاہدین سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس میں چند اقوال پائے گئے ہیں کہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کے درجہ کو حاصل کرنے کا حواریین نے مطالبہ کیا۔

(۱) اس میں ایک قول یہ ہے کہ شاہدین سے مراد سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور آپ کی امت ہے، اسلئے کہ قیامت کے دن ان کو ہی خصوصی طور پر شہادت دینے کا منصب حاصل ہوگا، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

(۲) دوسرا قول بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ﴿اُكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ کا معنی ہے "اكتبنا فی زمرة الانبياء" اے ہمارے رب ہمیں انبیاء کرام کی جماعت میں لکھ دے یعنی ہمیں انبیاء کرام کا

قرب حاصل ہو جائے۔

"لان کل نبی شاھد لقومه قال الله تعالی"فلنسألن الذین ارسل الیھم ولنسألن المرسلین"

کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہوگا، رب تعالی کا ارشاد گرامی اس پر دلیل ہے کہ رب تعالی نے فرمایا'' تو ضرور ہمیں پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول گئے اور بیشک ضرور ہمیں پوچھنا ہے رسولوں سے،

(۳) **والقول الثالث"اکتبنا مع الشاھدین ای اکتبنا فی جملة من شھدلک بالتوحید ولا نبیائک بالتصدیق"**

تیسرا قول یہ ہے کہ شاہدین سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالی کی توحید اور انبیاء کرام کی تصدیق کی گواہی دی، جب انہوں نے اپنے اسلام پر عیسی علیہ السلام کو گواہ بنایا تو بطور تاکید اللہ تعالی کو بھی اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔

"فقد اشھدوا الله علی ذلک تاکیدا للامر وتقویة له"اور ساتھ ھی"طلبوا من الله مثل ثواب کل مؤمن شھدلله بالتوحید ولانبیائه بالنبوة"

انہوں نے رب تعالی سے مطالبہ کیا کہ اے اللہ ہمیں ان تمام مؤمنین کا درجہ اور ثواب عطاء فرما جنہوں نے تیری توحید کی گواہی دی، اور انبیاء کرام کی نبوت کی گواہی دی۔

(۴) **القول الرابع ان قوله(فاکتبنا مع الشاھدین)اشارة الی ان کتاب الابرار انما یکون فی السماوات مع الملائکة"**

چوتھا قول یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿فَاکْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِیْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ حواریین نے کہا کہ ہمارا ذکر کتاب الابرار میں کر دے جو آسمانوں میں فرشتوں کے پاس ہے، جس کا ذکر اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں ہے:

(کَلَّا اِنَّ کِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ) (سورة المطففین، آیة نمبر ۱۸)

''ہاں ہاں بیشک نیکوں کی لکھت سب سے اونچے محل علیین میں ہے'' جب اللہ تعالی ان کے ذکر کو مؤمنین گواہوں میں کر دے گا تو ان کا ذکر بھی ملائے اعلی میں اور ملائکہ مقربین کے ساتھ ہو جائے گا۔

(۵) **القول الخامس انه تعالی قال(شھدالله انه لااله الاھو والملائکة واولوا العلم"**

(گواہی دی اللہ نے بیشک وہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے، اور (گواہی دی) فرشتوں نے اور علم والوں نے) علم والوں کو اللہ تعالی نے گوہوں میں شامل فرمایا، اور ان کا ذکر اپنے ذکر کے ساتھ کیا، علم والوں کیلئے یہ عظیم درجہ اور بلند مرتبہ ہے، اسلئے عیسی علیہ السلام کے حواریین نے بھی عرض کیا ﴿فَاکْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِیْنَ﴾ (تو لکھ لے ہمیں گواہوں کے

ساتھ)ای اجعلنا من تلک الفرقة الذین قرنت ذکر ھم بذکرک" یعنی ہمیں اس گروہ کے ساتھ ملا دے جن کا ذکر تو نے اپنے ساتھ کیا ہے۔

(۶) والقول السادس ان جبریلں لما سأل محمدااعن الاحسان فقال"ان تعبد الله کانک تراه"

چھٹا قول یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے جب نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ احسان کیا ہے تو آپ نے فرمایا (احسان یہ ہے کہ تو رب کی عبادت کرے تو یہ سمجھے کہ تو رب کو دیکھ رہا ہے) یہ مقام شہود ہے، یعنی بندہ رب تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوتا ہے، غیب کے درجہ میں نہیں ہوتا۔

"لما صاروا کاملین فی درجة الاستدلال ارادوا الترقی من مقام الاستدلال الی مقام الشھود والمکاشفة فقالوا"فاکتبنا مع الشاھدین"

جب وہ لوگ درجہ استدلال میں کمال حاصل کر چکے تو انہوں نے مقام استدلال سے مقام شہود و مکاشفہ کی طرف ترقی کا ارادہ کیا تو کہا (ہمیں لکھ لے مقام شہود والوں کے ساتھ)

(۷) القول السابع ان کل من کان فی مقام شھود الحق لم یبال بما یصل الیه من المشاق والآلام"

ساتواں قول یہ ہے کہ جن لوگوں کو رب تعالیٰ کے ہاں مقام شہود حاصل ہوتا ہے، یعنی رب تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوتے ہیں انہیں رب تعالیٰ کی تجلیات میں مشغول ہونے کی وجہ سے کوئی مشقت اور مصیبت، درد و تکلیف حاصل نہیں ہوتی۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریین کو کہا تم اللہ کے دین میں میری مددگار بن جاؤ اور میرا دفاع کرو، تو حواریین نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ﴿فَاکْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِیْنَ﴾ (تو ہمیں لکھ دے شاہدین کے ساتھ) یعنی اے اللہ "اجعلنا ممن یکون فی شھود جلالک" ہمیں ان لوگوں میں کر دے جن کو تیرے جلال کا شہود حاصل ہے، تا کہ ہم ہر قسم کے مصائب و آلام، درد، تکالیف کو گھٹیا سمجھ کر پرواہ میں نہ لائیں تو اس وقت ہم پر تیرے نبی سے وفا کرنا آسان ہوگا، اسلئے ہم تیرے رسول و نبی کی امداد کرنا اپنے آپ پر لازم کر سکیں گے۔ (کبیر)

حواریین کی اس دعاء پر آثار:

"اخرج القربانی وعبدبن حمید وابن المنذر من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس "فاکتبنا مع الشاھدین"قال مع محمد ﷺ وامته انھم شھدوا له انه قد بلغ وشھدوا للرسل انھم قدبلغوا" (درمنثور)

فریابی اور عبد بن حمید اور ابن منذر نے کلبی سے ابوصالح کی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو ذکر کیا کہ ان کا یہ عرض

کرنا﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ﴾ (ہمیں شاہدین کے ساتھ لکھ لے) کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں محمد ﷺ کے ساتھ لکھ لے اور آپ کی امت کے ساتھ لکھ لے کیونکہ انہوں نے آپ کی تبلیغ (رب کے حکم پہنچا دینے) کی شہادت دی، اور تمام رسولوں کے متعلق شہادت دی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دے۔

❁ ''واخرج ابن مردویه عن ابی سعید الخدری ان رسول اللهﷺ کان یقول اذاقضی صلوته اللهم انی اسألک بحق السائلین علیک فان للسائلین علیک حقا ایما عبد اوامة من اهل البر والبحر تقبلت دعوتهم واستجیبت دعاء هم ان تشرکنا فی صالح ما یدعونک به وان تعافینا وایاهم وان تقبل منا ومنهم وان تجاوز عنا وعنهم بانا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاكتبنا مع الشاهدين، وكان يقول لايتكلم بهذااحد من خلقه الااشركه الله فی دعوة اهل برهم واهل بحرهم فعمتهم وهو مكانه'' (درمنثور)

ابن مردویہ نے ابو سعید خدری ﷺ کی روایت نقل فرمائی کہ بیشک رسول اللہ ﷺ (تعلیم امت کیلئے) نماز سے فارغ ہونے پر یہ دعاء فرماتے تھے،''اے اللہ میں تجھ سے سؤال کرتا ہوں سائلین کے حق کے واسطہ سے جو تو نے اپنے ذمہ کرم پر لازم کیا ہے، بیشک سائلین کا تیرے ذمہ کرم پر یہ حق ہے کہ جو بھی مرد اور عورت خواہ وہ خشکی میں رہنے والے ہیں یا سمندری علاقہ میں رہنے والے ہیں وہ عبادت کے بعد جب تجھ سے دعاء کرتے ہیں تو تو (اپنے فضل وکرم سے) وہ دعاء قبول کرتا ہے، جب تو ان کی دعاء کو قبول کرتا ہے تو ہمیں بھی نیک بندوں کی دعاء میں شریک کر کے تو ہمیں معاف کر اور ان کو (بھی) معاف کر، اور ہماری دعاء کو قبول کر اور ان کی دعاء کو (بھی) قبول کر، اور ہم سے درگذر فرما اور ان سے (بھی) درگذر فرما، کیونکہ ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو تو نے نازل کیا ہے، اور ہم نے (اللہ کے) رسول پر ایمان لایا ہے تو ہمیں لکھ لے شہادت دینے والوں میں، اور آپ فرماتے تھے کہ کوئی شخص اللہ کی مخلوق میں سے یہ دعاء نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے بر و بحر (خشکی وتری) کے لوگوں کی دعاء میں شریک کرتا ہے، وہ کہیں بھی ہو سب کی دعاء میں اس کی دعاء شریک ہو جاتی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۴)

(1) اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر چھپی تدبیر والا ہے۔

(2) اور مکر کیا انہوں نے اور (ان کو ہلاک کرنے کی) خفیہ تدبیر فرمائی اللہ نے، اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر فرمانے والا ہے۔

سب سے پہلے تو آپ تراجم کا فرق دیکھئے، اس آیۃ کریمہ کے ترجمہ کا اکثر مترجمین نے حق ادا نہیں کیا۔

''اور مکر کیا ان کافروں نے'' اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا مکر سب سے بہتر ہے۔'' (محمود الحسن صاحب)

''فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے'' (شاہ عبد القادر صاحب)

''(یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں) ایک چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے کیلئے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے'' (فتح محمد)

''اور مکر کیا انہوں نے یعنی کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے'' (شاہ رفیع الدین صاحب)

''اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر والا ہے''

(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس آیۃ کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت عام مترجمین نے اس مقام کی نزاکت کو نہیں سمجھا اور براہ راست مکر، فریب، دھوکا، دغا، داؤ جیسے الفاظ کی نسبت رب قدوس بے عیب ذات کی طرف کر دی، عام انسان جو مفسرین کرام کے نکات سے بے خبر ہے ضرور یہ سمجھے گا کہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ مکار، دھوکا باز، وغیرہ ہے (معاذ اللہ) اسی وجہ سے مفسرین کرام نے اس مقام پر نہایت غور فکر کے بعد بتایا کہ یہاں مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہے۔

''ومكر الله''عبارة عن الاحتيال في ايصال الشرو الاحتيال على الله تعالى محال فصار لفظ المكر في حقه من المتشابهات''وذكروا في تاويله وجوها احدها انه تعالى سمى جزاء المكر مكرا كقوله تعالى وجزاء سيئة مثلها سمى جزاء المخادعة بالمخادعة وجزاء الا ستهزاء بالاستهزاء والثاني ان معاملة الله معهم كانت شبيهة بالمكر فسمي بذلک، والثالث ان هذااللفظ ليس من المتشابها ت لانه عبارة عن بالتدبير المحكم الكامل ثم اختص في العرف ب التدبير ايصال الشر الى الغير وذلک في حق

اللہ تعالی غیر ممتنع و اللہ اعلم" (کبیر)

اعتراض: یہ ہوا کہ مکر کا معنی ہوتا ہے "کسی کو شر پہنچانے میں حیلہ کرنا" اور اللہ تعالی کا شر پہنچانے میں حیلہ کرنا محال ہے، تو مکر کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کس طرح صحیح ہے۔

جواب: یہ لفظ اللہ تعالی کی شان میں استعمال ہونے سے متشابہات سے ہے، اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں۔

(۱) ایک یہ ہے کہ یہاں جزاء مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن پاک میں ہی "جزاء سیئة" ذکر فرمایا گیا، یعنی مشاکلت کے طور پر ﴿جَـزَآءُ سَيِّـئَةٍ﴾ کو "سـيـئـة" کہا گیا ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق 'جـزاء مـخـادعة" کو مـخـادعة سے، اور جزاء استھزاء کو استھـزاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس تاویل کے مطابق "مکر الله" کا معنی یہ ہوگا کہ 'اللہ تعالی مکر کی جزاء دے گا۔

(۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سے ایسا معاملہ فرماتا ہے کہ جو ان کے مکر کے مشابہ ہوتا ہے یعنی مکر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے میں خفیہ طور پر حیلہ کرنا جس سے وہ بے خبر ہو۔ اسی طرح اللہ تعالی ان کو اس فعل کی جزاء دے گا، جس جزاء (عذاب) سے وہ خبر ہیں، تو اس طرح مکر کی مشابہت ہوئی، کیونکہ وجہ شبہ کسی ایک صورت میں کافی ہوتی ہے، وہ فقط "خفاء" ہے۔ انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام سے ان کے قتل کرنے کا حیلہ ان سے مخفی رکھا، اسی طرح اللہ تعالی نے اپنا عذاب اب سے مخفی رکھا۔ اب اس صورت میں "مـکـر الـلـه" کا معنی یہ ہوا 'اللہ تعالی ان کے مکر کا معاملہ ان سے ایسا ہی فرمائے گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ متشابہت سے نہیں، بلکہ اس کا معنی "تـدبیـر مـحـکـم و کامل" ہے۔ پھر عرف میں اس کا معنی مختص ہو گیا کہ "کسی کو عذاب پہنچانے اور ہلاک کرنے میں خفیہ تدبیر کرنا" اور یہ اللہ تعالی کے حق میں ممتنع نہیں۔ اب تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں آپ کا ترجمہ اس تیسری صورت کے عین مطابق آپ کو نظر آئے گا۔ "کہ اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی " (راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا) لیکن باقی تراجم کا مقصد عم اردودان کو سمجھانا مقصود ہے تو وہی ترجمہ اس کو راہ راست پر لاسکتا ہے جس میں وہ غلطیوں واقع ہو کر اللہ تعالی پر عیب ثابت کرنے شروع نہ کردے۔ اسی طرح پارہ انیس رکوع چار ، اور پارہ نو رکوع بارہ میں بھی مترجمین نے اپنے تراجم میں ایسے ہی غلطیاں کیں۔ (تسکین الجنان ص ۸۳،۸۴)

حضرت پیر کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، تقریبا ہر زبان میں بلا استثناء ایسے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں

جومتعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں اور اہل زبان ان الفاظ کو بلا تأمل اب کے مختلف معنوں میں استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن جب وہی لفظ کسی دوسری زبان میں استعمال ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے اصلی مختلف معنوں میں سے کسی ایک معنی میں مشہور ہو جاتا ہے، اب جب ہم اسے اس کو اصلی زبان مستعمل ہوتے ہوئے پاتے ہیں تو اس کا وہی معنی جو ہمارے ذہن نشین ہو چکا ہوتا ہے، چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب وہ چسپاں نہیں ہوتا تو پریشان ہو جاتے ہیں۔اس کی ایک لفظ "مکر" ہے، اس کا معنی 'حیلہ سازی' بھی ہے، اور یہی لفظ عربی میں صرف کرنے اور کسی پنہاں سازش کو خفیہ طیقہ سے ناکام بنادینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن اردو میں ہم اس لفظ "مکر" کو صرف دھوکہ دہی اور فریب کاری کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

جب اس فعل کی نسبت ذات باری تعالی کی طرف ہوتی ہے تو ہمارا ذہن بلا وجہ طرح طرح کے شکوک وشبہات کی آماجگاہ بن جاتا ہے، حالانکہ جب اس کا فاعل وہ ذات مقدس ہو جو ہر عیب، ہر نقص اور ناز یبا فعل سے پاک ہے تو ہم لفظ مکر کا معنی صرف خفیہ تدبیر یا خفیہ طریقہ جس سے دشمنان حق کے شیطانی منصوبوں کو خاک ملانا مقصود ہوتا ہے کریں گے اب کسی قسم شک باقی نہیں رہتا۔

"قال المفضل و دبروا و دبر الله والمکر لطف التدبیر" (البحر المحیط)

مفضل فرماتے ہیں 'ومکروا ومکر الله' کا معنی ہے اور یہودیوں نے بھی (مسیح علیہ السلام کو قتل کی) خفیہ تدبیر کی، اور اللہ تعالی نے بھی (مسیح علیہ السلام کو بچانے کی) خفیہ تدبیر کی، کیونکہ مکر کا معنی یہاں صرف تدبیر، خفیہ تدبیر ہی لیا جا سکتا ہے۔اور اگر ان لغوی تحقیقات کیلئے انسان کے پاس وقت نہ ہو تو کم از کم علم بدیع کے قاعدہ مشاکلت کو ہمیشہ پیش نظر رکھے وہ یہ ہے کہ عربی میں کسی برے اور ناپسندیدہ فعل پر جو سزا دی جاتی ہے اسی لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ سزا کتنی مناسب اور قرین انصاف کیوں نہ ہو مثلاً ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے۔ حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوا کرتی بلکہ عین انصاف ہوا کرتی ہے۔اسی طرح اور ارشاد فرمایا ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ یعنی جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو۔حالانکہ زیادتی اور تعدی کی روک تھام کرنا زیادتی اور ظلم نہیں بلکہ دین اور اخلاق کے تمام ضابطے اس کے درست ہونے کی تائید کرتے ہیں۔

اسی طرح یہاں بھی حضرت عیسی علیہ السلام کے قتل کرنے کی جو مکارانہ سازش ان یہودیوں نے کر رکھی تھی اللہ تعالی کی طرف سے اس کو ناکام بنانے کی جو تدبیر کی گئی اسے مکر سے تعبیر فرما دیا۔اور اس میں کوئی نقص نہیں۔
(ضیاء القرآن)

ان کا مکر کیا تھا؟

ان کا مکر یہ تھا کہ وہ عیسی علیہ السلام کو قتل (شہید) کرنے کیلئے حیلے، بہانے تراش رہے تھے، جس کا علم عیسی علیہ السلام کو بھی ہو گیا۔

رب تعالی کی خفیہ تدبیر:

اللہ تعالی نے عیسی علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھالیا، ان کو ناکام کر دیا۔ ان کے ہی ایک شخص کو ان کے ہاتھوں سے ہلاک کرا دیا، اور اخروی عذاب کی ہلاکت کا سب کو مستحق ٹھہرا دیا۔

عیسی علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کا واقع:

تفسیر خازن اور روح المعانی میں بیان کیا گیا ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل کو جب عیسی علیہ السلام نے تبلیغ فرمائی تو وہ آپ سے مقابلہ تو نہ کر سکے البتہ ان کی شان میں گستاخی شروع کر دی۔ اور آپ کی والدہ مکرمہ پر عیب لگانے شروع کر دیئے اور آپ کو طرح طرح کی تکالیف دینی شروع کر دیں۔ ایک دن آپ شہر میں گشت فرمار ہے تھے کہ شہر کے لوگوں نے آپ کو بہت پریشان کیا تب آپ نے اللہ تعالی سے دعاء کی اے مولائے کائنات، میں کہاں تک صبر کروں، اب بہتر یہی ہے کہ تو ان کو خنزیر بنا دے، آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ وہ سب خنزیر بن گئے، اس واقع سے لوگوں پر ایک خوف طاری ہو گیا۔ کسی نے اس وقت کے یہودی بادشاہ کو خبر دی کہ عیسی علیہ السلام کی دعاء کو اللہ تعالی قبول فرماتا ہے، آپ کی دعاء سے اتنے لوگ خنزیر بن گئے ہیں، تم بھی ان کے مخالف ہو اس لئے تم اپنی فکر کرو، کہیں وہ تمہارے خلاف بھی دعاء نہ کر دیں اور تمہارا بھی ایسا حال نہ ہو جائے۔

اس نے کہا کیا ہو سکتا ہے ایسے مقبول الدعاء کے مقابلہ میں کوئی تدبیر بھی کام نہیں آ سکتی البتہ یہ ہو سکتا کہ کسی حیلہ سے شہید کر دیا جائے تو ان کی دعاء کا خوف ختم ہو جائے گا کہ کہیں وہ مخالف دعاء نہ کریں۔ اس نے ایک شخص ''ططیانوس'' کو اس کام کیلئے منتخب کر دیا وہ ایک منافق شخص تھا بظاہر عیسی علیہ السلام سے بھی ملتا تھا لیکن در پردہ وہ یہود سے بھی ملا ہوا تھا۔

جب یہ واقع در پیش آنے والا ہی تھا تو حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے پہلے فرما دیا تھا کہ آج صبح سے پہلے ہی مجھے ایک شخص چند دراہم کے عوض فروخت کر دے گا۔

خیال رہے کہ منافقین تقریباً ہر دور میں رہے، یعنی جہاں مخلصین ہوتے ہیں وہاں منافقین بھی ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی منافقین تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آیا تھا اس وقت تک جاننے کے باوجود آپ ان سے چشم پوشی فرماتے ہے، جب حکم آگیا تو ایک ایک کا نام لے کر مسجد سے نکال دیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم تھا لیکن آپ بھی رب تعالیٰ کی مثبت پر شاکر تھے اسے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی کسی اور کو کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے ۔ چنانچہ ططیانوس کو اس یہودی بادشاہ نے جس کا نام بھی یہودا تھا، تیس درہم دینے کا وعدہ کیا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خود شہید کر دے یا کسی اور سے کرادے۔

تیس درہم کی لالچ میں آکر ططیانوس نے یہود کے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور آپ کی قیام گاہ پر آگیا، ان لوگوں کو باہر کھڑا کیا اور خود اندر گیا۔ اس کے سامنے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو کھڑکی کے ذریعے آسمانوں پر زندہ اٹھالیا گیا، وہ یہ ماجرا دیکھ کر بہت متعجب ہوا، اور کافی دیر تک اس تعجب میں گم سم رہا، اس کے ساتھیوں نے سمجھا کہ شائد ططیانوس اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے، وہ اندر جانا ہی چاہتے تھے لیکن ان کا ساتھی باہر آگیا، اللہ تعالیٰ نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا، اب اس کے ساتھی یہودیوں نے اس کے باہر آتے ہی یہی سمجھا کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ یہ ان کا ہم شکل بھی تھا اس لئے انہوں نے اسے پکڑ لیا یہ چلا چلا کر انہیں بتا رہا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں حضرت مسیح کو قتل کرنے گیا تھا، لیکن اس کی بات کو کسی ایک نے بھی نہ سنا بلکہ وہ کہنے لگے اے عیسیٰ تم نے ہمارے ساتھی کو قتل کر دیا ہے اب ہمیں دھوکہ دینا چاہتے ہو، یہ کہہ کر اسے سولی پر چڑھا دیا۔

خیال رہے کہ عیسائی بھی آج تک اسی وہم میں مبتلاء ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا البتہ پھر زندہ کر کے انہیں آسمانوں پر اٹھایا گیا ہے، اسی وجہ سے سارے عیسائی صلیب کو پوجتے ہیں، اس سولی کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ططیانوس کو قتل کیا گیا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا۔ (روح المعانی، خازن)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول:

قتادہ کہتے ہیں ہمیں یہ بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کہا "**ایکم یقذف علیه شبهی فانه مقتول**" تم میں سے کون ہے، جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے تو اسے قتل کر دیا جائے، تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے نبی مجھ پر تمہاری شبیہ ڈال دی جائے، تو اس پر آپ کی شبیہ ڈال دی گئی، تو وہ قتل کر دیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قتل ہونے سے بچالیا، اور ان کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا، اور انہیں نورانی لباس پہنا دیا گیا، اور ان سے

کھانے پینے کی لذت کو اٹھا لیا گیا، اور ان کی اڑان فرشتوں کے ساتھ کر دی گئی، اور آپ کو عرش کے گرد پھرنے والے فرشتوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ "وصار انسیا ملکیا ارضیا سماویا" اس لحاظ پر آپ کو انسان ہونے، فرشتہ ہونے زمینی ہونے اور آسمانی ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ (خازن)

تنبیہ: اس روایت میں اور پہلے ذکر کیے ہوئے واقع میں کوئی تعارض نہیں پایا گیا، کیونکہ ططیانوس منافق ہو گیا تھا، ابتدائی طور پر جب منافق نہیں تھا تو عیسی علیہ السلام کے قول کا جواب دیا کہ مجھے آپ کی شبیہ حاصل ہو جائے اور مجھے قتل کر دیا جائے، لیکن بعد میں وہی یہودیوں کا طرف دار ہو گیا، اور پیسوں پر بک گیا، منافق ہو گیا، اور عیسی علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش کرنے لگا تو اسی کے سامنے رب تعالی کی خفیہ تدبیر آ گئی کہ اسے عیسی علیہ السلام کی شبیہ دے کر قتل کرا دیا گیا۔ (راقم)

اللہ تعالی کی خفیہ تدبیر کی کئی صورتیں:

(۱) اللہ تعالی نے یہود کے مکر و حیلہ کو ان پر ہی لوٹا دیا کہ وہ حضرت عیسی علیہ السلام کو شہید کرنا چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالی اسی شخص پر عیسی علیہ السلام کی شبیہ ڈال کر قتل کرا دیا جو عیسی علیہ السلام کو شہید کرنے کی سازش کر رہا تھا۔

(۲) اللہ تعالی نے یہود پر اہل فارس کو مسلط کیا، انہوں نے ان کو قتل کر دیا اور ان کی اولاد کو قید کر لیا، یہ قول ابن اصم کا ہے۔

(۳) عیسی علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد یہود نے حواریین سے جہاد کیا، ان کو یہود نے پکڑ لیا اور طرح طرح کی تکالیف پہنچائیں یہ خبر شاہ روم کو پتہ چلی تو اس نے حواریین کو ان سے چھڑا لیا، یہود کی بادشاہت بھی اس کی زیر سلطنت تھی، پھر بنی اسرائیل سے اس نے جہاد کیا تو وہ در پردہ عیسائی ہو گیا، اور اپنے عیسائی ہونے کا انہیں پتہ نہ چلنے دیا، اس طرح اللہ تعالی نے اپنی خفیہ تدبیر سے یہود کو ان کے اپنے بادشاہ کے ذریعے نقصان پہنچایا۔ (از البحر المحیط)

انتباہ شدید:

"ولا یقال للہ ماکر اومکار الامشاکلۃ وزول بما علمت لان اصل المکر یستعمل فی المحتال لأخذ صاحبہ لعجزہ عنہ وھو مستحیل علی اللہ" (صاوی)

اللہ تعالی کو "ماکر" (مکر کرنے والا) یا (مکار) نہیں کہا جا سکتا، ہاں صرف مشاکلت کے طور پر اور تاویل کر

کے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ پر استعمال ہوتے ہیں، اس کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔

اصل میں مکر کا مطلب ہے کہ حیلہ سے دوسرے کو دھوکہ دینا جس کو مندفع کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو، اس معنی کے لحاظ پر اللہ تعالیٰ کی طرف ان الفاظ کی نسبت صحیح نہیں (لیکن اردو زبان میں مکر صرف فریب کرنے، دھوکہ دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے کسی صورت میں بھی یہ کہنا درست نہیں، اللہ تعالیٰ مکر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ماکر ہے، اللہ تعالیٰ مکار ہے، کیونکہ اردو زبان میں سوائے فریب کرنے، دھوکہ دینے کے استعمال نہیں البتہ عربی زبان میں "مکر" کا معنی خفیہ تدبیر، یا جزاء مکر وغیرہ میں استعمال ہے، عربی اور اردو کے استعمالات میں جب فرق پایا جاتا ہے تو ایک زبان کے استعمال کو دوسری زبان کے استعمال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ دعاء فرماتے تھے "اللهم امكرلي ولا تمكر علي" "اے اللہ میرے لئے بہتر خفیہ تدبیر فرما، میرے خلاف خفیہ تدبیر نہ فرما۔ (قرطبی)

رب تعالیٰ کا عجیب انداز پر گرفت کرنا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ہم ان کو درج (داخل) کرتے ہیں وہاں جہاں وہ جانتے ہی نہیں سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "نمدهم بالنعم وننسيهم الشكر عليها فاذاركنوا الى النعمة وحجبوا عن المنعم اخذوا" ہم ان کی نعمتوں کے ذریعے امداد کرتے ہیں، اور ان کو شکر کرنے سے دور کر دیتے ہیں، جب لوگ نعمتوں کی طرف میلان کریں اور منعم سے دور ہوں، اس کا شکر ادا نہ کریں تو وہ گرفت میں آجاتے ہیں،

"وقال ابو العباس ابن عطاء يعني كلما احدثوا خطيئة جددنا لهم نعمة وانسيناهم الاستغفار من تلك الخطيئة"

ابو العباس ابن عطاء نے بیان کیا ہے کہ لوگ جب نئے نئے گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نئی نئی نعمتیں عطاء کرتا ہے تا کہ ان کو استغفار کرنے کا موقع ہی نہ ملے، اس طرح وہ گناہوں کی سزا میں مبتلاء کر دیئے جائیں۔ (از روح البیان)

واضح ہوا کہ دنیاوی نعمتیں ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت کا بھی ذریعہ بنتی ہیں۔ (روح البیان)

فائدہ: ومن جهل المريد بنفسه وبحق ربه ان يسيء الادب باظهار دعوى"

وہ شخص جو اپنے نفس کا ارادہ رکھتا ہو، یا اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ارادہ رکھتا ہو اس وقت جاہل کہلائے گا، جب وہ اپنے دعوی

کے اظہار میں ادب کا لحاظ نہیں رکھے گا۔ (روح البیان)

اسی طرح اگر کوئی شخص گناہوں کی دلدل میں پھنس جائے لیکن اسے ان کی سزا دینے میں مہلت دی جائے تو وہ کہے کہ اگر یہ میرے کام جائز نہ ہوتے تو مجھے مہلت نہ دی جاتی بلکہ میری گرفت ہوتی تو اس کا یہ نہ سمجھنا کہ مجھے مہلت تو گناہوں سے توبہ کرنے کیلئے دی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے "وما ذاک الا لفقد نور بصیرتہ او ضعف نورھا" کہ اسے نور بصیرت ہی حاصل نہیں، یا اس کے نور بصیرت میں ضعف ہے، یعنی اس کے نور بصیرت کی کمی کی وجہ سے اسے وہ مطلب نہ سمجھ آیا جس کا سمجھنا ضروری تھا۔ (از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِذْقَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ٥﴾ (آیۃ نمبر ۵۵)

(1) یاد کرو جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا اور تجھے کافروں سے پاک کردوں گا اور تیرے پیروؤں کو قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے تو میں تم میں فیصلہ فرما دوں گا جس بات میں جھگڑتے ہو۔

(2) یاد کرو جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ بیشک میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا، اور اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف، اور پاک کر رہا ہوں (دور کر رہا ہوں) تمہیں ان سے جنہوں نے کفر کیا، اور کروں گا ان کو جنہوں نے تابعداری کی تمہاری اوپر ان کے جنہوں نے کفر کیا "قیامت تک" پھر میری طرف لوٹنا ہے تم نے تو میں فیصلہ کروں گا درمیان تمہارے، جس میں کرتے تھے تم اختلاف۔

﴿اِذْقَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾

"یاد کرو جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ! بیشک میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا" یہی ترجمہ

راقم نے بھی نقل کیا ہے۔ آیئے راقم کی تسکین الجنان سے تراجم کا تقابلی جائزہ دیکھئے، اور انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ کون سا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ تراجم پر نظر ڈالئے:

﴿اِنِّی مُتَوَفِّیۡکَ﴾

''میں لوں گا تجھ کو''	(محمود الحسن صاحب)
''اب میں تجھے واپس لے لوں گا۔''	(مودودی صاحب)
''اے عیسی میں تم کو موت دینے والا ہوں''	(عبدالماجد صاحب)
''بے شک میں تم کو موت دینے والا ہوں''	(اشرف علی تھانوی صاحب)
''میں تجھ کو پھر لوں گا ''	(شاہ عبدالقادر صاحب)
''تحقیق میں پھر لینے والا تجھ کو''	(شاہ رفیع الدین صاحب)
''میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا''۔	(اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

یہ خطاب ہے حضرت عیسی علیہ السلام کو، اگر ترجمہ کیا جائے کہ ''میں لے لوں گا تجھ کو'' ''میں تم کو موت دینے والا ہوں''، ''میں لے لوں گا تجھ کو'' اس ترجمہ میں کئی احتمال ہیں ''تجھے لے لوں گا'' یعنی تیری روح کو قبض کرلوں گا، تجھے اپنی حفاظت میں لے لوں گا، یہ الفاظ مرزائیوں کے عقائد کا رد نہیں کرتے۔ اور ترجمہ ''میں موت دینے والا ہوں تجھ کو'' مرزائیوں کے عقیدہ کی امداد کرتا ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسی علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، ان کے متعلق تو رب تعالی فرما چکا ہے ''انی متوفیک'' لھذا احادیث میں جو مسیح موعود کا ذکر ہے، اس سے مراد ہمارا نبی (کذاب) مرزا غلام احمد قادیانی (لعنة الله علیه) ہی ہے، لیکن ان کے اس نظریئے کے باطل کرنے کے لیے اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ موزون ترین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر کبیر کے مطابق ہے، یہ مرزائیوں کا گروہ تو کل کی پیداوار ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے ہی ایسی تفسیر کی جو ان کے نظریات کو رد کرنے کیلئے کافی ہے۔

معنی قوله ''انی متو فیک'' ای انی متمم عمرک فحینئذ الو فاک فلا اتر کھم حتی یقتلوک بل انا رافعک الی سمائی و مقرک بملائکتی و اصونک عن ان یتمکنو امن قتلک وھذا تاویل حسن'' (کبیر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اِنِّی مُتَوَفِّیکَ﴾ کا معنی یہ ہے ”میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا“ پھر تمھیں وفات عطاء کروں گا، ان کو نہیں چھوڑوں گا (یعنی ان کو کھلی چھٹی نہیں دوں گا) کہ وہ تمہیں قتل کرسکیں بلکہ میں تمہیں آسمانوں کی طرف اٹھاؤں گا بلکہ اپنے ملائکہ کے ساتھ ٹھہراؤں گا، میں آپ کی حفاظت کروں گا، وہ تمہیں قتل کر نے کی قدرت نہیں رکھ سکتے“ یہ تاویل اچھی ہے“

معلوم ہوا کہ جس تاویل کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے اچھا کہا پسند کیا ہے وہ یہی ہے کہ ”میں تمھیں پوری عمر تک پہنچاؤ ں گا“ ان کا قتل کرنے کا دعوی باطل ہوگا، وہ کسی طرح بھی اس پر قادر نہیں ہوسکتے۔

یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا بھی ہے اور اسی سے مرزائیوں کا رد کامل طور پر ایک اردو دان بھی ترجمہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح مدارک میں علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی یوں تفسیر کی ﴿اِنِّی مُتَوَفِّیکَ﴾ ای **مستوفی اجلک**“ یعنی تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان)

یہی الفاظ خازن، روح البیان وغیرہ میں بھی ہیں۔

حضرت پیر **محمد کرم** شاہ رحمہ اللہ نے بھی وہی معنی بیان کیا ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔ اور آپ نے خوبصورت انداز پر تفسیر کی ہے، خیال تو تھا کہ لمبا اقتباس ذکر نہ کیا جائے تا کہ ضیاء القرآن کی ضیاء اسی سے قائم رہے، لیکن محبت وذوق کی وجہ سے اور خصوصا اپنی کم علمی کی وجہ سے بھی مناسب یہی سمجھا کہ ضیاء القرآن کے الفاظ کو ہی ذکر کیا جائے عین ممکن ہے کہ راقم کے الفاظ سے وہ مقصد ادا نہ ہو جو حضرت پیر صاحب نے بیان کیا، کیا خوب بیان کیا، آیئے دیکھیے، علم معانی کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی لفظ کا ایک حقیقی معنی ہو اور دوسرا مجازی تو حقیقی معنی کو مجازی پر ترجیح دی جائے گی، ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جس کے ہوتے ہوئے حقیقی معنی متعذر ہو تو اس وقت معنی حقیقی کو ترک کر کے معنی مجازی مراد لیا جائے، لیکن اگر ایسے قوی قرائن موجود ہوں جو حقیقی معنی مراد لینے کے ہی مؤید ہوں تو اس حالت میں حقیقی معنی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے پر اصرار کرنا تو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے اب آپ لفظ ”توفی“ کے معنی پر غور فرمائیں تاج العروس میں لفظ ”وفی“ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”**وتوفاہ ای لم یدع منہ شئیا**“ یعنی پورے کا پورا لے لیا اور اس سے کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی“ امام ابو عبداللہ رحمہ اللہ ”الاحکام“ میں لکھتے ہیں ”**توفیت مالی من فلان ای قبضتہ**“ یعنی میں نے اس سے سارا مال لے لیا۔ یہ تو ہے لفظ ”**توفی**“ کا حقیقی معنی، ہاں یہ لفظ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اس کا مجازی معنی

ہے، جیسے صاحب تاج العروس نے لکھا ہے:

"ومن المجاز ادرکته الوفاة ای الموت والمنیة وتوفی فلان اذمات وتوفاه الله عزوجل اذاقبض روحه"

اس کا مجازی معنی ہے کہ اسے موت نے پالیا جوکوئی شخص فوت ہو جائے تو "توفی فلان" کہا جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی کی روح کو قبض کرلیا جائے تو کہا جاتا ہے "توفاه الله عزوجل"

اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک لفظ کا حقیقی معنی ترک کر کے بغیر قرینہ کے اس سے مجازی معنی اخذ کرنے پر اصرار کرنا اس لفظ کے ساتھ بے جا زیادتی ہے اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں کہ مجازی معنی لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں بلکہ قوی قرائن موجود نہیں جو اس لفظ کے حقیقی معنی لئے جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کون سے ایسے قرائن ہیں تو اس کے متعلق عرض ہے کہ

(۱) ایک تو آیۃ کا سیاق وسباق اس امر کا قوی قرینہ ہے، یہاں گفتگو نجران کے عیسائیوں سے ہو رہی ہے جو حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل تھے، مقصد کلام ہے اثبات توحید باری تعالیٰ اور بطلان الوہیت مسیح، اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہوتے تو کتنی صاف بات تھی کہ نجران کے عیسائیوں سے کہہ دیا جاتا کہ جن کو تم خدا مانتے ہو وہ تو مر چکے ہیں اور جو مر جائے کیا وہ بھی کہیں خدا بن سکتا ہے؟ لیکن قرآن کا اس اسلوب کو اختیار نہ کرنا بلکہ اس انداز کو اپنانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کی اس آیۃ کا مدعیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کو بیان کرنا نہیں۔

(۲) دوسرا واضح قرینہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ "قال الحسن قال رسول الله ﷺ للیهود ان عیسی لم یمت وانه راجع الیکم قبل یوم القیامة" رسول اللہ ﷺ نے یہود کو فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور قیامت سے پہلے وہ تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد نہیں ہو سکتا، اسی لئے جمہور مفسرین اس حقیقی معنی کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں۔

"متوفیک" ای مستوفی اجلک معناه انی عاصمک من ان یقتلک الکفار" (کشاف)

اللہ تعالیٰ تمہیں پوری عمر تک پہنچائے گا یعنی تمہیں کفار کے قتل سے بچائے گا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ لکھتے ہیں "واولی الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنی ذلک انی قابضک من الارض ورافعک الی لتواتر الاخبار من رسول الله ﷺ یعنی میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھے زمین سے قبض کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں، کیونکہ حضور ﷺ کی احادیث

متواترہ سے یہی چیز ثابت ہے کہ آپ کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا۔ (ضیاء القرآن)

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿اِنِّی مُتَوَفِّیکَ﴾ اور اس کی مثل رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ﴾ (پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگاہ رکھتا تھا) میں تفسیر دو طرح کی جاسکتی ہے ایک یہ کہ آیہ کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے اور کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہ کی جائے اور دوسری میں تقدیم و تاخیر کا اعتبار کرنا فرض ہوگا۔

پہلی وجہ: ''انی متوفیک ای متمم عمرک فحینئذ اتوفاک فلااترکھم حتی یقتلوک بل انا رافع الی سمائی ومقربک بملائکتی واصونک عن ان یتمکنوا من ذلک وھذا تاویل حسن''

یعنی ''اِنِّی مُتَوَفِّیکَ'' کا معنی یہ ہے کہ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا، اب ''اتوفاک'' کا مطلب یہ ہوگا کہ میں یہود کو ایسے ہی نہیں چھوڑوں گا کہ وہ تمہیں قتل کر دیں بلکہ میں آسمانوں کی طرف تمہیں اٹھالوں گا اور فرشتوں کا مقرب بنادوں گا اور تمہیں اس سے محفوظ رکھوں گا کہ یہود تم پر قادر ہوسکیں، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس تاویل کو حسن کہا ہے کہ یہ تاویل اچھی ہے۔

دوسری وجہ: کہ ''متوفیک'' کا معنی ''ممیتک'' کا کیا جائے، یہی معنی ابن عباد اور محمد بن اسحاق سے مروی ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ یہود آپ کو قتل نہیں کرسکیں گے بلکہ آپ کو اپنے وقت پر طبعی طور پر وفات ہوگی، اگرچہ ابن وہب نے ایک قول یہ بھی کیا ہے کہ آپ کو تین ساعتیں وفات حاصل ہونے کے بعد آسمانوں پر اٹھائے جانے کا ذکر کیا ہے، اور محمد بن اسحاق نے سات ساعتیں وفات ہونے کے بعد اسمانوں پر اٹھائے جانے کا قول کیا ہے۔

لیکن ان دونوں کے اقوال سے مرزائی آپ کی وفات ثابت نہیں کر سکتے کہ ان کے مرزا صاحب کو مسیح موعود کہا جاسکے، کیونکہ انہوں نے تین یا سات ساعتوں کی وفات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بعد یوں ذکر کیا ''ثم احیاہ اللہ ورفعہ'' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا اور آسمانوں پر اٹھالیا، ان دونوں حضرات کے اقوال سے بھی آپ کا زندہ ہونا اور آپ کا ہی واپس آنا ثابت ہوگیا، مسیح ابن مریم ہی مسیح موعود ہیں، مرزا غلام احمد صاحب جب مسیح ابن مریم نہیں تو ان کے لوٹنے کا قول کیسے کیا جاسکتا ہے۔ راقم نے یہ بحث اپنی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں بھی ذکر کی لیکن اس میں چند سطور شامل نہ کرسکنے کی وجہ سے بحث کچھ کمزور رہ گئی اس کی اصل وجہ والدہ مکرمہ کی علالت اور وفات تھی، عجیب ذہنی دباؤ تھا، اللہ تعالیٰ والدہ مکرمہ کو جنت الفردوس عطاء فرمائے، مغفرت فرمائے، مدارج بلند کرے۔

تیسری وجہ: ربیع بن انس کا قول یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالی نے آسمانوں کی طرف اٹھانے میں وفات عطاء کی، لیکن یہ وفات کیسے تھی؟ یہ اسطرح تھی جس کا ذکر رب تعالی نے یوں فرمایا ﴿اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا﴾ (سورۃ الزمر، آیۃ نمبر۴۲)

''اللہ تعالی جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت، اور جو نہ مریں انہیں ان کے سوتے میں''، یعنی عیسی علیہ السلام کو اٹھاتے وقت نیند کا غلبہ عطاء کیا جسے بظاہر وفات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لئے کہ روح سیلانی کو قبض کر لیا جاتا ہے، انسان چلتا پھرتا نہیں، سنتا، سمجھتا نہیں، لیکن اس کی روح حیاتی باقی رہتی ہے، اسی لئے سانس چل رہا ہوتا ہے۔

چوتھی وجہ: اگر چہ واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی لیکن اگر ترتیب والا معنی اعتبار کر ہی لیا جائے تو پھر بھی اتنا مطلب نکل سکے گا، اللہ تعالی نے آپ کو فرمایا کہ میں تمہیں پہلے فوت کرنے والا ہوں اور پھر آسمانوں پر اٹھانے والا ہوں، لیکن یہ کیسے کرے گا، اور کب کرے گا، یہ ذکر نہیں یہ دلیل پر موقوف ہے کہ اس موت وحیات سے مراد کون سی موت وحیات ہے۔ دلیل سے تو یہ ثابت ہے کہ آپ زندہ ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عیسی علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے پھر فوت ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو آسمانوں پر زندہ اٹھالیا گیا، پھر آپ اتریں گے، اس کے بعد آپ پر وقت مقرر پر وفات آئے گی، اس وفات کے بعد آپ کو آسمانوں پر اٹھایا جائے گا جیسا کہ سب لوگوں کو موت عطاء کر کے پھر زندہ کر کے آسمانوں پر اٹھایا جائے گا۔ لھذا واؤ کو ترتیب کے معنی میں اگر لیا جائے تو اترنے کے بعد وفات اور اس کے اٹھایا جانا مراد ہے۔

پانچویں وجہ: ابو بکر واسطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ تمہاری خواہشات اور نفسانی منافع کے حصول کو مارنے والا ہوں، اور میں تمہیں آسمانوں پر اٹھانے والا ہوں۔ اسلئے کہ جو اللہ کے سواء سے اپنے آپ کو دور نہ کر لے وہ اللہ تعالی کی معرفت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا، عیسی علیہ السلام کو جب آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تو آپ کا حال فرشتوں والا ہو گیا، فرشتوں کو اللہ تعالی نے شہوت اور غیظ وغضب اور برے اخلاق سے دور رکھا ہوا ہے۔

چھٹی وجہ: بیشک ''التوفی'' کا معنی کسی چیز کو مکمل طور پر لینا'' اللہ تعالی ''علیم'' اور ''خبیر'' ہے جسے یہ معلوم تھا کہ کچھ لوگ کہیں گے کہ اللہ تعالی نے آپ کی روح کو آسمانوں پر اٹھایا ہے جسم کو نہیں، تو رب تعالی نے ''متوفیک'' ذکر فرما کر اس وہم کا ازالہ کر دیا کہ اللہ تعالی نے آپ کو مکمل طور پر روح اور جسم دونوں کو آسمانوں پر

اٹھایا ہے۔اس تاویل کے صحیح ہونے پر اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ﴿وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ﴾ (وہ آپ کا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے) دلالت کر رہا ہے۔

ساتویں وجہ: ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں فوت ہونے والے کی طرح کرنے والا ہوں، اس لئے کہ جب آپ کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تو دنیا والے آپ کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکے آپ کی خبر اور آپ کے اثرات زمین سے بظاہر منقطع ہو گئے تو آپ فوت ہونے والے کی طرح ہو گئے۔

"واطلاق اسم الشئی علی ما یشا بهه فی اکثر خواصه وصفاته جائز حسن"

ایک چیز پر اطلاق کرنا اس کے مشابہ کے اکثر خواص وصفات کو دیکھ کر جائز اور حسن ہے۔

آٹھویں وجہ: "التوفی" کا معنی "قبض کرنا" بھی آتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "وفاتنی فلان دراھمی" یعنی فلاں شخص نے میرے درھم میرے قبضہ میں دے دئے۔ اور کبھی کہا جاتا ہے "توفیتها منه" تو اس کا معنی ہوتا ہے "میں نے اس سے دراہم قبضہ میں لے لئے۔

اعتراض: اس صورت میں یہ دونوں لفظوں کا ایک معنی ہوگا کیونکہ "متوفیک" کا معنی ہوگا "قبض کرنا یعنی اٹھانا" اور "رافعک" کا معنی ہوگا "اٹھانا" یہ تکرار ہے اس کا کیا فائدہ؟

جواب: "متوفیک" ایک عمومی معنی پر دلالت کر رہا ہے یعنی یہ جنس ہے اس کے تحت مختلف نوعیں ہیں کیونکہ قبض کرنا کبھی موت کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی آسمانوں پر اٹھا کر ہوتا ہے، اب واضح ہوا کہ "متوفیک" سے پتہ چلا کہ آپ کو قبض کرنا ہے وہ کیسے؟ پھر "رافعک" سے یہ واضح ہو گیا کہ آسمانوں پر اٹھا کر۔

نویں وجہ: "متوفیک" کا معنی فوت کرنے والا نہیں، بلکہ مکمل کرنا مراد لیا گیا ہے اور مضاف یہاں محذوف ہے، اصل عبارت "متوفی عملک" ہے، یعنی میں تمہارے اعمال کو اپنے حضور مکمل طور پر قبول کرنے والا ہوں یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ﴾ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکمل طور پر تمہارے اعمال کو قبول کرنے والا ہے، یعنی اس طرح کلمات کے چڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جو اللہ کے دین کی راہ میں اور اس کے دشمنوں تک دین کے پھیلانے میں جو مشقت پہنچتی ہے وہ اس کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں کرتا، یہاں تک تو پہلی تاویل کے مطابق کلام ہے جو اپنے ظاہر پر ہے، کوئی تقدیم وتاخیر کا اعتبار نہیں۔

دوسری تاویل: یعنی جب واؤ کو اپنی اصلی حالت میں رکھا جائے کہ واؤ میں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا

تو اب معنی میں تقدیم وتاخیر ہوگی، اب آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا:

"ورافعک الی ومطھرک من الذین کفروا ومتوفیک بعدانزال ایاک فی الدنیا"

بیشک میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں اور پھر تمہیں دنیا میں جب اتاروں گا اس کے بعد فوت کرنے والا ہوں۔ (ماخوذ از کبیر)

تقدیم وتاخیر قرآن پاک میں کثیر جگہ واقع ہے، اتقان میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کی کئی مثالیں دیں ہیں، چند ملاحظہ ہوں ﴿وَاسۡجُدِیۡ وَارۡکَعِیۡ﴾ (اور سجدہ کرو اور رکوع کرو) حالانکہ اس وقت بھی نماز میں رکوع پہلے اور سجدہ بعد میں تھا، لیکن یہاں تقدیم وتاخیر کے طور پر ذکر ہوا۔

﴿خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ﴾ اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کو پیدا کیا، حالانکہ حیات موت سے پہلے ہے، لھذا یہاں بھی تقدیم وتاخیر ہے۔

﴿خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ﴾ (وہ ذات جس نے) تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، یہاں بھی مخاطبین کا ذکر پہلے ہوا اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا ذکر بعد میں کیا گیا، اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔

﴿وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ﴾ اور تحقیق آپ کی طرف اور آپ سے پہلے انبیاء کرام علیھم السلام کی طرف وحی کی گئی، یہاں بھی تقدیم وتاخیر پائی گئی کیونکہ پہلے انبیاء کرام کی طرف وحی پہلے کی گئی اور نبی کریم ﷺ پر بعد میں، لیکن ذکر آپ کا پہلے اور دوسرے انبیاء کرام کا بعد میں کیا گیا۔ (ماخوذ از نعیمی)

﴿وَرَافِعُکَ اِلَیَّ﴾ "اور اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف"

راقم نے یہ ترجمہ روح البیان سے لیا ہے (وَرَافِعُکَ) الآن (الی) اور ابھی اٹھا رہا ہوں تمہیں اپنی طرف۔ (روح البیان)

اپنی طرف اٹھانے کا کیا مطلب:

اس کی چند وجوہ ہیں، ظاہر معنی مراد لینا ممکن نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) کسی مکان میں ہے تو اس مکان کی طرف آپ کو بلانے کا تذکرہ ہے۔

(۱) "الاول ان المراد الی محل کرامتی وجعل ذلک رافعاالیہ للتفخیم والتعظیم"

پہلی وجہ ان میں سے یہ ہے کہ اپنی طرف اٹھانے کا یہ مطلب ہے کہ میں تمہیں اپنے مقام عزت

میں بلند کرنے والا ہوں، یعنی اس مقام کی طرف اٹھانے والا ہوں جہاں تمہیں عظمت وکرامت حاصل ہوگی۔اس لحاظ پر اپنی طرف اٹھانے کا مطلب مقام عزت وتکریم کی طرف بلند کرنا جو تقرب الٰہی کا ذریعہ ہوگا۔

یعنی مراد آسمانوں پر اٹھانا ہی ہے، لیکن آسمان اللہ تعالیٰ کا مکان نہیں وہ تو مکان سے پاک ہے، البتہ ''اپنی طرف اٹھانے'' کا مطلب اپنی طرف سے کرامت وتعظیم عطاء کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے شام تک ہجرت کرتے ہوئے کہا ﴿اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ بیشک میں جانے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ میں ہجرت کررہا ہوں رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے ،لھذا وہ مجھے اپنے قریب کرے گا اور مجھے معظم ومکرم بنائے گا۔اسی طرح بادشاہ کہتا ہے ''ارفعو ھذاالامر الی القاضی'' اس معاملہ کو قاضی کی طرف اٹھاؤ''یعنی یہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں لے جاؤ کہ وہ ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

اسی طرح حاجی لوگوں کو کہا جاتا ہے ''زوار اللہ'' (اللہ کی زیارت کرنے والے) یعنی مقامات مقدسہ کی زیارت سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے والے۔اور کعبہ شریف کے مجاوروں کو کہا جاتا ہے ''جیران اللہ'' اللہ کے مجاور (پڑوسی) اس سے مراد بھی یہی ہے کہ کعبہ کی مجاورت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے والے جن کو اللہ تعالیٰ عظمت وتکریم عطاء فرماتا ہے۔

(۲) ''الوجه الثانی فی التاویل ان یکون قوله''ورافعک الی''معناه انه یرفع الی مکان لا یملک الحکم علیه فی الحقیقةوفی الظاهر الا الله''

دوسری وجہ تاویل کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَرَافِعُکَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس مکان کی طرف اٹھا رہا ہوں جہاں حکم حقیقت میں اور ظاہر میں بھی صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے، زمین میں تو کئی حاکم اپنے اپنے حکم چلانے کے دعویدار ہوتے ہیں، لیکن آسمانوں میں ان کی حکومت نہیں چلتی ،لھذا تمہیں آسمانوں پر اٹھا رہا ہوں۔

(۳) ''الوجه الثالث لابد من حمل اللفظ علی ان المراد ورافعک الی محل ثوابک ومجازاتک''

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے ثواب اور جزاء کی طرف اٹھانے والا ہے، جب جزاء اور ثواب رب تعالیٰ نے عطاء کرنا ہے تو مطلب یہ ہوگیا کہ وہ تمہیں اس جزاء وثواب کی طرف اٹھانے والا ہے جو اسی کی طرف سے تمہیں حاصل ہونا ہے۔

﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

''اور پاک کرر ہاہوں (دور کرر ہاہوں) تمہیں ان سے جنہوں نے کفر کیا''

یعنی تمہیں کافروں سے نکال رہاہوں، اور تمہارے اوران کے درمیان جدائی پیدا کرر ہاہوں، ''تمہیں پاک کرر ہاہوں کافروں سے'' کہہ کر عیسی علیہ السلام کی عظمت شان کو ذکر کیا اور اللہ تعالی کے ہاں ان کے بلند منصب کا ذکر کیا، صرف یہ نہیں کہا کہ تمہیں کافروں سے دور کرر ہاہوں، بلکہ کہا کہ وہ تمہیں کافروں سے پاک کرر ہاہے کہ وہ نجس ہیں، اسلئے کافروں کے کفر یعنی نجاست سے تمہیں پاک کرر ہاہے۔

﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾

''اور کروں گا ان کو جنہوں نے تابعداری کی اوپر ان کے جنہوں نے کفر کیا قیامت تک۔''

رب تعالی نے عیسی علیہ السلام کو بتایا کہ میں تمہارے متبعین کو کافروں سے بلند مرتبہ عطاء کروں گا، مطلب یہ ہے کہ میں ان کو کافروں پر غلبہ عطاء کروں گا۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی بامحاورہ یہی ہے کہ، وہ ان کو کافروں پر غلبہ دے گا، بظاہر ایک مراد تو یہ ہے کہ عیساؤں کو یہودیوں پر قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا کہ یہودی عیساؤں کے زیر تسلط رہیں گے، اور ان کے محتاج رہیں گے، لیکن حقیقت میں مطلب یہ ہے کہ آپ کے متبعین اس وقت وہ لوگ تھے، ''**فهم الذين كانوا يؤمنون بانه عبدالله ورسوله**'' جنہوں نے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانا، جنہوں نے آپ کو خدا یا خدا کا شریک یا خدا کا بیٹا کہا وہ آپ کی تابعداری نہ کرنے والے تھے۔

''**واما بعد الاسلام فهم المسلمون**'' لیکن اسلام کے بعد آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول ماننے والے مسلمان ہی ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ عیسائی اگر چہ بظاہر اپنے آپ کو عیسی علیہ السلام کے متبعین کہلاتے ہیں لیکن وہ ایسے نظریات رکھتے ہیں، جو عیسی علیہ السلام کو ناپسند تھے، لیکن پھر بھی اللہ تعالی نے ان کو دولت دے رکھی ہے اور یہود پر ان کو قوت دے رکھی ہے۔

"**واما اليهود فلاترى فى طرف من اطراف الدنيا ملكا يهوديا ولا بلدة مملوأة من اليهود بل يكونون اين كانوا بالذلة والمسكنة واما النصارى فامرهم بخلاف ذلک**''

یہودیوں کی دنیا میں کہیں حکومت قائم نہیں، کوئی ایسا شہر نہیں جہاں صرف یہودی آباد ہوں، بلکہ یہودیوں کو ذلت اور مسکینی حاصل ہے بخلاف عیسائیوں کے کہ ان کی حکومتیں قائم ہیں اور وہ ذلت وخواری سے بچے ہوئے ہیں۔

فلسطین میں حقیقت میں یہودیوں کی حکومت قائم نہیں، کیونکہ وہ نصاری نے ہی حکومت بنا رکھی ہے یہود ان کے غلامی میں زندگی گذار رہے ہیں، ان کے نمک خوار ہیں۔

خیال رہے کہ فلسطین میں بنی اسرائیل کی حکومت اور قبضہ حرامی بچے کی طرح ہے جن مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی حکومت کو تسلیم کیا یا تسلیم کرنے کیلئے بے تاب ہیں وہ ملت اسلامیہ کے غدار ہیں، اور حرامی بچے کو حلالی بنانے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔

فوقیت کا ایک اور مطلب:

"ان المراد من هذه الفوقية الفوقية بالحجة والدليل" یعنی مراد اس فوقیت سے حجت اور دلیل میں فوقیت ہے جس طرح اس سے پہلے الفاظ گرامی "ورافعک" کا مطلب بھی درجہ اور منقبت کے لحاظ سے زندہ ہی اپنی طرف اٹھانا ہے اسی طرح یہاں بھی بلند درجات مراد ہیں۔

﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ فِيۡمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ﴾

"پھر میری طرف لوٹنا ہے تم نے، تو میں فیصلہ کروں گا درمیان تمہارے جس میں کرتے تھے تم اختلاف۔"

عیسی علیہ السلام کو جب اللہ تعالی نے بشارت دی کہ ان کو دنیا میں خواص شریفہ اور درجات رفیعہ عالیہ (خاص قسم کے فضائل اور بلند درجات) عطاء کئے جارہے ہیں، البتہ قیامت کے دن آپ پر ایمان لانے والوں اور آپ کی رسالت کا انکار کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کردیا جائے گا۔ اس فیصلہ کے متعلق آنے والی آیۃ کریمہ میں تفصیل آرہی ہے۔

اعتراض: جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ عیسی علیہ السلام کی شبیہ ایک اور شخص ططیانوس کو دے دی گئی تو اسے قتل کردیا گیا، اس طرح تو محسوسات پر اعتبار ہی اٹھ جائے گا، ایک شخص کہتا ہے میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا، پھر میں نے اسے دوبارہ دیکھا لیکن میں نے یہ سمجھا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہ ہو بلکہ کوئی اور شخص ہو، اس پر میرے بیٹے کی شبیہ ڈال دی گئی ہو، "وحينئذ يرتفع الامان عن المحسوسات" اس وقت محسوسات سے امان اٹھ جائے گا۔

"وایضا فالصحابة الذین رأوا محمدا ﷺ یأمرهم وینها هم وجب ان لایعرفوا انه محمدلاحتمال انه القی شبهه علی غیره وذلک یقتضی الی سقوط الشرائع"

اسی طرح اس میں اور خرابی یہ لازم آئے گی کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ انہیں اوامر ونواہی بیان فرمارہے ہیں (یعنی بعض کاموں کا حکم دے رہے ہیں اور بعض سے منع فرمارہے ہیں) لیکن اس میں احتمال یہ پایا جائے گا کہ ہوسکتا ہے یہ کوئی اور شخص ہو اس پر نبی پاک ﷺ کی شبیہ ڈال دی گئی ہو۔اس طرح تو کسی شریعت، کسی نبی پر اعتبار نہیں رہے،اور نہ ہی مبصرات (دیکھی جانے والی چیزوں) پر اعتبار رہے گا،تو پتہ چلا کہ شبیہ ڈالنے والا قول درست نہیں۔

جواب: "والجواب ان کل من اثبت القادر المختار یسلم انه تعالٰی قادر علی ان یخلق انسانا آخر علی صورة زید"

شبیہ ڈالنے کا یہ مقصد نہیں کہ ہر جگہ شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے بلکہ دلائل وروایات سے ثابت ہو تو پھر شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے گا،صرف اتنا تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالٰی قادر ومختار ہے جب چاہے کسی پر دوسرے کی شبیہ ڈال دے،لیکن اس کا ثبوت یقینی ہو تو شبیہ ڈالنے کا قول کیا جائے گا صرف عقلی احتمالات کی وجہ سے محسوسات اور شرعی احکام کے اٹھنے کا قول نہیں کیا جائے گا۔عیسٰی علیہ السلام کی شبیہ طِطیانوس پر ڈال دی گئی روایات سے ثابت ہے،جس کا مزید تذکرہ ان شاء اللہ ﴿وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کی وضاحت میں آئے گا۔

لیکن کسی اور شخص کی شبیہ کسی اور پر ڈالنے کا کوئی ثبوت نہیں،اسلئے صرف عقلی ڈھکوسلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔
(تمام بحث ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مقام پر مختلف انداز پر کئی اشکال پیش کئے ہیں لیکن تمام ہی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں،تمام کے ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

پہلے جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں کہ بعض اقوال میں آپ کو چند گھڑیاں وفات عطاء کر کے پھر زندہ کر کے اٹھایا گیا ہے وہ اقوال صحیح نہیں۔

"والصحیح کما قاله القرطبی ان الله تعالی رفعه من غیر وفاة ولانوم وهو اختیار الطبری"

صحیح قول وہی ہے جو قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بیشک اللہ تعالٰی نے آپ کو بغیر وفات اور بغیر نیند کے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا" یہی طبری کا بھی مختار قول ہے۔ (روح المعانی)

سب سے زیادہ قوی دلیل تو ارشاد مصطفوی ہے "قال ﷺ ان عیسی لم یمت وانه راجع الیکم قبل یوم القیامة" نبی کریم ﷺ نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں بیشک وہ قیامت سے پہلے تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

حیات عیسیٰ علیہ السلام پر مزید بحث ان شاء اللہ چھٹے پارہ میں آئے گی۔

تنبیہ: علامہ محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق کے قول کو یوں نقل فرمایا:

"وقال محمد بن اسحاق ان النصاری یزعمون ان الله تعالی توفاه سبع ساعات من النهار ثم احیاه ورفعه"

محمد بن اسحاق کا قول یہ ہے کہ نصرانی گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دن کی سات گھڑیاں موت عطاء کی پھر ان کو زندہ کر کے اٹھالیا گیا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

یعنی محمد بن اسحاق کا یہ اپنا قول نہیں بلکہ یہ قول نصرانیوں کا ہے جسے محمد بن اسحاق نے نقل کیا ہے، راقم کو علامہ بغوی کی عبارت دوسرے مفسرین کی عبارات سے عظیم نظر آئی۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دین میں تحریف:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر اٹھالیا تو آپ کی امت کے لوگ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ بعض وہ تھے جو ایمان پر قائم رہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اور اللہ کی عبادت گذار عورت مریم کے بیٹے تھے۔

اور بعض نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق غلو (حد سے تجاوز) کیا اور آپ کو اللہ کا بیٹا کہا۔

اور ایک فرقہ نے آپ کے متعلق کہا "هو الله" عیسیٰ ہی خدا ہیں۔

اور ایک فرقہ نے یوں کہا "هو ثالث ثلاثة" وہ تین خداؤں میں سے ایک خدا ہیں۔

(ان تینوں فرقوں کی تفصیل اور ان کا رد ان شاء اللہ چھٹے پارہ میں آئے گا)

پھر یونان کے بادشاہوں میں سے ایک ان کا بادشاہ بنا جسے قسطنطین کہا جاتا تھا، یہ نصرانیت میں داخل ہوا لیکن مکاری کی وجہ سے تاکہ ان لوگوں کے دین کو فاسد کر دے، یہ اگرچہ دین عیسوی سے جاہل تھا لیکن فلسفی تھا، بے دین، مکار، حیلہ ساز، روشن خیال تھا، (بے حیائی اور بے دینی کا نام روشن خیالی رکھ لیا گیا ہے) اس نے دین

عیسوی کو تبدیل کر دیا، اس میں کچھ زیادتیاں کر دیں اور میں کچھ کمی کر دی، اپنی طرف سے قوانین بنادئے، عظیم امانت یعنی دین عیسوی میں گھٹیا قسم کی خیانت کر دی۔

"واحل فی زمانه لحم الخنزیر" اسی کے زمانہ میں خنزیر کا گوشت حلال کیا گیا۔

"وصلوا اله الی المشرق" اسی کے کہنے پر مشرق کی طرف منہ کر کے وہ لوگ نماز پڑھنے لگے۔

"وصوروا له الکنائیس والمعابد والصوامع" گرجا، کلیا اور عبادت خانوں میں اس کی تصویریں لگائی گئیں۔

"وزادفی صیامهم عشرة ایام من اجل ذنب ارتکبه فیما یزعمون" نصرانیوں نے اس کے بعض افعال کو گناہ سمجھا تو اس نے ان کو مطمئن کرنے کیلئے دس روزوں کا اضافہ کر دیا۔ یعنی چالیس روزے کر دئے، (دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ان لوگوں نے رمضان کے روزوں کو موسم بہار میں رکھنے کا فیصلہ کیا اور دس روزے بڑھادئے)"وصار دین المسیح دین قسطنطین" دین عیسوی دین قسطنطین بن گیا۔

اس کی مکاری کا یہ عالم تھا کہ بظاہر دین دار بننے کیلئے اس نے بارہ ہزار سے زائد عبادت خانے بنائے اور اس نے ایک شہر بنایا جس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر کے اس کا نام "قسطنطنیہ" رکھا، شاہی چمچے اور درباری کڑ چھے (جو ہر حاکم کی تعریف کر کے اپنے ذہن وضمیر کا سودا کر کے، بے حیاء بن کر مفاد حاصل کرتے ہیں) مفاد پرست ٹولہ (گروہ) اس کا متبع ہو گیا۔

ان لوگوں نے یہود پر قہر و جبر کیا "ایده الله علیهم لانه اقرب الی الحق منهم وان کان الجمیع کفار العن الله علیهم" اللہ تعالی نے اس گروہ کو یہود پر فتح عطاء فرمائی، اگر چہ دونوں فرقے کافر تھے، اللہ کی لعنت کے مستحق تھے تاہم یہ لوگ بنسبت یہودیوں کے کچھ حق کے قریب تھے۔

جب نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالی نے مبعوث فرمایا تو وہی لوگ آپ پر ایمان لائے یعنی اللہ تعالی اور فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر حق کے ساتھ ایمان لائے، "فکانوا هم اتباع کل نبی علی وجه الارض" جو نسل بنسل اس روئے زمین پر ہر نبی پر ایمان لاتے رہے جن ان لوگوں نے مطلقا عربی امی نبی کی تصدیق کی۔ خاتم الرسل تسلیم کیا اور تمام انسانوں بلکہ تمام مخلوق کا سردار تسلیم کیا تو وہ تمام لوگوں سے افضل ہو گئے، کیونکہ باقی لوگ اگر چہ بظاہر یہ دعوی کرتے تھے کہ ہم اپنے نبی پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے نبی کے دین پر قائم ہیں لیکن ان کا یہ دعوی جھوٹا تھا کیونکہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا گیا، جن تمام دین منسوخ ہو چکے

تھےتو ان کا یہ کہنا کہ ہم اپنے نبی کے دین پر قائم ہیں خود بخود باطل ہو گیا، ان کا جھوٹ واضح ہو گیا۔

نبی کریم ﷺ کا دین وہ دین ہے جو قیامت تک قائم رہنے والا ہے، اور تمام دینوں پر اسے فوقیت حاصل ہوئی کیونکہ اللہ تعالی نے اس کی حفاظت، تائید اور نصرت کو اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے۔

"فلهذافتح الله لاصحابه مشارق الارض مغاربها واحتازوا جميع الممالک ودانت لهم جميع الدول وكسروا كسرى وقصروا قيصر وسلبوهما كنوزهما وانفقت في سبيل الله"

اسی وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے آپ پر ایمان لایا تو اللہ تعالی نے ان کو زمین کے مشارق و مغارب پر فتح عطاء فرمائی، قیصر و کسری کی بادشاہیاں ان کو حاصل ہوئیں، اور ان کے خزانے ان کو حاصل ہوئے جو انہوں نے اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کئے۔ اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کے ذریعے ان لوگوں کو یہ خبر دے دی:

"وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُو الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ" (سورۃ النور آیۃ نمبر ۵۵)

اللہ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ضرور انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسی ان سے پہلوں کو دی اور ضرور ان کیلئے جما دے گا (قائم رکھے گا) ان کا وہ دین جو ان کیلئے پسند فرمایا ہے اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا، میری عبادت کریں، میرا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد ناشکری کریں تو وہی لوگ بے حکم (فاسق) ہیں۔

جب عیسی علیہ السلام پر حقیقی اور سچا ایمان رکھنے والے نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالی نے مؤمنین کو اپنی تائید ونصرت سے نوازا تو" سلبوا النصارى بلاالشام والجؤهم الى الروم فلجا والى مدينتم القسطنطنية ولايزال الاسلام واهله فوقهم الى يوم القيامة" مؤمنوں نے نصرانیوں سے شام کے علاقہ جات چھین لئے اور ان کو روم کی طرف دھکیل دیا تو وہ اپنے شہر قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اسلام کو اور مسلمانوں کو قیامت تک غلبہ حاصل رہے گا، یہ اللہ تعالی کا وعدہ ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ "ان الاسلام يعلو ولايعلى" اسلام یقیناً غالب رہے مغلوب نہیں ہو گا، یہود و نصاری یا ان کے حواری کوشش کرتے رہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔

"وقد اخبر الصادق والمصدوق ﷺ امته بان آخرهم سيفتحون القسطنطيهة

ویستفبنون ما فیها من الاموال ویقتلون الروم مقتلة عظیمة جدالم یر الناس مثلها ولا یرونّ بعدها نظیرها"

سچے نبی کریم ﷺ نے خبر دی، جو سچ ہو کر رہی کہ میری امت کے لوگ آخر میں (یعنی صحابہ اپنے آخری دور میں) قسطنطنیہ کو فتح کرلیں گے، اس کا مال ان کے ہاتھ آئے گا، اور رومیوں سے یہ بہت عظیم جنگ کریں گے جس کی نظیر نہ کسی نے اس سے پہلے دیکھی ہوگی اور نہ ہی کوئی بعد میں دیکھے گا اور آخر کار روم کو بھی فتح کرلیں گے۔

آپ کی یہ دونوں خبریں سچی ہو کر رہیں، کافروں کے منہ بند ہو گئے جو کہتے کہاں قیصر و کسری اور قسطنطنیہ کی مضبوط بادشاہیاں اور مضبوط قلعے اور کہاں مسلمانوں کے نبی کی فتح کی خبریں، رب تعالی کا یہ وعدہ بھی سچا ہو کر رہا ﴿وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (اور کروں گا ان کو جنہوں نے تمہاری تابعداری کے اوپر ان لوگوں کے جنہوں نے کفر کیا) کہ عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور آپ کے متبعین نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے وہی حضرت عیسی علیہ السلام کے سچے متبعین ہیں، ان کو کافروں پر فوقیت حاصل رہی اور اللہ تعالی کے وعدہ کے مطابق تا قیامت ان کو فوقیت حاصل رہے گی۔ (ماخوذ از ابن کثیر و صابونی)

❁ واخرج ابن عساكر عن معاوية بن ابی سفيان قال سمعت رسول الله ﷺ يقول انها لن تبرح عصابة من امتی يقاتلون على الحق ظاهرين على الناس حتى يأتی امر الله وهم على ذلک ثم قرابهذه الآية يا عيسى انی متوفيک "الآية"

ابن عساکر نے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان سے روایت ذکر کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت میں سے حق پر جہاد کرنے والی ہمیشہ قائم رہے گی قیامت تک، ان کو دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل رہے گا، پھر آپ نے یہی آیۂ کریمہ "یاعیسی انی متوفیک" (مکمل آیۂ کریمہ) تلاوت کی۔ (درمنثور)

❁ واخرج ابن المنذرعن الحسن فی الآية قال عيسى مرفوع عندالله لم ينزل قبل يوم القيامة فمن صدق عيسى و محمد ﷺ و كان على دينهما لم يزالواظاهرين على من فارقهم الى يوم القيامة"

ابن منذر نے حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک روایت ذکر کی کہ عیسی علیہ السلام کو اللہ تعالی کے ہاں اٹھالیا گیا پھر وہ قیامت سے پہلے اتریں گے، جس شخص نے عیسی علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی تصدیق کی وہ ان کے دینوں پر قائم ہو گئے، وہ قیامت تک ان لوگوں پر غالب رہیں گے جو ان کے دینوں سے جدا رہے یعنی ان پر ایمان نہ لائے۔ (درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۶)

(1) تو وہ کافر ہوئے میں انہیں دنیا وآخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

(2) تو وہ جنہوں نے کفر کیا تو میں عذاب دوں گا ان کو سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں، اور نہ ہی ہوگا ان کا کوئی مدد کرنے والا۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے ذکر فرمایا ﴿اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (میری طرف ہی تم نے لوٹنا ہے تو میں فیصلہ کردوں گا تمہارے درمیان جس میں تم اختلاف کرتے تھے) اب اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ تمہارا اختلاف یہ تھا کہ ایک قوم نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور دوسری نے کفر کیا، اور ان کے درمیان فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ رب تعالی نے کافروں کے متعلق بیان فرمادیا۔ ﴿فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ تو میں ان کو عذاب دوں گا سخت دنیا اور اخرت میں، ایمان والوں کے متعلق جو فیصلہ کیا جاتا ہے اسے بھی ذکر فرمادیا جو ساتھ ہی آنے والی آیۃ کریمہ میں آرہا ہے ﴿فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ پورا پورا دے گا ان کو ان کا اجر وثواب۔

کافر کا عذاب دنیا میں دو طریقے سے ہوگا:

(۱) ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کو وہ جہاد میں قتل کردیں یا قید کرلیں، یہ ان کیلئے دنیا میں عذاب ہے، اگر کفار ایمان لے آئیں تو اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرلیں، اسلئے کافر جب ایمان لے آئے تو اس کی جان اور مال محفوظ ہوجاتے ہیں۔

(۲) "والثانی مایلحق الکافر من الامراض والمصائب" ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ کافر کو دنیا میں عذاب یہ حاصل ہوگا کہ اسے امراض اور مصائب حاصل ہوں گی۔

لیکن اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا امراض ومصائب کو عذاب کہا جائے یا نہ کہا جائے؟ بعض حضرات نے یہ کہا "انہ عقاب فی حق الکافر واذاوقع مثلہ لمؤمن فانہ لا یکون عقابا" کہ کافر کے حق

میں یہ عذاب ہیں، لیکن مؤمن کے حق میں امراض و مصائب کا واقع ہونا عذاب نہیں، بلکہ امتحان و ابتلاء ہے کہ یہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔ (از کبیر)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کافر کے حق میں بھی امتحان ابتلاء کا قول کرتے ہیں، وہ عذاب نہیں کہتے۔

اعتراض: کافروں کو دنیا میں عذاب دیا جانا دوسری آیات کے مخالف ہے۔ رب تعالی کا ارشاد ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (اگر پکڑتا اللہ تعالی لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے تو نہ چھوڑتا روئے زمین پر کوئی چلنے والی چیز) ''لفظ "لو" ایک چیز کے امتناع سے دوسری چیز کا امتناع ثابت کرتا ہے، جب روئے زمین پر تمام چیزوں کو فناہ نہیں کیا گیا تو کافروں اور مشرکوں پر عذاب کا دنیا میں نہ آنا بھی ثابت ہو گیا اور رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ آج (قیامت کے دن) ہر نفس کو اس کے کسب کی جزاء دی جائے گی۔

جواب: یہ آیۃ کریمہ جو زیر بحث ہے اس میں خصوصی طور پر اللہ تعالی نے دین اور دنیا میں عذاب دینے کا ذکر کیا اور دوسری آیات میں حکم عمومی ہے، پہلی آیۃ میں ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ پر اس طرح کا عذاب نہیں آئے گا کہ تمام امت کو اور روئے زمین پر تمام چلنے والے ذی روح حیوانات کو تباہ و برباد کر دیا جائے، جیسا کہ پہلی امتوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا، اور دوسری آیۃ کریمہ میں عمومی طور پر آخرت میں جزاء دینے کا ذکر ہے جس میں دنیا میں عذاب دینے کی ممانعت نہیں۔

قانون یہی ہے کہ خصوص مقدم ہوتا ہے عموم پر، لھذا اس آیۃ کریمہ میں خصوصی طور پر جب دنیا میں عذاب دینے کا ذکر ہے تو آیات میں کوئی تعارض نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: پہلی آیۃ کریمہ میں جب ﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ ذکر فرمایا کہ تم میری طرف لوٹنا ہے (تو میں تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں گا) لوٹنا تو قیامت کو ہی ہے وہ تو اخروی عذاب کا ہی تقاضا کرتا ہے جب اس کی تفصیل اس آیۃ اور آنے والی آیۃ میں ہے تو دنیا کے عذاب کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

جواب اول: مقصد یہ ہے کہ کافروں کو عذاب دائمی ہوگا، اس کا انقطاع نہیں ہوگا دنیا اور آخرت میں عذاب کا یہی مقصد ہے۔

جواب دوم: دنیا اور آخرت سے مراد ہو سکتا ہے اول و آخر ہو، یعنی ان کو عذاب اول بھی ہوگا اور آخر

بھی مراد اس سے بھی دوام ہے۔

جواب سوم: رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ کروں گا آپ کی تابعداری کرنے والوں کو کافروں کے اوپر قیامت تک۔ "الی یوم القیامة" غایت ہے "فوق" کی، نہ کہ "جاعل" کی، یعنی ان کو فوقیت قیامت تک حاصل رہے گی، اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ﴾ پھر میری طرف تم نے لوٹنا ہے، اس لوٹنے سے مراد بھی فوقیت اور قرب ہے، کہ ایمان والوں کو کافروں پر فوقیت حاصل رہے گی اور رب تعالیٰ کا قرب حاصل رہے گا، یہ دنیا میں بھی حاصل رہے گا، اور آخرت میں بھی، بخلاف کفار کے کہ وہ پستی میں ہوں گے اور قرب الٰہی سے محروم ہوں گے، یہ محرومیت ہی درحقیقت ان کیلئے دنیا اور آخرت میں شدید عذاب ہوگا، اس سے بڑھ کر اور عذاب کیا ہوگا کہ رب تعالیٰ سے دور ہو جائیں گے۔

طلباء کرام خیال رکھیں کہ "ثم" "تراخیٔ رتبی" کیلئے استعمال ہے، ایک کلام سے دوسری کلام کی طرف ترقی کیلئے استعمال ہے "تراخیٔ زمانی" کیلئے استعمال نہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اعتراض: آیۃ کریمہ سے تو یہ سمجھ آ رہا ہے کہ دنیا میں کافروں کو سخت عذاب دیا جائے گا، حالانکہ دنیا میں کبھی کافروں کی سخت گرفت ہوتی ہے، کبھی مومنوں کی تو فرق کیسے ثابت ہوگا؟

جواب: آیۃ کریمہ میں اگر یہود مراد ہوں تو فرق واضح ہے کہ ان کو ذلت اور مسکینی لازم ہے، اگر عام کفار مراد ہوں تو پھر بھی فرق واضح ہے کہ وہ فوقیت و قرب سے محروم ہوں گے، اور مومنوں کو حاصل ہوں گی۔ (از بیضاوی بتصرف)

﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِيْنَ﴾ اور نہیں ہوگا کوئی ان کا مدد کرنے والا۔

بظاہر اس پر وہم یہ ہوتا ہے کہ کبھی مومنوں کو یا ان کے حکام کو وعدہ کی وجہ سے ان کو قتل کرنے سے منع کیا جاتا ہے، یہ ان کی امداد ہی ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو قتل کرنے سے مانع وعدہ ہے نہ کہ ان کی امداد مقصود ہے۔ (از بیضاوی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظَّالِمِیْنَ۝﴾ (آیة نمبر ۵۷)

(1) اور وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اللہ ان کا نیک انہیں بھرپور دے گا اور ظالم اللہ کو نہیں بھاتے۔

(2) اور وہ جو ایمان لائے اور عمل کئے اچھے، تو پورا پورا دے گا ان کو اجر ان کا، اور اللہ نہیں پسند کرتا ظالموں کو۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے کفار کا ذکر فرمایا، اب ایمان والوں کا اور ان کے متعلق فیصلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، کافروں کا ذکر پہلے کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کی تہدید یعنی عذاب کا ذکر کیا گیا، تو عقل کا تقاضا بھی یہی تھا کہ تہدید کا ذکر پہلے ہو اور ایمان والوں کے اجر کا ذکر بعد میں ہو، اور وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے ذکر ﴿فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ قریب ہی تھا تو اس کی مناسبت کی وجہ سے پہلے ذکر کفار کا کر دیا۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت اور علامہ آلوسی رحمہما اللہ:

"فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ" ای فیوفر علیهم ویتمم جزاء اعمالهم القلبیة والقالبیة ویعطیهم ثواب ذلک وافیا من غیر نقص"

"فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ" کا ترجمہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "فیوفر علیهم" کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزاء وافر مقدار میں دے گا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے "اللہ ان کا نیک انہیں بھرپور دے گا" راقم کا ترجمہ بھی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے آنے والے الفاظ کے مطابق ہے، یعنی راقم کا ترجمہ ان الفاظ سے لیا گیا ہے۔

"ویتمم جزاء اعمالهم القلبیهة والقالبیة ویعطیهم ثواب ذلک وافیا من غیر نقص"

اور ان کو پورا پورا بدلہ دے گا ان کے اعمال کا خواہ وہ اعمال باطنی ہوں یا ظاہری ہوں، اور دے گا ان کو اس کا ثواب پورا پورا اس میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔

"وزعم بعضهم ان توفیة الاجور هی قسم المنازل فی الجنة والظاهر انها اعم من ذلک"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "توفية الاجور" جنت میں خصوصی منازل کا نام ہے کہ "ایمان والوں کو اللہ تعالی جنت میں منازل رفیعہ عطاء فرمائے گا، لیکن صحیح یہ ہے کہ مراد اس سے عام ہے، مطلقا "پورا پورا اجر دینا" مقصود ہے، جو ہر قسم کی مہربانیوں کو شامل ہے۔ (از روح المعانی)

ایمان کا ذکر پہلے کیا، پھر اچھے اعمال کا ذکر کیا، اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اعمال نفس ایمان سے خارج ہیں، یعنی ایمان تصدیق قلبی سے حاصل ہو گیا، اچھے اعمال اس کے اوپر مرتب ہیں۔ (از کبیر)

ایمان والوں کی شان اس سے بھی واضح طور پر سمجھ آ رہی ہے کہ نفس ایمان پر ہی اجر و ثواب مرتب ہے البتہ اچھے اعمال پائے جائیں گے تو اور ہی زیادہ ثواب حاصل ہو گا، لیکن کفر کے بعد برے اعمال کا تذکرہ نہیں تو اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ پایا گیا کہ کفر خود ہی دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کا سبب ہے، اس پر برے اعمال پائے جائیں یا نہ پائے جائیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ "اور نہیں پسند کرتا ظالموں کو"

ظالم سے مراد کون؟ لا يحب من ظلم غيره حقاله" ظالم سے مراد ایک تو یہ ہے کہ غیر پر ظلم کرے اور اس کی حق تلفی کرے۔ "اووضع شيا في غير موضعه" یا ظالم سے مراد عام ہے کہ وہ ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دے، یعنی ہر قسم کے گناہ اور بے راہ روی کو شامل ہے۔

"والمعنى انه تعالى لا يرحمهم ولا يثنى عليهم بجميل" مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی ظالموں اور گناہگاروں پر رحم نہیں فرماتا تاکہ ان کے بندوں پر کئے گئے مظالم کو معاف کر دے اور نہ ہی ان کی اچھی تعریف کرتا ہے۔ (خازن)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ نے ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ انه تعالى لا يدالكفر والمعاصى" اللہ تعالی کفر اور معاصی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کسی چیز کا ارادہ اسی وقت پایا جاتا ہے جن اس سے محبت بھی ہو، البتہ یہ اس وقت ہے جب وہ چیز افعال سے ہو، اگر اشخاص سے ہو تو پھر قانون نہیں، جیسا کہ کہا جائے "احب زيدا" میں زید کو پسند کرتا ہوں" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ "اريده" میں اس کا ارادہ کرتا ہوں۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

ارادہ اور محبت ایک چیز نہیں، بلکہ علیحدہ علیحدہ مراد ہیں مومنوں سے محبت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو خیر (بھلائی) پہنچانے کا ارادہ کرنا، اور کافروں کے کفر کا ارادہ پایا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت بھی کرتا ہے۔

فائدہ جلیلہ: ﴿واللّٰہ لا یحب الظّٰلمین﴾ ای الذین یظلمون علی انفسھم با نقضاء العمر فی طلب غیر اللہ "اللہ نہیں پسند کرتا ظالموں کو" یعنی ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا جو عمر بھر اللہ کے غیروں کے طلب میں ہوتے ہیں۔

خلافت طریقت بود کا ولیاء　　تمنا کنند از خدا جزء خدا

اہل طریقت کے نزدیک وہ اولیاء طریقت کے مخالف ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو اس کے غیروں کے ذریعے تلاش کرتے ہیں۔

اہل طریقت اپنے دل کے صفحات سے غیر کے نقش مٹا دیتے ہیں، اور اپنے نفوس کو برے اوصاف سے پاک رکھتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں انسان کو وصال کی بلندیوں اور معرفت کے آسمانوں تک عروج سے مانع ہیں، حضرت مولنا جلال الدین رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آں یکے نحوی بکشتی درنشست　　روبکشتیبان نہاد آں خود پرست

ایک نحوی کشتی میں بیٹھ گیا، منہ کشتی چلانے والے کی طرف رکھا اس خود پرست نے، (کشتیبان سے مخاطب ہوا)

گفت ہیچ از نحو خواندی؟ گفت لا　　گفت نیم عمر تو شد درفنا

اس نے کہا کیا تو نے نحو بھی پڑھی، کشتیبان نے کہا نہیں، نحوی نے کہا تو نے آدھی عمر ضائع کر دی،

دل شکستہ گشت کشتیبان زتاب　　یک آن دم گشت خاموش از جواب

دل شکستہ ہو گیا کشتیبان کا اس کی سرزنش سے، لیکن وہ اس کا جواب دینے سے خاموش ہو گیا،

باد کشتی را بگردابی فگند　　گفت کشتیبان بداں نحوی بلند

ہوا نے کشتی کو بھنور میں ڈال دیا، کشتیبان نے اس نحوی کو بلند آواز سے کہا،

ہیچ دانی آشنا کرگو　　گفت نے ای خوش جواب خوب رو

﴿ذٰلِکَ نَتْلُوْهُ عَلَیْکَ مِنَ الْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ۝﴾ (آیۃ نمبر ۵۸)

(1) یہ ہم تم پر پڑھتے ہیں کچھ آیتیں اور حکمت والی نصیحت

(2) یہ کہ بیان کرتے ہیں ہم تم پر آیات اور قرآن محکم۔

"ذٰلِکَ" کا اشارہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کے عجائب کی طرف جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے البتہ عجائب کئی مذکور ہیں اور اشارہ واحد کا ہے (بظاہر اگرچہ درست نظر نہیں آتا لیکن) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذکور کی تاویل میں ہے اسی وجہ سے جلالین میں یوں تفسیر کی گئی "ذلک" "المذکور من امر عیسی" یہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ (عجائب وغرائب) جو مذکور ہو چکا ہے۔ (جلالین ص ۵۰)

﴿نَتْلُوْهُ عَلَیْکَ﴾ "ہم بیان کرتے ہیں آپ پر۔"

"نَتْلُوْهُ" تلاوت سے لیا گیا ہے، لغوی معنی اس کا یہی ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں ذکر کیا ہے، تاہم علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "نَتْلُوْهُ" کی تفسیر "نسرده ونذکره شئیا بعد شئ" سے کی ہے ہم وہ بیان کرتے ہیں آپ پر، ہم وہ ذکر کرتے ہیں آپ پر آہستہ آہستہ،

اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ ماضی کا صیغہ "تلونا" ہونا چاہئے تھا کہ ہم آپ پر بیان کر چکے ہیں ہاں بتہ "عبر بالمضارع استحضار للصورة الحاصلة اعتناء بها" ماضی کو مضارع سے تعبیر کر دیا گیا کہ جو چیز بیان ہو چکی ہے اس کے اہتمام شان کیلئے اس کی صورت کو بیان حال سے سامعین کے ذہن میں حاضر کر دیا جائے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "نتلوه" اپنی اصلی حالت پر ہو، ذکر بھی مضارع اور مراد بھی مضارع ہو کہ ابھی حضور ﷺ پر مکمل واقعات نہ ذکر کئے گئے ہوں تو پہلے ہی اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا، یعنی ہم تم پر پڑھتے ہیں، بیان کر رہے ہیں، ذکر کر رہے ہیں، وغیرہ معانی ہوں۔

﴿مِنَ الْاٰیَاتِ﴾ "آیات (نشانیاں)"

"من الآیات" ای الحجج الدالة علی صدق نبوتک اذا علمتهم بما لا یعلمه الاقاری کتاب او معلم"

آیات سے مراد حجتیں، دلائل ہیں جو آپ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کر رہی ہیں، یعنی میں نے تمہیں وہ دلائل بتا دیئے ہیں جو آپ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کر رہے ہیں وہ ایسے ہی بیان کئے گئے جیسے کتاب کو صرف قاری

کتاب یا معلم ہی بیان کرسکتا ہے، اسی طرح مکمل طور پر آپ کو بذریعہ وحی وہ تمام بیان کردیئے گئے ہیں۔

﴿وَ الذِّکۡرِ الۡحَکِیۡمِ۝﴾ ''اور قرآن محکم''

اعلیٰ حضرت اور علامہ بغوی رحمہما اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ معالم التنزیل کے ان الفاظ میں دیکھئے:

(ذلک)ای ھذا الذی ذکرتہ لک من الخبر عن عیسی ومریم والحواریین(نتلوہ علیک)یعنی نخبرک بہ بتلاوۃ جبریل علیک(من الآیات والذکر الحکیم)یعنی القرآن والذکر ذی الحکمۃ''

یہ جو ہم نے آپ پر ذکر کردیا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم اور حواریین کے واقعات وہ ہم آپ پر پڑھتے ہیں، یعنی جبریل آپ پر ہمارے حکم سے پڑھتے ہیں اور اس پڑھنے سے ہم آپ کو قرآن پاک کی بعض آیات سے خبر دیتے ہیں، اور یہ نصیحت والا ذکر ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

خیال رہے کہ ''ذکر'' کا معنی قرآن پاک بھی ہے اور لوح محفوظ بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔ اور یہ خیال کیا جائے کہ جب "نتلوہ" کا معنی ''تلاوت کرنا'' لیا جائے تو "من الآیات" میں ''من تبعیضیہ ہوگا، یعنی ''ہم پڑھتے ہیں آپ پر کچھ آیتیں'' اور اگر "نتلوہ" کا معنی "نسرد، نذکر" (ہم بیان کرتے ہیں، ذکر کرتے ہیں) لیا جائے تو "من الآیات" میں "من" ابتدائیہ ہوگا۔ اس صورت میں معنی بعض کرنا صحیح نہیں، یعنی صحیح معنی یہ ہوگا ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر آیات'' لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہوگا ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر بعض آیات'' (از روح المعانی)

راقم جب اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کو دیکھتا ہے اور تفاسیر کی بحثوں کو دیکھتا ہے تو بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے (واہ اعلیٰ حضرت آپ نے کتنی تفاسیر کو دیکھ کر کتنی محنت سے ترجمہ کیا ہے)

راقم کا ترجمہ بھی معالم التنزیل اور روح المعانی میں دیکھئے، کچھ حصہ ذکر ہو چکا ہے، اور دیکھئے "الحکیم "المحکم المتقن نظمہ" حکیم کا ایک معنی یہ ہے کہ (قرآن پاک) محکم ہے جس کی نظم یعنی اس کے الفاظ مبارکہ یقین پر دلالت کررہے ہیں۔

تاہم ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے "الممنوع الباطل" وہ جو باطل سے دور ہو، یعنی آپ پر ہم بیان کرتے ہیں قرآن کی آیات جو حق ہیں، باطل سے دور ہیں۔

ایک معنی یہ بھی لیا گیا ہے ''صاحب الحکمۃ'' یعنی ''نصیحت والی'' (روح المعانی)

علامہ رازی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ O﴾ کہنے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الاول انه بمعنى الحاكم مثل القدير والعليم والقرآن حاكم بمعنى ان الاحكام تتفادمنه"

ان میں سے ایک یہ ہے کہ "حکیم" بمعنی حاکم ہے جیسے قدیر بمعنی قادر، اور علیم بمعنی عالم استعمال ہوتے ہیں، قرآن حاکم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ "احکام قرآن پاک سے حاصل ہوتے ہیں" لھذا قرآن پاک حاکم ہے۔

(۲) والثاني معناه ذوالحكمة في تاليفه ونظمه وكثرة علومه"

ان میں سے دوسری وجہ یہ ہے کہ "حکیم" کا معنی ہے "حکمت والا ہونا" قرآن پاک کی تالیف اور نظم حکمت پر مبنی ہے اور اس میں کثیر علوم پائے گئے ہیں، اس لئے ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ O﴾ کا مطلب ہوا "اور قرآن حکمت والا"

(۳) والثالث انه بمعنى المحكم فعيل بمعنى مفعل قال الازهري وهوشائع في اللغة لان حكمت يجري مجرى احكمت في المعنى فرداى الاصل ومعنى المحكم في القرآن انه احكم عن تطرق وجوه الخلل اليه قال الله تعالى احكمت آياته"

ان وجوہ میں تیسری وجہ یہ ہے کہ "حکیم" کا وزن "فعیل" کا ہے، اور فعیل بمعنی "مفعل" استعمال ہوتا رہتا ہے، اسلئے "حکیم" کا معنی ہے "محکم"۔ اب ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ O﴾ کا معنی ہوگیا "قرآن محکم" اب اس پر بظاہر وہم یہ ہوا کہ "حکیم" مجرد ہے، اور "محکم" مزید فیہ "تو "حکیم" بمعنی "محکم" کیسے؟

تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "حکیم" کا "محکم" کے معنی میں استعمال ہونا بہت ظاہر اور واضح ہے۔ کیونکہ "حکمت" مجرد، اکثر طور پر "احکمت "مزید فیہ، کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔

(۴) والرابع ان يقال القرآن لكثرة حكمه انه ينطق بالحكمة فوصف بكونه حكيما على هذاالتاويل"

چوتھا احتمال یہ ہے کہ قرآن پاک کو حکمت والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں کثیر حکمتوں کا ذکر ہے اسی وجہ سے قرآن پاک کو حکیم کہا گیا ہے۔

یہ تمام وجوہ جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق اس سے ہے کہ "الذکر" سے مراد قرآن پاک ہو، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ذکر سے مراد لوح محفوظ ہو، انبیاء کرام پر نازل ہونے والی تمام کتب لوح محفوظ سے منقل ہوئی ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ عیسی علیہ السلام کے واقعات جو آپ پر بیان کئے گئے ہیں وہ لوح محفوظ سے نقل کئے گئے ہیں، وہ واقعات حق ہیں، باطل سے دور ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

تیسرا احتمال روح المعانی سے پہلے ہی نقل کیا جاچکا ہے کہ "الذکر" سے مراد نصیحت ہو، اور "الحکیم" سے مراد حکمت والی،'' اور حکمت والی نصیحت'' اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے۔

تنبیہ: تیسری وجہ میں ''حکیم'' کا معنی ''محکم'' کیا ہے، لیکن مراد لغوی معنی ہے کہ قرآن پاک خلل اور نقص سے پاک ہے، اور اصطلاحی معنی محکم بمقابلہ متشابہ نہیں، یعنی تمام قرآن پاک محکم ہے کیونکہ اس میں کوئی خلل اور نقص نہیں پایا گیا، اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے بطور دلیل ﴿اُحکمتْ آیاتہٗ﴾ ذکر فرمایا، ممکن ہے آپ نے ان الفاظ کا بھی لغوی معنی لیا ہو۔

❁ **اخرج ابن ابی حاتم عن الحسن قال اتی رسول الله ﷺ راهبا نجران فقال احدهما من ابو عیسی و کان رسول الله ﷺ لایعجل حتی یامره ربه فنزل علیه "ذلک نتلوه علیک من الآیات و الذکر الحکیم الی قوله من الممترین"**

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران کے دو راہب آئے، ان میں سے ایک نے آپ سے پوچھا ''عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ آپ چونکہ اپنی طرف سے جلدی کوئی جواب نہیں دیتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر رہتے تھے اس وقت یہ آیت کریمہ اور آنے والی آیات ﴿مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾ تک نازل ہوئیں (درمنثور)

❁ **واخرج ابن جریر عن الضحاک فی قوله والذکر الحکیم قال القرآن"**

ابن جریر نے ضحاک سے روایت ذکر کی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ○﴾ سے مراد قرآن پاک ہے۔ (درمنثور)

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن علی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ستکون فتن قلت فما المخرج منها قال کتاب الله هو الذکر الحکیم و الصراط المستقیم"**

ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی، آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ'' فتنے نمودار ہوں گے'' تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان سے نکلنے (بچنے) کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے فرمایا کتاب اللہ پر عمل کرنے سے ان فتنوں سے بچا جا سکے گا، کیونکہ قرآن پاک ذکر حکیم اور صراط مستقیم ہے۔ (درمنثور)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''ذلک'' اشارہ بعید کا ہے جو بلندی مرتبت پر دلالت کررہا ہے ''ذلک' مبتداء ہے ''نتلوہ'' اس کی خبر

ہے، اور ''علیک'' متعلق ہے ''نتلوہ'' کے ''من الآیات'' حال ہے ''نتلوہ'' کی ضمیر منصوب سے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ ''من الآیات'' دوسری خبر ہو جائے ''ذلک'' کی۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ ''نتلوہ'' حال ہو اسم اشارہ سے اور ''من الآیات'' خبر ہو۔ (تفسیر ابی السعود)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰهِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۝﴾
(آیۃ نمبر ۵۹)

(1) عیسیٰ علیہ السلام کی کہاوت اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے، اسے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

(2) بیشک شان عجیبہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہے حالت عجیبہ آدم کی، پیدا کیا اسے مٹی سے، پھر کہا ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

شان نزول:

نجران کا ایک وفد مدینہ طیبہ میں آیا، وہ وفد ان کے چودہ سرداروں پر مشتمل تھا ایک ان کا بڑا سردار تھا جس کا نام اہیب تھا، اور دوسرا ان میں سے صاحب رائے تھا، یعنی اس کی رائے کو مانا جاتا تھا، اور ایک شخص ابو حارثہ تھا جو بادشاہ روم کا بہت مقبول تھا، یہ لوگ مدینہ طیبہ میں عصر کی نماز کے بعد پہنچے، انہوں نے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور بہت جسیم تھے، یہ لوگ چونکہ عیسائی تھے انہوں نے کھڑے ہو کر نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے شروع کی، صحابہ کرام نے ارادہ کیا کہ ان کو روکیں (تاکہ یہ کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں) لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''دعوھم'' ان کو چھوڑ دو، یعنی ان کو اپنے عقیدہ کے مطابق نماز ادا کرنے دو۔ اس وفد کے آنے سے پہلے ہی ان کے ساتھ مناظرہ کیلئے سورۃ آل عمران کی کچھ ابتدائی آیات نازل ہو چکی تھیں۔

وہ لوگ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ان میں سے ابو حارثہ اور اس کے ساتھ ایک اور شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو

آپ نے ان کو فرمایا "اسلما" اسلام لے آؤ، وہ کہنے لگے "اسلمنا قبلک" ہم تم سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"کذبتما یمنعکما عن الاسلام ثلاث عبادتکما الصلیب واکلکما الخنزیر وزعمکما ان لله ولدا"

تم جھوٹ کہتے ہو، تمہیں اسلام قبول کرنے سے تین چیزیں روک رہی ہیں (ایک ان میں سے تمہارا صلیب کی عبادت کرنا، اور دوسری چیز) تمہارا خنزیر کھانا، اور (تیسری چیز ان میں سے تمہارا یہ گمان کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ اے محمد تم ہمارے صاحب (عیسیٰ علیہ السلام) کو گالی کیوں دیتے ہو؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہنے لگے تم کہتے ہو وہ عبد (بندہ) ہیں تو آپ نے فرمایا "اجل هو عبد الله ورسوله وکلمته القاها الی العذراء البتول" ہاں وہ اللہ کے عبد اور اس کے رسول ہیں، اور اس کا کلمہ ہیں جو کنواری مریم کی طرف ڈالا گیا، تو وہ لوگ غصہ میں آ گئے، کہنے لگے کیا تم نے کوئی ایسا انسان بھی دیکھا ہے جو بغیر باپ کے ہو، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انسانوں میں ان کا کوئی باپ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا باپ ہو۔

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ان آدم علیہ السلام ما کان له اب ولا ام" بیشک آدم علیہ السلام کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم علیہ السلام کو ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا جائے۔ تو یہی حال ہے عیسیٰ علیہ السلام کا، کیونکہ بغیر ماں اور بغیر باپ کے انسان کا پیدا ہونا بہت ہی عادت کے خلاف ہے بنسبت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ "فشبه الغریب بالاغرب لیکون اقطع لشبهة الخصم" آپ نے عجیب وغریب کو تشبیہ دی بہت زیادہ عجیب وغریب سے تاکہ مخاصمت کرنے والے کے شبہات مکمل طور پر ختم کیے جا سکیں (ماخوذ از روح البیان)

اعلیٰ حضرت اور علامہ رازی رحمہما اللہ:

(ان مثل عند الله کمثل آدم) ای صفته کصفة آدم، ونظیره "مثل الجنة التی وعد المتقون" ای صفة الجنة"

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ آیۃ کریمہ میں 'مثل' کا معنیٰ صفت ہے، جیسا کہ دوسری آیۃ کریمہ "مثل الجنة التی وعد المتقون" میں بھی "مثل" کا معنیٰ صفت ہی ہے، اب مطلب یہ ہو گیا بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی صفت، واقع، بات، کہاوت آدم علیہ السلام کی صفت، واقع، بات، کہاوت کی طرح ہے۔

راقم نے ترجمہ روح البیان اور تفسیر ابی السعود سے لیا ہے، تفسیر ابی السعود کی عبارت ملاحظہ ہو:

(ان مثل عیسی) ای شانه البدیع المنتظم لغرابته فی سلک الامثال (عندالله) ای فی تقدیرہ وحکمه کمثل آدم ای کحالة العجیبة التی لا یرتاب فیها مرتاب ولا ینازع فیها منازع"

بیشک عیسی علیہ السلام کی عجیب شان جو عجائب وغرائب پر مشتمل ہے اللہ کے ہاں، یعنی اللہ کی تقدیر وحکم میں آپ کی مثال آدم علیہ السلام کی حالت عجیبہ کی طرح ہے جس میں کوئی شک کرنے والا شک نہ کرے اور کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہ کرے۔

راقم نے اسی کا اختصار کر کے یوں ترجمہ کیا بیشک شان عجیبہ عیسی کی مثل ہے حالت عجیبہ آدم کی۔

انسانوں کا والد اول آدم علیہ السلام ہیں:

عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کا کوئی والد اول ہو ورنہ لازم یہ آئے گا کہ اولاد والد سے پہلے ہو، جب یہ نہیں ہوسکتا تو خود بخود سمجھ آ گیا کہ انسان کے والد اول حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں۔ قرآن پاک بھی اس پر شاہد ہے ﴿یاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُم الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (اے لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک نفس سے اور پیدا کیا اسی نفس سے اس کی زوجہ کو) اس نفس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور زوجہ سے مراد آپ کی زوجہ حضرت حوا ہیں۔

اسی مضمون کو اس آیۂ کریمہ میں بھی پیش کیا گیا ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾

تخلیق آدم علیہ السلام کی کیفیت میں وجوہ کثیرہ:

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں رب تعالی نے کئی وجوہ کو ذکر کیا۔

(۱) ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ رب تعالی نے ان کو مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) ﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا﴾ وہ ذات جس نے بشر کو پانی سے پیدا کیا۔

(۳) ﴿وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ﴾ انسان کی تخلیق کی ابتداء کیچڑ سے کی۔

(۴) ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ﴾ بیشک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا (یعنی مٹی کے خمیر کے جوہر و سے)

(۵) ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ﴾ بیشک ہم نے ان کو چپکتی مٹی سے بنایا۔

(۶) ﴿اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ بیشک میں آدمی کو بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو

بد بودار سیاہ مٹی سے ہے۔

ان تمام صورتوں مین تطبیق اور مختلف اوقات کا ذکر پہلے پارہ میں تخلیق آدم علیہ السلام کی بحث میں گذر چکا ہے۔ یہاں چند حکمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت کی چند وجوہ:

(۱) مٹی سے پیدا کرنے میں ایک حکمت یہ ہے کہ انسان کو عجز اور تواضع حاصل رہے کہ وہ سمجھے میری پیدائش مٹی سے ہے، مٹی میں پستی ہے تو میں نے بھی پست ہو کر رہنا ہے۔

(۲) کسی چیز کو ڈھانپنا چاہیں تو مٹی سے ڈھانپ سکتے ہیں، جیسا کہ سونا اور چاندی کو پہلے زمانہ میں زمین میں دفن کر کے ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو گویا کہ زمین کو ستار ہونے کا وصف حاصل ہوا۔

تو انسان کو مٹی سے پیدا کر کے یہ بتا دیا کہ تو اپنی اصلیت کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا رہ تاکہ تجھے بھی ستار ہونے کا وصف حاصل ہو جائے، اور تجھے رب تعالیٰ کے وصف ستار کا مظہر ہونے کا شرف بھی حاصل ہو جائے۔

(۳) مٹی چونکہ زمین میں پائی جاتی ہے، انسان کو پیدا کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ زمین میں ہی رہے اسلئے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں خلیفہ) کے مطابق اسے زمین والوں کی خلافت کا حق دیا گیا ہے تاکہ وہ زمین میں ہی رہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کیلئے کسی کو زندہ آسمانوں پر اٹھائے تو یہ اس کی مرضی اور اختیار کی بات ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ ہی آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار کیلئے اپنی مخلوق کو مختلف چیزوں سے پیدا کر کے ان میں مختلف اوصاف رکھ دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو آگ سے پیدا کیا جو دوسرے ''اجرام'' (اجسام) سے زیادہ روشن ہے پھر اسی مخلوق کو گمراہی کی تاریکیوں میں مبتلاء کر دیا جسے روشن چیز سے پیدا کیا۔ فرشتوں کو لطیف چیز سے پیدا کیا یعنی نور اور ہواء لطیف سے پھر ان کو کامل شدت اور قوت عطاء کر دی، یعنی یہ رب تعالیٰ کی قدرت ہی ہے جس نے لطیف کو شدید وقوی بنا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا مٹی ''اکثف الاجرام'' ہے۔ پھر اس کثیف چیز کو اپنی قدرت

کاملہ سے محبت، معرفت اور نور وہدایت عطاء کردے۔

اور آسمانوں کو دریاؤں اور سمندروں کے پانی کی موجوں سے پیدا کیا، پھر ان آسمانوں کو ہوا میں معلق رکھ کر باقی رکھا تا کہ یہ اجرام فلکیہ (فلکی اجسام) رب تعالی کی قدرت باہرہ (روشن قدرت) پر دلالت کریں۔ اللہ تعالی کی مخلوق اس پر دلیل بن گئی کہ

"انه تعالى هو المدبر بغير احتياج، والخالق بلامزاح وعلاج"

کہ اللہ تعالی تمام چیزوں کا خالق ہے، اسے تخلیق میں کوئی محتاجی نہیں اور نہ ہی ان کی تدبیر میں اسے کوئی محتاجی حاصل ہے، بلکہ اس کے کام "کن" سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالی کی یہ قدرت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی اصلیت کے خلاف ان کو مزاج عطاء کر دیتا ہے اور اس کو تخلیق میں آلات اور مشقت کی ضرورت نہیں۔

(۵) انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ مٹی کو یہ وصف حاصل ہے کہ یہ آگ کو بجھا دیتی ہے اس لئے مٹی سے پیدا کیا تا کہ وہ شہوت غضب اور حرف کی آگ کو بجھا سکے کیونکہ ان چیزوں کی آگ سوائے مٹی کے یعنی سوائے عجز کے نہیں بجھائی جاسکتی۔

پانی سے پیدا کرنے میں حکمت:

پانی کو صاف اور شفاف ہونے کا وصف حاصل ہے، پانی میں جھانکنے سے انسان کو اپنا عکس نظر آتا ہے، اسی وجہ سے انسان کو پانی سے پیدا کیا تا کہ اسے وہ صفاء اور روشنی حاصل ہو جائے کہ اشیاء (چیزوں) کی صورتیں اس میں منقش ہو جائیں۔ گویا کہ انسان تمام مخلوق کا مظہر بنایا گیا کیونکہ فرشتوں والی صفات آپ کو انسان میں نظر آئیں گی، اسلئے کہ انسان کو لطافت ومحبت بھی حاصل ہے اور عبادت گزار ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے اور انسان کو صفات شیاطین بھی حاصل ہیں، کہ آگ کی طرح ذرا ذرا بات پر اکڑ جانا، بھڑک اٹھنا انسان کے مزاج میں داخل ہے، اور شیطانی کام بھی اسے حاصل ہیں۔ حیوانوں کی طرح کھانا، سونا، خواہشات رکھنا بھی انسان کو حاصل ہے۔

تو واضح ہوا کہ انسان تمام مخلوق کا مظہر ہے کیونکہ اسے پانی سے پیدا کر کے شفاف بنا دیا گیا ہے، جس میں اشیاء کی صورتیں منقش ہیں۔ انسان کی جو صفت غالب رہے انسان کو وہی مقام حاصل ہوتا ہے، دعاء یہی کی جائے کہ انسان کی صفت ملکی غالب رہے، شیطانی صفات سے دور رہے، درندگی سے رب تعالی بچائے، اور حیوانی صفات بھی انسان پر غالب نہ رہیں، وہی انسان کامل ہے۔

کیچڑ سے پیدا کرنے میں حکمت:

مٹی کو کثافت حاصل ہے اور پانی لطافت حاصل ہے، جب مٹی اور پانی کو ملا لیا جائے تو کیچڑ بن جائے گا، جسے عربی زبان میں ''طین'' کہا جاتا ہے کیچڑ میں دونوں صفات جمع ہو جاتی ہیں، کثافت بھی اور لطافت۔ انسان کو کیچڑ سے پیدا کیا گیا تا کہ اس کی اصلیت یعنی مٹی کی کثافت کو کم کر کے اسے پانی کی لطافت بھی عطاء کر دئے جائے، تو اب انسان کو بھی دونوں وصف کثافت اور لطافت حاصل ہو گئے۔ اسی مضمون سے رب تعالی کے ارشاد گرامی ''انی خالق بشرا من طین'' کی حکمت واضح ہوگئی۔

خالص طین سے بنانے کی حکمت:

رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ﴾ اور تحقیق ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا، یعنی خالص مٹی کے خمیر کے جوہر سے بنایا۔

''السلالة بمعنى المسلولة فعالة بمعنى المفعولة لانها هي التى تسل من الطف اجزاء الطين''

سلالہ بمعنی مسلولہ کے ہے کیونکہ فعالہ کا وزن مفعولہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، سلالہ اس مٹی کو کہتے ہیں جسے کیچڑ کے لطیف اجزاء سے کھینچا (نکالا) گیا ہو۔

چنی ہوئی خالص مٹی سے بنانے میں حکمت یہ ہے کہ انسان کو کثافت ولطافت کے ساتھ ساتھ قوت بھی حاصل ہے، جس طرح خالص کیچڑ سے بنی ہوئی چیز مضبوط ہوتی ہے، لیکن ریت وغیرہ ملی ہو تو وہ مضبوط نہیں ہوتی، اسی طرح انسان کو جب خالص مٹی سے بنایا ہے تو اسے قوی بنایا گیا ہے۔

چپکنے والی مٹی سے بنانے میں حکمت:

کہ انسان جب غور کرے گا کہ مجھے تو رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ﴾ (ہم نے ان کو پیدا کیا چپکتی مٹی سے) کے مطابق چپکنے کی قوت عطاء کی گئی تو وہ عبادات پر لزومی عمل کرے گا ایسا نہیں کہ کبھی اس پہ عمل کرے اور کبھی عمل نہ کرے، بلکہ چپک کر عمل پر قائم ودائم رہے۔

بدبودار مٹی سے انسان کو پیدا کرنے میں حکمت:

رب تعالی نے ارشاد فرمایا'' ﴿إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ بیشک میں آدمی کو

بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو بدبودار سیاہ مٹی سے ہے۔ (از ہری)

اس آیۃ کریمہ میں مٹی کے تین وصف ذکر کئے گئے ہیں، بدبودار ہونا، اور رنگ بدل کر سیاہ ہو جانا، اور مٹی کا کھنکنا اور بجنا جیسے گھنٹی بجتی ہے۔ مٹی کا جب کیچڑ بنایا جائے اور اسے کچھ دیر اسی طرح چھوڑا جائے تو اس میں بدبو آ جاتی ہے، بدبودار مٹی سے پیدا کرنے میں یہ حکمت اور اشارہ پایا گیا ہے کہ انسان کے پسینہ میں بدبو ہوگی۔

نبی کریم ﷺ کی تخلیق:

علامہ امام ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں کعب بن احبار رضی اللہ عنہ سے روایت کو نقل کیا ہے کہ

لما اراد الله عزوجل ان يخلق محمدا ﷺ امر جبريل علیہ السلام فاتاه بالقبضة البيضاء التي هي موضع قبر رسول الله ﷺ فعجنت بماء التسنيم فغمست في انهار الجنة وطيفها في السماوات فعرفت الملائكة محمدا ﷺ قبل ان يعرف آدم ثم كان نور محمد يرى في غرة جبهة آدم وقيل له يا آدم هذا سيد ولدك من المرسلين فلما حملت حواء بشيث انتقل النور من آدم الى حواء وكانت تلد في كل بطن ولدين الاشياء فانه ولدته وحده كرامة لمحمد ﷺ ثم لم يزل ينتقل من طاهر الى طاهر الى ان ولدته آمنة من عبدالله ابن عبدالمطلب" (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۴۴ باب فضائل سید المرسلین)

جب اللہ تعالیٰ نے محمد (رسول اللہ ﷺ) کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو جبریل کو حکم دیا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کی جگہ سے سفید مٹی کی ایک مٹھی لی پھر اسے ماء تسنیم (جنت کی نہر تسنیم کے پانی) سے گوندھا گیا، پھر اسے جنت کی نہروں میں ڈبویا گیا اور آسمانوں میں اسے پھیر لیا گیا پس فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو پہچاننے سے پہلے ہی محمد ﷺ کو پہچان لیا، پھر نور محمدی کو آدم علیہ السلام کی پیشانی میں رکھا گیا جس کی وجہ سے آپ کی پیشانی جگمگاتی تھی، اور ان کو بتایا گیا اے آدم یہ تمہاری اولاد سے ہوں گے، اور تمام رسولوں کے سردار ہوں گے، پس جب حضرت حوا کے پیٹ میں شیث آئے تو وہ نور آدم علیہ السلام کی پیشانی سے منتقل ہو کر حوا کے پاس آ گیا، حالانکہ حضرت ہوا کے بطن سے دو دو بچے ہر حمل سے پیدا ہو رہے تھے لیکن (نبی کریم ﷺ کے نور کو منقسم ہونے سے بچانے کیلئے) صرف شیث علیہ السلام ہی اکیلے پیدا ہوئے اس میں حضور ﷺ کی کرامت کا لحاظ رکھا گیا پھر آپ کا نور ہمیشہ سے پاک ہستی کی طرف منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ آپ کی والدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو عبداللہ بن عبدالمطلب سے جنا۔

خیال رہے کہ پاک نسلوں سے منتقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے آباء واجداد بدکاری اور کفر سے پاک تھے، طہارت کو صرف بدکاری کی نجاست سے پاک ہونے کے ساتھ خاص کرنا باطل ہے، بلکہ زیادہ مقصود ہی کفر

سے پاک ہونے کا بیان کرتا ہے۔

یہ تفصیل راقم نے پہلے پارہ ﴿وَلَا تُسْـئَلُ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِيْمِ﴾ کی وضاحت کے ضمن میں بیان کر دی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مٹی کو جنت کے پانی (ماءِ تسنیم) سے گوندھا گیا اس لئے آپ کی مٹی خوشبودار تھی، آپ کا پسینہ بھی خوشبودار تھا۔

آپ کا پسینہ خوشبودار اور باعث برکت تھا:

عن ام سليم ان النبی ﷺ كان ياتيها فيقبل عند ها فتبسط نطعا فيقيل عليه و كان كثير العرق فكانت تجمع عرقه فتجعله فی الطيب فقال النبی ﷺ يا ام سليم ما هذا؟ قالت عرقک نجعله فی طيبنا وهو من الطيب اطيب وفی رواية قالت يا رسول الله نرجو بركته لصبيا ننا قالت اصبت" (بخاری، مسلم مشکوۃ باب اسماء النبی ﷺ و صفاته)

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ ان کے گھر عام طور پر تشریف لاتے اور قیلولہ فرماتے، وہ آپ کیلئے چمڑے کا بچھونا بچھاتیں، جس پر آپ قیلولہ فرماتے، حضور ﷺ کو پسینہ بہت آتا تھا وہ آپ کے پسینے کو جمع کر کے اپنی خوشبو میں ملا رہی تھیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ام سلیم یہ کیا؟ انہوں نے کہا، "یہ آپ کا پسینہ ہے، جس کو ہم اپنی خوشبو میں ملا رہے ہیں کیونکہ یہ سب خوشبوؤں سے اعلیٰ خوشبو ہے"

اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس سے ہم اپنے بچوں کیلئے برکت حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے، تمہیں اس سے برکت حاصل ہوگی۔

خیال رہے کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جمع کے صیغے ذکر کئے حالانکہ ان کا بظاہر اپنا ہی فعل تھا لیکن انہوں نے کہا "عرقک نجعله فی طيبنا وهو من الطيب اطيب" یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اس کو اپنی خوشبو میں ڈالیں گے کیونکہ آپ کا پسینہ سب خوشبوؤں سے زیادہ خوشبودار ہے۔ پھر اور عرض کیا "يا رسول الله نرجو بركته لصبياننا" یا رسول اللہ ہم آپ کے پسینہ سے اپنے بچوں کیلئے برکت حاصل کریں گے" جمع کے صیغے ذکر کر کے گویا کہ زبان حال سے یوں عرض کر دیا کہ یا رسول اللہ جو میرا عقیدہ و نظریہ ہے وہی میرے گھر کے ہر فرد کا ہے۔

نبی کریم ﷺ کو پسینہ زیادہ آتا تھا:

وجہ اس کی یہ تھی "لانه كثير الحياء" کیونکہ نبی کریم ﷺ کو حیاء زیادہ آتی تھی، اور جسے حیاء زیادہ آئے اسے

پسینہ زیادہ آتا ہے۔ کسی قسم کا عطر، کستوری، ہر قسم کی خوشبو والی اشیاء میں ایسی خوشبو نہیں پائی گئی جو میرے حبیب پاک ﷺ کے پسینہ مبارک میں تھی، میرے آقا و مولی کو ایک عام انسان سمجھنے والوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے پسینہ سے بد بو آتی ہے، ان کے قریب کوئی بیٹھنا پسند نہیں کرتا، اور ان کی تخلیق بد دار مٹی سے کی گئی لیکن حضور ﷺ کی تخلیق خوشبودار مٹی سے کی گئی، اور آپ کا پسینہ خوشبو دار چیزوں کی خوشبو بڑھانے کیلئے استعمال ہوتا تھا، اور آپ کے پسینہ سے برکت حاصل کی جاتی تھی۔

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے یہ عرض کرنے پر کہ ہم آپ کے پسینہ کو بچوں کیلئے برکت حاصل کرنے کیلئے استعمال کریں گے، آپ نے منع نہیں فرمایا بلکہ ارشاد فرمایا۔ ''اصبت ای فعلت الصواب'' تم نے درست کام کیا ہے، یقیناً میرے پسینہ میں برکت ہے۔

''وفیہ استحباب التبرک والتقریب بآثار لصالحین''

اس حدیث پاک سے یہ سمجھ آیا کہ نیک لوگوں کے آثار سے تبرک حاصل کرنا اور ان کا تقرب حاصل کرنا مستحب ہے۔

''لما حضر انس بن مالک الوفاۃ اوصی ان یجعل فی حنوطہ من ذلک الطیب''

جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بیٹے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو آپ نے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد مجھے جو خوشبو (حنوط) لگائی جائے گی اس میں وہ خوشبو بھی ملانا جو میری ماں نے حضور ﷺ کا پسینہ ملا کر تیار کی تھی۔

سبحان اللہ ! صحابی رسول کا کیسا پختہ ایمان ہے کہ آپ کا پسینہ قبر میں بھی برکت کا باعث بنے گا۔

خیال رہے کہ ام سلیم اور ام حرام دونوں بہنیں ہیں، ملحان کی بیٹیاں ہیں۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی دس سال خدمت کرنے والے خوش نصیب صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں، ان کا نکاح پہلے مالک سے تھا، وہ حالت کفر پر ہی مر گیا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اسی مالک کے بیٹے ہیں بعد میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے ہوا، آپ کے پورے گھرانے کے افراد صحابی تھے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ علامہ نووی رحمہ اللہ مسلم شریف کی شرح میں بیان فرماتے ہیں کہ ام سلیم اور ام حرام رسول اللہ ﷺ کی خالہ تھیں، رضاع کی وجہ سے تھیں یا نسب کی وجہ سے اس لحاظ پر آپ ان کے گھر عام طور پر تشریف لے جاتے، آپ ان کے محرم تھے، وہ آپ کی محرمہ تھیں، محرمہ عورت سے خلوت جائز ہے، اسی لئے آپ ان کے گھر عام طور پر تشریف لے جاتے تھے خواہ وہ اکیلی ہی کیوں نہ ہوں۔

ہوں، اس قانون اور ضابطہ کے مطابق گدھے اور خچر کا پسینہ بھی مشکوک ہونا چاہئے تھا۔

لیکن تمام فقہاء کرام کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ ان کا پسینہ پاک ہے، اس کی طہارت میں کوئی شک نہیں۔ اس کی وجہ راقم کے ذہن میں جو آتی ہے (فقہاء کرام کی بحثوں سے ہٹ کر) وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بعض اوقات گدھے اور خچر پر بغیر زین کے سواری کی، ان کی پیٹھ پر کپڑا وغیرہ بھی نہیں ہوتا تھا، اگر ان کا پسینہ ناپاک ہوتا تو آپ ان پر سواری نہ فرماتے کیونکہ کسی جانور کی ننگی پیٹھ پر سوار ہونے سے پسینہ تو آتا ہی ہے یا دوسرے لفظوں میں میرے عشق و محبت سے یوں کہو کہ نبی کریم ﷺ کے ان پر سوار ہونے نے ان کے پسینہ کو پاک بنا دیا، جس نے شک وشبہ کو زائل کر دیا۔ (راقم)

رنگ بدلتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت:

ایک وجہ تو حدیث پاک میں واضح طور پر مذکور ہے جو پہلے پارہ "نجوم الفرقان" میں ذکر کر دی گئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر میں مختلف رنگوں کی مٹی رکھی گئی تھی وہی تمام رنگ آپ کی اولاد میں موجود ہیں۔

اور دوسری حکمت یہ ہے کہ جس طرح کیچڑ میں رنگ بدل جاتا ہے اسی طرح انسان کا مختلف کیفیات میں رنگ بدل جاتا ہے۔ شرمندگی آنے پر رنگ سرخ ہو گیا، اور ڈر کے وقت زرد ہو گیا، اور پریشانی کے وقت یوں سمجھ آتا ہے کہ اس کے چہرہ سے خاک اڑ رہی ہے۔

کھنکتی (بجتی) مٹی سے پیدا کرنے میں حکمت:

جس طرح مٹی کے برتن کو جب یہ دیکھنا ہو کہ یہ خوب پختہ ہے یا کہ کچا ہے، اور یہ صحیح ہے یا ٹوٹا ہوا تو اسے کھنکا اور بجا کر دیکھا جاتا ہے، اگر اسمیں گھنٹی کی طرح آواز آئے تو سمجھ آتا ہے کہ یہ پختہ اور صحیح ہے، اگر اس طرح آواز نہ آئے تو پتہ چلتا ہے یہ کچا ہے یا ٹوٹا ہوا ہے۔ انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کر کے یہ اشارہ کر دیا کہ اے انسان تو اپنے ایمان میں پختہ رہ، اور ایمان میں صحیح سلامت رہ، کبھی ادھر اور کبھی ادھر نہ ہو۔

﴿ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ "پھر کہا ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر طور پر عقل کا تقاضا ہے کہ یہ کہنا چاہئے تھا "ثم قال لہ کن فکان" (پھر کہا ہو جا تو وہ ہو

حضور ﷺ نے تعلیم امت کیلئے حقیقی محرمہ کے بغیر کسی دوسری عورت سے خلوت نہیں فرمائی اگر چہ آپ کی امت کی تمام عورتوں کو آپ کی محرمہ ہونے کا شرف حاصل تھا، لیکن تمام عورتیں حقیقی محرمہ نہ تھیں اسی وجہ سے آپ کے نکاح میں امہات المؤمنین آئیں۔ حضرت ام سلیم اور حضرت ام حرام بنی نجار سے تھیں اور حضرت عبدالمطلب کی شادی بھی بنی نجار قبیلہ کی عورت سے ہی تھی، یہ اپنے باپ ہاشم سے جدا ہو کر مدینہ طیبہ چلے گئے تھے اور وہاں بنی نجار کی ایک عورت سے شادی کر لی۔ (از مرقاۃ ج۱۱ص۲۹)

پسینہ کی خوشبو سے پتہ چلتا کہ آپ یہاں سے گزر رہے ہیں:

عن جابر ان النبی ﷺ لم یسلک طریقا فیتبعه احد الاعرف انه قد سلکه من طیب عرقه دارمی، مشکوۃ (باب اسماء النبی ﷺ وصفاته)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ جب بھی کسی راستہ پر چلتے تو آپ کے بعد جب کوئی اس راستہ پر چلتا تو اسے آپ کے پسینہ کی خوشبو سے پتہ چل جاتا کہ حضور ﷺ کا یہاں سے گذر ہوا۔

یہاں جس خوشبو کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ "**طیب عرقه الخلقی لاطیب العرفی**" آپ کے پسینہ مبارک میں جو خوشبو قدرتی طور پائی جاتی تھی وہ مراد ہے، عام طور پر پسینہ کی بد بو زائل کرنے کیلئے لوگ جس خوشبو کا استعمال کرتے ہیں وہ مراد نہیں۔

"**هذا من خصائصه دون سائر الانبیاء علیه وعلیهم الصلوۃ والسلام**" (از مرقاۃ ج۱۱ص۸۳)

پسینہ میں قدرتی طور پر خوشبو کا پایا جانا حضور ﷺ کی خصوصیت ہے باقی انبیاء کرام کو بھی یہ شرف حاصل نہ ہوا۔

راقم کے ذہن میں ایک عجیب مسئلہ گھومتا ہے:

فقہاء کرام نے ایک ضابطہ بیان کیا ہے کہ جس کا جوٹھا (بقیہ) پاک ہے اس کا پسینہ بھی پاک۔ انسان اور گھوڑے کا جوٹھا پاک ہے، اسلئے ان کا پسینہ بھی پاک ہے، کتے اور باقی درندوں کا جوٹھا ناپاک ہے اسلئے ان کا پسینہ بھی ناپاک ہے۔ گدھے اور خچر (جس خچر کی ماں گدھی ہو) کا جوٹھا مشکوک ہے، اس لئے کہ اس میں روایات بھی مختلف ہیں اور قیاس بھی مختلف ہیں، اگر اور پانی نہ میسر ہو تو گدھے اور خچر کے جوٹھے پانی سے وضوء بھی کرے اور تیمم بھی کرے کیونکہ ہو سکتا ہے نجس ہونے والی روایات غالب ہوں اور ہو سکتا ہے کہ طہارت والی روایات غالب

گیا)"فکان" کی جگہ "فیکون" کیوں ذکر کیا، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اصل مفہوم یہ ہے:

(ثم قال له کن فیکون)فکان، واعلم یا محمد ان ما قال له ربک(کن)(فانه یکون لا محالة)

کہ اے محمد ﷺ آپ کا رب جس کسی کو کہتا ہے "ہو جا" تو وہ یقیناً "ہو جاتا ہے" تو حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو بھی کہا اس شکل پر بن جا تو وہ بن گئی (کبیر)

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ ماضی سے مضارع کی طرف عدول کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ اس میں ماضی کے حال کی حکایت پائی گئی ہے۔ (روح البیان)

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۰)

(1) اے سننے والے یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تو شک والوں میں نہ ہوتا۔

(2) (اے سننے والے) یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو نہ ہو شک کرنے والوں۔

میں سے اس آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر عیسی علیہ السلام کی جو خبر نازل کی گئی ہے وہی حق ہے کہ آپ کلمہ کن اور نفخ جبریل (جبریل کی پھونک) سے پیدا کئے گئے۔ آپ کی والدہ مریم کنواری تھی، پاکدامن اور نیک تھی، عیسی علیہ السلام کے متعلق جو یہود ونصاری نے کہا وہ باطل ہے، اسے ماننا کفر ہے۔

"فالنصاری قالوا ان مریم ولدت الھا"

نصاری نے کہا کہ بیشک مریم نے خدا کو جنا ہے۔ یعنی وہ عیسی علیہ السلام کو معاذ اللہ خدا کہنے لگے، ان کے متعلق ہی رب تعالی نے فرمایا:

﴿لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ﴾

تحقیق انہوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا بیشک اللہ وہ مسیح ابن مریم ہیں۔

"والیھود رموا مریم علیھا السلام بالافک ونسبوھا الی یوسف النجار"

اور یہود نے مریم علیہا السلام پر بہتان باندھا اور ان کو یوسف نجار کی طرف منسوب کیا، یعنی یہودیوں نے معاذ اللہ حضرت مریم کو بدکارہ اور مزنیہ قرار دیا۔

خیال رہے یہود کے پیروکار نیچری مذہب والوں نے بھی وہی کچھ کہا جو یہود نے کہا لیکن مسلمانوں کے غیظ وغضب سے بچنے کیلئے حضرت مریم کو یوسف نجار کی منکوحہ قرار دیا۔ نصاری اور یہود اور یہود کے پیروکار لوگوں کے اقوال من گھڑت اور باطل ہیں، ان کے نظریات کفریہ ہیں، ان کے اقوال کو تسلیم کرنے والے کافر ہیں۔

"فاللہ تعالی بین ان ھذاالذی انزل فی القرآن ھو الحق"

بس حق وہی ہے جو عیسی علیہ السلام کی شان رب تعالی نے قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس سے پہلی آیۃ میں اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام کی شان عجیبہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی حالت عجیبہ کے مشابہ قرار دیا، تو اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا کہ "ان الحق فی بیان ھذہ المسألہ ماذکرناہ من المثل" جو مشابہت ہم نے بیان فرمائی ہے وہ حق ہے وہ تخلیق آدم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ "ولا

برھان اقوی من التمسک بھذہ الواقعۃ" اس واقعہ سے بڑھ کر قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ (بیر)

﴿فَلا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝﴾ (اے سننے والے) تو نہ ہو شک کرنے والوں میں سے

یعنی جب حق وہی ہے جو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

"ممتری" وزن ہے "مفتعل" کا "مریۃ" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے شک کرنا' عام طور پر عرب استعمال کرتے ہیں "مریت الناقۃ والشاۃ" میں نے اونٹنی کو دوہا، یا میں نے بکری کو دوہا، جس طرح دودھ دوہنے والا دودھ دوہ کر کھینچتا ہے، اسی طرح شک کرنے والا مختلف طرح کے خیالات کو کھینچتا ہے اور جذب کرتا ہے، اسلئے "مریۃ" کا معنی شک بھی ہے۔

اسی طرح "مریۃ" کا معنی جھگڑا کرنا بھی آتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "ماری فلان فلانا" فلاں نے فلاں سے جھگڑا کیا، جھگڑا کرنے والا بھی غضب کو ظاہر کرتا ہے اور شک کرنے والا بھی تردد کو ظاہر کرتا ہے، لھذا "مریۃ" کا معنی اس مناسبت سے بھی شک لیا گیا ہے۔

خطاب کسے کیا گیا؟

﴿فَلا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝﴾ کا خطاب کسے کیا گیا ہے؟

"خطاب فی الظاھر مع النبی ﷺ وھذا بظاھرہ یقتض انہ کان شا کافی صحۃ ما انزل علیہ وذلک غیر جائز"

بظاہر تو یہ سمجھ آتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن اس سے تو یہ ثابت کرنے پڑھے گا کہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا کلام جو نازل کیا آپ کو اس میں شک تھا، لیکن یہ تو جائز نہیں کہ آپ "معاذ اللہ" کلام الٰہی میں شک کریں۔

واختلف الناس فی الجواب عنہ، فمنھم من قال الخطاب وان کان ظاھرہ مع النبی ﷺ لانہ فی المعنی مع الامۃ قال تعالیٰ "یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء"

اہل علم حضرات نے اس کا جواب مختلف انداز پر دیا ہے، ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے۔

(یہی جواب صاوی، مدارک، مظہری، قرطبی، حازن وغیرہ نے پسند کیا ہے، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے کہ آپ نے "اے سننے والے" الفاظ ذکر کر کے اسی جواب کی طرف اشارہ کر

دیا ہے، راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے)

"والثانی انه خطاب للنبی ﷺ والمعنی فدم علی یقینک وعلی ماانت علیه من ترک الامتراء"

دوسرا جواب اہل علم نے دیا ہے کہ یہ خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن اس صورت میں یہ معنی درست نہیں ہوگا کہ ''نہ ہو تم شک کرنے والوں میں سے'' بلکہ درست معنی یہ ہوگا ''تم یقین پر قائم رہو اور شک جو آپ سے پہلے ہی دور ہے اسی پر قائم رہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ دوسرا جواب تفسیر ابی السعود اور روح البیان میں پسند کیا گیا ہے۔ روح البیان کی واضح عبارت کو دیکھئے:

فی ذلک الخطاب للنبی ﷺ علی طریق الالهاب والتهیج لزیادة التبثیت لان النهی عن الشئ حقیقة یقتض ان یتصور صدور المنهی عنه من المنهی ولا یتصور کونه علیه السلام شاکا فی صحة ما انزل علیه والمعنی دم علی یقینک وعلی مانت علیه من الاطمئنان علی الحق والتنزه عن اشک فیه"

یہ خطاب نبی کریم اکو زیادہ ثابت رہنے پر برانگیختہ کرنے کیلئے ہے، حقیقی نہی یہاں نہیں پائی گئی، نہی وہاں ہوتی ہے جہاں "منهی عنه" (جس کام سے روکا گیا ہے) کا پایا جان "منهی" (جسے روکا گیا ہے) سے متصور ہو سکے، (جب کوزے میں پانی ہی نہ ہو تو یہ کہنے کا کوئی مقصد نہیں "لا تشرب الماء من الکوز" کوزے سے پانی نہ پیو۔

نبی کریم ﷺ سے جب کلام الٰہی میں شک کرنے کا تصور ہی نہیں پایا گیا تو نہی حقیقی معنی میں نہیں لھذا یہ معنی کرنا تو درست نہیں کہ (نہ ہو تم شک کرنے والوں میں سے) البتہ یہ معنی کرنا درست ہوگا کہ '' آپ یقین پر قائم رہیں اور آپ پہلے سے ہی جو حق پر اطمینان رکھتے ہو اور شک سے جب آپ پاک ہو تو اسی پر قائم رہو۔

جب آپ معصوم ہیں تو آپ کو زیادہ ثابت رہنے پر برانگیختہ کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا:

"قال الامام ابو منصور رحمه الله العصمة لا تزیل المحنة ولاترفع النهی"

امام ابو منصور رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آپ کے معصوم ہونے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو مشقت میں نہ ڈالا جائے اور آپ کو نہی نہ کی جائے یہ بلندی شان کیلئے پائی جاتی ہیں۔ (روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۱)

(1) پھر اے محبوب جو تم سے عیسیٰ کے بارے حجت کریں بعد اس کے کہ تمہیں علم ہو چکا تو ان سے فرمادو آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر مباہلہ کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔

(2) تو جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس کے بارے میں، بعد اس کے جو آ گیا تمہارے پاس علم، تو اس نے فرمادو، آؤ ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور (تم بلاؤ) اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی بیٹیوں کو اور تم اپنی بیٹیوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو، پھر ہم مباہلہ کریں تو کریں اللہ کی لعنت جھوٹوں پر۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے اس سورۃ میں قطعی دلائل سے عیسائیوں کا رد فرمایا، جو وہ حضرت مریم کو اللہ کی زوجہ اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا مانتے تھے، پھر ان کو بتایا کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا جب انسانوں میں کوئی باپ نہ تھا تو وہ ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہی ہوگا، یا خدا ہوگا، اگر یہ تمہارا دعویٰ سچا ہو تو آدم علیہ السلام کے متعلق تم کیا کہو گے، ان کا نہ کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔

اب اس آیۃ کریمہ میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کو ختم کرنے کیلئے یعنی ان کو مکمل طور پر لاجواب کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ اگر قطعی دلائل کے بعد بھی ان کی حجت بازی نہ ختم ہو تو ان کو آپ فرماؤ آؤ مباہلہ کرلیں تو سچے جھوٹے کا پتہ چل جائے، تو یہ ضدی لوگوں کو لاجواب کرنے کا آخری جواب تھا۔ (از کبیر)

شان نزول:

مختلف آیات میں نجران کے وفد کا تذکرہ ہو چکا ہے، ابھی ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ﴾ کی بحث میں بھی تفصیل ذکر ہو چکا ہے، اسی وفد کی حجت بازی کو ختم کرنے کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو مباہلہ کا

چیلنج کر کے لاجواب کر دیا گیا۔

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ﴾ ''تو جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس کے بارے میں۔''

زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ''من ''موصولہ ہے، اگرچہ شرطیہ بنانا بھی صحیح ہے۔

''فمن حاجک ای من نازعک وجادلک'' جس شخص نے آپ سے نزاع کیا اور مجادلہ (جھگڑا) کیا اصل میں جھگڑا سے مراد ایک دوسرے کے خلاف حجت و دلائل پیش کرنا مراد ہے۔ یہ باب مفاعلہ ہے جو فعل کو جانبین سے چاہتا ہے، اب مطلب واضح ہوا کہ آپ کے دلائل کے بعد بھی آپ پر کوئی حجت قائم کرے تو اسے مباہلہ کا چیلنج کریں۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ''حاجک'' کا معنی ہی یہ کیا ' جو تم سے حجت کریں ''فیہ' کی ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر ''عیسی'' (علیہ السلام) کی طرف لوٹ رہی ہے، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''پھر اے محبوب جو تم سے عیسی کے بارے میں حجت کریں' اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''فیہ ''کی ضمیر ''الحق ''کی طرف لوٹ رہی ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا، جو شخص آپ سے حق میں جھگڑا کرے۔

راقم نے ''حاجک'' کا ترجمہ لغوی کیا ہے اور ''فیہ'' کی ضمیر میں دو احتمال پائے جانے کی وجہ سے صرف ترجمہ کیا ہے ''اس کے بارے میں'' (ماخوذ از البحر المحیط و کبیر)

﴿مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ بعد اس کے جو آ گیا تمہارے پاس علم''

''ما'' موصولہ ہے ''الذی'' کے معنی میں ہے، اور ''علم'' سے مراد ''وحی'' ہے، یعنی قرآن پاک کے نازل ہونے کے بعد جس میں عیسی علیہ السلام کا ذکر موجود ہے جو حق ہے، آپ کا حق دلائل پیش کرنے کے بعد پھر آپ سے جو حجت بازی کریں (ان کو مباہلہ کا چیلنج کریں) (البحر المحیط)

اسی سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کے دلائل قطعی اور حق تھے، ان لوگوں کے دلائل باطل تھے بلکہ ان کے دلائل کفر پر مبنی تھے۔

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا﴾ ''فرما دو آؤ''

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں: ''تعالوا'' امر کا صیغہ ہے، مبنی بر سکون ہونے کی وجہ

سے نون اعرابی ساقط ہے۔ اصل میں "تعالیوا" ہے، یا متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے تبدیل کیا گیا، پھر الف اور واؤ میں التقاء ساکنین ہوا تو الف کو حذف کر دیا گیا۔ چونکہ "تعالوا" امر ہے، اسی وجہ سے "ندع" جواب امر میں مضارع واقع ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، لھذا اس کے آخر میں سے "واؤ" کو حذف کر دیا گیا۔ (صاوی)

﴿نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ کُمْ وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ کُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ﴾

''ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور (تم بلاؤ) اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی بیٹوں کو اور تم اپنی بیٹوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو۔''

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ظاہری الفاظ مبارکہ کے مطابق ہے، اور راقم نے روح المعانی اور روح البیان سے مرادی معنی لیا ہے،

"ندع ابناء نا وابنائکم، الخ" ای یدع کل مناومنکم ابناء ہ ونساء ہ ونفسہ للمباھلة" (روح المعانی)

یعنی ہر ایک ہم میں سے اور تم میں سے اپنے بیٹوں اور عورتوں اور اپنی جانوں کو مباہلہ کیلئے بلائیں۔

"قیل ابناء ناالحسن والحسین و نساء نا فاطمة" "ابناء نا" سے مراد امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور "نساء نا" سے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ (روح البیان)

اولاد کا ذکر اپنی جان سے پہلے کرنے میں حکمت:

اولاد کا پہلے ذکر کرنے کی دو وجہ ہیں۔

(۱) "وقدمھم علی النفس لان الرجل یخاطر بنفسه لھم ویحارب دونھم"

ایک وجہ یہ ہے کہ اولاد کا ذکر مقدم کیا ہے اپنی جان پر کیونکہ انسان کبھی اپنے آپ کو اولاد کی خاطر خطرہ میں ڈال لیتا ہے، اور اولاد پر واقع ہونے والے مظالم کا ان کی جانب سے دفاع کرتا۔

(۲) ولان الاصل فی الدعاء المغایرة بین الداعی والمدعو، والمغایرة بین الرجل وبین ابنائه ونسائه حقیقی وبینه وبین نفسه اعتباری فقدم الحقیقی علی الاعتباری"

اصل قانون یہ ہے کہ بلانے والا اور ہوتا ہے اور جسے بلایا جائے وہ اور ہوتا ہے یعنی داعی اور مدعو میں مغایرت پائی جاتی

ہے، انسان اور اس کی اولاد کے درمیان مغایرت حقیقی پائی جاتی ہے، اور انسان اور اس کی جان کے درمیان مغایرت اعتباری پائی جاتی ہے، اسلئے مغایرت حقیقی کو مغایرت اعتباری سے پہلے ذکر کیا۔

❁ **عن سعد بن ابی وقاص قال لما نزلت هذه الآية دعا رسول الله ﷺ عليا وفاطمة وحسنا وحسينا فقال اللهم هؤلاء اهل بيتی "** (رواہ الترمذی ومسلم)

حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ سے مروی ہے کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہو تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین ﷺ کو بلایا اور (رب تعالی کے حضور) اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

رافضیوں کا استدلال:

رافضی لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت علی ﷺ خلیفہ بالفصل ہیں اور ابو بکر اور عمر اور عثمان ﷺ کی خلافتیں باطل ہیں۔ معاذ اللہ وہ غاصب تھے، خلیفہ برحق نہیں تھے۔ انہوں نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پیش کی کہ "ابناء نا" سے مراد حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور "نساء نا" سے مراد حضرت فاطمۃ الزہراء ہیں اور "انفسنا" سے مراد حضرت علی ﷺ ہیں، "**واراد الله تعالی به کون علی ﷺ مساويا له ﷺ فی الفضائل**" اللہ تعالی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کے فضائل میں اس آیۃ کریمہ سے برابر کرنے کا ارادہ فرمایا۔

اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو لوگوں کی جانوں سے بھی زیادہ "**اولی فی التصرف**" بنایا، یعنی ان کے حقوق میں تصرف کا اختیار اتنا زیادہ دیا جو ان کو اپنی جانوں میں تصرف کا اتنا اختیار نہ تھا۔ "**فکان علی کذلک فهو الامام**" حضرت علی ﷺ جب نفس محمد ہیں تو مؤمنوں کی جانوں سے زیادہ ان پر "**اولی بالتصرف**" ہیں تو حقیقی امام آپ ہی ہیں۔

اس دلیل کے رد میں چند وجوہ:

(۱) رب تعالی نے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا "وانفسنا" اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم اپنی جان اور اپنے متبعین کی جانوں کو بلاتے ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی ﷺ کی ایک جان تھی۔

(۲) حضرت علی ﷺ کا "ابناء نا" میں داخل قوی احتمال رکھتا ہے کیونکہ عرفا عموم المجاز کے لحاظ پر داماد کو بیٹا اور

سسر کو باپ کہہ دیا جاتا ہے۔

(۳) جائز ہے کہ "انفسناء" سے مراد وہ لوگ ہوں جو نسب اور دین کے لحاظ پر آپ سے متصل ہوں اس لحاظ پر صرف حضرت علی ﷛ کا "انفسنا" میں داخل ہونا اور نبی کریم ا کے فضائل میں مساوی ہونا لازم نہیں آتا۔ کئی آیات مبارکہ میں "انفس "کا اطلاق نسبی اور دینی بھائیوں پر قرآن پاک میں آیا ہوا ہے:

﴿وَلَا تُخرِجُونَ اَنفُسَكُم مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ اور نہ نکالو اپنے نفسوں (اپنے بھائیوں) کو اپنے شہروں سے" ﴿تَقْتُلُوْنَ اَنفُسَكُمْ﴾ تم قتل کرتے ہو اپنے نفسوں کو (اپنے بھائیوں کو) ﴿ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِاَنفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ مؤمن مرد اور عورتیں اپنے نفسوں (اپنے بھائیوں) کے متعلق خیر کا گمان کرتے ہیں۔ ﴿وَلَا تَلْمِزُوْا اَنفُسَكُمْ﴾ اور نہ عیب لگاؤ اپنے نفسوں پر (اپنے بھائیوں پر) ان تمام آیات میں "انفس" سے مراد" بھائی ہیں" دینی یا نسبی۔

(۴) اگر اس آیۂ کریم سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ نبی کریم ﷺ مومنوں کی جانوں سے زیادہ "اولی بالتصرف" ہیں، لھذا حضرت علی ﷛ "اولی بالتصرف" ہیں، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضرت علی ﷛ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں بھی "اولی بالتصرف" تھے، حالانکہ تم اس کے قائل نہیں ہو، بلکہ تم صرف آپ کی ظاہری حیات کے بعد حضرت علی ﷛ کو اولی بالتصرف مانتے ہو۔

رافض حضرات کی دلیل کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا ہے:

ہاں اس واقعہ سے یہ ضرور ثابت ہے "ان هؤلاء الكرم احب الناس الى رسول الله ﷺ" کہ بیشک یہ حضرات یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین ﷛ رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے، اس کا کوئی انکار نہیں۔

(ماخوذ از مظہری)

اعتراض: داعی مدعو کا غیر ہوتا ہے کوئی اپنے آپ کو بلاتا نہیں، لھذا "انفسنا" سے مراد نبی کریم انہیں بلکہ صرف حضرت علی ﷛ ہی ہیں۔

جواب: یہ اعتراض محاورات عرب سے بے خبری پر مبنی ہے، کیونکہ عرب کے محاورہ میں اپنے آپکو بلانے کا یہ مطلب ہے کہ ہم خود موجود ہو جاتے ہیں، اسے مغایرۃ اعتبار یہ کہا جاتا ہے جو پائی گئی ہے۔ (راقم)

شیعہ کے نزدیک حضرت علی ؓ انبیاء کرام سے افضل ہیں:

اثناعشریہ کا معلم محمود بن حسن حمصی علاقہ رے میں رہتا تھا "وھو کان یزعم ان علیا ؓ افضل من جمیع الانبیاء سوی محمد ﷺ" وہ یہ گمان رکھتا تھا کہ حضرت علی ؓ سوائے حضرت محمد ﷺ کے باقی تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ اس نے اپنے مذہب وعقیدہ پر یہی آیۃ کریمہ بطور دلیل پیش کی کہ "انفسنا" سے مراد خود نبی کریم ﷺ نہیں کیونکہ کوئی شخص اپنے آپ کو نہیں بلاتا بلکہ غیر کو بلاتا ہے، وہ بالاتفاق حضرت علی ؓ ہیں، لھذا آیۃ کریمہ سے واضح ہوگیا کہ نفس علی نفس محمد ہے، اور مراد یہ بھی نہیں کہ عین نفس علی عین نفس محمد ہے

"فالمراد ان هذه النفس مثل تلک النفس وذلک یقتضی الاستواء فی جمیع الوجوه"

بلکہ مراد یہ ہے کہ نفس علی مثل نفس محمد ہے، لھذا اس سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علی نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام اوصاف میں برابر ہیں، ہاں البتہ اجماع امت سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علی نبی نہیں اور یہ ثابت ہے کہ تمام کائنات میں افضل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

جب نبی کریم ﷺ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں تو حضرت علی ؓ جو اوصاف میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے برابر ہیں وہ بھی تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ اور اس نے ایک حدیث بطور دلیل یہ پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"من اراد ان یری آدم فی علمه ونوحا فی طاعته وابراهیم فی خلته وموسی فی هیبته وعیسی فی صفوته فلینظر الی علی بن ابی طالب"

جو شخص ارادہ رکھے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کا علم اور نوح علیہ السلام کی طاعت اور ابراہیم علیہ السلام کی خلت اور موسیٰ علیہ السلام کا رعب اور ان کی ہیبت اور عیسیٰ علیہ السلام کی برگزیدگی کو دیکھے تو حضرت علی بن ابی طالب کو دیکھ لے۔

لھذا اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں۔

شیعہ کی دلیل کا رد:

"انفسنا" مراد صرف حضرت علی ؓ نہیں، (تفصیل طور پر تفسیر مظہری سے راقم نے نقل کردیا ہے) اور جب شیعہ حضرات کے نزدیک اجماع امت دلیل ہے اس پر کہ حضرت علی نبی نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے افضل نہیں،

"واجمعوا علی ان النبی افضل ممن لیس بنبی واجمعوا علی ان علیا ؓ ما کان نبیا"

تو اس مسئلہ پر بھی اجماع ہے کہ کوئی غیر نبی کسی نبی پر افضل نہیں، اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حضرت علی

ﷺ نبی نہیں۔ لھذا تم پر لازم ہو گیا کہ اسے تسلیم کر لو کہ اجماع امت سے ثابت ہے کہ حضرت علی ﷺ کسی نبی سے نہ افضل ہیں، بلکہ برابر بھی نہیں، جب کسی نبی کے برابر نہیں تو نبی کریم ﷺ کے برابر ہونے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ (ماخوذ از نبیہ)

﴿ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾

''پھر ہم مباہلہ کریں تو اللہ کی لعنت کریں جھوٹوں پر''

''ثم نبتهل'' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے ''نتضرع فی الدعاء'' کہ ہم دعاء میں عاجزی کریں۔ اور کلبی کا قول ہے ''نجتهد و نبالغ فی الدعاء'' کہ ہم دعاء میں کوشش اور مبالغہ کریں۔ کسائی اور ابو عبیدہ کا قول یہ ہے کہ ''نبتهل'' باب افتعال ہے'' ''ابتهال'' التعان کے معنی میں آتا ہے، عام طور پر کہا جاتا ہے ''علیه بهلة الله'' اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ لھذا معنی یہ ہو گیا ''ہم اللہ کی لعنت کریں'' (معالم التنزیل للبغوی)

راقم کے نزدیک اقوال میں کوئی تعارض نہیں سب کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ کبیر میں یوں بیان کیا گیا ہے ''ابتهال'' کا ایک معنی ہے دعاء میں اجتہاد کرنا، لھذا ''ابتهل فی الدعاء'' اس وقت تک نہیں کہا جا سکے گا جب تک دعاء میں کوشش اور مبالغہ نہیں پایا جائے گا۔

دوسرا معنی ہے لعنت کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''علیه بهلة الله'' اس پر اللہ کی لعنت ہو، کیونکہ اس کا لغوی ہے چھوڑ دینا، اور دور کر دینا جیسا کہ کہا جاتا ہے ''ناقة باهل'' اونٹنی کھلی چھوڑی ہوئی، یعنی اسے باندھا ہوا نہیں، یہ معنی لغت میں بھی پایا گیا ہے۔ ''لان معنى اللعن هو الابعاد و الطرد'' اسلئے کہ لعنت کا معنی ہے ''دور کرنا، ہانکنا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے ''بهله الله ای لعنه و ابعده من رحمته'' بہلہ اللہ کا معنی لیا جاتا ہے اللہ تعالی اسے رحمت سے دور کرے، اس پر لعنت کرے۔ (کبیر)

''والاصل فی البهلة بالضم و الفتح فيه كما قيل اللعنة و الدعاء بها ثم شاعت فی مطلق الدعاء''

اصل میں ''بهلة'' (پیش اور زبر سے) کا معنی لعنت ہے اور لعنت کی دعاء ہے، لیکن پھر مطلقا دعاء کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (روح المعانی)

البتہ آیۃ کریمہ ''ابتہال'' لعنت کے معنی میں استعمال ہے جس پر آنے والے الفاظ گرامی ﴿فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ دلالت کر رہے۔ (کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نجران کے نصاری کا ایک وفد (جو ان کے چودہ سرکردہ

آدمیوں پر مشتمل تھا) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، ان میں ایک قبیلہ کا سردار تھا اور ایک عاقب یعنی قبیلہ کے سردار کا نائب تھا جو ان کا صاحب رائے بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا "اسلما" تم اسلام قبول کرلو، وہ کہنے لگے، ہم نے تو اسلام قبول کیا ہوا ہے، تو آپ نے فرمایا، تم نے اسلام قبول نہیں کیا ہوا۔ وہ کہنے لگے کیوں نہیں؟ ہم نے تو تم سے پہلے اسلام قبول کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے جھوٹ کہا ہے، تمہارے اسلام قبول کرنے میں تین چیزیں مانع ہیں، ایک تمہارا صلیب کی عبادت کرنا، دوسری چیز تمہارا خنزیر کا گوشت کھانا، اور تیسری چیز تمہارا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننا۔ انہوں نے کہا کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ بغیر باپ کے کوئی بچہ پیدا ہو؟ جب عیسیٰ علیہ السلام کا انسانوں میں کوئی باپ نہیں تو ان کا باپ (معاذ اللہ) خدا ہی ہوسکتا ہے۔ تو رب تعالیٰ آیۃ کریمہ ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ (الآیۃ) ﴾ کو نازل فرمایا کہ "عیسیٰ کی شان عجیبہ آدم کی حالت عجیبہ کی طرح ہے، گویا کہ عجیب چیز یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو عجیب ترین یعنی آدم علیہ السلام کا بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہونے سے تشبیہ دے کر سمجھایا، لیکن وہ لوگ سمجھنے کے بجائے یوں کہنے لگے "**ما نعرف ما تقول**" ہمیں تو پتہ نہیں چل رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس وقت آیۃ مباہلہ کو نازل کیا گیا۔

نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو کہا اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دلائل کو قبول نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے ساتھ مباہلہ کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا اے ابا القاسم ہم ابھی واپس جاتے ہیں علیحدہ ہوکر اپنے معاملہ میں غور فکر کرتے ہیں پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہم نے مباہلہ کرنا ہے یا نہیں، وہ علیحدہ ہوکر ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے، تاکہ ایک دوسرے کی تصدیق کر کے اتفاقی فیصلہ کرسکیں۔

اس قبیلہ کے سردار نے اپنے نائب کو کہا "**قد واللہ علمتم ان الرجل نبی مرسل**" تحقیق قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ بیشک یہ نبی مرسل ہے، اگر تم نے اس شخص پر لعنت کردی تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کے نبی پر لعنت بھیجی تو وہ تباہ و برباد ہوئی، ان کے چھوٹے اور بڑے تباہ و برباد ہوئے۔ "**فان انتم لن تتبعوہ وابیتم الا الف دینکم فواد دعوہ وارجعوا الی بلادکم**" اگر تم اللہ کے نبی کی تابعداری نہیں کرتے اور ماننے سے انکار کرتے ہو اور تمہیں اپنے دین سے الفت ہے تو اس شخص کو چھوڑ دو اور اپنے شہروں کی طرف لوٹ چلو۔

"**وقد کان رسول اللہ ﷺ خرج ومعہ علی والحسن والحسین وفاطمۃ فقال رسول اللہ ﷺ ان انا دعوت فامنوا انتم فابوا ان یلاعنوہ وصالحوہ علی الجزیۃ**"

رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ حضرت علی اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان حضرات کو فرمایا جب میں دعاء کروں تم آمین کہنا۔ لیکن نصرانیوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور حضور ﷺ سے جزیہ پر صلح کر لی۔ (روح المعانی)

مباہلہ کے متعلق چند روایات:

واخرج البخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابو نعیم فی الدلائل عن حذیفة ان لاعاقب والسید اتیا رسول اللہ ﷺ فاراد ان یلا عنہما فقال احدھما لصاحبہ لاتلا عنہ فواللہ لئن کان نبیا فلا عننا لانفلح نحن ولا عقبنا من بعد نافقالوا لہ نعطیک ما سألت فابعث معنا رجلا امینا فقال قم یا ابا عبیدة فلما قفا قال ھذہ امین ھذہ الامة"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں نجران کے وفد میں قوم کا ایک سردار اور ایک اس کا جانشین صاحب رائے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان سے مباہلہ کیا جائے یعنی اگر یہ دونوں جھوٹے ہیں تو ان پر لعنت کی جائے لیکن ان میں سے ایک شخص دوسرے کو کہنے لگا تو اس پر لعنت نہ کر، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر یہ شخص نبی ہوا اور اس نے ہم پر لعنت کر دی تو ہم کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اور نہ ہی ہمارے بعد ہماری نسل میں سے کوئی کامیاب ہوگا، تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا ہم آپ کو وہ چیز (بطور جزیہ) دیں گے جس کا آپ مطالبہ کریں گے، آپ ہمارے ساتھ ایک امین شخص کو بھیج دیں۔ تو آپ نے فرمایا اے ابو عبیدہ کھڑے ہو جائے جب وہ کھڑے ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ اس امت کا امین ہے۔ (منقول از در منثور)

خیال رہے بعض روایات میں "فلما قفا" کی جگہ "فلما قام" ہے، مطلب ایک ہی ہے، حدیث پاک سے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان سمجھ آئے گی کہ وہ کتنے خوش بخت انسان تھے جن کو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کا امین کہا۔

❁ واخرج الحاکم وصححہ وابن مردویة وابو نعیم فی الدلائل عن جابر قال قدم علی النبی ﷺ العاقب والسید فدعا الی الاسلام فقالا اسلمنا یا محمد قال کذبتما ان شئتما اخبرلکما بما یمنعکما من الاسلام قالا فھات قال حب الصلیب وشرب الخمر واکل لحم الخنزیر قال جابر فدعا ھما الی الملاعنة فوعداہ الی الغد فغدارسول اللہ ﷺ واخذبید علی وفاطمة والحسن والحسین ثم ارسل الیھا فابیا ان یجیباہ واقرالہ فقال والذی بعثنی بالحق لوفعلا لامطر الوادی علیھما نارا قال جابر فیھم نزلت تعالوا ندع ابناء نا وابنائکم الآیة قال جابر انفسنا وانفسکم رسول اللہ ﷺ علی وابناء نا الحسن

والحسین ونساء نا فاطمة"

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے پاس نجران کی قوم کا ایک سردار اور ایک اس کا جانشین صاحب رائے آیا، آپ نے ان دونوں کو دعوت اسلام دی، وہ دونوں کہنے لگے اے محمد ہم تو اسلام لا چکے ہیں آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں تمہیں کس چیز نے اسلام سے دور کر رکھا ہے، انہوں نے کہا ہاں آپ بتائیں، آپ نے فرمایا صلیب کی محبت اور شراب پینے اور خنزیر کے گوشت کھانے نے تمہیں اسلام لانے سے منع کیا ہوا ہے۔

حضرت جابر کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے انہیں مباہلہ کے متعلق فرمایا کہ آؤ جھوٹے پر لعنت کریں، انہوں نے کل کا وعدہ کیا (یعنی وہ سوچ کر بتائیں گے) کل صبح رسول اللہ ﷺ سے مباہلہ کیلئے گھر سے نکلے اور آپ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پکڑے (اور ساتھ لیا) پھر ان کی طرف پیغام بھیجا لیکن انہوں نے مباہلہ کے چیلنج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کیساتھ مبعوث فرمایا اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو اللہ تعالیٰ ان کی وادی پر آگ کی بارش برساتا، حضرت جابر کہتے ہیں ان بارے میں ہی یہ آیت تعالوا ندع ابناء نا (الآیۃ) نازل ہوئی۔ حضرت جابر کہتے ہیں "انفسنا" سے مراد نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور "ابناء نا" سے مراد حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں، اور "نساء نا" سے مراد حضرت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا ہیں۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج الحاکم وصححه عن جابر ان وفد نجران اتو االنبی ﷺ فقالوا ماتقول فی عیسی فقال هو روح الله وکلمته وعبدالله ورسوله قالواله هل لک ان نلاعنک انه لیس کذلک قال وذلک احب الیکم قالوانعم قال فاذاشئتم فجاء وجمع ولده الحسن والحسین فقال رئیسهم لا تلاعنوا هذالرجل فوالله لئن لاعنتموه لیخسفن باحدالفریقین فجاء وافقالوا یا ابا القاسم انما اراد یلا عنک سفهاء نا وانا نحب ان تعفینا قال قداعفیتکم ثم قال ان العذاب قد اظل نجران"

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں بیشک نجران کا وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو انہوں نے کہا تم عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، اور اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ کہنے لگے کیا ہم تمہارے ساتھ مباہلہ نہ کریں یعنی ہر فریق جھوٹے پر لعنت کرے کہ عیسیٰ اسطرح نہیں تھے، آپ نے فرمایا ٹھیک ہے مباہلہ کر لیتے ہیں میں تو پہلے ہی یہی چاہتا تھا، انہوں نے کہا ٹھیک ہے مباہلہ کرتے ہیں، آپ نے فرمایا جب چاہو

مباہلہ کرلو۔ آپ آئے اپنی اولاد میں سے امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو (اپنے ساتھ مباہلہ کیلئے) جمع کیا، لیکن ان کے سردار نے کہا اس شخص سے مباہلہ نہ کرو۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر تم نے اس شخص سے مباہلہ کیا تو دونوں میں سے ایک (جھوٹے) فریق کی شکل نے ضرور بگڑنا ہے (وہ سچے ہم جھوٹے ہیں) وہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے اے ابوالقاسم ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگوں نے آپ سے مباہلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا ہم یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف فرمادیں، آپ نے فرمایا میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ نجران کے لوگوں کے قریب عذاب آچکا تھا۔ (یعنی اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو تباہ و برباد ہو جاتے) (منقول از درمنثور)

❀ ابونعیم کی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ان پر آیۂ مباہلہ کو پیش فرمایا''

"فقالوا اخرنا ثلاثة ايام فذهبوا الى بنى قريظة والنضير وبنى قينقاع فاستشاروهم فاشاروا عليهم ان يصالحوه ولا يلاعنوه وهو النبى الذى نجده فى التوراة فصالحوا النبى ﷺ على الف حلة فى صفر والف فى رجب ودراهم"

تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تین دنوں کی مہلت دیں تو وہ بنی قریظہ بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودیوں کے پاس گئے اور مشورہ کیا تو انہوں نے ان کو نبی کریم ﷺ سے صلح کر لینے کا ارشارہ دیا کہ تم ان پر لعنت نہ کرنا کیونکہ وہ نبی ہیں ان کا تذکرہ ہم توراۃ میں پاتے ہیں (وہی اوصاف ان میں پائے گئے جو توراۃ میں مذکور ہیں) تو ان لوگوں نے یہود کے مشورہ سے نبی کریم ﷺ سے صلح کر لی کہ ہم ایک ہزار کپڑے کے جوڑے صفر میں ادا کریں گے اور ایک ہزار جوڑے رجب میں ادا کریں گے اور ساتھ ساتھ دراہم بھی دیں گے۔ (منقول از منثور)

❀ واخرج ابن ابى شيبة وسعيد بن منصور عبدبن حميد وابن جرير وابونعيم عن الشعبى قال كان اهل نجران اعظم قوم من النصارى قولا فى عيسى بن مريم فكانو ايجادلون النبى ﷺ فيه فانزل الله هذه الآيات فى سورة آل عمران "ان مثل عيسى عند الله" الى قوله "فنجعل لعنة الله على الكاذبين" فامر بملا عنتهم فواعدوه لفد فغدا النبى ﷺ ومعه الحسن والحسين وفاطمة فابوا ان يلاعنوه وصالحوه على الجزية فقا النبى ﷺ لقداتانى البشير بهلكة اهل نجران حتى الطير على الشجر لو تموا على الملاعنة"

شعبی بیان فرماتے ہیں کہ نصرانیوں میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بات کرنے میں اہل نجران عظیم قوم تھی، وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے "ان مثل عیسى عند الله كمثل آدم" سے

لے کر "فنجعل لعنة الله علی الکاذبین" تک آیات کریمہ کو نازل کیا، تو آپ نے ان کو مباہلہ کا حکم دیا کہ ہر فریق دعاء کرے اور جھوٹوں پر لعنت کرے، انہوں نے کل آنے کا وعدہ کیا، کل نبی کریم باہر تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ امام حسن اور امام حسین اور فاطمہ رضی اللہ عنہم بھی تھے" لیکن نجرانیوں آپ کے ساتھ مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور جزیہ دینے پر صلح کر لی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے بشارت مل چکی تھی کہ اگر نجرانیوں آپ سے مباہلہ کر لیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان علاقہ میں درختوں پر کوئی پرندہ بھی نہیں بچ سکے گا۔ (منقول از درمنثور)

❁ **واخرج عبد الرزاق والبخاری والترمذی والنسائی وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویه وابونعیم فی الدلائل عن ابن عباس "قال لو باهل اهل نجران رسول الله ا لرجعوا لا یجدون اهلا ومالا"**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر اہل نجران نبی کریم ﷺ سے مباہلہ کر لیتے تو وہ اپنے مال اور اپنی اہل نہ پاتے (یعنی سب کچھ تباہ و برباد ہو جاتا) (منقول از درمنثور)

مباہلہ کی ایک طویل روایت ابونعیم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی، اس میں یہ مذکور ہے۔

"وقد غدا رسول الله ﷺ محتضنا الحسین آخذا بیدالحسن وفاطمة تمشی خلفه وعلی خلفها وهو یقول اذادعوت فامنوا، فقال اسقف نجران یا معشر النصاری انی لاری وجوها لوسألوالله ان یزیل جبلا عن مکانه لازاله فلا تبتهلوا فتهلکوا ولا یبقی علی وجه الارض نصرانی الی یوم القیامة"

نصرانیوں نے مباہلہ کیلئے کل تک جب سوچنے کی مہلت طلب کی تو نبی کریم ﷺ کلہ باہر تشریف لے گئے، آپ کی بغل میں امام حسین تھے اور آپ نے امام حسن کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی حضرت فاطمہ کے پیچھے چل رہے تھے، آپ ان کو فرما رہے تھے میں جب دعاء کروں تو تم آمین کہنا، نجران کے سردار نے کہا اے نصرانیوں کے قبیلہ بیشک میں یہ چہرے جو دیکھ رہا ہوں اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ سوال کیا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا، اس لئے تم اس شخص سے مباہلہ نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، اور روئے زمین پر قیامت تک کوئی نصرانی باقی نہیں رہے گا۔

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے:

"قال ﷺ والذی نفسی بیده ان العذاب قدتدلی علی اهل نجران ولو تلاعنوا لمسخوا قردة وخنازیر ولا ضطرم علیهم الوادی نارا ولا ستاصل الله نجران واهله حتی الطیر علی الشجر ولما حال الحول علی النصاری کلهم حتی هلکوا وکذااخرج ابو نعیم فی الدلائل من طرق عن ابن عباس"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بیشک اہل نجران کے قریب عذاب آچکا تھا، اگر یہ میرے ساتھ مباہلہ کر لیتے تو بندر اور خنزیر بنا دئے جاتے، اور ان کو آگ کی وادی بھر کر جلا دیا جاتا، اللہ تعالی نجران اور ان کی اہل کو تباہ و برباد کر دیتا (ان کوی نحوست کی وجہ سے) پرندے بھی درختوں پر ہلاک ہو جاتے، (نبی کریم ﷺ کے مقابل آنے والے) ایک سال کے بعد تمام ہی ہلاک ہو گئے۔ (ماخوذ از مظہری)

مقام اہل بیت:

"وانما قدمهم في الذكر على النفس لينبه بذلك على لطف مكانهم وقرب منزلتهم"

نبی کریم ﷺ نے اپنے ذکر سے پہلے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا کیا تا کہ اس پر تنبیہ کی جا سکے کہ اہل بیت کا مرتبہ آپ کے قریب تھا اور آپ کو ان پر خصوصی لطافت و مہربانی حاصل تھی، امت مصطفیٰ ﷺ کیلئے یہی لازم ہے کہ وہ صحابہ کرام اور اہل بیت پر ایمان رکھے اور ان سے محبت رکھے ورنہ جہنم کی وادیوں میں ہی رہے گا۔

آیۂ مباہلہ سے حاصل ہوا:

وفيه دليل قاطع وبرهان واضح على صحة نبوة محمد ﷺ لانه لم يروا احد من موافق ومخالف انهم اجابوا الى المباهلة لانهم عرفوا صحة نبوته وما يدل عليها في كتبهم"

اس آیہ کریمہ سے قطعی طور پر ثابت ہوا، اور واضح دلائل سے یہ بات سامنے آئی کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت صحیح ہے، کیونکہ موافقین اور مخالفین سبھی نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ مباہلہ نہ کرو ورنہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے، اس کی وجہ یہی تھی کہ نصرانی جو ان کے موافق تھے وہ بھی اپنی کتاب سے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی حقانیت کو سمجھ چکے تھے، اور یہود جو ان کے مخالف تھے وہ اپنی کتاب تورات سے مصطفیٰ کریم ﷺ کی حقانیت کو پہچان چکے تھے۔ (خازن)

نبی کریم ﷺ نے بیٹے کیسے کہا جبکہ وہ نواسے ہیں:

بظاہر وہم یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، ماں کی طرف نہیں، اگر کوئی ہاشمی شخص رومی یا حبشی عورت سے نکاح کرے اور اس سے اولاد پیدا ہو تو وہ اولاد باپ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہاشمی کہلائے گی رومی یا حبشی نہیں کہلائے گی، اسی وجہ سے امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ میری موت کے بعد یہ میرا مال میری اولاد کو دے دینا، اگر اس کی اپنی (صلبی) اولاد نہیں بلکہ اس کے پوتے اور نواسے ہوں تو وہ مال اس کے پوتوں کو ملے گا نواسوں کو نہیں، ایک شاعر نے بھی یوں کہا:

بنونا بنو ابنائنا وبناتنا   بنوهن ابناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے، ہمارے پوتے نواسے سبھی اپنے آباء کی طرف منسوب ہیں خواہ وہ بعید خاندان کے ہی ہوں۔

تو نبی کریم ﷺ نے اپنے نواسوں کو "ابنائنا" ہمارے بیٹے، کیسے کہا؟

تو اس کا جواب یہ ہے:

"فنسبة الحسن والحسين رضى الله عنهما الى النبى ﷺ بالبنوة على الاطلاق مخصوص بها لا يدخل فيه غيرهما"

کہ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو جو نبی کریم ﷺ نے اپنا بیٹا کہا تو یہ آپ کی خصوصیت ہے، ان دونوں حضرات کے بغیر اور کسی کو شرف حاصل نہیں۔

اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

"كل سبب ونسب منقطع يوم القيامة الاسببى ونسبى"

ہر سبب اور نسب قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا سوائے میرے سب اور میرے نسب کے

ہاں البتہ باقی لوگوں کا قانون یہی ہے:

"وان غيرهما من الناس انما ينسبون الى الآباء وقومهم دون قوم الام"

نبی کریم ﷺ کے نواسوں کے بغیر تمام لوگوں کیلئے یہی قانون ہے کہ وہ اپنے اپنے باپ اور اس کی قوم کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اپنی ماؤں کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ (ماخوذ از احکام القرآن للجصاص)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

عام طور پر ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو اور حسنین کریمین کو ساتھ لیا، اور باقی بیٹیوں اور نواسوں کو ساتھ کیوں نہ لیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تین احتمال ہیں ایک تو یہ کہ مباہلہ کے وقت باقی بیٹیوں کو اس لئے ساتھ نہ لیا ہو کہ وہ وفات پا چکی ہوں، لیکن جواب اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ مباہلہ کا واقعہ ۹ھ کے آخر کا ہو، کیونکہ حضرت رقیہ کی وفات ۲ھ کو ہے، اور حضرت زینب کی وفات ۸ھ کو ہے، اور حضرت ام کلثوم کی وفات ۹ھ کو ہے۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مباہلہ کے وقت باقی بیٹیاں مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ میں نہ پہنچیں ہوں) یہ جواب قوی ہو سکتا ہے، کیونکہ مفسرین کرام کے اقوال سے یہی پتہ چلتا ہے کہ مباہلہ کا واقعہ مدینہ طیبہ میں آنے

کے بعد جلدی ہی در پیش آیا۔ **تیسرا جواب** یہ ہوسکتا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ اس لئے لیا ہو کہ وہ سب سے زیادہ پیاری ہوں، چونکہ عام عادت یہی ہے کہ چھوٹی اولاد پیاری ہوتی ہے۔ (ماخوذ از نعیمی بالوضاحت)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا علی تھا جو حد بلوغ تک پہنچ کر فوت ہو گیا، البتہ ان کی بیٹی امامہ تھیں جن سے نبی کریم ﷺ کو بہت پیار تھا، یہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت رقیہ کا صرف ایک بیٹا تھا جو دو سال کا ہو کر فوت ہو گیا۔ اور حضرت ام کلثوم کی کوئی اولاد نہیں تھی، البتہ بعض حضرات نے کہا دو بیٹے پیدا ہوئے لیکن بچپن میں ہی فوت ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ خاندان سادات حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہے۔ کیونکہ باقی بیٹیوں کی آگے نسل چلی ہی نہیں۔ (ماخوذ از مدارج النبوت بوضاحت)

مسئلہ: نبی کریم ﷺ کی امت کو مباہلہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ مباہلہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب دوسرے شخص کا جھوٹا ہونا قطعی ہو، اس کا علم حضور ﷺ کو تھا عام آدمیوں کو قطعی علم حاصل نہیں ہوتا، البتہ امت کے افراد کو لعان کی اجازت دی گئی۔ یعنی جب خاوند اپنی زوجہ کو تہمت لگائے زنا کی اور گواہ نہ پیش کر سکے اور عورت اقرار بھی نہ کرے تو اس وقت مرد چار مرتبہ اپنے سچے ہونے کی قسم اٹھاتا ہے اور پانچویں مرتبہ کہتا ہے اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو، اور اس کے جواب عورت چار مرتبہ قسم اٹھا کر کہتی ہے یہ جھوٹا ہے، اور پانچویں مرتبہ کہتی ہے اگر یہ سچا ہوں تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو، یہ ہے لعان جواب بھی جائز ہے، اور لعان کے بعد زوجین کے درمیان تفریق کر دی جاتی ہے، زیادہ تفصیل سورۃ نور میں موجود ہے۔ (ماخوذ از نعیمی وصاوی بوضاحت)

البتہ بعض فرقہ نواصب نے کہا ہے جب دوسرے کا جھوٹا ہونا یقینی ہو تو مباہلہ کیا جا سکتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)

لیکن یہ قول جمہور کے مخالف ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۝﴾

(آیة نمبر ۶۲)

(1) یہی بیشک سچا بیان ہے اور اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور بیشک اللہ ہی غالب ہے حکمت والا.

(2) بیشک یہی واقعات ہیں حق ،اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بیشک اللہ ہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔

"ھـــذا" کے اشارہ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ اشارہ قرآن پاک کی طرف ہو، تو معنی یہ ہوگا بیشک یہ قرآن ہے، وہ حق بیان ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس میں واقعات حق ہیں. (قرطبی)

ایک اور احتمال یہ ہے کہ "ھذا" کا اشارہ ہو "المذکور فی شان عیسی علیہ السلام قالہ ابن عباس" المذکور کی طرف تاویلا ،یعنی عیسی علیہ السلام کی شان میں جو واقعات مذکر ہو چکے ہیں" المذکور " یا "ما ذکر" یا "ما قصص " کے الفاظ مفسرین کرام نے "ھذا" مفرد مذکر ہونے کی وجہ سے بیان کئے ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"ان" حرف تحقیق مشبہ بالفعل ہے۔"ھذا" اسم ان ہے،"القصص" موصوف "الحق" صفت، موصوف ملکر خبر ان، درمیان میں "لھو" میں لا تاکید کیلئے اور "ھو" ضمیر فصل حصر اضافی کیلئے ہے، جیسا کہ قانون ہے کہ مبتداء اور خبر جب دونوں معرفہ ہوں تو درمیان میں ضمیر فصل حصر کیلئے آتی ہے۔اب معنی یہ ہوگیا "ان ھذا ھو الحق" بیشک یہی حق ہے، یعنی عیسی علیہ السلام کے واقعات جو قرآن پاک میں موجود ہیں وہی حق ہیں۔

حصر اضافی ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرآن پاک میں مذکور عیسی علیہ السلام کے واقعات حق ہیں اور باقی قرآن میں مذکور آیات حق نہیں، معاذ اللہ یہ مطلب نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے:

"ان ھذا لھو الحق لا مایدعیہ النصاری من کون المسیح علیہ السلام الھا او ابن اللہ سبحانہ وتعالی عما یقولہ الظالمون علوا کبیرا"

کہ بیشک عیسی علیہ السلام کے واقعات جو قرآن پاک میں مذکور ہیں وہی حق ہیں، وہ واقعات حق نہیں جو نصارانیوں نے بیان کئے ہیں کہ عیسی علیہ السلام معبود یعنی خود خدا تھے اور اللہ کا بیٹا تھے یہ ان کے اقوال باطل تھے اسلئے کہ ان ظالموں کے

اقوال سے اللہ تعالیٰ پاک و بلند ہے، کیونکہ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کی اولاد ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

طلباء کرام یہ بھی خیال میں رکھیں:

کہ اگر ''ھذا'' کا اشارہ قرآن پاک کی طرف ہو تب بھی حصر اضافی پائی جائے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ بیشک یہ قرآن ہی حق ہے، یہود و نصاریٰ کے اقوال باطل ہیں، ان کی تحریف شدہ انجیلیں اور توراۃ باطل ہیں۔

حصر اضافی کا یہی فائدہ ہے کہ وہ حقیقی انجیل اور توراۃ جو رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، ان کا باطل ہونا نہیں ثابت ہوگا وہ حق ہیں، البتہ قرآن پاک کے نازل ہونے اور نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) کے ساتھ پہلی کتب منسوخ ہوگئیں۔

''**القصص**'' کا معنی ہے واقعات، عام طور ''قص یقصه قصاء قصصا'' کا معنی آتا ہے بیان کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے ''قص فلان الحدیث'' فلاں نے کلام بیان کیا، یا فلاں نے حدیث بیان کی، اصل معنی اس کا ہے کسی کے پیچھے چلنا، کسی کی تابعداری کرنا، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی اور موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے جو کلام کیا رب تعالیٰ نے اس کی حکایت بیان کی ﴿وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ﴾ اور اس (موسیٰ علیہ السلام کی ماں) نے کہا اس کی بہن کو اس کے پیچھے پیچھے چلو (کہ یہ صندوق جس میں موسیٰ علیہ السلام کو بند کر کے دریا میں ڈالا گیا یہ کدھر جاتا ہے)

قصہ اور واقعہ بیان کرنے والے کو ''قاص'' کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک خبر کے پیچھے دوسری خبر لاتا ہے۔

''فمعنی القصص الخبر المشتمل علی المعانی المتتابعة'' یہاں ''**قصص**'' کا معنی یہ ہے کہ وہ خبر جو پے در پے معانی پر مشتمل ہوا سے ''قصص'' کہا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔''

ان الفاظ مبارکہ سے ان نصاریٰ کا بھی رد ہو گیا جو تین خدا مانتے ہیں اور ان کا بھی رد ہو گیا جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں، ضمناً ان کا بھی رد ہو گیا جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں کیونکہ خدا تو وہی ہے جو ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ ہے، یعنی اولاد سے پاک ہے اور والدین سے بھی پاک ہے، ماں، باپ اور اولاد ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، رب تعالیٰ احتیاجی سے پاک ہے، جہاں توالد و تناسل (سلسلہ اولاد پائے) پایا جائے وہاں حدوث ہو گا، رب تعالیٰ حادث ہوگا،، اور مشرکین کا بھی رد ہو گیا، غرضیکہ رب تعالیٰ کو معبود حقیقی وحدہ لا شریك له نہ ماننے

والے تمام فرقوں کا اس آیۃ کریمہ سے رد کر دیا گیا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**من**" زائد ہے، صلہ پر داخل ہونے والا "**من**" زائد ہوتا ہے "من زائدہ کما ھو شان الصلات" (صلہ کا اصطلاحی معنی موصول وصلہ والا نہ سمجھنا بلکہ لغوی معنی سمجھنا) "**الٰہ**" نکرہ ہے، نکرہ تحت النفی آجائے تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے، لھذا معنی واضح ہو گیا، کہ کوئی ایک بھی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝﴾ "بیشک اللہ ہی غالب (اور حکمت والا ہے۔"

"**العزیز**" ای الغالب غلبة تامة" العزیز" کا معنی ہے" وہ غالب جس کو کامل غلبہ حاصل ہو"

"**العزیز**" ای القادر قدرة تامة" العزیز کا معنی ہے وہ قادر جسے قدرت کاملہ حاصل ہو"

"**العزیز**" ھوالذی لانذیرلہ" العزیز کا معنی وہ (عزت والا) جس کی کوئی نظیر نہ ہو، بلکہ ہر صفت میں نظیر سے پاک "العزیز" ہے۔

"**الحکیم**" ای المتقن فیما صنع اوالمحیط بالمعلومات "الحکیم" کا مطلب ہے" وہ ذات جسے اپنی صنعت میں پختگی اور یقین حاصل ہو، اور وہ ذات جسے اپنی معلومات پر احاطہ حاصل ہو" (روح المعانی)

جب معنی کیا جائے" حکمت والا" تو یہ معانی خود بخود اس میں سمٹ کر آجاتے ہیں، ان الفاظ مبارکہ سے بھی باطل فرقوں کا رد کر دیا گیا کہ "اللہ" وہی ہے جو غالب (اور) حکمت والا ہے، جسے غلبہ کاملہ حاصل نہیں، جسے قدرت کاملہ حاصل نہیں، جو بے نظیر بے مثل نہیں، اور جو حکمت والا نہیں، جسے اپنی صنعت میں پختگی حاصل نہیں، اور جسے اپنی معلومات پر احاطہ حاصل نہیں وہ معبود بننے کے لائق بھی نہیں۔ لھذا ان صفات کاملہ مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ معبود حقیقی ہے وہی وحدہ لاشریک لہ ہے۔

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

اصل میں مبتداء پر لام داخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے لام ابتداء کہا جاتا ہے، پھر وہی لام تاکید کیلئے خبر پر داخل ہوتا ہے لیکن جب مبتداء اور خبر کے درمیان ضمیر فصل نہ ہو، اگر ضمیر فصل ہو تو وہی لام ضمیر فصل پر داخل ہوتا ہے، اسی وجہ سے "لھو" میں ضمیر فصل پر لام داخل ہے۔ (مظہری)

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۳)

(1) پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ فسادیوں کو جانتا ہے۔

(2) پھر اگر وہ پھر جائیں تو بیشک اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو۔

قرآن تیری عظمت پہ قربان:

بظاہر آیۃ کریمہ بڑی مختصر اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی بڑا مختصر اور جامع و مانع، لیکن یہ آیۃ کریمہ عظیم مطالب کو حاوی ہے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ ''اگر وہ پھر جائیں''

''تـولـوا'' میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ماضی کا صیغہ ہو اور دوسرا یہ کہ مضارع کا صیغہ ہو، اصل میں تتولوا ہو ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہو، اور آخر سے نون اعرابی ''ان'' شرطیہ کی وجہ سے محذوف ہو، تاہم ''ان'' کی وجہ سے معنی دونوں صورتوں میں مستقبل کا ہوگا۔ (از روح المعانی)

اگر وہ پھر جائیں کس چیز سے پھرنا مراد ہے؟

''فان تولوا عن الحجج و اعرضوا عن التوحید'' ''اگر وہ دلائل سے اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے پھر جائیں۔ (مظہری)

(فان تولوا عن ذلک الی غیرہ) ہم نے جو واقعات حق بیان کئے ہیں ان سے اگر یہ اعراض کریں اور غیر راہ یعنی باطل راہ پر چلیں۔ (صابونی)

(فـان تـولـوا)ای اعـرضـوا عن قبول التوحید و الحق الذی قص علیک بعد ما عاینوا تلک الحجج النیرۃ و البراھین الساطعۃ''

اگر وہ توحید کے قبول کرنے سے اعراض کریں، اور وہ حق جو آپ پر بیان کیا اس کا روشن دلائل اور روشن وقوی براھین کو دیکھنے کے باوجود پھر جائیں۔ (روح البیان)

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ﴾ ''تو بیشک اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو''

یعنی اگر وہ حق راہ سے پھر جائیں تو وہ فسادی ہیں، آپ ان سے اعراض کریں، ان سے کلام منقطع کریں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ (روح البیان)

وہ فسادی کیوں ہیں؟ اسلئے کہ وہ آفاق میں کفر ومعاصی پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں، اور ان کے نفسوں میں منعم ذات کی نعمتوں کا کفران (ناشکری) پایا جاتا ہے، اور وہ شکر کو چھوڑنے والے ہیں اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرنے والے ہیں، اسلئے وہ عذاب کے مستحق ہیں۔

"وفیه اشارة الی ان التولی عن الحق افساد" "والله اعلم"

اس آیۃ کریمہ میں اشارہ پایا گیا ہے، اس طرف کہ حق سے پھرنا حقیقت میں فساد پھیلانا ہے۔ (مظہری)

(فان الله علیم بالمفسدین) وعیدلهم بالعذاب المذکور فی قوله زدنا هم عذابا فوق العذاب بما کانو ایفسدون"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ﴾ (تو بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو) میں وعید (عذاب کی دھمکی) پائی گئی ہے، دوسری آیۃ کریمہ میں فساد پھیلانے والوں کے عذاب کا ذکر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ﴾ ہم زیادہ کرتے ہیں عذاب اوپر عذاب کے بوجہ اس کے کہ وہ فساد پھیلاتے تھے۔ " (مدارک)

آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے قطع تعلق کرنی ضروری ہے، یہ قطع تعلق واجب ہے اور اس میں ثواب ہے، مومنوں اور نیک آدمیوں تین دنوں سے زیادہ قطع تعلق ناجائز ہے۔ اور مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حق سے پھرنے والے، بے دین خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے باغی فسادی ہیں، حق راہ پر چلنے والے شریف ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۴)

(1) تم فرماؤ اے کتابیو ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے یہ کہ عبادت نہ کریں مگر خدا کی اور اس کا شریک کسی کو نہ کریں اور ہم میں کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنا لے اللہ کے سوا پھر اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

(2) آپ فرما دیں، اے اہل کتاب آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو برابر ہے ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یہ کہ نہ عبادت کریں ہم سوائے اللہ کے، اور نہ شریک ٹھہرائیں ہم اس کے ساتھ کسی چیز کو، اور نہ بنائے ہمارا بعض بعض کو رب سوائے اللہ کے، پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو "تم گواہ رہو بیشک ہم مسلمان ہیں۔

یہ خطاب عام ہے تمام اہل کتاب کو ہے خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی، یا ان کے متبعین ہوں، یعنی مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر یہودیوں کے طرز عمل پر کام کر رہے ہوں۔ (صابونی)

طلباء کرام تفسیر صابونی کی عبادت بھی یاد کر لیں:

"هذا الخطاب يعم اهل الكتاب من اليهود والنصارى ومن جرى مجراهم"

شان نزول :

جب نجران کا وفد مدینہ طیبہ میں آیا تو وہ یہود کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوئے لیکن مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصاری کا حضرت ابراھیم علیہ السلام کے متعلق اختلاف ہو گیا نصرانی کہنے لگے ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے ہم ان کے دین پر ہیں اور سب لوگوں سے ہم ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب ہیں اور یہودیوں نے کہا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے ہم ان کے دین پر ہیں اور سب لوگوں سے ہم ابراہیم علیہ السلام کے قریب ہیں۔

"فقال رسول كلا الفريقين برى من ابراهيم ودينه بل كان حنيفا مسلما وانا على دينه فاتبعوا دينه الاسلام"

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں فریق ہی ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رائے یہ رکھتے ہیں کہ ہم ان کے دین پر ہیں ان کا دین یہی تھا جو ہمارا دین ہے، حالانکہ آپ تو ان دینوں سے جدا ہو کر اسلام پر قائم تھے (یعنی افراط وتفریط کے درمیان دین اسلام پر قائم تھے) میں ان کے دین پر ہوں تو تم لوگ ان کے دین اسلام کی تابعداری کرو۔

ضمناً واضح کر دیا کہ اگر تم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اچھا اعتقاد اور اچھی رائے رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو اور دین اسلام پر قائم ہو جاؤ، کیونکہ آپ کا اسلام تھا، اور میں ہی ان کا متبع ہوں، تم ان کے متبع نہیں، تمہارا دعوی جھوٹا ہے۔

"فقالت الیہود ماترید الاان نتخذک ربا کما اتحذت النصاری عیسی ربا"

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بعد یہود نے کہا، تم صرف یہی کہتے ہو کہ تمہیں رب مان لیں، جیسا کہ نصرانیوں نے عیسی کو رب مان لیا ہے۔

"وقالت النصاری یا محمد ما ترید الاان نقول فیک ماقالت الیہود فی عزیر"

اور نصرانیوں نے کہا اے محمد تم تو صرف یہی چاہتے ہو کہ ہم تمہارے متعلق وہی کچھ کہیں جو یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق کہا تھا (کہ وہ خدا کا بیٹا ہے)

اسی وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی ﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ﴾ فرمادو اے اہل کتاب ایک کلمہ کی طرف آجاؤ جو برابر ہو ہمارے اور تمہارے درمیان آگے اسی کلمہ کی وضاحت کردی کہ وہ کلمہ یہ ہے ﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـٴًـا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ یہ کہ ہم نہ عبادت کریں سوائے اللہ کے، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ بنائے بعض ہمارا بعض کو رب سوائے اللہ کے۔

مطلب واضح ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے (معاذ اللہ) اللہ کا بیٹا یا اللہ کہا جائے، میں تو وہی چاہتا ہو جو میرا رب تعالی چاہتا ہے ہاں رب قدوس نے ہی تو فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کلمہ کی دعوت دوں جو حقیقت میں ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہی ہے کہ آؤ ہم سب ایک ہی ذات اللہ تعالی کی عبادت کریں، اور آؤ اس بات میں ہمارا اتفاق ہو جائے کہ ہم میں سے کوئی ایک فریق بھی اپنے ہی آدمیوں کو رب نہ بنا بیٹھے، ان باتوں میں اتفاق ہو جائے تو جھگڑے سب ختم ہو جائیں، تم اپنے باطل عقیدہ پر بھی قائم رہو، دین اسلام کی بھی مخالفت کرتے رہو، اپنی مرض کے مطابق ڈگڈگی بجاتے رہو اور یہ بھی تصور کرو کہ ہم تمہارے تابع ہو جائیں گے اور ہم تمہارے باطل عقائد

میں تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں گے تو یہ تمہارا تصور غلط ہوگا، حق تو یہی ہے کہ تم رب تعالیٰ کے پیش کردہ قانون اور متفق ہونے کیلئے لائحہ عمل کے مطابق اسلام قبول کرلو، گویا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایمان قبول کرلیں تو بہتر ورنہ اے نبی کریم اور مؤمنین تم ان سے یہ کہو ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ بن جاؤ بیشک ہم مسلمان ہیں یعنی جس چیز کا تم نے ان کو حکم دیا ہے اگر وہ اسے تسلیم نہ کریں اور اس سے پھر جائیں تو تم ان کو کہہ دو کہ اگر تم ایمان نہیں لاتے تو ہمارے اسلام اور ایمان اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو خلوص سے ماننے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے پر گواہ بن جاؤ۔ (ماخوذ از خازن)

کلمہ سے مراد کیا ہے:

اس مقام پر کلمہ سے مراد نحوی کلمہ نہیں کہ نحویوں کے نزیک کلمہ مفرد کو کہا جاتا ہے وہ مرکب کا مقابل ہوتا ہے، اسم ہو یا فعل ہو یا حرف، بلکہ اس مقام پر کلمہ سے مراد یہ ہے:

"والعرب تسمی کل قصة لها شرح کلمة ومنه سمیت القصیدة کلمة" (معالم التنزیل للبغوی)

عرب ہر قصہ جس کی شرح ووضاحت پائی جائے یعنی طویل اور واضح قصہ کو کلمہ کہتے ہیں، اور قصیدہ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر کلمہ سے مراد یہی ہے کہ آؤ ایک بات پر متفق ہو جائیں، اس کے بعد اس کی وضاحت کردی اگرچہ وہ تینوں جملے مفیدہ ہیں۔

خیال رہے کہ ﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ کا خطاب یہود ونصاری دونوں فریقوں کو ہے جیسا کہ شان نزول سے واضح ہے کہ دونوں فریقوں نے جب نبی کریم ﷺ کو کہا تم تو چاہتے عیسی علیہ السلام کی طرح تمہیں خدا مانا جائے یہ یہود کا قول تھا، اور نصاری کا قول تھا کہ تم تو چاہتے ہو تمہیں عزیر کی طرح خدا کا بیٹا مانا جائے تو ان دونوں فریقوں رد میں آیۂ کریمہ نازل ہوئی تو خطاب بھی دونوں فریقوں کو ہے، اگرچہ بعض مفسرین کرام نے خطاب کو نجران کے نصرانیوں کے وفد سے خاص کیا ہے، لیکن راقم کو وہی قول پسند ہے جس میں خطاب کو عام رکھا گیا ہے جو یہود ونصاری دونوں کو شامل ہے۔

"سواء" عدل بیننا وبینکم مستویة ای امر مستو" یعنی "سواء" کا ایک معنی ہے برابر ہونا، عام طور پر "سواء" استواء کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ "مستوی" کا معنی "برابر ہونا" مشہور ومعروف ہے۔ "سواء" انصاف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "دعا فلان الی السواء الی النصفة" فلاں شخص نے انصاف کی طرف بلایا، اور "سواء" کا معنی وسط بھی آتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"سواء کل شئی وسطه" ومنه قوله "فَرَآهُ فِيْ سَوَاءِ الْجَحِيْمِ"

ہر چیز کے وسط کو "سواء" کہا جاتا ہے، قرآن پاک کی اس آیۃ کریمہ میں "سواء" کا معنی برابر ہے۔

"سواء" مصدر بمعنی مستوية ای" لا يختلف فيها التوراة والانجيل والقرآن اولا اختلاف فيها بكل الشرائع"

"سواء" مصدر ہے، "مستوية" کے معنی میں استعمال ہے، یعنی اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یعنی توراۃ وانجیل اور قرآن میں سے کسی ایک کا اختلاف نہیں، سب کا اتفاق ہے، اور سب ہی برابر طور پر اس پر متفق ہیں کہ عبادت صرف اللہ کی ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ ہی بندوں میں سے کوئی رب ہے۔ بلکہ اس مسئلہ میں کسی شریعت میں بھی کوئی اختلاف نہیں، اور نہ ہی کسی شریعت میں اس کے خلاف حکم دیا گیا ہے۔ (روح المعانی)

بعض کا بعض کو رب نہ بنانے کا کیا مطلب؟

اس کا مطلب یہ ہے:

(ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون) كما اتخذتم الاحبار والرهبان" (جلالین)

اور نہ بنائے ہمارا بعض بعض کو رب سوائے اللہ کے جیسا کہ تم نے اپنے علماء اور پادریوں کو اپنا رب بنالیا ہے۔ وہ لوگ اپنے علماء اور پادریوں کو اپنا رب بنالیا ہے۔ وہ لوگ اپنے علماء اور پادریوں کو کس طرح رب مانتے تھے، اس پر تفسیر صاوی کی ایک تحقیقی عبارت کو دیکھئے جس سے بے دین دہریوں کا بھی رد ہو جائے گا اور جھوٹے پیروں اور ان کے مریدوں کا بھی رد ہو جائے، حقیقی طور پر سچا عقیدہ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

"كما اتخذتم الاحبار" اى وهم علماء اليهود والرهبان عباد النصارى واتخاذهم اربابا من حيث انهم ينسبون التحليل والتحريم والاقالةمن الذنوب لهم ولا يتبعون ما انزل الله بل المدارعندهم على ما حللته الاحبار والرهبان اوحرموه ،وهذه الآية وان كانت خطاباللیهود والنصارى الاانهاتجرى بذيلها على من يشرك بالله غيره من المسلمين كضعفاء الايمان الذين يعتقدون فى الاولياء انهم يضرون وينفعون بذواتهم ويحلون ماحرم الله ويحرمون ما احل الله ومع ذلك يحدثون بدعا عظيمة ماانزل الله بهامن سلطان ويجعلون تلك البدع طرقالهؤلاء الاولياء ويزعمون انهامنجية وان كانت مخالفة للشرع ويحسبون انهم على شئ الاانهم هم الكاذبون استحوذعليهم الشيطان فانساهم ذكر الله

اولئک حزب الشیطان الاان حزب الشیطان هم الخاسرون "

آیۂ کریمہ میں خطاب یہود ونصاری کو ہے لھذا ﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (اور نہ بنائے بعض ہمارا بعض کو رب سوائے اللہ کے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بغیر تم نے علماء کو رب بنایا ہوا ہے، ان کی ربوبیت سے باز آجاؤ، ہم نے تو کسی عالم کو رب نہیں مانا ہوا تو خود بخود اس پر عمل ہو جائے گا، کہ " بعض ہمارا بعض کو رب نہیں مانے گا سوائے اللہ کے" اسی طرح تم اپنے راہبوں یعنی پادریوں کو خدا مانتے ہو، اسے چھوڑ دو صرف رب تعالی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔

وہ لوگ علماء اور راہبین کو کس طرح رب مانتے تھے؟:

وہ اس طرح رب مانتے تھے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ راہب حضرات اور علماء جس چیز کو حلال کریں وہی حلال ہوتی ہے، اور جس چیز کو حرام کریں وہ حرام ہو جاتی ہے، اور یہ لوگ ہمارے گناہوں کو ہم سے دور کر دیتے ہیں، اور وہ یہود ونصاری ان احکام پر عمل نہیں کرتے تھے جو اللہ تعالی نے نازل کئے بلکہ ان کی دار و مدار صرف علماء اور راہبوں پر ہوتی، ان چیزوں کو ہی یہ حرام سمجھتے تھے جن کو ان کے علماء اور راہب حرام کہتے ہیں، اور ان چیزوں کو ہی حلال سمجھتے ہیں جن کو ان کے علماء اور راہب حلال کہتے ہیں۔

علماء سوء اور علماء حق میں فرق واضح ہو گیا:

وہ علماء کرام ہی علماء حق ہیں جن کو "العلماء ورثة الانبياء" کا شرف حاصل ہے، یعنی وہ انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان کا کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جن چیزوں کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ چیزیں حلال ہیں، اور جن چیزوں کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے وہ ان کو حرام سمجھتے ہیں۔ علماء سوء وہ لوگ ہیں جو مفاد پرست ہوتے ہیں، حکومتی ٹٹو ہوتے ہیں، حکام کے خوشامدی ہوتے ہیں۔ اور پیسے دینے والوں کو چاپلوسی کرتے ہیں، ان لوگوں کو دنیاوی مال عزیز ہوتا ہے، وہ اسی دنیاوی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں، حکام صحیح کہیں یا غلط کہیں یہ علماء سوء اسی ہاں میں ہاں ملائیں گے، ان کے نزدیک حق و باطل میں فرق کرنا کوئی چیز نہیں، وہ ہر چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔

آیئے آیئے قارئین کرام! خود فیصلہ فرمائیں کون سے علماء حق ہیں اور کون سے علماء سواء ہیں۔ اگر حکام یہ کہیں

کہ قرآن پاک سے جہاد کی آیات کی وضاحت لوگوں کے سامنے نہیں کرنی اور جہاد کے متعلق کوئی تقریر نہیں کرنی ،اور دینی مدارس کے کورس سے جہاد کی آیات اور احادیث کو نکالنا ہے تو علماء سوء کہیں گے ہاں یہی درست ہے ،لیکن علماء حق کہیں گے نہیں نہیں ہم یہ نہیں مانتے ،ہم قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں ترمیم کر کے کفر مول نہیں لیتے۔

اسی طرح اگر روشن خیالی سائنسی ترقی ہو تو اس کا کوئی عالم دین مخالف نہیں ،اگر روشن خیالی بے حیائی کا نام ہو یعنی مخلوط تعلیم اور ایسی محافل کا قیام جہاں عورتوں کو گانا گانے اور ناچ کرانے کیلئے بلایا جائے ،مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محافل جہاں عورتوں کے سر اور گریبان کھلے ہوں اور بازو ننگے ہوں تو اس روشن خیالی کو علماء سوء تعریفی کلمات سے یاد کریں گے کہ ہاں ہمارے حاکم صاحب نے جو فرمایا ہے کہ ساری قوم روشن خیال ہو جائے ہاں یہی ٹھیک ہے ،سب روشن خیال ہو جاؤ یعنی سب بے حیاء ہو جاؤ۔لیکن علماء حق کہیں گے نہیں نہیں ،یہ روشن خیالی جو حقیقت میں بے حیائی ہے وہ تو ہم جائز نہیں کہتے البتہ سائنسی ترقی کریں ،ایٹم بم بنائیں یا میزائل بنائیں ہم اس کی تعریف کریں گے۔

حقیقی ولیوں اور بناوٹی پیروں اور ان کے پیروکاروں میں فرق:

اگر چہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب تو یہود ونصار کو ہے لیکن ضمنا یہ بھی سمجھ آ گیا جو لوگ ضعیف ایمان رکھتے ہیں ،دین کی ان کو واقفی نہیں ہوتی ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ولی اللہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ذاتی طور پر نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں ،اور جس چیز کو اللہ تعالی حرام کرے یہ اسے حلال کر لیتے ہیں ،اور جسے رب حرام کر لے یہ اسے حلال کر لیتے ہیں ،یہ عقائد ونظریات بے دین لوگوں کے ہیں۔دیندار لوگ صاف ستھرا عقیدہ رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کا کوئی ولی بلکہ کوئی نبی اور کوئی رسول ذاتی طور پر نفع ونقصان کے مالک نہیں ،البتہ اللہ تعالی کی عطاء سے ان کو ان تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے کہ ان کی تابعداری کرنے والوں کو اللہ تعالی نفع پہنچاتا ہے ،ان کی مخالفت کرنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے ،نفع ونقصان سے مراد دنیاوی مال ودولت نہیں بلکہ دینی اور اخروی نفع ونقصان مراد ہے۔

اور دیندار لوگ اور صحیح عقیدہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ اللہ کے اولیاء تو وہ ہیں جو لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کا حکم دیتے ہیں ،اس راہ پر لوگوں کو چلاتے ہیں جسے اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے "صراط مستقیم" کہا ہے۔اللہ تعالی کے ولی اسی چیز کو حلال سمجھتے ہیں جسے رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا ہے ،اور اسی چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے۔

اسی طرح جھوٹے اور بے دین لوگ شریعت کے خلاف نئے نئے کام ایجاد کر کے اولیاء کرام کی طرف

منسوب کر دیتے ہیں کہ یہی کام ذریعہ نجات ہیں باوجود اس کے کہ وہ کام خلاف شرع ہوں، ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں، ان کے نظریات باطل ہیں، ان پر شیطان غالب آچکا ہے، شیطان نے ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے دور کر دیا ہے، وہ شیطانی گروہ ہیں، خبردار شیطانی گروہ خسارے میں ہے، یعنی واضح ہوا کہ اللہ کے ولی خود بھی "صراط مستقیم" پر قائم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کا ولی خلاف شرع کاموں کا حکم دے۔ (صاوی مع وضاحت)

نبی کریم ﷺ کا مکتوب اور اس پر ردعمل:

اس آیۃ کریمہ کے نازل ہونے بعد نبی کریم ﷺ نے دوسرے ممالک میں اہل کتاب سربراہان مملکت کو خطوط لکھے، ان میں سے ایک خط اور اس کا ردعمل مسلم شریف سے ذکر کیا جارہا ہے، اگرچہ بخاری میں ذکر کچھ اور طویل ہے:

❁ عن ابن عباس ان ابا سفیان اخبره من فیه الی فیه قال انطلقت فی المدة التی کانت بینی وبین رسول الله ﷺ قال فبینا انا بالشام اذجیئ بکتاب من رسول الله ﷺ الی هرقل قال و کان دحیة الکلبی جاء به فدفعه الی عظیم بصریٰ فدفعه عظیم بصری الی هرقل فقال هرقل هل ههنا من قوم هذاالرجل الذی یزعم انه نبی قالوا نعم قال فدعیت فی نفرمن قریش فدخلنا علی هرقل فاجلسنا بین یدیه فقال ایکم اقرب نسبامن هذاالرجل یزعم انه نبی فقال ابو سفیان فقلت انا فاجلسونی بین یده و اجلسوا اصحابی خلفی ثم دعا بترجمانه فقال له قل لهم انی سائل هذا عن الرجل الذی یزعم انه نبی فان کذبنی فکذبوه قال فقال ابو سفیان وایم الله لو لامخافة ان یؤثر علی الکذب لکذبت ثم قال لترجمانه سله کیف حسبه فیکم قال قلت هو فینا ذوحسب قال فهل کان من آبائه ملک قالت لا،قال فهل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال قلت لا،قال ومن یتبعه اشراف الناس ام ضعفائهم قال قلت بل ضعفائهم قال ایزیدون ام ینقصون قال قلت لا بل یزیدون،قال هل یرتد احد منهم عن دینه بعد ان یدخل فیه سخط له،قال قلت لا،قال فهل قاتلتموه قلت نعم قال فکیف کان قتالکم ایاه قال قلت یکون الحرب بیننا وبینه سجا لا یصیب منا ونصیب منه قال فهل یغدر قلت لا،ونحن فی مدة لا ندری ماهو صانع فیها قال فوالله ما امکننی من کلمة ادخل فیها شیئا غیر هذه قال فهل قال هذاالقول احد قبله قال قلت لاقال لترجمانه قل له انی سالتک عن حسبه فزعمت انه فیکم ذوحسب و کذلک الرسل تبعث فی احساب قومها وسالت هل کان فی آبائه ملک فزعمت ان لا،فقلت لو کان من آبائه ملک قلت رجل یطلب ملک آبائه وسالتک عن اتباعه اضعفاؤهم ام اشرافهم فقلت بل ضعفاؤهم وهم اتباع الرسل وسالتک هل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال فزعمت ان لا

فقد عرفت انه لم یکن لیدع الکذب علی الناس لم یذهب فیکذب علی الله وسألتک هل یرتد احد منهم عن دینه بعد ان یدخله سخطة له فزعمت ان لا وکذلک الایمان حتی یتم وسألتک هل قاتلتموه فزعمت انکم قد قاتلتموه فتکون الحرب بینکم وبینه سجالا ینال منکم وتنالون منه وکذلک الرسل تبتلی ثم تکون لهم العاقبة وسألتک هل یغدر فزعمت ان لا فقلت لو قال هذاالقول احد قبله قلت رجل ائتم بقول قیل قبله قال ثم قال بم یأمرکم قلت یا مرنا بالصلوة والذکوۃ والصلة والعفاف قال ان یکن ماتقول فیه حقافانه نبی وقدکنت اعلم انه خارج ولم اکن اظنه انه منکم ولوانی اعلم انی اخلص الیه لا حببت لقاء ہ ولوکنت عنده لغسلت عن قدمیه ولیبلغن ملکه ما تحت قدمی قال ثم دعا بکتاب رسول الله ﷺ فقرأه فاذافیه بسم الله الرحمن الرحیم من محمدرسول الله ﷺ الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی اما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم واسلم یؤتک الله اجرک مرتیین وان تولیت فان علیک الم الاریسیین ویااهل الکتاب تعالواالی کلمة سواء بینا وبینکم الا نعبد الاالله ولا نشرک به شئیا الی قوله فقولوااشهدوابانا مسلمون فلما فرغ من قرائة الکتاب ارتفعت الاصوات عنده وکثراللغط وامربنا فاخرجنا قال فقلت لاصحابه حین خرجنا لقد امرامر ابن کبشة انه لیخافه ملک بنی الاصفر قال فما زلت موقنا بامررسول الله ﷺانه سیظهر حتی ادخل الله علی الاسلام" (مسلم جلد ثانی کتب النبی ﷺ الی ھرقل ص ۱۰۵)

ترجمه وضاحت:

اس حدیث پاک باب (عنوان) ہی یہ قائم کیا گیا کہ (باب اس بیان میں کہ نبی کریم ﷺ نے ہرقل بادشاہ شام کی طرف خط لکھا جس میں دعوت اسلام دی گئی۔

"هرقل بکسرالهاء وفتح الراء واسکان القاف هذاهوالمشهور ویقال هرقل بکسر الهاء واسکان الراء وکسرالقاف"

"ھرقل" کا صحیح اور مشہور تلفظ یہ ہے کہ ہاء کے نیچے زیر اور راء کے اوپر زبر اور قاف ساکن، اور اس کا تلفظ یہ بھی ہے، ہاء کے نیچے زیر اور راء ساکن اور قاف کے نیچے زیر۔

"ھرقل" اس بادشاہ کا نام تھا، اور "قیصر" اس کا لقب تھا، روم کے ہر بادشاہ کا لقب قیصر ہی تھا"

خیال رہے کہ اس وقت شام کا علاقہ بہت وسیع تھا، روم بھی اسی کے ضمن میں تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے حضرت ابو سفیان ﷺ نے خبر دی جیسا کہ ان کا منہ میرے منہ کی طرف تھا، یعنی میں نے ان سے براہ راست آمنے سامنے یہ سنا کہ وہ کہہ رہے کہ جس وقت ہمارے اور رسول اللہ

ﷺ کے درمیان صلح حدیبیہ کا معاہدہ تھا اس وقت میں شام کے علاقہ میں (تجارت کیلئے) گیا۔اس وقت وہاں ہرقل کے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط پہنچا جو دِحیہ کلبی لے کر گئے تھے۔(دحیہ کی دال پر زبر اور زیر دونوں ہی آئی ہوئی ہیں) وہ خط حضرت دحیہ کلبی نے بصری کے امیر کو دیا تا کہ وہ ہرقل کو پہنچا دے، بصری کے امیر نے وہ خط ہرقل کو پہنچا دیا، بصری شام اور حجاز کے درمیان حوران کے علاقہ میں ایک شہر کا نام ہے، ہرقل نے پوچھا کیا کوئی شخص اس شخص کی قوم کا بھی یہاں ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ نبی ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ میں۔نے انہیں بتایا کہ ہاں میں اس شخص کی قوم کا ہوں۔ان لوگوں نے مجھے ہرقل کے سامنے بٹھا دیا، اور میرے دوسرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھا دیا، پھر اس نے ایک ترجمان کو بلایا، ہرقل نے ترجمان کو کہا کہ تم اس کے ساتھیوں کو بتا دو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص کے متعلق کچھ سوالات کر رہا ہوں، اگر یہ میرے سامنے جھوٹ بولے تو بتانا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ابوسفیان کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے بٹھانے کی وجہ بھی یہ تھی کہ اگر ابوسفیان جھوٹ بولے تو یہ لوگ اس کی آسانی سے تکذیب کر سکیں کیونکہ سامنے کسی تکذیب کرنے میں لوگ شرم محسوس کرتے ہیں، ابوسفیان کہتے اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میرے ساتھی مجھے جھوٹا کہہ دیں گے تو میں جھوٹ سے کام لیتا بخاری شریف میں یہ الفاظ ہیں "لولا الحیاء من ان یأثروا علی کذبا لکذبت عنه" اگر مجھے یہ حیاء وشرم دامنگیر نہ ہوتی کہ میرے ساتھی مجھے جھوٹا کہنا اختیار کر لیں گے تو میں جھوٹ سے کام لیتا، ابوسفیان کا جھوٹ کی طرف منسوب ہونے سے ڈرنے کی وجہ یہ تھی۔

"ان الکذب قبیح فی الجاهلیة کما هو قبیح فی الاسلام" بیشک جھوٹ زمانہ جاہلیت میں بھی اسی طرح برا سمجھا جاتا تھا جیسا کہ اسلام میں جھوٹ بری چیز ہے۔پھر ہرقل نے ترجمان کو کہا اس سے پوچھو اس (مدعی نبوت) کا حسب کیسا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں میں نے اسے بتایا کہ وہ شخص تو بہت اچھے حسب (خاندانی شرف) والا ہے، یہاں حسب تقریبا نسب کے معنی میں لیا گیا ہے، لیکن راقم کے بریکٹ میں لائے گئے الفاظ حسب ونسب دونوں کو شامل ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا اس شخص کے آباء واجداد میں سے کوئی بادشاہ تھا؟ تو میں نے کہا "نہیں"

پھر اس نے سوال کیا کہ وہ شخص جو کہہ رہا ہے اس سے پہلے (یعنی اس کے دعوہ نبوت سے پہلے) کیا تم اس سے پہلے جھوٹا سمجھتے تھے، یعنی جھوٹا ہونے کی تہمت لگاتے تھے؟ میں نے کہا "نہیں"

پھر اس نے سوال کیا اس شخص کی تابعداری کرنے والے کون سے لوگ ہیں۔قوم بڑے سردار

یا ضعیف (غریب) لوگ؟ میں نے کہا بلکہ غریب لوگ اس کے متبعین ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا اس کی تابعداری کرنے والے زیادہ ہورہے ہیں یا کم ہورہے ہیں؟ میں نے کہا کم نہیں ہورہے، بلکہ زیادہ ہورہے ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا اس شخص سے ناراض ہوکر کوئی اس کے دین میں آکر پھر مرتد ہوا ہے یا نہیں؟ میں کہا ایک بھی مرتد نہیں ہوا۔

پھر اس نے سوال کیا کیا تم نے اس شخص سے کبھی جنگ بھی کی ہے؟ میں نے کہا ہاں ہماری اس سے کئی جنگیں ہوئیں۔

پھر اس نے سوال کیا تمہارے درمیان جنگوں کے نتائج کیا رہے؟ میں نے کہا نتیجہ باری باری رہا، کبھی انہوں نے ہمیں شکست دی، کبھی ہم (بظاہر) غالب رہے۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا وہ شخص عذر کرتا ہے؟ یعنی کیا جنگ نہ کرنے کا وعدہ کر کے پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا، اس سے پہلے تو کوئی عذر اس نے نہیں کیا، البتہ اب ہم ایک معاہدہ (صلح حدیبیہ) کی مدت گذار رہے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں وہ کیا کرے گا۔ (صلح حدیبیہ کے وعدہ کو توڑنے والے کفار ہی تھے، نبی کریم ﷺ نے وہ وعدہ نہیں توڑا) ابوسفیان کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالی کی میں اپنے کلام میں کوئی اور (جھوٹا) کلمہ نہ ملا سکا۔

پھر اس نے سوال کیا، کیا یہ قول (دعوی نبوت) اس سے پہلے بھی کسی (اس کے آباء واجداد) نے کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔

پھر ہرقل بادشاہ نے ترجمان کو کہا، تم اس شخص کو بتاؤ کہ میں نے تم سے اس شخص کے حسب کے متعلق سوال کیا تو تم نے بتایا کہ وہ شخص اچھے حسب والا ہے۔ (ہاں یہ یقین کرلو کہ) رسول اپنی قوم میں اچھے حسب والے ہوتے ہیں۔ (حکمت اس کی یہ ہوتی ہے کہ اچھے حسب ونسب والے شخص کے کمالات وشرافت کو دیکھ کر لوگ جلدی ایمان قبول کرلیتے ہیں، اگر حسب ونسب اچھا نہ ہو تو لوگ طعنہ زنی کرتے ہیں، ایمان نہیں لاتے)

پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس کے آباء میں سے کوئی شخص بادشاہ تھا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں کوئی اس کے آباء سے بادشاہ نہیں تھا، تو اس کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ اگر اس کے آباء سے بادشاہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ ہاں یہ شخص اپنے آباء کی سلطنت کو (دعوی نبوت کی چال سے) حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پھر میں تم نے سے سوال کیا کہ اس کے متبعین قوم کے بڑے بڑے سردار اور جابر لوگ ہین یا غریب، تو تم

نے جواب دیا کہ غریب لوگ اس کی تابعداری کرنے والے ہیں (تو رسولوں کی تابعداری کرنے والے غریب لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو اپنے آپ سے بڑا سمجھنے میں عار نہیں سمجھتے، لیکن بڑے سردار لوگ کسی کو اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اس میں عار سمجھتے ہیں)

پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس مدعی نبوت کو اس کے دعوی نبوت سے پہلے تم جھوٹا سمجھتے تھے یا نہیں، تو تم نے کہا کہ ہم اسے جھوٹا نہیں سمجھتے تھے، تو میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص لوگوں پر جھوٹ کو نہ چھوڑے وہ اللہ تعالی پر بھی جھوٹ کو نہیں چھوڑتا (جب وہ شخص لوگوں سے کوئی جھوٹی بات نہیں کرتا تو یقیناً وہ اللہ تعالی پر بھی کوئی جھوٹ نہیں بول رہا، وہ سچا ہی سچا ہے)

پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی شخص (ناراض ہو کر اس کے دین سے مرتد ہو گیا ہو اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد، تو تم نے کہا نہیں (تو اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ سچا ہے کیونکہ صدق اور حق سے لوگ پھرا نہیں کرتے بلکہ ان کو اس پر بصیرت حاصل ہوتی ہے، لیکن جھوٹے اور باطل شخص کو لوگ چھوڑ دیتے ہیں) وجہ اصل میں یہ ہے کہ ایمان حاصل ہونے کے بعد دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے، اور سینہ میں انشراح پایا جاتا ہے اور انسان کو لطافت حاصل ہو جاتی ہے۔

پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ اس کے متبعین کم ہو رہے یا زیادہ تو تم نے کہا وہ زیادہ ہو رہے ہیں، تو اس کے متعلق بھی سمجھتا ہو کہ تابعداری کرنے والے زیادہ ہوں تب ہی ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، پھر میں نے تم سے سوال کیا کہ اس شخص اور تمہارے درمیان جنگ ہوئی ہے یا نہیں؟ تم نے کہا جنگیں ہوئی ہیں، ان کے نتائج باری باری رہے، کبھی وہ غالب رہے اور کبھی ہم اپنے آپ کو غالب سمجھتے رہے، کہ ان کو کبھی تم سے تکلیف پہنچی اور کبھی تمہیں ان سے تکلیف پہنچی۔

ہاں رسولوں کو اسی طرح آزمائش میں مبتلاء کیا جاتا ہے لیکن آخر کار کامل کامیابی رسونوں کو ہی حاصل ہوتی ہے، (رسولوں کو آزمانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صبر کریں، تاکہ ان کو اجر وثواب عطاء کیا جائے) اور میں نے تم سے سؤال کیا کہ وہ شخص کیا عذر کرتا ہے یا نہیں، تم نے کہا نہیں (وہ عذر نہیں کرتا)

اسی طرح رسول وہ ہی ہوتے ہیں جو جنگ نہ کرنے کا معادہ کر کے اسے توڑتے نہیں، دھوکہ بازی نہیں کرتے، پھر میں نے تم سے سؤال کیا کہ اس شخص سے پہلے بھی کسی نے (اس کے آباء سے) دعوی نبوت کیا ہے؟ تم

نے کہا نہیں، اگر اس سے پہلے کسی نے دعوی نبوت کیا ہوتا تو میں کہتا یہ ان لوگوں کی اقتداء کر رہا ہے۔

پھر اس نے کہا وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں میں کہا وہ ہمیں نماز کا اور زکوۃ کا اور صلہ رحمی کا اور پاک دامنی کا حکم دیتا ہے، ہرقل بادشاہ نے کہا اگر یہ باتیں ہیں تو وہ شخص یقیناً نبی ہے۔ مجھے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ آخر الزمان نبی نے آنا ہی ہے لیکن مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ وہ نبی تم میں سے ہوگا، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس کیلئے بڑا خلوص دل میں رکھتا اور اس سے ملاقات کرنا پسند کرتا، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو میں اس کے قدموں کو دھوتا، اور اپنی بادشاہی اس پر نثار کر دیتا، پھر اس بادشاہ نے نبی کریم ﷺ کا خط طلب کیا، اس میں یہ مضمون درج تھا:

"بسم الله الرحمن الرحیم" سے وہ خط شروع کیا گیا تھا کہ:

یہ خط محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف!

سلام ہو! اس پر جس نے ہدایت کی تابعداری کی، اس مضمون مذکور کے بعد بیشک میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں، اسلام لے آؤ سلامتی میں رہو گے، اور اسلام لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں دو مرتبہ اجر عطاء فرمائے گا۔ اور اگر تم پھر گئے تو بیشک تم پر تمہاری رعایا کے لوگوں کا گناہ بھی ہوگا۔

پھر اس خط میں یہ آیۃ کریمہ لکھی گئی۔

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝﴾

جب وہ خط پڑھنے سے فارغ ہوا تو اس کے پاس آواز بلند ہوئی، شور وغل زیادہ ہوا، ابوسفیان کہتے ہیں ہمیں وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے دوستوں کو کہا ابن ابی کبشہ کا تو کام بن گیا، ابن ابی کبشہ سے مراد نبی کریم ﷺ لئے گئے ہیں، ابو کبشہ آپ کی والدہ مکرمہ کے اجداد میں سے تھا، بیشک اس سے تو رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرنے لگ گیا۔

حدیث شریف میں "بنی اصفر" سے مراد رومی لوگ ہیں کیونکہ ان کی اولاد میں حبشہ کی سیاہی اور رومیوں کی سفیدی موجود تھی جس کی وجہ سے ان کا رنگ زرد تھا۔ ابوسفیان کہتے ہیں میں نے اس وقت سے یقین کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ بڑھے گا، آپ غالب ہو جائیں گے، آپ چھا جائیں گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام میں داخل کر دیا۔ (ترجمہ اور مختصر وضاحت از نووی)

مزید وضاحت ابھی انشاء اللہ آرہی ہے۔

خط پڑھنے کے بعد آوازوں کے بلند ہونے کی وجہ:

ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ ہرقل حضرت دحیہ کلبی کو علیحدگی میں لے گیا، اور اس نے کہا خدا کی قسم میں جانتا ہوں وہ سچے رسول ہیں، اور یہ وہی ہیں جن کی ہم انتظار کر رہے تھے، اور ہم نے ان کی صفات آسمانی کتاب میں پڑھی ہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے ان کی تابعداری کی تو رومی مجھے ہلاک کر دیں گے۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے دارالخلافہ (صدر ہاؤس) میں بڑے بڑے رومیوں کو بلایا درمیان میں ایک محل میں جمع کیا جس کے اردگرد کمرے تھے، وہ سب بند کر دئے، اس کے بعد محل کے ایک دریچہ سے سرکردہ رومیوں کو خطاب کیا، اے روم کے لوگو اگر تم اپنی بھلائی، اپنی نجات اور راہ راست کی خواہش رکھتے ہو اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک برقرار رہے تو اس نبی کی تابعداری کرو جو مبعوث ہوا ہے، جس نے ہمیں بھی دعوت ایمان دی ہے۔

ہرقل کی یہ بات سن کر قوم بگڑ گئی، ادھر ادھر بھاگنے لگے، گدھے کی طرح دولتیاں مارنے لگے، چاہتے تھے محل سے باہر نکل جائیں، لیکن محل کے تمام دروازے بند تھے، وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

ہرقل نے جب دیکھا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں اور نہ ہی میرے ایمان لانے پر مجھے زندہ رہنے دیں گے تو اس نے سب کو پھر آواز دی، اے روم کے لوگو تم مجھ سے نفرت کیوں کر رہے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ میں تو صرف تمہیں آزمانا چاہتا تھا کہ تم دین پر کتنے پختہ طریقہ سے قائم ہو، اب مجھے پتہ چل گیا کہ تم اپنے دین پر پختہ طریقہ سے قائم ہو، لھذا اسی دین پر تم قائم رہو، یہ سن کر وہ سب راضی ہو گئے اور ہرقل کو سجدہ کیا، تو محل کے دروازے کھول دیئے گئے وہ واپس چلے گئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوت ج ۲)

ہرقل بدقسمت انسان نکلا:

"انہ قد عرف صدق النبی ﷺ وانما شح فی الملک ورغب فی السیاسۃ فآثرھا علی الاسلام وقد جاء ذلک مصر حافی صحیح البخاری" ولو اراد اللہ لوفقہ کما وفق النجاشی" (نووی بر مسلم ج ۲ ص ۱۰۶)

ہرقل نے نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو پہچانا، بلکہ اظہار محبت کیا، لیکن وہ اپنی بادشاہی میں حریص نکلا، اور اس نے سیاست میں رغبت کی، اور سیاست کو اسلام پر ترجیح دی، بخاری شریف میں صراحۃ آتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے (ہرقل) کو اسی طرح توفیق دے دیتا کہ یہ ایمان قبول کر لیتا جیسا کہ نجاشی کو ایمان کی توفیق دی گئی۔

حدیث پاک سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) کفار کو جنگ سے پہلے دعوت اسلام دی جائے، اگر ان کو پہلے اسلام کی دعوت نہیں ملی تو ان کو دعوت اسلام دینا واجب ہے، اور اگر ان کو اس سے پہلے دعوت اسلام مل چکی ہے تو پھر دوبارہ دعوت اسلام دینا مستحب ہے۔

(۲) قاصد جب کوئی خبر لے جائے خصوصا وہ خط جو سر بمہر ہوں یعنی مہر لگا کر بند کر دئے گئے ہوں ان پر ان لوگوں کو اعتبار کر لینا چاہئے جن کی طرف وہ خطوط لکھے گئے ہیں۔

(۳) خط کو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے شروع کیا جائے اگر چہ کافر کی طرف بھی بھیجا جائے، یہ امر مستحب ہے، راقم کے نزدیک اس میں تبلیغ دین بھی ہے کہ ہم اللہ کے نام سے ابتداء کرتے ہیں جبکہ تم اپنے بتوں کے اسماء سے ابتداء کرتے ہو۔

(۴) نبی کریم ﷺ کا خط مبارک "وھذاالکتاب کان ذابال بل من المھمات العظام وبدأفیہ بالبسملۃ" ذی شان تھا، بلکہ عظیم اہمیت والا تھا کیونکہ اس میں دعوت اسلام کا تذکرہ تھا، اسی لئے اسے "بسم اللہ" شریف سے شروع کیا گیا تھا، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "کل امر ذی بال لایبدأفیہ ببسم اللہ الرحمن الرحیم فھوابتر" ہر ذی شان کام جو "بسم اللہ" کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اگر چہ بظاہر اس پر وہم ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں "کل امر ذی بال لا یبدأ فیہ بالحمد للہ فھو اقطع" بھی آتا ہے تو حضور ﷺ اپنے خط مبارک میں "الحمد للہ" کو ابتداء میں نہیں لکھا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "بسم اللہ" یا "الحمدللہ" سے مراد 'اللہ کا ذکر ہے' یعنی اگر ذی شان کام اللہ کے ذکر کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں:

"المراد بالحمد للہ ذکر اللہ وقد جاء فی روایۃ بذکر اللہ"

"الحمد للہ" والی حدیث سے مراد 'اللہ کا ذکر ہے' کیونکہ ایک روایت میں "بذکر اللہ" بھی آیا ہوا ہے۔ لھذا "بسم اللہ" سے ابتداء کافی ہے، بیشک "الحمدللہ" ابتداء میں نہ ذکر کیا جائے۔

مرقاۃ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ثم انہ وردالحدیث بلفظ کل کلام ذی بال لایبدأ فیہ بالحمدللہ فھواجذم رواہ ابوداؤد والنسائی فی

عمل الیوم واللیة وبلفظ کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بالحمدلله فهو اقطع رواه ابن ماجة والتوفیق بینهما ان المراد منهما الابتداء بذکر الله سواء یکون فی ضمن البسملة او الحمدلة بدلیل انه جاء فی حدیث رواه الرهاوی فی اربعینه وحسنه ابن الصلاح ولفظه کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بذکر الله فهو اقطع"

حضرت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ اس مشکل کا حل پیش فرمارہے ہیں کہ ایک حدیث میں یہ ذکر ہے، ہر ذی شان کام جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں "کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بالحمدلله فهو اقطع" ہر ذی شان کام جو الحمدللہ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ بے برکت ہے۔

جب حدیثیں دو ہیں، دونوں میں ذی شان کام کی ابتداء کا ذکر ہے تو کس حدیث سے ابتداء کی جائے، تو اس کا ایک جواب آپ نے یہ ذکر فرمایا کہ دونوں حدیثوں سے مراد یہ ہے "کہ ہر ذی شان کام جو اللہ کے ذکر کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اربعین رہاوی میں ایک حدیث میں صراحۃ "بذکر الله" موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے "کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بذکر الله فهو اقطع" ہر ذی شان کام جو اللہ کے ذکر سے نہ شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

اس حدیث (حدیث اربعین رہاوی) کو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے "حسن" قرار دیا ہے۔ یعنی یہ حدیث ضعیف بھی نہیں "والله اعلم بالصواب" (ماخوذ از مرقاۃ ج اول ص ۳)

(۵) حدیث پاک سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ قرآن پاک کی ایک یا دو آیتوں کو کفار کی طرف لے جانا جائز ہے جبکہ مقصد بھی عظیم ہو، یعنی کفار کو جب تبلیغ کرنی مقصود ہو تو ایک دو آیات کو کفار کی طرف لے جانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کفار کو جو خطوط لکھے ان میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ابتداء کی گئی، اور تبلیغ یہی آیہ کریمہ جس کی وضاحت جاری ہے "(یااهل الکتاب تعالوا......) تحریر فرمائی۔

ہاں البتہ مکمل قرآن پاک کا نسخہ یا زیادہ مقدار میں آیات کو کفار کے ملک میں لے جانا اس وقت منع ہے جبکہ یہ خطرہ ہو کہ قرآن پاک ان کے ہاتھوں میں آجائے گا تو وہ اس کی توہین کریں گے، جب یہ خطرہ نہ ہو تو قرآن پاک کا لے جانا بھی منع نہیں۔

(۶) خط کا عنوان اس طرح مستحب ہے کہ پہلے اپنا ذکر کرے پھر اس کا جس کو خط لکھا گیا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے

تحریرفرمایا"من محمدرسو ل الله الی هرقل عظیم الروم" محمدرسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف۔

(۷) ایمان لانے پردواجر کاذکرحدیث پاک میں فرمایا گیاتواسی سے پتہ چلاکہ اہل کتاب ایمان لے آئیں توان کوایک اجراپنی کتاب پرایمان لانے کااوردوسرااجرقرآن پاک پرایمان لانے کاحاصل ہوتاہے۔

(۸) اورفائدہ یہ حاصل ہواکہ جب کسی کودعوت ایمان دی جائے تو واضح الفاظ میں اس کی گمراہی کے اسباب اور ہدایت سےدوری کی وجوہ کوذکرکیاجائے،جیساکہ نبی کریم ﷺ نے خط میں لکھا"وان تولیت فان علیک اثم الاریسیین" اگرتم پھرگئے(ایمان نہ لایا)توتمہارے ذمہ تمہاری رعایاکاگناہ بھی ہوگا۔

بخاری شریف میں لفظ"یریسیین"استعمال ہے،معنی دونوں لفظوں کاایک ہی ہے۔

"واصح الاقوال واشهرها انهم الاکارون ای الفلاحون والزراعون ومعناه ان علیک اثم رعایاک الذین یتبعونک"

"اریسین" ہو،یا"یریسین"ہو،اس کے معنی میں صحیح اورمشہورقول یہ ہے کہ اس کامعنی ہے کسان،کھیتی باڑی کرنے والے،مراداس کی رعایاہے،یعنی بادشاہ کی روش(طریقہ)پراس کی رعیت چلتی ہے،اس لئے اگرتم نے اسلام قبول نہ کیاتوتمہاری وجہ سے تمہاری رعیت نے بھی اسلام قبول نہ کیاتوتمہیں رعیت کابھی گناہ حاصل ہوگا۔

(۹) اورفائدہ یہ حاصل ہواکہ کافروں کوابتدائی طورپرسلام نہ کیاجائے،اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے کفارکوخطوط میں"السلام علیکم"نہیں لکھا،بلکہ ﴿سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی﴾ سلام ہواس پرجس نے ہدایت کی تابعداری کی۔ (ماخوذازنووی)

فائدہ عظیمہ:

"**قیصر**"لقب تھاروم کے بادشاہوں کا۔"**کسری**"لقب تھافارس کے بادشاہوں کا۔

"**نجاشی**"لقب تھاحبشہ کے بادشاہوں کا۔"**خاقان**"لقب تھاترک کے بادشاہوں کا۔

"**فرعون**"لقب تھاقبطی بادشاہوں کا۔"**عزیز**"لقب تھامصرکے بادشاہوں کا۔

"**تبع**"لقب تھاحمیرکے بادشاہوں کا۔ (ماخوذازنووی)

تاہم یہ بھی خیال رہے کہ بعض حضرات نےمطلق مصرکے بادشاہوں کالقب"فرعون"بیان کیا

ہے۔اور ''عزیز''مصر میں بادشاہ کے نائب (وزیر اعظم) کا لقب بیان کیا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: ''ولیبلغن ملکه ما تحت قدمی'' راقم نے ان الفاظ کا ترجمہ کیا ہے''اور اپنی بادشاہی اس پر نثار کر دیتا'' یہ ترجمہ سیاق وسباق کو دیکھ کر بامحاورہ طور پر کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں معنی یہ ہے کہ ضرور بضرور پہنچ جائے گی اس کی بادشاہی اس مقام تک جو میرے قدموں کے نیچے ہے۔ (راقم)

مکتوب گرامی بنام کسریٰ پرویز:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم''

محمد رسول (ﷺ) کی جانب سے بنام کسریٰ شاہ فارس، سلام ہو! اس پر جو راہ راست کی پیروی کرے اور خدا پر ایمان رکھے اور گواہی دے کہ خدا ایک اور محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، بلاشبہ میں خدا کا رسول ہوں تمام لوگوں کی طرف، تاکہ میں خوف دلاؤں اور ڈراؤں، میں نے کفار پر حجت قائم کر دی، مسلمان ہو جاؤ گے تو سلامت رہو گے اور اگر انکار اور سرکشی کرو گے تو مجوسیوں کا وبال تم پر ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کا یہ خط حضرت عبداللہ بن حذافہ لے کر گئے تو اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی، وہ تو خدا بنا بیٹھا تھا، نبی کریم ﷺ کے خط کو دیکھ کر کہنے لگا محمد میری طرف خط لکھتا ہے حالانکہ وہ میرا بندہ ہے۔

''وہ کتنا جاہل تھا اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے بندہ ہیں'' پھر اس نے نبی کریم ﷺ کے نام کو اپنے نام سے پہلے دیکھا تو اور غصہ میں آ گیا کہ اس شخص نے اپنا نام میرے نام کے اوپر کیوں لکھا ہے۔اس جاہل کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خط کا مضمون ہی اس وقت اسی انداز کا ہوتا تھا کہ لکھنے والا پہلے اپنا نام لکھتا تھا، پھر اس جاہل کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ تو وہ ذات ہے جن کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ عرش پر لکھا ہوا ہے'' اس نے خط کا جواب نہ دیا، بلکہ خط کو پھاڑ کر ٹکرے ٹکرے کر دیا۔

جب یہ خبر نبی کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا''مزق کتابی مزق الله ملکه''اس نے میرے خط کو پھاڑ کر ٹکرے ٹکرے کر دیا ہے''اللہ تعالیٰ اس کے بادشاہی کے ٹکرے ٹکرے کر دے گا''اس کے بعد کسریٰ (فارس کے بادشاہ) پرویز نے یمن کے حاکم باذان کو لکھا کہ دو آدمی بڑے اعتماد والے اس شخص کے پاس بھیجوا سے باندھ کر میرے پاس لے آئیں (معاذ اللہ)

اس نے دو شخص بڑے سر کردہ منتخب کیے، انہوں نے داڑھیاں منڈا رکھی تھیں، موچھیں بڑھائی ہوئی تھیں، مونچھوں کو بل (طاؤ) دے کر رکھتے تھے، وہ پوچھتے پوچھتے طائف میں پہنچ گئے، وہاں ان کو ابوسفیان وغیرہ ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ مدینہ میں ہوتے ہیں، کفار دل میں خوش ہوئے کہ فارس کا بادشاہ آپ کا مخالف ہو گیا ہے، اب کام بن جائے گا وہ یہ نہ جانتے تھے کہ جس کے ساتھ رب تعالیٰ ہو اسے کسی مخالف اور موافق کی کیا پرواہ، والی یمن کے دونوں قاصد بحکم پرویز کسریٰ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ ہم فارس کے بادشاہ کسریٰ کی طرف سے تمہارے پاس آئے ہیں اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تمہیں باندھ کر اپنے ساتھ لے چلیں، اور بادشاہ تک پہنچا دیں، لھذا تم ہمارے ساتھ چلو، ورنہ ہمارا بادشاہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تباہ و برباد کر دے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی غصہ کے ان کی باتوں کو تحمل مزاجی سے سنا، اور ان کو ایمان کی دعوت دی، راہ حق بیان فرمائی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کو بیان فرمایا، وہ ایمان نہ لائے، اور یہی کہتے رہے تم ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں اپنے بادشاہ کے دربار میں پہنچانا چاہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج ٹھہرو، کل تمہیں جواب دیں گے، وہ جب آپ کی مجلس سے نکلے تو کانپ رہے تھے، قدرتی طور پر ان پر شان نبوت کی عظمت کا رعب چھا گیا تھا، وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ اگر ہم تھوڑی دیر وہاں اور ٹھہرتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے، اور اس کا کام خدا کا کام ہے، صبح جب وہ دونوں قاصد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان دونوں کو بتایا جاؤ اپنے صاحب، یعنی باذان کو خبر دو کہ تمہارے شہنشاہ کا بوجھ اتار دیا ہے، یعنی خسرو (کسریٰ کو عربی میں خسرو کہا جاتا تھا) کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سبحان اللہ! میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کو کیا خوب اللہ تعالیٰ نے علوم غیبیہ عطاء فرمائے، مدینہ طیبہ میں کوئی بھی نہیں جانتا، اور نہ ہی شاہ فارس کے قاصد جانتے ہیں کہ ہمارے بادشاہ سے کیا معاملہ ہو چکا ہے۔ یہ واقعہ دس جمادی الاخریٰ ۷ ھ کا ہے۔

پھر آپ نے ان قاصدوں کو کہا کہ باذان کو جا کر بتا دو بہت جلدی میرا دین کسریٰ کی مملکت پر غالب آ جائے گا، اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے تو تمہارا علاقہ تمہارے زیر تصرف رہے گا، اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو تمہیں معزول کر دیا جائے گا۔ جب وہ دونوں قاصد یمن میں پہنچے تو نبی کریم ﷺ کا پیغام باذان والیٔ یمن کو پہنچا دیا، اور آپ کی مجلس میں جن چیزوں کا مشاہدہ کیا تھا وہ سب اس کو بتا دیا۔

اس نے پوچھا کہ ان کے پہریدار اور محافظ ہیں، انہوں نے بتایا نہیں، ان کے محافظ تو نہیں وہ تو بلا خطر گھومتے پھرتے ہیں۔ باذان نے کہا جو اوصاف تم نے بتائے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نبی ہیں، بادشاہ نہیں کیونکہ یہ اوصاف بادشاہوں کو حاصل نہیں ہوتے۔ ان کی نبوت میں مجھے کوئی شک نظر نہیں آتا، اسلئے میں یہی چاہتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کوئی اور بادشاہ ایمان نہ لے آئے۔ اسی دوران اس کے بعد شیرویہ کا خط پہنچ گیا کہ کسریٰ لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور مملکت کی جماعت عظیمہ میں تفرقہ ڈالتا تھا، اس لئے میں نے اسے قتل کر دیا، لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو گئے ہیں، لھذا تمہیں چاہئے کہ تم خود بھی میری تابعداری کرو، اور لوگوں کو بھی میری تابعداری کا حکم دو، خبردار اس شخص کے درپے نہ ہونا جس نے دعویٰ نبوت کیا ہوا کہ میں عرب وعجم کا نبی ہوں، ہاں میرا خط ان کے متعلق تمہیں ملے تو اس پر عمل کرنا، اس سے پہلے ان کے حق میں خاموشی اختیار کرنا، ان کی مخالفت نہ کرنا۔ باذان پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ مجھے وہ شخص نبی سمجھ آتے ہیں، مجھے ان کی نبوت میں کوئی شک نہیں، ادھر شیرویہ کا خط بھی مل گیا تو وہ بغیر کسی توقف اور تاخیر کے مسلمان ہو گیا، اور اس کے کئی ساتھیوں نے بھی ایمان قبول کر لیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوت بالاختصار)

مکتوب گرامی حبشہ کے شاہ نجاشی کی طرف:

نجاشی کا نام اصمحہ بن الحر ہے، ان کی طرف عمرا بن امیہ ضمری کو قاصد بنا کر بھیجا گیا تھا، یہ حضور ﷺ کے سعادتمندوں سے تھے، جب حضور ﷺ کا خط مبارک ان کو پہنچا تو تخت سے اتر کر انہوں نے بڑے ادب واحترام سے وہ خط وصول کیا، اور اس خط کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

اس خط کا مضمون یہ تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نجاشی شاہ حبشہ کی طرف، تمہاری طرف اس خدا کی حمد وثنا بھیجتا ہوں جو مالک برحق ہے، اور مالک مطلق ہے، اور وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، وہ آفات اور عیوب سے محفوظ ہے، اور وہی آیات ومعجزات کے ذریعے اپنے نبیوں کی تصدیق فرماتا ہے، اور وہی اپنے بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے، وہی ان کو بلند درجات عطاء کرنے والا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے، اور وہی جبار اور متکبر وعلیم ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، جن کو حضرت مریم بتول پاکدامن نے جنا، اور عیسیٰ علیہ السلام کا ماں ہونے کا شرف انہیں حاصل ہوا، عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے روح پھونک کر پیدا فرمایا، جسطرح آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنا کر ان میں روح کو پھونکا، اما بعد بلاشبہ میں تمہیں دین اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اس سے

پہلے میں نے اپنے چچا کے بیٹے جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھ چند اور مسلمانوں کو بھیجا ہے ان کے ساتھ حسن سلوک سے در پیش آنا۔ تمہارے لائق یہی ہے کہ میری نصیحت سننا اور اسے قبول کرنا، تکبر اختیار نہ کرنا، اطاعت و فرنبرداری کرنا ﴿وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى﴾ اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی تابعداری کی۔

نجاشی نے خط پڑھتے ہوئے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت زبان پر جاری کیا، اسلام قبول کر لیا اور کہا کہ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو خود چل کر نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوتا، اور آپ کے پاس حاضر ہو کر سعادت حاصل کرتا، (لیکن یہ بادشاہی امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، صحابی نہ بن سکے، تابعی رہے) نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے خط کا جواب اس مضمون کا لکھا:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم"

"نجاشی شاہ حبشہ کی طرف سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف"

اے نبی آپ پر سلام و رحمت ہو اور رب تعالی کی برکتیں نازل ہوں عیسی علیہ السلام جو آپ نے فرمایا وہی حق ہے اس میں ذرا بھر بھی کوئی کمی زیادتی نہیں۔ میں نے آپ کے چچا کے بیٹے اور آپ کے صحابہ کی عزت کی، اور آپ کے چچا کے بیٹے کے ذریعہ آپ کی بیعت کر رہا ہوں، اگر حکم ہو تو آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں، وہیں آ کر رہوں؟ لیکن آپ نے ان کو حبشہ میں رہنے کے متعلق ارشاد فرمایا۔

(ماخوذ از مدارج النبوت ج ۲)

گذشتہ سے پیوستہ:

جب آیۃ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ تو عدی بن حاتم (جو اس وقت اسلام لا چکے تھے) نے "ماکنا نعبدھم یا رسول اللہ" ہم تو ان کی (یعنی اپنے علماء اور راہبوں کی) عبادت نہیں کرتے تھے، (تو ان کو رب کیوں کہا گیا)

قال الیس کانوایحلون لکم ویحرمون فتاخذون بقولھم قال نعم قال ھو ذاک" (رواہ الترمذی وحسنہ)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا وہ تمہارے لئے حلال اور حرام نہیں کرتے تھے اور تم ان کے قول پر ہی عمل نہیں کرتے تھے؟ انہوں نے کہاں یہ تو تھا، آپ نے فرمایا رب ماننے کا یہی مطلب ہے۔

یعنی تمہارا عقیدہ جو یہ تھا کہ ہمارے علماء اور راہب جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال ہو جاتی ہے، اور جس چیز کو حرام کہہ دیں وہ حرام ہو جاتی ہے، یہ دراصل ان کو رب ماننے کے مترادف تھا، اسی سے رب تعالی نے منع فرمایا کہ کوئی بعض تمہارا بعض کو رب نہ مانے۔

فائدہ جلیلہ: "فما کان من اطاعۃ الرسول فھو اطاعۃ اللہ لاغیر" رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے، وہ کسی غیر کی اطاعت نہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے "ومن یطع الرسل فقد اطاع اللہ" جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے تحقیق وہ اللہ کا مطیع ہے۔ علماء ومشائخ وسلاطین کی اطاعت میں دو رخ ہیں پہلا رخ یہ ہے:

"وکذا ماکان من اطاعۃ العلماء والاولیاء والسلاطین والحکام علی مقتضی الشرع"
علماء کرام اور اولیاء کرام اور بادشاہوں اور حکام کی اطاعت جب کہ شریعت کے مطابق ہو، تو وہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو، اور تم اپنے میں سے "اولی الامر" امور کے والیوں کی اطاعت کرو، "اولی الامر" کا اطلاق علماء کرام، مشائخ کرام اور بادشاہوں اور حکام تمام کو شامل ہے، لیکن ان تمام کی اطاعت کی شرط یہی ہے کہ وہ شریعت کے تقاضا کے مطابق حکم دیں تو ان کی اطاعت ضروری کی جائے۔

دوسرا رخ یہ ہے:

"وما کان علی خلاف مقتضی الشرع فھو الاتخاذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ" اگر کوئی عالم یا شیخ خلاف شرع کام کا حکم دے تو پھر اس کی بات کو ماننا اسے رب ماننے کے مترادف ہے، گویا کہ اسے اس نے رب مان لیا ہے۔ حالانکہ رب تعالیٰ بندوں کو رب بنانے سے منع فرمایا ہے۔ یہی حکم بادشاہوں اور حکام کا ہے کہ اگر یہ لوگ شریعت کے خلاف حکم دیں، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کو عیاشی اور فحاشی کی طرف مائل کریں تو گویا کہ وہ اپنے آپ کو رب بنا رہے ہیں، ان کے احکام کو ماننے والے نے ان کو رب مان لیا ہے، جبکہ رب تعالیٰ نے کو رب ماننے سے منع فرمایا ہے، اس طرح رب تعالیٰ کی نافرمانی کی جا رہی ہے۔

- عن علی رضی اللہ عنہ لا طاعۃ لا حد فی معصیۃ اللہ انما الطاعۃ فی المعروف" (رواہ البخاری ومسلم)
  حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کی نافرمانی کر کے کسی شخص کی طاعت نہ کی جائے۔ ہاں اچھے کاموں میں، یعنی شریعت کے مطابق کاموں کا کوئی حکم دے تو ان کاموں میں اس کی فرمانبرداری کی جائے۔
- وعن عمر ان بن حصین والحکیم بن عمرو الغفاری لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق"
  عمران بن حصین اور حکیم بن عمرو غفاری فرماتے ہیں خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی فرمانبرداری کرنا جائز نہیں۔

تفسیر مظہری سے غیر مقلدین کا استدلال درحقیقت اپنی جہالت کا ثبوت:

مظہری میں یوں ذکر ہے:

"ومن ههنا يظهر انه اذا اصح عنه احد حديث مرفوع من النبي سالما عن المعارضة ولم يظهر ناسخ وكان فتوى ابي حنيفة رحمه الله مثلا خلافه وقد ذهب على وفق الحديث احد من الائمة الاربعة يجب عليه اتباع الحديث الثابت ولا يمنعه الجمود على مذهبه من ذلک كيلا يلزم اتخاذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله"

یہاں سے ہی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جب کوئی ایک مرفوع حدیث پیش کرے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو اور وہ حدیث معارضہ سے بھی سلامتی میں ہو، اور اس حدیث کا منسوخ ہونا بھی ثابت نہ ہو، اور مثال کے طور پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہو اور دوسرے ائمہ کرام میں سے کسی کا قول حدیث پاک کے موافق ہو تو انسان پر واجب ہوگا کہ وہ حدیث پاک جو ثابت ہے اس کی اتباع کرے، اس کو اپنے مذہب پر جمود منع نہ کرے تا کہ یہ لازم نہ آئے کہ ہم میں سے بعض بعض کو سوائے اللہ تعالیٰ کے رب مان رہا ہے۔

اس عبارت کو غیر مقلدین بیان کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، اور خوشی سے اتراتے ہیں، کہ قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی نقشبندی نے تفسیر مظہری میں بیان کر دیا کہ امام ابو حنیفہ کا فتویٰ جب حدیث پاک کے مخالف تو اسے رد کردو، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ (معاذاللہ) تم امام ابوحنیفہ (رحمہ اللہ) کو رب مان رہے ہو۔

طلباء کرام! جاہلوں کی تقاریر سن کر جاہل نہ بن جانا، آیئے راقم سے مظہری کی عبارت کا مطلب سمجھئے، اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کو مدنظر رکھئے ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ تم فرماؤ بفرض محال رحمٰن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوجتا۔ (کنزالایمان)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت ترجمہ لکھا ہے جس میں شان الوہیت کا کیا خوب لحاظ کیا ہے "بفرض محال" کے الفاظ سے یہ بات سمجھا دی کہ رب تعالیٰ اولاد سے پاک ہے، اگر بفرض محال اس کا کوئی بچہ ہوتا (نبی کریم ﷺ سے کہلایا گیا) تو میں سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا، جب اس کی کوئی اولاد ہی نہیں تو میں سوائے اس کے اور کس کی عبادت کروں؟

اصل میں ان کے تراجم میں "بفرض محال" کی کوئی قید نہیں، ہوسکتا ہے جہلاء اس آیۃ کریمہ کا مطلب یوں سمجھنے لگیں کہ (معاذاللہ) رب تعالیٰ کی اولاد ہے اور نبی کریم ﷺ اس اولاد کی پوجا کرتے تھے، تو تمہاری عقل پر

جاہلو، کیا تمہاری نظر آنے والی آیۃ کریمہ پر نہیں۔

﴿سُبۡحَانَ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ﴾ (الزخرف آیۃ نمبر ۸۲)

پاکی ہے آسمانوں اور زمین کے رب کو عرش کے رب کو ان باتوں جو یہ بناتے ہیں۔

ان دونوں آیات سے واضح ہو گیا کہ رب تمہارے کی نہ اولاد ہے، اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کو کوئی اولاد سمجھی اور نہ ہی اس کے سواء کسی کی عبادت کی۔ ہاں کافروں نے رب تعالیٰ کی اولاد مانی، اور اسے معبود مانا۔

آیئے طلباء کرام! ان دونوں آیات کے سمجھنے کے بعد قاضی مظہری رحمہ اللہ کی عبارت کو سمجھئے قاضی مظہری فرماتے ہیں:
"وکان فتوی ابی حنیفہ رحمہ اللہ مثلا خلافہ" امام حنیفہ رحمہ اللہ کا فتوی مثال کے طور پر حدیث کے خلاف ہو۔ "مثال کے طور پر" اور "بفرض محال" تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کوئی فتوی حدیث پاک کے خلاف نہیں دیا، ہاں کسی جاہل کو پتہ ہی نہ چلے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جو فتوی دیا ہے وہ حدیث پاک کے مطابق ہے، تو نہ وہ حدیث کو مانے اور نہ ہی فتوی کو مانے تو اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا تو کوئی علاج نہیں، جو عبارت مظہری سے نقل کی گئی ہے، اس کے بعد متصل بیہقی کی روایت کو دیکھئے۔

روی البیھقی فی المدخل باسناد صحیح الی عبد اللہ بن المبارک قال سمعت ابا حنیفۃ یقول اذا جاء عن النبی ﷺ فعلی الراس والعین واذاجاء عن اصحاب النبی ﷺ نختار من قولھم واذاجاء من التابعین زاحمناھم"

بیہقی نے اسناد صحیح سے روایت ذکر کی کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے فرماتے ہوئے سنا کہ جب ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یعنی مرفوع حدیث آجائے تو سر آنکھوں پر (ہم اسے بسر و چشم قبول کریں گے) اور اگر ہمارے پاس صحابہ کرام کا ارشاد یعنی حدیث موقوف آجائے تو ہم اسے بھی ترجیح دیں گے اس کے خلاف اپنا کوئی قول نہیں پیش کریں گے، ہاں اگر تابعی کا قول ہمارے سامنے آئے یعنی حدیث مقطوع ہو تو ہم اس کی مزاحمت کریں گے۔

یعنی ہم بھی تابعی ہیں، وہ بھی تابعی ہیں، تابعی کے قول کے خلاف ہمیں اجتہاد کا حق حاصل ہے۔

❁ وذکر عن روضۃ العلماء قال اترکوا قولی بخبر رسول اللہ ﷺ وقول الصحابۃ"

روضۃ العلماء میں مذکور ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تمہیں میرا قول رسول اللہ ﷺ کے خلاف یا صحابہ

کرام کے اقوال کے خلاف نظر آئے تو اسے چھوڑ دو۔

بہت واضح اور خوبصورت انداز میں سمجھایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے خلاف کوئی قول نہیں کرتا اور نہ ہی صحابہ کرام کے اقوال کی مخالف کرتا ہوں۔"ونقل انه قال اذاصح الحديث فهو مذهبي" امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب صحیح حدیث کسی مسئلہ میں ثابت ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔ یہ تمام بحث مختصر طور پر مظہری میں موجود ہے، اب عقل کا اندھا کوئی یہ کہتا پھرے کہ امام صاحب کا مذہب رائے پر مبنی ہے حدیث کے خلاف ہے تو وہ اپنی حماقت کا علاج کرائے۔

مظہری کی ایک اور بحث سے بیہودہ لوگوں کا اترانا:

لیکن افسوس یہ کہ وہ عبارات جن سے اپنی مرضی کے مطالب نکالے جاتے ہیں ان سے پہلے مقصودی بحثوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مکمل مسئلہ مظہری میں یوں بیان کیا گیا:

"لا يجوز لا حد ان يقول في امرافتي علماء الشرع على حرمته او كراهته ان مشائخ الصوفية سلوا كذلك ونحن نتبع سنتهم والصحيح ان الصوفيه الكرام ما فعلوا قط على خلاف مقتضى الشرع وانماالفساد من جهال اتباعهم"

علماء شرع کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ حرمت یا کراہت پر فتوی دیں۔ مشائخ صوفیہ کا یہی طریقہ ہے، اسی لئے ہم صوفیاء کرام کے طریقہ کی تابعداری کرتے ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ صوفیاء کرام وہی ہیں جو شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، فساد ان کے جاہل تبعین کی طرف سے آتا ہے کہ وہ خلاف شرع کاموں کو مشائخ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے یہ کہا ہے۔

(اور کبھی بناوٹی پیر غلط غلط طریقے ایجاد کر کے مشائخ کی بدنامی کا بظاہر سبب بنتے ہیں، لیکن ان جہلاء سے دھوکے میں آنے والے بھی جاہل ہوتے ہیں، حقیقی معبود اور باطل معبودوں میں فرق کرنا ضروری ہے اور حقیقی نبی اور جھوٹے نبی میں فرق کرنا ضروری ہے تو یقیناً یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقی مشائخ اور جھوٹوں میں فرق سمجھا جائے)

اس تمہید کے بعد مظہری میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"لا يجوز ما يفعله الجهال بقبور الاولياء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ اسرج والمساجد عليها ومن الاجتماع بعد الحول كا لاعياد ويسمونه عرسا"

یہ جائز نہیں جو جاہل لوگ اولیاء کرام اور شہداء کرام کی قبور کو سجدہ کرتے ہیں، اور ان کے ارد گرد طواف کرتے ہیں، اور

چراغ جلاتے ہیں اور ان کو سجدہ گاہ بناتے ہیں، اور سال کے بعد عیدوں کی طرح جمع ہو کر میلہ لگاتے ہیں اسے عرس کہہ لیتے ہیں۔

راقم کی وضاحت:

اہل سنت و جماعت کا صاف و ستھرا مذہب یہ ہے کہ قبر سجدہ کرنا حرام ہے، حرام بھی اس وقت جب قبر والے کو معبود نہ سمجھے، اگر معبود سمجھے تو شرک ہے۔ قبر کو طواف کرنا حرام ہے علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کی ہے، طواف صرف کعبہ شریف کا ہے، سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے مزار انور کا طواف حرام ہے، تو باقی کسی اور قبر کے اردگرد تو یقیناً طواف حرام ہوگا۔

جہاں تک چراغ جلانے کا مسئلہ ہے اس میں تفصیل ہے، جب تک وہ تفصیل بیان نہ کی جائے تو مسئلہ سمجھ میں نہیں آئے گا، آیئے توجہ فرمائیں۔

اصل میں ہر چیز مباح اور جائز ہے، اگر شرعی دلیل سے کسی چیز کو منع کیا جائے تو وہ ناجائز ہوگی، حقیقت میں حکم کی دارومدار ''نیت'' پر ہے چراغ جلانے والے کی نیت اگر صاحب قبر کو معبود سمجھنا ہو تو یقیناً شرک اور حرام ہوگا، اگر کوئی اور فاسد غرض ہو تو اسی کے مطابق ممانعت کا حکم بھی ہو گا، اور اگر اس چراغ سے لوگوں کو نفع پہنچانا مقصود ہو تو جائز ہوگا، جیسا کہ مجمع البحار میں مذکور ہے:

''وان كان ثم مسجدا وغيره ينتفع فيه للتلاوة والذكر فلا باس بالسراج فيه'' (مجمع البحار جلد سوم ص ۱۰۴)

اگر قبر کے نزدیک مسجد ہو کہ قبر کے چراغ سے اس میں تلاوت قرآن پاک اور ذکر کرنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہو تو ایسی حالت میں چراغ جلانے میں کوئی حرج نہیں۔

اس ''وغیرہ'' کے لفظ سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ کسی طرح بھی وہ چراغ فائدہ پہنچائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں، جیسے قبر کے قریب سے راستہ گذر رہا ہو اس چراغ سے راہ گذر کو فائدہ ہو یا وہ قبر گاؤں کے قریب ہو اس کا چراغ گاؤں کا پتہ دے رہا ہو تو یقیناً اس کا فائدہ لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ دیہاتوں میں رات کو چلنے والے مسافر اکثر طور پر بھٹک جاتے ہیں کسی گاؤں کے چراغ سے وہ اپنی راہ متعین کرتے ہیں۔

میلہ اور عرس میں فرق:

تفسیر مظہری کی عبارت ''ومن الاجتماع بعدالحول كا لاعياد ويسمونه عرسا'' سے نہ خود گمراہ ہوں اور نہ

دوسروں کو گمراہ کریں۔مظہری کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جاہل لوگ جو سال کے بعد اولیاء کی قبور پر عید کی طرح جمع ہوتے ہیں اور اسے عرس کہتے ہیں، جائز نہیں۔

جاہل لوگوں کا اولیاء کرام کے قبور پر عرس کے نام سے میلہ لگانا جائز نہیں جس طرح عید کے دن اگر جہلاء جمع ہو جائیں، ایسی محافل قائم رہیں کہ ڈھول، باجے، گانے، ان میں ہوں، اور گانے والی عورتیں ان محافل میں بلائی جائیں، اس طرح کی محافل قائم کرنا یقیناً ناجائز ہے۔اگر اولیاء کرام کی قبور پر سال کے بعد ان کی وفات کے دن لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن خوانی ہو، تقاریر ہوں، نعت خوانی ہو، اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہو، اور اس بزرگ، اور دیگر بزرگان دین اور انبیاء کرام اور تمام مؤمنین ومؤمنات کے حضور ایصال ثواب کا نذرانہ عقیدت پیش کرے تو یہ جائز ہے یہ ہی حقیقت میں عرس ہے۔

عید میں بھی دو ہی رخ ہیں جس سے تشبیہ دی گئی، اگر عید کے دن خرافات اور ناجائز کاموں میں مشغول ہو کر خوشی کا اظہار کرے تو یہ ناجائز ہے۔اگر عید کے دن نیا لباس پہن لے، خوشبو لگالے، غسل کر لے، عید کی نماز ادا کرے، جائز اور مباح کاموں سے خوشی کا اظہار کرے تو یقیناً جائز ہے۔ایصال ثواب کی زیادہ تفصیل ''نجوم الفرقان'' کے دوسرے حصہ میں دیکھئے۔

مظھری سے ایک غلط فھمی:

"وروی الحاکم وصححه عن ابن عباس لعن الله زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج"

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ذکر کی ہے، اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ ''اللہ کی لعنت ہو قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

سجدہ گاہ بنانے اور چراغ جلانے کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے، عورتوں کے قبروں کی زیارت کرنے میں تفصیل ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے۔

> روح کا تعلق انسان کے جسم کے ذرات سے قائم ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے قبر کا عذاب ہو تو اسے درد محسوس ہوتا ہے، اور قبر میں نیک آدمی کو راحت سے سرور حاصل ہوتا ہے، عام آدمی کا جسم مٹی ہو جاتا ہے اور ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں، لیکن نیک آدمیوں کے جسم بھی صحیح سلامت رہتے ہیں، انہیں قبر میں کامل زندگی حاصل رہتی ہے، ان کی قبر پر جا کر جزع وفزع نہ کریں اور کوئی

عذر شرعی نہ ہو تو ایسی حالت میں ان کا بھی قبروں کی زیارت کیلئے جانا جائز ہے۔

صاحب قبر کو زیارت کرنے والوں سے سکون حاصل ہوتا ہے، آیئے اس پر حدیث پاک دیکھئے:

❁ **اخرج ابن ابی الدنیا فی کتاب القبور عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ ما من رجل یزور قبر اخیه ویجلس عنده الاستأنس به وردعلیه حتی یقوم"** (شرح الصدور ص ۸۴)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ جب بھی کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے تو اسے سکون وراحت میسر ہوتی ہے، اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھڑا ہوتا ہے۔

اس شخص کے اٹھ جانے تک یہی کیفیت رہتی ہے، کہ اس شخص سے قبر والے کو انس ہوتا ہے، اور سکون حاصل ہوتا، اور راحت میسر ہوتی ہے۔

❁ **عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ کنت نهیتکم عن زیارة القبور فزوروها فانها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة"** (ابن ماجہ، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو کہ اس سے دنیا میں زہد (تقوی) حاصل ہوگا اور آخرت کی یاد حاصل ہوگی۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا تھا، کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا، لوگ بت پرستی کے عادی تھے، اس لئے منع کیا تھا کہ لوگ قبر والوں کو معبود نہ سمجھ لیں، جب صحابہ کرام کے دلوں میں اسلام اور اسلامی طریقے راسخ ہو گئے تو آپ نے اجازت فرمادی، موت کی یاد لذتوں کو مٹادیتی ہے، دلی کدورتوں کو ختم کر دیتی ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے:

"اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باهل القبور" (مرقاۃ)

جب تمہیں کچھ معاملات میں حیرانی و پریشانی ہو تو قبروں والوں سے امداد طلب کرو۔

اسی طرح قبروں کی زیارت سے انسان کو آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے وہ اس کی تیاری کرتا ہے، برائیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور نیکیاں کرتا ہے۔ وہ کتنے بے نصیب ہیں جو قبرستان میں بھی فحش مزاح کرنے سے یا وہاں بھنگ کا گھوٹا لگانے سے باز نہیں آتے آیئے اب اصل مقصد کو سمجھئے کہ عورتوں کیلئے بھی قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ عام طور پر ایک حدیث پاک بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کی قبروں کی زیارت کرنے پر حدیث پاک میں لعنت کی گئی، لیکن حدیث پاک کی مکمل وضاحت نہیں کی جاتی جو خود محدثین کرام نے بیان کی ہے۔

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول اللهﷺلعن زوارات القبور"

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ باب زیارۃ القبور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہو۔

ترمذی نے اس حدیث پاک کو حسن صحیح کہا ہے، اور خود ہی حدیث پاک کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے

"قدرأی بعض اهل العلم ان هذا كان قبل ان يرخص النبی ﷺفی زيارة القبور فلما رخص دخل فی رخصته الرجال والنساء وقال بعضهم انما كره زيارة القبور للنساء لقلة صبرهن ولشدة جزعهن" (مشكوة باب زيارة لقبور)

امام ترمذی نے کہا کہ بعض اہل علم کا اس حدیث پاک میں اعتقاد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی زیارت کی جو رخصت فرمائی ہے یہ حدیث اس سے پہلے کی ہے، کیونکہ پہلے مردوں کو بھی منع کیا گیا تھا اور عورتوں کو بھی، لیکن جب اجازت فرمائی تو مردوں اور عورتوں تمام کیلئے اجازت فرمادی، البتہ اگر عورتیں صبر نہ کریں اور قبروں پر جا کر رونا پیٹنا اور جزع وفزع کریں تو ایسی حالت میں انہیں قبروں پر جانا منع ہے۔

تنبیہ: راقم نے جو تحریر کیا ہے یہ فتوی کے درجہ میں ہے، اور اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "حیات الموات فی بیان سماع الاموات" میں مطلقا عورتوں کو قبروں پر جانے سے شدت سے منع کیا ہے لیکن وہ آپ کا تقوی ہے، آپ کا تقوی بھی سر آنکھوں پر، لیکن فتوی سے انحراف بھی ممکن نہیں احتیاطی مسائل اور جوازی مسائل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ (راقم)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ۶۵)

(۱) اے کتاب والو! ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو توراۃ وانجیل تو اتری مگر ان کے بعد تو کیا تمہیں عقل نہیں۔

(۲) اے اہل کتاب! کیوں جھگڑا کرتے ہو تم ابراہیم کے متعلق، حالانکہ نہیں اتاری گئی توراۃ اور انجیل مگر بعد آپ کے، کیا نہیں عقل رکھتے تم؟

شان نزول: یہودی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام دین یہودیت پر قائم تھے، اور نصرانی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام سے محبت کرنے کے دعویدار تھے اور ہر فریق ان کو اپنے دین پر سمجھتا تھا، لیکن رب تعالی نے ان کا رد فرمایا کہ دین یہود یعنی دین موسوی کی ابتداء توراۃ کے نازل ہونے سے ہوئی، اور دین نصرانیت یعنی دین عیسوی کی ابتداء انجیل کے نازل ہونے سے ہوئی، تو تمہیں عقل کیوں نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت یہ دونوں کتابیں نازل ہی نہیں ہوئی تھیں تو وہ کس طرح یہودی یا نصرانی تھے؟

اعتراض: جب تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام دین اسلام پر تھے، اور تم یہ کہتے ہو کہ اصول دین یا فروع میں ان کے موافق ہو، اور ابراہیم علیہ السلام اصول دین میں اس مذہب پر تھے جس پر آج مسلمان ہیں۔ تمہارا یہ کہنا کس طرح صحیح ہے "والاسلام انما انزل بعد بزمان طویل" حالانکہ اسلام ان کے بعد بہت زمانہ گذرنے کے بعد نازل ہوا۔ جب تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین، اسلام تھا، جبکہ اسلام بعد میں نازل ہوا تو ہم (یہود) بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ یہودی تھے بیشک یہودیت کا نزول بعد میں ہوا، اور ہم (نصاری) بھی یوں کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، بیشک نصرانیت کا وجود انجیل کے نزول سے ہوا جو آپ کے بعد نازل ہوئی، جو جواب تم دو گے تو وہی جواب ہم دے دیں گے۔

پہلا جواب: ہمارے قوی جواب کے مقابل تم کیا جواب دے سکو گے، آیئے دیکھئے ہم کیا کہتے ہیں۔

"والجواب ان القرآن اخبر ان ابراهيم "كان حنيفا مسلما" وليس فى التوراة والانجيل "ان ابراهيم كان يهوديا او نصرانيا فظهر الفرق"

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اسلام بعد میں نازل ہوا تو ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ کہنا

درست نہیں کہ وہ اسلام پر تھے، تمہارا یہ کہنا باطل کیوں ہے؟ اسلئے کہ رب تعالی نے خود ہی قرآن پاک میں ابراہیم علیہ السلام کا وصف بیان فرمادیا ﴿كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا﴾ وہ باطل دینوں سے جدا، مسلمان تھے۔" لیکن توراۃ نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ یہودی تھے، اور انجیل نے بھی نہیں بیان کیا کہ وہ نصرانی تھے" اب تمہارے دعوی اور ہمارے دعوی میں فرق واضح ہوگیا۔

دوسرا جواب: نصرانیوں کا یہ دعوی کہ "ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے" اس لئے باطل ہے کہ نصرانی تو عیسی علیہ السلام کو معبود مانتے ہیں، یعنی ان کی عبادت کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تو کسی نے بھی عیسی علیہ السلام کی عبادت کی اور نہ ہی آپ نے (معاذ اللہ) نہ عیسی علیہ السلام کی عبادت کی۔

"فکان الاشتغال بعبادة المسیح مخالفة لملة ابراهیم لا محالة"

لھذا حضرت عیسی علیہ السلام کی عبادت میں مشغول ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے یقیناً مخالف ہے۔

واضح ہوا کہ یہ دعوی سراسر باطل ہے ابراہیم علیہ السلام نصرنی تھے، اور ہم (نصرانی) ان کے دین پر چلنے والے ہیں اور ان کے متبعین ہیں، یہود کا دعوی بھی باطل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، کیونکہ حضرت موسی علیہ السلام کے تشریف لانے سے پہلے بھی مخلوق پر اللہ تعالی کے اوامر ونواہی (احکام اور ممنوع اشیاء) نافذ تھے، اور وہ انبیاء کرام کے ذریعے حاصل ہوئے اور انبیاء کرام کو معجزات کے ذریعے تائید دی گئی۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ موسی علیہ السلام جب تشریف لائے تو آپ کو پہلی شریعت کی تشریح اور وضاحت کرنے کیلئے بھیجا گیا تو یہ قول یقیناً یہود بھی نہیں تسلیم کریں گے، اور واقع کے بھی خلاف ہے، حق یہی ہے کہ آپ کو نئی شریعت مستقل طور پر عطاء کی گئی۔ جب آپ کو نئی شریعت عطاء کی گئی تو وہ پہلی شریعتوں کی ناسخ بن گئی، تو ابراہیم علیہ السلام کا یہودیت (دین موسوی) پر قائم ہونے کا دعوی بھی باطل ہوگیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا نہیں عقل رکھتے تم؟

"ای الاتتفکرون فلا تعقلون بطلان مذهبکم فتجادلون بالجدال المحال لان بین ابراهیم وموسی الف سنة وبین موسی وعیسی الفی سنة فکیف یکون ابراهیم علی دین الابعد عهده بازمنة متطاولة"

تم یہ سوچتے کیوں نہیں، تمہیں عقل کیوں نہیں حاصل ہوتی کہ تمہارا مذہب باطل ہے، تم باطل اور محال جھگڑا کیوں کرتے ہو، تمہیں پتہ نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور موسی علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے، اور موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ ہے، ابراہیم علیہ السلام اس دین پر کیسے قائم تھے جو بہت طویل زمانہ آپ

کے بعد آیا۔ (روح البیان)

کسی کے ساتھ دین میں موافق ہونے کیلئے ضروری ہے کہ عقائد میں اور احکام میں اسکے موافق ہو، عیسائیوں کے ایک فرقہ کا عقیدہ یہ تھا، عیسی علیہ السلام اله (معبود) ہیں، دوسرے فرقے کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ "ابن الله" (اللہ کا بیٹا ہیں) اور تیسرے فرقہ کا عقیدہ یہ تھا ﴿هُوَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾ وہ تین خداؤں میں سے ایک خدا ہے۔ اور یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ عزیر علیہ السلام "ابن الله" (خدا کا بیٹا) ہیں۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ نہ وہ تھا جو یہود کا تھا اور نہ وہ تھا جو نصرانیوں کا تھا۔

احکام میں بھی موافقت ممکن نہیں کیونکہ احکام توراۃ وانجیل کے ابراہیم علیہ السلام کے بعد طویل عرصہ گذرنے کے بعد نازل ہوئے تو کیسے ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام توراۃ وانجیل کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ جب عقائد اور احکام میں کسی میں بھی ابراہیم علیہ السلام ان کے موافق نہ تھے تو یقیناً یہ دعوی ہی باطل ہو گیا کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے۔ (البحر المحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿هَآاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (آیۃ نمبر ٦٦)

(1) سنتے ہو یہ جو تم ہو اس میں جھگڑے جس کا تمہیں علم تھا تو اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(2) خبردار تم یہ ہو کہ جھگڑا کیا تم نے اس میں جس کا تمہیں علم تھا، تو کیوں جھگڑا کرتے ہو اس میں جس کا تمہیں علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿هَآاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ﴾ میں "ھاء" حرف تنبیہ ہے، انتم مبتداء ہے اور "ھؤلاء" خبر ہے۔ "ھاانتم" میں پانچ قراءتیں ہیں جو سب ہی قراء سبعہ کی ہیں:

(۱) "ھـــاء" میں الف ہو اور بعد میں ہمزہ ہو، دونوں ثابت ہوں، جیسا کہ ہم اپنی قراءت روایت حفص کے مطابق پڑھ رہے ہیں۔

(۲) "ھا انتم" کے ہمزہ میں تخفیف کے طور پر تسہیل کی جائے یعنی بین بین کر کے پڑھا جائے۔

(۳) "ھاء" کا الف تخفیف کیلئے حذف ہو اور ہمزہ موجود ہے "صنعتم" کے وزن پر پڑھا جائے اور ہمزہ ثابت رہے۔

(۴) اسی تیسری صورت میں ہمزہ میں تسہیل کر دی جائے یعنی بین بین کر کے پڑھا جائے۔

(۵) "ھاء" کا الف موجود ہو اور انتم کا ہمزہ محذوف ہے۔ (صاوی)

اہل کتاب کو تنبیہ کی گئی "خبردار" تم تو یہ ہو کہ تم نے اس چیز میں بھی جھگڑا کیا جس کا تمہیں علم تھا، وہ کیا چیز تھی جس کا انہیں علم تھا؟

(حاججتم فيما لكم به علم) من امر موسى وعيسى اى الذى نطقت به التوراة والانجيل من انهما عبدان ورسولان لله يا مران بعبادة الله وحده ولا يشركان به غيره"

تم نے جھگڑا کیا اس چیز میں جس کا تمہیں علم تھا یعنی موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود کو علم تھا جس کا ذکر توراۃ میں تھا کہ آپ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرایا

جائے، اور یہود یہ گمان بھی کرتے تھے کہ ہم حق پر ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، لیکن پھر انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور اللہ کا شریک مانا اور توراۃ کے احکام پر عمل نہ کیا، اور نبی کریم ﷺ سے ان کے جھگڑا کرنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ اپنے باطل عقائد و نظریات پر دلائل دیتے اور آپ کی حقانیت اور قرآن پاک کی حقانیت کا انکار کرتے تھے۔

اسی طرح نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، حالانکہ انجیل میں بھی یہی تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ اور اس کے رسول ہیں، آپ نے حکم دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے، لیکن پھر تم نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کیا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے، یا خدا ہے، یا خدا کا شریک ہے۔ کیا یہ نظریات جو یہود کے ہیں وہ موسیٰ علیہ السلام نے بتائے ہیں؟ کیا یہ نظریات جو عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام نے بتائے ہیں؟ نہیں یقیناً انہوں نے نہیں بتائے۔ تو تم ان چیزوں میں بھی جھگڑا کر رہے جو تمہاری کتب میں واضح طور پر موجود ہیں تو تمہارے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے (ماخوذ از جلالین وصاوی)

﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾

"تو کیوں جھگڑا کرتے ہو تم اس میں جس کا تمہیں علم نہیں"

اس سے مراد کیا ہے؟ مراد یہ ہے:

"من شان ابراهيم الى لكونه لم يذكر فى كتبكم ما كان ابراهيم عليه فكيف تدعون انكم على دينه مع جهلكم به"

یعنی تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کے متعلق تمہاری کتب میں کوئی تذکرہ نہیں کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے جبکہ توراۃ وانجیل نازل ہی آپ کے بعد ہوئیں تو تم کس طرح دعویٰ کرتے ہو کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے، تمہارا یہ دعویٰ سراسر تمہاری جہالت پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از جلالین وصاوی)

اور اقوال:

"وقيل الذى لهم به علم هو امر محمد ﷺ لانهم وجدوا نعته فى كتبهم فجادلوا بالباطل والذى ليس لهم به علم هو امر ابرهيم"

بعض اور حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو نبی کریم ﷺ کے متعلق علم تھا، کیونکہ انہوں نے آپ کے اوصاف کو اپنی

کتب میں پایا، پھرانہوں نے اس میں باطل طریقے پر جھگڑا کیا کہ آپ کے اوصاف کو ہی بدل ڈالا۔ جس چیز کا انہیں علم نہیں تھا وہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق علم نہیں تھا، باطل طور پر وہ دعوی کرر ہے تھے کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے۔
(البحر المحیط)

(حاجحتم فیما لکم به علم)هو انهم زعموا ان شریعة التوراة والانجیل مخالفة لشریعة القرآن، فکیف تحاجون فیما لاعلم لکم به؟وهو ادعاؤ کم ان شریعة ابراهیم کانت مخالفة شریعة محمد ﷺ"

تم نے جھگڑا کیا اس میں جس کا تمہیں علم ہے، اس علم سے مراد ان کا گمان ہے، حقیقی علم نہیں، کیونکہ انہوں نے گمان کیا کہ توراۃ اور انجیل کی شریعت قرآن پاک کی شریعت کے مخالف ہے۔ یہ ان کا گمان کیوں تھا؟ اس لئے کہ قرآن پاک تو پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے، البتہ توراۃ وانجیل کے احکام پر عمل کا وقت قرآن پاک کے نازل ہونے تک تھا، قرآن پاک کے نازل ہونے پر ان کے احکام منسوخ ہو گئے۔ جس چیز کا انہیں علم نہیں تھا، اس سے مراد ان کا یہ دعوی کہ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت نبی کریم ﷺ کی شریعت کی مخالف تھی، یہ دعوی ان کا باطل تھا کیونکہ اس کا انہیں گمان بھی حاصل نہیں تھا۔ (کبیر)

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

یعنی اللہ تعالی جانتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے، اور اللہ تعالی جانتا ہے جن چیزوں میں تم جھگڑا کرر ہے ہو، اور تم جانتے نہیں، یعنی تم جاہل ہو اور تمہارے اقوال اور تمہارے جھگڑے باطل ہیں۔ (خازن، مدارک)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥﴾ (آیة نمبر ۶۷)

(1) ابراہیم نہ یہودی تھے، اور نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔

(2) نہیں تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی، لیکن تھے باطل سے جدا مسلمان، اور نہیں مشرکوں سے۔

شان نزول:

"واخرج ابن ابی حاتم عن مقاتل بن حیان قال قال کعب واصحابه ونفر من النصاری ان ابراهیم منا وموسی منا والانبیاء منا فقال الله ما کان ابراهیم یهودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما"

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت ذکر کی کہ کعب اور اس کے ساتھیوں اور نصرانیوں کے چند لوگوں نے کہا کہ ابراہیم ہم سے تھے، اور موسیٰ ہم سے تھے، اور انبیاء ہم میں سے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔ (در منثور)

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا﴾ "نہیں تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی"۔

رب تعالیٰ نے یہود اور نصاریٰ دونوں فرقوں کی تکذیب کی کہ تمہارا دعویٰ باطل ہے، یہودیوں کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، ان کا یہ قول باطل ہے، آپ یہودی نہیں تھے، یہودیت آپ کے بعد ہے، اور نصاریٰ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، ان کا بھی یہ قول باطل ہے، کیونکہ آپ نصرانی نہیں تھے، نصرانیت آپ کے بعد ہے۔ (کبیر)

﴿وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ "لیکن تھے باطل سے جدا" "مسلمان"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور تفسیر تبصیر الرحمٰن:

(ولکن کان حنیفا) ای مائلا عن الاعتقادات الفاسدة (مسلما) ای منقادا للاعتقادات الصحیحة" (تبصیر الرحمٰن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے بعینہٖ مطابق ہے، (بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے) یہی تفسیر کی عبارت سے واضح ہے کہ آپ تمام اعتقاد فاسدہ سے اعراض کرنے والے تھے، اور اسلام پر قائم تھے یعنی اعتقادات صحیحہ کے متبع تھے۔

راقم نے پہلے پارہ میں "حـنـیـفـا" پر تسکین الجنان میں تراجم میں تقابلی جائزہ پیش کیا وہ نجوم الفرقان میں شامل کرنا بھول گیا، اسے یہاں ہی دیکھ لیا جائے، بحث تقریبا ایک ہی ہے۔

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا﴾ (پ ۱ ع ۱۶)

''کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم جو ایک ہی طرف کا تھا'' (محمود الحسن صاحب)

''آپ کہہ دیجئے کہ ہم تو ملت ابراہیم پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں۔'' (اشرف علی صاحب)

''ان سے کہہ دو بلکہ سب چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ۔'' (مودودی صاحب)

''تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے'' (اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس مقام پر "قـــــل" کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے ''کہہ دے'' اور ''تم فرماؤ'' یہ دونوں ترجمے اسی لفظ ''قل'' کے ہیں، ان میں جو فرق ہے وہ بیان وضاحت کا محتاج نہیں، اس مقام پر ''حـنـیـفـا'' کا ترجمہ بعض حضرات نے کیا ہے ''ایک ہی طرف کا''

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اسی لفظ کا ترجمہ کیا ہے ''ہر باطل سے جدا تھے'' پہلی بات تو یہ ہے کہ عام اردو زبان کے محاورات سے واقف آدمی سمجھ لے گا۔ ''ایک ہی طرف کا ہونا'' اور ''باطل سے جدا ہونا'' ان دونوں میں سے یقیناً دوسرا معنیٰ زیادہ مناسب ہے۔ پھر بھی اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہونے پر جلالین نے ''حـنـیـفـا'' کی جو تفسیر کی ہے وہ شاہد ہے۔

(حنیفا) حال من ابراهیم مائلا عن الادیان کلها الی الدین القیم''

یعنی "حـنـیـفـا" ترکیبی لحاظ پر لفظ "ابراہیم" سے حال ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام باطل دینوں سے جدا ہونا ایک دین مستقیم پر قائم ہونا سوارک نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"الحنیف المائل من کل دین باطل الی دین الحق"

یعنی "حنیفا" کا مقصد یہ ہے کہ ہر باطل دین سے جدا ہونا، دین حق کی طرف متوجہ ہونا''

بیضاوی میں ہے ''(حنیفا) مائلا عن الباطل الی الحق'' باطل سے جدا ہونا حق کی طرف متوجہ ہونا''

خیال رہے کہ مودودی صاحب کا ترجمہ صرف خیالی ہے، عربی گرائمر کی مطابق سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور اشرف علی صاحب نے "حـنـیـفـا" کا ترجمہ کیا ہے ''جس میں کجی کا نام نہیں'' یہ ترجمہ آپ نے کسی لغت اور کسی تفسیر سے لیا ہے؟ ہمیں تو یہی سمجھ آیا کہ یہ ترجمہ لغوی نہیں اور نہ ہی مقصد کو واضح کرتا ہے۔ (تسکین الجنان ص ۴۷، ۴۸)

❁ واخرج ابن جریر عن سالم بن عبدالله لااراه الایحدله عن ابیه ان زیدبن عمر وبن نفیل خرج الی الشام یسأل عن الدین ویتبعه فلقی عالما من الیهود فسأله عن دینه وقال انی لعلی ان ادین دینکم فاخبرنی عن دینکم فقال له الیهودی انک لن تکون علی دیننا حتی تاخذ بنصیبک من غضب الله قال زید مافر الامن غضب الله ولا احمل من غضب الله شیأ ابدافهل تدلنی علی دین لیس فیه هذا قال ما اعلمه الا ان تکون حنیفا قال وما الحنیف قال دین ابراهیم لم یکن یهودیا ولا نصرانیا وکان لایعبد الاالله فخرج من عنده فلقی عالما من النصاری فسأله عن دینه فقال انی لعلی ان ادین دینکم فاخبرنی عن دینکم قال انک لن تکون علی دیننا حتی تاخذ بنصیبک من لعنة الله قال لااحتمل من لعنة الله شیأ ولا من غضب الله شیأ ابدا فهل تدلنی علی دین لیس فیه هذافقال له نحو ماقاله الیهودی لا اعلمه الاان تکون حنیفا فخرج من عندهم وقدرضی الذی اخبراه و الذی اتفقاعلیه من شأن ابراهیم فلم یزل رافعایدیه الی الله وقال اللهم انی اشهدک انی علی دین ابراهیم" (درمنثور)

ابن جریر نے روایت ذکر کی کہ زید بن عمر بن نفیل شام کی طرف گئے دین کے بارے میں سوال کرر ہے تھے کہ مجھےکوئی دین حاصل ہو جائے جس کی میں تابعداری کرو، تو ان کی ملاقات ایک یہودی عالم سے ہوئی، اس سے زید نے دین کے متعلق پوچھا، اور بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دین پر آجاؤں، لیکن پہلے تم مجھے اپنے دین کے متعلق معلومات پہنچاؤ۔ یہودی عالم نے کہا تم اس وقت تک ہمارے دین پر نہیں آسکتے جب تک تم اللہ تعالیٰ کے غضب کا کچھ حصہ برداشت نہ کرلو (کیونکہ یہود اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہیں) زید نے کہا میں تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے بھاگا ہوں، اب اللہ تعالیٰ کے غضب کا کچھ حصہ بھی قابل برداشت نہیں البتہ تم مجھے کسی اور دین کی راہنمائی کرو جس میں آنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا غضب برداشت نہ کرنا پڑے۔ اس نے کہا مجھے اور تو کچھ علم نہیں، البتہ تم دین حنیف پر آجاؤ، زید نے پوچھا وہ دین حنیف کیا ہے؟ اس نے کہا وہ دین ابراہیم ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کی عبادت نہیں کرتے تھے،

پھر زید نے ایک نصرانی عالم سے ملاقات کی، اس سے اس کے دین کے متعلق سوال کیا، اور اسے کہا کہ میں تمہارے دین پر آنا چاہتا ہوں تم مجھے اپنے دین کے متعلق معلومات فراہم کرو تو اس نے کہا کہ تم ہمارے دین پر اس وقت تک نہیں آسکتے جب تک اللہ تعالیٰ کی لعنت کا کچھ حصہ حاصل نہ کرلو (کیونکہ نصرانی اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق ہیں) زید نے کہا میں تو اللہ تعالیٰ کی لعنت کو برداشت نہیں کرسکتا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے غضب کو برداشت کرسکتا ہوں، اس لئے تم مجھے کسی اور دین کے متعلق بتاؤ جس میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب کو برداشت نہ کرنا

پڑے، اس نصرانی عالم نے بھی یہودی عالم کی طرح ابراہیم علیہ السلام کے دین کی راہنمائی کی۔ زید وہاں سے نکلا تو اس کے دل میں دین ابراہیم کی محبت کامل طور پر آ گئی، کیونکہ وہ دونوں (یہودی اور نصرانی) عالموں سے دین ابراہیم کی تعریف سن چکا تھا، زید نے اپنے دونوں ہاتھ رب تعالیٰ کے حضور اٹھائے اور عرض کیا، اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا کہ میں دین ابراہیم پر آ گیا ہوں۔

اعتراض: تم کہتے ہو ابراہیم علیہ السلام دین اسلام پر تھے اس مراد تم لیتے ہو کہ اصول دین میں تم ان سے متفق ہو یا فروع دین میں۔ اگر تم کہو کہ اصول دین میں ہم ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ متفق ہیں اس لئے وہ بھی مسلمان تھے، تو اس طرح ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اصول دین میں ہم بھی ان سے متفق ہیں کیونکہ اصول دین میں تمام انبیاء کرام متفق ہیں، لھذا ہم یہ کیوں نہیں کہہ سکتے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی اگر تم کہو کہ تمہارا ابراہیم علیہ السلام سے فروع دین میں اتفاق ہے اس لئے وہ مسلمان تھے تو اس قول کے مطابق تو تمہارے نبی کی شریعت مستقل شریعت ہی نہیں ہو گی بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی تابع ہو گی لھذا یہ تمہارا کہنا کے ابراہیم علیہ السلام مسلمان تھے درست نہیں۔

جواب: نبی کریم ﷺ کی شریعت اصول دین میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے موافق تھی اور فروع دین میں بھی۔ فروع دین میں فوافق ہونے کے باوجود آپ کی شریعت مستقل تھی حضرات ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے تابع نہیں تھی، آیئے اس کا خوبصورت بیان علامہ رازی رحمہ اللہ کے الفاظ میں دیکھئے:

وجاز ایضا ان یقال المراد به الفروع وذلک لان الله نسخ تلک الفروع بشرع موسی علیہ السلام ثم فی زمان محمد ﷺ نسخ شرع موسی علیہ السلام بتلک الشریعة التی کانت ثابتة فی زمن ابراهیم علیہ السلام وعلی هذا التقدیر یکون محمد ﷺ صاحب الشریعة ثم لما کان غالب شرع محمد ﷺ موافقا لشرع ابراهیم علیہ السلام فلو وقعت المخالفة فی القلیل لم یقدح ذلک فی حصول الموافقة"

نبی کریم ﷺ کی شریعت فروع (یعنی احکام میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے فروع (احکام) میں موافق تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت مستقل تھی، کسی شریعت کے تابع نہیں تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے آنے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے احکام منسوخ ہو گئے، پھر جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو آپ کی مستقل شریعت سے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے احکام منسوخ کر دیئے گئے، زیادہ طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

شریعت کے احکام کو بحال کر دیا گیا، اگر چہ بعض احکام دونوں شریعتوں کے مختلف بھی ہیں، لیکن اکثر احکام میں موافق ہونے کے باوجود یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی شریعت کے احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے احکام کے موافق ہیں۔ اصول دین یعنی اعتقادات میں تو ہر نبی دوسرے نبی کے موافق رہا، سب کا اللہ تعالی اور ملائکہ پر، اور قیامت کے دن پر اور اس کے انبیاء کرام کے برحق ہونے پر، اور اس کی طرف سے نازل ہونے والی کتب پر ایمان رہا۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی شریعت مستقل بھی تھی اور شریعت ابراہیم کے موافق بھی تھی، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وصف رب تعالی نے بیان فرمائے کہ وہ تمام باطل دینوں سے جدا تھے اور مسلمان تھے۔

تینوں آیات کا خلاصہ:

ابھی متصل ہی ماقبل جن تین آیات کریمہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیوں جھگڑا کرتے ہو جبکہ ان کے وقت توراۃ وانجیل نازل ہی نہیں ہوئی تھیں تو تمہارا دعوی کرنا کہ وہ ہماری کتب کے موافق تھے یہ باطل ہے، جس سے تمہاری عقلوں کی نفی ہوتی ہے اور جہالت کا ثبوت ہوتا ہے۔

تم تو یہ لوگ ہو کہ جس چیز کا تمہیں علم ہے اس کے متعلق بھی جھگڑا کرتے ہو، گویا کہ حق کی بھی نفی کرتے ہو، اور جن چیزوں کا تمہیں علم ہی نہیں ان میں تم کیوں جھگڑا کرتے ہو، یعنی جہالت کے باوجود جھگڑا کرنا اور بے وقوفی ہے، اللہ تعالی جانتا ہے، تم نہیں جانتے، حق تو یہی تھا کہ ناحق جھگڑا کرنے سے تم باز آتے اور یہ کہتے کہ ہمیں تو کچھ علم نہیں، اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے (جبکہ توراۃ وانجیل ان کے بعد نازل ہوئیں، تو وہ کس طرح تمہارے دعوی کے مطابق تھے یا نصرانی تھے) بلکہ وہ تمام باطل دینوں سے جدا تھے، مسلمان تھے، اور مشرکوں سے نہیں تھے۔

تفسیر نعیمی کا نورانی بیان:

حضرت قبلہ شاہ سید محمد صاحب محدث کچھوچھوی دام ظلہم کی ایک شیعہ سے اس پر گفتگو ہوئی کہ سنی اور شیعہ میں کون (سا) مذہب پرانا ہے، محدث صاحب نے فرمایا کہ پرنا مذہب سنی ہی ہے، اس لئے کہ اس کا نام اہل سنت وجماعت" جب سے سنت رسول اللہ ﷺ اور جماعت مسلمین دنیا میں قائم ہوئی تب ہی سے یہ مذہب آیا۔ تمہارا نام

ہے **اثنا عشریہ** یعنی بارہ امام والے، جب بارہ امام ہوئے تو تم بنے (یعنی بارہ اماموں کے آنے کے بعد فرقہ اثنا عشریہ بنا، کیونکہ بارہ اماموں کے مکمل ہونے سے پہلے اثنا عشریہ نام رکھنا ہی صحیح نہیں کیونکہ "اثنا عشر" کا معنی ہے "بارہ") اور یقینی بات ہے کہ یہ بارہ امام عرصہ بعد پیدا ہوئے، لھذا تمہارا دین بھی پیچھے ہی ہے، تمہارا نام تمہاری تاریخ کا پتہ دے رہا ہے۔

اسی طرح ہر دین کے نام سے اس کی تاریخ کا پتہ چلا لو، محمد بن عبدالوہاب سے وہابی بنے، ان کی پیداوار بارھویں صدی میں ہے۔ عبداللہ چکڑالوی سے چکڑالوی فرقہ بنا یعنی ان کی پیداوار گیارھویں صدی میں ہے۔ مرزا قادیانی سے قادیانی فرقہ بنا، یعنی ان کی پیدوار تیرھویں صدی میں ہے۔ (سرسید احمد خان سے نیچری مذہب بنا، نیچری کی پیدوار چودھویں صدی کے آغاز میں ہے) غرضیکہ ہر مذہب کی تاریخ اس کے نام سے معلوم کرو، البتہ سنی وہ فرقہ ہے، وہ مذہب ہے جو سنت رسول اللہ ﷺ سے بنا۔

{اب قارئین کرام (کتاب کو پڑھنے والے حضرات) خود فیصلہ فرمالیں کہ کون سا مذہب حق ہے، اور کون سا باطل}

خیال رہے کہ حنفی، شافعی مالکی عاقائد کا نام نہیں فروعی اعمال کا نام ہے، یہ سب عقائد میں سنی ہیں، فروعی اور اجتہادی اعمال میں حنفی اور شافعی ہیں، ایسے ہی چشتی اور قادری وغیرہ عقائد میں حنفی اور اعمال شافعی ہیں، ایسے ہی چشتی اور قادری وغیرہ عقائد میں سے سنی ہیں، روحانی اعمال کے لحاظ سے یہ چشتی اور قادری ہیں۔

تنبیہ: سنت کی دستگیر فرائض سے پہلے ہے، پیدا ہوتے ہی ناف کی نال کٹوانا سنت اور عقیقہ سنت، اور ختنہ سنت، اور تعلیم و تربیت سنت ہے۔ اور بالغ ہونے کے بعد نماز فرض ہے، اس لئے ہمارا نام اہل سنت ہے نہ کہ اہل فرض، نیز مرتے ہی فرائض علیحدہ ہوجاتے ہیں، مگر سنت مصطفے ﷺ قبر میں ساتھ جاتی ہے، قبر کی گہرائی سنت، اور کفن کی مقدار سنت، دفن کے بعد فاتحہ ایصال ثواب سنت (**راقم "بھترالوی"** کی کتاب ایصال ثواب مستحب ہے کا مطالعہ کریں) لھذا ہم پیدائشی سنی ہیں، اور مرنے کے بعد بھی سنی، اللہ تعالی اس سنت والے کے زیر سایہ رکھے غرضیکہ ہمارا نام ہی ہماری تاریخ بنا رہا ہے۔

فائدہ: پچھلوں کا اثر اگلوں پر نہیں پڑتا، ہاں اگلوں کا اثر پچھلوں پر پڑتا ہے۔ ہم لوگ ابراہیمی ہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ہم سے پہلے گذرے، مگر ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی نہیں تھے کیونکہ یہ چیز ان کے بعد کی ہیں۔

لطیفہ: ایک سنی کا کسی وہابی غیر مقلد سے "قراءت خلف الامام" پر مناظرہ ہوا۔ سنی نے کہا کہ

حدیث شریف میں ہے "قراء ۃ الامام لہ قراء ۃ" یعنی امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔ وہابی غیر مقلد بولا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی اسناد میں جابر جہنی ہیں، جو نا قابل اعتبار تھا۔ سنی نے پوچھا کہ جابر جہنی کب پیدا ہوا؟ وہاں غیر مقلد نے کہا ۲۵۰ھ میں۔ سنی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے وقت میں جابر جہنی اپنے والد کی پشت میں بھی نہ آیا ہوگا کیونکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہے۔ اس وقت یہ حدیث صحیح تھی۔ (یہ حدیث مسند امام اعظم میں بھی مذکور ہے، امام صاحب کی روایت کی دارومدار تابعین یا صحابہ پر ہے، ان میں سے صحابہ کرام پر تو جرح ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ سب عادل اور ثقہ ہیں، تابعین میں سے کسی پر کوئی جرح کرے تو اسے دیکھا جائے، جو راوی امام صاحب کی وفات کے ایک سو سال بعد پیدا ہوا اسے ضعیف کہہ کر حدیث پاک کو امام صاحب کے زمانہ میں ضعیف قرار دینا حماقت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ (راقم بھٹرالوی)

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث ہم تک پہنچنے میں ایک سند سے ضعیف ہے، لیکن دوسری سند اور مسند امام اعظم کی روایت سے صحیح ہے۔ لھذا بعد کی سند کے ضعیف راوی کا امام صاحب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہاں یہ سن کر خاموش ہو گیا۔

ضروری نوٹ:

اہل سنت و جماعت کو یہ قاعدہ خوب یاد رکھنا چاہئے، بہت فائدہ مند ہے۔ (ماخوذ از نعیمی)

راقم کی کتاب "نماز حبیب کبریاء" کا مطالعہ کریں، انشاء اللہ اپنے سنی حنفی بھائیوں کو کافی فائدہ ہوگا۔ غیر مقلدین نے تو کبھی نہیں ماننا، لیکن یہ خیال کریں کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ابوجہل اور ابولہب اور دوسرے کافروں نے نہیں مانا تو بدقسمت وہ رہے، نبی کریم ﷺ کے ارشادات تو نورانی تھے،

اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ بری چیز کا اثر اچھی چیز پر زیادہ ہوتا ہے۔ اور اچھی چیز کا آثر بری چیز پر کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ راقم نے کبھی نہیں سوچا کہ غیر مقلدین میری بات مان جائیں گے، راقم کے ذہن میں صرف ایک بات ہوتی ہے کہ حنفی حضرات غیر مقلدین کے فریب اور دھوکے میں نہ آئیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ۝﴾ (آیة نمبر ٦٨)

(1) بیشک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ تھے جو ان کے پیرو ہوئے، اور یہ نبی اور ایمان والے اور ایمان والوں کا والی اللہ ہے۔

(2) بیشک زیادہ قریب سب لوگوں سے ابراہیم کے وہ جنہوں نے ان کی تابعداری کی اور یہ نبی اور ایمان والے ہیں، اور اللہ والی ہیں ایمان والوں کا۔

راقم نے ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ﴾ کا ترجمہ تفسیر مظہری سے لیا ہے۔

"اولی "مشتق من الولی بمعنی القریب یعنی اخصھم و اقربھم دینا"

لفظ "اولی" ولی سے بنا ہے، جس کا معنی ہے قریب ہونا، یعنی سب لوگوں میں سے ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب اور ان کے خاص اور دین کے لحاظ پر ان کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تابعداری کی بلاشبہ (یقینا) وہ آپ کی امت اجابت کے درجہ پر آئے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے دین کے اکثر احکام کے قریب یہ نبی محمد ﷺ اور مؤمنین ہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالی کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور قربانی کرتے ہیں، اور ختنہ کراتے ہیں، اور کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح حج اور عمرہ کرتے ہیں۔

لھذا واضح ہوا کہ آپ کی امت میں سے آپ کے متبعین اور نبی کریم ﷺ اور مؤمنین زیادہ حقدار ہیں کہ یہ کہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین کے احکام کے زیادہ قریب ہیں۔ (از مظہری)

شان نزول:

کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے اور محمد بن اسحاق نے ابن شہاب سے اسناد صحیح سے روایت ذکر کی، حضرت جعفر بن ابی طالب اور کچھ صحابہ کرام نے حبشہ کی جانب ہجرت کی اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی، بدر کا واقعہ بھی گذر چکا تھا تو قریش "دار الندوہ" (میٹنگ روم) میں جمع ہوئے، مشورہ کیا، اور طے یہ ہوا کہ والی حبشہ کے پاس دو شخص سمجھدار بہت تحائف دے کر بھیجے جائیں، جو ان لوگوں کے خلاف اسے بھڑکائیں جو اس کے ملک میں ہجرت کر کے چلے گئے ہیں۔

جن دو شخصوں کو منتخب کیا گیا وہ عمرو بن العاص اور ع عمارۃ بن ابی معیط تھے، یہ اپنے ساتھ بہت قیمتی تحائف لے کر سمندری راستہ سے کشتیوں پر سوار ہو کر حبشہ میں پہنچ گئے۔ نجاشی کو ملے اور اسے سجدہ کیا اور سلام کیا، پھر نجاشی کو کہا کہ ہماری قوم تمہارے لئے بہت خلوص رکھتی ہے، اور تمہاری شکر گذار ہے، اور تمہاری اچھائیوں سے محبت رکھتی ہے، بیشک انہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے تا کہ ہم آپ کو ان لوگوں سے ڈرائیں جو ہمارے ملک سے تمہارے ملک میں آگئے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایسے شخص کی تابعداری کر رہے ہیں جو جھوٹا ہے، اور وہ ہم میں سے ہی ہے، اور گمان یہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

"ولم یتابعہ منا احد الا اسفھاء" ہم میں سے کوئی بھی اس کی تابعداری نہیں کر رہا سوائے بے وقوفوں کے" ہم نے ان لوگوں پر راستہ تنگ کر دیا اور ان کو وادیوں اور گھاٹیوں میں محبوس کر دیا تا کہ ان کے پاس کوئی آ جا نہ سکے، ان لوگوں کو ہم نے بھوک اور پیاس میں مبتلاء کر دیا۔

"فلما اشتد علیہ الامر بعث الیک ابن عمہ لیفسد علیک دینک وملکک ورعیتک فاحذرھم"

جب اس مدعی نبوت پر معاملہ سخت ہو گیا تو اس نے اپنے چچا کے بیٹے کو تمہارے ملک میں بھیج دیا تا کہ وہ تمہیں اور تمہارے دین اور تمہارے ملک اور تمہاری رعایا کو فساد میں مبتلاء کر دیں، اسلئے تم ان آئے ہوئے لوگوں سے بچ کر رہو۔

"وادفعھم الینا لنکفیھم" یہ لوگ ہمارے حوالے کر دو، تا کہ ہم خود ہی ان سے نمٹ لیں۔ اور ساتھ ہی ان دونوں نے یہ کہا کہ تم ہماری سچائی دیکھنا چاہتے ہو تو ان مہاجروں کو اپنے دربار میں بلا لو، وہ تمہیں سجدہ نہیں کریں گے، اور تمہاری مجلس کے وہ آداب بجا نہیں لائیں گے جو دوسرے لوگ بجا لاتے ہیں۔ اس سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ وہ تمہارے دین اور تمہارے طریقہ سے منہ موڑنے والے ہیں (اعراض کرنے والے ہیں) نجاشی نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو میرے دربار میں بلا لو، ان کو بلایا گیا

" فلما حضروا صاح جعفر بالباب یستاذن علیک حزب اللہ "

جب مہاجرین نجاشی کے دروازے پر پہنچے تو حضرت جعفر بن ابی طالب نے زور سے کہا " اللہ کا گروہ (ٹولہ) آ گیا ہے جو تمہارے پاس آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ نجاشی نے جب سنا تو کہنے لگا " مروا ھذا الصائح فلیعد کلامہ " اس آواز دینے والے کو کہو اپنا کلام پھر لوٹاؤ۔ حضرت نجاشی دوبارہ وہی کلمات لوٹائے " یستاذن علیک حزب اللہ " اللہ کا ٹولہ (گروہ) تمہارے پاس آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ تو نجاشی نے کہا

"نعم فلید خلوا باذن الله و ذمته" ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اسی کی امان سے اندر آ جاؤ۔

ادھر کفار کا نمائندہ عمرو بن العاص (ابھی تک ایمان قبول نہیں کیا ہوا تھا، بعد میں ایمان لا کر صحابی بنے) اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ان لوگوں نے "حزب اللہ" کہہ کر کس طرح نجاشی کو متاثر کر دیا۔ اور ادھر نجاشی کا کلام سن کر کہ اس نے ان کو امن دی، شیریں کلام ان سے کیا، وہ دونوں غمناک ہو گئے، شائد ہمارا کام نہیں ہوگا، یہ کہیں نجاشی پر کامل طور پر اثر انداز نہ ہو جائیں "ثم دخلوا علیه فلم یسجدوا له" مہاجرین حضرات جب نجاشی کے کمرہ میں داخل ہوئے تو اسے انہوں نے سجدہ نہیں کیا۔

عمرو بن العاص نے کہا اے بادشاہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ بڑے متکبر ہیں، انہوں نے تمہیں سجدہ نہیں کیا۔ بادشاہ (نجاشی) نے ان سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ تم نے مجھے سجدہ نہیں کیا، اور جس طرح باہر سے آنے والے لوگ میری محفل کے آداب خدمت بجالاتے ہیں وہ آداب تم نے کیوں نہیں بجالائے۔ "قالوا نسجد لله الذی خلقک وملکک" انہوں نے کہا ہم تو صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بادشاہی عطاء کی۔ ہم بت پرست تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں سچے نبی کو مبعوث فرمایا، اور آپ نے ہمیں یہ بتایا کہ کسی محفل میں جاؤ، کسی سے ملاقات کرو تو "السلام علیکم" کہو، کیونکہ جنت والے ملاقات پر یہی کہتے ہیں، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "تحیتهم سلام" ان (جنتیوں) کا ایک دوسرے کو تحفہ دینا سلام ہوگا۔ ہم نے آپ کو سلام دے دیا ہے، جنتی آداب سے بڑھ کر اور کیا آداب خدمت ہوں گے،؟'

'فعرف النجاشی ان ذلک حق وانه فی التوراة والانجیل"

نجاشی نے سمجھ لیا کہ یہ بات حق ہے جو اس شخص نے کہی ہے، یہی توراۃ وانجیل میں بھی مذکور ہے،

"قال ایکم الهاتف یستأذن علیک حزب الله؟قال جعفر انا"

نجاشی نے کہا باہر سے آواز دینے والا کون تھا، جس نے یہ کہا کہ اللہ کا گروہ تم سے اجازت طلب کرتا ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب نے کہا "وہ میں تھا"

نجاشی نے کہا تم کوئی کلام کرو، حضرت جعفر نے کہا تم روئے زمین کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہو، اور اہل کتاب سے ہو اس لئے تمہارے سامنے زیادہ کلام کرنا اور حد سے تجاوز کرنا تو اچھا نہیں، البتہ یہ دو شخص جو ہمارے علاقہ سے آپ کے پاس آئے ہیں اور ہماری شکایات آپ کے پاس لائے ہیں، ان میں سے ایک کو کہو کہ وہ کلام کرے اور دوسرا خاموش رہے، آپ ہمارے مکالمہ کو سنیں، آپ کو سچے اور جھوٹے کا پتہ چل جائے گا۔

بادشاہ نے جب ان کو کلام کرنے کے متعلق فرمایا تو عمرو بن العاص نے حضرت جعفر کو کہا پہلے تم کلام کرو، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی کو کہا آپ ان دونوں سے پوچھئے "اعبید نحن ام احرار" کیا ہم غلام ہیں یا آزاد ہیں "قال بل احرار کرام" عمرو بن العاص نے کہا یہ لوگ آزاد ہیں اور اچھے حسب ونسب والے ہیں، نجاشی نے کہا "نجوامن العبودیة" ان لوگوں کو تمہارے اقرار سے غلامیت کے طعن سے تو نجات مل گئی۔

"ثم قال جعفر سل هما هل اهرقنا دما بغير حق فيقتص منا؟

پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ ان دونوں سے پوچھئے کیا ہم نے ان کا کوئی ناحق خون بہایا ہے کہ یہ ہم سے قصاص لینا چاہتے ہیں۔

"قال عمرو لا ولا قطرة" عمرو بن العاص نے کہا، نہیں انہوں نے کوئی ایک قطرہ خون کا ناحق کسی کا نہیں بہایا۔

"قال جعفر سل هل اخذنا اموال الناس بغير حق فعلينا قضاء وها،قال النجاشی ان كان قنطارا فعلی قضاء وه"

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا ان سے پوچھئے کیا ہم نے کسی کا ناحق مال لے لیا ہے جس کا ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ نجاشی نے کہا اگر تمہارے ذمہ ڈھیروں (بہت کثیر) مال بھی ہو تو وہ میں ادا کردوں گا۔

"قال عمرو لاولا قيراطا" عمرو بن العاص نے کہا نہیں ان کے ذمہ کسی کا مال ایک قیراط کے برابر بھی نہیں۔ (قیراط رتی کے قریب وزن ہے، چار جو کی قیراط اور پانچ جو کی ایک رتی ہوتی ہے)

نجاشی نے ان کے مکالمہ کو سن کر کافروں کے نمائندوں کو کہا تم ان سے کیا مطالبہ کرتے ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم اور یہ ایک دین پر تھے، وہ ایک ہی دین ہمارے آباء واجداد کا دین تھا، لیکن انہوں نے وہ دین چھوڑ دیا اور غیر کی تابعداری اختیار کرلی۔ "فبعثنا اليک قومهم لتدفعهم الينا" اسلئے ہماری قوم نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ تم ان کو ہمارے حوالے کردو۔

نجاشی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ کیا دین تھا جس کو تم نے چھوڑا ہے، اور وہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔

"قال جعفر امادين الذی كنا عليه فتركناه فهو دين الشيطان كنا نكفربالله ونعبدالحجارة"

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا جس دین کو ہم نے چھوڑا ہے وہ شیطان کا دین تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے کفر کرتے تھے، اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

"واماالذی تحولنا فدين الله الاسلام جاء نا به من الله رسول وكتاب مثل كتاب ابن مريم وموافقاله"

لیکن اب جس دین کو ہم نے اختیار کیا ہے وہ اللہ کا دین اسلام ہے، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ آئے، اور رب تعالیٰ کی کتاب (قرآن پاک) ہمارے پاس آئی، وہ کتاب ابن مریم (عیسیٰ علیہ السلام) کی کتاب (انجیل) کے موافق ہے۔

نجاشی نے یہ سن کر کہا تم نے عظیم بات کہی ہے، تم ابھی کچھ دیر کیلئے رک جاؤ، نجاشی نے ناقوس بجانے کا حکم دیا، اس نے تمام راہبوں اور اہل علم مبلغین کو جمع کر لیا، ان کو کہا کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں جس نے انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری "هل تجدون بين عيسى وبين يوم القيامة نبيا مرسلا" کیا تم نے انجیل میں پایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور قیامت کے درمیان کوئی نبی مرسل آئے گا؟

"قالو اللهم نعم قدبشرنا به عيسى وقال من آمن به فقد آمن بي ومن كفر به فقد كفربي"

انہوں نے کہا ہاں ہم نے یہ پایا ہے "اے اللہ تو خوب جانتا ہے" کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی ہے کہ میرے بعد آخری نبی آئیں گے، جن کا نام احمد ہوگا۔ (نبی کریم ﷺ کا نام احمد آسمانوں میں زیادہ بولا جاتا ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چونکہ آسمانوں پر زیادہ دیر زندگی گذارنی تھی اس لئے آپ نے احمد نام استعمال فرمایا) ان کے ساتھ جو ایمان لائے گا وہ میرے ساتھ بھی ایمان لانے والا ہوگا، ان کے ساتھ جو کفر کرے گا وہ میرے ساتھ بھی کفر کرے گا۔

پھر نجاشی نے حضرت جعفر بن ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ شخص جس پر تم نے ایمان لایا ہے "وہ کیا کہتا ہے؟ اور کس چیز کا حکم دیتا ہے، اور کس چیز سے منع کرتا ہے۔

"قال يقرأ علينا كتاب الله ويأمرنا بالمعروف وينهى عن المنكر وأمر بحسن الجوار وصلة الرحم وبر اليتيم ويأمر بان نعبد الله وحده لا شريك له"

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا وہ اللہ کے نبی ہمیں اللہ کی کتاب پڑھ کر سناتے ہیں، اچھے کاموں کا ہمیں حکم دیتے ہیں، اور برے کاموں سے ہمیں منع کرتے ہیں۔

اور پڑوسیوں سے اچھا تعلق رکھنے کا حکم دیتے ہیں، اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں، صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے اچھا تعلق رکھنے کا حکم دیتے ہیں، اور یتیموں پر بھلائی کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اسی کو صرف ایک معبود مانیں، اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہرائیں۔

"قال اقرأ علي مما يقرأ عليكم" نجاشی نے کہا "اللہ کا کلام جو تمہارے نبی تمہیں سناتے ہیں، وہ ہمیں بھی پڑھ کر سناؤ"

"فقرأ علیهم سورة العنکبوت والروم ففاضت عین النجاشی، واصحابه من الدمع"
تو حضرت جعفرؓ نے انہیں سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم پڑھ کر سنائیں، تو نجاشی اور اس کے دوسرے تمام ساتھیوں یعنی راہبوں اور اہل علم مبلغین کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔
"فقالوا زدنا یا جعفر من هذاالحدیث الطیب فقرأ علیهم سورة الکهف"
وہ تمام لوگ کہنے لگے اے جعفر یہ کتنا ہی پاکیزہ کلام ہے، یہ کلام ہمیں اور بھی سناؤ، تو آپ نے سورۃ "الکہف" ان کو پڑھ کر سنائی،

عمرو بن العاص نے نجاشی کو غضب دلانے کیلئے کہا کہ یہ مہاجرین تو عیسی علیہ السلام اور ان کی ماں کو گالی دیتے ہیں۔ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا تم عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے سورۃ مریم پڑھ کر سنائی، حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق آیات کو سن کر، نجاشی نے اپنی مسواک سے آنکھ کی خاشاک کے برابر تھوک کو انگلی سے اٹھا کر کہا "واللہ مازاد المسیح علی مایقولون" قسم ہے اللہ تعالی کی عیسی علیہ السلام نے اپنے متعلق یا اپنی ماں کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں۔ یعنی قرآن پاک میں عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کی وہی شان بیان کی گئی جو انجیل میں بیان کی گئی، نجاشی قرآن پاک میں عیسی علیہ السلام اور ان کی والدہ کی وہی شان بیان کی گئی جو انجیل میں بیان کی گئی۔

نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو کہا "اذهبوا فانتم سیوم بارضی" اب تم یہاں سے چلے جاؤ، میرے اس ملک میں تم آرام اور چین سے رہو (سیوم) حبشہ کی زبان میں "آمنون" امن میں رہنے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا پھر نجاشی نے کہا آج کے بعد تم میرے ملک میں امن سے رہو کوئی تمہیں گالی نہیں دے گا، اور کوئی تمہیں اذیت (تکلیف) نہیں پہنچائے گا، خوش ہو کر رہو، کسی قسم کا خوف دل میں نہ رکھو، اور نجاشی نے یوں کہا:
"فلا دهورة الیوم علی حزب ابراهیم"
آج کے بعد ابراہیم علیہ السلام کے گروہ کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جائے گی۔
"الدهورة جمعک الشیٔ کانه اراد لاضیعة علیهم ولا یترک حفظهم"
"دہورۃ" کا معنی ہے کسی چیز کو جمع کرنا اور اسے ضائع نہ ہونے دینا، اور اس کی حفاظت کو نہ چھوڑنا)

عمرو بن العاص نے پوچھا "ابراہیم کا گروہ" کون ہے؟ نجاشی نے کہا یہی لوگ ہیں اور وہ ذات ہے جس سے انہوں نے دین اسلام حاصل کیا ہے، اور اس نبی کے تمام متبعین "حزب ابراہیم" (ابراہیم علیہ السلام کا گروہ ہیں) عمرو بن العاص اور دوسرے مشرکین نے اس کا رد کیا، اور دعوی یہ کیا ہم ابراہیم علیہ السلام کا گروہ ہیں۔ نجاشی نے

عمرو بن العاص پر غصہ کرتے ہوئے، اس کے مشرکین کی جانب سے لائے ہوئے تحفے واپس کر دیئے، اور کہا۔

"انما هديتكم الى رشوة فاقبضوها فان الله ملكني ولم ياخذ مني رشوة"

بیشک یہ تمہارا ہدیہ تو رشوت ہے، یہ تم واپس لے لو، بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے بادشاہی عطاء فرمائی ہے، میں رشوت دیتا نہیں اور مجھ سے کوئی رشوت حاصل کرنے کی بھی امید نہ کرے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب ﷺ فرماتے ہیں کہ ہمیں شاہی دربار سے بہتر گھروں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی جن کے پڑوسی بھی اچھے تھے۔

یہ تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر ﷺ فرماتے ہیں عمرو بن العاص اور عمارۃ بن معیط کا نجاشی کو یہ کہنا کہ ہم ابراہیم علیہ کا گروہ ہیں، ادھر تمام مشرکین بھی یہی کہہ رہے تھے تو

"وانزل الله تعالى ذلك اليوم على رسول الله ﷺ في خصومتهم في ابراهيم وهو بالمدينة قوله عزوجل "ان اولى الناس "الاية"

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ آیۃ کریمہ ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ﴾ مکمل نازل فرمائی کہ (بیشک زیادہ قریب سب لوگوں سے ابراہیم کے قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی تابعداری کی اور یہ نبی اور ایمان والے ہیں، اور اللہ والی ہے مؤمنون کا) یہ آیۃ کریمہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، یعنی نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ میں ہجرت کر کے آ چکے تھے۔

راقم کے ذہن میں بار بار یوں آ رہا ہے:

کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا مکالمہ تیئس شب رمضان کا ہے اور آیۃ کریمہ کا نزول چھ ماہ بعد (ہجرت کے بعد) ہوا، کیونکہ بزرگان دین تیئس شب رمضان کو بڑے اہتمام سے عشاء کی نماز کے بعد سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم پڑھتے رہے، بعض اوقات صرف سورۃ عنکبوت پر ہی اکتفاء کیا جاتا رہا، اور اصحاب علم کے گھروں میں گاؤں کی تمام عورتیں جمع ہوتی تھیں، وہاں بھی اصحاب علم کی عورتوں میں سے کوئی ایک ان کو سورۃ عنکبوت اور سورۃ روم سنائی۔

راقم کو اس کی اصل یہی نظر آئی کہ حضرت جعفر ﷺ نے نجاشی اور اس کے دربار میں آنے والے راہب، پادری وغیرہ کو یہی دو سورتیں سنائیں جن سے ان کے دل کانپ اٹھے اور آنسوؤں سے آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اسی کی یاد میں بزرگان دین نے ان دونوں سورتوں کو تیئس شب رمضان کو پڑھنے کا معمول بنایا۔

"والله اعلم بالصواب واليه المرجع واليه المآب"

تاہم کوئی صریح قول مل گیا تو ان شاء اللہ نقل کر دیا جائے گا، ابھی تو بغیر کسی حوالہ کے صرف ذہنی سوچ کو لکھا ہے۔ (راقم)

تنبیہ: نجاشی حبشہ کے بادشاہ کا لقب تھا، کسی خاص شخص کا نام نہیں تھا، نبی کریم ﷺ نے دو نجاشیوں کی طرف خط لکھے تھے ایک یہ نجاشی جن کا تذکرہ ہو رہا ہے، ان کا نام مواہب لدنیہ میں ''اصــمـحــہ'' بیان کیا گیا ہے۔ یعنی وہ نجاشی جن کا نام اصحمہ تھا ان کی طرف مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے، اور ان کی طرف نبی کریم ﷺ نے خط مبارک بھیجا تھا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا، اگر چہ وہ اپنی بادشاہی مصروفیات اور نبی کریم ﷺ کے حکم سے حبشہ میں رہے اور مدینہ طیبہ میں آ کر نبی کریم ﷺ کی صحبت اختیار نہ کر سکے اور نہ ہی زیارت سے مشرف ہو سکے، البتہ نجاشی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر ایمان لانے والے کئی حضرات کو مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہونے اور زیارت سے مشرف ہونے کی وجہ سے مقام صحابیت حاصل ہو گیا، لیکن خود نجاشی تابعی رہے۔

ان کی وفات پر نبی کریم ﷺ ان کا جنازہ مدینہ طیبہ میں پڑھا، یہ آپ کی خصوصیت تھی یا آپ کے سامنے سے حجاب اٹھا دئے گئے تھے اور جنازہ آپ کے سامنے تھا، زیادہ تفصیل ان شاء اللہ دسویں پارہ میں جنازہ کے مسائل کے ضمن میں آئے گی، اصحمہ نجاشی رحمہ اللہ کے بعد جو حبشہ کا حاکم بنا اس کا لقب بھی نجاشی تھا، اس کی طرف بھی نبی کریم ﷺ نے خط بھیجا تھا لیکن اس کے ایمان لانے کا ثبوت نہیں ملتا، یہی وجہ ہے کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں یوں ذکر ہے۔

''عن انس ان نبی اللہ ﷺ کتب الی کسری والی قیصر والی النجاشی والی کل جبار یدعوھم الی اللہ ولیس بالنجاشی الذی ﷺ''

(مسلم ج ۲ ص۱۰۷، باب کتب النبی ﷺ الی ملوک الکفار یدعوھم الی الاسلام)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی (یعنی فارس کے بادشاہ اور روم کے بادشاہ اور حبشہ کے بادشاہ) کو خطوط لکھے اور تمام جابر کافر بادشاہوں کو خط لکھے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی (یعنی دعوت اسلام دی) لیکن نجاشی وہ مراد نہیں جن کی نماز جنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی تھی، اس حدیث سے ہی تقریباً یہ بات سمجھ آ رہی ہے کہ حدیث پاک میں ان بادشاہوں کا ذکر ہے جن کو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی اور انہوں نے اسے قبول نہیں کیا، وہ جابر اور ظالم اور کافر ہی رہے، یقیناً اس نجاشی سے مراد وہ نجاشی ہے جس نے اسلام قبول نہیں کیا، جس نجاشی کے ایمان لانے کا ذکر ہے وہ اور ہیں۔

غلطی کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں نے نجاشی نام سمجھ لیا ہے، یہ نہیں سمجھا کہ حبشہ کے ہر حاکم کو نجاشی کہا جاتا

تھا۔اور یہ بھی نہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ دونجاشیوں کوخطوط لکھے،ایک نے ایمان قبول کیا اور ایک نے ایمان قبول نہیں کیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ ج۲ بوضاحت کثیرہ)

عمروبن العاص کا مائل باسلام ہونا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جب نجاشی کے دربار میں اس بابرکت انقلاب کے خدوخال وضاحت سے بیان کئے جس سے نبی کریم ﷺ کی غلامی نے انہیں مالا مال کردیا تھا،تو ان کی تقریر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ درباری میں حاضر رئیسوں اور پادریوں کے علاوہ خود بادشاہ کی آنکھیں بھی اشکبار ہوگئیں،نہ صرف نجاشی اوراس کے متعدد باری حلقہ بگوش اسلام ہوگئے بلکہ اہل مکہ کا جو وفد مسلمان مہاجرین کو حبشہ سے باہر کرنے کا مشن لے کروہاں گیا تھا،اس کا سربراہ عمروبن العاص بھی حضرت جعفر کے دلآویز حسن بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔وہ گیا تھا مسلمان درویشوں کوشکار کرنے کیلئے،لیکن مردحق کی زبان کی کمان سے کلمۂ حق کا ایک تیر اس کو بھی گھائل کرگیا،

علامہ ابن عبدالبر''الاستیعاب''میں لکھتے ہیں:

''انه لم يات من ارض الحبشه الامعتقداللاسلام''

یعنی عمروبن العاص جب حبشہ کی سرزمین سے واپس آئے تو ان کا دل اسلام کی حقانیت کوتسلیم کرچکا تھا،اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک روز نجاشی نے عمروبن العاص کو اپنے پاس بلایا اوراسے کہا

''یا عمر و کیف یعزب عنک امر ابن عمک؟فو الله انه لرسول الله حقا''

اے عمروتجھ سے اپنے چچازاد کی حقیقت کیسے مخفی رہی بخدا وہ اللہ کے سچے رسول ہیں،عمرو نے ازراہ حیرت نجاشی سے پوچھا''انت تقول هذا''اے نجاشی تم بھی ان کی نبوت کوتسلیم کرتے ہو؟

''قال النجاشی ای و الله فاطعنی'' نجاشی نے کہاہاں بخدا میں ان کواللہ کا رسول مانتا ہوں۔تم بھی اس بات میں میری پیروی کرو(یعنی تم بھی ایمان لے آؤ)علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''فخرج من عنده مهاجرا الی النبی ﷺ فاسلما قبل خيبر و الصحيح انه قدم مسلما على رسول الله ﷺ فی صفر سنة ثمان قبل الفتح بستة اشهر وهو وخالدبن الوليد وعثمان بن طلحة وكان هم بالاقبال الى رسول الله ﷺ فی حين انصرافه من الحبشة ثم لم يعزم له الى الوقت الذى ذكرنا''و الله اعلم''

پس عمروبن العاص نجاشی کے پاس سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے فتح خیبر سے

چھ مہینے پہلے آکر مسلمان ہوئے۔ لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ۸ ہجری ماہ صفر میں فتح مکہ سے پہلے چھ ماہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عثمان بن طلحہ کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوئے جب وہ حبشہ سے روانہ ہوئے تھے تو ان کا ارادہ فورا بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے کا تھا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور اس وقت حاضر ہوئے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا" واللہ اعلم " (الاستیعاب ج۲ ص۵۰۲)

حافظ ابن حجر الاصابہ میں زبیر بن بکار مشہور ماہر علم انساب سے نقل کرتے ہیں:

''کہ عمرو بن العاص نے نجاشی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جب کہ وہ حبشہ میں تھے'' مہاجرین حبشہ کی ہجرت کی جو گونا گوں برکات ظاہر ہوئیں ان کا خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اور اگر ان کی ہجرت کی صرف یہی ایک برکت ہوتی کہ عمرو بن العاص جیسی نابغہ روزگار شخصیت نے اسلام قبول کرلیا تو یہ بھی کچھ کم نہ تھی۔ (ضیاء النبی ج۳ ص۴۱)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْيُضِلُّوْنَكُمْ وَمَايُضِلُّوْنَ اِلَّااَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (آیة نمبر ۶۹)

(1) کتابیوں کا ایک گروہ دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں گمراہ کردیں اور وہ اپنے ہی آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں شعور نہیں۔

(2) تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش کہ وہ گمراہ کردیں تمہیں، حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے سوائے اپنی جانوں کے اور نہیں وہ سمجھ رکھتے۔

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کا ذکر کیا کہ وہ حق سے پھر جاتے ہیں، اور دلائل کو قبول کرنے سے اعراض کرتے ہیں۔ اب بیان کیا جارہا ہے کہ وہ صرف اسی پر اقتصار نہیں کرتے بلکہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا ہے ان کو (معاذ اللہ) گمراہ کردیا جائے۔ ان کو وہ اپنے باطل گمان کے مطابق گمراہ کرنے کیلئے ان کے دلوں میں شبہات ڈالتے تاکہ یہ راہ حق سے پھر جائیں، لیکن مسلمانوں کو وہ راہ راست سے نہ بھٹکا سکے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس طرح کے شبہات ڈالتے۔

"ان محمد (ﷺ) مقر بموسی وعیسی ویدعی لنفسه النبوة"

بیشک محمد (ﷺ) موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ وہ نبی تھے پھر اپنی نبوت کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے امتی ہونے کا دعویٰ کرتے یہ یہود نے کہا اور نصرانیوں نے یہ کہا کہ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کا امتی ہونے کا دعویٰ کرنا چاہئے تھا، ان جاہلوں کو یہ بھی سمجھ نہ آسکا کہ ہر نبی نے دوسرے نبی کی نبوت کا اقرار بھی کیا کہ وہ سچے نبی تھے لیکن اپنی نبوت کا دعویٰ بھی کیا، اس میں کوئی تقابل نہیں پایا گیا۔

"وایضا ان موسی علیہ السلام اخبر فی التوراة بان شرعه لا یزول"

اور مسلمانوں کے دلوں میں یوں شک ڈالتے کہ موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ میں خبر دی ہے کہ ان کی شریعت میں زوال نہیں آئے گا اور محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ ان کی شریعت منسوخ ہوگئی، منسوخ کا دعویٰ کرنا تو باطل ہے۔ یہودیوں کا یہ قول سراسر جھوٹا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان فرمائے تھے ان میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ ان کی

شریعت پہلی شریعتوں کو منسوخ کر دے گی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ یہودیوں کے نمک خوار، اوران کے غمخوار اوران کے یار لوگوں نے بھی یہی کہا کہ قرآن پاک کی بعض آیات کو منسوخ کہنا باطل ہے، یہ نیچریوں اور قادیانیوں کا قول ہے۔

"والغرض منه تنبيه المؤمنين على ان لا يغتروابكلام اليهود"

اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مومنوں کو تنبیہ کر دی کہ تم یہود کے کلام سے دھوکے میں نہ آنا ورنہ وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ (مقام افسوس قرآنی تعلیمات سے دور ہو کر لوگ آجکل نام نہاد مسلمان یہودیوں اور نصرانیوں کے ہمنوا بنے بیٹھے ہیں، نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن کام یہودیوں اور نصرانیوں والے ہیں)۔ رب تعالیٰ نے اور آیات کریمہ میں بھی اسی مضمون کو ذکر فرمایا ہے:

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾

بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں۔ (سورۃ البقرۃ آیۃ نمبر ۱۰۸)

اور ارشاد فرمایا ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ (سورة النساء آية نمبر ۸۹)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ کہیں تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو تم سب ایک سے ہو جاؤ۔ (کبیر)

شان نزول: یہود کے مختلف قبائل بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ اور نجران کے عیسائیوں نے حضرت معاذ اور حضرت حذیفہ اور اور حضرت عمار ﷺ کو اپنے دین میں آنے کی دعوت دی۔

"وقال ابن عباس هم اليهود قالوالمعاذ وعمار تركتما دينكما واتبعتما دين محمد"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود نے حضرت معاذ اور عمار کو کہا کہ تم نے اپنے دین کو چھوڑ کر محمد کے دین کی تابعداری کیوں کر لی، آؤ اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ، تو اس وقت رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا" کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا ایک گروہ تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر سکیں، حالانکہ وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں (کیونکہ ان کے گمراہ کرنے کا وبال ان پر ہی لوٹ کر آتا ہے) اور وہ سمجھ نہیں رکھتے۔ (البحر المحیط)

﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾

تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش وہ گمراہ کر دیں تمہیں"

وقال ابو مسلم الاصبهاني ودبمعنى تمنى فستعمل معها لو، و، ان، وربما جمع بينهما فيقال وددت ان لو فعل"

ابو مسلم اصبہانی کہتے ہیں کہ "ود" تمنا کے معنی میں استعمال ہے، اس کے ساتھ کبھی "لو" آجاتا ہے اور کبھی "ان" آجاتا ہے، اور کبھی لو اور ان دونوں آجاتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے "وددت ان لو فعل" میری تمنا یہ تھی کہ وہ یہ کرتا۔

"ودد" الود محبة الشئ وتمنى كونه ويستعمل فى كل واحد من المعنيين على ان التمنى يتضمن معنى الود لان التمنى هو تشهى حصول ماتوده"

"الود" کا معنی ہے کسی چیز کی محبت کرنا اور اس کے پائے جانے کی تمنا کرنا، البتہ ہر ایک معنی دوسرے کو شامل ہوتا ہے، کیونکہ تمنا محبت کے معنی کو شامل ہے اسلئے کہ جس چیز کی محبت ہوگی اسی کے حصول کی خواہش ہوگی، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ اور اس نے بنائی ہے تمہارے درمیان محبت ورحمت، اس مقام میں "مودة" محبت اور تمنا دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اور کبھی "مودة" صرف محبت کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ ﴿قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (فرمادو نہیں سوال کرتا میں تم سے اس پر سوائے اہل قرابت کی محبت کے) یہاں "مودة" صرف محبت کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کبھی صرف تمنا کے معنی میں استعمال ہوتی ہے جیسا کہ ﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (اور تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے کاش کہ وہ تمہیں گمراہ کردیں)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(من اهل الكتاب) فى موضع الصفة لطائفة، والطائفة رؤساؤهم واحبارهم، وقال ابن عطية ويحتمل من ان تكون لبيان الجنس، وتكون الطائفة جميع اهل الكتاب"

یہاں ترکیبی لحاظ پر دو احتمال ہیں کہ "من اهل الكتاب" "طائفة" کی صفت ہو، اور طائفہ سے مراد، اہل کتاب کے رئیس اور پادری ہوں گے، اس صورت میں معنی ہوگا "تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے" یعنی اہل کتاب کے رئیسوں اور پادریوں نے تمنا کی، اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "من" بیانیہ ہو، اور "طائفة" سے مراد تمام یہود اور نصاریٰ ہوں، لیکن جنس اہل کتاب کا بیان ہو افراد کا نہ ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔ "تمنا کی اہل کتاب کے کسی ایک گروہ نے۔ (از البحر المحیط)

لیکن اگر مراد طائفہ سے اہل کتاب کے تمام افراد ہوں تو "من" تبعیضیہ ماننا ضروری ہو جائے گا۔

وايلم ان "من" ههنا للتبعيض وانماذكر بعضهم ولم يعمهم لان منهم من آمن والنى

الله علیهم بقوله"منهم امة مقتصده" (ان میں کوئی اگروہ اعتدال پر ہے)

اورارشادفرمایا﴿لَيْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ (سب برابر نہیں، کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں) اس سے مراد چالیس مرد اہل نجران کے بتیس (۳۲) حبشہ کے اور آٹھ روم کے ہیں جو دین عیسوی پر تھے پھر سید عالم ﷺ پر ایمان لے آئے، (خزائن العرفان)

"من" تبعیضیہ کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ "تمنا کی گروہ یہود ونصاری سے بعض نے " (ماخوذ از کبیر)

﴿لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ "کاش کہ وہ گمراہ کردیں تمہیں"

وانما قال (لويضلونكم) ولم يقل ان يضلوكم لان"لو"للتمنى فان قولك لو كان كذايفيد التمنى ونظيره قوله تعالى(يوداحدهم لويعمرالف سنة)

رب تعالی نے ارشادفرمایا﴿لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ اور یہ ارشاد نہیں "ان يضلوكم" اس لئے کہ "لو" یہاں تمنی کیلئے استعمال ہے، جیسا کہ کہاجاتا ہے "لو كان كذا" کاش کہ ایسا ہوتا، اسی طرح رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (اور مشرکوں سے) ایک کو تمنا ہے کاش کہ اسے عمر دی جاتی ہزار سال) میں بھی "لو" تمنی کے معنی میں استعمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تاہم بعض حضرات نے "لو" کو "ان مصدريه" کے معنی میں بھی لیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا "تمنا کی ایک گروہ اہل کتاب نے تمہیں گمراہ کرنے کی" (ماخوذ از مظہری)

لیکن جب "ودت" کا معنی "تمنا کی" لیا جائے، اور "لو" کو بھی تمنی کیلئے بنایا جائے اور اسے ماقبل کا بیان بنایا جائے تو معنی میں خوبصورتی نظر آئے گی۔

﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾ "حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے سوائے اپنی جانوں کے۔"

یعنی اگرچہ وہ تمنا یہ رکھتے ہیں کہ کاش وہ مؤمنوں کو گمراہ کردیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

(وما يضلون الاانفسهم) وهو وجوها، منها اهلاكم انفسهم باستحقاق العقاب على قصدهم اضلال الغير وهو كقوله تعالى "وما ظلمونا ولكن كانوا انفسهم يظلمون"

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾ کے چند مطالب ہیں:

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ "اضلال" کا معنی "اھلاک" کیا جائے کہ وہ صرف اپنی جانوں کو ہلاک کر رہے ہیں کیونکہ جب وہ مؤمنوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اپنے آپ کو عذاب اور ہلاکت کا مستحق بناتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے رہے۔

(۲) ومنها اخرجهم انفسهم عن معرفة الهدی والحق لان الذاهب عن الاهتداء یوصف بانه ضال"

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مؤمنوں کو وہ گمراہ کرنے کی تمنا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خود ہدایت اور معرفت کی راہ سے دور ہیں، جو ہدایت کی راہ سے دور ہو جائے وہ گمراہ ہی ہوتا ہے۔ "یعنی وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

(۳) ومنها انهم لما اجتهدوا فی اضلال المؤمنین ثم ان المؤمنین لم یلتفتوا الیهم فهم قدصاروا اخائبین خامرین حیث اعتقدوا اشئیا ولاح لهم ان الامر بخلاف ما تصوروه"

تیسرا مطلب یہ ہے کہ "اضلال" کا معنی ہے "رسواء کرنا، اور خسارے میں ڈالنا، اب معنی یہ ہوگا کہ وہ نہیں رسوا کر رہے اور نہیں خسارے میں ڈال رہے سوائے اپنی جانوں کے۔ کیونکہ جب انہوں نے مؤمنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی لیکن مؤمنوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تو وہ رسوا ہو گئے، اور خسارے میں رہے، اسلئے کہ جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ مؤمنوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے، ان کے تصور کے خلاف ہوا تو ان کی اپنی جانوں کیلئے رسوائی اور خسارہ حاصل ہوا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"وما یضلون الاانفسهم جملة حالیة جیئی بها للدلالة علی کمال رسوخ المخاطبین وثباتهم علی ما هم علیه من الدین القویم ای وما یتخطاهم الاضلال ولا یعود وباله الاالیهم لما انه یضاعف به عذابهم"

﴿وَمَا يُضِلُّونَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾ جملہ حالیہ ہے، جملہ حالیہ لانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مخاطبین کو کامل راسخ ہیں (پختہ عقیدہ رکھنے والے ہیں) اور دین قویم پر ثابت اور قائم ہیں، گمراہ کرنا ان کی طرف قدم نہ بڑھا سکا یعنی یہود کا گمراہ کرنا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکا، ان کے مؤمنوں کو گمراہ کرنے کی تمنا کا وبال ان کی طرف ہی لوٹا، کیونکہ وہ دوگنا عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ (روح البیان)

﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ ''اور نہیں وہ سمجھ رکھتے''

"(وما يشعروون)ان ذلك الضلال هو مختص بهم" اور وہ سمجھ نہیں رکھتے کہ بیشک یہ گمراہی ان کے ساتھ ہی خاص ہے۔ یعنی ان کے دل بہت سخت ہو گئے، اور ان پر یہ معاملہ مخفی اور دقیق (باریک) رہا۔

"فهم لا يعلمون انهم يضلون انفسهم" اس لئے وہ سمجھ نہیں کہ بیشک وہ تو اپنے نفسوں کو ہی گمراہ کر رہے ہیں۔

"ودل ذلك على ان من اخطأ الحق جاهلا كان ضالا" اسی سے یہ پتہ چل گیا کہ جو حق سے جاہلانہ طریقے سے پھر گیا وہ گمراہ ہے۔

''(وما يشعرون)انهم لا يصلون الى اضلالكم'' یعنی وہ سمجھ نہیں رکھتے اے مؤمنین کہ وہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکتے ''او لا يفطنون صحة الاسلام'' یا اس کا اور مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی صحت وحقانیت کی سمجھ نہیں رکھتے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت کو واضح دلائل سے سمجھتے اور اس پر ایمان لاتے۔ (یہ قرطبی نے ذکر کیا ہے)

او(وما يشعرون)ان الله يدل المسلمين على حالهم ويطلعهم على مكرهم وضلالتهم'' (ذکرہ ابن الجوزی)

ابن جوزی نے ذکر فرمایا ہے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اس بات کی سمجھ نہیں رکھتے کہ اللہ تعالی مسلمانوں کی راہنمائی فرماتا ہے اور ان کو ہمارے مکر وفریب پر اور ہمارے گمراہ کرنے کی تمنا پر ان کو مطلع کر دیتا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

نصیحت عظیمہ:

تفسیر روح البیان نے اس مقام پر بہت نفع مند نصیحت ذکر فرمائی ہے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے عربی عبارت بمع ترجمہ نقل کر رہا ہوں۔

''اعلم ان الله تعالى لما بين ان من طريقة اهل الكتاب العدول عن الحق والاعراض عن قبول الحجة بين انهم لا يقتصرون على هذاالقدر بل يجتهدون فى اضلال من آمن بالرسل عليه السلام بالقاء الشبهات،فعلى العاقل ان لا يضل عن الطريق القويم بالقاء ات كل شيطان رجيم من ضلال الانس والجان،اصلحهم الله الملك المنان وماذابعد الحق الاالضلال''

یہ بات جان لو کہ اللہ تعالی نے جب یہود ونصاری کا طریقہ بیان فرمایا کہ وہ اسی قدر پر اقتصار نہیں کریں گے بلکہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے ان کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈالیں

گے، عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ راندے ہوئے شیطان کے شبہات ڈالنے سے راہ راست سے نہ بھٹکے وہ راندہ ہوا شیطان خواہ انسان ہو یا جن، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت کو درست رکھے، اسلئے کہ حق سے پھرنے کے بعد تو فقط گمراہی ہے، لھذا مسلمانوں کو چاہئے وہ گمراہی سے بچ کر رہیں۔

❁ قال ابن مسعود ﷜لما دنا فراق رسول الله ﷺ جمعنا فی بیت امنا عائشة رضی الله عنها ثم نظر الینا فد معت عیناه وقال (مرحبا کم الله رحمکم الله اوصیکم بتقوی الله وطاعته قد دنا الفراق وحان المنقلب الی الله ولی سدرة المنتهی والی جنة الماوی یغسلنی رجال اهل بیتی ویکفنونی فی ثیابی هذه ان شاء والوفی حلة یمانیة فاذاغسلتونی وکفنتمونی علی سریری فی بیتی هذا علی شفیر لحدی ثم اخرجواعنی ساعة فاول من یصلی علی حبیبی جبریل علیه السلام ثم میکائیل ثم اسرافیل ثم ملک الموت مع جنودهم،ثم ادخلواعلی فوجاصلواعلی)فلما سمعوافراقه صاحواوبکواوقالوایارسول الله ﷺ انت رسول ربنا شمع جمعنا وسلطان امرنا اذاذهبت عنا فالی من نراجع فی امورنا،قا(ترکتم علی المحجة البیضاء)ای علی الطریق الواسع الواضع لیلها کنهارها فی الوضوح ولایزیغ بعدها الی غیرها الاهلاک،وترکت لکم واعظین ناطقاوصامتا فالناطق القرآن والصامت الموت فاذااشکل علیکم امر فارجعوا الی القرآن والسنة واذاقسا قلبکم فلینوه بالاعتبار فی احوال الاموات"

حضرت ابی مسعود ﷜فرماتے ہیں، جب رسول اللہ ﷺ کا دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت قریب آ گیا تو ہم ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر جمع ہوئے، پھر آپ نے ہماری طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا" مرحبابکم "(تمہارا آنا اچھا ہے) اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی میں برکت عطاء فرمائے، اور اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ رکھنا اور اطاعت کرنا، تحقیق فراق ہمارے قریب آ چکا ہے، اور اب اللہ تعالیٰ کی طرف اور سدرة المنتهی اور جنة المأوی کی طرف جانے کا وقت قریب آ گیا ہے، اور مجھے میرے اہل بیت کے مرد غسل دیں، اور اگر وہ چاہیں تو مجھے ان کپڑوں میں ہی کفن دے دیں، اور اگر چاہیں تو مجھے یمنی چادروں میں کفن دے دین، جب تم مجھے غسل دے دو اور کفن پہنا دو، تو میری چارپائی کو اسی حجرہ میں لحد کے ایک کنارے پر رکھ دینا، پھر تم سب کچھ وقت کیلئے نکل جانا۔

سب سے پہلے میرے حبیب جبریل مجھ پر جنازہ پڑھیں گے، پھر میکائیل، پھر اسرافیل، پھر ملک الموت، ان فرشتوں کے ساتھ اور فرشتوں کے لشکر بھی ہوں گے جو میرا جنازہ پڑھیں گے، پھر فوج در فوج تم آ کر میرا جنازہ

پڑھنا، جب آپ کے صحابہ نے یہ سنا کہ فراق واقع ہو رہا ہے تو ان کی چیخیں نکل گئیں (یعنی وہ پریشان ہو گئے "صاحوا" کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے چلانا شروع کر دیا) اور آنسو نکل آئے، اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے رب کے رسول ہیں، اور آپ ہی ہماری شمع محفل ہیں، اور آپ ہی ہمارے امور کے والی ہیں، جب آپ تشریف لے جائیں گے تو ہم اپنے امور میں کس کی طرف رجوع کریں گے، (یعنی اپنے معاملات) کس کے پاس لے جائیں گے؟) تو آپ نے فرمایا تمہارے پاس روشن دلائل تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں (یعنی اتنا واضح راستہ چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جس میں رات کو بھی دن کی طرح کوئی بھٹک نہیں سکے گا، اور اس روشن دین کو چھوڑ کر اور راستہ اختیار کرنے والا اپنے آپ کو تباہ و برباد کر دے گا، اور آپ نے فرمایا اور میں تمہارے لئے دو چیزیں نصیحت کرنے والی چھوڑ کر جا رہا ہوں، ایک بولنے والی چیز ہے، اور دوسری خاموش ہے، بولنے والی چیز قرآن پاک ہے، اور خاموش چیز موت ہے، جب تمہیں اپنے معاملات میں مشکل درپیش آئے تو قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا، اور جب تمہارے دل سخت ہو جائیں تو موت کے احوال سے عبرت پکڑتے ہوئے ان کو نرم کر لینا۔ (انتہی)

روح البیان نے یہ روایت جو ذکر کی ہے راقم کی نظر سے کہیں اور نہیں گذری۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جہاں اے پسر ملک جاوید نیست زدنیا وفاداری امید نیست

جہاں اے لڑکے ہمیشہ رہنے والا ملک نہیں، دنیا سے وفاداری کی امید نہیں ہے۔

فائدہ: لوگ اعتقاد و عمل میں مختلف ہیں، بعض وہ ہیں جو مضبوط قلعہ کی طرح اپنے اعتقاد میں پختہ ہوتے ہیں، وہ کبھی اپنے اعتقادات سے نہیں پھرتے خواہ انہیں گمراہ کرنے میں سب لوگ متفق ہو جائیں تو پھر بھی ان کو اپنی راہ سے وہ ہٹا نہیں سکتے، یہ ہیں انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور چیدہ چیدہ مؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر تمام پردے اٹھ جائیں تو میرا یقین زیادہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے تو پہلے ہی یقین محکم حاصل ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے الفاظ یہ ہیں، "لو کشف الغطاء ما ازددت یقینا" اور بعض لوگ ضعیف اعتقاد رکھتے ہیں، ان کو اس میں متانۃ (پختگی) حاصل نہیں ہوتی "تذروہ ریاح الھوی حیث شاء بعد ان لم تساعدہ لہ العنایۃ الازلیۃ" ایسے شخص کو خواہشات کی ہوائیں جہاں چاہیں اڑا کر لے جاتی ہیں، اصل وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ اسے رب تعالیٰ کی طرف سے ازلی عنایت حاصل نہیں ہوتی۔

❁ قال رسول اللہ ﷺ الناس کمعادن الذھب و الفضۃ"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ سونے اور چاندی کے معادن کی طرح ہیں۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں سے ہر شخص اپنے اعمال، اخلاق اور اقوال کا معدن ہے، لیکن لوگ اس میں مختلف درجات رکھتے ہیں جس طرح سونے اور چاندی کے معادن مختلف ہوتے ہیں، شرح مصباح میں ذکر کیا گیا ہے، کہ حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

"ان ماضی معادن الطباع من جواهر مكارم الاخلاق ينبغى ان تستخرج برياضة النفوس كما يستخرج الجواهر من المعادن بالمقاساة و التعب"

جیسے جواہر کو ان کے معادن سے بہت سخت محنت ومشقت سے نکالا جاتا ہے، ایسے ہی طبیعتوں کے معادن سے مکارم اخلاق کے جواہر (موتیوں) کو ریاضت وعبادت کے ذریعے نکالا جا سکتا ہے۔

کیا خوب کسی نے کہا:

بقدر الكد تكتب المعالی   ومن طلب العلی سهر الليالی

جتنی قدر زیادہ محنت ومشقت پائی جائے گی اتنی قدر بلندی حاصل ہوگی۔ جو شخص بلندی کو طلب کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگے (اور اللہ کو یاد کرے)

تروم العز ثم تنام ليلا   يغوص البحر من طلب الآلی

تو عزت کا ارادہ کرتا ہے پھر رات کو سو جاتا ہے، ایسا شخص تو موتیوں کی طلب میں دریا میں غوطے ہی کھاتا رہتا ہے۔

"فلا بد من الاجتهاد والا ستمداد من الابدال والاوتاد لعل الله يسهل سلوک هذا الطريق ويخلص من خطر هذا البحر العميق"

اے انسان اگر تو راہ سلوک کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور مقام ولایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تو عبادت وریاضت اختیار کر، عبادت کرنے میں مکمل محنت وکوشش کر، اور ابدال واوتاء (اللہ کے نیک بندوں، اولیاء کرام) سے امداد طلب کر، تاکہ اللہ تعالی اپنے فضل وکرم اور اولیاء کرام کی برکت سے تمہارے لئے راہ سلوک کو آسان کر دے، اور اس گہرے سمندر کے خطرات سے تمہارے لئے آسانی پیدا کر دے،

باری کہ آسمان وزمین سر کشید از اں   مشکل بود بیاوری جسم وجان کشید

ہمت قوی کن از مدد راہروان عشق   کان باررا بقوت ہمت تواں کشید

ایک بار آسمان وزمین نے سر اس سے کھینچ لیا، تو جسم وجان سے اسے لانا مشکل ہوگا، ہمت کو عشق کی راہ پر چلنے والوں کی امداد سے قوی کر، پھر اس بوجھ کو ہمت وطاقت سے کھینچ سکے گا۔

مطلب واضح ہے کہ رب تعالی کی قربت کی راہ رب تعالی کی رحمت سے ملتی ہے، رب تعالی کی رحمت اگر اس

سے دور ہو جائے تو اپنے جسم و جان کی محنت و مشقت کام نہیں آ سکے گی۔ ہاں اگر اس راہ سلوک میں انسان اپنے آپ کو مضبوط کرنا چاہتا ہے تو اس راہ سلوک پر چلنے والوں سے امداد طلب کرے، پھر ان کی دعاء کی برکت کی وجہ سے اسے قوت و ہمت حاصل ہو جائے گی اور اس راہ پر چلنے میں درپیش آنے والی مشکلات دور ہو جائیں گی۔

مقام افسوس: آجکل تمام ممالک اسلامیہ خواہشات کی آندھیوں کی گردش میں ہیں، کفار سے خائف ہیں، کافروں سے صلح کی راہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، اور مسلمانوں کا قتل عام کررہے ہیں، یہود و نصاری کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ادھر سے جو اشارہ ملتا ہے وہی ممالک اسلامیہ کے سربراہان راگ الاپتے ہیں۔ کاش کہ اسلامی تعلیمات پر عمل ہو جائے، یہود و نصاری سے دوستی کو چھوڑ دیا جائے، یہود و ہنود و نصاری کے خوف کو دل سے نکال دیا جائے، مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی بنالیں مسلمانوں کو ہی اپنی خیر خواہ سمجھیں، مسلمان مسلمانوں کا قتل عام بند کر دیں تو ان شاء اللہ وہی مقام حاصل کرلیں کہ قیصر و کسری اور یہود و نصاری کے حکمران ان کا نام سن کر خائف ہو جائیں، وہ ان کو دیکھ کر کانپنے لگیں۔ کاش کہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے سر بلند دیکھ لیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁